

اُداس نسلدیں

عبداللہ حسین



ہر ادیب اور شاعر اپنی ہم عصر نسل کے لیے لکھتا ہے۔ یوں
 کبھی نہیں ہوا کہ کوئی ادیب قلم اٹھائے اور کہے کہ "اب میں
 آنے والی نسلوں کی خاطر ادب تخلیق کرتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔"
 ہاں اگر ایک کے بعد دوسری نسل بھی اس کے ادب کو
 اسی شوق سے پڑھتی ہے، اور اس کے ساتھ اپنے کو اسی
 قدر منسلک و مربوط محسوس کرتی ہے تو یہ بات ادیب کے
 لیے گویا بونس کے طور پر ہوتی ہے، اور اس سے اُسے۔
 وہ جو کہ آخر قلم کا مزدور ہی ہوتا ہے۔ اتنی ہی خوشی حاصل
 ہوتی ہے جتنی کہ کسی بھی محنت کش کو عید کے موقع پر ایک
 ماہ کی زاید تنخواہ کے ملنے کی ہوتی ہے۔ اور وہ اس پر شکر گزار
 ہوتا ہے، گو کہ یہ کوئی عطیہ نہیں بلکہ اُس کا اپنا حق ہوتا ہے۔

لندن

عبد اللہ حسین

یکم جنوری ۱۹۸۳ء

اُدائے نیکوئی

عبداللہ حسین

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Abdullah Hussain

Odaas Naslain/ Abdullah Hussain.-

Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2007.

558pp.

1. Urdu Literature - Novel.

I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2007

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-0073-3

Sang-e-Meel Publications

25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN

Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101

<http://www.sang-e-meel.com> e-mail: smp@sang-e-meel.com

Chowk Urdu Bazar Lahore, Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف ایڈیٹرز، لاہور

ابا جان مرحوم

کے

نام

(۱)

بر طیش اندییا

And (the people) shall look into the earth; and behold trouble and darkness, dimness of anguish; and they shall be driven to darkness.

ISAIAH

(۱)

سارا گاؤں مشکل سے سو گھروں پر مشتمل تھا۔ اس گاؤں کا نام روشن پور تھا۔ یہ راستے سے ہٹ کر واقع تھا اور کوئی کچی یا پکی سڑک بھی یہاں تک نہ آتی تھی۔ اس طرف کے دیہات میں آمد و رفت کا سلسلہ اکوں تانگوں پر یا پیدل چل کے طے ہوتا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں تھیں، جو کثرت سے ایک دوسری کو کاٹتی تھیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کچی یادداشت والے مسافر اور کہ بان غلط راستے پر پڑ جاتے تھے اور کسی اجنبی گاؤں میں پہنچ کر پریشانی اٹھاتے تھے۔ مگر یہ روز کی بات تھی اور گاؤں والوں کو ایسے مسافروں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ بعض اوقات ان لوگوں کو پہر دو پہر ستانے کے لئے کھاٹ اور پیاس بجھنے کے لئے لسی پانی بھی مل جاتا تھا۔

پگڈنڈیوں پر سارا دن سورج چمکا کرتا۔ دھوپ کی ماری ہوئی وہ بڑی مسکین اور صاف ستھری لیٹی رہتیں، مگر ان کی کمینگی اس وقت ظاہر ہوتی جب کوئی سواری ان کے اوپر سے گزرتی۔ تب وہ پگڈنڈیاں گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھاتیں، جو فضا میں دیر تک منڈلاتا رہتا اور دور و نزدیک جو بھی انسان، حیوان یا شجر اس کی زد میں آتا یکساں سب کی دل آزاری کا سبب بنتا۔ کسان مسافروں کو غلط رستے پر ڈال دینا اور گرد اڑا اڑا کر آس پاس کے جانداروں کو تنگ کرنا ان پگڈنڈیوں کے پاس اپنی بد حالی پر خاموش احتجاج کرنے کے دو موثر طریقے تھے۔ روشن پور جانے کے لئے آپ کو رانی کوٹ کے چھوٹے سے قصباتی اسٹیشن پر اتر کر ایسے ہی راستوں پر مغرب کی سمت دور تک چلنا پڑتا تھا۔ رستے میں آپ کو کتے ملتے۔ یہ ایسے ہی معمولی، آوارہ کتے تھے، جو ہر گاؤں میں ہوتے ہیں اور گاؤں والوں کی رائے یا خواہش کے بغیر ہی اپنے اوپر سارے گاؤں کی حفاظت اور دیکھ بھال کا ذمہ لے لیتے ہیں۔ یہ کتے عموماً قریب سے گزرنے والے مسافر کو بیرونی حملہ آور اور گاؤں کی سلامتی کے لئے سخت خطرے کا باعث سمجھتے، اپنے خدشات کا اعلان اونچی آواز میں بھونک بھونک کر کرتے۔ اور اس طرح مخالفت کا اظہار کرتے ہوئے اگلے گاؤں تک تعاقب جاری رکھتے، جہاں وہ آپ کو اپنے جیسے ہی معمولی اور شکی المزاج کتوں کے حوالے کر کے بہ اطمینان واپس لوٹتے۔ کمزور دل و دماغ رکھنے والے مسافر اکثر طیش میں آکر رک جاتے، انہیں کوستے، پتھر اٹھا اٹھا کر مارتے، پیچھے بھاگتے اور طرح طرح کی حرکتوں سے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے۔ لیکن طبع سلیم کے مالک لوگ کتوں کی نسبت اپنے وقار اور برتر حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے اور درگزر کر کے ٹھک جاتے۔ اس طرح چودہ کوس کی لمبی مسافت کے بعد گرد میں اٹے اور اکتائے ہوئے، تھک ہار کر آپ روشن پور پہنچتے۔ یہ گاؤں

نہر کے کنارے آباد تھا۔ نہر کا پانی یہاں کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ علاقائی طور پر اس گاؤں کی حیثیت، کم از کم رائے عامہ کے لحاظ سے، غیر مسلم تھی۔ ایک گروہ، جس کا سربراہ گاؤں کا سب سے عمر رسیدہ کسان احمد دین تھا، مدعی تھا کہ گاؤں صوبہ دلی میں، اور دوسرا گروہ جو سکھ کسان ہرنام سنگھ کی سربراہی میں تھا، دعویٰ کرتا تھا کہ گاؤں صوبہ پنجاب میں واقع ہے۔ اس بات پر اکثر چوپال میں مناظرے ہوا کرتے تھے۔ بہر حال یہ امر مسلم تھا کہ گاؤں ہر دو صوبہ جات کی مشترکہ سرحد پر کسی جگہ واقع تھا۔ اس گاؤں کی تہذیب بھی اسی دوئی کا نمونہ تھی۔ جو سکھ قوم کے افراد یہاں آباد تھے وہ پنجاب کے سکھ کسانوں کی طرح پہنتے کھاتے اور پنجابی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ ہندو اور مسلمان طبقہ یوپی کے کسانوں کی معاشرت کا روادار تھا۔ اس کے باوجود گاؤں کے دو ڈھائی سو افراد بڑے امن اور صلح جوئی کے ساتھ اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی زندگیاں بسر کر رہے تھے۔

روشن پور کی تاریخ مختصر اور رومانی تھی۔ اسے آباد ہوئے نصف صدی سے چند سال اوپر کا عرصہ ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اس علاقے کا سب سے کم عمر گاؤں تھا۔ یہاں ابھی اس نسل کے بھی کئی افراد بقیہ حیات تھے جس نے پہلے پہل آکر یہ گاؤں آباد کیا تھا۔ جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت دوسری اور تیسری نسل اس کی زمینوں کی کاشت کر رہی تھی۔ تاریخ کا سب سے مستند ذریعہ بہر حال بوڑھا کسان احمد دین تھا جو عین جوانی میں یہاں آکر بسا تھا، اور ان چند کنبوں میں سے تھا جنہوں نے غیر آباد زمین میں سے روشن پور کا گاؤں آباد کیا تھا۔ یہ تاریخی کہانی وہ اس طرح بیان کرتا تھا:

جب سن ستاون کا غدر مچا تو نواب روشن علی خان ضلع رہتک کے کلکٹر کے دفتر میں معمولی اہلکار تھے۔ (ظاہر ہے کہ اس وقت وہ نواب نہیں رہے ہوں گے۔) ڈل تک تعلیم یافتہ تھے اور اپنی شرافت کی وجہ سے دوست و اجباب اور گلی کوچہ میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں وہ اپنی والدہ اور نئی بیہتا بیوی کے ساتھ شہر کے ایک پرانے حصے میں رہتے تھے۔ جس روز شہر میں بغاوت کی آگ بھڑکی اور ہندوستانی سپاہی انگریزی افسروں کے خلاف ہتھیار لے کر اٹھ کھڑے ہوئے، اس روز شہر کے عوام میں بھی خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ کئی جگہ لوگ گلی محلوں میں اکٹھے ہو کر چھاؤنی سے آنے والی خبروں پر کان لگائے بیٹھے تھے، گویا سمجھنا غلطی ہوگی کہ وہ سب کے سب انگریزوں کے جانی دشمن تھے۔ رات پڑی تو سب شہری اپنے اپنے مکانوں میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔

شام کے قریب روشن علی خان نے اپنے ایک علیل دوست سے، جس کی مزاج پر سی کی خاطر وہ اس کے ہاں تشریف لے گئے تھے، اجازت حاصل کی اور گھر لوٹے۔ اپنی گلی سے پچھلی گلی کے اندر داخل ہوتے تھے کہ چند قدم آگے ایک بھاگتے ہوئے شخص پر نظر پڑی۔ دیکھتے

دیکھتے وہ سایہ لڑکھڑا کر گرا اور ساکن ہو گیا۔ انہیں تشویش ہوئی، تیزی سے بڑھ کر اس پر جھکے لیکن اندھیرے کی وجہ سے کچھ پہچان نہ پائے۔ پھر آوازیں دس، ٹٹولا، ناک کے آگے ہاتھ رکھ کر سانس کی روانی کو محسوس کیا اور صرف اتنا جان پائے کہ کوئی مصیبت کا مارا غش کھا گیا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے اٹھا کر کندھے پر لا دا اور چل پڑے۔ مضبوط آدمی تھے، ایک گلی آسانی سے چل کر پار کر لی۔ پر بے ہوش آدمی وزن دار ہوتا ہے، ایک جگہ جو کندھا بدلنے کو رکے تو کوئی سخت سی شے محسوس ہوئی۔ ٹٹول کر دیکھا تو اس شخص کی کمر کے ساتھ بندھا واٹپنچہ تھا۔ ساتھ ہی اُن کا ہاتھ خون سے لٹھڑ گیا۔ وہ زخمی بھی تھا۔ ان کا ماتھا ٹھنکا لیکن اسے اٹھائے ہوئے چلتے رہے۔

گھر پہنچ کر جو چراغ کی روشنی میں دیکھا تو یکلخت سرد پڑ گئے۔ ان کے سامنے سنہری بالوں والا ایک انگریز پڑا تھا، جو ہندوستانی دوکانداروں کے لباس میں تھا۔ اس کا چہرہ بے حد زرد اور سانس مدہم تھا۔ انہوں نے دوڑ کر دروازہ بند کیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔ سب سے پہلے گھر کی عورتوں کو پردے میں کر کے اس کا لباس تبدیل کیا اور ٹانگ کے زخم پر، جو تیز دھار آلے سے لکایا گیا تھا، پٹی باندھی۔ پھر اپنی ماں کو بلایا۔ پہلے تو اس نیک بی بی نے مریض کے فرنگی ہونے کی رو سے اس کے نزدیک آنے سے انکار کر دیا۔ مگر پھر روشن علی خان کے، اور اس کی بیوی کے، جو اس خوبصورت جوان کو کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر کافی غمزدہ تھی، منت سماجت کرنے سے اس کی دیکھ بھال کرنے پر رضامند ہو گئی۔ اس نیک بی بی کا مرحوم شوہر، یعنی روشن علی خان کا والد چھوٹا موٹا حکیم تھا اور گو اس کی وفات سے خاندان میں یہ پیشہ ختم ہو چکا تھا پر اس واسطے سے مرحوم کی بی بی کو، جو مرحوم سے زیادہ طویل العمر ثابت ہوئیں، کسی حد تک حکمت میں دخل تھا۔ بہر حال اس سفید فام مریض کے سلسلے میں ان لوگوں سے جو کچھ ہو سکا انہوں نے کیا۔

یکایک گلی میں شور اٹھا اور چند لمحوں کے اندر شور قیامت معلوم ہونے لگا۔ پھر روشن علی خان کے گھر کا دروازہ دھڑا دھڑا کوٹا جانے لگا۔ گھر کے مالک نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ہندوستانی سپاہیوں کی تنگی تلواریں اور برچھیوں کے پھل مشعلوں کی روشنی میں چمکتے نظر آئے۔ گلی میں ہر طرف ہا ہا کار مچی تھی اور سر ہی سر نظر آتے تھے۔ تھوڑی دیر تک اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو باغیوں نے دروازہ توڑنے کا فیصلہ کیا۔

اول اول تو محلے کے لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے رہے کہ جانے کس کی موت آئی ہے۔ پھر جب بات کھل گئی کہ اس غیض و غضب کا رخ محض روشن علی خان کے گھر کی جانب ہے تو چند سربراہ دبکے دیکھائے محلے اور کسی نہ کسی طور اس دروازے تک پہنچے جس کے توڑے جانے کی تجویز ہو رہی تھیں۔ وہاں پر انہیں جو بتایا گیا وہ یوں تھا: "کرنل جانسن، چھاؤنی کے

کمانڈنگ افسر ، بھیس بدل کر گھیرے میں سے بچ نکلے ہیں اور دلی پہنچنا چاہتے ہیں ۔ رستے میں چند سپاہیوں سے ان کی مٹھ بھیڑ بھی ہوئی لیکن وہ ان میں سے تین کو موت کی نیند سلا کر خود تلوار کا زخم کھا کر نکل آئے ہیں ۔ اب ان کے خون کی لکیر اس دروازے میں داخل ہوتی ہے انہیں ہمارے حوالے کیا جائے ، ورنہ درواہ توڑ کر گھر کے مکینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے

کا ۔ محلے کے سربراہوں نے ، کہ خود خوفزدہ تھے ، ہر قسم کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور باغیوں کے غصے کو فی الوقت ٹھنڈا کر کے کسی نہ کسی راستے سے مکان میں داخل ہوئے ۔ اب ہر ایک سربراہ اپنی اپنی پگڑی اتار کر روشن علی خان کے پیروں پہ رکھ رہا ہے ، منتیں کر رہا ہے ، دھکیاں اور گھرکیاں دے رہا ہے پر ہمت کا دھنی روشن علی خان اپنے اٹل فیصلے پر قائم ہے کہ جان جاتی ہے تو چلی جائے ، پر زخمی مہمان کو دشمنوں کے حوالے نہ کروں گا ۔

اس کے بعد کے واقعات کے سلسلے میں داستان گو کے بیان میں بڑی گڑبڑ تھی ۔ کبھی وہ کہتا کہ جب دروازہ توڑا گیا تو بہادر نوجوان نے ایک کندھے پر زخمی مہمان کو ، دوسرے پر اپنی بیوی کو بٹھایا اور لڑتا بھڑتا ہوا صحیح سلامت نکال لے گیا ۔ کچھ موقعوں پر اس نے یہ بھی بیان دیا تھا کہ چند مصلحتوں کی بنا پر باغی دروازہ توڑنے سے باز رہے مگر سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا اور رسد و رسائل کے تمام وسائل منقطع کر دیئے گئے ۔ یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا ، یہاں تک کہ اہالیان شہر پر فاقوں کی نوبت آگئی ۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ فرنگیوں کو فتح نصیب ہوئی اور محاصرین کو نجات ملی ۔ ایک حکایت یہ بھی تھی کہ روشن علی خان نے جب کوئی راہ فرار نہ دیکھی تو گھر کے فرش میں سرنگ لگانی شروع کی جو چھاؤنی میں جا نکلی ۔ اس راستے سے وہ کرنل جانسن اور اپنی بیوی کو نکال کر لے گیا ، اور بالآخر محلے کے سربراہوں کی رائے سے جب گھر کا دروازہ ایک دن توڑا گیا تو گھر میں صرف ایک بڑھی عورت کی لاش ملی ۔ یہ گھر کے مالک کی ماں تھی جو پہلے روز ہی صدمے کی وجہ سے راہی ملکِ عدم ہو گئی تھی ۔ قصہ مختصر یہ کہ سربراہوں اور باغیوں کو سخت پشیمانی کا سامنا کرنا پڑا ۔ ان حکایات کی صحت کی طرف توجہ دینے کی کسی کو ضرورت یوں محسوس نہ ہوتی کہ اس کے بعد داستان گو کے خیالات کی لڑی پھر سلجھ جاتی اور وہ کمالِ یکسوئی سے یوں گویا ہوتا : جب غدر کا خاتمہ ہوا اور باغی کیفردار کو پہنچے تو کرنل جانسن نے ، جو شاہِ انگلستان کے قریبی عزیزوں میں سے تھا ، روشن علی خان کو دلی دربار میں بلا بھیجا اور اپنے دستِ خاص سے خلعت عطا کی ۔ او رکہا کہ جاؤ اور جا کر جتنی زمین ، جہاں سے چاہو گھیر لو ، تمہیں عنایت کی جائے گی ۔ اس کے بعد اس فیاض انگریز حاکم نے ، جسے اردو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی ، ایک عجیب و غریب تقریب کے دوران (جس کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آئے گا) نواب روشن علی خان کو آغا کا لقب عطا کیا ۔

زمین گھیرنے کے متعلق دو روایتیں تھیں۔ ایک کے مطابق نواب صاحب نے گھوڑے پر سوار ہو کر چکر لگایا اور گھوڑے کی پونچھ کے ساتھ ایک شہد بھرا ٹین باندھ دیا جس کے پیندے میں سوراخ تھا۔ شہد ٹپکتا رہا اور کیڑے مکوڑے آکر اس پر جمع ہوتے گئے۔ اس طرح قدرتی حد بندی زمین کی ہو گئی۔ دوسری کے مطابق انہوں نے پیدل بھاگنا شروع کیا اور بانس کی کھچیاں راستے میں گاڑتے گئے۔ غروب آفتاب کے وقت جب واپس پہنچے تو بانس اکڑ گئی، پلٹ کر گرے اور مرتے مرتے بچے۔ اس سوال کے جواب میں بھی کہ رہائش کے لئے خاص طور پر اس علاقے کا انتخاب کیسے اور کیوں عمل میں آیا، کئی روایتیں مشہور تھیں جن کا بیان اس کتاب کے احاطے سے باہر ہے۔

اس ساری حکایت کے حرف بہ حرف صحیح ہونے کو یوں بھی عقل سلیم نہیں مانتی۔ پھر بھی مناسب کاٹ چھانٹ کے بعد اسے حقیقت سے قریب تر لایا جاسکتا ہے۔ یہ تو بہر حال سب کے دیکھے کی بات تھی کہ جب تک کرنل جانسن ہندوستان میں رہے ہمیشہ شکار کے لئے روشن پور آتے رہے، اور جب روشن آغا یورپ گئے تو انہیں کے پاس ٹھہرے اور فیض پایا۔ اس طرح روشن پور کی جاگیر، جو پانچ سو مربعوں پر محیط تھی، قیام میں آئی۔ واحد مالک روشن آغا تھے۔

روشن آغا اپنے معمولی پس منظر کے باوجود اس عظیم ذمہ داری کے پوری طرح اہل ثابت ہوئے جو اس پیش بہا خلعت اور جاگیر کی نوازش سے ان پر آپڑی تھی۔ آخر عمر میں انہوں نے یورپ کا سفر کیا اور اپنے بیٹے کو تعلیم کے لئے ولایت بھیجا، گو واپس لوٹ کر اس نے ایک ایسی حرکت کی جس سے انہیں سخت صدمہ پہنچا، یعنی اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک ایسے گھرانے کی لڑکی سے شادی کر لی جس کے آبائی پیشے کو شرفاء میں قطعاً قدر کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے بعد سے ان کا لڑکا ہمیشہ دلی کے روشن محل میں رہا۔ روشن محل وہ عالی شان مکان تھا جو روشن آغا نے رہائش کی خاطر دارالسلطنت میں تعمیر کرایا تھا۔

کاؤں کے وسط میں بڑی سی پکی حویلی تھی جس میں روشن آغا کئی برس تک رہے تھے۔ اس کے گردا گرد پچاس پچاس گز تک جگہ خالی پڑی تھی جہاں کسی وقت میں بڑا خوبصورت باغیچہ ہو گا، لیکن اب محض خشک پودے اور ٹنڈ ٹنڈ درخت کھڑے تھے کہ حویلی مدت سے خالی پڑی تھی۔ زندگی کے آخری برسوں میں روشن آغا نے اپنے بیٹے کو معاف کر دیا تھا اور جا کر روشن محل میں رہنے لگے تھے، جس سے کہ ان کے فرزند نواب غلام محی الدین خان کو دلی سکون اور مسرت میسر ہوئی تھی۔ اس حویلی کے علاوہ کاؤں کا دوسرا واحد پکا مکان کاؤں کے آخر پر واقع تھا۔ یہ مغلوں کا گھر تھا۔ مغلوں کے گھرانے کی کہانی اس طرح بیان کی جاتی تھی:

مرزا محمد بیگ اور نواب روشن علی خان کا گمنامی کے زمانے سے گہرا یارانہ چلا آتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ملازمت کے دوران دونوں ایک جگہ کام کرتے اور رہتے سہتے تھے۔ جب خداوند تعالیٰ نے اپنی بے نیازی میں روشن علی خان کو نیک نامی اور دنیوی جاہ و شہرت سے نوازا تو وہ اپنے دوست کو نہ بھولے اور ملازمت چھوڑوا کر اسے اپنے ہمراہ لیتے آئے۔ محمد بیگ کا خالص مغلوں کا خاندان تھا اور قدرت نے اس گھرانے کو وہ خوبصورتی عطا کی تھی جو خالص نسلوں میں پائی جاتی ہے اور بدقسمتی سے روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ بلکہ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ روشن علی خان محمد بیگ کی بیوی کے بے مثال حسن و جمال کے حد سے زیادہ مداح تھے اور یہی عقیدت تھی جس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنی ملکیت میں سے پچاس مربع زمین کے الگ کر کے اپنے عزیز دوست کو تحفہ دے دیں، اور اپنی جیب سے گاؤں میں پکا مکان بنا کر دیں۔ افواہ تھی کہ محمد بیگ کا بڑا بیٹا نیاز بیگ بھی روشن علی خان کے واسطے سے تھا۔ لیکن افواہوں کا کیا ہے، کہنے والے تو یہاں تک کہتے تھے کہ خود نواب روشن علی خان کی اکلوتی اولاد اُس فیاض اور عالی نسب انگریز کرنل کی بدولت تھی جو زخمی ہو کر چند دن ان کے ہاں مہمان رہا تھا اور جس کی وجہ سے روشن علی خان پر جان کی مصیبت آئی تھی۔ حالانکہ اس غیر ملکی کی عالی نسب اور شرافت کو منظر میں رکھا جائے تو عقل سلیم آسانی سے اس بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ ہم یہی سوچ کر بھی ان افواہوں کی پرزور تائید کرنے سے باز رہنے پر مجبور ہیں کہ اس زمانے کے بزرگ قطعی طور پر مخلص، وضع دار اور شفیق ہوا کرتے تھے۔

جتنا عرصہ مرزا محمد بیگ زندہ رہے بڑی خوش حالی کی زندگی بسر کرتے رہے، اور دونوں کنبوں کی آپس میں محبت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ محمد بیگ محنتی آدمی تھے اور صنعت و حرفت میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ زمیندارے کے ساتھ ساتھ انہوں نے گھر میں لوہے کے کام کی دکان کھول لی کہ ان وقتوں میں ایسے پیشے اختیار کرنے کو عار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ گو مرزا محمد بیگ کے لئے یہ کام پیشہ کم اور ہنر مندی کے شوق والی بات زیادہ تھی۔ اسی طرح سلوک اور محبت کے ساتھ وقت گزرتا جا رہا تھا کہ اچانک محمد بیگ کو عین جوانی کے عالم میں، جبکہ وہ ابھی پورے پینتیس برس کے بھی نہ ہوئے تھے، موت نے آدھوچا اور انہوں نے ایک بڑی پرسکون اور خوش نما زندگی گزارنے کے بعد جان جان آفریں کے سپرد کی۔ ان کی پراسرار بیماری اور موت کے متعلق بھی کئی افواہیں مشہور ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا ہماری کہانی کے ساتھ کوئی براہ راست تعلق نہیں ہم اس طرف زیادہ توجہ نہ دیں گے۔

مرزا محمد بیگ کی وفات کے بعد ان کے بیوی اور بچے نواب صاحب کی خاص شفقت اور نگرانی میں پرورش پاتے رہے۔ بڑا لڑکا نیاز بیگ پورے قد کا، بڑا گہرو خوبصورت جوان نکلا اور باپ کے زمیندارے اور ہنر مندی کے شوق ورثے میں پائے۔ وہ عمر بھر گاؤں میں رہا اور

یہی کام کرتا رہا۔ اس کی ماں نے اس کی شادی اپنے جیسے ایک خالص مغل گھرانے میں کی اور بڑی خوبصورت اور خوب سیرت بہو بیباہ کر لائی۔ شادی کے پندرہ سال بعد خدا نے اسے بیٹا عطا کیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ نیاز بیگ کی ماں نے پوتے کی پیدائش کا اتنی شدت اور اتنے شوق سے انتظار کیا تھا کہ اتنے لمبے عرصے کے بعد اس اچانک خوشی سے جو صدمہ پہنچا اس سے وہ جانبر نہ ہو سکی۔ ماں کے مرنے کے بعد نیاز بیگ نے ایک اور عورت کو گھر میں ڈال لیا۔ یہ دوسری عورت کسی نیچ ذات سے تھی۔

چھوٹا بیٹا نیاز بیگ پانچ سال تک سکول میں پڑھنے کی خاطر جاتا رہا کہ اسے پڑھائی کرنے کا شوق تھا۔ پھر اچانک اس کا اس کام سے جی اٹھ گیا اور وہ گھر سے بھاگ کر ریلوے کے محکمے میں ملازم ہو گیا۔ اس کے کئی سال بعد وہ گاؤں لوٹا۔

پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی وجہ سے اس گھرانے کے خوشگوار دن یکلخت غائب ہو گئے۔ نیاز بیگ کو حکومت کے خلاف کسی جرم کے الزام میں پکڑ لیا گیا اور چند روزہ عدالتی کارروائی کے بعد بارہ برس قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ وہ چند دن، جب مغلوں کے اس باعزت کنبے پر بد قسمتی وارد ہوئی تھی ابھی تک گاؤں والوں کے حافظے میں محفوظ تھے، اور اس کا ذکر کرتے ہوئے اب بھی لوگ آواز نیچی کر لیتے تھے اور رنج سے سر ہلانے لگتے تھے۔ حکومت نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ ان دونوں بھائیوں کی زیادہ تر زمین ضبط کر لی، اور تھوڑی سی جائیداد، جس پر نیاز بیگ کی دونوں بیویوں کا بمشکل گزارہ چل سکتا تھا، چھوڑ دی۔ اب اکیلی رہتی ہوئی وہ دونوں عورتیں بڑی عسرت اور تنگی میں بڑھاپے کا انتظار کرنے لگیں۔ اس طرح گاؤں کے اس اکلوتے آزاد گھرانے پر قدرت کی طرف سے بد بختی اور ذلت نازل ہوئی۔

چھوٹے بھائی نیاز بیگ نے اس واقعے سے بد دل ہو کر گاؤں چھوڑ دیے۔ لیکن جاتے ہوئے وہ نیاز بیگ کے لڑکے نعیم کو، جو اپنے باپ کے جیل جانے کے وقت تین سال کا تھا، اپنے ساتھ لیتا گیا۔ اسے اپنے بھتیجے سے بڑی محبت تھی۔ نیاز بیگ معمولی تعلیم و تربیت کے باوجود اس خدا داد ذہانت اور صلاحیت کا مالک تھا جس کے بل پر بہت سے معمولی آدمیوں نے دنیا میں ناموری پائی ہے۔ اس کا اس نے پورا فائدہ اٹھایا اور عمارتی تعمیر کے کام میں کمال فن حاصل کیا۔ ہوتے ہوتے وہ کلکتے کی ایک مشہور تعمیری فرم میں انجینیئر کے عہدے تک جا پہنچا۔ اس نے تمام عمر شادی نہ کی۔ تنہا ہی پسند اور ستھرے مذاق کا آدمی تھا۔ بہت روپیہ کمایا لیکن کبھی گاؤں نہ لوٹا۔ نعیم کو اس نے بہترین انگریزی سکولوں میں تعلیم دلائی اور ساری امیدیں اس کے ساتھ وابستہ کر دیں۔

روشن پور کا ہماری کہانی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لیکن ابتدائی چند یوم آپ کو دارالسلطنت دلی میں بسر کرنے ہوں گے کہ اس زمانے میں، جس زمانے سے ہم نے کہانی کی

ابتدا کرنے کا فیصلہ کیا ہے ، سارے اہم افراد وہاں پر جمع تھے ۔
 اور یہ وہ زمانہ تھا جب نواب روشن علی خان آف روشن پور اسی برس کی عمر پا کر حال ہی
 میں فوت ہوئے تھے ، اور ہندوستان کی آزادی کی جنگ ابتدائی مرحلوں میں تھی ۔

(۲)

کوئینز روڈ کے آخر میں روشن محل تھا ۔ یہ ایک قدیم وضع کی وسیع ، دو منزلہ کوٹھی
 تھی ۔ آگے کرزن روڈ شروع ہوتی تھی ۔

ان کو دور ہی سے آج کے دن کی پھل پہل دکھائی دے گئی ۔ پھانک پر کاغذی جھنڈیاں
 اور رنگ برنگ بجلی کے مقمے لٹک رہے تھے ۔ پہلی سے اترے تو انہوں نے دیکھا کہ لمبی ڈرائیور
 پر ، جو سامنے والے برآمدے تک جاتی تھی ، تازہ سرخ بھری پچھائی گئی تھی اور دونوں اطراف
 چونے کی متوازی لکیریں لگی تھیں ۔ برآمدے میں دو میزیں پڑی تھیں ۔ ایک پر میز پوش تھم
 کئے رکھے تھے ، دوسری کے گرد بہت سارے لڑکے لڑکیاں کھڑے نیپکن بنا رہے تھے ۔
 برآمدے کے سامنے وسیع لان میں میزیں اور کرسیاں لگائی جا رہی تھیں ۔ دن کی روشنی ابھی باقی
 تھی مگر برآمدے اور باغ میں مقمے جل رہے تھے ۔ صرف برآمدے میں شور تھا جہاں میز کے
 گرد خوش پوش اور تندرست لڑکے لڑکیاں جمع ہو کر کام کر رہے تھے ۔ سبزے پر نوکر سفید
 وردیاں پہنے خاموشی سے ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے ۔

ایاز بیگ اور نعیم جب برآمدے میں چڑھے تو سامنے سے بھوری آنکھوں والی ایک نو عمر
 لڑکی جارحانہ انداز میں نکلی ۔

”چچا ۔ ۔“ وہ ٹھٹک کر اونچی آواز میں بولی ، ”تسلیم ۔ بابا بیٹھے ہیں ۔ آپ چلیے اندر ،
 ہم لوگ نیپکن بنا رہے ہیں ۔ ابھی تو ۔ ۔“ وہ گھڑی دیکھتی ہوئی جا کر نو عمروں کے اس گروہ
 میں شامل ہو گئی ۔ نعیم ان کی طرف متوجہ تھا ۔ ان کی اوسط عمر نعیم کی عمر کے لگ بھگ تھی ۔
 ”دیکھو عذرا ، پرویز الٹی طرف سے بنا رہا ہے اور کہتا ہے کہ یہی سیدھا ہے“ ۔ پہلی لڑکی

سے ایک دوسری لڑکی ، جو سرخ ریشمی لباس میں تھی ، بولی ۔

بھوری آنکھوں والی لڑکی نے جا کر اسی جارحانہ انداز میں سب سے لمبے اور بڑی عمر کے
 لڑکے کا نیپکن کھول دیا ۔ ”غلط ۔ بالکل غلط ۔“ وہ بولی ۔ اس کے بھورے رنگ کے لمبے بال
 ہوا میں اڑ رہے تھے اور گردن کی سفید جلد دکھائی دے رہے تھی ۔ ”دیکھو بھٹی سب لوگو ۔“
 اس نے چلا کر کہا ، ”پرویز یوں بناتا ہے ۔ ۔“ اور رومال کو بے ترتیبی سے گول مول پیٹ

دیا جسے دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔

”یوں تو مولانا سر پر باندھ کے نماز پڑھاتے ہیں۔“ ایک موٹا سا سفید رنگت والا لڑکا بولا۔ قہقہوں کا شور بلند ہوا۔ بھوری آنکھوں والی لڑکی سر پیچھے پھینک کر ہنس رہی تھی جس سے گردن کی پشت پر سفید، صحت مند جلد اٹھی ہو کر ابھر آئی تھی اور گلے پر تنگ فراک گوشت میں دھنسا جا رہا تھا۔ اس کا گہرا سرخ چہرہ ایک پاگل ہنسی میں مبتلا ہوا تھا، نرخرہ کپکپا رہا تھا اور آنکھوں میں پانی آگیا تھا۔

پرویز متذہب کھڑا سب کا منہ دیکھتا رہا، پھر بہت گہرا جھینپ گیا۔ ”میں کوئی لڑکی تھوڑا ہوں۔ یہ تو لڑکیوں کا کام ہے۔ یا بیروں کا۔“ ہنسی تیز ہو گئی۔

اپنے آپ کو اجنبی فضا میں پا کر نعیم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا، مگر جی کھول کر ہنستے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بے تکلفی، سادگی اور برابری کا جو احساس ہوتا ہے اس کی وجہ سے اس کا جی چاہا کہ وہ بھی جا کر ان میں شامل ہو جائے۔ اسی وقت وہ ایاز بیگ کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔

کمرہ نشست میں داخل ہو کر جس پر سب سے پہلے نعیم کی نظر پڑی وہ گھر کا مالک تھا۔ نواب غلام محی الدین ایک کونے میں بڑی سی میز پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

”آئیے آئیے۔“ وہ بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر بولے۔ ”میں اتنی جلد آپ کا متوقع نہیں تھا۔ کب آئے؟“

”آج صبح۔“ ایاز بیگ نے بہت جھک کر مصافحہ کیا۔ اپنے چچا کو اتنی انکساری کے ساتھ کسی سے ملتے ہوئے نعیم نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ نواب صاحب کے چہرے پر سب سے نمایاں شے ان کی ناک تھی جو اونچی اور نوک دار تھی اور انہیں مردانہ شکل و صورت عطا کرتی تھی۔

”افسوس ہے روشن آغا کی وفات پر حاضر نہ ہو سکا۔ ملازمت کا سلسلہ ہے۔“ ایاز بیگ نے کہا۔ ”آپ تو بڑے فرض شناس افسر ہیں۔ ٹھیک ہے، کام وام کرتا ہی آدمی اچھا لگتا ہے۔ ہماری بھی کوئی زندگی ہے۔“ انہوں نے شرارت بھری معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو پرانے خاندانی لوگوں کا حصہ ہوتی ہے۔

”بچا فرمایا۔ بچا فرمایا۔“ ایاز بیگ ہاتھ ملتے ہوئے خوش دلی سے بولے۔ دونوں دوستوں کی آنکھوں میں چمک تھی۔ پھر وہ نعیم کی طرف متوجہ ہوئے: ”یہ صاحب زادے۔“

نعیم نے ایاز بیگ کی تقلید میں بہت جھک کر مصافحہ کیا جس سے اس کی ٹوپنی کا پھند نواب صاحب کے ہاتھ کی پشت سے جالکا۔

”بھتیجا ہے۔“

”اوہ۔ میں سمجھا۔“ وہ غور سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ آہستہ آہستہ ان کے چہرے

پر سنجیدگی کی سختی پیدا ہونے لگی۔ تینوں آدمیوں کے درمیان عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ ایاز میگ کا چہرہ بے حد اداس ہو گیا۔ نواب صاحب کے ماتھے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی رگ ابھر آئی۔ باریک ریشمی گاؤن پہنے وہ اپنے مضبوط چہرے پر وحشیانہ قوت سے بھرپور شبیہ لٹے سیدھے بیٹھے رہے، پھر اچانک انہوں نے پہلو بدلا اور آہستہ آہستہ کہنے لگے:

”میں دیکھ رہا تھا۔ ان کی شکل نیاز میگ سے ملتی ہے۔ خوبصورت آدمی تھا۔ واپس آگیا ہے؟“

”جی ہاں۔“

”کے سال بعد؟“

”بارہ۔“

”اوہ۔“ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ”پڑھتا ہے؟“

”کلکتے میں۔ اس سال سینٹر کیمبرج کیا ہے۔“ ایاز میگ نے بتایا۔

”ہوں۔ آپ نیاز میگ سے ملے؟“

”نہیں۔“

”میں گے؟“

”نہیں۔“

دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر ایاز میگ نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا:

”آج تو کافی رونق ہوگی۔“

”امید تو ہے۔ نواب صاحب کی سنجیدگی دور ہو گئی۔“ چیف کمشنر آئیں گے۔ گو کھلے

بھی شہر میں ہیں، شائد آجائیں۔ اور آپ کی اپنی بیسنٹ بھی آرہی ہیں، ذرا تیار رہیے گا۔

آپ بھی بڑے زوردار تھیوسوفسٹ ہیں۔“ پھر انہوں نے ایاز میگ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

غور سے دیکھا۔ ”بوڑھے ہو گئے ہو۔“

”وقت سب کو بوڑھا کر دیتا ہے۔“ ایاز میگ نے مسکرا کر کہا۔

نعیم بہت بے چین بیٹھا تھا۔ اپنے باپ کا ذکر اس نے بہت کم سنا تھا اور یہ منظر جو

آج اس نے دیکھا، اور محسوس کیا، بالکل نیا تھا۔ موضوع کی تبدیلی سے اسے کافی تسکین ہوئی

اور وہ غور سے اپنے میزبان کو دیکھنے لگا۔

نواب صاحب چالیس کے لگ بھگ اور بہت صحت مند تھے۔ چشمہ ان کی ناک میں گہرا

پھنسا ہوا اور کال شیٹے سے اوپر ابھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں گہری اور جبرے اور ٹھوڑی اور سر

کی ہڈی مضبوط اور چوڑی تھی۔ ان کے ہاتھ نازک اور خوش نما تھے۔ معمولی ناک نقشے کے

باوجود ان کے چہرے پر وہ نرمی اور خوش شکلی تھی جو پر آسائش زندگی کا پتہ دیتی ہے۔ گفتگو

کرتے ہوئے وہ ایک ہاتھ کو بڑے دلکش انداز میں حرکت دیتے تھے۔
 کمرہ بڑے قرینے سے سجا تھا۔ نعیم کے عین پیچھے ایک بھس بھرا شیر کھڑا تھا جو خطرناک
 حد تک زندہ دکھائی دے رہا تھا۔ چاروں کونوں میں اونچے اونچے فرشی لیمپ روشن تھے۔
 کھڑکیوں پر بھاری پردے اور فرش پر دیز بے آواز قالین پڑے تھے۔ برآمدے کے شور کے
 مقابلے میں اندر گہری خاموشی اور سکون تھا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ دروازوں کھڑکیوں
 کی درزیں فلالمین کی تھوں سے بند کی گئی تھیں۔

پھر ان کا میزبان اٹھا اور تھوڑی دیر تک لان پر ملنے کا وعدہ کر کے اندر کے کمروں کی
 طرف چلا گیا۔

باہر آکر نعیم نے دیکھا کہ نیپکن ساری میزوں پر رکھے تھے اور سفید وردیوں والے میرے
 آخری انتظامات میں مصروف تھے۔ اور کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھانک کے بغل والے دوسرے
 لان میں بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایاز بیگ نے کونے میں ایک کرسی کھسیٹی اور کیمبرہ نکال کر
 رات کو تصویریں لینے کے لئے اسے تیار کرنے لگے۔

نعیم ادھر ادھر پھرنے لگا۔ اس وقت اندر سے وہی لڑکے لڑکیاں باتیں کرتے نکلے اور
 ادھر ادھر پھیل گئے۔

لبے لڑکے نے تمیز سے جھک کر ایاز بیگ کو سلام کیا۔ پھر وہ نعیم کی طرف آیا۔
 ”آپ کلکتے سے آئے ہیں نا؟“
 ”جی ہاں۔“

”میں پرویز ہوں۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ”یہ۔ ہمارا گھر ہے۔“
 نعیم نے ہاتھ ملایا اور خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ ایک تنہا اور بے خطر پرورش کے
 طفیل یہ اس کا قدرتی، بے زبان انداز گفتگو بن چکا تھا۔
 ”آئیے ادھر چلیں۔“ پرویز نے کہا۔

ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب انہوں نے کھلنڈروں والا
 لباس اتار کر تقریبی لباس پہن لیا تھا اور زیادہ ذمہ دار دکھائی دے رہے تھے۔

”یہ۔ یہ۔ کلکتے سے آئے ہیں۔“ پرویز نے سہٹا کر کہا، ”اور یہ میری بہن عذرا
 ہے۔ یہ سب ہمارے بہن بھائی ہیں۔“

نعیم گھبراہٹ میں اپنی لمبی سرخ ٹوپی لے پھندنے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔
 ”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بیٹھیے۔“ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔
 ”آپ بولتے بالکل نہیں ہیں؟“ عذرا نے اپنی بھوری آنکھیں نچا کر اسی بے تکلفی سے

پوچھا۔

”جی - جی نہیں تو -“ سب لوگ سادگی سے مسکرائے -

”آپ نے نام نہیں بتایا اپنا -“

”نعیم -“

”اوہ - کس قدر خوبصورت نام ہے -“ ایک پتلے سے لڑکے نے انگریزی میں کہا -
ان کا کھلنڈرا پن اور شور و شغب سب ختم ہو چکا تھا - گو ان کی آنکھوں میں تمسخر کی
جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی -

صرف عذرا اسی جارحانہ انداز میں باتیں کر رہی تھی - اب اس نے سفید ریشم کی ساڑھی
باندھ رکھی تھی اور دیکھنے میں کافی بڑی اور سمجھدار لگ رہی تھی -
”آپ کو نیپکن بنانا آتا ہے؟“

”نہیں -“

”دراصل آج ہمیں پتہ چلا کہ ہم میں سے آدھے لوگوں کو نہیں آتا -“

”عذرا یہ تو غلط بات ہے -“ پتلا لڑکا انگریزی میں بولا ، ”اب تم کہو گی ہمیں ساڑھی
باندھنا نہیں آتا تو یہ بھلا کیا بات ہوئی -“ سب لوگ چپکے سے ہنسے -

کچھ دیر تک وہ اسی طرح باتیں کرتے رہے - پھر مہمان آنا شروع ہو گئے - ایاز بیگ
نے نعیم کو پکارا اور وہ جا کر کیمرے میں فلم چڑھانے میں ان کی مدد کرنے لگا - آدھ گھنٹہ کے
بعد کیمرہ درست ہوا -

اب کافی مہمان آچکے تھے - نواب صاحب اور ادھیڑ عمر کی ایک خوبصورت عورت دروازے
میں کھڑے ان کا استقبال کر رہے تھے - عذرا بھی پاس کھڑی تھی - پرویز اور گروہ کے دوسرے
افراد مہمانوں کے درمیان ادھر ادھر پھر رہے تھے - ابھی تک جو لوگ آچکے تھے ان میں زیادہ تر
غیر ملکی تھے - چند ایک نے اونچے سیاہ ہیٹ اور ٹیل کوٹ پہن رکھے تھے - باقی نے ، جو زیادہ
تر نوجوان طبقہ تھا ، شام کا سیاہ چست لباس پہن رکھا تھا اور سر سے تنگے تھے - تقریباً سبھی
خاموش بیٹھے سگریٹ اور موٹے موٹے سگار پی رہے تھے - عورتوں نے بند گلے کے چست
فراک پہن رکھے تھے - اب ہندوستانی مہمان آ رہے تھے - وہ مختلف قسم کے لباس میں -
تھے - مسلمان پھندنے والی سرخ ٹوپییوں اور لمبے لمبے چوغوں میں تھے - کچھ لوگ شیروانیوں
میں بھی تھے جن سے ان کے قوم و مذہب کا پتہ چلانا دشوار تھا کہ ہندوستان میں اب ہندو مسلم
عیسائی سب نے شیروانیاں پہننی شروع کر دی تھیں - البتہ ہندو اپنی ڈھیلی اڑنگ دھوتیوں اور
بڑی بڑی سفید پگڑیوں سے پہچانے جا سکتے تھے -

وہ دو دو اور چار چار گھوڑوں والی بہلیوں میں آ رہے تھے - صرف انگریز مہمان اور چند
ہندوستانی موٹروں پر آئے تھے - وہ پھاٹک پر نواب صاحب اور ان کی ساتھی عورت کے ساتھ

اخلاق سے جھک کر ہاتھ ملاتے یا دور سے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے اور جا کر خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ انگریز سب ایک طرف بیٹھے تھے، ہندوستانی دوسری طرف۔ غیر ملکیوں نے اپنی اپنی ٹوپیاں اور سکارف آتے ہی خادموں کے حوالے کر دیے تھے۔ ہندوستانی ٹوپیاں پہنے، چھڑیاں ہاتھوں میں تھامے بیٹھے تھے۔

ایک ہندوستانی زرق برق شیروانی اور پگڑی پہنے موٹر سے اترا۔ ساتھ ایک نوجوان انگریزی لباس میں تھا۔ نواب صاحب بہت نیچے جھک کر ملے۔ کسی نے کہا مہاراج کمار پرتاپ گڑھ میں ہیں، ہمراہ غالباً سیکرٹری تھے۔ وہ واحد ہندوستانی تھے جو آکر انگریزوں میں بیٹھے۔ انہوں نے اپنی چھڑی بھی خادم کے حوالے کر دی۔

پھر گوکھلے آئے جس پر تمام ہندوستانی اور چند انگریز اٹھ کھڑے ہوئے اور جھک جھک کر ملے۔ ایاز بیگ نے جب ان کا نام لیا تو نعیم چونک کر اٹھا اور قریب جا کھڑا ہوا۔ گوکھلے کا نام اس نے بہت سن رکھا تھا مگر دیکھنے کا آج پہلی بار موقع ملا تھا۔ انہوں نے پتلون کے اوپر بند گلے کا بڑے بڑے کالروں والا ہاف کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر ٹوپی لٹے ہوئے تھے (اس قسم کی ٹوپی نعیم نے کلکتے میں تلک کو بھی پہنے دیکھا تھا)، گلے میں لمبا سا مفلر تھا۔ سنہرے فریم کا چشمہ لگائے اکہرے چشم کا یہ آدمی خوبصورت کہلایا جاسکتا تھا، گو بہت کمزور تھا نعیم نے اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے وقت عجیب سی کیفیت محسوس کی۔

پھر ڈاکٹر اینی بیسنٹ آئیں جن کا نام نعیم نے ایاز بیگ کی زبانی اکثر سنا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کے ایک گروپ میں جا کر بیٹھ گئیں۔ خدام مہمانوں کو پھلوں کا رس پیش کرنے لگے۔

انار کے ایک پودے کے نیچے نعیم کھڑا تھا۔ پتوں میں چھپے ہوئے بلب کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

”ہلو۔ آپ نے پھلوں کا رس پیا؟“ عذرا اس کے پیچھے سے مہل کر بولی۔

”نہیں۔“

”لیجیے۔“ اس نے گلاس نعیم کے ہاتھ میں تھما دیا جو اس نے فوراً لبوں سے لکا لیا۔

”سب مہمان آگئے؟“ بہت سوچ کر اس نے بات کی۔

”تقریباً۔“ عذرا نے تمسخر اور سادگی کے عجیب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ نعیم نے

محسوس کیا کہ سائے میں اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا سیاہ ہو گیا تھا۔ اس نے گلاس میں سے دو بڑے بڑے کھونٹ لٹے۔

”آپ ٹوپی بالکل نہیں اتارتے؟“

وہ گھبرا کر ٹوپنی اور پھندے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
”اتار دیجیے۔“

اس نے جلدی سے ٹوپنی اتار دی۔

”یہ۔ بٹن کھول دیجیے۔“ عذرا نے اٹھکی سے اس کے گلے کی طرف اشارہ کیا۔ جب وہ اوپر کے دو چار بٹن کھول چکا تو دفعتاً وہ بہت گہری جھینپ گئی۔ ”میرا مطلب ہے صرف یہ کہ۔ آپ کو گرمی محسوس نہیں ہوتی شيروانی میں؟“
”نہیں۔“

”یوں بھی۔ دیکھیے یہ ہمارے مٹر پھول سوکھ گئے ہیں۔ آخر اپریل تک ان کی بہار ہوتی ہے۔“ اس کا چہرہ ابھی تک سُرخ ہو رہا تھا۔ نعیم کو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ وہ کوئی غیر معمولی شے نہیں بلکہ عام سی لڑکی تھی، بالکل جس طرح کا وہ خود تھا۔ جلد ہی وہ اس کے سحر میں سے نکل آیا۔ عذرا نے ہاتھ بڑھا کر ہولی ہوکس کا ایک گلابی پھول توڑا۔
”آج کل ان کی بہار ہے۔ مجھے اندر جانا ہے، آپ بیٹھیے۔“ اس نے کہا۔ اندھیرے کی طرف جاتی ہوئی وہ ایک بڑی عمر کی سنجیدہ عورت کی طرح چل رہی تھی۔ نعیم نے اسے برآمدے میں غائب ہوتے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر چند خشک مٹر پھول توڑے۔ وہ کھڑکھڑا کر ٹوٹے اور بکھر گئے۔

مہمانوں کی ٹولیوں میں گفتگو بڑے زور شور سے شروع ہو چکی تھی۔ سامنے تین انگریز بیٹھے چوتھے کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ یہ چوتھا، جس کا سیاہ ہیٹ نیچے گھاس پر پڑا تھا، ادھیڑ عمر کا بڑے سے سر والا شخص تھا، اور بڑی محویت سے ڈرامائی انداز میں ہاتھ ہلا کر کوئی قصہ بیان کر رہا تھا۔ نعیم آگے بڑھا۔ ایک لمبے صوفے پر مہاراج کمار پر تاپ گڑھ چیف کمشنر کے ساتھ بیٹھے تاش کے پتے بانٹ رہے تھے۔

”تاش کے لئے یہ موزوں وقت تو نہیں مسٹر۔۔۔، پر میں آپ کو سکھانے کے لئے بہت بے تاب ہوں۔ ایسا عجیب و غریب کھیل ہے جو یہاں پر کسی کو نہ آتا ہو گا۔ گزشتہ ماہ میں نے پیرس میں ایک خاتون سے سیکھا تھا۔“ انہوں نے پتوں کی تقسیم سے غیر مطمئن ہو کر تاش اپنے سیکرٹری کو پکڑائے اور خود چیف کمشنر کو کھیل کے ابتدائی اصول سمجھانے لگے۔ ساتھ بیٹھی ایک انگریز خاتون بھی دلچسپی لینے لگی۔ سیکرٹری ماہر فن کی طرح تاش لگا رہا تھا۔

جب نعیم گملوں کی اس قطار کے ساتھ ساتھ، جن میں موسم گرما کے پھول کی پنیری لگی تھی، مہاراج کمار کے صوفے کے پیچھے سے گزرا تو وہ پتے ترتیب وار لگاتے ہوئے اچانک رک کر بولے:

”پیرس میں میں نے دیکھا مسٹر۔۔۔ کہ جس ہوٹل میں میں ٹھہرا وہاں عجیب رواج

تھا۔ وہ پیرس کا سب سے بڑا ہوٹل تھا، اور ہر ایک ”سوئٹ“ کے ساتھ دو دو غسل خانے تھے۔ کیا ہوا کہ صبح صبح میں نہانے کے لئے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے والے ”سوئٹ“ سے ایک صاحب تنگ دھڑنگ، کمر کو تولنے سے پونچھتے نکلے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر کہا: ”اوہ، معاف کیجیے“۔ اور واپس چلا آیا۔ وہ صاحب جواب دیے بغیر نکل گئے۔ انگریز خاتون سرخ ہو گئیں۔ ”انگریزی بہت کم سمجھتے ہیں وہاں پر۔“ وہ جلدی سے بولیں۔

”جی ہاں“ راج کمار نے بے حد اخلاق سے کہا، ”بڑی دقت ہوتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ فرانس کا ساحل آپ سے صرف تیس میل دور ہے۔“

”درست ہے۔ بالکل درست۔“ خاتون نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ”حیرت کی بات تو ہے۔“

”اچھا تو مسٹر۔۔۔“ مہاراج کمار نے بہر حال بات جاری رکھی۔ ”دوسرے دن پھر یہی حرکت ہوئی۔ اب کے کوئی دوسرے صاحب تھے۔ میں بھی ڈھٹائی سے سامنے دیکھتا ہوا پاس سے گزر گیا۔ لیکن آگے نکلنے پر میں ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھنے سے باز نہ رہ سکا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خاتون بڑی بے خبری اور لا تعلقی سے میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہیں۔ اس کے بعد میں پیرس کا عادی ہو گیا۔“

چیف کمشنر ہولے سے مسکرائے۔ سیکرٹری کے پاس جو نوجوان انگریز بیٹھا تھا، آگے جھک کر بولا: ”بھئی پیرس کی عورتیں ہندوستانی عورتوں کی طرح تھوڑا ہوتی ہیں۔“

”ہاں جی“ مہاراج کمار نے سوچتے ہوئے کہا، ”بڑی محنتی عورتیں ہوتی ہیں۔“

اس پر زبردست قہقہہ پڑا۔ سب جی کھول کر بنے۔ چیف کمشنر مسکرائے اور اپنے بے حد وسیع ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ مہاراج کمار پھر سے پتے تقسیم کرنے لگے صرف وہی ایک شخص تھے جو انگریزوں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔

آگے دو بڑی بڑی پکڑیوں اور دھوتیوں والے ہندو تاجر بیٹھے تجارت کی باتیں کر رہے تھے۔ مجمع کے اوپر سے نعیم نے دوسری طرف دیکھا۔ تین انگریزوں کو قصہ سنانے والا انگریز اب اٹھ کر ان کرسیوں کے آگے اس طرح پھر رہا تھا جیسے جنگلی جانور پنجرے میں چکر لگاتا ہے، اور اسی انہماک سے بول رہا تھا۔ پھانک کے اندر جو کارس کھڑی تھیں ان کا نظارہ کرنے کے لئے چند بچے اور نچلے طبقے کے لوگ سڑک پر جمع ہو گئے تھے۔ چیف کمشنر کے ہمراہ آئے ہوئے سپاہی انہیں بید مار مار کر بھگا رہے تھے۔ لیکن وہ ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ جا کھڑے ہوتے۔ مٹی کے شفاف آسمان پر اب مکمل تاریکی تھی، اور ستارے تھے۔ رات گرم تھی اور درختوں میں رنگین ققمے روشن تھے۔ اگلے صوفے پر اسے ایاز بیگ دکھائی دیے جو ڈاکٹر اپنی

بیسنٹ کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں ایک اور شخص، بہت صاف رنگت اور سیاہ بالوں والا، بھی شامل تھا۔ نعیم اپنے چچا کے پاس خالی جگہ پر بیٹھ گیا۔

”لیکن مسٹریگ، اس بات پر میں میڈم بلیوٹسکی سے متفق نہیں ہوں۔“ اپنی بیسنٹ کہہ رہی تھیں۔ ”وہ کہتی ہیں کہ ستاروں کی دنیا میں جو وجود ہیں وہ محض روحیں ہیں اور یہ کہ وہ مادی نہیں ہیں، اور وہ انہیں مابعدالطبیعیاتی طور پر ثابت کرنا چاہتی ہیں۔ میں کہتی ہوں کہ وہ باقاعدہ طور پر اجسام ہیں اور مادی ہیں اور طبیعیاتی طور پر اس کا ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہ طبیعیات کے اطلاق سے ”تھیوسوفی“ کی تھیوری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔“

”لیکن اس بات کا جواب پچھلی اپریل میں میں نے آپ کو خط میں بھی دیا تھا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تھیوسوفی پر سائنس کو صادر کیا جاسکے۔“ ایاز بیگ بولے

”سائنس کے قانون کو ’صادر‘ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ اپنی بیسنٹ نے اپنے دل کش لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”صادر کرنا اور بات ہے اور۔۔۔“

نعیم نے اکتا کر سننا چھوڑ دیا۔ اس کی سمجھ میں اس گفتگو کا ایک لفظ نہ آیا تھا، لیکن وہ مسز بیسنٹ پر سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ اس کے سر پر برف ایسے سفید بالوں کی ٹوپی سی بنی ہوئی تھی۔ اور اسکی آواز، نعیم نے سوچا، شائد دنیا کی خوبصورت ترین آواز تھی۔ اپنی عمر کے باوجود وہ بڑی پرکشش عورت تھی۔

دل میں وہ سوچے بیٹھا تھا۔ عذرا کے جانے کے بعد کسی نے اس سے بات نہ کی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ مختصر ملاقات اور اس کے جارحانہ انداز سے وہ جھلا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے دل پر لڑکپن کی اداسی اتر آئی اور ارد گرد باتیں کرتے ہوئے اور باتیں سنتے ہوئے تمام آدمیوں کو وہ خاموش رقابت کے احساس کے ساتھ دیکھنے لگا۔ دائیں طرف نواب صاحب، ان کی ساتھی ادھیڑ عمر خوبصورت عورت، دو انگریز اور ایک ہندوستانی چھوٹے سے دائرے میں بیٹھے تھے۔ ہندوستانی متواتر باتیں کر رہا تھا اور اس کے ساتھی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ جب وہ آیا تو لنگڑا کر چل رہا تھا اور سب لوگ بڑے تپاک سے اسے ملے تھے۔ چیف کمشنر اور مہاراج کمار کے بعد اسکی کار سب کاروں سے اونچی اور چمکدار تھی، اور اس کے پہیوں کے تار بجلی کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس وقت اس کی ٹانگ، جو خراب تھی، بالکل سیدھی، اکڑی ہوئی کرسی پر سے نیچے سبزے تک آ رہی تھی لیکن اس کی باتوں کے پہلے میں کوئی اس کی ٹانگ سے دلچسپی نہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے سے ذہانت پٹکتی تھی۔ نواب صاحب کے خاص ملازم نے ایک راشنل اور ایک بڑی سی پستول، جس کے پیچھے لکڑی کا دستہ لگا تھا، لا کر اسے پکڑائی اور وہ تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا کچھ کہنے لگا۔

نعیم نے جب دوبارہ اپنی بیسنٹ کی طرف دیکھا تو وہ کہہ رہی تھیں: ”میں بھی گو کھلے سے

ملنا چاہتی ہوں۔ بہت کمزور دکھائی دے رہے ہیں۔“ پھر وہ، ایاز بیگ اور سیاہ بالوں والا شخص اٹھ کر لان پار کرنے لگے۔ نعیم بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب وہ لنگڑے باتونی شخص کے قریب سے گزرا تو اس نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔

”افوہ، یہ جرمن۔ کمبخت ایسی مشین بناتے ہیں! اب دیکھیے اس ساری پستول میں آپ کو بھی ایک کیل (Rivet) نظر نہ آئے گی۔ سارا ویلڈنگ کا کام ہے۔ یہ اصل مرد کا کھیل ہے۔ پار سال شیر کے شکار کو چیف کمشنر کے ساتھ جو میں بنگال گیا۔“

نعیم گزر گیا۔ باتوں کا شور عروج پر تھا۔ جب وہ دوسری طرف پہنچا تو اس کے ساتھی جھک جھک کر گو کھلے سے مل چکے تھے اور خیریت پوچھ رہے تھے۔ وہ صوفے کے پیچھے جا کر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ گو کھلے آنے والوں کو جگہ دینے کی خاطر کھسک کر صوفے کے کونے پر چلے گئے، جس سے ان کا چہرہ اچانک روشنی میں آ گیا۔

”ہم یہی بات کر رہے تھے۔ میں ان سے کہہ رہی تھی کہ مسٹر گو کھلے کی ”مجلس خدام ہند“ (Servants of India Society) خالص تھیوسوفیکل اصولوں پر بنائی گئی ہے۔“ ایسی بیسنٹ نے کہا۔

”لیکن انہیں صرف لفظ ”ہند“ پر اعتراض ہے۔ یعنی ”خدام انسانیت“ کیوں نہیں؟“ ایاز بیگ بولے۔ ”یا خدام تھیوسوفی!“ سیاہ بالوں والے شخص نے مسکرا کر کہا۔ اس کی بات کو سنی ان سنی کر کے ایسی بیسنٹ پھر بولیں: ”اس سے، آپ مانیں گے کہ تحریک محدود ہو جاتی ہے۔“

گو کھلے سنبھل کر بیٹھے اور اپنے بوڑھے ہاتھوں میں چھڑی کو پھرانے لگے۔ ”تھیوسوفی۔“ انہوں نے دھیمے لہجے میں بات شروع کی۔ پھر چشمہ اتار کر صاف کیا اور دوبارہ لگا لیا۔ ”تھیوسوفی، مسز بیسنٹ، نہ سائنس ہے نہ سیاست۔ محض فلسفہ ہے۔ سیاست چند مادی فوائد کا نام ہے، جیسے بہتر خوارک، بہتر لباس، بہتر رہائش، انہیں حاصل کرنے کا طریقہ۔ اور تھیوسوفی، یا کسی بھی غیر مادی یا غیر عملی فلسفے پر یقین کر کے ہم یہ چیزیں حاصل نہیں کر سکتے۔ مادے کا ایک حجم ہوتا ہے اور وہ ایک خاص جگہ گھیرتا ہے۔ وہی مادہ اس سے زیادہ رقبے کی جگہ نہیں گھیر سکتا، چنانچہ محدود ہے۔ ہم مادے یا سیاست کو غیر محدود نہیں کر سکتے۔ ”خدام ہند“ کے اصول اور طریقہ کار کو خالصتاً مادی تو نہیں، اور انہیں کسی حد تک روحانی کہا جا سکتا ہے، کیونکہ جو لوگ مجلس میں شامل ہیں انہیں اپنے ہر آرام و آسائش کو ترک کر دینا پڑتا ہے، لیکن وہ کام کرتے ہیں دوسرے لوگوں کی بہتری کی خاطر، اور یہ دوسرے لوگ ہیں ہندوستان کے لوگ۔ یہی ”ہندوستان“ کا لفظ مجلس کو ایک مادی شکل دے دیتا ہے۔“ ”ایسی بیسنٹ کسمائیں، مگر جب بولیں تو ان کی آواز کم دل کش نہ تھی، ”لیکن میں نہیں سمجھتی کہ آپ

وسیع تر مقصد اور اصطلاحوں سے کیوں گھبراتے ہیں - کام جو بھی ہو ، ایک بڑا نام کام اور مقصد کو وسعت بخشتا ہے -

”لیکن یہ عظمت اور وسعت تو آپ سمجھتی ہیں ، یا نواب صاحب سمجھتے ہیں یا کرنل اولکٹ سمجھ سکتے ہیں - میرے ملک کے یہ چھوٹے چھوٹے لوگ نہ ذہین ہیں نہ روحانی بزرگ - ان سے اگر کہا جائے کہ دنیا کی بہتری کے لئے آؤ تو وہ اپنا گندم بونا جاری رکھیں گے - لیکن اگر کہا جائے کہ ہند کے لئے ، اپنے فلاں بھائی اور فلاں بہن کے لئے آؤ - تو دیکھیے مسز بیسنٹ“ گو کھلے نے ایک ہاتھ سے چشمہ اتارا اور دوسرے ہاتھ کی انگلی ہلاتے ہوئے بولے ، ”یہ لوگ جو کھیتوں میں ، اور سڑکوں پر اور گلیوں میں کام کرتے ہیں گو ذہین اور روحانی نہیں مگر عقل مند ضرور ہیں - وہ اپنے گاؤں ، اپنی زمینوں ، اپنے ماں باپ اور بچوں کے نام پر ضرور آئیں گے - اور اسی لئے کسی سیاسی تحریک کو غیر محدود نہیں کیا جا سکتا -

اس لحظے نواب صاحب ، جو قریب سے گزر رہے تھے ، چونک کر رکے - ”خوب - ہر طرف سیاسی تحریکات کی بات ہو رہی ہے - آپ بڑے کمزور نظر آ رہے ہیں مسٹر گو کھلے - آپ کی ذیابیطس کیسی ہے؟“

”خراب ہی جا رہی ہے - صحت یا موت کا غم تو نہیں ، غم ہے تو محبت کا - “
”محبت کا؟“ سیاہ بالوں والا آدمی مسکرایا - ”ایسی بیسنٹ خوبصورتی سے چونکیں - “
”جب سے پیدا ہوا میٹھے سے محبت کرتا رہا - اب ادھر دس برس سے میٹھا حلق سے نہیں اترا - “ وہ ہنسنے لگا -

”مگر یہی کرسمس پر جب بانکی پور آپ آئے تو آپ صحت میں تھے - “
”آپ کانگریس کے اجلاس پر بانکی پور میں تھے؟“ ایسی بیسنٹ نے بات کاٹ کر کہا -
”ہاں ہاں - میں تھا ، گو کھلے تھے ، مہاراج کمار تھے ، مسٹر سنہا تھے - “ نواب صاحب نے لنگڑے باتونی کی طرف اشارہ کر کے بتایا -

”اوہ - میں اس وقت ہندوستان میں نہیں تھی - اجلاس کیسا رہا؟“

”اچھا خاصا رہا - بہت لوگ آئے - “

”بنگال کی تقسیم کے متعلق کوئی ریزولیشن ہوا - “

”ارر - “ نواب صاحب نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے سامنے دیکھا جہاں نعیم کھڑا تھا - وہ

کھسک کر اندھیرے میں ہو گیا - ”ارر - کیوں مسٹر گو کھلے؟“

گو کھلے ہنسنے لگا : ”بنگال تقسیم ہو یا متحد رہے ، آپ کا رائل بنگال ٹائیگر کا شکار جاری

رہے گا - “

”میری یادداشت کچھ ٹھیک نہیں رہی کئی دنوں سے - “ وہ کھسیانے ہو کر بولے اور

اجازت لے کر چلے گئے۔

”آپ کا بانگی پور کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اپنی بیسنٹ نے گو کھلے سے پوچھا۔
 ”خیال؟“ وہ طنز سے مسکرائے۔ ”بس ایسی ہی ایک پارٹی تھی جیسی آج ہے۔ بڑے شاندار لوگ تھے۔ خوبصورت اور اپ ٹو ڈیٹ، خوبصورت باتیں تھیں، خوش گیمیاں تھیں۔“
 ”یہ تو زیادتی ہے، مسٹر گو کھلے۔ میں بھی پریس کی طرف سے وہیں تھا۔ اچھی خاصی کانفرنس تھی۔“ سیاہ بالوں والا آدمی شستہ انگریزی میں بولا۔

پتہ کھڑا نعیم اپنی ٹوپی کو بری طرح ہاتھوں میں مڑورنے لگا۔ گو کھلے یکلخت سنجیدہ ہو گئے: ”آپ کے اخبار کا کوئی نمائندہ جنوبی افریقہ میں بھی تھا؟“

”اوہ۔ ہاں ضرور تھا۔“ اخبار نویس نے رک کر بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”آپ جنوبی افریقہ سے آرہے ہیں، میں جانتا ہوں۔ مگر وہاں کا مقابلہ آپ ہندوستان سے نہیں کر سکتے۔ یہاں تو۔ سیاست، یعنی پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔“
 ”پڑھے لکھے لوگوں سے آپ کی مراد؟“

”یہی کہ۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ تاریخ سے واقف ہیں، اور۔۔۔۔۔“
 دفعتاً نعیم آگے بڑھا، جس سے اس کا چہرہ، جو سرخ ہو رہا تھا، روشنی میں آگیا ذرا سارا جھک کر نو عمری کے جوشیلے لہجے میں وہ بولا: ”اور یہ بھی کہ ساری کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔“

سب نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔ نعیم کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ اس نے ٹوپی کے پھندے کو اس زور سے کھینچا کہ وہ اس کے ہاتھ میں آگیا۔ ایاز بیگ کا رنگ سفید پڑ گیا۔
 ”یہ کوئی بری بات نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی بڑی زبان سیکھنا معیوب نہیں، بلکہ اچھی تعلیم ہے۔“ اخبار نویس اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔
 ”اسی لیے کم پڑھے لکھے لوگ قید کر دیے جاتے ہیں۔ اور آپ کیا توقع رکھتے ہیں۔ تلک جیل میں ہے۔ کیا؟“

اخبار نویس انگریز کا چہرہ ایک دم غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس کے ماتھے سے نفرت ٹپکنے لگی اور وہ بار بار مٹھیوں کو کھولنے اور بند کرنے لگا۔

”تو آپ اسے سیاست دان کہتے ہیں؟ وہ۔۔۔“ پھر اس نے ایک شریف انگریز کی تربیت کے مطابق، انتہائی کوشش سے اپنے آپ کو قابو میں کیا اور خشک لہجے میں بولا: ”اس کی سیاست کے متعلق تو چیف کمشنر آپ کو بتا سکتے ہیں۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے میں کہتا ہوں کہ وہ اچھا اخبار نویس بھی نہیں۔“

ایاز بیگ اعصابی حالت میں دونوں پاؤں ہلا رہے تھے۔ انار کے پتوں میں چھپا ہوا قلم

ہوا کے جھونکے کے ساتھ زور سے جھولا اور سایہ ان کے پاؤں پر ڈولنے لگا۔ اسی وقت سب لوگ کھانے کے لئے اٹھنا شروع ہوئے۔ گو کھلے اپنی بیسنٹ سے کہہ رہے تھے:

”لیکن چند نوجوانوں سے میں ضرور متاثر ہوا۔ موتی لال نہرو کا لڑکا بھی آیا تھا۔ ابھی

کیمبرج سے لوٹا ہے۔“

اخبار نویس انگریز دیر تک کھڑا، چہرے سے ہر تاثر کو دور کرنے کے لئے، ماتھے پر رومال پھیرتا رہا۔ لنگڑا آدمی بڑی تندہی سے باتیں کرتا اور ہنستا ہوا قریب سے گزرا۔ نعیم نے دیر تک جیبوں میں رومال تلاش کرنے کے بعد ٹوپنی کے ساتھ ماتھے کا پسینہ پونچھا اور ہجوم میں شامل ہو گیا۔

کھانے کی میزوں کی دو لمبی قطاریں لگی تھیں جن پر سب مہمان باآسانی بیٹھ گئے۔ سبزے کے اس قطعے پر رنگین مقیموں کا جال بچھا تھا۔ رکابیوں میں بھنے ہوئے سالم مرغ اور تیترا لکڑی کی ٹانگوں پر کھڑے تھے۔ پلاؤ ابھی نہیں آیا تھا پر خوشبو آ رہی تھی۔ دس سے زیادہ قسم کے کھانے میز پر آچکے تھے۔ کھانوں کے درمیان چینی کی چھوٹی چھوٹی بے داغ پلیٹوں میں سیاہ چربی کی بھدی موم بتیاں کھڑی تھیں۔ یہ موم بتیاں درمیانی اٹھلی کے برابر موٹی اور خاصی بد شکل تھیں، اور انہیں روشن نہیں کیا گیا تھا۔

ایک میز کے سرے پر دو بڑی کرسیاں پڑی تھیں۔ جن پر نواب صاحب اور ایک دوسرے بزرگ آکر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے شام کے کھانے کا لباس اتار کر اب سرخ چمکیلے ریشم کا لباس پہن رکھا تھا۔ یہ کچھ اس طرح کا لباس تھا جیسا مغل شہنشاہ یا ان کے درباری پہنا کرتے تھے، اور آج کل سرکس کے مسخرے پہنتے ہیں۔ کپڑا ایسا تھا جو عورتوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ ایک لمبا سا تنگ بلاؤز تھا جس پر گلے تک سفید چمک دار بٹن لگے تھے۔ آستین چست تھی۔ کمر سے نیچے بلاؤز کا گھیر بڑا تھا، اور نیچے اسی کپڑے کی بھاری سی تنگ پانچوں والی شلوار تھی۔ جو تا بھی اسی کپڑے کا اور موزہ نما تھا۔ کمر کے ساتھ سنہری میان والی تلوار لٹک رہی تھی اور بلاؤز کی پٹی بھی سنہری تھی۔ ان کے ملازم خاص نے ایک بڑی سی سرخ ٹوپنی، جس پر سنہرا کام کیا ہوا تھا، لا کر ان کے سامنے میز پر رکھ دی۔ قریب ہی ایک پلیٹ میں کالی چربی کی سب سے بڑی موم بتی رکھی تھی۔ ساتھ والے بزرگ نے عام ہندوستانی مسلمانوں کا لباس، شیروانی اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ ان کے ساتھ دونوں طرف پرویز اور عذرا بیٹھے تھے۔ آگے وہ ادھیڑ عمر عورت تھی جو اب تیز روشنی میں خاص معمر دکھائی دے رہی تھی۔ آگے چیف کاشنر، مہاراج کمار، ایسی بیسنٹ، گو کھلے اور تقریباً سب انگریز مہمان تھے۔ میز کے آخر میں چند ہندوستانی تھے جن میں نعیم بھی بیٹھ گیا۔

دوسری میز پر سبھی ہندوستانی تھے جن میں ایاز بیگ بھی تھے۔ ملازمین بے داغ لباس پہنے سرگرمی سے آ جا رہے تھے۔ سارے غیر ملکی نواب صاحب کا عجیب و غریب لباس دیکھ کر چہروں پر سنجیدگی طاری کیے ہوئے تھے۔

جب سب لوگ بیٹھ چکے تو میز کے سرے والے بزرگ اپنی جگہ سے اٹھے۔ سب خاموش ہو گئے۔ ہوا درختوں میں تھم گئی۔

چند لمحے تک خاموش کھڑے رہنے کے بعد انہوں نے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ خشک کیا اور بولے: ”آج۔ آج یعنی ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو روشن آغا کو فوت ہوئے تین ماہ مکمل ہوتے ہیں۔ میں خاندانی روایات کے مطابق، اور اس حیثیت کی رو سے جو مجھے سوچی گئی ہے، نواب غلام محی الدین خان آف روشن پور کے روشن آغا کے لقب کا صحیح حقدار ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔“

تقریر ختم کر کے انہوں نے جلدی سے سرخ ٹوپی اٹھا کر نواب صاحب کے سر پر رکھ دی، جس نے آنکھوں تک ان کا چہرہ چھپا لیا۔ پرویز اور عذرا اٹھ کر اپنے باپ کی طرف بڑھے۔ لیکن اس سے پہلے دوسرے بزرگ نے جلتی ہوئی تیلی ان کی طرف بڑھائی جس کی مدد سے انہوں نے اپنے آگے کی سیاہ موم بتی روشن کی۔ ”روشن آغا“ کہہ کر ان کے دونوں بچے ان سے لپٹ گئے۔

تالیوں اور مبارک بادوں کا شور برپا ہو گیا۔ غیر ملکی، جو اب تک ضبط کیے بیٹھے تھے، روشن آغا کی ہیٹ کڈائی پر اب دل کھول کر ہنس رہے تھے۔ روشن آغا اپنے دونوں بچوں کو تھامے جھک جھک کر مبارک باد وصول کر رہے تھے۔ ایک دفعہ جھکتے ہوئے ان کی عجیب و غریب ٹوپی ٹھوڑی تک لٹک آئی۔ عذرا نے جلدی سے اسے پھر سے ان کی آنکھوں پر جمایا اور احتیاط سے جھکنے کی تنبیہ کی۔ ہر طرف قہقہوں، تالیوں اور ”روشن آغا۔ روشن آغا“ کی چیخوں کا شور تھا۔ مؤدب میرے ہاتھ پیچھے باندھے شرما کر ہنس رہے تھے۔ قہقہے ایک ایک کر کے بجھنے شروع ہوئے، حتیٰ کہ صرف روشن آغا کی موم بتی روشن رہ گئی۔ چاروں طرف اندھیرا ہو گیا۔ سب سے پہلے پرویز اور عذرا نے اپنے اپنے آگے کی موم بتیاں لے جا کر اس سے جلائیں اور واپس لا کر رکھ دیں۔ پھر معمر خوبصورت عورت اور دوسرے بزرگ نے ایسا ہی کیا: اس کے بعد چیف کاشنر اور مہاراج کمار اپنی اپنی موم بتیاں اٹھا کر لے گئے اور بڑی موم بتی سے روشن کر کے واپس لے آئے، پھر اپنی بیسنٹ اور گو کھلے اٹھے، پھر اخبار نویس، پھر سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑی موم بتی کے گرد دھاندلی پڑ گئی۔ بعض لوگ موم بتیاں جلانے گئے اور وہیں کھڑے ہو کر گپیں بانگنے لگے۔ اخبار نویس ایک بڑھے انگریز کو، جس نے اس سے شکایت کی تھی کہ ساری عرونی کو پہلے سے چھاپ کر سب مہمانوں میں بانٹ دیا جاتا تو وہ اس گڑبڑ سے بچ جاتے،

سمجھا رہا تھا کہ یہ ساری تقریب ایک خاندانی راز ہے اور اسے پرنٹ میں لانے کی ہرگز اجازت نہیں دی جاتی۔ بڈھا سنجیدگی اور اداسی سے موم بتی کو تکیے جا رہا تھا۔ ہر طرف قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر مومی شمعوں کی روشنی میں کھانا شروع ہوا اور خاموشی سے جاری رہا۔ اب چاند وسط مئی کے آسمان پر روشن اور گرم تھا، اور ہوا درختوں میں تھم چکی تھی۔ مدہم چاندنی میں دلی کی آدھی سے زیادہ آبادی سو چکی تھی، اور روشن محل کے باغ میں مقدس چربی کی روشنی میں خاموشی سے کھانا کھایا جا رہا تھا۔ سفیدے کے اونچے درخت ساکت کھڑے تھے۔ میزوں سے پرے ایک فوارہ اندھیرے میں خاموشی سے پانی اچھال رہا تھے۔ نعیم نے کھانے پر سے سر اٹھا کر دیکھا۔ ساری فضا طلسمی تھی۔ ایک سحر۔ جس میں صرف خوشبودار کھانا اور جبرے ہلاتے ہوئے لوگ حقیقی تھے۔ ساری دنیا، سارے لوگوں کا صرف ایک کام تھا، کھانا۔ لنگڑے باتونی کی مہذب، خوش گوار آواز اب بھی آ رہی تھی۔

”بھوک۔ چونکہ انتہائی وحشت ناک انسانی جذبہ ہے، چنانچہ کھانا انسان کا شریف ترین فعل ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ نعیم کے دائیں بازو پر جو شخص بیٹھا تھا پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے اس کی طرف جھکا۔

”میں نے آپ کو بات کرتے سنا جب آپ تلک کے متعلق کچھ کہہ رہے تھی۔“ اس نے دیکھا یہ وہی قصہ گو انگریز تھا جو کچھ دیر پہلے اپنے ساتھیوں کے سامنے جنگلی جانور کی طرح چکر لگا رہا تھا۔ وہ پھر بولا: کیا آپ کو پتہ ہے کہ تلک نے مسلمانوں کے خلاف کیا کچھ کیا؟ وہ ذبیحہ کاؤ کے خلاف سوسائٹی، اور مسجد کے سامنے باجا بجانے پر اصرار۔ اور وہ سب۔“

کوئی جواب نہ پا کر کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ گفتگو کی سعی کی: ”اس موم بتی کو دیکھ رہے ہیں۔ سنا ہے یہ چربی پگھلے سو سال سے اس خاندان کے پاس ہے۔ میں سوچتا ہوں جب یہ ختم ہو جائے گی پھر کیا ہو گا؟“

نعیم نے محظوظ ہو کر اسے دیکھا۔ ”آپ کو کیسے پتہ چلا میں مسلمان ہوں؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”اوہ۔“ جنگلی جانور برا سامنہ بنا کر بولا، ”آپ آج شام سرخ ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔“ اس کے بعد اس نے کوئی بات نہ کی۔

کھانا کافی دیر تک جاری رہا۔ پھر لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ دوسرے لان میں جب وہ آرام سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے تو بیرے کافی کے خوبصورت پیالوں میں قہوہ پیش کرنے لگے۔ جب کھانے کی میزوں پر وہ اکیلے رہ گئے تو روشن آفاٹھے۔ دیر تک وہیں کھڑے وہ بڑی

موم بتی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ اپنے انوکھے لباس میں وہ بیک وقت بارعب اور مسخرے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر انہوں نے پھونک مار کر موم بتی کو بجھا دیا۔

”روشن آغا۔“ ان کے ملازم خاص نے دھیرے سے کہا اور سارے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ انہوں نے ایک لحظہ غور سے اسے دیکھا، پھر اپنی چھوٹی اٹھکی سے چمک دار انگوٹھی نکال کر اس کی طرف اچھالی جسے زمین پر گرنے سے بچانے کے لئے وہ دیوانہ وار ہوا میں ہاتھ چلانے لگا۔ جب وہ بھری کی سڑک پار کر کے دوسری طرف جا رہے تھے تو کونے والے درخت کے نیچے انہوں نے نعیم اور عذرا کو دیکھا، اور ان کے مسرور چہرے پر فکر کی ایک پرچھائیں گزر گئی۔

نعیم قہوے کا پیالہ پکڑے پکڑے ایک عجیب و غریب درخت کے پاس جا نکلا۔ وہ ٹھگنا سا پھیلا ہوا درخت تھا اور اس کی موٹی موٹی شاخیں نعیم کی چھاتی کے برابر آتی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ چھلانگ لگا کر اوپر چڑھ جائے۔ قہوے کا پیالہ شاخ پر رکھ کر اس نے اوپر دیکھا شاخوں میں سرخ رنگ کا قلمہ جل رہا تھا۔

”آپ اکیلے اکیلے کیوں پھر رہے ہیں؟“ عذرا نے قریب آ کر پوچھا۔ جواب دینے کی بجائے اس نے قہوے کا پیالہ اٹھایا اور گڑ بڑا کے ایک جلتا جلتا گھونٹ بھرا۔

”یہ درخت ہماری محبوب جگہ ہے۔ ہم چھٹی کے روز سارا دن یہاں چڑھے رہتے ہیں۔“ وہ شاخ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ مدہم سرخ روشنی میں اس کی آنکھیں اور بال بھورے اور رنگ گندی تھا۔ اس کا بازو جو شاخ پر رکھا تھا گول اور صحت مند تھا اور تینگ آستین میں سختی سے پھنسا ہوا تھا۔ بے اختیار نعیم کا جی چاہا کہ اس ابھری ہوئی جگہ کو چھوئے جہاں سے آستین نے جلد کو دبا رکھا تھا۔ وہ شاخ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”آپ کی کافی گرم ہے؟“

”کچھ زیادہ ہی گرم ہے۔“ نعیم نے کہا۔

”اوہ۔“ وہ اسی طرح سر پیچھے پھینک کر ہنسی جیسے شام کے وقت برآمدے میں ہنس رہی تھی۔ اس کی گردن چوڑی ہو گئی اور نرخرہ تیزی سے کانپنے لگا۔ وہ بے حد جاندار ہنسی تھی۔ ”آپ کا منہ جل گیا؟“ نعیم برا سا منہ بنا کر ہنسا۔

”یہ بہت اچھا ہوا۔“ وہ اسی جارحانہ انداز میں خوشی سے بولی اور دونوں ہاتھ اوپر باندھ کر شلخ کے ساتھ جھول گئی۔

”ار۔“ دفتاً وہ جھینپ گئی۔ ”مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ روشن آغا ناراض ہوں گے۔ وہ ہمیشہ مجھے اس پر چڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ آپ خفا تو نہیں ہوئے، میں نے آپ سے مذاق کیا ہے۔“ وہ قہوہ پیتی ہوئی بولی۔

”نہیں۔ لکین آپ میرا قہوہ پی رہی ہیں۔“

”ارے۔ اوہ۔“ وہ سادگی سے ہنس پڑی۔ ”لایئے، آپ کے لئے اور لا دوں۔“

”میں یہی پیوں گا۔“

”یہی؟“ اس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

”ہاں۔ یہی۔“

حیرت کے مارے اس کی آنکھیں اور زیادہ پھیل گئیں۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا:

”پیالے بالکل ایک جیسے ہیں۔“

وہ خاموشی سے کھڑے قہوہ پیتے رہے۔ سامنے سے باتوں کا شور آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔

ہوا میں خنکی آگئی تھی۔ عذرا کے بال پیچھے کی طرف اڑنے لگے۔ نعیم خاموش کھڑا اس کے بازو

اور گردن کو دیکھتا رہا۔ قہوہ پیتی ہوئی وہ اپنے موٹے سرخ ہوشوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

”میں اس ساری تقریب کا مطلب نہیں سمجھا۔ یہ جو آج ہوئی۔“ نعیم نے کہا۔

”آپ کو کسی نے نہیں بتایا؟ ارے۔۔۔۔۔ یہ دراصل اس طرح ہے۔ روشن پور کمالک

روشن آغا کہلاتا ہے۔ یہ تقریب اسی سلسلے میں تھی آج سے بابا روشن آغا کہلائیں گے۔ اس

سے پہلے بڑے ابا تھے۔“

”بے حد دلچسپ تقریب تھی۔“

”یوں یہ خالص خاندانی تقریب ہے۔ بابا کا لباس بھی خاندانی ہے۔ صرف آج کے دن

سپننے کے لئے ہے۔“ وہ احترام سے بولی۔

جنہوں نے تقریر کی وہ کون ہیں؟“

”ہمارے خاندان کے سب سے عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔“

”اور وہ خاتون؟“

”میری خالہ ہیں۔ یہیں رہتی ہیں۔“

”آپ کی والدہ؟“

”ممی پردہ کرتی ہیں۔“ اس نے پیالہ خالی کر کے شلخ پر رکھتے ہوئے اچانک نعیم سے

پوچھا: ”آپ انگریزی لباس پہنتے ہیں؟“

”ہاں۔“

”اتوار کو ہم پرویز کے بی۔ اے کرنے کی خوشی میں پارٹی کر رہے ہیں۔ آپ آئیں

گے؟“

”آ جاؤں گا۔“

”ضرور یاد رکھیے گا۔ پانچ بجے شام۔“

”اچھا۔“

”ضرور۔“ اس نے پھر کہا۔ نعیم ہنس دیا۔

”شب بخیر۔“ وہ سبزے پر سے گزر کے روشن آغا کی طرف چلی گئی۔ وہ دوسرے کونے میں اونچی تکونی ٹوپی پہنے بیٹھے سر ہلارہے تھے اور بار بار تلوار سنبھالتے جا رہے تھے۔ نعیم عذرا کو سبزے پر چلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ اس لابی لڑکی سے بہت مختلف تھی جو شام کے وقت انگریزی لباس پہنے برآمدے میں دوڑ رہی تھی۔ بڑی شدت سے یہ خواہش نعیم کے دل میں پیدا ہوئی کہ وہ مڑ کر اس کے پاس چلی آئے اور وہ اس کے ہونٹ، بازوؤں اور گردن کو قریب سے دیکھے۔

کچھ دیر کے بعد وہ جا کر ایاز بیگ کے پاس بیٹھ گیا جو لنگڑے باتونی کو کسی عمارت کے تعمیری مناقصے کے بارے میں بتا رہے تھے۔ اسے خاموشی سے ایاز بیگ کی باتیں سنتے ہوئے پا کر نعیم کو دکھ ہوا۔

آدھی رات کے قریب مہمان رخصت ہونا شروع ہوئے۔ روشن آغا کو شب بخیر کہہ کر جمائیاں لیتے اور ڈکاروں کو روکتے ہوئے وہ اپنی اپنی سواریوں میں جا کر بیٹھنے لگے۔ نچلے طبقے کے چند لوگ ابھی تک شور مچا کر روانہ ہوتی ہوئی موٹر کاروں کو دیکھنے کے لئے باہر کھڑے تھے۔ جب نعیم ایاز بیگ کے ساتھ آخر میں شب بخیر کہہ کر اپنی بہلی کے قریب آیا تو اسے نیند آ رہی تھی اور زیادہ کھا جانے سے پیٹ بھاری ہو رہا تھا۔ سوار ہونے سے پہلے ایک طاقتور خواہش کے تحت مڑ کر اس نے سارے روشن محل پر نظر دوڑائی۔ باغ میں صرف نوکر خاموشی سے پھر رہے تھے اور برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ درختوں میں سرخ قمقمے زور زور سے جھول رہے تھے۔ وہ بے دلی سے اچک کر ایاز بیگ کے برابر بیٹھ گیا۔

”عذرا نے اتوار کی شام کو دعوت دی ہے چائے کی۔“ اس نے کہا۔

جواب کی بجائے چند مجھ اس کے چہرے سے ٹکرائے۔ اس نے چچا کی طرف دیکھا۔ ان کا کھلا، سپاٹ، معمولی خد و خال کا چہرہ تھا جیسا عام کام کرنے والے لوگوں کا ہوتا ہے۔ اس پر کوئی گہرائی نہ تھی، اس پر ہر تاثر صاف واضح ہو جاتا تھا۔ وہ چونک اٹھا۔

”تم تقریر کرنے کے لئے وہاں نہیں گئے تھے۔“ ایاز بیگ نے غرا کر کہا، ”تمہیں پتا ہے تلک کا نام لینا ہی دہشت پسندی میں شمار ہوتا ہے۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو تمہیں گرفتار کر لیا جاتا۔ روشن محل کی تقریب تھی اس لئے۔۔۔“ نعیم بیٹھا سوچتا رہا، پھر آہستہ سے بولا:

”مجھے افسوس ہے، چچا۔ وہ ہمارا سب کا ایسا ہیرو ہے۔ ورنہ۔“

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے بہلی کے چلنے کے ساتھ ہلکورے کھاتے رہے۔ پھر ایاز بیگ نرم لہجے میں بولے: ”ہمارا خاندان انہی باتوں کی وجہ سے تباہ ہو چکا ہے۔ میں نے

تمہیں تعلیم دلوائی - ساری امیدیں - - تم میری ساری زندگی ہو - ایک روز تمہیں پتہ چلے گا کہ میں نے کتنا دکھ سہا -

نعیم کو خیال ہوا کہ وہ رو رہے ہیں - اس نے کنکھیوں سے دیکھا - ان کی خشک ، چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کو خوشی ہوئی - بہلی دیر تک سنسان سڑکوں پر چلتی رہی -

(۳)

جب نعیم روشن محل میں داخل ہوا تو پارٹی شروع ہو چکی تھی - پھانک پر ایک اونچی سی سیاہ موٹر گاڑی کھڑی تھی - قریب ہی پرویز کھڑا اس کے مالک سے باتیں کر رہا تھا - نعیم سے اس کا تعارف کرایا گیا - صاحبزادہ وحید الدین ، کلج میں پرویز سے دو سال سینئر رہا تھا ، محکمہ تعلیم میں افسر اعلیٰ منتخب ہوا تھا - یہ سب باتیں اسے اسی تعارف کے دوران معلوم ہوئیں - پھر مصروفیت سے ایپرن کے ساتھ ہاتھ پوچھتی ہوئی ایک انگریز لڑکی کو ٹھہرا کر نعیم سے تعارف کرایا گیا -

”معاف کیجیے ، میرے ہاتھ کالے ہیں - ہم نے خود ہی چائے بنانے کا فیصلہ کیا ہے -“ اس نے بے حد اخلاق سے کہا اور بھری کی سڑک کو پار کر کے لان پر اتر گئی - وہاں برگد کے پرانے درخت کے نیچے ہنگامہ پیا تھا - آج وہاں کوئی کرسی نہ تھی اور نہ میز - دو تین سٹول پڑے تھے جن پر دو لڑکیاں اور ایک لڑکا اکڑوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے - پاس ہی دو بچے سبزے پر لیٹے ایک تصویر دار رسالے کی ورق گردانی کر رہے تھے - ان سے پرے عذرا ایک بڑے سے سٹوو کو جلانے میں جتی ہوئی تھی - اور آٹھ دس لڑکے لڑکیاں اسے گھیرے ہدایات دے رہے تھے - سامنے سے دو لڑکیاں چلی آ رہی تھیں - ایک کے ہاتھ میں چائے کے برتنوں سے بھری ہوئی بید کی ٹوکری تھی ، دوسری پانی کی کیتلی اٹھائے ہوئے تھی -

انگریز لڑکی سٹوو کے قریب پہنچ کر گھٹنوں کے بل سبزے پر جھکی اور ہولے سے بولی : ”وہ تمہارا خوبصورت دوست آ رہا ہے -“

عذرا نے سر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتی رہی -

”لیکن آج شریف آدمی لگ رہا ہے -“

”ہشت -“ عذرا نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی - ایک لحظے کی سراسیمگی جو اس پر طاری ہو گئی

تھی بے ساختہ مسرت میں تبدیل ہو گئی - ”سلام لیگم -“ اس نے کہا اور اپنے تیل اور کالک لگے ہاتھوں میں نعیم کا ہاتھ پکڑ کر کالا کر دیا - قہقہوں کے درمیان وہ سرخ ہو گیا -

”لڈیا نے آج مشورہ دیا کہ چائے خود ہی بنائی جائے۔ اب مزہ آ رہا ہے سب کو۔ دیکھیے۔“ اس نے سٹوو کی طرف اشارہ کیا جس کے ساتھ اب آدھے درجن لڑکے لڑکیاں کستی لڑ رہے تھے۔ ان سب کے چہرے پسینے سے تر تھے۔ اور بے حد انہماک سے وہ اسے جلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

عذرا آج بے حد صحت مند اور چاق و چوبند نظر آ رہی تھی۔ چہرہ سرخ اور آنکھیں چمک دار تھیں۔ گوہنستے ہوئے اس کا دہانہ بہت پھیل جاتا تھا لیکن بھرے ہوئے ہونٹوں میں عجیب کشش تھی اور اس کا وجود اڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ نعیم کے سارے بدن میں مسرت کی سنسنی دوڑ گئی۔

کیتلی سٹوو پر رکھ کر وہ باتیں کرنے لگے۔

”وجید، اپنی نوکری لگنے کی نہ تم نے ہمیں کوئی پارٹی دی ہے نہ کچھ۔“ کھڑے پاجامے اور قمیض دوپٹے والی ایک لڑکی نے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ انگریز لڑکی بات کاٹ کر چلائی، ”اب تم برسِ روزگار ہو۔ چلو پارٹی دو ہمیں فوراً، کنجوس ٹام۔“

”اتنی پارٹیاں تو کھا چکی ہو اور ابھی کنجوس ٹام ہوں۔“

”پر روزگار ملنے کی خوشی میں کوئی نہیں ہوئی۔“

بات کو بیچ میں چھوڑ کر وہ قہقہے لگانے لگے۔

”وجید یہ بتاؤ“ عذرا بولی: ”سکول میں لڑکوں کو کیسے پڑھاؤ گے۔“ پھر قہقہہ بلند ہوا۔

”اچھا بھئی، ٹھہرو سب لوگ۔“ پرویز بولا۔ ”وہ مسز ملن کی کیا بات ہے وجید؟ تم تو

سول کلب جاتے ہو۔“

”کیا؟“

”وہ سنا ہے کہ ملن صاحب کو اس نے مجبور کیا واپس جانے پر۔ اس لئے پتہ استعفیٰ

دے کر چلے گئے۔“

”ارے ہاں۔ وہ۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ اور۔ لیکن یہ درست ہے کہ اسی نے ملن صاحب

سے استعفیٰ دلویا۔“

اس گفتگو سے اکتا کر لڑکیاں واپس سٹوو کی طرف چلی گئیں۔ چند لڑکے برگد پر چڑھنے کی

مشق کرنے لگے۔ جب وہاں پر وجید کے ساتھ بس پرویز اور نعیم رہ گئے تو وہ آواز نیچی کر کے

بولا:

”یار قصہ یہ تھا اصل میں کہ وہ جانے کیا سمجھنے لگی تھی خود کو۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی تو تھی

ہی، اور کافی خوبصورت بھی تھی۔ اور اوپر سے اس پٹیل پارٹی نے سر پہ چڑھا رکھا تھا اسے کہ گھر

پہ سلام کرنے کو حاضر ہو رہے ہیں باری باری ، اور برج کھیل رہی ہے تو جناب پارٹی کی پارٹی ارد گرد گھٹنے ٹیکے مدد کو حاضر ہے ، تو بس ۔“

”تو بس کیا ۔“

”ہونا کیا تھا ۔ اب ہر کوئی چغد رام تھوڑا ہی ہوتا ہے ۔ وہ مجھے حاصل نہ کر سکی ، نواب زادہ آفتاب کو حاصل نہ کر سکی ، اے ۔ ایس ۔ پی کو حاصل نہ کر سکی ، تو دل برداشتہ ہو کر خاوند سے استعفیٰ دلوا دیا ۔“ صاحب زادہ وحید الدین نے فاتحانہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا ۔ پرویز نے مرعوب ہو کر سنجیدگی سے سر ہلایا ۔

عذرا بار بار کیتلی کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھ رہی تھی ۔ تین چار لڑکیاں مختلف قسم کے کیک اور مٹھائیوں کو ڈبوں میں سے نکال نکال کر پلیٹوں میں لگا رہی تھیں ۔ وہ لڑکا جو سٹول پر بیٹھا دو لڑکیوں کے ہاتھ دیکھ رہا تھا اٹھ کر درخت پر چڑھنے والی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ وہاں پہلے سے ہی پانچ چھ لڑکے اوپر شاخوں میں بیٹھے آرام کر رہے تھے اور بعد میں آنے والوں کو ٹہنیاں توڑ توڑ کر مار رہے تھے ۔ قیامت کا شور تھا ۔

اس وقت کیتلی کے پاس سے عذرا کی آواز آئی : ”آؤ بچو چائے تیار ہو گئی ۔“

پرویز کا گروہ فرماں برداری سے کیتلی کے پاس جا کھڑا ہوا ۔

”ہمیں یہاں پر چائے بھیج دو ۔“ درخت پر سے ایک لڑکے نے چلا کر کہا ۔

”ہم سے پاس کوئی ہوائی جہاز نہیں جو آپ کو رسد پہنچائے ۔ جو نیچے آئے گا اے چائے

ملے گی ۔“

”ہم نیچے نہیں آئیں گے ۔ یہاں پر آب و ہوا اچھی ہے ۔“ دو تین آوازیں آئیں ۔

”تم اپنا پروگرام شروع کرو ۔“ مٹھائیوں کے پاس کھڑے پاجامے والی لڑکی نے تیزی سے

کہا ۔

عذرا نے جلدی سے بالوں کی پٹیاں ٹھیک کرتے ہوئے شرافت سے دوپٹہ اوڑھا اور قمیض

کا دامن کھینچ کر ٹھیک کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی ۔ ”معزز حضرات ۔“ اس شور میں اس کی آواز کم

ہو کر رہ گئی ۔

”وحید لوگوں کو چپ کراؤ“

وحید ہڑٹا کر چلایا: ”پیارے خواجہین و معزز بچو ، ار ۔ لاجول ولا قوۃ ۔ معزز خواجہین و

پیارے بچو ۔“

اب سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے ۔

”عذرا میٹگم کچھ فرماتی ہیں ۔“ اس نے سنجیدگی سے مطلع کیا ۔ نعیم کو ہنسی آگئی ۔

”تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را۔ کاہے کاہے باز خواں۔“ عذرا نے افتتاحی شعر پڑھا۔

”تقریر فارسی میں نہیں ہوگی۔ اردو میں ہوگی۔“ درخت پر سے آواز آئی۔
 ”نہیں انگریزی میں ہوگی۔“ انگریز لڑکی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
 ”انگریزی میں ہوگی۔ انگریزی میں ہوگی۔ دھاندلی مت کرو۔“ پرویز نے چپ کراتے ہوئے کہا۔
 ”آج۔ آج۔“

”اتوار ہے۔“ ایک لڑکی نے چپکے سے کہا۔
 ”ہیئر ہیئر۔“ وحید نے تالی بجائی۔ تالیوں اور قہقہوں کا ایک شور اٹھا۔ پرویز اور نعیم بھی دل کھول کر ہنسے۔ درخت پر کوئی کانے لگا۔
 ”خاموش رہو۔“ عذرا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
 ”خاموش۔ خاموش۔“

”آج بتاریخ سولہ مئی ۱۹۱۳ء کو نواب زادہ پرویز محی الدین کے بی۔ اے پاس کرنے کی خوشی میں چائے کا افتتاح کیا جاتا ہے۔“
 ”تالیاں بجاؤ۔“ وحید نے کہا۔ تالیاں بجائی گئیں۔

پھر عذرا نے ایک پیالی اس کے سامنے رکھی اور چائے دانی اٹھا کر پکڑائی۔ پرویز نے چائے انڈیلی۔ وحید نے دودھ دان پکڑایا۔ اس نے دودھ ڈالا، پھر ایک چمچہ چینی ڈالی، اس کی تقلید میں عذرا نے اور وحید نے ایک چمچہ چینی کا ڈالا، پھر نعیم نے ایک چمچہ اور انگریز لڑکی نے اور قیض دوپٹے والی لڑکی نے ایک ایک چمچہ بھر کر ڈالا،، پھر درخت سے سب لڑکے اتر کر آئے اور اپنے اپنے حصے کی چینی ڈالی حتیٰ کہ چائے باہر گر گئی اور پیالی چینی سے بھر گئی۔

ابھی ایک پیالی چائے انہوں نے سبزے پر بیٹھ کر قہقہے لگاتے ہوئے ختم کی۔ پھر صاحب زادہ وحید الدین نے، جسے ایک سے ایک انوکھے کھیل سوجھتے تھے، اعلان کیا:
 ”جو شخص بغیر چائے گرائے پیالی لے کر پیڑ پر چڑھے گا اسے موٹر کی سیر کرائی جائے گی۔“

اس کی تھی تھی موٹر میں بیٹھ کر پوری رفتار سے دوڑانے اور نعرے لگانے میں بھی بے پناہ کشش تھی۔ چنانچہ مقابلہ شروع ہوا۔

سب سے پہلے ایک لڑکی غزالہ نام کی آگے بڑھی۔ وہ سکول میں جمناٹک کرتی تھی اور باسکٹ بال ٹیم کی کپتان تھی۔ لبالب بھری ہوئی پیالی پر نظریں گاڑے ہوئے، احتیاط سے جما

جا کر پیر رکھتے ہوئے اس نے چڑھنا شروع کیا۔ چند فٹ تک وہ کامیابی سے چڑھتی گئی، اس کی ہمت بندھانے کے لئے نیچے سے عجیب و غریب نعرے لگائے جا رہے تھے۔ نعروں کے اس شور میں دفعتاً اس کی چابٹے چھلکی، پھر پاؤں پھسلا اور وہ گرتے گرتے بجی۔ پیالی بہر حال نیچے آ رہی۔ وہ وہیں پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ نیچے مصنوعی یاس و حسرت کی 'آہ' اور 'اُف' بلند ہوئیں۔ اب دوسرا امیدوار بڑھا۔ جلد ہی اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ پھر پیالیاں ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگیں۔

پرویز اکتا کر پنیری کے گملوں کے ساتھ ساتھ ٹہلتا ہوا دوسری جانب چلا گیا جدھر خالہ کھڑی باغبان سے باتیں کر رہی تھی۔ نعیم اور عذرا قریب قریب بیٹھے اپنی اپنی پیالیوں میں چائے بنانے لگے۔ انگریز لڑکی قمیض دوپٹے والی لڑکی سے کہہ رہی تھی:

”یہ ہندوستان کے نواب۔ اگر ان کو کچھ عرصے کے لئے انگلستان بھیج دیا جائے تو کیا اچھا ہو۔ جمیلہ تم نہیں سمجھتیں۔ میرے والدین کی بھی سکاٹ لینڈ میں جاگیر ہے، اور چائے کا ایک سیٹ ٹوٹنے سے ہمارا بھی اتنا کچھ ہی نقصان ہوتا ہے جتنا عذرا کا۔ لیکن ہمیں اس کی سزا میں سارا دن چائے نہیں ملتی۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ جب ہمارے کاؤں کی جھیل پر برف جمی ہوئی تھی اور میں چھوٹی سی تھی تو۔ اوہ، تم نہیں سمجھتیں۔“

مغرب کی طرف سے بادل اٹھ رہے تھے اور فضا گہری ہوئی جا رہی تھی۔ نعیم پیالی ہاتھ میں پکڑے دور اس عجیب و غریب درخت کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے چند روز پیشتر اس کی دوستی ہوئی تھی۔

”تم نے کہا تھا وہ تمہاری محبوب جگہ ہے۔“

”ہاں۔“ عذرا نے جواب دیا۔ پھر وہ دونوں اٹھ کر اس کی طرف چل دیے۔

عذرا نے پیالی مخصوص جگہ پر ٹکائی اور ہاتھ شلخ پر باندھ کر جھول گئی۔ ”آج کی تقریب کا مطلب آپ سمجھ گئے؟“

”اس کا کوئی مطلب ہی نہیں۔“ وہ ہنسا۔ عذرا کو دکر شلخ پر بیٹھ گئی۔

”آج پیالے پھر ایک جیسے ہیں۔“ نعیم نے کہا۔

”ہاں عجیب اتفاق ہے۔“

”اتفاق نہیں ہے۔“

”پھر؟“

”پہلے مجھے دوسرا پیالہ ملا تھا۔“

”تو؟“

”پھر میں نے جمیلہ سے یہ پیالہ لیا۔“

”کیوں؟“

”شاید آج پھر تبدیل ہو جائیں۔“

عذرا سر پیچھے پھینک کر ہنسی: ”عجیب منطقی ہے۔“

”مگر نہیں ہوئے۔“

”ہاں۔“

”جمیلہ نے پوچھا تھا اس میں کوئی خاص بات ہے۔“

”آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا؛ ”نہیں“۔“

”آپ نے جھوٹ بولا۔“

”ہاں۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”جمیلہ بڑی پیاری دوست ہے۔ وہ ہمارے سگے رشتہ داروں میں سے ہے۔“

”یہ اچھا لگتا ہے؟“ اچانک نعیم نے پوچھا۔

”کیا؟“

”تم نے کہا تھا انگریزی لباس پہن کر آنا۔“

”اوہ۔“ وہ ایک دم جھینپ گئی۔

بھورے رنگ کے بادل سارے آسمان پر گرج رہے تھے اور ہوا تیز ہو گئی تھی۔ مہین پھوار ان کے چہروں پر پڑنے لگی۔ ”بارش شروع ہو گئی۔“ عذرا نے کہا۔ پھر اس نے جوتا اتار کر پھینکا اور اوپر چڑھنے لگی۔ نعیم بھی اس کے پیچھے پیچھے چڑھا۔ وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر آہستہ آہستہ شاخ پر چل رہی تھی۔ گول، سرخ ایڑیاں نعیم کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ایک مختصر سے لمحے کے لئے اس کی لہڑی نعیم کے منہ سے ٹکرائی۔ وہ رک گیا اور سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس کے ٹخنے بھرے ہوئے، گول اور گلابی تھے۔ ہوا اس کے جسم سے رگڑ کھا کر درخت میں کم ہو رہی تھی۔ اور اودے ریشم کا لباس جسم کے ساتھ چپکا ہوا پھڑ پھڑا رہا تھا، جس سے اس کی فریب، صحت مند ٹانگیں، کولہے اور کمر واضح ہو گئے تھے۔ آٹھ دس گز اوپر جا کر وہ بیٹھ گئی اور تیز تیز سانس لینے اور ہنسنے لگی۔ تاریکی چاروں طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

”اگر بارش تیز ہو گئی؟“ نعیم نے پوچھا۔

”تو بھاگ جائیں گے۔“

”میں نے ابھی کچھ پوچھا تھا۔“

”کیا؟“

”یہ لباس؟“

عذرا نے ایک لمحے کو اندھیرے میں غور سے اسے دیکھا۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی: ”تم جب روشن آغا کی پارٹی پر آئے تھے تو بڑے عجیب لگ رہے تھے۔“

”کیسے؟“

”تمہاری ٹوپی کا پھندنا۔“

”چپ رہو۔“ نعیم نے اندھیرے میں خود کو سرخ ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ ہنسی۔ یہ وہی بے ساختہ، نوجوان، بھاری ہنسی تھی جو اتنی مانوس، اتنی پاکل کر دینے والی تھی۔ بجلی چمکی اور انہوں نے پتوں میں سے ایک دوسرے کو دیکھا، اور نعیم جو بات اتنے دنوں سے سوچ رہا تھا دفعتاً جان گیا۔ روشن آغا کے چہرے پر جو مانوسیت تھی عذرا کی وجہ سے تھی۔ دونوں کے چہروں پر ایک سا وحشیانہ پن تھا جس نے ان کے ہونٹوں اور آنکھوں کو خفیف سی درندگی عطا کی تھی، اور جس سے نعیم روشن آغا کی طرف بھی اسی طرح کھنچ گیا تھا جیسے عذرا کی طرف۔ اس نے ایک پتلی سی ٹہنی توڑی اور ہوا میں ہلانے لگا۔ شام کی گہری نیلگوں بارش سارے لان میں بھری ہوئی تھی۔ اور پتوں پر سے قطرے ان کے سروں پر ٹپک رہے تھے۔ وہ ایک ساتھ اٹھے اور اسی طرح چلتے شاخ کے آخر تک چلے گئے۔ یہاں پتے کھنسنے لگے۔

”کیوں ہنستے ہو؟“ عذرا نے پوچھا۔

”ہم بندروں کی طرح چل رہے ہیں۔“ نعیم نے کہا۔ وہ پاؤں لٹکا کر ساتھ ساتھ بیٹھ

گئے۔

برگد کے درخت تلے سے غول کا غول ”بارش بارش“ کا شور مچاتا ہوا برآمدے کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ وہاں روشنی تھی اور پرویز کے کمرے میں لڈیا پیانو کے سٹول پر بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ بارش کا اور پیانو کے اکا دکا سُر کا اور باتوں کا شور دور تک آ رہا تھا۔

”تم سر پیچھے پھینک کر کیوں ہنستی ہو؟“

”کیوں؟“

”یونہی۔“ وہ رکا، ”اچھا لگتا ہے۔“

دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر نعیم بولا: ”تمہارے ہونٹ رڑ کی طرح پھیل جاتے

ہیں۔ میرا جی کرتا ہے ہاتھ لگاؤں۔“ وہ دم سادھے بیٹھا استغفار کرتا رہا، پھر مصنوعی ہنسی ہنسا۔

”تم بھی روشن پور میں رہتے ہو؟“

”تمہیں کیسے پتہ؟“

”خالہ نے بتایا تھا۔“

”خالہ نے اور کیا بتایا؟“

”کچھ نہیں۔ روشن پور جاؤ گے؟“

”شائد۔“

”کب؟“

”پتہ نہیں۔“

نعیم نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں اس کے ہوشوں کو چھوا اور ان پر اٹھکی پھرتا رہا۔ پھر اس کی ناک اور آنکھوں کو چھوا، پھر کالوں کو دبا کر محسوس کیا، پھر جبرے اور ٹھوڑی پر سے پھسلتا ہوا اُس کا ہاتھ عذرا کے گول، مضبوط کندھے پر آگرا اور وہیں پڑا رہا۔ گیلے جسموں اور ہرے پتوں کی بو ان کی ناک میں داخل ہو رہی تھی۔

برآمدے میں سے خالہ کی تیز آواز گونجی، جو عذرا کو بلا رہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ بارش دفعتاً تیز ہو گئی۔ پھر وہ چونک کر اٹھی اور نعیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے نیچے کی طرف دھکیلنے لگی۔

”یہیں بیٹھتے ہیں۔“ نعیم نے بھاری آواز سے کہا۔

”چلو۔“ وہ خفت اور برہمی سے دانت پیس کر چیخنی۔ وہ دونوں بڑے بڑے سیاہ چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے نیچے اتر آئے۔

نعیم کو دیکھ کر خالہ کے ماتھے پر ہلکی سے شکن آئی۔ لیکن اس نے نرمی سے کہا: ”پانی پڑ رہا ہے بی بی۔ آپ کیوں بھیگتی رہیں؟“

پرویز کے کمرے میں ہڑبونگ مچی تھی۔ سب وہاں جمع تھے اور اپنے اپنے کھیلوں اور باتوں میں لگے تھے۔ صرف صاحب زادہ وحید الدین برآمدے میں کھڑے اپنے دلکش، فاتحانہ انداز میں انگریز لڑکی سے باتیں کر رہے تھے۔ برآمدے پر جھکی ہوئی میل پر سے پانی ٹپک رہا تھا۔

(۲)

سویرا ہونے والا تھا اور ستارے تیزی سے جھلملا رہے تھے۔ نعیم نے مسہری کا پردہ اٹھایا اور باہر نکل آیا، منڈیر پر جھک کر نیچے تھوکا اور اکتاہٹ سے اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ اس کے منہ میں صبح کی مخصوص بو اور پھیکا پن تھا۔ رات وہ بڑی دیر میں روشن محل سے لوٹا تھا۔ اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں ملیں اور ساتھ والی مسہری میں اپنے چچا کو ہلتے ہوئے دیکھا۔ رات کس قدر گرم تھی۔ اس نے سوچا۔ لیکن اب اس کا ذہن صاف اور تر و تازہ تھا

وہ انہیں بچوں کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے؛ اور وہ دن بھی جب پولیس آئی۔ سارے گاؤں کے لوگ گھروں میں چھپ گئے اور کوارٹر بند کر لیے گئے۔ کلیاں سنسان ہو گئیں اور مویشی اکیلے اکیلے کلیوں اور کھیتوں میں پھرنے لگے۔ انہوں نے ہمارے گھر کی تلاشی لی اور اسلحہ برآمد کر لیا۔ جب وہ اسے اکٹھا کر رہے تھے تو مجھے یاد ہے نیاز بیگ ان کی منتیں کرنے لگا۔ لیکن ایک سپاہی نے اس کی داڑھی پکڑ کر منہ پر طمانچے مارے اور وہ کھسیٹتے ہوئے اسے ساتھ لے گئے۔ ”ان کے ہاتھ اب مردہ پرندوں کی طرح میز پر رکھے تھے، اور وہ اپنی چکنی اور اداس آنکھیں آہستگی سے جھپک رہے تھے۔ ”چند دن بعد تمہارا باپ واپس آ گیا۔ اس کے گالوں کی ہڈیاں سیاہ ہو گئی تھیں۔ اور داڑھی کے آدھے بال جھڑ چکے تھے۔ لیکن اس کا سودا اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس سے اس کی ہنر مندی کا فخر نہ لے سکے۔ کوئی بھی نہ لے سکا۔ روشن آغانے ۔۔۔۔۔ اس سے کہا: ”نیاز بیگ تم سارے گاؤں پر تباہی لاؤ گے۔“ مگر نیاز بیگ بھوسے والے کمرے میں دروازہ بند کر کے اپنے کام میں مشغول رہا۔ اس کے ہاتھ میں ہنر تھا۔ اس نے دس دس گولیوں والی ایسی ایسی پستولیں بنائیں جو گاؤں میں کسی نے نہ دیکھی تھیں۔

”اب کی دفعہ پوری گاڑ آئی۔ انہوں نے سب کچھ قبضے میں کر لیا۔ بھوسے والے کمرے کو انہوں نے آگ لگا دی، اور سارے کواڑ توڑ کر میدان میں ڈھیر لگا دیا۔ پھر اس پر انہوں نے تمہارے باپ کے اور اس کی بیویوں کے اور میرے تمام تھے خوبصورت کپڑے پھینکے اور آگ لگا دی۔ گورے سارجنٹ نے پستول نکال کر آگ میں فائر کیا اور چیخ کر بولا: ”تمہاری ماؤں کے سر موٹ کر اس میں جلاؤں گا، اگلی دفعہ۔“ پھر وہ پستول لہراتا ہوا ہماری دکان پر گیا۔ کلیوں میں ہُو کا عالم تھا۔ گاؤں کی سب سے بڑی دکان ہماری تھی اور نیاز بیگ بڑا ماہرانہ کام کرنے والا تھا۔ اس نے کسانوں کی ضرورت کی تمام چیزوں سے علاوہ تاروں اور سلاخوں سے سمندری جہازوں کے ماڈل بھی بنا رکھے تھے۔ سارجنٹ نے تالے میں گولی ماری اور دروازہ توڑ کر بازار میں ڈالنے کا حکم دیا۔ پھر اس پر انہوں نے دکان کے سارے اوزار اور میلوں کے نعل اور ہل اور کنوؤں کی چکلیاں اور جہازوں کے ماڈل ڈھیر کئے اور آگ میں لوہے کی چیزیں مکھن کی طرح پکھلنے لگیں۔ اس نے آگ میں یکے بعد دیگرے تین فائر کیے اور جانوروں کی طرح چیخ مار کر بولا: ”ایک تمہاری بندوقوں کے واسطے ہے۔ اور یہ سارے گاؤں کے واسطے ہے۔ اور یہ تمہاری بیٹیوں بیٹیوں کے واسطے ہے جو بیوہ ہو جائیں گی، اگر تم باز نہ آئے۔“ نیاز بیگ، جس کی ہتھکڑیوں کی زنجیر اس کے گھوڑے کی زین سے بندھی تھی، کہتا رہا: ”میری بندوقوں سے ایک بھی گولی کبھی نہیں چلی۔ یہ میری نمائش کی چیزیں ہیں۔“ لیکن اس نے وحشیوں کی طرح گھوڑے کی پسلیوں میں ایڑیاں مارنا شروع کیں، اور میں نے گنے کے کھیت میں بیٹھے بیٹھے

دیکھا کہ نیاز یک گھوڑے کے پیچھے بھاگتا بھاگتا ، اوہ ۔“
 وہ خشک ، وزنی آواز نعیم کے دل پر پتھر کی طرح میٹھتی جا رہی تھی ۔ دوبارہ بولنے سے پہلے ایاز یک نے جھک کر فرش پر تھوکا ۔ لعاب سگار کے تباہ کو کی وجہ سے سیاہی مائل تھا ۔
 ”بارہ سال ہو گئے میں اس سے نہیں ملا ۔ میں نے اپنی محنت سے اتنی ترقی کی ۔ اگر سرکار کو آج بھی کوئی خبر کر دے کہ میں اس سے ملتا ہوں تو مجھ پہ سارے دروازے بند ہو جائیں ۔ اس نے خاندان کو تباہ کر دیا ۔

”تمہارے ماں باپ اب تم سے ملنا چاہتے ہیں ۔ وہ گاؤں آچکا ہے مگر تمہیں جلد واپس آ جانا چاہیے ۔ میں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی ۔ میں پڑھ سکتا ہی نہ تھا ۔ لیکن ہمارے خون میں ہنر ہے ۔ اور تمہیں میں نے تعلیم دلوائی ہے ۔ تم دنیا میں ترقی کر سکتے ہو ۔“
 وہ اٹھے کونے میں جا کر تھوکا اور ٹھگنے بوڑھے جانور کی طرح دھیمی متوازن رفتار سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے ۔

نعیم شام تک ہوتا رہا ۔ تین دفعہ اس کی آنکھ کھلی لیکن نیند کے غلبے کی وجہ سے پھر سو گیا ۔ ایاز یک نے کئی بار دروازے میں آکر دیکھا اور خاموش پلٹ گئے ۔ جب کمرے میں اندھیرا بڑھنے لگا تو وہ اندر داخل ہوئے ، لیمپ جلایا اور نعیم کے ماتھے پر ہاتھ رکھا ۔
 ”باہر چلو گے؟“

وہ آنکھیں بند کیے چارپائی پر بیٹھا رہا ۔ پسینے سے تکیہ گیلا ہو گیا تھا اور قیض اس کی پشت پر چپکی ہوئی تھی ۔ ”نہیں ۔“ اس نے بھاری آواز سے کہا ۔

لیمپ کی بتی اونچی کر کے ایاز یک باہر نکل گئے ۔ کمرے میں اس نے گیلی قیض اتاری ، چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھا ، اور اسے دور کونے میں پھینک دیا ۔ پھر وہ چارپائی پر بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا ۔ اس حالت میں اس نے بہت سے ملے جلے ، مختصر خواب دیکھے ۔ جب اس کا سر نیند میں دیوار سے جا ٹکرایا تو وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوا ۔ کچھ دیر تک کمرے کے وسط میں بائیں لٹکائے کھڑا دیوار پر اپنے سائے کو دیکھتا رہا ، پھر پتلون ٹانگوں پر چڑھائی ، نئی قیض پہنی اور بھاگتا ہوا باہر نکل آیا ۔

”شاید گرمی کی وجہ سے ہے ۔“ کھلی ہوا میں آکر اس نے سوچا ۔ لیکن غصہ سست رفتار بادل کی طرح اس کے دماغ پر منڈلا رہا تھا ۔

دور سے اس نے عذرا کو دیکھا ۔ وہ فوراً کے پاس کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی ۔ اس وقت اس نے ٹھٹک کر سوچا کہ وہ سلیپر پہنے چلا آیا ہے ۔ سبزے پر آہستہ آہستہ چلتا وہ عذرا کے پاس جا کھڑا ہوا ۔

”میں آج شام کو نہیں آسکا۔“ جمائی روکتے ہوئے وہ میز کے کونے پر بیٹھ گیا۔
 ”کیوں؟“

”سو یا رہا۔“

”کیوں؟“

”گرمی کی وجہ سے۔“

”کیوں؟“

”کیوں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

بجلی کی روشنی، سرسبز گھاس اور عذرا کی موجودگی سے اس کا مزاج کھل گیا۔ ”تم انتظار کرتی رہیں۔“

”ہم سب انتظار کرتے رہے۔“

”کون کون؟“

”پرویز۔ جمیلہ۔“

”تم نے بھی کیا؟“

جواب دینے کی بجائے عذرا نے ہاتھ بڑھا کر پانی کی پھوار کو محسوس کیا۔

”تم نے نہیں کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”کیوں؟“

”کیوں؟“ وہ خفگی سے چلایا۔ وہ دونوں ہنس پڑے اور ندامت سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ یہ دھیمی، خطاوار ہنسی تھی جو ان کے لبوں پر تھی اور جس نے دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی سے بے حد آگاہ کر رکھا تھا۔

”تم نے آج منہ نہیں دھویا۔ فوارے پر دھو لو۔“ عذرا نے کہا۔

نعیم نے پھوار میں ہاتھ گیلا کر کے چہرے پر پھیرا۔ بھیگی پلکوں کو تیز تیز جھپکتے ہوئے بچوں کی سی ہنسی اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی۔ ایک لمحے کا چور، جو آنکھوں میں ظاہر ہوا تھا، غائب ہو گیا۔ ”گھاس خشک ہے۔“ اس نے کہا۔

شام کی گرم ہوا اس کے رخ تیز ہو گئی اور فوارے کے مہین قطرے اس کے جسم کو بھگونے لگے۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اس کا ذہن پہاڑی جھیل کی طرح شفاف تھا۔ اس نے پھوار کو گرتے، ہوا کو تیزی سے چلتے، سبزے کو ہاتھوں کے نیچے اٹھتے اور پانی کو زمین میں جذب ہوتے ہوئے واضح طور پر دیکھا اور محسوس کیا۔

”یہاں آ جاؤ۔“ آنکھیں کھول کر اس نے بھاری آواز سے کہا۔

عذرا ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھے اداس نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ تھے تھے قطرے اس

کے گندمی کالوں پر گر رہے تھے۔ نعیم کو محسوس ہوا کہ اس کا کلا سوج گیا ہے۔ اس نے بے تابی سے گلے پر ہاتھ پھیرا۔

”آؤ۔“ اس کی آواز بھاری، خشک اور غیر مانوس تھی۔
عذرا قلم سے ناخن پر لکیریں کھینچنے لگی۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔
”میں نے آج تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔“

”ہم سب خواب دیکھتے ہیں۔“ وہ ایک کے بعد ایک سارے ناخن کالے کر رہی تھی۔
نعیم تھے قطروں کو دیکھتا رہا جو اس کے کمال، ٹھوڑی، ناک، ماتھے اور ہونٹوں پر چمک رہے تھے، گویا ہزاروں ققمے اس کے چہرے پر جل رہے ہوں۔ اس نے سوچا وہ بندرگاہ پر کھڑا ہے اور جہازوں کی ان گنت روشنیاں پانی میں جھلملا رہی ہیں۔ اس نے بولنا چاہا، لیکن اس کا حلق پھر سوج گیا۔ پھر اس کی دو انگلیاں عذرا کے کمال پر پھسلیں۔ کئی تھے تھے قطرے ٹوٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ ملے اور ایک بڑا قطرہ اس کی ٹھوڑی پر جا کر لٹک گیا۔ وہ مڑ کر ہنسنے لگا۔

”تم نے کوئی بندرگاہ دیکھی ہے؟“

”نہیں۔“

”جہازوں کی روشنیاں سمندر میں اسی طرح تیرتی ہیں۔“

عذرا منہ پھیرے اندھیرے میں دیکھتی رہی۔

”میرا جی چاہتا ہے سمندری فوج میں چلا جاؤں۔“

”اچھا؟“

”ہاں۔ یہ ایسا شاندار ہوتا ہے۔ جہاز ایک شہر کی طرح ہوتا ہے جس میں گھر بنے ہوتے ہیں اور دکانیں، کھانے کے ہال کمرے، کھیل کے میدان اور روشنیاں، جو رات کے وقت پانی میں جھلملاتی ہیں۔“

”اچھا؟“ اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا، ”میں نے یہ سب سن رکھا ہے۔ میرا دل چاہتا

ہے سمندر کا سفر کروں۔“

”جب میں نیوی میں جاؤں گا تو تم بھی ساتھ چلتا۔“

”اچ چ چ چھا۔“ وہ میز پر جھک گئی۔

”چلو گی؟“

وہ خاموشی سے ناخن کھرچتی رہی۔

”چلو گی عذرا؟“

”کیا تم جا سکتے ہو؟“ اُس نے ہولے سے پوچھا۔
”میں کوشش کروں گا۔“

اسی وقت روشن آغا برآمدے میں ظاہر ہوئے اور باغ کی طرف دیکھے بغیر دوسرے بازو کی طرف چلے گئے۔

”آج روشن آغا ناراض ہیں۔“ عذرا نے کہا۔
”کیوں؟“

”پرویز کے بیاہ کی بات ہو رہی تھی۔“
”پھر؟“

”سب کا خیال ہے کہ اسے جمیلہ سے شادی کر لینی چاہیے۔ وہ نہیں کرتا۔“
”کیوں نہیں کرتا؟“

”وہ اس بات کا جواب نہیں دیتا۔“

رات پڑنے پر سرس کے درخت گئے پتے بند ہو کر لٹک گئے تھے۔ سڑک پر ایک میل گاڑی روں روں کرتی گزر رہی تھی اور میلوں کو چلاتے ہوئے دو جاٹ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ سبزے پر چلتی ہوئی ہوا گرم اور خوش گوار تھی۔ نعیم نے میز پر اٹھکیاں پھیلانیں۔

”کیا یہ ممکن ہے، عذرا۔۔ میں نے پوچھا تھا، کیا یہ ممکن ہے؟“ اس نے رک رک کر روز کی معمولی، غیر جذباتی آواز میں کہا۔

”روشن پور کب جاؤ گے؟“

”تم نے پہلے بھی پوچھا تھا۔ کیوں پوچھتی ہو؟“

”تم اپنے والدین سے ملنے جاؤ گے۔“

نعیم کا رنگ سفید ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ بہت سی طاقت اس کے گھٹنوں میں سے گزر کر نیچے زمین میں جا رہی ہے۔ وہ آہستہ سے گھاس پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

”لیکن خالہ نے مجھے بتایا تھا کہ۔ تم سرکاری نوکری میں نہیں جا سکتے۔“ عذرا نے کہا اور نعیم کی اٹھکیوں کو دیکھنے لگی، جو سبزے پر بہت سفید لگ رہی تھیں۔ وہ دو زانو بیٹھا

ہوا سفید پتھر کے محسمے کی طرح خوبصورت اور نازک نظر آ رہا تھا۔

پھر وہ اٹھی اور بات کیے بغیر برآمدے کی طرف چلی گئی۔

جب نعیم پھاٹک سے نکل رہا تھا تو چوکیدار نے بڑھ کر کوئی بات کی، جس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بند مٹھی کی طرح کوئی وزنی، بد مزہ سی شے اس کے معدے میں

پڑی تھی۔ سڑک پر چند قدم چلنے کے بعد دفعتاً دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا غصہ اس کے

سر پر چڑھا۔ اس نے چھلانگ لگا کر نالی پار کی اور باڑ میں سے منہ نکال کر چیخا: ”لیکن تمہاری ماں۔۔ وہ بری عورت ہے۔ اور خالہ بھی۔“
چوکیدار نے قریب آ کر پھر کوئی بات کی۔
”جاؤ۔“ وہ آنکھیں نکال کر دھاڑا اور سڑک پر بھاگنے لگا۔

(۵)

چند روز کے بعد نعیم روشن پور کے لیے روانہ ہوا۔ ریل کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ سوائے ایک ناگوار واقعے کے جو رانی کوٹ سے ایک اسٹیشن ادھر پیش آیا۔ علی پور سے گاڑی چلی تو جس سے گھبرا کر ڈبے کے دروازے میں اکھڑا ہوا۔ پلیٹ فارم پر بھاگتا ہوا ایک بوڑھا آدمی گاڑی پکڑنے کے لیے بدحواسی میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کے کندھے پر لٹھی میں اڑسی ہوئی گٹھڑی جھول رہی تھی اور اس کا چہرہ لو میں کام کرتے رہنے کی وجہ سے جھلسا ہوا تھا، جیسے عام کسانوں کا ہوتا ہے۔ نعیم نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر گاڑی تیز ہو گئی۔ آخر ”مر جائے گا۔۔ کٹ جائے گا“ کے شور میں اس نے لپک کر ساتھ والے درجہ اول کا پینڈل پکڑا اور کسانوں کی طرح ٹانگیں پھیلا کر چھلانگ لگائی۔

جب وہ جم کر پائیدان پر کھڑا ہو گیا تو شرمندگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کئی خشمگین چہرے گردنیں بڑھا بڑھا کر اُسے گھور رہے تھے۔
”اگر مر جاتا تو؟“ نعیم نے غصے سے چلا کر کہا۔

بڑھے کا بے دانت کا منہ اچانک سادہ، شرمیلی ہنسی میں پھیل گیا۔ ”میری بیوی گاڑی میں ہے۔“
”بیوقوف!“

جواب دینے کی بجائے اُس نے لٹھی سے دروازہ کھٹکھٹایا اور گٹھڑی کی کانٹھ کسنے لگا۔ دروازہ کھلا اور ایک سفید چہرہ اور تنکا بدن ظاہر ہوا گورے کی آنکھیں نیند سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ڈبے میں خنک اندھیرا تھا۔

”کیا مانگتا۔ کیوں آیا؟“ گورا آنکھیں نکال کر چیخا۔
جواب میں کسان اسی طرح سادگی سے ہنسا۔ ”میں نیچے بیٹھ جاتا ہوں۔ اگلے اسٹیشن پر

اتر جاؤں گا۔ میری بیوی گاڑی میں ہے۔“ اُس نے کہا، اور اطمینان سے دروازے میں بیٹھ کر گٹھڑی کسنے لگا۔

”نیچے جاؤ مانگنا۔ آسنٹا؟“ پاؤں سے وہ اُسے نیچے دھکیلنے لگا۔

”گاڑی بھاگ رہی اے صاب۔ کہاں جاؤں؟“

”آں؟ نائیں جاؤ آں؟“ اُس نے پیر کی ٹھوکر سے کسان کی گٹھڑی باہر اُچھال دی جو اڑتی

ہوئی زمین پر گری اور لوگوں نے اُس میں سے باجرہ اور گڑ بکھرتے ہوئے دیکھا۔ ”جاؤ۔“

”ہا۔۔۔ میرا باجرہ۔“ بڈھے کا منہ کھل گیا۔ پھر دفعتاً غصے سے بھنا کر وہ اُٹھا اور لاٹھی

گورے کی ٹانگوں پر مارنے لگا۔ ”مجھے مار دو۔ پھینک دو۔ باجرہ۔۔۔ میرا گڑ میں تمہارے

باپ سے بھی لوں گا۔ گورے سؤر۔ اب میں اپنی لڑکی کے لیے کیا لے کر جاؤں؟ ہیں؟“ چپخنی

سے رال اُس کی داڑھی پر بہنے لگی۔ انگریز نے اُس کی لاٹھی چھین کر نیچے پھینک دی اور بڑے

بڑے بوٹوں والے پاؤں اندھا دھند اس کے چہرے اور چھاتی پر مارنے لگا۔

’اپنی لڑکی کے لیے ایک سؤر لے جاؤ۔“ اس نے انگریزی میں کہا۔ پھر وہ گالیاں بکنے

اور بے تحاشا ٹانگیں چلانے لگا۔ اُس کا ایک بوٹ ایڑی تک اکھڑ گیا۔ کسان کا سر لٹک گیا اور

آنکھیں بند ہو گئیں۔ لیکن اس کا بازو ابھی تک پینڈل کے گرد کسا ہوا تھا۔ اُسے جھلسے ہوئے

چہرے پر خون کی دھاریاں بہ رہی تھیں اور اس کی داڑھی خون، پسینے اور رال سے لتھڑ گئی تھی۔

جب رانی کوٹ کے سٹیشن پر دو گورے سارجنٹوں نے آکر اُسے پینڈل سے علیحدہ کیا تو

وہ گندم کی بوری کی طرح زمین پر گرا اور مر گیا۔ سارجنٹوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گورے کا چہرہ

کھڑکی سے باہر آیا۔ پولیس والوں کے جواب میں اس نے کچھ کہا، جس پر دونوں سارجنٹوں نے

مستعدی سے فوجی سلام کیا اور بولے: ”لیکن آپ زیر حراست ہیں۔“

”باہ۔“ گورے نے کال پھلا کر کہا اور کھڑکی گرا دی۔ سارجنٹ دونوں پینڈل پکڑ کر

پائیدان پر کھڑے ہو گئے۔

”وہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ پر بوڑھا مر گیا۔“ مجمعے میں سے کسی نے بات کی۔

”تو کیا ہوا؟“ سنہری چشمے اور بڑے سے ماتھے والے ایک آدمی نے کہا۔

”وہ عدالت میں تو پیش ہو گا۔“ نعیم نے خشکی سے کہا۔

”ضرور ہو گا۔ ضرور ہو گا“ وہی آدمی بولا، ”یہ لوگ بڑے قانون دان ہوتے ہیں۔ لیکن

جیوری میں کون ہو گا؟۔ تمہارا کوئی چچا جیوری میں ہے؟“ وہ جانے کے لیے مڑا، پھر پلٹ کر

نعیم کے پاس آکھڑا ہوا۔ ”یہ سؤر، میں تمہیں بتاتا ہوں برخوردار، آج ہی رات کو اپنی بیوی کے

ساتھ جا کر سوئے گا۔ میں نے اپنی عمر میں ایسے پچاس سے اوپر واقعات دیکھے ہیں۔ ایسے

مقدموں کے لیے سفید جیوری ہوتی ہے۔ بالکل سفید۔“

نعیم اُس کے لہجے کی تیزی سے گھبرا گیا۔ جب وہ پلیٹ فارم کے باہر جا رہا تھا تو اُس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک بھدی سی بوڑھی کسان عورت لاش کے ساتھ لپٹ کر رو رہی تھی۔ چودہ کوس کا سفر نعیم نے ایک مریل سی سیاہ گھوڑی پر طے کیا۔ گاؤں کا ایک کمین، جو اُسے لینے آیا تھا، ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پگڈنڈیوں کے دو رویہ جھڑیریاں اور خودرو جھاڑیاں کثرت سے اگی ہوئی تھیں۔ اُس کا راہبر مستقل باتیں کر رہا تھا:

”اس سال چوہدری نیاز بیگ نے خود غلہ کاشت کیا۔ بڑی بھاری فصل ہوئی۔ تین من تو مجھ کو دیے۔ اور یہ گھوڑی خریدی۔ بڑا اول نسل کا جانور ہے۔“ اُس نے گھوڑی کی پیٹھ پر ہاتھ مارا جو ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ”مگر یہ جاٹ نگر کے جولاہوں کے پاس تھی۔ انہوں نے اس کا ناس مار دیا۔ کبجنت کمین۔ جانور پر ظلم کرنا اپنی جان پر ظلم کرنا ہے بھائی۔ چوہدری نیاز بیگ کے بعد تو زمین ویران ہو گئی تھی۔ ہت تمہارے کی، کم ذات کتو۔ ہم تمہارے گاؤں میں نہیں ٹھہرتے، فکر نہ کرو۔ اب دفع ہو جاؤ۔ اب کی بار پانی کی تنگی رہی، چاول کی کاشت نہیں ہو سکی، مگر.....“

شام پڑ رہی تھی جب دھند لکے میں انہیں روشن پور کے پیڑ دکھائی دیے۔ ”کتوں کی پروا نہ کرو۔ ان کی بھونکنے کی پرانی عادت ہے۔ ہمیں پہچان کر خاموش ہو جائیں گے۔ نیاز بیگ آ گیا۔“

نیاز بیگ ایک بڑے سے کیکر کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی اٹھا اور باہیں پھیل کر دوڑتا ہوا آیا۔ پتلی چھڑی، جو پکڑے ہوئے تھا، پرے پھینکی اور نعیم سے لپٹ گیا۔ پہلے اُس نے اپنے بیٹے کو چھاتی پر چوما، پھر چہرہ کھینچ کر قریب لایا۔ اور منہ ہی منہ میں نا قابلِ فہم الفاظ بڑبڑاتا ہوا اُس کے ماتھے، گال اور کانوں کو چومنے لگا۔ لپٹنے اور چومنے کے دوران وہ حلق سے خوشی کی عجیب و غریب آوازیں نکالتا جا رہا تھا۔ نعیم نے محسوس کیا کہ اُس کی داڑھی سخت کھردری تھی اور جسم سے پسینے اور سبز چارے کی بو آ رہی تھی۔

پھر نعیم سے جدا ہو کر وہ اُس کے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا: ”اتنی دیر لکائی؟ پیدل چلاتا لایا؟ یا با نہیں کرتا رہا ہو گا۔ باتو فی میرا سی۔ میں تم کمین لوگوں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔“ اُس نے ہوا میں اٹھکی نچا کر کہا اور گھوڑی کی باگ پکڑ کر چلنے لگا۔ میرا سی اُس کے آگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش میں بحث کر رہا تھا۔ لیکن اس نے کچھ نہ سنتے ہوئے نعیم کی کمر میں ٹھو کا دیا: ”دیکھا کیسے باتیں کر رہا ہے؟ میں خوب سمجھتا ہوں۔ کمین کی ذات کو خوب سمجھتا ہوں۔ تمہارا دل کالا اور زبان روشن ہوتی ہے۔ اب تم فصل پر آنا۔ تمہیں چیونٹی کا فضلہ دوں گا۔ پورا تین من۔“ اس نے ہوا میں مکہ چلایا اور مصنوعی غصے سے اچھل

اچھل کر چلنے لگا۔

گھر کے باہر دو عورتیں کھڑی اونچی آواز میں رو رہی تھیں۔ نیاز بیگ لال پیلا ہو کر ان سے مخاطب ہوا: ”دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا اس باتونی میرا سی کو مت بھیجو۔ جادفع ہو جا۔“ پھر وہ اچھل کر گھوڑی پر سوار ہو گیا اور عورتوں کے گرد ایک چکر کاٹا، پھر کود کر اترا اور چھڑی سے بے تحاشا اسے پیٹنے لگا۔ ”جولاہوں کمینوں نے تجھے کچھ نہیں کھلایا۔ ہیں؟ مکڑے کی طرح چلتی ہے۔ کمینی۔۔“ گھوڑی ٹانگیں پھیلائے خاموش کھڑی رہی۔

بوڑھی عورت روتی ہوئی نعیم سے لپٹ گئی اور اُسے سارے جسم پر چومنے لگی۔ اس کے بالوں سے کھی کی بو آ رہی تھی۔ ”میرے بچے۔۔ میرا بچہ۔“ وہ کہے جا رہی تھی۔ دوسری نسبتاً جوان عورت پاس کھڑی اُس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ بوڑھی عورت اس کے سارے جسم کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھی اور روتی ہوئی کچھ بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ جو نعیم کے لیے ناقابل فہم تھا۔ دو کتے ان کے پاس آکر لڑنے لگے۔ نیاز بیگ گھوڑی کو چھوڑ کر کالیاں دیتا ہوا بھاگا اور دور تک ان کے پیچھے دوڑتا ہوا چلا گیا۔ آس پاس کے گھروں سے مرد اور عورتیں دیے اور لالٹینیں لے کر نکل آئے۔ نیاز بیگ نے اسے اندر کی طرف کھینچا۔

”انہیں چھوڑو۔ یہ بے وقوف عورتیں ہیں۔ تمہارا باپ مر گیا جو رو رہی ہو؟“ گلی کی نگر پر سے ایک نوجوان سکھ لڑکے نے پکار کر پوچھا: ”چچا تیرا بیٹا آگیا؟“ ”ہاں ہاں، آگیا۔“ اُس نے جلدی سے نعیم کو بے کواڑ کے دروازے میں سے اندر کھینچا۔ ”یہ غیر تعلیم یافتہ آوارہ لونڈے ہیں۔ تمہیں ان سے دوستی رکھنے کی ضرورت نہیں۔“

موشیوں کے احاطے میں دو بھینسیں میٹھی جکالی کر رہی تھی، دو میل چارہ کھا رہے تھے۔

”یہ میں نے اس سال تیسرے مہینے میں خریدا تھا۔“ نیاز بیگ نے اپنے خشک، مضبوط ہاتھ سے میل کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ ”چار من غلے میں آیا۔“ پچھلی منڈی میں اسے کاغذ ملا تھا۔ بہترین نسل کا جانور ہے۔ کیوں چوہدری؟“

”ہاں چوہدری۔“ میرا سی نے جواب دیا۔ ”بیس بیس کوس میں اس کا جواب نہیں۔ جاٹ نگر کے چوہدریوں کا میل بھی مر کے ایک کھیت تیار کرتا ہے۔ اس ہیرے نے سورج سر پر آنے سے پہلے پہلے ڈیڑھ کھیت تیار کیا ہے۔ میرے سامنے کی بات ہے چوہدری۔“

”سچ ہے۔ بالکل سچ۔“ نیاز بیگ نے فخر سے کہا۔ پھر وہ عورتوں کو مخاطب کر کے بولا: ”ہو ہوبند کرو بے وقوف عورتو، تم نے چاول نہیں نکالے۔ آؤ چوہدری میٹھو۔ چاول کھاؤ۔“ اس نے دوستانہ انداز میں میرا سی کا کندھا تھپکا۔

جب وہ کھانے پر بیٹھے تو اس کی ماں بھاگ کر سٹول لے آئی اور اصرار کر کے نعیم کو اس پر بٹھلایا۔

”بیٹھو بیٹھو۔۔۔ یہ سٹول میں نے خود بنایا ہے۔“ اس کے باپ نے کہا۔

ایک بڑے سے تھال میں سفید ابلے ہوئے چاول نکال کر بڑھی نے ان پر سرخ شکر چھڑکی اور گرم گرم مکھن انڈیلا جو شکر اور چاولوں میں جذب ہو گیا۔ پھر احتیاط سے اٹھا کر اسے کمرے کے وسط میں لا رکھا۔ گھر کے تینوں مرد اس کے گرد بیٹھ گئے اور اپنے اپنے آگے سے کھانے لگے۔ سٹول پر بیٹھے نعیم نے جھک کر دو چار نوالے لیے، پھر جھلا کر اسے پیچھے لڑھکا دیا۔

”یہ فضول ہے۔“

اس زوروں کی بھوک لگی تھی۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر اس نے آدھا تھال خالی کر دیا۔ حتیٰ کہ اُس کی خالی کی ہوئی جگہ بڑھتی بڑھتی اس کے باپ اور چھوٹے لڑکے کے آگے کی خالی جگہوں کی حدود سے جاملی۔ نعیم نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کی ماں نے بڑی احتیاط سے کرتے کے دامن میں پکڑ کر اس کا ہاتھ صاف کیا۔ پھر اس نے چھوٹے لڑکے کی گردن میں پنکھے کی ڈنڈی چبھوئی۔

”کم کھا۔ پھر تیرا پیندا دو دو گھڑی پر کھلنے لگے گا۔“ لڑکا خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

”یہ کون ہے؟“

”یہ بڑھیا کا بھتیجا ہے۔ اس کے ماں باپ بڑے سفیے میں مر گئے۔“

”یہ تمہارے ماموں کا لڑکا ہے۔“ بڑھیا نے بتایا، ”اس کی بیوی کم ذات نے اس پر جادو کر دیا تھا۔“

”جھوٹ مت بول، بے وقوف۔ وہ بیس کاؤں میں سب سے خوبصورت عورت تھی۔“

نیاز بیگ نے ہاتھ روک کر کچھ سوچا، پھر خیال ہی خیال میں مسکرایا اور تھال پر جھک گیا۔ اس کی بیوی نے سارے چاول اُس کے آگے سمیٹے، پھر مکھن والا برتن اونہٹھا کر کے اٹھکی سے پونچھ کر آخری قطرہ تک ان پر پٹکایا اور تھال اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ لہلیوں کی طرح چاولوں پر پل پڑا۔

دیوار پر لٹکی ہوئی لائین کی روشنی اُپلوں کے دھوئیں میں اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔ نیاز بیگ کی آنکھوں کے حلقے آدھے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں سیاہ تھیں۔ کالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے اور جبرے کی ہڈی مضبوط اور تنگی تھی۔ وہ ایک فاقہ زدہ بوڑھے میل کی طرح چہرے کی تمام ہڈیوں اور ہٹھوں کی نمائش کرتا ہوا کھا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا خلا تھا اور چہرہ کبھی گئے گزرے ہوئے وقتوں میں خوبصورت رہا ہو گا۔ نعیم یہ سوچ کر لرز گیا کہ اس کی اپنی شکل اپنے باپ سے کس قدر میل کھاتی ہے۔

”وہ چٹیل تمہیں دکھانے کو رو رہی تھی۔“ بڑھیا نے پنکھا نیاز یگ کے کندھے میں چبھویا۔

”ہیں؟“

”وہی۔ اب رات کو ٹونا کرے گی۔“

”بھونکو مت۔“ وہ یوں چاولوں پر جھک گیا گویا ان پر خفا ہو رہا تھا۔

”وہ کون تھی، جو رو رہی تھی؟“ نعیم نے پوچھا۔

”وہ دوسری عورت ہے۔“ اس کی ماں نے بتایا۔ ”تمہیں اس کے گھر جانے کی کوئی

ضرورت نہیں۔ جادوگرنی ہے۔“

جب چاول تھوڑے سے رہ گئے تو نیاز یگ نے برتن اپنی بیوی کے آگے سرکایا اور

انگلیوں سے داڑھی اور سر کے بال چکنے لگے۔

”آپ کب آئے؟“

نیاز یگ نے خالی خالی نظروں سے نعیم کو دیکھا۔ ”پار سال چھٹے مہینے۔“

گو رات بے حد گرم تھی اور صحن کی زمین گوبر کے پچھروں سے اٹی پڑی تھی، پر نعیم

بے سدھ ہو کر سویا رہا۔

جب وہ اٹھا تو صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا اور گھر میں کہرام برپا تھا۔ دونوں عورتیں صحن

میں اپنے اپنے دروازے پر کھڑی جھگڑ رہی تھیں، بازو بڑھا بڑھا کر اشارے کر رہی تھیں اور گلا

پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھیں۔

نعیم چارپائی سے اٹھا تو بھینس نے پیشاب کرنا شروع کر دیا، اس سے بچنے کے لیے اچھل

کر پرے ہوا تو ٹخنوں تک گوبر میں گھس گیا، وہاں سے اچھلا تو پیشاب کے ایک چھوٹے سے

تالاب میں جا گرا جہاں وہ گھٹنوں تک بھیک گیا۔ دل ہی دل میں کوستا ہوا وہ نلکے کے نیچے جا

کھڑا ہوا۔ چھوٹا لڑکا بھاگتا ہوا نلکا چلانے کے لیے آیا۔

عورتیں چیخ رہی تھیں:

”پرسوں میں نے اسے کھلایا اور لے کے آج تو اسے گھس گئی۔ گرم کتیا۔“ بوڑھی

عورت نے کہا۔

”اور پچھلے مہینے۔ کھلا پلا کے میں میکے چلی گئی تھی تو تو نے گل چھرے نہیں اڑائے

میرے مال پر۔“

”تمہارا یار جو مر گیا تھا، تیرا جانا تو ضروری تھا۔ اور کھا پی کر کیا وہ تیری ماں کے پاس

جا کے سوتا۔“

”زبان بند کر چڑیل - میرا مال مفت میں نہیں آیا - تیرا جوان بیٹا کل آیا ہے - آج ہی رات تُو نے - آج ہی رات کرتے - - میں؟“

”تجھے شرم نہیں آتی کم ذات - نو مہینے ہوئے نہیں اسے لوٹے اور لے کے بچہ باہر پھینک دیا - استغفر اللہ -“

”بدماش - تیرے سفید بالوں کا لحاظ ہے ورنہ میں تیرے بیٹے سے ڈرتی نہیں ہوں -“

چھوٹی عورت نے عمد آسر تگا کر کے اپنے سیاہ بال بڈھے کی طرف جھٹکے -

کچھ دیر پہلے نیاز بیگ کھسیانا چہرہ لے کر چھوٹی عورت کے کمرے سے نکلا تھا اور دونوں کے درمیان آکھڑا ہوا تھا - تھوڑی دیر تک ادھر ادھر دیکھنے کے بعد غصے میں آکر وہ بھی صحنے لگا:

”چپ رہو - بے وقوفو - تم دونوں کو باہر نکال دوں گا - دونوں کو مار دوں گا - دونوں کو پیٹوں گا - دونوں کو -“ اس کی داڑھی ہوا میں هل رہی تھی اور دونوں بازو ہوا میں لہراتا ہوا وہ تیزی سے گھوم رہا تھا - دور سے دیکھنے والوں کے لیے وہ کسی دیہاتی ناچ کا منظر پیش کر رہا تھا -

”بھونکنا بند کرو - کتیو - دونوں کو کتے خرید دوں گا - دونوں کو گدھے خرید دوں گا - دونوں کو سوڑ خرید دوں گا - پھر ٹھیک ہے؟“ ناچتے ہوئے اس نے بازو سے دونوں عورتوں کے درمیان کی ہوا کاٹی، مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ دونوں میں سے ایک بھی اس کے قریب نہ آنے پائے - یوں بچا بچا کر اس نے دو چار ہاتھ ہوا میں چلائے اور گردن لمبی کر کے دھمکاتا رہا: ”زمین میں گاڑ دوں گا - زندہ - جاتی ہو؟ سوڑ خرید دوں گا -“

مگر جب دونوں عورتیں چمٹے پکڑ کر پھنکارتی ہوئی بڑھیں اور کتھم گتھا ہو گئیں تو وہ شرمندگی سے ہنستا ہوا نعیم کی طرف آیا: ”تم باہر جاؤ - یہ سب اجڈ گنوار عورتیں ہیں - میں انہیں کچا چبا جاؤں گا - اس نے اسے دروازے کی طرف دھکیلا -

دروازے کے باہر دو کتے چہلیں کر رہے تھے - ایک پہلی ہوئی بھینس اطمینان سے جکالی کر رہی تھی - ایک کو اس کے سر پر بیٹھا چونچ مار رہا تھا اور دو باتونی چڑیاں اس کے گوبر کو کرید رہی تھیں - رات والا سکھ لڑکا چھینٹ کی بنیان پہنے کتوں کے پاس کابلی سے کھڑا جامیاں لے رہا تھا - سامنے کھاد کے ڈھیر پر ایک کتیا اپنے متعدد بچوں کو دودھ پلا رہی تھی - سکھ لڑکے نے لاپرواہی سے نعیم کو دیکھا اور جامیاں لیتا رہا -

”تم چوہدری نیاز بیگ کے بیٹے ہو؟“ پھر اس نے پرے دیکھتے ہوئے گنواروں کی طرح پوچھا -

”ہاں -“

سکھ نے ایک نو عمر کتے کو کان سے پکڑ کر اٹھایا اور گھما کر جوہر میں پھینک دیا - کتا چیختا

ہوا بھینسوں کی پیٹھ پر جا چڑھا جو وہاں نہا رہی تھیں۔ چھوٹے لڑکے جو بھینسوں کی دمیں پکڑے تیر رہے تھے کتے کی نقل میں چنچنے اور اس پر پانی پھینکنے لگے۔

”آج پھر بڑھیاں لڑ رہی ہیں۔“ سکھ لڑکا سادگی سے ہنسا۔ ”روز لڑتی ہیں۔“

”کیوں؟“ نعیم نے غصے کو دبا کر کہا۔

”تین دن ایک، چوہدری کو مکھن کا پیڑا اور مرغا کھلاتی ہے، تین دن دوسری۔ ساتویں دن چوہدری کھیتوں میں جا کر سوتا ہے۔ مگر جب ایک کا کھا کر دوسری کے پاس چلا جاتا ہے تو لڑائی ہو جاتی ہے۔“

نعیم کی گردن پر بال کھڑے ہو گئے۔ سکھ لڑکا پھر خوش دلی سے ہنسا

”روز چوہدری کہتا ہے: مار دوں گا۔ گاڑ دوں گا۔“ پر اس نے آج تک ہاتھ نہیں

اٹھایا۔“

”نعیم اتہائی غصے کی حالت میں بھی اپنے باپ کا حلیہ یاد کر کے ہنس پڑا۔

”لیکن بارہ سال ان کا بڑا سلوک رہا۔ جب چوہدری جیل میں تھا تو دونوں بہنوں کی طرح رہیں اور ایک ہی تھالی سے کھاتی رہیں اور کسی غیر مرد کی ران نہیں دیکھی۔“

نعیم نے دل میں اسے گالی دی۔

”بڑھے کا انہوں نے عورتوں کی طرح انتظار کیا۔“ سکھ پھر بولا۔ ”چھٹالوں کی طرح

نہیں۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“

”گندم لادنی ہے۔“

”میں بھی چلوں گا۔“ نعیم نے کہا۔ سکھ لڑکا بے دھیانی سے چلتا رہا۔ جوہڑ کے آخر

پر جا کر وہ دائیں طرف مڑ گئے۔ سامنے وسیع اور تنگے کھیت تھے۔ بائیں طرف کاؤں کے چھوٹے

چھوٹے کچے مکان تھے۔ سورج کافی اٹھ آیا تھا۔ اور گرم چمک دار دھوپ کھیتوں میں پھیل گئی

تھی۔ فصل کاٹ لی گئی تھی اور کہیں کہیں سبز گھاس کے قطعے نمودار ہو رہے تھے۔ باقی جگہ پر

بھوسے کی ناٹس اور خشک، سخت جڑیں بکھری ہوئی تھیں۔ تازہ تازہ کٹائی کے بعد جگہ جگہ

کبوتروں اور دوسرے پرندوں کے غول پرے بیٹھے چک رہے تھے۔ درخت صرف کاؤں کے

ارد گرد اور جوہڑ کے کنارے پر تھے۔ زیادہ تر شیشم اور آم کے گھنے پیڑ تھے جن کے سائے

میں مویشی بندھے تھے اور چارپائیوں پر اکاد کا کسان سو رہے تھے۔ دور مغرب میں گھنے درختوں

کی قطار تھی اور کسی کسی کھیت میں پکی ہوئی فصل کھڑی تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے

کاؤں سے نکل آئے۔

”کٹائی کی یہ کون سی رت ہے؟“

”ہم نے دیر میں بیانی کی تھی۔ ہماری وہ سامنے کچھ فصل کھڑی بھی ہے۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ٹھا کر مہندر سنگھ۔“

چلتے چلتے وہ گیہوں کے کھیت کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں کی زمین نم اور گھاس سر سبز

تھی۔

”تم کہاں سے آئے ہو؟“ مہندر سنگھ نے پوچھا۔

”دہلی سے۔“

”وہاں رہتے ہو؟“

”نہیں۔ میں کلکتے میں رہتا ہوں۔“

”کلکتے۔۔۔“ مہندر سنگھ رک کر سوچنے لگا۔ پھر اس کے چہرے پر وہی بچوں کی سی

ہنسی پھیل گئی۔ ”کلکتے بنگال میں ہے۔ مجھ کو پتہ ہے۔“

”تمہیں کیسے پتہ ہے؟“

”میرا بھاپا وہاں تھا۔“

”وہاں کیا کرتا تھا؟“

”تمہیں اس سے کیا؟“

عجیب جاہل لوگ ہیں۔ نعیم نے سوچا۔ چوری کرتا ہو گا۔

وہ ایک خشک برساتی نالہ پار کر رہے تھے جس کی ریت تینا شروع ہو گئی تھی۔

”تم نے میرا نام نہیں پوچھا؟“

”تم چوہدری نیاز بیگ کے لڑکے ہو۔ میں جانتا ہوں۔“ سکھ سامنے دیکھتا ہوا معتبری

سے بولا۔ جیسے ہی انہوں نے نالہ پار کیا وہ گندم کے کھیت کے کنارے کھڑے تھے۔ سونے

کے رنگ کی فصل تیز دھوپ میں چمک رہی تھی۔ ہوا بالیوں میں سرسرا رہی تھی۔ فصل کی

اوٹ میں چند کسانوں کے باتیں کرنے کی کرخت آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک بڑا سا لکڑی کا کاشا

تھوڑے تھوڑے وقفے پر فصل کے اوپر لہراتا۔ وہ گیہوں الگ کر رہے تھے۔ نعیم نے چن

کر ایک خوبصورت بالی کو توڑا، ہتھیلی میں مسل کر دانے نکالے اور ایک دانہ منہ میں ڈال کر باقی

کو پھینک دیا۔

”تمہیں فصل کی قدر نہیں، تم نے ایک سٹہ خراب کر دیا۔ تم شہر سے آئے ہو۔“ مہندر

سنگھ نے نفرت سے کہا۔

سامنے سے ایک لڑکی آ رہی تھی۔ وہ لمبے قد کی صحت مند لڑکی تھی اور سر پر چنگیر اور

چھاپہ کا مٹکا اٹھائے لاپرواہی سے چل رہی تھی۔ اُس نے کترا کر نکلنا چاہا تو مہندر سنگھ رستہ روک

کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پیشانی پر بل ڈال کر مسکرائی۔

”کہاں سے آ رہی ہو؟“

”بھاپے کو روٹی دے کے۔“

”مجھے بھی بھوک لگی ہے۔“

”تمہاری ماں مر گئی ہے؟“ لڑکی نے مصنوعی غصے سے کہا۔

”تم اپنے بھاپے کی ماں ہو؟“ وہ ہنسا۔

”دانت مت دکھاؤ۔ مجھے جانے دو۔“

مہندر سنگھ نے چھاپچھ کا مٹکا اُس کے سر سے اُچک لیا۔ وہ خالی تھا۔

”تیرا بھاپا بڑا پیٹو ہے۔ ساری لسی پی گیا۔“ وہ مٹکا لڑکی کے پیٹ میں مار کر بولا۔

وہ ذرا سا جھکی اور مٹکے کو اُس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

”چنگیر نہیں دکھاؤں گی۔“ وہ پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

”تیری ماں بھی دکھائے گی۔“ اُس نے گالی دی اور کندھا لڑکی کے سینے میں چبھویا۔

وہ چھاتی اور ہاتھوں کے زور سے دھکیلتی ہوئی اُسے دور تک لے گئی۔ اس پر مہندر سنگھ نے

کچکچا کر زور لگایا اور اُلٹے پاؤں اُسے واپس لے آیا۔ دونوں کے چہروں سے پسینہ نکل رہا تھا۔

ہوا سے لڑکی کی دھوتی کا ایک پلو اڑ رہا تھا اور اُس کی مضبوط، گندمی ران دکھائی دے رہی تھی۔

”چلو۔۔“ مہندر سنگھ نے ٹھوڑی سے کھڑی ہوئی فصل کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں۔۔ سؤر۔“ لڑکی نے ناخن اُس کے کندھوں میں گاڑ دیے۔ ”مجھے جانے

دو۔“

لیکن وہ اُسے دھکیلتا ہوا فصل کے اندر لے گیا اور بے شرمی سے ہنستے ہوئے دو دفعہ

”چلو۔۔ چلو“ کہا۔

”تمہارا بھاپا بیٹھا ہے۔ اُسے بلاؤں؟“ لڑکی نے رک کر کہا۔

”وہ کیا کرے گا؟“

”تمہاری ہڈیاں توڑے گا۔“

”وہ ہمیں نہیں ڈھونڈ سکتا۔“

تبھی فصل کے پیچھے سے ایک کسان کی بھاری، خشک آواز آئی جو کسی کو پکار رہا تھا۔

مہندر سنگھ نے سیدھے ہو کر بد مزگی سے ادھر ادھر دیکھا اور گالیاں دیتا ہوا باہر نکل آیا۔ ”کل

تمہاری ساری لسی پیوں گا۔“

”کل بھاپے کے ساتھ جاٹ نگر جا رہی ہوں۔ بیانی پر لوٹوں گی۔“ لڑکی ابرو اٹھا کر

شرارت سے مسکرائی اور نالے میں اتر گئی۔ مہندر سنگھ نے بڑی سی گالی دی اور نعیم کی طرف

دیکھ کر ہنسا۔

”یہ کون تھی؟“

”تھی ایک چھنال۔“

”چھنال تو نہیں لگتی تھی۔“

”تمہاری ماں لگتی تھی؟“ مہندر سنگھ ہنسا۔

”بکو مت۔۔۔“

”اور کیا لگتی تھی؟“

نعیم کے سارے بدن میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ”سؤں تمہاری ماں تھی۔“ سکھ رک گیا۔ آنکھیں سکیڑ کر نعیم کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے آہستگی اور مضبوطی کے ساتھ تہبند میں اڑسی ہوئی لکڑی کی پتلی بانسری نکالی۔ ”اکڑومت۔ مجھے جاتے ہو۔“

”جٹ ہوں۔ تمہارے پاس صرف ایک بانسری ہے۔“

”یہ تم لے لو۔“ اُس نے بانسری نعیم کی طرف اچھالی۔ ”اب بھی تمہارا سر توڑ دوں۔“

”آؤ۔“

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے۔ کئی لمحوں تک خاموشی اور کچھاؤ بڑھتا گیا۔ مہندر سنگھ نے بے دھیانی سے گیہوں کی چند بالیاں اکھیڑیں اور اٹھکیوں میں مروڑنے لگا۔ اس کی پگڑی میں سے گندے بالوں کی ایک لٹ گردن پر لٹک رہی تھی اور نئی نئی داڑھی میں بھوسے کے تئکے اٹکے ہوئے تھے۔

پھر اُس نے سٹہ زمین پر پھنک دیا اور مخصوص ہنسی اس کے بڑے سے چہرے پر پھیل گئی۔ ”تم کل آئے ہو۔ ابھی کچھ روز چوہدری کی بڈھیوں کا دودھ پیو۔ پھر لڑنا۔“

”بزدل۔“ نعیم نے بانسری گرا دی۔

”میں تم سے نہیں لڑتا۔“ مہندر سنگھ ہنسا اور بانسری اٹھا کر لبوں سے لکالی۔ اُس کے پیچھے چلتے ہوئے نعیم نے دیکھا کہ اس کے کندھے، جو بنیان سے باہر رہتے تھے، سیاہ ہو چکے تھے اور باقی پشت پر، جو گندی رنگ کی تھی، بنیان کے مستقل نشانات پڑ گئے تھے۔ ”تم قیض نہیں پہنتے؟“ نعیم نے پوچھا۔ مہندر سنگھ نے مڑ کر دیکھا اور بانسری بجاتا

رہا۔

چلتے چلتے وہ دائیں ہاتھ مڑ گئے۔ سامنے چند کسان تیز دھوپ میں جھکے ہوئے گندم سے بھوسا الگ کر رہے تھے۔ ان کے جسم سیاہ اور چمک دار تھے۔ کئی مہینے گزر گئے۔ نعیم نے باپ کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ باقی

سارا وقت وہ سویا رہتا۔ وہ بہت زیادہ کھانے اور سونے لگا تھا۔ اُس کا ذہن گڈ سا رہتا اور ایک نا معلوم سا بے وجہ غصہ ہر وقت اس پر چھایا رہتا۔ بھاری بھاری قدموں سے چلتے ہوئے وہ حیرت اور خوف سے دیکھتا کہ وہ موٹا ہو رہا ہے، اس کا پیٹ بڑھ رہا ہے اور ٹھوڑی کے نیچے کا گوشت لٹکنے والا ہے۔ اس خیال سے وہ ہر وقت جھنجھلیا رہتا کہ وہ انتہائی کاہل اور پیشو ہوتا جا رہا ہے، گو اس کا باپ کہتا رہتا کہ گرمیوں کے موسم میں نیند عموماً زیادہ آتی ہے اور یہ صحت کے لیے مفید ہوتی ہے۔

کبھی کبھی وہ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے باپ سے کہتا: ”تم اپنی دکان شروع کیوں نہیں کرتے ہو بابا؟ یہ کام بہت سخت ہے۔ میں بھی دکان پر کام کروں گا۔“

نیاز بیگ کے کال سیاہ ہو جاتے۔ خوف ایک واحد جذبہ تھا جو ایسے وقتوں میں اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا۔ پھر جلد ہی وہی مستقل، پاگل خلاء اس کی جگہ لے لیتا اور وہ کھیت میں جھک جاتا۔ ”ہاں ہاں۔۔ ہم کسی روز دکان شروع کریں گے۔ مگر زمین کا کام بھی اچھا ہے۔ ہم زمین کا ہی کھاتے ہیں۔“

پھر کبھی وہ بڑھے کو سمجھاتا: ”یہ ہر وقت لڑتے رہنا بھی اچھا نہیں۔ لوگوں کی نظر میں عزت جاتی رہتی ہے۔ عورتوں کے ساتھ سلوک سے رہا کرو۔ اور کالیاں مت دیا کرو۔“

اُس وقت نیاز بیگ غصے میں آکر چیخنے لگتا: ”اور تم مجھے سبق دینے کے لیے آئے ہو؟ تم میرے نطفے سے ہو، تمہیں پتہ ہے؟ اپنی عقل اپنے پاس رکھو۔ میرا سر میرے لیے کافی ہے۔“

رات کو وہ کھانے پر بیٹھتے۔ ہفتے میں تین دن بڈھا ان کے ساتھ کھاتا، تین دن دوسری عورت کے ساتھ۔ ساتویں دن نعیم یا چھوٹا لڑکا اس کا کھانا لے کر کھیتوں میں جاتے۔ صرف وہی تین روز، جب گھر کا مالک مہمان ہوتا، کھانا اچھا پکتا، باقی دنوں میں روکھا سوکھا کھانے کو ملتا۔ ظاہر ہے۔

ایاز بیگ کے کئی خط آئے، جن کا نعیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک روز وہ مہندر سنگھ کے ساتھ گھوڑ دوڑ کا مقابلہ کر کے لوٹ رہا تھا کہ جوہڑ کے کنارے اُسے ایاز بیگ کا معتمد خاص ملا جو دہلی میں رہتا تھا۔ وہ سوکھے چہرے اور سیاہ دانتوں والا وضع دار بڈھا تھا۔ نعیم کو دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آگئی اور وہ گھوڑے کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔

”میں آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں، بھیا۔ میں آپ کے گھر بھی گیا تھا۔“

نعیم نے گھوڑا روک لیا۔ ”پھر؟“

”چوہدری نے مجھے کالیاں دیں، جناب اور جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی۔“

نعیم خاموش رہا۔

”آپ کے چچا نے آپ کو بلایا ہے، بھیا۔ وہ بہت متفکر ہیں۔ چھ بار دلی آچکے ہیں اس دوران میں۔“

نعیم نے بے دھیانی سے گھوڑے کی ایال پر ہاتھ پھیرا۔ ”صحت کیسی ہے چچا کی؟“
 ”یوں صحت تو ٹھیک ہے مگر آپ نہ گئے، بھیا تو خراب ہو جائے گی۔“
 وہ انہماک کے ساتھ ایال نوچتا رہا۔ سورج چھپ رہا تھا جب اُس کے سینے میں کوئی
 بھاری، بدمزہ سی شے تیرتی ہوئی نیچے کی طرف اتری، اور اس نے پوچھا: ”اور سب لوگ کیسے
 ہیں؟“

”سب ٹھیک ہیں، بھیا۔ ٹھا کر درشن سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ روشن محل کے پرویز میاں
 ولایت چلے گئے۔“ وہ بتانے لگا۔ نعیم گھوڑے کی پشت پر بیٹھا بے خیالی سے اس کے غیر
 دلچسپ، مشینی چہرے کو ہلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر ایک خیال، بڑا تیز اور واضح، اس کے ذہن
 میں ابھرا: ”کیا فائدہ!“

دفعتاً نفرت اور غصے کا طوفان اس کے اوپر سے گزرا۔ ”جاؤ۔“ وہ بازو سے پیچھے کی طرف
 اشارہ کر کے چیخا، ”میں نہیں جاؤں گا۔“ اور گھوڑے کی پسلیوں میں ایڑیاں مارنے لگا۔
 وہ ابھی زیادہ دُور نہ گیا تھا کہ پیچھے سے نیاز بیگ کی آواز سن کر رک گیا۔ وہ کالیاں دے
 رہا تھا اور مخصوص انداز میں، ایک ٹانگ پر ناچ رہا تھا۔ ”جا حرام زادے نوکر۔ میرا بیٹا نہیں
 جائے گا۔ جا کر اسے کہہ دے کہ وہ میرے باپ کے نطفے سے نہیں ہے۔ وہ جولاہا ہے اور تو
 جولاہے کا نوکر ہے، چنانچہ جولاہا ہے۔ دفع ہو جا۔“

معتمد خاص، جو مسکین اور وضع دار آدمی تھا، پہلے شدر کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر اپنی ذلت کا
 خیال کر کے ایک دم گرم ہو گیا اور رک رک کر بولا: ”تم اس کی زمین میں نہیں کھاتے؟ تمہاری
 کہاں ہے؟ کہاں ہے آپ کی؟ حساب دیجیے۔“
 نعیم نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور معتمد کے سر پر جا چڑھا۔ معتمد گرا، پھر اٹھا اور پوری
 قوت سے بھاگنے لگا۔

”جولاہے۔ نوکر۔“ چیختا ہوا نیاز بیگ دور تک اس کے پیچھے بھاگتا گیا۔ دھندلے میں
 کاؤں پر اپلوں کے دھوئیں کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

(۶)

بیائی زوروں پر تھی۔ پچھلے چند دنوں میں نیاز بیگ اور نعیم نے بہت محنت کی تھی۔
 ان کے پاس میلوں کی صرف ایک جوڑی تھی۔ گوہندر سنگھ کٹی بار انہیں ایک جوڑی مہیا کر دینے

کی پیش کش کر چکا تھا مگر باپ بیٹا جاتے تھے کہ یہ میل چوری کے ہوں گے۔ چنانچہ وہ اپنے دو میلوں پر قلع رہے اور آٹھ ایکڑ زمین بیانی کے لیے تیار کر کے باقی پانچ ایکڑ ساؤنی کے لیے چھوڑ دی۔ کل تیرہ ایکڑ ان کی ملکیت تھی۔

ابھی بہت رات باقی تھی جب نیاز میگ نے اٹھ کر حقے میں پانی ڈالا، چولہے میں سے رات کا دبایا ہوا، دھکتا ہوا اُپلا نکالا، تمباکو سلکایا اور حقہ پینے لگا۔ بڈھا اور چھوٹا لڑکا زمین پر سو رہے تھے۔ کونے میں نعیم کی چارپائی تھی۔

”آج آخری رات ہے۔ ادھر۔“ اونگھتے ہوئے اس نے سوچا اور اپنی بیوی کے ڈھیلے ڈھالے، سوکھے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ عورت نیند میں کسمائی۔ کمرے میں سوتے ہوئے انسانی جسموں کی مخصوص بو تھی، اور گرم، خواب آلود بھاری سانسوں کی آواز آرہی تھی۔ آنگن میں پھیلی ہوئی سفید خنک چاندنی دروازے کے راستے اندر آرہی تھی اور کمرے میں رکا ہوا لپلوں کا دھواں دودھیا دکھائی دے رہا تھا۔ نیاز میگ وہیں بیٹھا بیٹھا ساتھ والے کمرے میں سوتی ہوئی چھوٹی عورت اور آنے والی شب کے تصور سے دل ہی دل میں لطف لینے لگا۔

پھر اُس نے اٹھ کر کمرہ پار کیا اور حقے کی نعیم کی گردن میں چھوٹی۔ ”کیسے سوتے ہو؟ جاڑا سر پر آگیا اور بیانی ابھی اتنی باقی ہے۔“

نعیم نے اندھیرے میں آنکھیں کھولیں اور کروٹ بدل کر سو گیا۔ نیاز میگ چارپائی پر بیٹھ کر حقہ گڑ گڑانے لگا۔ نعیم کی نیند اچاٹ ہو گئی۔

”میں ہل لے کر لیکر والے کھیت میں جا رہا ہوں۔ بیج لے کر آ جاؤ۔“ نے منہ میں الگ کیے بغیر اس نے کہا اور بڑھیا کے پاس جا کر رک گیا۔ ایک پاؤں اٹھا کر اس نے سوتی ہوئی عورت کے پیٹ پر رکھا اور ہولے سے دبایا، پھر اس کے سینے پر، پھر گردن پر، پھر ٹانگوں پر، کچھ دیر تک وہ اسی طرح اپنے تلووں میں بوڑھے جسم کی حرارت محسوس کرتا رہا، پھر اندھیرے میں ہنسا اور باہر نکل آیا۔

”اٹھو۔ کسانوں کے بیٹے لڑکیوں کی طرح نہیں سوتے۔“ دروازے پر سے ہل اٹھاتے ہوئے اس نے کہا اور میل کھول کر کھیتوں کی جانب چل پڑا۔

کاتک کا چاند جیسے بالکل سامنے کھڑا تھا، اور آخر خزاں کی خنک اور سفید لٹھے کی سی کھڑکھڑاتی ہوئی رات چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جوہڑ کے کنارے چند کتے اس پر کابلی سے بھونکے۔ درختوں کے نیچے سوئے ہوئے کسانوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور کروٹ بدل کر پھر سو گئے۔

”اتنے سویرے کہاں جاتے ہو چوہدری۔“ ایک کسان نے خواب آواز میں پوچھا۔

”بیانی کو۔“

”اللہ کرم کرے۔“

”اللہ کرم کرے۔“ نیاز بیگ نے اکتاہٹ سے دھرایا۔

”لونڈے کو محنت کرایا کرو۔ شہر میں رہ کر نازک ہو گیا ہے۔“

وہ نعیم کے دیر کرنے پر غصے سے بھنا گیا۔ مگر میلوں کی رسیاں تھامے، حقہ گڑ گڑاتا ہوا

چلتا رہا۔ خاموش، سفید فضا میں میلوں کی گھنٹیاں سحر خیزی سے بچ رہی تھیں۔

کیکر کے نیچے پہنچ کر وہ ہل جوتے لگا۔ پھر کھیت میں گھس گیا اور زمین کو محسوس

کرنے لگا۔

”بالکل تیار ہے۔“ اُس نے اپنے آپ سے کہا اور خوشی کے مارے کھیت کا لمبا چکر

کاٹا۔ زمین سہاگا پھرا کر ہموار کر دی گئی تھی اور اندر سے نرم اور نمدار تھی۔ اس میں بس اتنا

پانی تھا کہ مٹی ہاتھ میں بھر بھی جائے اور اٹھکیوں پر نمی بھی چھوڑ جائے۔

”پانی پورا ہے۔ بالکل پورا ہے۔“ اُس نے بار بار مٹی کو ہاتھ میں لے کر ملتے ہوئے

کہا۔ پھر جا کر میلوں کو تھپتھپایا اور جیسا کہ بعض کسانوں کو عادت ہو جاتی ہے، اُن کا مزاج

پوچھا۔ چاندنی رات میں ایک سایہ اُس کے قریب آکر رک گیا۔

”کس سے باتیں کر رہے ہو؟“ یہ ایک لمبا تڑبکا سکھ کسان تھا۔

”زمین میں بالکل پورا پانی ہے۔“ نیاز بیگ بھاگ کر گیا اور مٹھی بھر مٹی لا کر خوشی سے

اسے دکھانے لگا۔ سکھ کسان نے مٹی کو اٹھکیوں میں ملا اور گرا دیا۔

”بالکل پورا پانی ہے۔“ سکھ نے دھرایا

”کہاں جا رہے ہو؟“

”پانی لکانے۔“

”پانی لکانے؟ اب؟“

”ہٹ.....، تو بیانی کب کرو گے؟“

”پانی اب ملا ہے۔“ سکھ نے دوبارہ تاسف سے کہا۔

”اچھا تو او او او۔ اب تم پانی دو گے تو بیانی ماگھ میں کہیں جا کر ہوئی۔ ایس؟“

”ہاں۔“

”تمہیں جلدی کرنی چاہیے۔ تم ہمیشہ دیر کر دیتے ہو۔ پارساں تم نے فصل چھٹے مہینے

میں جا کر اٹھائی تھی۔ یاد ہے؟“

”واہ کرو کی مرضی۔“

”تمہیں سستی نہیں کرنی چاہیے۔“

”اور تم سمجھتے ہو کہ میں عورت کے ساتھ سویا رہتا ہوں؟ میری صرف ایک عورت

ہے۔ “سکھ کسانوں کی موٹی، خام آواز میں ہنسا۔
 اُس کے جانے کے بعد نیاز بیگ نے غصے سے ادھر ادھر دیکھا اور گھر کی جانب دوڑ پڑا۔
 نعیم ابھی تک سو رہا تھا۔ اُس نے اونچی آواز میں اُسے پکارا :
 ”ہم جب جوان ہوئے تو ہمارے باپ نے لسی پانی ہمارا سب بند کر دیا کہ سو سو کر پوستی
 نہ ہو جائیں۔“ اُس نے کہا۔ نعیم نیند سے بوجھل جسم لیے چارپائی کے کنارے پر بیٹھا رہا۔
 ”چلتے کیوں ہو۔ ابھی اتنی رات باقی ہے۔“ وہ جھنجھلیا۔ رات کے کھانے سے ابھی تک
 اُس کا معدہ بھاری تھا۔ آنکھیں بند کیے کیے اُس نے پتلون ٹانگوں پر چڑھائی۔

دونوں نے مل کر گندم کی بوری گھوڑی کے پیٹھ پر رکھی اور باہر نکل آئے۔ ہاتھ سے
 بوری تھامے وہ گھوڑی کے برابر کھیتوں کے نیچوں بیچ چلتا رہا۔ نیاز بیگ، جو پیچھے پیچھے آ رہا
 تھا، کبھی کبھی تیز بے سری آواز میں گانے لگتا۔ چاندنی اس قدر صاف تھی کہ چیونٹی تک منظر
 آ رہی تھی۔ پچھلی رات کو بوجھل، نمدار ہوا اُس کے چہرے سے ٹکرائی اور وہ چلتے چلتے اونگھنے
 لگا۔

لیکر کے نیچے ایک گیدڑ منہ اٹھائے کھڑا غور سے میلوں کو دیکھ رہا تھا۔ نیاز بیگ نے
 دور سے اُسے دیکھ لیا۔ اُس نے فوراً نعیم کو روکا، چکر کاٹ کر دبے پاؤں پیچھے سے گیا، قریب
 جا کر گھٹنوں کے بل ہو گیا، پھر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ رہن گئے لگا۔ گیدڑ آہٹ پا کر چونکا اور بھاگ
 گیا۔ نیاز بیگ نے گالی دی۔

”لالو کی گھوڑی پالے سے جڑ گئی ہے۔ اُس کے لیے چاہیے تھا۔“
 ”گیدڑ؟“ نعیم نے پوچھا۔

”ہاں۔ اس کا گوشت گرم ہوتا ہے۔“

بوری اتروا کر وہ فوراً کھیت میں گھس گیا۔ ”آؤ۔ میرے ساتھ چلو۔“ دوسرے چکر پر
 گزرتے ہوئے وہ پکارا : ”دیکھو۔ یہ بل پھیرنے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں تمہیں منحنی پر
 بوجھ نہیں ڈالو گے۔ صرف نالی کو زمین میں ڈبوئے رکھنا ہے۔ ہوں؟ لو کرو۔ اور بیج نالی میں
 ڈالے جاؤ۔ اسے نل بیانی کہتے ہیں۔“

اُس نے نالی نعیم کے حوالے کی، بیج کی جھولی اس کی پشت پر کس کر باندھی اور ساتھ ساتھ
 چلنے لگا۔ تیسرے چکر پر وہ کھیت سے باہر نکل آیا اور لیکر کے نیچے کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔
 ”ہوں ہوں ہوں۔ لکیر ٹیڑھی جا رہی ہے۔“ وہ وہیں سے چیخا۔ نعیم اٹے سیدھے قدم
 رکھتا، نالی سے کستی کرتا، زیر لب گالیاں دیتا ہوا میلوں کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔
 ”ہواووں۔“ اُس کا باپ پھر چلایا، ”اندھے ہو؟ بیج باہر گر رہا ہے۔“

”تمہاری نظر بڑی تیز ہے۔“ نعیم نے جل کر کہا، ”چاند کی روشنی میں دانے دیکھتے ہو۔“ وہ بے حد احتیاط کے ساتھ بیانی کر رہا تھا، لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے پر اُسے برابر ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ لکیر سیدھی رکھنے کی کوشش میں بیج باہر گرنے لگتا، اور اس کی طرف دھیان دیتا تو نالی باہر نکل آتی۔ خنکی کے باوجود اس کے سارے جسم میں سے پسینہ نکل رہا تھا۔

”نیلے کی دم مروٹ اُوپر والے کی۔ دیتا ہے کمین کا میل۔ کھانے کو تو تین مرلے بھی کھا جائے۔“ اُس کا باپ چیخا۔ وہ بغیر سنے کام میں مصروف رہا۔ جب دوبارہ نیاز بیگ چلایا: ”نیلے کو چلاؤ نیلے کو۔“ تو اُس نے جھنجھلا کر میل روک دیے اور خالی جھولی پشت پر سے اُتار کر اُس کے پاس لا پھینکی۔

”جب میں نے پہلے دن بیانی کی تھی تو ایک سو چالیس کیکر کی چھڑیاں مجھے پڑی تھیں۔ اتنی میلوں کو نہیں ماریں جتنی باپ نے مجھ کو ماریں۔“ نیاز بیگ نے جھولی بھر کر نعیم کی کمر پر کتے ہوئے کہا۔

”تو تم اب بدلہ اُتارنا چاہتے ہو؟“

”کام کرو۔ چلاؤ نہیں۔ سویرا ہونے والا ہے۔“

”دادا جب مرا تو تم چھوٹے سے تھے۔ مجھے پتہ ہے۔“

”جرح مت کرو۔ سویرا ہونے والا ہے۔“

صبح کا ستارا تیزی سے چمکنے لگا۔ پھر دوسرے ستارے ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے۔ اُجالا پھیلا اور چاند سفید ہو گیا۔ سورج نکلنے تک نعیم کا جسم اتنا نہیں تھکا تھا جتنا اُس کا مزاج نیاز بیگ کی جھک جھک سے بگڑ چکا تھا۔ مگر آخر اُس نے بیانی کرنا سیکھ لی تھی۔ آخری کھیت اُس نے مکمل صفائی سے بویا تھا۔ دو گھڑی دن گزر چکا تھا جب اُس نے میل کھولے، انہیں کیکر تلے باندھا اور لسی کا مٹکا اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ اس کی چھوٹی ماں آج اپنی باری پر چھاچھ اور روٹی لے کر آئی تھی۔ دسترخوان پر دو باجرے کی روٹیاں پڑی تھیں۔ ایک پر مکھن چپڑا تھا جسے اُس کا باپ کھانے لگا۔ خشک روٹی اس کے ہتھ میں آئی۔ اُس کی ماں میٹھی چند ماہ کے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ وہ معمولی شکل کی ایک سیدھی سادی عورت تھی اور اُس کے سنولائے ہوئے چہرے پر کسان عورتوں کی عام جلدی بیماری کے سفید دھبے تھے۔

”ابھی ایک تہائی بیانی ہوئی ہے۔“ نیاز بیگ نے کھاتے ہوئے کہا۔

”باقی کل کریں گے۔“

”کل؟ کل؟“ پھر وہ طنز سے ہنسا، ”کلکتے میں بیانی پھاگن تک کرتے رہتے ہیں؟ آج

شام تک بیانی ختم ہو جانی چاہیے۔ سنا؟ کل۔ ہنہ! ہنہ ہنہ۔ کل!“

”کل کیوں نہیں؟“ نعیم نے غصے سے کہا۔

”جو دو سیر آج رات کو ہم بیچ میں سے کھالیں گے کل وہ کہاں سے آئے گا؟“
 وہ خاموشی سے کھاتے رہے۔ اُس کے باپ کے جبرٹوں کی آواز دور تک جا رہی تھی۔
 کئی کسان ہل پکڑے ہوئے پاس سے گزرے۔ سورج اُونچا ہو گیا تھا اور دھوپ میں سفیدی اور
 سختی آچلی تھی۔ تازہ تازہ پچھائے ہوئے بیج پر کبوتروں کے غول کے غول آرہے تھے جنہیں
 نیاز بیگ کالیاں دیتا ہوا اڑاتا جا رہا تھا۔

”نعیم کو بھی مکھن دو۔“ عورت نے نیاز بیگ سے کہا۔

”ہاں ہاں لو کھاؤ۔ آج تم نے محنت کی ہے۔“

نعیم اپنی روٹی ختم کر کے باپ کی روٹی کھانے لگا۔

”میں تو تمہیں بھی علی کی طرح سمجھتی ہوں۔“ چھوٹی ماں نے اُس سے کہا۔ نعیم نے

خاموشی سے کھانا ختم کیا اور لسی کا کٹورا بھر کے پیسا۔ پھر وہ سوئے ہوئے بچے کے کالوں پر ہاتھ
 پھیرنے لگا۔ نیاز بیگ نے باقی لسی ایک سانس میں چڑھائی اور حقہ گڑ گڑانے لگا۔

”لو حقہ پی لو۔ پھر تمہیں کام کرنا ہے۔“

”میں نہیں پیتا۔“ نعیم نے زمین پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے اب بیانی نہیں

ہوگی۔“

نیاز بیگ نے ٹیڑھی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر غصہ دکھانے کو ہوا میں بازو پھینک
 پھینک کر کبوتروں کو کالیاں دینے لگا۔ جب سارا تباکو جل گیا تو وہ اٹھا۔ ”اسی لیے بیانی کے
 دنوں میں ہمیں مکھن نہیں ملتا تھا۔“ اُس نے اپنے آپ سے بات کی اور جھولی کمر پر لاد کر کھیت
 میں چلا گیا۔

دھوپ تیز ہو گئی۔ کیکر کے نیچے کی زمین بیک وقت نیم گرم، ٹھنڈی اور نمدار تھی۔
 نعیم کو چھاپچھ اور باجرے کی خماری چڑھنے لگی۔

”تمہاری ماں سمجھتی ہے میں تمہاری دشمن ہوں۔“ چھوٹی ماں نے بات شروع کی۔

”اب ایلی ہو گیا ہے تو میرا کیا قصور ہے؟ وہ کہتی ہے میں نے ٹونا کیا ہے۔“

نعیم بچے کے ہاتھ پھیرتا رہا۔ وہ چھوٹا سا صحت مند، گندمی رنگ کا بچہ تھا اور اس کے
 سوتے ہوئے منہ سے دودھ کی بو آ رہی تھی۔ ”ہاں تمہیں لڑنا نہیں چاہیے۔ میں نے ماں سے
 بھی کہا تھا۔“ اس نے کہا۔ بچے کی پکی ہوئی فصل کی طرح سنہری جلد کو تھپکتے ہوئے اسے بہت
 پیار آیا۔ لیٹے لیٹے منہ آگے بڑھا کر اس نے اُسے پیار کیا۔ وہ پہلی دفعہ اس بچے کو پیار کر رہا
 تھا اور شاید پہلی بار اُس اجنبی، دشمن عورت سے مخاطب تھا۔

”آج میں نے تین کھیت بیانی کی ہے۔ علی کو خوب دودھ پلاؤ۔ پھر ہم مقابلے پر ہل چلایا کریں گے، اور باپ بیٹھ کر گالیاں دیا کرے گا۔“
لڑکا ہلا اور آنکھیں بند کیے کیے رونے لگا۔ ماں نے گریبان کھول کر بڑی سی، گندی، دودھ سے بھری ہوئی چھاتی اُس کے منہ میں دے دی۔

”تم بھی میرے بیٹے ہو۔ ایلی بھی۔ تم دونوں کا ایک خون ہے۔“
نعیم بچے کا پاؤں دانتوں میں لے کر دبا رہا تھا۔ عورت نے پہلی بار غور سے اس جوان، اجنبی آدمی کی طرف دیکھا اور رونے لگی۔

”بارہ سال تک ہم بہنوں کی طرح رہیں۔ میرے باپ نے، جب میرا پہلا خاوند مر گیا تو، مجھے یہاں پر دے دیا۔ مجھے آئے ہوئے بیس دن ہوئے تھے کہ تمہارا باپ چلا گیا۔ ہم ایک چھت کے نیچے رہیں اور کسی دوسرے مرد کی ران نہ دیکھی۔ اب وہ میری دشمن ہے۔“ وہ دیر تک باتیں کرتی رہی۔ نعیم لیٹا لیٹا سو گیا۔

سارا پچھلا پہر نیاز بیگ بیانی کرتا رہا۔ دھوپ میں کام کرنے سے اس کا رنگ سیاہ ہو گیا اور پسینے سے داڑھی اور چھاتی کے بال بھیگ گئے۔ مگر جب وہ واپس آیا تو میچ کی بوری خالی ہو چکی تھی اور دو کھیت ابھی باقی تھے۔ وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا:

”اُدھار لینا پڑے گا۔ میلوں کو گھر لے جاؤ۔“

جاگیردار کا منشی، جو حویلی کے ایک حصے میں رہتا تھا، ادھیڑ عمر، موٹا تازہ سرخ رنگت کا آدمی تھا اور آنکھوں پر چشمہ لگاتا تھا جس سے اُس کی حیثیت کاؤں میں یوں بھی مسلم ہو جاتی تھی۔ جب یہ باپ بیٹا نہا دھو کر اُس کے پاس پہنچے تو وہ دور سے دیکھ کر پکارا:

”آؤ چوہدری۔ کیسی گزار رہے ہو؟ قرض کے بغیر؟“

”ہاں قرض کے بغیر، قرض کے بغیر۔“ نیاز بیگ نے اُس کے پاس دیوان پر بیٹھتے ہوئے کہا، ”پر اب نہیں۔“

”جان مانگ لو چوہدری پر میچ نہ مانگو۔ ایک دانہ جو ہو بھائی، قسم ہے....“
”قسم نہ کھا گنہگار۔ رک جا۔ میں ایک قدم بے بوئی زمین کے لیے جان دے دوں گا۔ تم جاتے ہو، کمین۔“ وہ ہنسا۔ منشی نے زور سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا اور کالی دی۔ پھر وہ کھسر پھسر کرنے لگے۔

”ایک دس، بس بس۔ زیادہ مت بکو۔ ایک دس ٹھیک ہے۔“ نیاز بیگ نے کہا۔

”میں تیری داڑھی کا ایک بال نہ چھوڑوں گا، یاد رکھ۔“ منشی ہنسا ”ایک بارہ۔“

”بس بس ایک دس۔ ایک دس۔“ نیاز بیگ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ایک بارہ - ایک بارہ -“ منشی نے دھرایا اور نیچے بیٹھے ہوئے ایک کسان کو اشارہ کیا -
 ”اللہ کرم کرے -“
 ”اللہ کرم کرے -“

دونوں نے منشی کے گودام سے آدھی بوری گندم کی لی اور اُسے گھوڑی پر لاد کر واپس ہوئے -

”ہمیں اب دس بوریاں دینی پڑیں گی؟“ نعیم نے بوری تھام کر چلتے ہوئے پوچھا -
 ”پانچ - یہ آدھی بوری ہے -“

”بہت زیادہ ہے - تم فصل میں سے کیوں نہیں رکھتے؟“

”اس دفعہ تو بہت تھا -“ وہ رکا - ”ایک اور منہ جو آگیا -“

”کون؟“ نعیم نے بے خیالی میں پوچھا - پھر دفعتاً وہ بے حد جھلا گیا - ”تو میں چلا جاؤں؟“

نیاز میگ چپ چاپ سر جھکائے چلتا رہا - بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اُس کے چوڑے جسم کا خفیف سا جھکاؤ اور ڈھلکے ہوئے کندھے ایک سن رسیدہ دیو کے معلوم ہو رہے تھے - اُس کے بھاری قدموں کی مستقل ، مسلسل آواز گلی میں اُٹھ رہی تھی - بے کواڑ کے دروازوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے انہیں عورتیں اور مرد چولہوں کے گرد بیٹھے کھاتے ہوئے دکھائی دیے - اُپلوں کا تیز گھنا دھواں گلی کو لپیٹ میں لیے تھا اور وہ بار بار آنکھیں پونچھ رہے تھے - پھر اس نے سر اٹھایا اور جب وہ بولا تو اُس کی بھاری ، کرخت آواز میں کسانوں کے خام جذبات کی نرمی اور کپکپاہٹ تھی -

”نہیں - تم بھی اپنا ہی خون اور گوشت ہو - پر تمہیں کام کرنا چاہیے -“

جاڑوں کی ایک شام کو مہندر سنگھ کے گھر چند لوگ جمع ہوئے - مجمع زیادہ تر گاؤں کے نوجوانوں پر مشتمل تھا جو اس کے بھائیوں کے دوست تھے اور مختلف ٹولیوں میں بیٹھے تھے - ہر ایک ٹولی کا سرغنہ مہندر سنگھ کا ایک بھائی تھا جو اپنے دوستوں کے حلقے میں بیٹھا ڈینگیں مار رہا تھا اور بڑی انکساری کے ساتھ دودھ کے گلاس پیش کرتا جا رہا تھا - سب نوجوان نہا دھو کر ، کھیتوں کیٹی اُتار کر آنکھوں میں سرمہ اور سر میں تیل ڈال کر آئے تھے - انہوں نے اپنے اپنے بہترین بھڑ کیلے لباس اور رنگے ہوئے کپے چمڑے کی جوتیاں پہن رکھی تھیں -

سکھوں کا گھر گاؤں سے باہر جوہڑ کے کنارے پر تھا - دالان میں ، جہاں لوگ جمع تھے ، چند چارپائیاں پڑی تھیں اور دیوار کے ساتھ دو لائینیں لٹک رہی تھیں - کچھ لوگ چارپائیوں پر بیٹھے تھے ، باقی چٹائیوں پر ، جو نیچے بچھی تھیں - کمرہ دھوئیں ، مٹی کے تیل کی بو ، قمقمہوں اور باتوں کے شور سے بھرا ہوا تھا - مہندر سنگھ کا بڑا بھائی اس رات کا دولہا تھا - اس نے سفید

جھوٹے ریشم کا لباس پہن رکھا تھا اور سر سے تیکا تھا۔ کڑا کے کا جاڑا پڑ رہا تھا لیکن اپنے اپنے لباس دکھانے کے شوق میں سب نوجوانوں نے لوئیاں اور کبیل اتار کر کونے میں ڈھیر کر دیے تھے اور اب کچے دودھ کے نشے میں قہقہے لگا رہے تھے۔

”میری گندم میں تو گھٹنے نظر نہیں آتے، مہندرو۔“ فقیر دین نے، جو منشی کا خاص جاں نثار تھا۔ گنجی آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

”ہاں بے۔ تمہاری فصل میں تو منشی اور اُس کی بیوی نے ایک ایک پودے پر پیشاب کیا ہے۔ کل کو تمہارا پیندا بھی نظر نہ آئے گا۔“ مہندر سنگھ نے کہا، جو اکیلا پھر رہا تھا۔

جو گندر سنگھ کو مہمانوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں بار بار باہر جانا پڑ رہا تھا، لیکن کیکر کی شراب کے نشے میں اُسے سردی کا احساس نہ تھا اور وہ تیز ہوا میں خالی قمیض پھڑ پھڑاتا ہوا اندر باہر پھر رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں، جہاں بھوسہ بھرا تھا، خالی جگہ پر چٹائی بچھا کر شراب کی مشکلی دھری تھی اور پینے والے کسان ارد گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

”میرا نیلا بیماری کی حالت میں بھی چھ گھنٹے متواتر ہل کے آگے چل سکتا ہے“ منجھلے بھائی کرم سنگھ نے کہا۔

”اور آسانی سے دو مرلے زمین تیار کر سکتا ہے۔“ ایک بوڑھا، جو بھوسے کے ڈھیر کے ساتھ لیٹا تھا، بولا۔

”او کبڑے بوڑھے۔ تیری ماں۔“ کرم سنگھ نے شراب سے بھرا ہوا مٹی کا پیالہ زمین پر دے مارا۔

ساتھ بیٹھے ہوئے تین آدمیوں نے، جو دیر سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے، شراب کے پیالے زمین پر رکھے اور کسی بات پر ہنسنے لگے۔ وہ سر پیچھے پھینک کر کرخت آوازوں سے ہنس رہے تھے اور اپنے کھردرے بڑی بڑی کانٹھوں والے ہاتھوں سے تالیاں بجا رہے تھے۔ ان کے سیاہ چہروں پر شراب اور ہنسی کی وجہ سے موٹی موٹی رگیں ابھر آئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کرم سنگھ ہنسنے لگا اور بوڑھے کی ران پر ہاتھ مار کر بولا۔

دیکھ کبڑے جولاہے، ان کی ماں کو کچھ ہو گیا۔“

بوڑھا مسخرہ چیخیں مار کر ہنسنے لگا۔ تھوڑی سی شراب چھلک کر اس کی چھاتی کے سفید بالوں میں جذب ہو گئی۔ جو گندر سنگھ دروازے پر نمودار ہوا۔

”چھ ماہ بعد میں نے یہ مشکلی نکالی ہے آج کے لیے۔ اور یہ تیرے دادے سے بھی بڑھے کیکر کی ہے۔ کبڑو۔ دو گھونٹ تیری عقل کے لیے بہت ہیں۔ تھوڑی پی۔“ وہ ہنس کر آگے چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد جب ایک موٹی تازی جوان لڑکی ، جو جوگندر سنگھ کی بیوی تھی، دروازے کے سامنے سے گزری تو اُس کے منہ سے خوف کی ہلکی سی چیخ مچل گئی ۔ ہوا کے زور سے بوڑھے کی چلم میں چند چنگاریاں اڑ کر بھوسے پر جاگری تھیں اور وہ جگہ جگہ سے سلگ رہا تھا ۔ لڑکی نے بدحواسی کے ساتھ اپنے خاوند کو آوازیں دے کر بلایا ، جس نے گالیاں دیتے ہوئے بھاگ بھاگ کر پانی کی چند بالٹیاں بھوسے پر ڈالیں ۔

”سارا نشہ خراب کر دیا سرے نے ۔ اس واہگرو کے دشمن کو یہاں کیوں لائے ۔“ وہ بڑھے سے حقہ چھینتے ہوئے بولا ۔

”دیکھ او جوگندرے ۔ بھوسے کی ماں کو آگ لگ جائے ۔“ کرم سنگھ نے بڑھے بھائی سے کہا، ٹھا کر بلدیو سنگھ میرا مہمان ہے ۔ تو حقہ یہاں رکھ دے ۔“

جوگندرے نے اپنے چھوٹے بھائی کے نشیلے چہرے کی طرف دیکھا اور حقہ چھوڑ دیا ۔ ”دروازہ تو بند کرو پھر ۔“ وہ آنکھیں نکال کر بولا ۔

”اب پہلے گیلا بھوسہ جانوروں کو ڈالنا ، ورنہ سارا سڑ جائے گا ۔“ اس کی بیوی کلدیپ کور نے کہا ۔

”کتیا کی اولاد ۔ سارا نشہ خراب کر دیا ماں کے یار نے ۔“ وہ کنڈی چڑھا کر چلا گیا ۔ کلدیپ کور، جس نے شادی کے بعد پہلی دفعہ اتنا بڑا مجمع دیکھا تھا، بغیر پیے نشے میں تھی ۔ وہ مستعدی سے کھانے کا انتظام کرتی ہوئی ، بھاری کو لہے ہلا ہلا کر اور چھاتی آگے نکال کر چلتی ہوئی ادھر ادھر آ جا رہی تھی ۔ مضبوط جسم کی ہونے کے باوجود اُس کے چہرے پر معصومیت تھی اور سکھ عورتوں کے خوب صورت نقوش اس کے حصے میں آئے تھے ۔

نعیم جوہڑ کے کنارے چلتا ان کے گھر میں داخل ہوا ۔

”شادی ہو رہی ہے؟“

”نہیں دستار بندی ہے ۔“ مہندر سنگھ نے کہا ۔ نعیم گاؤں بھر میں اس کا واحد دوست تھا ۔ دونوں دالان کی طرف چلے گئے ۔ اندر جو لوگ بیٹھے تھے سب جاگیردار کے مزارعین تھے، اور نعیم غریب ہونے کے باوجود کاشت کار کا بیٹا تھا ، چنانچہ سب نے اسے اپنی اپنی طرف بلا کر پاس بیٹھنے کے لیے کہا ۔

”کل تو نے جو گھڑ دوڑ میں مہندرو کو ہرایا ، جوان ، تو چوہدری کا نام رکھ لیا ۔“ ایک پکی عمر کے آدمی نے کہا ۔

”چوہدری بھی بڑا دلیر آدمی تھا ۔ پر اس کا بیٹا نمبر لے گیا ۔ وہ جولاہوں کی گھوڑی کس گھوڑے سے ملائی ہے چوہدری؟“ ایک اور آدمی نے پوچھا ۔

”منشی کے گھوڑے سے ۔“ نعیم کی بجائے فقیر دین نے جواب دیا، اور حقہ نعیم کی طرف

بڑھایا : ”لو حقہ پیو۔“

”میں نہیں پیتا۔“ نعیم نے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”وہ تو نکما گھوڑا ہے۔ پوستی ہے۔“ پیچھے سے ایک کمزور آواز والا کسان بولا۔

”کون سا؟ مشکلی؟“ فقیر دین کنجی آنکھیں پوری طرح کھول کر مڑا۔

”اچھا مشکلی۔ مشکلی۔ میں سمجھا وہ جو منشی کے بیٹے کی دستار بندی پر آیا تھا۔ کمزور

آواز والے نے معذرت کی۔

”دارو پیو گے؟“ مہندر سنگھ نے پوچھا۔

”نہیں۔“

لیکچر کی شراب میں مدہوش ہو کر بھوسے کے کمرے والے باہر نکل آئے تھے اور آنگن

میں اوٹ پٹانگ قسم کا نلچ نلچ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر دالان میں بیٹھے ہوئے چند لڑکے، جو

بہت اچھا ناچتے تھے، لوگوں کے اصرار پر اٹھے اور آنگن میں نکل آئے۔ انہوں نے ایک

دوسرے کو چند ہدایات دیں اور قطار میں کھڑے ہو کر ایک دیہاتی نلچ شروع کر دیا۔ کبڑا بوڑھا

کان پر ہاتھ رکھ کر کانے لگا۔ وہ اونچی، کرخت اور پتھر کی طرح کی بھاری آواز میں گیت کے

بے معنی بند گا رہا تھا۔ اور ناچنے والے قطار سے نکل کر دائرے میں ہو گئے تھے اور تیزی سے

اچھل کر بازو ہوا میں پھینکتے ہوئے نلچ رہے تھے۔۔۔ یہ بے ہنگم، وحشیانہ قوت اور خوشی کا

مظہر، جنگلیوں کا نلچ تھا۔

”دستار بندی کیا ہے؟“ نعیم نے مہندر سنگھ سے پوچھا۔

”بھائی نے جھگی توڑی ہے۔“

”ایس؟“

”ہاں۔ نہیں سمجھتے؟ تمہاری عقل میں نہیں آئے گا۔ یہ شیروں کی دنیا ہے۔“

”بکو مت۔ تم نشے میں ہو۔“

”میں نشے میں نہیں ہوں، چوہدری صاب۔ ہم میں سے جب تک کوئی دوسرے کا کوٹھا

نہ توڑے پکڑی نہیں باندھ سکتا۔“

”پکڑی تو جو گندر پہلے بھی باندھتا تھا۔“

”وہ تو واہگرو کی پکڑی تھی۔ یہ عزت کی پکڑی ہے۔ دستار نہیں سمجھتے؟ دلیری اور مردانگی

کی۔“

نعیم ہنسا : ”کوٹھا کیسے توڑا؟“

”رات علی پور گئے۔ مگر وہ لوگ جاگ گئے بلو نگرے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا - تھوڑی سی لڑائی ہوئی اور ایک بھینس لے آئے - ایک کو مارنا بھی پڑا -“
 مہندر سنگھ نے کالی دی -
 ”یہ تو چوری ہو گئی -“

”بزدلوں کے اپنے نام ہوتے ہیں -“ پھر یکلخت اس نے اپنی شرابی آنکھیں پھرائیں -
 ”اور ایک لفظ بھی جو تو نے کہا تو واہگرو کی قسم واہگرو کی قسم یاد رکھنا -“
 نعیم خاموش کھڑا ناچنے والوں کو دیکھتا رہا - گانے والے کی اداس بھاری آواز کے ساتھ
 ناچ کی خاموش تال نے مل کر سرد چاندنی کو طلسمی بنا دیا تھا -
 پھر کھانا دیا گیا - بھنے ہوئے آٹے کا حلوہ جس میں گڑ اور بے تحاشا کھی ڈالا گیا تھا اور تتور
 کی روٹیاں تھیں - سب کسان لڑکے نیچے بیٹھ کر اٹھکیوں پر تول تول کر حلوہ کھانے لگے اور
 کھی ان کی داڑھیوں پر بہنے لگا - ایک ساتھ کئی جبروں میں سے چکنے حلوے کی ’چپ چپ‘ سنائی
 دے رہی تھی -

یہ لوگ کٹائی تک گندم کھاتے رہتے ہیں - محنتی لڑکے ہیں - ”کسمی نے کہا -
 کلدیپ کور بار بار دروازے پر آکر دودھ کے بھرے ہوئے کٹورے جو گندر سنگھ کو پکڑاتی
 جا رہی تھی - اس کے سرخ گالوں پر پسینے کے قطرے رگے ہوئے تھے -
 کھانے کے بعد ایک بڑی سی سرخ ریشمی پگڑی جو گندر سنگھ کے سر پر رکھی گئی اور سب
 لوگوں نے باری باری اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور ’سردار جو گندر سنگھ
 مبارک ہو کہا -

کسانوں کے پاس باتیں کرنے کو بہت کچھ نہیں ہوتا - وہ بے علم، آنکھوں والے،
 سیدھے سادھے غیر دلچسپ اور قناعت پسند، لوگ ہوتے ہیں جن کی زیادہ تر زندگی محض عمل اور
 حرکت سے عبارت ہوتی ہے - ان کے پاس وہ ذہانت نہیں ہوتی جس کی بدولت انسان مکمل طور
 پر مطمئن ہونے کے باوجود گفتگو کرنے کی خواہش محسوس کرتا ہے - چنانچہ ناچ، کھانے اور مبارکباد
 کے بعد جب انہوں نے حقہ پینا شروع کیا اور خاموشی کے لمبے لمبے وقفے آنے لگے تو انہوں نے
 اٹھنا شروع کیا اور تھوڑی دیر کے بعد دالان میں صرف گھر کے لوگ رہ گئے - باہر چولہے کے پاس
 کلدیپ کور اور اس کی ساس میٹھی اونگھ رہی تھیں -

تیسرے دن گاؤں میں پولیس آئی - انہوں نے جو گندر سنگھ، کرم سنگھ اور خشونت
 سنگھ کو پکڑ لیا اور پنچایت والوں کو بلا کر گواہیاں لینے لگے - تینوں بھائیوں کو الف بتکا کر کے
 پیٹھ پر ڈنڈے مارے گئے اور پنچایت والوں کو گالیاں دی گئیں لیکن ایک بھی گواہی نہ مل
 سکی -

نیاز بیگ کے گھر دونوں عورتیں دھوپ میں کام کر رہی تھیں - ایک چرخہ کات رہی تھی

اور دوسری لحاف نکل رہی تھی۔ چھوٹا لڑکا بھینس کو نہلا رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہو کر کانپتا ہوا آکر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ تو بڑی عورت بولی:

”چھوٹی بھینس کو بھی نہلا دو۔ وہ بھی تمہاری پھوپھی کی ہے۔“

چھوٹی عورت نے چرنے پر سے نظریں اٹھا کر نرمی اور محبت سے اسے دیکھا۔ لڑکا جا کر چھوٹی بھینس کو نہلانے لگا جو حالانکہ بڑی تھی مگر چھوٹی عورت کی تھی اس لیے چھوٹی کہلاتی تھی۔ صبح کا سورج کمزور اور سرد تھا۔ سردی کی وجہ سے انسان، چرند پرند سب دھوپ میں مکل آئے تھے اور فضا بڑی پر رونق تھی۔

نیاز بیگ گھر میں داخل ہوا اور بات کیے بغیر بھوسے والے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے اور وہ معمول سے پہلے چلا آیا تھا۔ دونوں عورتیں کام چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے گئیں۔

”جاؤ۔ کوئی پوچھے تو مت بتانا“ اس نے چہرہ بھوسے میں گاڑ دیا۔ ”جاؤ۔ دروازہ بند کر دو۔“ اس کے رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں اور سودائی آنکھوں میں سہم آگیا تھا۔ چھوٹا لڑکا بھاگتا ہوا داخل ہوا۔ ”پولیس آئی ہے۔“

دونوں عورتوں نے جھٹ سے دروازہ بند کر دیا اور آگے چارپائی کھڑی کر کے اس پر لحاف پھیلا دیا۔ پھر دونوں صحن میں خاموش بیٹھ کر انتظار کرنے لگیں۔ ان کے گھر کا سارا کام رک گیا۔ صحن میں مرغیاں خوش دلی سے دانہ چگ رہی تھیں۔

نعیم نے کھیتوں کی طرف سے لوٹتے ہوئے مہندر سنگھ کو دیکھا جو فصل کی اوٹ میں کسی شے پر کود رہا تھا۔ جب وہ فصل سے باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ مہندر سنگھ ایک بھینس کے ساتھ کستی لڑ رہا تھا۔ وہ ہنسا۔

”آج کوئی لونڈیا نہیں ملی؟“

مہندر سنگھ نے کستی جاری رکھی۔ وہ ہاتھ میں ایک اینٹ پکڑے اس مہیب الجشہ جانور سے زور آزمائی کر رہا تھا۔

”یہ اینٹ سے نہیں مرے گی۔“ نعیم نے کہا۔

”چپ رہو۔ سؤر۔“ وہ دانت پیس کر بھینس سے جٹ گیا۔ وہ بار بار اس کی گردن کو بازو میں لے کر اس کے ہونٹ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بھاری، سست اور طاقتور جانور ایک ہی زور دار جھٹکے سے اسے دُور پھینک دیتا ہے۔ وہ اٹھ کر دوبارہ اس پر لپکتا۔ اس کے سیاہ جسم کا ایک ایک پٹھا نمایاں ہو جاتا اور چہرے پر جنگلی جانوروں کی وحشت پھیل جاتی۔ اس کے کودنے سے پانی کی نالی ٹوٹ گئی تھی اور پانی کھیتوں میں جانے کی بجائے وہیں پر پھیل رہا تھا۔

آخر مہندر سنگھ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور بھینس کا منہ کھول کر اینٹ کی ایک زور دار ضرب سے اس کا دانت آدھا توڑ دیا اور چھلانگ لگا کر دور جاگرا۔
”پاکل ہو گئے ہو؟“

”تمہارے باپ ادھر آ رہے ہیں۔“ مہندر سنگھ گاؤں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔
”کون؟“

وہ صرف موٹی موٹی گالیاں دیتا رہا۔ ”ساری بھٹی میں سے ڈھونڈ کر یہ کھنگر نکالا۔ لوہے سے زیادہ مضبوط ہے۔“ اس نے اینٹ کو کھڑی فصل میں پھنک دیا۔
اسی وقت فصل کے پیچھے سے۔ سپاہی نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ آتے ہی انہوں نے بھینس کو کھولا اور مہندر سنگھ اور نعیم کو ڈنڈے مارتے ہوئے آگے لگا کر لے گئے۔

جوہڑ کے کنارے سکھوں کے سارے مویشی جمع تھے اور تینوں بھائی اوندھے لیٹے جوتے کھا رہے تھے۔ اس قافلے کو آتے دیکھ کر تھانیدار کے پاس سے ایک کسان اٹھ کر بھاگا۔
”یہ میری بھینس۔ میری بھینس۔ یہی ہے۔ انہوں نے ہی میرے نوکر کو مارا ہے۔
میری بھینس قاتلو۔ چورو۔ سکھو۔“

مہندر سنگھ بھاگ کر بھینس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ”خبردار تیری ماں کی زبان کھینچ لوں گا۔ یہ دیکھ۔ یہ تیری ماں بوڑی میں نے منڈی سے خریدی تھی۔ پوس میں۔ تیری بھینس بوڑی تھی؟“ اس نے ہونٹ اٹھا کر بھینس کا ٹوٹا ہوا دانت دکھایا۔
”یہ بد معاشی ہے، صاف۔“ کسان چلایا۔ ”ابھی اسے چھوڑ دو تو سیدھی میرے ڈیرے پر جائے گی۔ ابھی۔“

”اور یہ میرا میل لٹا۔“ مہندر سنگھ نے دم کٹے میل کی ذرا سی دم ہوا میں اٹھا کر سب کو دکھائی۔ پھر وہ بھاگ بھاگ کر سب مویشیوں کی خصوصیات بیان کرنے لگا: ”اور یہ میرا میل کانا۔ اور یہ میری مشکلی۔ اور یہ گائے چوکان۔ اور یہ میری جھوٹی۔“
جب وہ تھانیدار کے قریب سے گزرا تو اس نے گھما کر ڈنڈا مہندر سنگھ کے کندھوں کے بیچ میں مارا۔

لٹا دو اسے۔“

سپاہیوں نے اسے تھکا کر کے اوندھے منہ لٹایا اور ڈنڈے مارنے لگے۔ دوسرے بھائیوں کے برعکس، جو خاموش تھے یا آہستہ آہستہ کراہ رہے تھے، اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ہر چند منٹ کے بعد سپاہی مارتے مارتے رک کر پوچھتے تو جواب گالیوں میں ملتا۔
”اسے دھونی دو۔“ تھانیدار گرجا۔

انہوں نے درخت کی ٹہنی سے اس کے پاؤں باندھ کر الٹا لٹکا دیا۔ پھر سرخ مرچ کو آگ دکھا کر اس کی ناک کے قریب لے گئے۔

”میں بتاتا ہوں۔ مجھے کھولو۔“ وہ گھبرا کر چلایا۔ جب انہوں نے دھواں پرے کیا تو وہ چھینکیں مارنے لگا۔ چھینکیں ختم کر کے خاموش ہو گیا۔ تھانیدار کے بار بار پوچھنے پر بھی چپکا لٹکا رہا۔ پھر اچانک اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر چیخا۔

”میں نہیں جانتا تیری ماں کو کون لے گیا۔“

چند کسان لڑکے، جو کھڑے تماشاً دیکھ رہے تھے، ہنسنے لگے۔ اسے دوبارہ دھونی دی گئی۔ وہ لگاتار چھینکیں مارنے اور بچوں کی طرح اونچی آواز سے رونے لگا۔

”مجھے اُتارو۔ میں بتاتا ہوں۔“ اس نے دھرایا۔ جب اتارا گیا تو وہ ناک اور حلق صاف کر کے روتا ہوا بولا: ”مجھے کچھ پتہ نہیں۔۔۔ کچھ پتہ نہیں۔“

تماش بین لڑکے پھر ہنسنے لگے۔ ”تھوڑا سا دارو پی لو۔ دھونی کچھ نہ کہے گی۔“ ایک نے کہا۔ مہندر سنگھ نے پلٹ کر اسے کالی دی۔ اسے پھر دھونی دی گئی اور چلاتا ہوا بے ہوش ہو گیا۔ شام کے وقت پولیس کوئی ثبوت برآمد کیے بغیر واپس چلی گئی۔

رات کو کچھ لوگ مزاج پرسی کی خاطر سکھوں کے ڈیرے پر گئے۔ کرم سنگھ کے دوستوں نے اُس کی زخمی پیٹھ پر تیل کی پٹیاں رکھنی شروع کر دیں، باقی اس کے پاس بیٹھ کر حقہ پینے اور گپیں مارنے لگے۔ کلدیپ کور دالان کے کونے میں دھکتے ہوئے ایلے پر تیل اور لونگ کڑ کڑا رہی تھی۔

”ہنہ۔ عورت کی عورت۔“ ہمیں مار نہیں پڑی؟ جو گندر سنگھ داخل ہوا اور بیوی کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ”ہمیں مار نہیں پڑی؟ تو جو بچہ جننے والی کی طرح ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا ہے۔“

ایک کسان نے ایلے ہوئے تیل میں بھگو کر سوت کی پٹی جو کرم سنگھ کی پیٹھ پر رکھی تو وہ بلبلا اٹھا اور پٹی دیوار پر کھینچ کر ماری۔ ”لے جا اسے ماں کے پاس۔ میں نہیں لگواتا۔“ وہ بیٹھ کر کراہنے لگا۔

ہنہ۔ عورت کی عورت۔“ جو گندرے نے دوہرایا۔

سور۔ کرم سنگھ نے دانت پیسے۔ چند کسان ہنسنے لگے۔

چھیرے بدن کا ایک کسان گھٹنوں تک کپڑے میں لٹھڑا ہوا داخل ہوا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لمبوترے سیاہ چہرے والا آدمی تھا اور اس کے جسم پر صرف جانگیہ اور بنیان تھی۔ جو گندر سنگھ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”واہرو کی فتح۔ رام سنگھ کیسے آئے؟“ جواب دینے کی بجائے رام سنگھ دیوار کے ساتھ گھسٹ کر بیٹھ گیا۔ جو گندر سنگھ اٹھ کر اس

کے قریب گیا اور دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ یکبارگی جو گندر سنگھ کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہوئے اور وہ مٹھیاں بھینچ کر بولا: ”کب؟“

”کل۔ آدھی رات۔“ رام سنگھ نے کہا۔ مہندر سنگھ نعیم کے پاس سے اور کرم سنگھ چارپائی سے اٹھ کر ان سے جا ملے اور آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ سب کے رنگ سفید اور آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ مزاج پرسی کے لیے آئے ہوئے کسانوں نے اپنے اپنے حقے اٹھائے اور رخصت ہونے لگے۔

”آج رات کو۔ آج ہی۔“ جو گندر سنگھ نے کھڑے ہو کر کالی دی اور اعصابی اٹکلیوں سے پکڑی ٹھیک کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

”کیا ہوا؟“ نعیم نے وہیں بیٹھے بیٹھے مہندر سنگھ سے پوچھا۔

”قتل ہو گیا۔“

”کون؟“

”ہمارا بھائی۔ پچھیرا۔“

”کیوں؟“

”پانی لگا رہا تھا۔“

”پھر؟“

”زیادہ باتیں مت کرو۔ ہم آج ان کا صفایا کر دیں گے۔“

”کیسے؟“

”جیسے انہوں نے کیا۔ سمجھتے نہیں ہو؟“

”یہ تو مشکل ہے۔ نہیں؟“

”مشکل ہے؟“ مہندر سنگھ شرابی آواز میں چیخا۔ پھر چھاتی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا: چلو گے؟ ہم اپنے دوستوں کے ساتھ ان کا بدلہ لینے جایا کرتے ہیں۔ بزدل۔“

”بکو مت۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔“ نعیم نے کہا اور باہر نکل آیا۔

رکھوالی کے لیے فصل میں سونے کی آج اس کی باری تھی۔ وہ شیشم کے پیڑ پر مچان میں دیکا ہوا لحاف کے اندر گھٹنے سینے سے لگائے سو رہا تھا کہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک سایہ نیچے کھڑا اس کی پسلی میں بلم کی نوک چھو رہا تھا۔

”کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہم جارہے ہیں۔“

وہ نیچے اتر آیا۔

”تمہارے پاس کچھ ہے؟“

”نہیں۔“

”اؤ۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔“ مہندر سنگھ نے بھاری آواز میں کہا۔ لیکر کی شراب کی تیز بو نعیم کے ناک میں کھسی۔ اندھیرے میں بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے انہوں نے دوسروں کو جالیا۔ یہ مہندر سنگھ کے تینوں بھائی، کلدیپ کور اور اس کی ساس تھے۔ مردوں کے بدن پر ایک ایک لنگوٹ تھا اور ان کے تیل ملے ہوئے سیاہ جسم اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ عورتوں نے سروں پر ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں۔

”عورتوں کو لے کر لڑنے جا رہے ہو۔“ نعیم نے پوچھا۔ کسی نے جواب نہ دیا۔

وہ خاموشی سے سرسبز کھیتوں کے بیچوں بیچ مغرب کی سمت بڑھتے رہے۔ فصلوں کو پانی دیا جا رہا تھا۔ پچھلی رات کی سردی، بوجھل ہوا کے ساتھ ہی تیل، شراب اور گیلی مٹی کی ملی جلی بو بھی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ گندم کی نو عمر بالیوں میں نرم، ریشمیں دودھ بھرے دانے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ نہر کی پٹری پر چڑھ آئے۔ بادلوں کی تاریکی میں صرف بہتے ہوئے پانی کا دھیمہ شور سنائی دے رہا تھا۔

ایک جگہ مہندر سنگھ رک گیا۔ ”یہاں۔“ اس نے بلم کے پھل سے کھیت کے ٹوٹے ہوئے کنارے کو چھوا جہاں پانی ایک چھوٹے سے گڑھے میں جمع ہو گیا تھا۔ ”یہاں پر۔۔! وہ پانی لگا رہا تھا۔“

انہوں نے پانی کیوں توڑا؟“ نعیم نے پوچھا۔

”انہیں نہیں ملا تھا۔“

”یہ تو کوئی وجہ نہیں۔“

سور۔ ایک سیلچے سے مر گیا۔“

”چپ رہو۔“ جوگندر سنگھ دانت پیس کر نیچی آواز میں چیخا۔

وہ دریا پر کھڑے تھے۔ تین آدمی کنارے پر سے ہٹ کر گھاس پر لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ تینوں سکھ بھائیوں نے ایک ساتھ ان کے لحاف جھٹک کر دور پھینکے اور بلموں کے پھل سوئے ہوئے آدمیوں کے سینوں میں اتار دیے۔ مہندر سنگھ نے بلم نعیم کو پکڑا یا، لپک کر ماں کی ٹوکری سے تلاوار نکالی اور ایک ایک وار میں ان کے سر جدا کر دیے۔ وہ آواز نکالے بغیر مر گئے۔ نعیم بلم پکڑے دریا کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ اُس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور حلق میں سے گرمی نکل رہی تھی۔ سردی کی وجہ سے کپکپاہٹ جو اُس پر طاری تھی سارے بدن پر پھیل گئی۔

مردوں نے چارہ کاٹنے والے ٹوکوں سے مرے ہوئے آدمیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے

کیے اور عورتوں نے ٹوکریوں میں بھر بھر کر انہیں دریا میں بہا دیا۔ پھر انہوں نے لالٹین جلائی اور خون آلود زمین کو کدال سے کھودا۔ پھر کلدیپ کور اور اس کی ساس نے بڑی پھرتی اور صفائی سے مٹی ٹوکریوں میں لاد لاد کر دریا میں بہا دی۔ زمین کو ہموار کرنے کے بعد وہ خاموشی سے واپس لوٹے۔ نعیم کو اپنے منہ میں خون کا مزا محسوس ہونے لگا۔ اس نے کھنکار کر تھوکا اور اسے لگا کہ اس نے بہت سے پتھر کھالے ہیں جو اس کے معدے میں جا کر بیٹھ گئے ہیں۔

آخری تاریخوں کا کمزور سا چاند بادلوں میں ظاہر ہوا اور مہندر سنگھ کی آنکھیں، جو شراب اور خون کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں، نظر آنے لگیں۔ اُس نے چلتے چلتے ہاتھ بڑھا کر کلدیپ کور کے سینے پر پھیرا۔ لڑکی ہونٹ چبانے لگی۔ نیم تاریک رات میں وہ سایوں کی طرح سبز ریشمیں فصلوں کے بیچوں بیچ چلتے رہے۔

چارے کے ایک کھیت پر پہنچ کر مہندر سنگھ رک گیا۔

”بوڑی کے لیے چارہ نہیں ہے“۔ وہ بڑبڑایا۔

”اوتیرا کیا ارادہ ہے اب، میں؟“ جو گندر سنگھ غصہ دبا کر بولا۔

”چارہ کاٹوں گا۔“

”بے وقوف، مرے کا؟ تیری عقل کہاں گئی ہے؟“

”اور تیری ماں بوڑی بھوکی مر جائے؟“ مہندر سنگھ بلم کا پھل گیلی زمین میں گاڑ کر

بولا۔

”آہستہ بول، جانور۔ چاروں طرف لوگ کھیتوں کو پانی لگا رہے ہیں۔ چل۔“

”جاؤ۔“ مہندر سنگھ چلایا، ”میں چارہ لے کر آؤں گا۔“

اُس کی آواز بند کرنے کے لیے سب جلدی سے روانہ ہو گئے۔

”تو کہاں جا رہی ہے؟“ مہندر سنگھ بلم کا چوبی دستہ کلدیپ کے پیٹ میں گاڑ کر بولا۔

”خاوند کے ساتھ سونے کے لیے اب کوئی وقت نہیں۔ چل، چارہ کٹوا۔“

جو گندر سنگھ کھیت کے کونے پر جا کر رکا، چند منٹ تک اندھیرے میں اپنی بیوی اور بھائی کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر زیر لب گالیاں دیتا ہوا چلا گیا۔

پگڑی میں اڑسی ہوئی دراتتی نکال کر مہندر سنگھ نے کھیت کے درمیان چارہ کاٹنا شروع

کیا اور مشین کی سی تیزی سے بہت سی جگہ خالی کر دی۔ کلدیپ کور گٹھے باندھ باندھ کر ٹوکری

میں بھرتی گئی۔ سبز، نمدار چارے کی بو ان کے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ رات تاریک اور سرد

تھی۔ بادلوں نے ہوا تقریباً بند کر رکھی تھی اور ساری کائنات ایک بہت بڑے سیاہ گولے کی

طرح دکھائی دے رہی تھی۔ دریا کا ہلکا شور دور سے ان کے کانوں میں آ رہا تھا۔ ایک سایہ کھیت

کے کونے پر نمودار ہوا اور مہندر سنگھ لیٹ گیا۔

”لیٹ جا۔“ اس نے سرگوشی کی۔ کلدیپ کور لیٹ گئی۔ نیم تاریکی میں اس کا ابھرا ہوا سینہ مہندر سنگھ کو نظر آ رہا تھا۔ سایہ، جو کوئی پانی کو جاتا ہوا کسان تھا، ہاتھ میں کدال پکڑے خاموشی سے گزر گیا۔

”تیرا سینہ چارے کے اوپر دکھائی دے رہا تھا۔ اوندھی لیٹا کر۔“ مہندر سنگھ نے کہا، اگر دیکھ لیتا ماں کا یار تو۔“

”تو ایک اور سہی۔“ کلدیپ کور نے کہا، ”تمہارا بلم تو ابھی ثابت ہے۔“

”بک بک مت کر۔ ادھر آ۔“

وہ اگر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”چلو چلیں۔ سویر ہونے والی ہے۔“ مہندر سنگھ نے اس کے سخت سینے پر ہاتھ رکھا۔

”جانور۔“ وہ اندھیرے میں چیخنی۔

”تھک گیا ہوں۔“ اس نے بائیں پھیلا کر سرد چارے پر لوٹ لکائی۔

”مجھے سردی لگ رہی ہے۔“

”ادھر آ۔“

وہ اس کے برابر لیٹ گئی۔

”اب بھی سردی لگتی ہے؟“ مہندر سنگھ نے اسے کس کر اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا،

”بتا۔ اب بھی لگتی ہے؟“

”نہاتے نہیں ہو۔“

”نہیں۔“

”تمہارے سر سے بو آ رہی ہے۔“

”حرام زادی۔“

”مت دبا۔“ وہ دانتوں کے درمیان سے چیخنی، ”میری سانس رک رہی ہے۔“

وہ ہنسا۔ ”میں اور بھی زور سے دبا سکتا ہوں۔“

”سور۔ تم مجھ سے زیادہ زور آور نہیں ہو۔“

”میں سب سے زیادہ زور آور ہوں۔“ وہ ہنسا اور ٹانگیں اس کی ٹانگوں میں پھنسا کر

چارے پر لوٹنے لگا۔ ایک دوسرے سے جڑے دونوں دور تک لوٹتے ہوئے چلے گئے۔ نرم سبز

چارہ ان کے نیچے دیتا اور سر اٹھاتا رہا۔

”جانور۔ میل کی اولاد۔ چھوڑ مجھے۔“ وہ رک رک کر بولی۔

”میں سب سے زیادہ زور آور ہوں۔“

”جوگندر تم سے زیادہ زور آور ہے۔“

”تیری ماں کا یار وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے؟“

”اس نے آج سب کاٹے ہیں۔“

”حرام زادی۔“ اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

”غلط ہے یہ؟“

”سو رنی، تیرے باپ تھے جو ان کا رونا روتی ہے؟“ تھوک اس کے نرخرے میں اٹک

گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”رات حرام کر دی۔“

اس نے بلم کو چارے کے ڈھیر پر مارا۔ پھل دوسری طرف نکل گیا۔ کلدیپ کور نے

بال سمیٹ کر جوڑا بنایا، بلم نکال کر اسے پکڑایا اور ٹوکری اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

کافی دیر تک خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد مہندر سنگھ نے اونچی آواز سے گانا شروع کر دیا۔

”کوئی سن لے گا۔“ کلدیپ کور نے کہا۔ وہ گاتا رہا۔

”جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو صبح کا ستارہ منڈیر کے پاس چمک رہا تھا اور اس کی ساس

لکڑی کی بالٹی اٹھائے گاٹے دوھنے کے لیے جا رہی تھی۔۔

”اتنی دیر لگا کر آئی؟“

”اپنے بیٹوں کو تھوڑا دیا کرنا کھانے کو۔ کتے کی طرح ہر وقت تنگ کرتے ہیں۔“ اس

نے کہا اور سیدھی کھاٹ پر چلی گئی۔

(۷)

کٹائی شروع تھی۔ روشن پور کا ہر فرد اور ہر جانور کام میں مصروف تھا، صرف پرندے اسی طرح

آوارہ، نکلے اڑ رہے تھے۔ کڑکتی دھوپ اور لو کی وجہ سے کسانوں کے جسم سیاہ ہو گئے تھے۔

اور عورتوں کی منگیوں میں کھی ختم ہو چلا تھا کہ ہر کٹائی کرنے والے کو پاؤں سیر مکھن روٹی پر لگانے

کو چاہیے تھا۔ چوپایوں کی پسلیاں نکل آئی تھیں، عورتوں کے چہروں اور ہاتھوں پر خشکی کے

سفید دھبے پڑ گئے تھے اور ان کے بال کھردرے ہو چکے تھے۔ بچوں کی ٹانگیں پتلی اور پیٹ بڑھ

گئے تھے اور یہ حالت ہر جان دار کی مشقت اور زندگی کی سختی کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔

لیکن کسان اپنے گہرے شکن آلود چہروں اور دھنسی ہوئی آنکھوں اور کالوں کے باوجود ایک

سو بیس درجے کی گرمی میں کام کرتے ہوئے خوش تھے کیونکہ سامنے ان کی بھاری، پکی ہوئی

فصل کھڑی تھی۔ وہ درانتیاں چلاتے ہوئے، ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے، مذاق میں کالیاں

دیتے ہوئے سنہری میٹھی گندم کاٹ کاٹ کر ڈھیر کرتے جاتے تھے۔

کٹائی کے تیسرے دن زیادہ تر کھیت صاف کیے جا چکے تھے اور جگہ جگہ کاٹی ہوئی فصل کے انبار لگے تھے۔ گاؤں کا ہر بشر کام کرنے کو کھیتوں میں نکل آیا تھا۔ عورتوں کے رنگ برنگ کپڑوں اور مردوں کے کالے جسموں کا سیلاب ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور ایک اندرونی مسرت کا دھارا تھا جو کسانوں کی آنکھوں اور ہاتھوں سے پھوٹا پڑتا تھا، کہ یہ ان پڑھ لوگ قہقہہ لگا کر ہنسنا نہیں جاتے۔ ان کی خوشی حرکت اور عمل سے واضح ہوتی ہے۔

مہندر سنگھ کے کھیت پر پہنچ کر نیاز میگ نے رسیوں پر جسم کا سارا بوجھ پیچھے پھینک کر میلوں کو روکا اور گاڑی پر بیٹھا بیٹھا بولا :

”میں کل بھی آیا تھا۔“

مہندر سنگھ کھیت میں سے اٹھ کر آیا اور گاڑی کی ہتھی پر کہنی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”واہگرو چوہدری، کیا بات ہے؟“

”اللہ کرم کرے۔ تمہاری آنکھ کیوں سرخ ہو رہی ہے۔“

”پسینہ پڑ گیا ہے۔ پسینہ تو مادر چود لسی کی طرح بہتا ہے۔“ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ فضا میں مٹیالے رنگ کی دھوپ اور میلا سا غبار بکھرا ہوا تھا۔ آسمان پر چیلیں زبانیں نکالے اڑ رہی تھیں اور چاروں طرف سے اڈتی ہوئی گرمی اور جس زمین پر مرکوز تھا۔

”طوفان کے آثار ہیں۔“ اس نے کالی دی اور دراتتی کے دستے سے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ ”میں مطلب سے آیا تھا۔“ نیاز میگ نے کہا اور داڑھی کھجانے لگا۔ پھر اسے چھوڑ کر میلوں کی پشت پر اٹکیاں بجائے اور سر اٹھا کر چیلوں کو دیکھنے لگا۔

”واہگرو۔ چوہدری کیا بات ہے؟“

”تمہاری جگہ ہے؟“

”کیسی جگہ؟“

”ہمارا غلہ شاید کچھ بیچ رہے۔“

مہندر سنگھ نے پگڑی میں سے لٹکتی ہوئی بالوں کی لٹ کو پکڑ کر دراتتی سے کاٹا اور اٹکیوں میں مسل کر نیچے گرا دیا۔

”پتہ نہیں۔ ہماری اپنی فصل بہت ہے اس بار۔ پتہ نہیں۔“

”میں منشی کے پاس گیا تھا۔ وہ آدھے پر رکھتا ہے۔ تم میرے بیٹے کے دوست ہو۔“

”تمہارا دالان بڑا ہے۔“

”رکھ دینا۔ رکھ دینا۔ میں بھوسے پر سو جاؤں گا۔ جاڑے میں۔“ مہندر سنگھ نے

کہا۔

”ہاں ہاں۔ میرا بیٹا تمہارا دوست ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

نیاز بیگ نے رسیوں کو ڈھیل دی، پھر کھینچ لیا۔ ”جب میں سزا پر گیا تو تمہارے باپ کو ایک میل دے گیا تھا۔ تمہارا باپ مر گیا۔ میل کا پتہ نہیں کیا ہوا۔“ وہ رکا، پھر شرمندگی سے ہنسا۔ ”میں کوئی واپس تو نہیں مانگتا۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ میرا دوست تھا۔ آخر۔“ وہ رسیاں میلوں کی پیٹھ پر مارنے لگا۔

”یہ نہیں چلیں گے چوہدری۔“ مہندر سنگھ ہنسا۔ ”انہیں تھوڑی سی دارو پلا۔“

نیاز بیگ غصے میں آگر میلوں کو بے تحاشا پیٹنے لگا۔

اگلے کھیت میں ڈھول بج رہا تھا اور کٹائی کی دھن پر کسان درانتیاں چلا رہے تھے۔ دو میراثی تنگے بدن پسینے سے شرابور کھیت کے وسط میں کھڑے ڈھول پیٹ رہے تھے۔ یہ کٹائی کی مخصوص دھن تھی۔ اس سے بجانے والے اور سننے والے کا خون ابل کر بازوؤں میں آجاتا تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر دراتی چلاتا جاتا تھا۔ میراثی آنکھیں میچے دو دو گھنٹے تک ڈھول بجاتے رہتے اور کسان اس کی دھن پر مست بغیر سانس لیے ہاتھ چلاتے جاتے۔ یہ ایک اور تین کی تال تھی اور دراتی کے چلاؤ کے لیے مخصوص تھی۔ دراتی تین بار چھوٹے چھوٹے جھٹکے کھاتی اور چھوٹھی بار بڑا جھٹکا۔ کررر۔ اور خشک۔ تڑ۔ تڑ کرتے پتلے نازک گندم کے پودوں کا گٹھا ہاتھ میں آجاتا اور پھر تال کا چکر شروع ہوتا۔ دھم دھم دھما دھم۔ کرر کرر کرر۔ کسان پاؤں پر بیٹھے بیٹھے چلتے جاتے اور چھوٹے چھوٹے گٹھے چھوڑتے جاتے۔ پسینہ اُن کے ماتھے سے، گردن سے، بغلوں سے ٹپکتا اور زمین میں جذب ہو جاتا۔ بھوکی اور کمزور زمین پسینے سے سیراب ہوتی اور فصل ان کے حوالے کر دیتی۔ چھ ماہ پہلے یہی زمین سیاہ، طاقتور اور گیلی تھی اور تھے تھے سبز پودوں کو مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھی۔ پانچ ماہ بعد پھر یہ سیاہ اور طاقتور اور کمزور تھی اور اپنے بچوں کو پال کر مالک کے حوالے کر رہی تھی۔

”در در در سؤر۔ سست ہو گیا۔ ہلا پوسی کا ہلا لالا۔“ وہ جانوروں کی بولی بول کر ایک دوسرے کو اکساتے اور دھم دھم دھما دھم۔ کرر کرر۔ شریف، محنت کش ہاتھوں میں درانتیوں کی قطار ایک تال پر جھولتی فصل کی جڑوں پر ناچنے لگتی۔

جب سورج سر پہ آیا تو گاؤں کی طرف سے رنگ برنگے کپڑوں کا سیلاب اُبڑ پڑا۔ بوڑھی جوان سبھی عورتیں سر پہ لسی کے منگے اور کھی سے تر بتر باجرے کی روٹیاں اٹھائے گھروں سے نکل پڑیں۔ وہ اکیلی اکیلی اور غولوں میں آئیں اور مختلف کھیتوں میں پھیل گئیں۔ ان کے باریک کرتے پسینے سے کمر، پیٹ اور چھاتیوں پر چمٹے ہوئے تھے، بال اٹھے کر کے انہوں نے جوڑے باندھ رکھے تھے اور بڑی جوان چال چلتی، لالچی نظروں سے اپنے مردوں کو دیکھتی چلی آ رہی تھیں۔ اپنے اپنے کھیتوں پر پہنچ کر انہوں نے کھانا رکھا اور جگہ جگہ سے چھوٹے چھوٹے گٹھے اٹھا

کر جمع کرنے لگیں۔ میراثیوں نے ڈھول بجانے والی سونٹیوں سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور درختوں کے ٹھنڈے سائے کی طرف لوٹے۔ کٹائی کرنے والے دکھتے ہوئے گھٹنے اور دھنسنے ہوئے پیٹ لے کر اٹھے اور بھوکے جبروں کے ساتھ ساتھ روٹی پر پل پڑے۔

”تو بنا سرچہڑے نہیں رہ سکتی۔“ مہندر سنگھ نے دونوں کالوں میں روٹی بھر کر کھاتے ہوئے کلدیپ کور سے کہا۔

”تجھے کیا۔ تجھے تو پورا کھی ملتا ہے۔“

”اور تو اپنی ماں کا کھی سر پر لگاتی ہے؟“ وہ چیخا۔

”چپ رہ۔ بھیڑیے۔“ جو گندر سنگھ نے کہا۔ ”سب اپنی اپنی ماں کا کھی کھاتے ہیں۔“

ایک دوسرے سے مت لڑو۔“ تینوں ہنسنے لگے۔ پھر انہوں نے کٹورے بھر بھر کے لسی کے پیے اور واپس کام میں جا کر جٹ گئے۔

سورج ڈھل رہا تھا تو مغرب کی طرف سے بادل اٹھے اور تیزی سے آسمان پر پھیل گئے۔ کسانوں کی فکر مند نگاہیں آسمان پر بھٹکنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں دن بھر کی مسرت اور سکون کی بجائے خوف کی جھلک لہرا گئی۔ میل گاڑیاں بھگا کر وہ گاؤں سے تمام بوریاں اور ترپالیں لائے اور ان سے کٹی ہوئی فصل کو ڈھک دیا۔ جو بچ رہی اسے گاڑیوں پر لاد کر گھر لے چلے۔

”اسے قصائی کو دے دو۔ آج یہ نہیں چلتے۔“ مہندر سنگھ میلوں کو چلاتے ہوئے

پکارا۔

”نہیں چلتے؟ ان کی ماں۔“ فقیر دین پہنچ کر لکارا۔ مہندر سنگھ نے بھی اسی آواز میں جواب دیا

کے میلوں کی آنکھیں ابل پڑیں۔ پھر ڈھیل دی، وہ آگے کو جھول گئے۔ پھر کھینچا، پھر ڈھیل دی۔ میلوں کے تتھنے پھر پھرائے، مونچھیں ہوا میں لہرائیں، پٹھے اکڑے اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ دوڑ پڑے۔

”الالا لالا۔“ فقیر دین پہنچ کر لکارا۔ مہندر سنگھ نے بھی اسی آواز میں جواب دیا

اور میلوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کچی سڑک پر دونوں کی گاڑیاں بھاگنے لگیں۔ بغیر اعلان کے دوڑ شروع ہو گئی۔ دیہاتوں میں ایسے مقابلے روز مرہ کی بات تھی اور ان میں بہت کم باقاعدہ اعلان جنگ کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ اب دونوں طرف سے ”الالا۔“ کی مخصوص رٹ اٹھ رہی تھی، یہ اونچی، کرخت بھیڑیوں کی آواز تھی جو دونوں فریق جوش اور غصے میں آکر نکال رہے تھے، اور چھڑیاں اور رسیاں اور گیہوں کے ناڑ میلوں کی پسلیوں پر مارتے جا رہے تھے۔ راستے میں جاتے ہوئے کسان انہیں دیکھتے اور رستہ چھوڑ دیتے۔ جوشیلے لڑکے ایسی ہی آوازیں نکال کر ان کی ہمت بڑھاتے۔ گاڑیاں کچی سڑک کے گڑبوں اور پتھروں پر اچھلتی، میٹھتی، چرچاتی، گرد و غبار کا طوفان اٹھاتی ہوئی بھاگ رہی تھیں، اور اوپر ہر دو فریق کے بھی خواہ گاڑی کے ڈنڈوں سے لپٹے

ہنکارے مار رہے تھے۔

”اوپر برکھا آرہی ہے اور لونڈوں کو مستی سو جھتی ہے۔“ جلدی سے رستہ چھوڑتا ہوا ایک بڑھا بھوؤں میں جھلایا۔ گاڑیاں کھڑکھڑاتی ہوئی اس کے پاس سے نکل گئیں، اور وہ سر سے پاؤں تک گرد میں اٹ گیا۔

جوہڑ کے کنارے پہنچ کر مہندر سنگھ نے گاڑی ٹھہرائی اور مڑ کر تہبند نکال دیا۔
 ”اللا لاہ۔۔ واہ کرو۔“ فتح اور غرور کے نشے میں وہ فقیر دین کے رستے میں کھڑا ہو کر ناچنے لگا۔ فقیر دین نے کنجی آنکھیں سکیر کر دیکھا اور نفرت سے اس کی طرف تھوکتا ہوا نکل گیا۔
 کلدیپ کور اندر سے نکلی اور شرم سے لال ہو کر واپس چلی گئی۔

رات بھر وہ جاگتے اور فصلوں کے گرد پھرتے رہے۔ پچھلی رات مطلع صاف اور پرسکون ہو گیا۔ طوفان خاموشی سے گزر چکا تھا۔ کسان اگلا دن شروع کرنے سے پہلے دو گھڑی آرام کرنے کی خاطر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ سیرے ایک اور طوفان ان کی راہ دیکھ رہا تھا۔
 سورج ہاتھ بھر بھی اوپر نہیں آیا تھا۔ لیکن دن میں دوپہر کی تپش آچکی تھی۔ صبح کی تازہ، سبک ہوا کے ساتھ دھوپ کچی مٹیوں اور بھورے وسیع کھیتوں پر پھیل چکی تھی۔ مٹیالے رنگ کا غبار جو تین روز تک گاؤں پر منڈلاتا رہا تھا بادل اور ہوا کے گزرنے کے ساتھ چھٹ چکا تھا۔

فضا پہاڑی جھرنے کی طرح کھنکتی ہوئی شفاف تھی، اور آخر مٹی کے سفیدی مائل نیلے آسمان پر پر شکم پرندے آزادی سے اڑ رہے تھے۔ دھوپ بڑی آہستگی سے گلیوں میں داخل ہوئی اور میلوں کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ انہیں کھیتوں کو لے جاتے ہوئے کسان ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ گھنٹیوں کی کھنک اور کسانوں کی آوازیں صبح کی دھوپ کی طرح گرم، شفاف اور جاندار تھیں۔ نکھری نہائی ہوئی فضا میں ہک کی سفید روئی کی ’بڑھیاں‘ اڑ رہی تھیں۔ اور چند بچے شور مچاتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

جوہڑ کے کنارے پر پہنچ کر ساری آوازیں ایک ایک رک گئیں۔ صرف بچوں کے چلانے کا شور دور سے آتا رہا۔ نیاز بیگ باہر نکلا اور گھبرا کر واپس گھر میں گھس گیا۔ بھوسے کے ڈھیر میں چہرہ گاڑ کر وہ عورت سے بولا:

”کواڑ بند کر دو۔ تالا لگا دو۔ چھپر پر پڑا ہے۔ کسی کو مت بتانا۔ یہاں پر کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔ سنا؟ جاؤ۔“ پسینہ اس کی سیاہ گردن پر دھاریاں بناتا ہوا گندے کالر میں جذب ہو رہا تھا۔

نعمیم باہر نکلا۔ شیشم کے بڑے پیڑ کے نیچے دس بارہ فوجی ٹرک اور لاریاں کھڑی تھیں۔ تین گورے سارجنٹ اور دو گورے فوجی افسر کسانوں اور میلوں کے ہجوم کے سرے پر حرکت

کر رہے تھے۔ ان کے پاس مہندر سنگھ کی میل گاڑی دونوں ڈنڈے آسمان کی طرف اٹھائے
کھلی کھڑی تھی۔ پولیس کے سپاہی ہر طرف سے کسانوں کو گھیر کر لا رہے تھے۔

ایک انگریز سارجنٹ نے شستہ اردو اور بھاری، کرخت فوجی لہجے میں ہجوم کو مخاطب کیا:
”اپنے ملک، اپنی حکومت کی حفاظت کرنے کا فرض ہر فرد پر عاید ہوتا ہے۔ جنگ تمہارے ملک
اور تمہاری حکومت کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔“

ہجوم پر سناٹا طاری تھا۔ کبھی کوئی میل سینک جھٹک کر پھنکارتا اور اس کی کھنٹی کی آواز
ایک لحظے کے لیے سکوت کو توڑ دیتی۔ سارجنٹ نے اپنے زرد چہرے پر آہستگی سے ہاتھ پھیرا
اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

”جنگ جیتنے کے لے ہمیں جوانوں کی ضرورت ہے۔ جس کے پاس زیادہ جوان ہوں گے
وہ حکومت جنگ جیتے گی۔ ہمارے ملک میں لاکھوں جوان ہیں۔“ اس نے رک کر ہاتھ پھیلایا۔
”ان کی مدد سے ہم ضرور فتح حاصل کریں گے۔ جوانوں کو چاندی کے ساتھ شاہی سکے ماہوار دیے
جائیں گے۔ اور راشن وردی کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔ جنگ ختم ہونے پر جوان واپس آجائیں
گے۔“ ”واپس آجائیں گے۔“ بڈھا رحمت طنز سے ہنسا۔ ”جنگ میں اب خون ہونا بند ہو گیا
ہے۔ ہم تماشے پر جا رہے ہیں ایس؟“

سارجنٹ کے ہونٹ کانپے۔ ”ہم بوڑھوں کو نہیں لے جائیں گے۔ جوان اپنا نام
دیں۔“

مجھے میں سے شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ اٹھی۔ درمیان میں دو لڑکے باتیں کرنے
لگے۔

”لڑائی کہاں ہو رہی ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

”لڑائی ہو کہاں رہی ہے۔ ہاں۔“

اکلی صف میں کھڑے ہوئے مہندر سنگھ نے سارجنٹ کو مخاطب کیا: ”ہاں۔ لڑائی کہاں
ہو رہی ہے؟“ بھنبھناہٹ تیز ہو گئی۔

”خاموش۔“ سارجنٹ نے ہاتھ پھیلایا۔ ”جنگ اٹھلستان کو دھکی دے رہی ہے۔
اٹھلستان کو دھکی دے رہی ہے۔ میرا مطلب ہے آپ کی حکومت۔ حکومت برطانیہ کو پچانے کے
لیے آپ کی ضرورت ہے۔ جوان اپنا نام دیں۔“

”ہم کٹائی پر جا رہے ہیں۔“ بیچ میں سے آواز آئی۔

”کٹائی ختم کر کے جائیں گے۔“

”فصل باہر پڑی ہے۔ ابھی۔“ مہندر سنگھ اگلی صف میں سے بولا۔ سارجنٹ نے ایک نظر مڑ کر انگریز فوجیوں کو دیکھا پھر مضبوط آواز میں بولا: ”ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہمیں سارے ضلع میں جانا ہے۔ اپنے نام دو۔“

ہجوم میں جنبش پیدا ہوئی۔ کسان اپنے اپنے میلوں کے ساتھ جسم رگڑنے لگے۔ مختلف جگہوں سے چند دبی دبی آوازیں آئیں: ”ہم کیا کھائیں گے؟“ ”فصل کو گیدڑ اٹھائیں گے۔“ ”ہم نہیں جائیں گے۔“ ”سارے برس ہم نے سڑوں کے لیے محنت کی؟“

”دیکھو۔ ہمارے ہاتھ دیکھو۔“ پیچھے کھڑے ہوئے ایک کسان نے سیاہ، خشک تڑکا ہوا ہاتھ پھیلایا۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے اس کا گانٹھ داں پرانے سوکھے ہوئے چمڑے والا ہاتھ دیکھا، لیکن سارجنٹ مڑ کر فوجیوں کو دیکھ رہا تھا۔

لبے، پتلے چہرے والے فوجی افسر نے جیب سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا، الٹ پلٹ کر دیکھا، اور اپنے ساتھی کو پکڑا دیا۔ پھر وہ تیز تیز چل کر رکی ہوئی گاڑی پر جا چڑھا اور وزن قائم رکھنے کے لیے ایک بازو پھیلا کر تیز لہجے میں بولا:

”اپنی فصلیں اب تم اس سے کاٹو گے۔ اور میدان جنگ میں کاٹو گے۔“ یہ کہہ کر اس نے سنگین ہوا میں لہرائی۔ چمکتے ہوئے فولاد پر سورج کا عکس پڑا اور میلوں نے بدک کر سینک جھٹکے۔ پھر اس نے ماہر فن کی طرح سنگین گاڑی کے فرش پر پھینکی جو جا کر لکڑی میں گر گئی۔

”سپاہیوں کو حکم دو جوانوں کو پیش کریں۔“ اس نے سارجنٹ سے کہا۔

سنگین لگی رائفلوں سے جوانوں کو ہانکا جانے لگا۔ بعض کسانوں کو پسلیوں میں رائفلوں کے دستے اور سنگینیں چھو چھو کر میلوں سے علیحدہ کیا گیا، لیکن وہ بچوں کی طرح ان کی گردنوں اور سینگوں سے لپٹے ہوئے دبی دبی زبان میں کالیاں دیتے رہے۔ نعیم خاموشی سے چلتا سارجنٹ کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”میرا نام لکھو۔“ اس نے انگریزی میں کہا۔

سارجنٹ نے اچھنبے سے اسے دیکھا۔ ”تم تعلیم یافتہ ہو؟“

”میں نے کلکتہ سے سینئر کیمبرج کیا ہے۔“

”اور اب کٹائی کو جا رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”جاؤ۔“ سارجنٹ کاغذات پر جھک گیا۔

”میں محاذ پر جاؤں گا۔“

سارجنٹ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔ ”تم اس کے لیے موزوں نہیں

ہو۔ جاؤ۔“ پتلے چہرے والا افسر قریب آکھڑا ہوا۔ نعیم نے غیر یقینی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ایک شدید اندرونی خواہش کے زیر اثر بولا: ”میں سواری کر سکتا ہوں۔ رائل چلا سکتا ہوں۔ ان سب سے بہتر لڑ سکتا ہوں۔“

”ٹھہرو۔ بھرتی ختم ہونے دو۔“ افسر نے آہستہ سے کہا۔

وہ وہیں کھڑا سروں کے اوپر اوپر مغرب کی طرف دیکھنے لگا جہاں دھوپ میں چمکتے ہوئے کھیت تھے، اور گیہوں کے بھاری خوشے شراہیوں کی طرح ہوا میں جھوم رہے تھے۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی فصل کے انبار بڑے بڑے مردہ کچھوؤں کی طرح سنسان کھیتوں میں پڑے تھے اور ایک اکلوتی سیاہ گھوڑی ان کے درمیان پھر رہی تھی۔ آسمان پر چیلیں زبانیں نکالے چیخ رہی تھیں اور دوپہر کی گرم ہوا کھیتوں میں، کھلیانوں میں، فصلوں میں اور کسانوں کے پسینے کی منتظر خشک مٹیالی زمینوں میں سرسرا رہی تھی۔ نعیم کا اپنا کھیت اس کی پشت پر تھا۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے مڑا، پھر رک گیا اور سوئی سوئی نظروں سے اچھلتے کودتے ہوئے، دھکم پیل کرتے اور گالیاں دیتے پسینے اور گرد میں اٹے ہوئے جھوم کو دیکھنے لگا۔ دو گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد صرف دو نو عمر لڑکے، جن کے ماں باپ مر چکے تھے، بھرتی کیے جا سکے۔ پتلے چہرے والا فوجی افسر، جو نمایاں طور پر غصے میں تھا، نعیم کی طرف مڑا:

”ہمیں تعلیم یافتہ لوگوں کی نہیں، کسانوں کی ضرورت ہے۔ بہتر ہے تم یہیں ٹھہرو۔ یا محکمہ تعلیم میں نوکری کر لو۔“

”میں کسی محکمہ میں نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ میں کسان ہوں۔“ نعیم نے کہا۔

افسر نے اکتا کر اسے سارجنٹ کے حوالے کیا اور پرے چلا گیا۔ ایک ہندوستانی حوالدار نے اس کا نام، ولدیت، مذہب، پیشہ، عمر قد اور شناختی نشان درج کیے اور کاغذات اس کے ہاتھ میں تھما کر دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

وہ رات ان تینوں نے ملٹری ٹرک میں گزاری۔ رات گئے تک وہ بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ پھر نو عمری کی نیند ان پر غالب آگئی اور وہ ایک ایک کر کے سو گئے۔ اگلی صبح انگریز افسر، جو راتوں رات گاڑی لے کر کہیں چلا گیا تھا، لوٹا۔ اس کے ساتھ روشن آغاثے۔ وہ فوجی گاڑی کی اگلی سیٹ سے اتر کر حویلی تک آئے اور وہیں کھڑے کھڑے جوانوں کو اکٹھا کرنے کو آدمی دوڑا دیے۔ ان کی آواز پر دیکھتے دیکھتے گاؤں کے تمام نوجوان، بوڑھے اور بچے حویلی کے میدان میں جمع ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد روشن آغاکے شکل دیکھ کر انہوں نے اپنی مسرور، گونگی، وفادار آنکھوں سے خوش آمدید کہا اور اگر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ روشن آغانے ایک اکتائی ہوئی، سر پر ستانہ نظر ان پر ڈالی اور کرسی پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر ایک مختصر سی تقریر کے دوران انہوں نے ہندوستانی کسانوں کی بہادری، حکومت برطانیہ سے ان کی وفاداری

اور جنگ کی ہولناکیوں وغیرہ کا ذکر کیا۔ اس تمام دوران میں سارے فوجی افسر سینے پر ہاتھ باندھے بڑی متانت اور لاتعلقی سے کھڑے رہے۔ آخر میں روشن آغا نے جنگ پر جانے والوں کے خاندانوں کی دیکھ بھال کا ذاتی طور پر ذمہ لیتے ہوئے سرسری لیکن فیصلہ کن لہجے میں بھرتی کے لیے پیش ہونے کا حکم دیا۔ اب کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ فوجیوں نے اپنا کام شروع کیا۔ کسانوں کے مجمع میں ایک خاموش ہلچل پیدا ہوئی، لیکن وہ، ایک ایک کر کے تنگے بدن ڈاکٹر کے آگے سے گزرتے رہے۔ ڈاکٹر نے چند ایک کو چھو کر دیکھا، باقی کو سر کے ہلکے سے اشارے کے ساتھ سارجنٹ کے حوالے کر دیا جو ان کے کاغذات تیار کر رہا تھا۔ تین گھنٹے کے اندر اندر گاؤں کے زیادہ تر نوجوان، جو تعداد میں چالیس تھے، بھرتی کر لیے گئے۔

لال دین سے حقہ رکھوانے کے لیے ایک سپاہی اس کی طرف بڑھا۔

”جاؤ۔“ لال دین حقے کو بازوؤں میں چھپا کر چیخا۔ ”جا میں نہیں دیتا۔ مجھے مار

دے، خون کر دے، پر اسے ہاتھ مت لگا۔ میں اس سے تیرا سر توڑ دوں گا۔“

سارجنٹ نے ہاتھ کے اشارے سے سپاہی کو روکا، اور اس طرح ایک حقہ جوانوں کے ساتھ چلا گیا۔ سب کو ٹرکوں اور لاریوں میں بھر لیا گیا۔ روشن آغا تھوڑی دیر رک کر اسی فوجی گاڑی میں واپس لوٹ گئے۔ گاؤں کی عورتیں اپنے بیٹوں، خاوندوں اور محبوبوں کو جنگ پہ جاتے دیکھ کر اونچی آواز سے رونے لگیں۔ بوڑھے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے امیر اور ویران کھیتوں کو تکتے لگے۔

نیاز بیگ اگلی صبح بھوسے والے کمرے سے نکلا۔ کم خوابی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کا خلاء شدت اختیار کر گیا تھا۔

”نعیم چلا گیا؟“ اس نے پوچھا۔ سرد چولہے کے آگے بیٹھے بیٹھے بڑی عورت نے خاموشی سے اسے دیکھا اور سر جھکا کر راکھ کریدنے لگی۔ اس کی آنکھیں زرد اور خشک تھیں۔ نیاز بیگ جھک کر چلتا ہوا دیوار کے پاس گیا۔ اور ایڑیاں اٹھا کر اگلے مکان میں جھانکنے لگا۔

”حسین چلا گیا؟“

”ہاں۔“ دیوار کے پرلی طرف احمد دین نے جواب دیا۔

”اور کون گیا؟“ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

”فصل پر جا رہے ہو؟“ وہ دوبارہ اُچکا۔ اس طرف خاموشی رہی۔

کچھ دیر تک وہ صحن کے وسط میں کانپتی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا رہا۔ دو راتوں میں وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ پھر وہ چلم پر تمباکو اور گڑ رکھ کر چولہے کے پاس گیا۔

”آگ ہے؟“

”نہیں۔“ عورت اس کے غصے کا انتظار کرنے لگی۔

اس نے خاموشی سے چلم زمین پر رکھ دی اور کونے میں جا کر دراتتی اور رسہ اٹھایا۔ جھکے ہوئے جسم اور کمزور چال سے صحن پار کرتے ہوئے اسے اس کی بیوی نے دیکھا اور رنج اور رحم سے خوف زدہ ہو گئی۔ ”بوڑھے کے اب کتنے دن ہیں۔“ اس نے سوچا۔

نیاز بیگ نے رسہ کندھے پر پھینکا اور دراتتی کو پکڑی میں اڑسنے لگا۔ دیر تک وہ اعصابی اٹھکیوں کے ساتھ پکڑی، رسے اور دراتتی کے ساتھ الجھتا اور بھوؤں میں جھلاتا رہا۔ پھر اس نے جھک کر نعیم کی دراتتی اور رسہ اٹھایا اور دروازے میں بیٹھے ہوئے چھوٹے لڑکے کے کندھے پر رکھا۔ ”آؤ۔“ باہر نکلتے ہوئے وہ بولا۔

بچہ رسے کو سنبھالتا ہوا کود کر اٹھا اور خوش ہو کر چپکا: ”میں کٹائی کر لیتا ہوں بابا۔ کل میں نے دو مرلے فصل کاٹی تھی۔“

دروازے کے پاس وہ بھینس کے پھولے ہوئے تھنوں کو دیکھ کر رک گیا۔ ”اسے دودھ نہیں؟“ تھنوں کے نیچے ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ بھینس ڈکرائی اور سفید گاڑھے دودھ کے چند قطرے اس کی ہتھیلی پر گر پڑے۔ چھوٹے لڑکے نے سہم کر اسے دیکھا۔ (یہ نیاز بیگ کے گھر میں بہت بڑا جرم تھا۔ اس لاپرواہی پر وہ دو دو فٹ اچھلا کرتا اور کہتا: ”جانور کو عذاب دے کر تم کبھی سکھی نہیں رہ سکتے۔ تمہاری گود کے بچے بھی مر جائیں گے اور تمہاری چھاتیوں سے دودھ ٹپکے گا، لٹیو۔۔۔“) عورت ہاتھ روک کر پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

اس نے گندی ہتھیلیوں میں دودھ مل کر سر کے بالوں سے پونچھا۔

”بھینس دودھ پھینک رہی ہے۔“ پھر اس نے بیمار آواز میں کہا اور باہر نکل گیا۔ لڑکا فصل کاٹنے کی خوشی میں اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا اور مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ دفعتاً بڑی عورت، جو دو روز سے خاموش بیٹھی تھی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دھوپ کھیتوں اور کچے مکانوں کی مٹیوں پر پھیل گئی تھی اور گلیوں میں سے سیلوں کی گھنٹیوں کی اکا دکا آوازیں آ رہی تھیں۔

(۸)

نمبر ۱۲۹ بلوچی، ڈیوک آف کنانس اون، فیروز پور بریگیڈ، لاہور ڈویژن۔ رجمنٹ دو ماہ تک ہیڈ کوارٹرز پر رکی رہی۔ اس عرصے میں رنگروٹوں کو اتھائی سخت ٹریننگ سے گزرنا پڑا۔ اٹھارہ گھنٹے جو وہ جاگتے ان میں سے بارہ گھنٹے مشقیں (Exercises) کرتے، پریڈ دوڑ اور اسلحہ کا استعمال سیکھتے، چھ گھنٹوں میں کھانا کھاتے، کپڑے سیتے، جوتے اور بن پالش کرتے اور گپ

مارتے -

درختوں ، کبوتروں اور کھیتوں کی ہوا کی طرح آزاد ، اپنی مرضی سے کام کرنے والے کسانوں پر یہ منظم ، مشینی عمل بہت بھاری ہو گیا۔ کھیتوں اور باغوں میں وہ اس سے زیادہ سخت کام کرتے تھے، لیکن اب میلوں اور گھوڑوں کی بجائے رائفل اور خوراک و بارود کا تھیلا تھا اور جہاں وہ اپنی خفیف ترین مرضی کے مطابق گاؤں کی کسی بھی گلی ، کسی بھی کونے پر مڑ سکتے تھے ، رک کر باتیں کر سکتے تھے، اب خاص ہدایات کے تحت دائیں اور بائیں مڑنا ، اور حکم ملنے پر رکنا چلنا پڑتا تھا۔ محنت کی اس پابندی سے ان کے جسم تھکاوٹ سے ٹوٹ گئے اور چاق و چوبند ذہن غبی اور سست ہو گئے۔

اگست کے پہلے دن نعیم پریڈ پر سے لوٹا آسمان پر ساون کے سیاہ گھنے بادل گڑ گڑا کر چمک رہے تھے۔ علی پور کا عبداللہ ، جو ساری پلٹن میں نعیم کا واحد دوست تھا ، بارک کے کونے میں بیٹھا کچھ سی رہا تھا۔ مغربی پنجاب کے چار سپاہی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے وردیاں اتار رہے تھے۔ اس بارک میں یہی چھ سپاہی تھے۔

”تم چاند ماری کے بعد کہاں غائب ہو گئے؟“ نعیم نے عبداللہ سے پوچھا۔

”میں آوارہ گردی نہیں کرتا۔ سیدھا گھر آتا ہوں۔“

”گھر۔!“ نعیم نے تمسخر سے دھرایا۔ بندھے ہوئے بستر کو بوٹ سے دھکیل کر اس نے دیوار کے ساتھ لگایا اور اس پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تھک گیا تھا۔ گھسیٹ کر ٹوپی اتارنے کے بعد اس نے اس کے ساتھ چہرے اور گردن کا پیمنہ پونچھا اور گھما کر اسے فرش پر پھینک دیا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ بادل آسمان پر بہت نیچے جھک آئے تھے۔

”آج تم کسی نہ کسی کو مار دیتے۔“ اس نے بوٹ پٹیاں اتارتے ہوئے کہا۔

باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ دوسرے کونے میں ایک پنجابی سپاہی ساون کا کوئی گیت گانے لگا۔

”اگر پھر ایسا کیا تو گولی سے اڑا دیے جاؤ گے۔“ نعیم نے پھر کہا۔

عبداللہ خاموشی سے سوئی دھاگے پر جھکا رہا۔

”بعض لوگوں کے سر میں میل کا دماغ ہوتا ہے۔“

”تم باؤلے ہو گئے ہو۔“ عبداللہ آنکھیں نکال کر چیخا۔

نعیم ہوشوں میں ہنسا۔ وردی اتار کر اس نے گول بستر بغل کے نیچے رکھا اور لپٹ گیا۔

عبداللہ نے آخری ٹانگا لگا کر دھاگا توڑا اور غور سے اسے دیکھ کر بولا:

”پارسال انہی دنوں میں نے ایک مچھلی پکڑی تھی۔ بڑی خوب صورت۔“

”پھر۔“

”مجھے یاد ہے۔ میں سارا دن بیٹھا دھوپ میں جلتا رہا تھا مگر ایک کچھوے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تھا۔ شام کے وقت بادل آگئے، خوب بارش ہوئی اور ایک مچھلی بھی لگ گئی۔ چھوٹی سی، بس یہ اٹھلی دیکھ لو۔ پر اتنی خوبصورت مچھلی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اس کے جسم پر ہزار رنگ کے دانے تھے اور ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں اسے کٹورے میں ڈال کر گھر لے آیا۔ اور ناند میں پانی بھر کر اسے چھوڑ دیا۔“

بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ چاروں پنجابی سپاہی تنگے بدن باہر کھڑے نہا رہے تھے۔ اسی طرح سب بارکوں کے آگے تنگے، گندمی اور سیاہ جسم بھینگتے، کودتے اور شور مچاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ جو نہیں نہا رہے تھے وہ برآمدوں میں کھڑے تمباکو پی رہے تھے اور گپ مار رہے تھے بادل فیروز پور چھاؤنی پر بہت نیچے جھک آئے تھے اور کمروں میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

”کیا کہہ رہے تھے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”آج بالکل ویسا ایک پتھر میری ٹھوڑی کے آگے پڑا تھا۔ اس پر ہزار رنگ کے دانے تھے اور عین مین اسی شکل کا تھا۔ میں نے اتنے عرصے سے مچھلی نہیں پکڑی۔ میرا دل چاہا اسے پکڑ لوں۔ یقین کرو میرا ارادہ نہیں تھا۔“ وہ رکا ”لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ مچھلی ہے اور بھاگ جائے گی۔ میں نے اس پر فائر کر دیا۔ میرا ارادہ نہیں تھا۔ خدا کی قسم، میرا کوئی خیال نہ تھا۔ پر اس وقت میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بس، پتہ نہیں۔“

باہر بارش کا زور کم پڑ گیا تھا اور بارک میں اجالا بڑھنے لگا۔

”مضحکہ خیز!“ نعیم نے کندھے اچکائے۔ ”اور اس مچھلی کا کیا ہوا۔“

”وہاں کسی نے میل لا کر کر باندھ دیے۔ شاید وہ کھا گئے۔“

نعیم نے ہاتھ چوڑا کر کے عبداللہ کے کندھے پر مارا جس سے اس کا سارا بدن ہل گیا۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں بعض لوگوں کے سر میں میل کا دماغ ہوتا ہے۔“

”دانت مت نکالو۔ تم نے کبھی مچھلیاں نہیں پکڑیں۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ بعض

لوگوں میں میل کا دل بھی ہوتا ہے۔“ اس نے ٹرنک کھول کر پالش کا سلمان نکالا اور بوٹ

چمکانے لگا۔ برآمدے کے باہر مینہ تھم چکا تھا لیکن سپاہی ابھی تک تنگے بدن دوڑتے ہوئے

خوش فعلیوں میں مصروف تھے۔ ان کے جسم محنت کی وجہ سے ہلکے پڑ گئے تھے اور رگیں ابھر

آئی تھیں۔ نعیم آہستہ آہستہ ایک دھن، جو اس نے روشن محل میں سنی تھی، گنگنا نے لگا۔

”لیکن ایک بات تمہیں بتاؤں۔“ عبداللہ ہاتھ روک کر بولا ”میلوں کا دل بالکل آدمیوں

کی طرح ہوتا ہے۔“

”کیسے؟“

”وہ سب کچھ سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ روتے بھی ہیں۔۔۔“
نعیم گنگناتا ہوا ہنسا۔

”تم یقین نہیں کرتے؟ تم نے میل کبھی دیکھے ہیں؟ میں تو میلوں میں پیدا ہوا اور میلوں میں پلا۔“

نعیم کو بے دھیانی سے گنگناتے دیکھ کر وہ زور زور سے برش رگڑنے لگا۔
”گھوڑوں کا مجھے پتہ ہے۔ وہ سب سمجھتے ہیں۔“ اچانک نعیم نے کہا۔

”ہاں۔ گھوڑے بھی سمجھتے ہیں اور میل بھی۔ میں تمہیں بتاتا ہوں، جب میری پہلی بیوی مری تو لاٹھا، جو ہمارے گھر میں ہی پیدا ہوا تھا، دو روز تک بھوکا رہا۔ میری بیوی اسے چارہ ڈالا کرتی تھی۔ میں باہر گیا تو وہ بھی پیچھے پیچھے آگیا۔ آم کے پیڑ کے نیچے میں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ تو وہ میری گردن چاٹنے لگا۔ پھر قریب ہی بیٹھ گیا اور میرے کندھے پر سر رکھ کر سانس لینے لگا۔ بڑی دیر بعد میں نے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک آم توڑ کر دیا تو نہیں کھایا، بس سر ہلا دیا۔ پھر آدھا میں کھایا تو اس نے بھی چکھ لیا۔“
کھانے کی پہلی گھنٹی ہو چکی تھی اور نہانے والے اندر آکر کپڑے پہن رہے تھے۔
”گھوڑوں کے متعلق مجھے پتہ ہے۔“ نعیم نے کہا۔

”ہاں۔ گھوڑے بھی اور میل بھی۔“

نعیم نے اٹھ کر تام چینی کا جگ اور تھالی ٹرنک میں سے نکالی اور ٹوپنی کے ساتھ انہیں صاف کیا۔ ”چلو لنگر سجنو۔“ ایک پنجابی سپاہی نے تھالی اور گج بجاتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔

”چلو۔“

باہر آکر عبداللہ نے اونچے ہوتے ہوئے بادلوں اور دھلی دھلائی ہوئی فضا کو دیکھا۔
”آج تو آم کھانے کا دن ہے۔ پتہ نہیں یہ ہمیں آم کیوں نہیں دیتے۔“ اس نے کہا۔
ہر طرف سے جوان برتن ہاتھوں میں لیے ایک ہی سمت میں جا رہے تھے۔ کھانے کے ایک گھنٹہ بعد وہ پھر پریڈ کے لیے تیار ہو رہے تھے۔
”یہ بکلس لگانا بھائی۔“ عبداللہ نے دونوں ہاتھوں سے تھیلے کو پیٹھ پر تھامتے ہوئے کہا: ”میں سارجنٹ کو بتاؤں گا۔“

”کیا؟“

”تم اپنی گٹ بھی نہیں باندھ سکتے۔“

عبداللہ نے کالی دی: ”میں اس کا سر توڑ دوں گا۔ سو۔“

پھر جب وہ گٹ باندھ چکا تو اس نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا: ”جنگ کب شروع

ہوگی ، نعیم ؟“

”تمہیں مرنے کی جلدی ہے ؟“

”میں اس پریڈ سے عاجز آ گیا ہوں ۔ بہن چود وہاں پر آم تو ہونگے ۔ آموں کے درخت ہی ہوں گے ۔ شاید مچھلیاں بھی ہوں ۔“

”وہاں موت بھی ہوتی ہے ۔“

”ٹھیک ہے ، لوگ مریں گے تو سہی ۔ یہاں تو بہن چود بندوق ہے اور گولیاں ہیں اور ۔ قیدیوں کی طرح بند پڑے ہیں ۔ ایک نہ ایک دن میں کسی کو گولی مار دوں گا۔“

”کیا کہا ؟“ نعیم نے یکلخت پوچھا ۔ عبد اللہ نے سرا سیمگی سے اسے دیکھا اور ہنسنے لگا ۔

باہر آکر اس نے نعیم کو کہنی پر چھوڑا ۔ ”تم یقین نہ کرو چاہے ، پر میں بندوق ہاتھ میں لیتا ہوں تو مجھے تاؤ آ جاتا ہے ۔ میرا دل کرتا ہے کسی کا خون کروں ۔ تبھی آج سویرے میں نے فیر کیا تھا ۔ پر پتھروں میں خون کہاں سے آیا ۔“

”فکر نہ کرو ۔ جلد ہی موقع ملے گا ۔“ نعیم نے کہا ۔

عبد اللہ کھیانی ، کھوکھلی آواز سے ہنسا ۔

چار اگست ۱۹۱۴ء کو جنگ کا اعلان کیا گیا ۔ پانچ دن کے بعد بریگیڈ کو کوچ کا حکم ملا ۔ تمام صفوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ انہوں نے رگڑ رگڑ کر بوٹ پالش کیے ، رائفل کی نالی اور دستہ چمکایا ، وردی کے بٹنوں پر سوڈا گھسا ، اور بالوں میں تیل اور آنکھوں میں سرمہ لگایا ۔ جو تعلیم یافتہ تھے انہوں نے لمبے لمبے خط اپنے گھروں کو لکھے اور دوسروں کو لکھ کر دیے ۔ اتنے دنوں کی خشک بھاری ڈیوٹی کے بعد جب اصل جنگ کا لفظ چاروں طرف پھیلا تو اداس اور اکتائے ہوئے ذہن ، اور تھکن سے چور اعضاء خون کی تیزی سے سنسنانے لگے ۔

بارک نمبر ۶ میں وہ تیار ہو رہے تھے ۔

”تم گھر خط نہیں لکھو گے ؟“ نعیم نے پوچھا

”نہیں ۔“ عبد اللہ کے ہاتھ مشین کی طرح رائفل کے ہڑکے پر چل رہے تھے ۔ وہ اسے تیل دے کر رواں کر رہا تھا ۔ پنجابی سپاہی اپنا اپنا سامان باندھ رہے تھے ۔ بارک میں صرف رائفل کے ہڑکے کی ٹھک ٹھک اور ٹرنکوں کے کھسیٹنے کی آوازیں تھیں اور لائٹین کی روشنی میں انسانی جسموں کے چھوٹے بڑے سائے دیوار پر ناچ رہے تھے ۔ باہر شام کی تاریکی تیزی سے پھیل رہی تھی ۔ ایک بھاری ، دھماکے سے پھٹنے والی خاموشی کمرے کی فضا پر طاری تھی ۔ ان پھیپوں میں سے ہر ایک یہ محسوس کر رہا تھا کہ ابھی وہ سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگیں گے ، یا اچانک ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں گے ، یا پھر ۔ پتہ نہیں ، لیکن کچھ ہو گا ضرور جس کے لیے وہ خاموشی اور پھرتی سے تیار ہو رہے تھے ۔ ان کی طبیعت ہلکی پھلکی تھی اور ہر ایک یہ سوچ رہا

تھا کہ اس کو کوئی بات کرنی چاہیے۔ لیکن اتنے دنوں کی اداس، غبار کی سی یکساں زندگی کے خاتمے، اور جنگ کی سنسنی سے عارضی طور پر ان کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں اور دماغوں میں خون بھر گیا تھا۔

”میں خط نہیں لکھوں گا۔“ رائفل پر ہاتھ روک کر عبداللہ خوش دلی سے بولا۔
”کیوں؟“

”اگر میں مارا گیا تو خط کا کیا فائدہ؟ تین سو خط بھی میری بیوی کے پاس ہوئے تو بھی وہ دوسری شادی کر لے گی۔ خط کسی کو کچھ نہیں کہتے۔“
”اگر پنجاب میں کوئی ایسا کرے تو ہمارے بھائی اسے قتل کر دیتے ہیں۔“ ایک پنجابی سپاہی نے کہا۔

”پنجاب میں جنگلی رہتے ہیں۔“ بات کرنے والا پنجابی سپاہی بستر پر جھک کر ہنسا۔
”تو میں کیا کہہ رہا تھا، نعیم؟“
”کیا بے سرائی ہے۔“ نائیم۔
”دوسرا پنجابی منہ میں بڑبڑایا۔“
”تم خطوں کی بات کر رہے تھے۔“

”ہاں۔ خط جب ایک دفعہ پڑھا گیا تو پھر سمجھو وہ ناکارہ ہو گیا۔ پھر وہ گزرے ہوئے زمانے کی بات بن گیا۔ پھر وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ جیسے آدمی مر جائے۔ پتہ ہے مردہ آدمی اور خط میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ دونوں گزرے ہوئے وقت کی چیزیں ہیں۔ پرانے خط پڑھنا اور مردے پر رونا وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔“

نعیم ہونٹ بھینچ کر سیٹی بجا رہا تھا۔ گاؤں کی زندگی کے، جس نے اس کی روح اور جسم دونوں کا ستیاناس کر دیا تھا، خاتمے پر اس نے ایک بوجھ سینے پر سے اٹھتا ہوا محسوس کیا۔ چھاؤنی کی پابند زندگی، جہاں گاؤں گاؤں سے آئے ہوئے کسانوں نے پہلی بار زندگی میں شدید اکتاہٹ اور غنودگی دیکھی تھی، نعیم کے لیے خوش مزاجی اور لاپرواہی لے کر آئی تھی۔ گو اس کا دماغ ابھی تک سلب تھا اور اس نے کبھی سوچنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی، مگر اب وہ ایک معمولی، صحت مند آدمی کی طرح وقت گزار رہا تھا۔

آدھی رات کے قریب وہ فیروز پور چھاؤنی سے گاڑی میں سوار ہوئے۔ مال گاڑی کے خالی ڈبوں میں بھوسہ، گھاس اور باجرے کے ناڑ بچھا کر انہیں سفر کے قابل بنایا گیا تھا۔ سپاہی اپنے اپنے بستر دیواروں کے ساتھ رکھ کر ان کے اوپر بیٹھ گئے۔ ان کی نیند اڑ چکی تھی اور آنکھیں ان کے سگرٹوں کی طرح نیم تاریکی میں تیزی سے چمک رہی تھی۔ صرف ایک سپاہی، جس کے پیٹ میں درد تھا، بستر پر سر رکھے گھاس پر لیٹا تھا اور گلے میں ’غرغر‘ کر رہا تھا۔ کونے میں

ایک ادھیڑ عمر پنجابی سپاہی پرانے وقتوں کی کوئی کہانی سنا رہا تھا اور اس کے ارد گرد آٹھ دس نوجوان ، دہکتے ہوئے مشتاق چہرے محو سماعت تھے ۔ چھت کے ساتھ لٹکتی ہوئی دھندلی سی ہری کین ڈول رہی تھی ۔ دیواروں پر آدمیوں کے سائے مستقل پھیل اور سکڑ رہے تھے ۔

کاڑی سٹیشن پر رکتی تو ڈبے میں جس ہو جاتا اور لوگ دونوں طرف کے دروازوں پر جمع ہو جاتے ۔

”کون سا سٹیشن ہے ؟“

”دھرم پاسا ۔“

”یہیں ؟ کون سا ؟ زور سے بول ۔“

”کہاں جا رہے ہو ؟“ سٹیشن پر سے کوئی پوچھتا ۔

”لڑائی پر ۔“

”اللہ کرم کرے ۔“

”اللہ کرم کرے ۔“

”کہاں جاتے ہو سائیں ؟“ آگے سے ایک اور آواز آئی ۔

”لڑائی پر ۔“ اگلے ڈبے والے جواب دیتے ۔

”کہاں ؟“

”لڑائی پر ۔“

”پر کہاں ۔ کس جگہ ؟“

”تیری ماں کے پاس ۔“ ڈبہ قہقہوں سے بھر جاتا ۔ ”کوئی پیغام ؟“ مزید قہقہے ۔

عبداللہ نے گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بوٹ سے نعیم کا گھٹنا ہلایا ۔

”ہمیں گھوڑے ملیں گے ؟“

”پتہ نہیں ۔“ نعیم نے کہا ۔

”میں نے اگلے ڈبوں میں کچھ گھوڑے دیکھے ہیں ۔“

”وہ افسروں کے لیے ہیں ۔“

”اگر وہ کہتے تو میں اپنا گھوڑا ساتھ لے آتا ۔“

”اپنی بیوی کو لکھو لے آئے ۔“

عبداللہ خاموش بیٹھا گھاس میں اٹھکیاں دوڑاتا رہا ۔ مریض سپاہی کا درد بڑھ گیا ۔ اُس

نے بہت سی گھاس اٹھا کر منہ میں ڈالی اور گرر گرر چبانے لگا ۔

”اگلے سٹیشن پر تمہیں اتار دیں گے ۔ صبر کرو ۔“ تیمار دار سپاہی نے سگریٹ ختم

کرتے ہوئے کہا ۔

”دیکھو۔“ عبداللہ نے گیہوں کی ایک پکی ہوئی بالی گھاس میں سے کھینچ کر نکالی اور چلایا ،
 ”دیکھو۔ یہ یہاں سے نکلی ہے۔ حرامیوں نے پکی ہوئی فصل اٹھا کر ڈال دی ہے۔“
 نعیم نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر بالی اس سے لے لی ، ہتھیلی پر مسل کر دانے نکالے اور
 پھونک مار کر چھلکا اڑا دیا۔ ”ایک آدھ بالی تو بھوسے میں بھی چلی جاتی ہے۔“
 ”ایک آدھ بالی۔“ عبداللہ نے تیزی سے کہا ، ”تمہاری فصل کا کیا بنا ؟ اور میری کا ؟ وہ
 ابھی کھیت میں تھی۔ ہم چلے آئے۔“
 ”ہنہ۔ چلے آئے۔“ تاش کھیلتا ہوا ایک پنجابی طنز سے ہنسا۔ ”تم اپنے پیروں پر آئے
 تھے ؟ ہیں ؟“

”وہ سوروں نے کھائی ہوگی یا گاڑیوں میں بچھی ہوگی۔“ عبداللہ نے اندھیرے میں دیکھتے
 ہوئے بات ختم کی۔

”کل ہمیں بھی سڑ ہی کھائیں گے۔ لو کھاؤ۔“ نعیم نے چند دانے منہ میں ڈال کر باقی
 اس کی طرف بڑھائے جو اس نے ، ذرا تامل کے بعد لے کر پھانک لیے۔ اناج کیسیلا اور بے رس
 تھا لیکن ان کے گرم گرم لعاب کے ساتھ مل کر اس کا میٹھا ، سفید گودا گاڑھے خوشبودار دودھ
 میں تبدیل ہو گیا اور انہوں نے گیہوں کی مخصوص ، طاقتور حرارت زبان پر ، دانتوں میں اور حلق
 کے اندر اترتی ہوئی محسوس کی۔ دیر تک وہ خاموشی سے گیہوں کے دانے چباتے اور باہر تیزی
 سے بھاگتے ہوئے سیاہ درختوں کو دیکھتے رہے۔ اُن کے جیڑے ایک ساتھ ، ایک تال پر ، پریڈ
 کرتے ہوئے سپاہیوں کی طرح چل رہے تھے۔

”یہ سارا خون ہے۔“ عبداللہ نے منہ میں زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ نعیم نے اتفاق کیا۔ عبداللہ نے ہوا میں گالی دی۔

تاش کھیلتے ہوئے چاروں سپاہی کسی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسے۔ اُن کے ساتھ ہی پیٹ
 کے درد والے نے ایک چیخ ماری اور مٹھیاں پیٹ میں ٹھونس کر دانت گھاس میں گاڑ دیے۔
 سب لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

”صبر کرو۔ سٹیشن آنے والا ہے۔“ کہانی سنانے والے دیو ہیکل سپاہی نے کہا۔

”پانی پلاؤ۔“ ایک اور نے کہا اور چھاگل بڑھائی۔ مریض نے منہ موڑ کر ایک اور چیخ

ماری۔

”گاڑی روکو۔ منہ کیا دیکھ رہے ہو ، گدھو۔ زنجیر کھینچو۔“

”ہاں زنجیر کھینچو۔ زنجیر کہاں ہے ؟“

زنجیر کی تلاش شروع ہوئی۔ داستان گو نے لائین اتار کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع

کیا - آدھے سپاہی اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے -

زنجیر نہیں ہے؟“ آخر اس نے اعلان کیا -

”میں؟ زنجیر نہیں ہے؟“

”یہ جانوروں کا ڈبہ ہے، آدمیوں کا نہیں - دیکھتے نہیں ہو -“ ایک نو عمر لڑکے نے

گھاس پر ٹھوکر ماری - ”جانوروں کو زنجیر کی ضرورت نہیں پڑتی -“

مریض اب سیدھا لیٹ گیا تھا اور ہولے ہولے کراہ رہا تھا - گاڑی رکی تو سپاہی دونوں

دروازوں پر جا کھڑے ہوئے -

”کون سا سٹیشن ہے؟“ انہوں نے مخصوص سوال دہرایا -

”اور تم جانوروں کی طرح دروازے میں کیوں کھڑے ہو؟ ہوا آنے دو -“ عبداللہ بستر پر

بٹھے بٹھے چیخا - دو ایک سپاہیوں نے پلٹ کر دیکھا اور سنی ان سنی کر دی - وہ جھلا کر اٹھا اور

پوری قوت سے کہنی ایک کی پسلیوں میں ماری - ”ہٹو - مجھے باہر جانے دو -“

نیچے زمین کیلی تھی اور مٹی میں سے تازہ ہل جتنے ہوئے کھیت کی خوشبو آ رہی تھی -

بارش ابھی ابھی ہو کر گھمی تھی - یہ ایک چھوٹا سا دیہاتی سٹیشن تھا جس کے دونوں سروں پر

لاٹینیں ویرانی سے جل رہی تھیں - دوسری طرف سے آنے والی گاڑی کی روشنی نظر آ رہی تھی -

سپاہی کود کود کر باہر نکل رہے تھے اور سٹیشن پر پھر رہے تھے - جنہوں نے باہر آنا مناسب نہ

سمجھا وہ ٹانگیں لٹکائے دروازے میں بیٹھے تھے -

”مارو مارو مارو -“ اچانک ایک ڈبے میں شور اٹھا اور بھاگ دوڑ شروع ہوئی - کچھ دیر

بعد ایک سپاہی مینٹ کی نوک پر چھوٹا سا سانپ چڑھائے باہر نکلا - راشلوں کی نالیوں سے اُس کو

الٹ پلٹ کر دیکھا گیا - مینٹوں سے کچوکے لٹائے گئے اور متفقہ رائے کا اظہار کیا گیا: ”بڑا زہریلا

ہے -“ پھر اُس کا قاتل اُسے مینٹ میں اٹھا کر آگے بڑھ گیا - چار ڈبے آگے جا کر وہ رُکا اور

اُسے دروازے میں کھڑے سپاہیوں کی طرف بٹھادیا -

”لو، بھوپالیو - ایک تحفہ لایا ہوں -“

”کیا ہے؟“ دروازے میں سے کسی نے پوچھا - وہاں پر اندھیرا تھا -

”بلوچیوں نے بھیجا ہے -“

ایک جا کر اندر سے لائین اٹھا لیا - دروازے میں کھڑا ہوا سپاہی اپنے چہرے کے استا

قریب سانپ کی شکل دیکھ کر چونک کر پیچھے ہٹا - اوپر اور نیچے قہقہے بکھر گئے -

”سور -“ اُس نے بوٹ کی ٹھوکر سے سانپ کو دور اچھال دیا -

”ہم بھی جلد ہی تمہیں ایک تحفہ بھیجیں گے -“

”یہ کون سی رجمنٹ ہے -“ عبداللہ نے چلتے چلتے پوچھا -

”نمبر ۹ بھوپالی -“

آگے ایم - جی - ڈی ٹیچمنٹ کے ڈبے تھے - مشین گنوں کی خول چڑھی نالیاں دروازوں سے باہر نکلی تھیں اور سپاہی اُن پر ٹانگیں رکھے سو رہے تھے - آگے زخمیوں کو اٹھانے والی کمپنی تھی - وہ سڑپھروں کے انبار کے سہارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے - اُس سے آگے گھوڑوں کے دو ڈبے تھے جو منہ بہر نکالے گھاس کھا رہے تھے -

”جانوروں کو زنجیر کی ضرورت نہیں پڑتی -“ عبد اللہ نے ہنس کر زیر لب دہرایا - مخالف سمت سے آنے والی گاڑی سیٹی بجاتی ہوئی زن سے گزر گئی - اُس کے زیادہ تر کمروں میں تیز روشنی تھی اور پنکھے چل رہے تھے - مسافر اخبار پڑھ رہے تھے ، سو رہے تھے اور باہر دیکھ رہے تھے - ایک ادھ تلکی سفید فام عورت چمڑے کے بکسوں کے سہارے بیٹھی قہوہ پی رہی تھی - برف چوستا ہوا ایک موٹا آدمی حیرت سے فوجیوں کی گاڑی کو دیکھ رہا تھا - پچھلی رات کی نشہ آور نم دار ہوا عبد اللہ کے چہرے سے ٹکرائی اور وہ پلٹ آیا -

”تم نے گاڑی دیکھی؟“ ڈبے پر لٹک کر چڑھتے ہوئے اُس نے نعیم سے پوچھا -

”ہاں -“

”اُس میں ایک عورت تھی -“

”اچھا -؟“ نعیم نے مسکرا کر کہا -

وہ اپنا بستر کھولنے لگے - کہانی سنانے والا پنجابی کان پر ہاتھ رکھ کر ہیر گا رہا تھا - باقی سپاہی سونے کی تیاری کر رہے تھے - چار بجے کے قریب زیادہ تر لوگ سو چکے تھے - جو نہیں سوئے تھے وہ نیند سے بھرائی ہوئی آواز میں باتیں کر رہے تھے اور اپنا اپنا آخری سگریٹ پی رہے تھے -

کراچی سے وہ ایچ - ایم - ایس - ویوٹھ میں سوار ہوئے - جہاز کی اوپری منزل میں کمپنی کو جگہ ملی - اُن کے ساتھ والے کمروں میں مشین گن ڈی ٹیچمنٹ تھی - نیچے کی منزل میں نمبر ۹ بھوپال کا آدھا بریگیڈ تھا - پہلا پڑاؤ عدن پر آیا جہاں چوبیس گھنٹے تک رکنا پڑا - وہاں ہندوستان کی دوسری بندرگاہوں سے فوجی آ آ کر جمع ہونا شروع ہوئے ، اور جب وہاں سے روانہ ہوئے تو وہ پینتالیس جہازوں کا ایک وسیع قافلہ تھے - بحیرہ قلمزم میں داخل ہو کر تین جنگی حفاظتی جہاز اُن کے ساتھ ہو لیے - نعیم اور اُس کی کمپنی کے زیادہ تر جوانوں کو سمندری بیماری ہو گئی تھی اور وہ دن بھر لیموں کا عرق پیتے رہتے تھے -

چند روز کے سفر کے بعد سمندر پُر سکون ہو گیا اور کسان سپاہی اپنے پہلے سمندری سفر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے لگے - آسمان کے رنگ کے ساتھ پانی کا رنگ بدلتے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح حیرت زدہ ہو جاتے حد نظر تک پانی ، جہازوں کا وسیع و عریض قافلہ ، اُن کی سیٹیاں

اور بھونپو ، سمندر کا شور اور اُچھلتی کودتی ہوئی رنگ برنگ مچھلیوں کا نظارہ سادہ لوح دھقانوں کے لیے ، جن میں سے کئی تو پہلی بار اپنے کاؤں سے باہر نکلے تھے ، عجیب کشش رکھتا تھا ۔
پورٹ سعید پر وہ جہاز چھوڑ کر گاڑی پر سوار ہوئے اور قاہرہ پہنچے ۔ راستے کا علاقہ اور قاہرہ کے بازار اور گلیاں دلی اور اُس کے علاقے سے مشابہ تھیں ۔ صرف لوگوں کا لباس مختلف تھا ۔
قاہرہ میں چند لوگ یورپی لباس میں دکھائی دیے ۔ شہر سے باہر ہیلی پولس ریس کورس میں ان کا کیمپ لگا ۔

کمپنی آدھ گھنٹے سے ”فال ان“ تھی ۔ مصری آسمان پر سورج تیزی سے چمک رہا تھا اور زمین یوں خشک اور سخت تھی جیسے برسوں سے پانی کی شکل نہ دیکھی ہو ۔ ریس کورس بہت بڑے دائرے کی شکل میں تھا جس کے تین چوتھائی رقبے پر کیمپ پھیلا ہوا تھا ۔ جنوب میں بھورے رنگ کی خشک ، پتھریلی پہاڑیاں تھیں جن کے پتھر سورج کی مسلسل تپش اور تیزی سے سیاہی مائل ہو چکے تھے اور اُن پر اُسی رنگ کی پہاڑی بکریاں جانے کیا چرا کرتی تھیں ۔ شمال اور مغرب میں قاہرہ پھیلا ہوا تھا جس کی چوڑی خوش نما سڑکوں پر دیہاتی عربی لباس پہنے بدو گدھا گاڑیوں اور اونٹ گاڑیوں پر سبزیاں اور دودھ بیچتے پھرتے تھے ۔ مشرق میں ریگستان تھا اور جا بجا چمکتی ہوئی ریت کے ٹیلے تھے جن کے پیچھے سے ہر صبح گرم چمکتا ہوا سورج قاہرہ پر ، اور ریس کورس کے کیمپ پر اور تھکے ہوئے ، گرد میں اٹے ہوئے ، اکتائے ہوئے فوجی چہروں پر طلوع ہوا کرتا ۔

دور سے کیپٹن میکلین کے گھوڑے کو آتے دیکھ کر حوالدار ، جو ایک طرف کھڑا جمعدار سے باتیں کر رہا تھا ، وہیں سے چلایا : ”اٹنشن ۔“

انہوں نے رائفلیں کندھوں پر رکھیں اور تن کر کھڑے ہو گئے ۔ کیپٹن میکلین کا سیاہ خوبصورت گھوڑا اُن گھوڑوں میں سے تھا جو مصر اور سوڈان سے حاصل کیے گئے تھے ۔ اُس نے کمپنی کے دو چکر لگائے ۔ حوالدار نے کڑک کر دو ”کاشن“ دیے ۔

”بالکل ایسا میرا گھوڑا پچھلے سال پھول کر مر گیا ۔“ عبداللہ کے ساتھ کھڑے سپاہی نے اُسے اطلاع دی ۔

”چپ رہو ۔“

”جوانو ۔“ گھوڑے کو قابو میں کر کے کیپٹن بولا ، ”ہمیں چند حالت کی بنا پر کچھ دن اور یہاں رکننا پڑ گیا ہے ۔ مگر اُمید ہے کہ جلد ہی ہم میدان جنگ میں پہنچیں گے ۔“ اُس نے رک کر بائیں ہاتھ کا سفید سواری کا دستانہ اتارا ۔ ”اپنے آپ کو چست اور تازہ رکھو ۔ حکومت تمہارے گھروں اور گھر والوں کی سلامتی کی ذمہ دار ہے اور وہ راضی خوشی ہیں ۔“

گھوڑا پچھلے پاؤں پر دو بار ذرا اٹھا، پھر سبچ پا ہو گیا۔ سوار نے باگیں داتوں میں پکڑ کر دستاں سیننے کی کوشش کی مگر وہ نیچے گر پڑا۔ گھوڑا تیزی سے ناپنے لگا۔ ریت اڑا کر کیپٹن کے ترچہ پر جمنے لگی۔
”حوالدار۔“ وہ گرجا۔

حوالدار نے مستعدی سے دستاں اٹھا کر پکڑا۔
”کیپٹی۔ روٹ مارچ۔“ کیپٹن کے کرخت ’کاشن‘ کے ساتھ اُس کا ہنٹر گھوڑے کی پیٹھ پر پڑا۔ وہ گھوڑے کی تندرست، چمکدار پشت پر رانیں جا کر ذرا سا اٹھا اور اپنے پیچھے ریت کے چھوٹے چھوٹے بلورس ذروں کا غبار چھوڑتا ہوا غائب ہو گیا۔
”یہ جانور میرے نیچے ہو تو ایک دن میں ٹھیک کر دوں۔“ عبداللہ کے ساتھ والا سپاہی پھر بولا۔ عبداللہ نعیم سے کہہ رہا تھا:

”یہاں تو بھینچوڈ علی پور سے بھی زیادہ گرمی ہوتی ہے۔“
روٹ مارچ کرتے ہوئے وہ ریس کورس سے باہر نکل آئے۔ دور پہاڑیوں کے دامن میں کسان ہل چلا رہے تھے۔ بیچ میں ریگستان پڑتا تھا اور ریت تپنی شروع ہو چکی تھی۔
حوالدار معلومات دیتا ہوا انہیں پہاڑیوں کی طرف لے گیا۔ یہاں پانی کے آثار تھے اور کچھ سبرہ اُکا ہوا تھا۔ ہل چلاتے ہوئے بدو کسان نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا اور کھجور کے درخت تلے رک کر پسینہ پونچھنے لگا۔ اُس کا رنگ سیاہ اور گہرا لکیر دار چہرا تھا اور اُس کے آہنی ہل کو نخر کھینچ رہا تھا۔ کھجور کے نیچے سے ایک مشک نما چھاکل اٹھا کر اُس نے پانی کا گھونٹ بھرا اور آنکھیں پھاڑ کر پاس سے گزرتے ہوئے فوجیوں کو دیکھنے لگا۔
”یہاں بارش ہوتی ہے؟“ ایک سپاہی نے بھوری، خشک زمین کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

کسان چھاکل ہاتھ میں لٹکائے کھڑا رہا۔
”یا ان کا پیشاب کافی ہوتا ہے؟“ سپاہی نے نخر کی طرف اشارہ کیا۔ اُن کے قمقمے سن کر بدو نے چھاکل درخت کے تنے کے ساتھ رکھی اور سادگی سے ہنسنے لگا۔ اس کے اگلے دانت غائب تھے۔

”باتیں مت کرو۔“ حوالدار کڑکا۔
”سور۔“ کسی نے زیر لب کہا۔

وہ پہاڑیوں کا لمبا چکر لگا کر دوپہر کے وقت خیموں کی طرف لوٹے۔
عبداللہ نے ٹوپی اتار کر چہرہ اور بازو پونچھے اور اسے زمین پر دے مارا۔
”آج چار روز سے نہیں نہائے۔ دیکھو۔“ وہ کپڑے جھاڑنے لگا۔

”گرد مت اڑاؤ۔“ نعیم نے تنگ آکر کہا۔

میری ناک میں ریت بھر گئی ہے۔“ ایک پنجابی سپاہی نے، جس کے چہرے پر پسینے اور ریت کی لکیریں بنی تھیں، کالی دے کر کہا۔

”افسروں کو روز پانی ملتا ہے۔“

”اور ہم جانور ہیں؟“

”تم جانوروں سے زیادہ بدبو دار ہو۔“ ایک پٹھان سپاہی خمیے کے باہر قیض پھیلاتے ہوئے بولا: ”کیا ہی اچھا ہو اگر تم باہر آکر لیٹو۔“

انہوں نے وردیاں اتار کر رسیوں پر پھیلائیں اور سگریٹ سلکا کر لیٹ گئے۔

”پردہ سارا اٹھا دو۔ ہوا اندر آنے دو۔“ کسی نے کہا۔

ایک صبح کو نعیم بریگیڈ میجر کے سامنے پیش ہوا۔ اُس کا چھوٹا سا سبز رنگ کا خیمہ تھا جس میں اُس کی اور اُس کے حوالدار کلرک کی میز تھی۔

”تم تعلیم یافتہ ہو؟“ بریگیڈ میجر نے چشمہ اتارتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے سینئر کیمبرج کیا ہے۔“

”کہاں سے؟“

”کلکتہ سے۔“

”مشین گن کی ٹریننگ حاصل کی ہے؟“

”نہیں۔“

”تمہیں ترقی دے کر لانس نائک کا عہدہ دیا جاتا ہے اور مشین گن ڈی ٹیمپمنٹ میں

تبدیلی کی جاتی ہے۔“

”یس سر۔“ وہ ذرا سا پنجوں پر اٹھا۔

”کل تم سیکشن کمانڈر ایم۔ جی۔ ڈی ٹیمپمنٹ کو رپورٹ کرو گے۔ ڈس مس۔“

قاہرہ سے گاڑی میں بیٹھ کر وہ اسکندریہ پہنچے۔ وہاں بھی روٹ مارچنگ کا سلسلہ جاری

رہا۔ اسکندریہ سے پھر ایچ۔ ایم۔ ایس۔ ویوٹھ میں سوار ہوئے اور بیس جہازوں کا قافلہ بحیرہ

روم میں داخل ہوا۔ متلاطم سمندر کے باوجود بہت کم سپاہی بیمار پڑے۔ سمندری سفر میں

نسبتاً بہتر خوراک اور نہانے کے لیے پانی عام ملتا تھا۔ نمبر ۹ بھوپالی پیچھے رہ گئے تھے اور ان کی

جگہ ایک انگریز بٹالین ان کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ جب مارسیلز کی بندرگاہ نظر آئی تو انگریز

فوجی جہاز کے عرشے پر چڑھ کر ناچنے لگے اور بیٹنڈ نے ”مارسیلز“ بجانا شروع کر دیا۔

موسم چمکدار اور خوش گوار تھا۔ بہت سے بھونپوؤں اور سیٹیوں کے بعد جہاز نے لنگر

پھینکا۔ سازندوں نے دھن تیز کر دی اور انگریز سپاہی ”مارسیلز“ کاتے ہوئے بندرگاہ پر اترنے

لگے۔ سفید براق وردیوں میں فرانسیسی ملحق تباکو پیتے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ فرانسیسی عورتیں شوخ رنگ سکرٹ اور چھوٹے چھوٹے سفید ہیٹ پہنے کھڑی تھیں۔ انہوں نے کالوں پر چوم چوم کر فوجیوں کا خیر مقدم کیا۔ پھر ہندوستانی فوج کے افسر اترے۔ کیپٹن میکین۔ کیپٹن اشہر۔ لیفٹیننٹ براؤٹنگ۔ سب کے چہرے مسرت کی سنسناہٹ سے سرخ ہو رہے تھے اور وہ چلا چلا کر پوچھ رہے تھے:

”ہمیں دیر تو نہیں ہو گئی۔ کیا ہم دیر میں پہنچے؟“

فرانسیسی ملحق مسرور آوازوں میں چلا چلا کر جواب دیتے اور عورتیں سر پیچھے پینٹ کر خوشی سے تالیاں بجاتیں۔ فرانس کے آسمانوں پر سے زرد خوش نما دھوپ سفید فام افسروں کے اونچے ماتھوں اور سنہری بالوں پر پڑ رہی تھی اور ان کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں اور نیلی دلکش آنکھوں سے صحت اور زندگی مترشح تھی۔ ان کے بے خوف قدم اور مستعد فوجی جسم دیکھنے والوں کو مرعوب کرتے تھے۔ ان کے دماغ فوجی سکیموں اور اپنے گھر والوں کی یاد سے پُر تھے۔ وہ فہین، صحت مند اور پیارے انسان تھے۔ ایسے نوجوان جن کا بہت سے محبت کرنے والے دل انتظار کرتے ہیں، اور جن کے گھروں کے دروازے ان کے لیے تمام عمر کھلے رہتے ہیں، جن کی تصویریں آتش دانوں پر سدا مسکراتی ہیں اور جن کی دی ہوئی انگوٹھیاں لڑکیوں کی انکلیوں پر ہمیشہ جگمگاتی ہیں۔ سورج نے اپنی خوب صورت ترسین شاعریں ان پر پھینکیں اور مسکرایا۔ ”تمہاری یادیں سدا جوان رہیں گی۔“

چھ ماہ کے اندر اندر یہ سب میدان جنگ میں کام آچکے تھے۔ ہندوستانی فوجیوں کو گزرتا دیکھ کر فرانسیسیوں نے ہیٹ اُتارے اور زور زور سے اُنہیں ہلانے لگے۔

”لاء انڈینز (Les Indians)۔“ اُنہوں نے ایک دوسرے کو بتلایا۔

بورلے ریس کورس میں کیمپ لگا۔ تیسرے مشین گن سیکشن میں دو مشین گنیں، بارہ فخر، سولہ سپاہی، لانس نائک نعیم، حوالدار ٹھاکر داس اور سیکشن کمانڈر میک گرگر تھا۔ مارسیلز کا ریس کورس وسیع اور خوب صورت تھا۔ اس جگہ کی مٹی سیاہ اور زرخیز تھی اور یہاں پانی کی فراوانی تھی۔

”یہاں کا پانی میٹھا ہے۔“ حوالدار ٹھاکر داس نے سر پیچھے پھینک کر چھائل سے پانی پیا۔ ”اور کھانا طاقت ور ہے۔“

”لوگوں کا لباس بھی خوش نما ہے۔“ نعیم نے چھائل اس سے پکڑ کر منہ سے لکائی۔ ”خاص طور پر عورتوں کا۔“ ٹھاکر داس بوٹ پٹیوں سمیت لمبا لیٹ گیا۔ وہ دس میل کے روٹ مارچ سے تھک کر لوٹے تھے۔ فرانسیسی طرز تعمیر، باغات کی فراوانی اور غیر ملکی پھول

اور پودوں کو دیکھ کر وہ بچوں کی طرح مسرور تھے۔ اتنے دنوں تک اکتا دینے والے، ایک رنگ ریگستان اور پتھریلی پہاڑیوں کے نظارے کے بعد فرانس کی کھلی سڑکوں پر خوب صورت خوش رنگ عورتیں اور بڑے بڑے ہیٹ پہنے نچر سوار مرد، جو اُن کو گزرتا دیکھ کر ہیٹ اٹھا کر سلام کرتے تھے، انہیں بہت بھلے معلوم ہوئے۔

”کل ہمیں نیا بارود ملے گا۔“ ٹھاکر داس نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔
”کتنا؟“

”کتنا ویتنا نہیں۔ نیا۔ فرانسیسی طرز کا۔ مارک نمبر، گولی۔“
”اور مارک نمبر ۶۔“

”یہ سب کنڈم۔ مارک نمبر، سیدھی جاتی ہے۔“
”کیسی ہوتی ہے۔“

ٹھاکر داس نے لیٹے لیٹے پیٹی میں سے گولی نکالی۔ ”دیکھو۔ مارک نمبر ۶ تو نوکدار ہے۔ وہ آگے سے چپٹی ہوگی۔ اور یہ تو یوں جاتی۔“ اُس نے اٹھکی سے ہوا میں کمان بنائی۔ ”اور وہ یوں تیر کی طرح سیدھی جائے گی۔ شوپ۔“
”کیا فرق پڑے گا؟“

”فرق! ہا ہا ہا۔ کہتے ہو کہ کلکتے میں پڑھتے رہے۔ ارے میاں ٹیٹھی جائے گی تو مار نزدیک کرے گی۔ سیدھی جائے گی تو مار دور کرے گی۔ سارا حساب کا سوال ہے۔ سمجھے؟۔ اور سینٹ بھی ولایتی طرز کی ملے گی۔ لمبی والی۔ اب پوچھو کیا فائدہ؟“
”چھوٹی ہوگی تو مار نزدیک کرے گی۔ لمبی ہوگی تو مار دور۔“

اُس کی آواز ٹھاکر داس کے مہیب تمبھے میں کم ہو گئی۔ اُس نے ایک زور کے دھپ سے نعیم کا سارا بدن ہلا دیا۔

”شباباش بچے۔ شاباش۔“

”تمہیں یہ کس نے بتایا۔“ نعیم نے پوچھا۔

”سیکشن کمانڈر کے پاس میں نے دیکھیں۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔“

سر زمین فرانس پر وہ دن بڑا خوب صورت طلوع ہوا تھا۔ صبح صبح بارش ہوئی تھی جب وہ روٹ مارچ کرتے ہوئے بھیگے تھے۔ اُس کے بعد سورج نکل آیا تھا۔ اب بھاری نم دار ہوا کی مٹھلیں خوش رنگ پھولوں پر سے گزرتی، بڑی جان دار حدت لیے ہوئے یکے بعد دیگرے آ اگر تھکے ماندے فوجی چہروں کو تھپکیاں دے رہی تھیں۔ آسمان گہرے نیلے رنگ کا تھا۔ دور سڑکوں پر عورتیں اور بچے شوخ رنگ کپڑے پہنے، پھول دار چھاتے اور ہیٹ لے کر نکل آئے

تھے۔ ان کی چال بڑی مسرور اور جوان تھی اور وہ تازہ دم رسالے کی طرح مختلف راستوں پر بڑھ رہے تھے۔

”جنگ کہاں پر ہو رہی ہے؟“ نعیم نے پوچھا۔ وہ دیر سے ایک گیلی ماچس کو جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہم عنقریب جا رہے ہیں۔“

”کہاں؟“

”محاذ پر۔“

”کہاں؟ کس جگہ؟“

”تم کیوں اس کے پیچھے پڑے ہو؟“ ٹھاکر داس نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر یکلخت وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”لانس نائٹ نعیم احمد۔ انٹشن۔“

نعیم تیزی سے اٹھا اور فوجی انداز میں تن گیا۔

”میکسم گن کی پٹی میں کتنے راؤنڈ آتے ہیں؟“

”دو سو پچاس۔“

”وزن۔؟“

”تقریباً۔ چھ پا.....“

”میکسم گن کا وزن۔“ ٹھاکر داس نے کڑک کر پوچھا۔

”ساتھ پاؤنڈ۔“

”شینڈ ایٹ ایز۔“

وہ لمبے لمبے قدم رکھتا خیمے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اُس کی چوڑی پشت سارے دروازے پر پھیلی ہوئی تھی۔ باہر دھوپ ماند پڑنے لگی تھی۔ ”شاید بادل پھر آگئے۔“ نعیم نے کھڑے کھڑے بے دھیانی سے سوچا۔

کچھ دیر کے بعد وہ نعیم کے پاس آکھڑا ہوا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

نعیم کھڑا رہا۔

”لڑائی کے میدان میں عورتوں کی طرح سوال مت کرو۔ جنگ کرنے نکلے ہو تو مرنے کا انتظار کرو، جینے کا انتظار مت کرو۔ کیوں، کہاں، کب، کیسے؟“ سوالات بزدل بنا دیتے ہیں۔“

”غلط ہے۔ میں بزدل نہیں ہوں۔“ ایک نامعلوم سا غصہ اُس کے دماغ میں اُبال کھانے لگا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ ٹھاکر داس نے اُس کا کندھا دبایا اور جیب سے ماچس نکال کر دی۔

دونوں نے سگریٹ جلا لیے۔ بادل پھر آسمان پر اکٹھے ہو رہے تھے اور ہیلی سی مریل دھوپ خیمے کے دروازے میں سے اندر آ رہی تھی۔
 ”تم سوال نہیں پوچھتے؟“ نعیم نے آنکھوں کے کونوں میں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ٹھاکر داس نے دھواں اُس کے منہ پر چھوڑا۔“ نہیں۔“
 ”تم مرنے سے نہیں ڈرتے؟“
 ”نہیں۔“

”اگر میں تمہیں ابھی قتل کر دوں؟“

ٹھاکر داس کے ہونٹ کپکپائے اور وہ زرد پڑ گیا۔ ”تمہارے دل میں کیا ہے، سؤر۔ تم اتنی ہمت کرو گے؟“ اُس نے تیزی سے کہا۔
 نعیم اپنے بستر کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا، وہیں پر کھسک کر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ ٹھاکر داس ابھی تک اپنے آپ پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ وہ تیز تیز کش لگا رہا تھا اور اعصابی اٹھکیوں سے گھٹنا کھجا رہا تھا۔ کچھ دیر تک خیمے میں خاموشی رہی۔ ٹھاکر داس نے دوسرا سگریٹ سلکایا اور تیزی سے ختم کر دیا۔ پھر اُسے باہر اُچھالتے ہوئے وہ بھاری آواز سے بولا:

”قتل دوسری چیز ہے۔“

”وہاں بھی لوگ اسی طرح مرتے ہیں۔“ نعیم نے چھت کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں۔ تم نے جنگ نہیں دیکھی، اس لیے کہتے ہو۔ وہاں ہر طرف موت ہوتی ہے۔ آدمی چوہوں کی طرح مرتے ہیں۔ وہاں مرنا اور مارنا بڑا آسان کام ہے۔ یوں۔ سڑک پر جاتے ہوئے ہم چیونٹیوں کے ایک قافلے پر پاؤں رکھ کر گزر جاتے ہیں اور سینکڑوں چیونٹیاں ہمارے جانے بغیر مر جاتی ہیں۔ لیکن اکلوتی چیونٹی اگر ہمارے بازو پر چل رہی ہو تو اُسے مارتے ہوئے ہم ہچکچاتے ہیں، گھبراتے ہیں اور اُسے اٹھا کر ہم نیچے رکھ دیتے ہیں۔ یا پھونک مار کر اڑا دیتے ہیں۔“

دھوپ اب آدھے فرش تک آگئی تھی اور اس کی روشنی میں ٹھاکر داس غیر معمولی طور پر زرد اور بیتاب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے تیسرا سگریٹ جلایا۔

”وہاں تم بے ضمیر ہو کر مار دیتے ہو۔ بالکل صاف، بے داغ ضمیر کے ساتھ اور مر بھی جاتے ہو۔“

”میدانِ جنگ میں موت کی تکلیف نہیں ہوتی؟“ نعیم نے تسخر کے ساتھ پوچھا۔
 ”نہیں۔ شاید۔ پتہ نہیں۔ پر میں نے لوگوں کو چوہوں کی طرح مرتے ہوئے دیکھا ہے۔“

اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے سکریٹ ختم کیا اور دروازے سے باہر اُچھال دیا۔ اس کا ایک گھٹنا تیزی سے ہل رہا تھا۔ ”میں اپنی موت سے نہیں ڈرتا۔ لیکن میرے دو بچے ہیں۔“

لنگر پر کھانے کا پہلا بھونپو ہوا۔

”عورت کو دوسرا خاوند مل جائے گا، پر بچے۔ میری بیوی کا پہلے خاوند سے بچہ ہے۔ مجھے پتہ ہے میں کبھی اسے اپنے بچے کی طرح نہیں دیکھ سکتا۔“

”اچھا؟“ نعیم نے لیٹے لیٹے تسخر سے کہا۔

ٹھاکر داس نے دل میں کالی دی اور دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ ”یا میں اپنی موت سے خوف زدہ ہوں؟“ اس نے سوچا۔ ”بدبخت۔ اس کے دل میں کیا ہے۔“

دوسرے خیموں میں کھانے کے برتن کھنک رہے تھے اور سپاہیوں کی تیز، کرخت آوازیں آ رہی تھیں۔

تین دن تک رحمنٹ سفر میں رہی۔ گاڑی بالکل ویسی تھی جیسی فیروز پور سے ملی تھی۔ مال گاڑی جس میں گھاس بچھلایا گیا تھا۔ رحمنٹ میں تو انگریز افسر، انیس ہندوستانی افسر اور سات سو نوے سپاہی تھے۔ دلفریب پہاڑی علاقے میں سے وہ تین دن اور تین رات تک گزرتے رہے۔ راستے میں وہ جنرل سیورٹیرز کی فوج کے قریب سے گزرے جو پندرہویں ریجن کی کمان کر رہا تھا۔ سفر کے اختتام پر وہ سر کٹ کیمپ، آرلینز پہنچے۔

سر کٹ کیمپ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ تین اطراف سرسبز، کہنہ سال پائٹن کے درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑ تھے، نیلے برفانی چشمے جن کے نہجوں میچ بہتے تھے۔ روٹ مارچ کرتے ہوئے جوان چشموں پر رکتے، پیاس بجھاتے، تہہ میں چمکتے ہوئے رنگ برنگے پتھر اور سیپیاں چن کر جیوں میں بھرتے، پائٹن کی خوشبو دار چھاؤں میں دم لیتے، پھر بڑی بڑی چٹانوں پر گھوم کر بوٹوں سے کتھر اڑاتے ڈھلانوں پر اتر جاتے۔ پہاڑیوں پر اتنا دکا مکان ملتے جو عموماً انگور کی سیلوں میں چھپے ہوتے اور آس پاس سفید، ریشمیں بھیروں کے روڑ چرا کرتے۔ کہیں کہیں کوئی مختصر سا گاؤں آ جاتا۔ رحمنٹ وہاں سولہ دن تک ہیڈ کوارٹرز کے احکام کے انتظام میں رکھی رہی۔

اُن کے قیام کے پانچویں روز ڈیوک آف کنٹھ کے لڑکے ہرلایل ہائی نس پرنس آر تھر آف کنٹھ نے رحمنٹ کا معاہدہ کیا۔ سفید گھوڑے پر سوار، سفید اور سرخ شاہی وردی میں ملبوس وجیہد شہزادے نے صبح کی ہلکی سرد دھوپ میں انہیں مخاطب کیا:

”مجھے وہ راحت ابھی تک یاد ہے جو چند برس پیشتر رحمنٹ کو ہانگ کانگ میں دیکھ کر

مجھ کو ہوئی تھی۔ اور آج آپ کو یورپ میں برٹش فوج کے پہلو بہ پہلو لڑنے کے لیے تیار دیکھ کر مجھے دگنی خوشی ہوئی ہے۔ میں آپ کی خوش قسمتی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ چند روز تک محاذ پر ہماری ملاقات ہوگی۔ میں اپنے والد، رجمنٹ کے کرنل ان چیف کو لکھوں گا کہ آپ بہترین حالت میں ہیں۔ ”سپاہی دور تک، آنکھوں کے کونوں سے، شاندار سوار کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔“

سترہویں دن وہ آرلینز سے اُسی گاڑی میں سوار ہوئے اور اگلے روز ایک نامعلوم مقام پر جا کر اترے جہاں پر چاروں طرف کاغذ سازی کے کارخانے تھے۔ روٹ مارچ کرتے ہوئے وہ نمبر ۵۷ فرنٹیر فورس کے پاس سے گزرے۔ لمبی لمبی مونچھوں اور چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں والے پٹھان سپاہی، جو خاردار تار کے اندر برتن دھو رہے تھے، اپنے دیس کے جوانوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلانے اور تیز، باریک آواز میں ”ہواو۔ ہواو“ کرنے لگے۔ اگلے دن شام کے اندھیرے میں دور سے چیونٹیوں کی طرح رینگتی ہوئی فوجی بسوں کی قطار نظر آئی۔ نمبر ۱۲۹ ڈیوک آف کنائٹس اون بلوچ رجمنٹ والوں کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں اور وہ تاروں پر ہاتھ رکھ کر دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ انتظار کرنے لگے۔

”ہمارا لاریوں کا حصہ آگیا۔“

”کل ہم محاذ پر ہوں گے۔“

”میں توپ کی آواز یہاں سے سن سکتا ہوں۔“

دوسرا سپاہی ہنسا: ”پھر تم رستے میں ہی مر جاؤ گے۔ کبھی گولہ نہ دیکھ پاؤ گے۔ ہا ہا۔“

”دانت مت نکالو۔“

”محاذ یہاں سے دو سو میل پر ہے۔ سٹاف کیپٹن کہہ رہا تھا۔ بلجیئم میں۔“

”فرانس میں لڑائی نہیں ہو رہی کیا؟“

”اس طرف نہیں۔“

بسبب آکر نمبر ۵۷ فرنٹیر فورس کے پاس رک گئیں اور رجمنٹ سوار ہونی شروع ہوئی۔ بلوچیوں کے ہاتھ نیچے آ پڑے اور آنکھیں ماند پڑ گئیں۔ اُس رات چند یونٹوں کو کاغذ کے کارخانوں کے ارد گرد اُن مکانوں میں پوسٹ کیا گیا جو نمبر ۵۷ ایف۔ ایف۔ کے جانے سے خالی ہو گئے تھے۔

(۹)

اگلے روز رجمنٹ کو اپنا گاڑیوں کا حصہ مل گیا اور وہ ایتالیس گھنٹے کے سفر کے بعد، بلجیئم کی سرحد پار کر کے میدان جنگ میں داخل ہوئے۔ گاڑیاں انہوں نے آرکس کے مقام پر چھوڑیں اور

ہولی بیک میں قیام کیا ۔

اصل محاذ ہولی بیک سے تین میل کے فاصلے پر تھا ۔ سارے مکان اور دکانیں شہری آبادی سے خالی ہو چکے تھے ۔ مکانوں پر گورے رسالوں ، رجنٹوں اور توپ خانے کا قبضہ تھا ، جن میں تین یورپی اقوام کے لوگ : بلجیئن ، فرانسیسی اور انگریز شامل تھے ۔ دو منزلہ مکانوں کے تمام کمرے گورے سپاہیوں ، اسلحہ بارود ، باورچیوں اور راشن کے ڈبوں سے بھرے پڑے تھے ۔ ہیڈ کوارٹر سٹاف الگ الگ مکانوں میں تھا ۔ مکانوں سے ذرا فاصلے پر دکانیں تھیں جنہیں خالی کر کے فرش پر مکئی کے ناڑ بچھائے گئے تھے ۔ ان میں رسالوں کے گھوڑے اور فخر بند تھے ۔ جو دکانیں بچ رہی تھیں وہ ہندوستانی فوجیوں کے لیے مخصوص کی گئیں ۔

اکتوبر کے آخری دن تھے ۔ باہر تیز سرد ہوا چل رہی تھی اور رات ہولی بیک پر بہت نیچے جھک آئی تھی ۔ سپاہی خشک گوشت کے ٹکڑے اور پنیر کھانے کے بعد سونے کی تیاری کر رہے تھے ۔ چند ایک سو بھی چکے تھے ۔ پائن کے درختوں کی چوٹیاں دور اوپر اندھیرے میں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں اور اُن کی بوڑھی اُٹھکیوں کی طرح جھکی ہوئی جھری دار شاخیں اور تیز نوکیلے سبز پتے رات کے مخصوص اسرار میں سائیں سائیں کر رہے تھے ۔ دکان میں تمباکو ، پنیر اور مکئی کے ناڑوں کی ملی جلی بو پھیلی ہوئی تھی ۔ ایک خالی الماری میں مدھم سی لالٹین جل رہی تھی ۔ دیوار کے ساتھ دو مشین گنیں ، جن کی نالیوں پر خول چڑھے تھے ، کھڑی تھیں ۔ بارود سیکشن کمانڈر کے پاس تھا ۔

”فخر محفوظ ہیں ؟“ حوالدار ٹھاکر داس نے کبل تاتے ہوئے پوچھا ۔
 ”ہاں ۔“ نعیم بستر لگا رہا تھا ۔ اُس نے چند ناڑا کٹھے کر کے اُن کا سرہانہ بنایا اور ہاتھ سے دبا کر دیکھا ۔

”پہرے پر کون ہے ؟“

”احمد ۔“

”اس کے بعد ۔“

”دو بچے ریاض بدلی کرے گا ۔“

”سونے سے پہلے چیک کر لینا ۔“ ٹھاکر داس نے گھٹنے اٹھا کر بستر کا خیمہ بناتے ہوئے کہا ۔

ایک سپاہی نے کبلوں میں کروٹ بدلی اور بھاری ، خواب آلود آواز میں بڑبڑایا : ”یہ تو مکئی بھی سالی سرد ہے ۔“

لیٹتے ہی نعیم کے تھنوں میں خشک مکئی کی مانوس بو داخل ہوئی ۔ خواب آلود سانسوں کی حرارت اور انسانی بو آہستہ آہستہ کمرے میں پھیل رہی تھی ۔ جب بستر گرم ہو گیا تو اُس نے

اندر ہی اندر ہاتھ بڑھا کر بوٹ اُتارے اور باہر دھکیل دیے۔ دور کسی مکان میں سے ایک اُونچا،
 کرخت قہقہہ بلند ہوا اور گہری رات میں گم ہو گیا۔

”تمہارے پاس سگریٹ ہے؟“ ٹھاکر داس نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“

”ایک دو۔“

نعیم نے سگریٹ اُسے پکڑائے۔ ”دروازے کے پاس چلے جاؤ۔ یہاں مت پینا۔“

”تمہیں نیند آ رہی ہے؟“

”نہیں۔ مگر میں خوب گرم ہو گیا ہوں۔“

”اُو وہاں بیٹھیں۔“

دونوں کبیل اوڑھ کر دروازے کے پاس تنگے فرش پر جا بیٹھے اور خاموشی سے سگریٹ سلکا
 کر پینے لگے۔

”فرش بڑا ٹھنڈا ہے۔“ نعیم نے کہا۔

”تھوڑے سے ناڑ کھینچ لو۔ لگنے دو آگ (کالی)۔ جب حملہ شروع ہو گا تو کس کو پتہ ہے

اس جگہ کا کیا حشر ہو گا۔“

نعیم نے ناڑ مروڑ کر فرش پر رکھے اور اُن پر اکڑوں بیٹھ کر کبیل کی آرام دہ حرارت محسوس
 کرنے لگا۔

”محاذ تین میل پر ہے۔“ ٹھاکر داس نے بڑا سا ہاتھ بڑھی ہوئی داڑھی پر پھیرا۔

”خاموش کیوں ہے؟ صرف گیدڑ بول رہے ہیں۔“

”جرمنوں نے ابھی حملہ شروع نہیں کیا۔“

”ہماری لائنوں میں اس وقت کون ہے؟“

”گوار رسالہ۔“

”کیا ضروری ہے کہ جرمن حملہ کس۔“ تھوڑی دیر کے بعد نعیم نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ ٹھاکر داس نے ناڑ چباتے ہوئے کہا۔ ”مگر اُن کی فوج زیادہ ہے۔ ایک

ڈویژن۔ یا اس سے بھی زیادہ۔“

اُس نے سگریٹ پھینکنے کے لیے لوہے کا کواڑ کھولا۔ بھیسکی ہوئی سرد ہوا نعیم کے چہرے

سے ٹکرائی۔ ایک گیدڑ نے بالکل سامنے آ کر آواز بھلی۔ اگلی دکنوں میں سے نچروں میں بھگدڑ

مچنے اور ایک نچر کے مکئی کے ناڑوں پر پیدشاب کرنے کی آواز آنے لگی۔ نعیم نے سر باہر نکالا۔

”سپاہی احمد خان۔“

اندھیرے میں سے احمد خان کے رائفل کے دستے پر ہاتھ مارنے اور جواب دینے کی آواز آئی۔

”شلباش۔“

باہر ہلکی ہلکی خاموش بارش ہو رہی تھی اور پائن کی چوٹیوں میں بادل پھر رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر بجلی چمکتی۔

”یہ موسم جنگ کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔“ ٹھاکر داس نے تشویش سے کہا۔
نعیم نے خاموشی سے دروازہ بند کر دیا۔

”جب خاموش بارش ہو رہی ہو تو آواز دور تک جاتی ہے۔ اور بجلی۔“
”اچھا ہے کہ آج حملہ نہیں ہوا۔“

”ہاں۔ سب سے زیادہ خطرناک تو برف باری ہوتی ہے۔“
دور مشرقی آسمان پر سے گرر گر کی آواز آنی شروع ہوئی۔

”وہ۔ آ رہا ہے۔“ ٹھاکر داس نے چونک کر کہا۔ وہ کان لگائے سنتے رہے۔ ہلکی گرج دار آواز قریب آ رہی تھی۔ نعیم نے جلدی سے اٹھ کر لائٹین پر بہت سے ناڑ پھینکے۔ واپس آتے ہوئے وہ اندھیرے میں ایک سوئے ہوئے سپاہی سے ٹکرا کر گر پڑا۔ سپاہی نے نیند میں کالی دی اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

باہر نکل کر انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ مہین پھوار سے لکڑی کا پائیدان گیلا اور پھسلواں ہو رہا تھا۔ سامنے اندھیرے میں پائن کے درخت بھاری، سیاہ بھوتوں کی طرح کھڑے تھے۔ خوف ناک آواز دفعتاً بالکل قریب آ گئی۔ ٹھاکر داس اور نعیم بے جان لکڑی کے تختوں کی طرح زمین پر گرے اور بے سدھ لیٹے رہے۔ درختوں کے اوپر ایک دھندلی سبز بتی نمودار ہوئی اور تیزی سے مغرب کی سمت گزر گئی۔

”بدبخت ہزار توپوں کی آواز ہے۔“ ٹھاکر داس نے سرگوشی میں کہا۔

نیم روشن، سفیدی مائل بادل دکانوں کی چھتوں پر آگئے تھے اور باریک پھوار خاموشی سے ان کے چہروں کو بھگو رہی تھی۔ وہ اٹھے اور واپس دکان میں داخل ہوئے۔

”یہ ہوائی جہاز تھا۔“ ٹھاکر داس نے اپنے آپ سے بات کی۔

”جرمنوں کا تھا؟“

”پتہ نہیں۔“

”ہری بتی تھی۔“

”سب کی ہری ہوتی ہے۔“

کپکپاتی ہوئی اٹھکیوں سے انہوں نے دوبارہ سگریٹ سلکائے۔ ہوائی جہاز کے ساتھ اُن کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

”سگریٹ یہیں ختم کر دو۔ مورچوں میں نہیں پی سکتے۔“ ٹھاکر داس بولا۔

”کیوں؟“

”سگریٹ پر گولی پڑے گی اور جبرے صاف کر جائے گی۔ ہر بات پر کیوں۔ کیوں۔“ وہ خاموشی سے دھواں اُڑاتے رہے۔ کمرے میں سونے والوں کے خراٹوں کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

”شاید کل ہم چلے جائیں۔“

”کہاں؟“

”فائرنگ لائن پر۔ ایس؟“

نعیم نے ایک لمحے کو اُسے غور سے دیکھا۔ اب تم کیوں پوچھتے ہو؟“ ٹھاکر داس نے ابرو اٹھا کر کڑی، مسخرانہ نظر اُس پر ڈالی، پھر سگریٹ پر ایک لمبا کش لینے کے بعد نیم خفگی، نیم طنز سے ہنسا۔

”میں اس قدر اکتا گیا ہوں۔ یہاں سے۔“

نعیم خاموشی سے اندھیرے میں دیکھتا رہا۔

”مجھے اس وقت محاذ پر ہونا چاہیے۔ یا گھر۔“

”کیوں؟“

”میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ اتنے مہینے ہو گئے۔ یہاں میری نچروں سے بھی بری حالت ہو گئی ہے۔“

”تمہیں اپنی بیوی سے محبت ہے؟“

”ہاں۔ شاید۔ اے مجھ سے بڑی محبت ہے۔“

”اچھا۔“

”ہم نے شادی عجیب طریقے سے کی تھی۔ میں عورتوں کا کاروبار کیا کرتا تھا۔“

”کاروبار۔ ایس؟“

”میں اور رام سنگھ۔ ہم لدھیانے، انبالے اور رہتک سے عورتیں اٹھایا کرتے اور پنجاب میں لاکر بیچا کرتے تھے۔ خاص طور پر لدیل پور اور سرگودھا میں وہ اچھے دام دے جاتی تھیں۔ یوں ہمیں خود عورتوں کا کوئی چاؤ نہ تھا۔ ہم کبڈی کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے اور سب سے اول جسم اور جان کی رکھوالی کرتے تھے۔ جوانی کا زمانہ تھا۔ بیسیوں عورتیں آئیں اور بیسیوں گئیں۔ کبھی کبھار کوئی پسند آئی تو دو چار روز کے لیے رکھ لیا ورنہ ادھر سے لادا ادھر بیچا۔ لو

”میں نہیں پیتا۔“ نعیم نے اس کا سگریٹ والا ہاتھ پیچھے دھکیل دیا۔

”ایک دن میں نے سنا کہ چک نمبر ۳۰ کی ایک کمہاری نے آواز دی ہے چار طرف کے گاؤں میں کہ ہے کوئی ایسا جوان جو مجھے دن دن کو آگر لے جائے۔ یہ آواز سن کر میری مونچھ کو تاؤ آگیا۔ میں نے کہا چل رام سنگھ، مگر رام سنگھ دن دن کو جانے سے گھبرائے۔ میں نے ایک عورت بھیج کر پتہ کروایا تو معلوم ہوا کہ اس کا خاوند کمہار اپنے گاؤں کا شہ زور جوان ہے اور رات کے وقت اس کی ماں بیٹے اور بہو کو اندر بند کر کے تالا لگا دیتی ہے، چنانچہ رات کو ٹکلنا دشوار ہے۔“ اس نے کلا صاف کر کے زور سے فرش پر تھوکا اور بات جاری رکھی۔

”چنانچہ رات کو ٹکلنا دشوار ہے۔ خیر، بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ عورت کی پکار ضائع نہیں جانی چاہیے۔ میں نے پیغام بھیجا کہ فلاں دن تمہارے گاؤں سے تین مربے باہر بڑے پیپل کے نیچے دوپہر کو آؤں گا۔ ہمت ہو تو آجاؤ۔ سخت گرمیوں کے دن تھے۔ دس کوس چل کر میں پیپل کے نیچے پہنچا۔ بیٹھے بیٹھے دوپہر ڈھل گئی، عورت کا نام و نشان نہیں ملا۔ میں وہیں پر سو گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر سویا تھا کہ چھڑی کی نوک سے کسی نے مجھے جگایا۔ آنکھ کھولی تو ایک بڑا جوان منظر پڑا۔ سر پر منڈاسہ، کمر میں پھولدار لاجا، ہاتھ میں چھڑی۔ میں نے پوچھا: ”کیا بات ہے جوان؟“ کہنے لگا: ”اب اٹھ اگر چلنا ہے تو۔“ مجھے سندیسہ بھیج کر اب سوتا ہے۔“ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ غور سے دیکھا تو عورت تھی۔ پر نعیم، کیا عورت تھی کمبخت یہاں سارے ولایت میں میں نے ایسی جوان اور جلال والی عورت نہیں دیکھی۔“ وہ پر سرور تبسم کے ساتھ چند لحظے تک فضا میں دیکھتا رہا۔ ”ہم ساری رات اور سارا دن چلتے رہے اور تیس کوس پر جا کر پہلی رات گزاری۔ وہ میرے دوست کا گاؤں تھا۔ سویرے اٹھ کر عورت بولی: ”میں تجھ سے میاہ کروں گی۔“ میں نے کہا: ”میاہ ویاہ کی بات چھوڑ، میں میاہ کا قائل نہیں ہوں۔“ یہ سن کہ وہ رونے لگی اور رو کر برا حال کر لیا۔ خیر وہاں سے ہم گھوڑی لے کر دس دن میں امرتسر پہنچے۔ راتوں رات میں نے اس کے سات سو روپے وصول کیے اور اسے سوتا چھوڑ کر چلا آیا۔

”کوئی دس دن نہیں گزرے ہوں گے اس بات کو ایک دن میں کھیت میں سویا پڑا تھا کہ وہ میری چھاتی پر آن چڑھی۔ میں نے چلانا چاہا لیکن اس نے ایک ہاتھ سے میرا منہ بند کیا اور دوسرے ہاتھ سے چھڑی کی نوک میری گردن پر رکھ دی اور بولی: ”میں سریندری ہوں۔ بول میرے ساتھ شادی کرے گا یا نہیں۔ میں تجھے قتل کر دوں گی۔“ جان کے خوف سے میں نے وعدہ کر لیا۔ راتوں رات اسی کی گھوڑی پر سوار ہو کر ہم گاؤں سے نکل آئے۔ اس نے

مجھے اپنے آگے بٹھا کر باہوں میں کس رکھا تھا۔ صبح ایک گاؤں کے مندر میں جا کر ہم نے شادی کر لی۔ پتہ ہے کیسے؟ گھوڑی کی پشت پر اور کسی چوتھے آدمی کے بغیر۔ پنڈت کے سر پر سریندری کی چھری تھی اور وہ گھوڑی کی باگ پکڑے پکڑے پھیرے دے رہا تھا اور اشلوک پڑھتا جا رہا تھا۔ ”وہ اندھیرے میں آہستہ سے ہنسا۔ ”سریندری نے چند روپے کھول کر اس کی طرف پھینکے اور ہم لوٹ آئے۔ اس رات کو وہ مجھ سے لپٹ کر روتی رہی۔ میں نے کہا: ”روتی کیوں ہے۔ اگر میں شادی نہ کرتا تو تو مجھے قتل کر دیتی۔ کہنے لگی: ”وہ تو صرف دھونس تھی۔ اگر تم شادی نہ کرتے تو میں اپنے آپ کا خون کر لیتی۔ تم مرد ہو۔ تم کیا جانو عورت کے دل میں کیا ہے۔“ رات بھر وہ میرے ساتھ لپٹی چھوٹی سی کمزور چڑیا کی طرح روتی رہی۔ آج دس برس ہو گئے اس بات کو اور اس نے آج تک میرے سامنے آنکھ نہیں اٹھائی۔ اب وہ میری بیوی ہے۔“

وہ ایک لمبی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ لالٹین کی بتی جھلملا رہی تھی۔ اور فرش پر سوئے ہوئے سپاہیوں کی ٹانگیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ ساتھ والی دکان میں کوئی گا رہا تھا۔

”اب وہ کسی اور کے ساتھ بھاگ جائے تو۔؟“ نعیم نے کہا۔

”نہیں۔ وہ نہیں جائے گی۔ جس مرد کے ساتھ اس کا دل نہیں تھا اسے اس نے بول کر کہہ دیا تھا کہ تو مجھے لاکھ تالے میں رکھ، ایک نہ ایک دن میں چلی جاؤں گی۔ میرے گھر میں اس نے دو بچے دیے ہیں اور اونچی آواز سے بات نہیں کی ہے۔ اب وہ کہیں نہ جائے گی۔ تم نہیں جانتے نعیم، عورت جب محبت کرنے پر آتی ہے تو ختم ہو جاتی ہے۔ محبت کرنے کے لیے اتنا بڑا دل چاہیے۔ وہ دلیر عورت ہے۔ میں جانتا ہوں۔ ورنہ میں نے ایسی بھی عورتیں دیکھی ہیں جو ایک گھر میں پانچ پانچ بچے جننے کے بعد دوسرے مرد کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔“ وہ رکا، ”عورتیں بری نہیں ہوتیں۔ یہ میرا یقین ہے، پر اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے۔ جس کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ اسے ساری عمر دھوکہ دہی سے کام لینا پڑتا ہے۔“

ٹھاکر داس نے اپنے نیچے سے ناڑ نکال کر سوئے ہوئے سپاہیوں پر پھینکے اور کبیل جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم پہلے شخص ہو جس کو میں نے یہ قصہ بتایا ہے۔“

نعیم نے سر باہر نکالا۔ ”سپاہی ریاض احمد۔ شلباش۔“ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

”بارش ہو رہی ہے؟“ ٹھاکر داس نے پوچھا۔ نعیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ سوچتا ہوا بستر سیدھا کر رہا تھا۔ ساتھ کی دکان میں کانے والے سپاہی کی کرخت، نگلین، بھاری آواز

چھوٹے چھوٹے سر بناتی رات کے اتھاہ سناٹے میں گم ہو رہی تھی۔ بادل پھٹنے سے چاند سامنے آگیا تھا اور گیلے پائٹن کی بوڑھی اٹھلیاں اور لمبے نوکدار پتے روشن آسمان کے مقابل سیاہ اور ساکت تھے اور ان پر سے پانی کے قطرے خاموشی سے نیچے پتھروں پر گر رہے تھے۔

ٹھاکر داس کبیلوں میں ہلا اور بولا: ”مگر میرے دو بچے ہیں۔“
 ”مت سوچو۔ مت سوچو۔“ نعیم نے بستر میں دھنستے ہوئے کہا۔ ”رات بہت گزر گئی ہے۔“

دوسرے دن وائپرس پر جرمن حملہ شروع ہوا جو آخر نومبر تک رہا۔ آرکس سے نمبر ۱۲۹ بلوچ رجمنٹ (ڈیوک آف کنائٹس اون ، 7th فیروز پور بریگیڈ) ، مارچ کر کے ییلول تک پہنچی۔ وہاں جنرل فرینچ اپنی سیاہ کار میں آیا اور فیروز پور بریگیڈ کو سیکنڈ کیولری ڈویژن سے جا کر ملنے کے احکام جاری کیے۔ اسی شام کو رجمنٹ موٹر لاریوں میں سوار ہو کر رات کے وقت سینٹ الوئی پہنچی اور بریگیڈیئر جنرل واہن کے حوالے کر دی گئی جو تھرڈ کیولری بریگیڈ (سیکنڈ کیولری ڈویژن) کی کمان کر رہا تھا۔

صبح سویرے وہ فائرنگ لائن پر پہنچے اور 6th اور 5th لانسرز سے مورچے سنبھالے۔ کیولری کے دستے و تشت اور زندرورد کے درمیان کے سارے علاقے پر چھائے ہوئے تھے۔ دایاں بازو پلوگ سٹریٹ کے جنگل کے شمال مشرقی کونے کی آڑ میں تھا۔ یہ خوب صورت اور خاموش جنگل شمال کی طرف دور تک پھیلتا ہوا چلا گیا تھا۔ آگے جا کر سرسبز پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جس پر جنگل یوں چڑھ گیا تھا جیسے ہاتھیوں کا لشکر ہموار زمین پر چلتے چلتے ایک دم پہاڑ پر چڑھنے لگے اور چوٹی تک چلا جائے۔ گھاس ، جو کبھی کاٹا جاتا ہوگا ، بے تحاشا اُکا ہوا تھا اور اس میں جھڑے ہوئے زرد پتے اٹکے تھے۔ یہ خزاں کا موسم تھا۔

جنگل کے شمال مشرقی کونے سے پندرہ قدم ہٹ کر کھلی جگہ میں انہوں نے مشین گنیں نصب کیں۔ انہیں مورچوں میں ان سے پہلے 5th اور 16th لانسرز پڑے تھے اور ان کے چھوڑے ہوئے راشن کے خالی ڈبے ، ٹوٹے ہوئے سخت بسکٹ ، کاغذ کے ٹکڑے اور جلے ہوئے سگریٹ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ٹھاکر داس اور نعیم نے اپنے سیکشن کو مورچوں میں جمایا ، گنوں کو آہنی ٹانگوں پر باندھا اور آٹھ آٹھ جوان ہر دو مشینوں پر مقرر کیے۔ اسی خندق میں دو اور سیکشن بیس بیس کے فاصلے پر مورچے سنبھالے ہوئے تھے اور ان کی چار مشین گنیں پہلے سے کھدی ہوئی بنیادوں پر نصب تھیں۔ شمالی محاذ پر جرمن حملہ شروع ہو چکا تھا اور توپ خانے کے فائر کی مسلسل آواز جنوبی مورچوں تک آ رہی تھی۔ ان سے آگے زیریں سطح پر واقع خندقوں میں کیولری کے دستے تھے۔ سیکنڈ کیولری ڈویژن نہر کے پل اور ہولی میک کے مشرقی

بازو کے درمیان ساڑھے تین میل رقبے کو گھیرے ہوئے تھا۔ خندقیں ایک سے ڈیڑھ میل تک لمبی تھیں۔ تھرڈ بریگیڈ بائیں بازو پر تھا۔

سورج تمام دن ان کے آہنی خودوں پر چمکتا رہا اور وہ خندقوں میں سرچھپائے احکام کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ خندقیں گیلی اور سرد تھیں اور ان میں عجیب و غریب شکلوں والے تھے تھے کیڑے رنگ رہے تھے۔ ٹھاکر داس نے خود اتار کر کھٹنے پر رکھا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”حوالدار نور محمد کہاں ہے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”اؤٹ پوسٹ پر ہے۔“ ٹھاکر داس نے آہستہ سے ایک کیڑا اٹھا کر خود پر رکھتے ہوئے

کہا۔

”کہاں پر؟“

”رجمنٹل ہیڈ کوارٹر سٹاف کی عمارت۔ چوٹی کی منزل۔“

”اگر مجھے مل جائے تو کچا چباؤں۔“ نعیم نے سخت غصے میں مشین گن کی ٹانگوں پر ٹھوکر

ماری۔ ”کہہ رہا تھا آج صبح ہم ضرور حملہ کریں گے۔“

ٹھاکر داس خفگی اور طنز سے ہنسا۔ ”ہر کوئی اپنے کو بریگیڈیئر جنرل واہن سمجھتا ہے۔“

پھر وہ خود پر چلتے ہوئے کیڑے سے کھیلنے لگا۔ ”ہم حملہ نہیں کریں گے۔“

”پھر؟“

”جرمن پہلے کریں گے۔ شمال میں بھی انہوں نے ہی کیا ہے۔“

”تم بھی بریگیڈیئر جنرل واہن ہو۔“

”ایس؟ تمہاری طبیعت اب کھلنے لگی ہے، بچے۔“

سامنے اونچی نیچی زمین پر سورج غروب ہو رہا تھا اور غیر کاشت شدہ پتھریلی زمین مکئی

کے رنگ کی تھی۔ خشک ٹہنیوں اور زمین کی ہم رنگ گھاس کی اوٹ میں خندقوں کے اندر

ہزاروں سپاہیوں کے بیک وقت سرخ اور زرد، مشتاق اور مضطرب، اعصابی چہرے ساکن تھے

اور خوف زدہ ہوشیار آنکھوں میں انتظار کی تھکن نمایاں تھی۔ ان سب کے کان شمال کی طرف لگے

ہوئے تھے جہاں سے ہلکی ہلکی، بادل کے گرجنے کی سی، توپ خانے کی آواز آرہی تھی۔ سامنے

تقریباً ایک میل پر دشمن کے مورچوں میں حرکت ہو رہی تھی۔

”بھینچو۔“ نعیم نے کالی دے کر بوٹ کی ایڑی سے کیڑوں کی پوری قطار کچل دی۔

ٹھاکر داس بسکٹ چبا رہا تھا۔ اس نے چند بسکٹ منہ میں ڈال کر نعیم کی طرف

بڑھائے۔

”مجھے بھوک نہیں۔“ اس نے خشکی سے کہا اور کمر سے چھاگل کھول کر پانی پینے لگا۔
 ”اپنا پانی مت ختم کرو۔ مورچے میں دو چیزوں کی بڑی قیمت ہے۔ بارود اور پانی۔
 بعض اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ دشمن کو ختم کرنے کے بعد سب سے پہلے اس کی چھاگل تلاش
 کرنی پڑتی ہے۔“

نعیم کا دماغ ایک بے وجہ غصے اور مکان کی گرفت میں تھا۔ اس نے جواب دیے بغیر
 کیروں کو کچلنا جاری رکھا۔

ٹھاکر داس گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ ”ریاض پیٹیاں لے آئے؟“

”لے آیا۔“

”کل محمد۔ اب تم جاؤ۔“ اس نے حکم دیا۔ ”حملے کے اندر اسی طرح بارود کے لیے
 دوڑنا پڑے گا۔ ریاض اور رام لعل، تم انہیں خالی کر کے پھر سے بھرو۔ ڈھائی سو راؤنڈ تین
 منٹ میں نکلتا ہے۔ خالی مت بیٹھو، مشق کرو۔ خالی بیٹھے بیٹھے تم ایک دوسرے کو قتل کرنے
 کی ترکیبیں سوچنے لگو گے۔“

اس نے گنگھیوں سے نعیم کی طرف دیکھا جو سینٹ کو چوڑا کر کے کیروں پر مار رہا تھا۔
 ”مت مارو انہیں۔“ اس نے نرمی سے کہا۔ ”اپنے مورچے میں مت کسی کو مارو۔
 میدان جنگ کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔“

نعیم نے سینٹ کی مدد سے مرے ہوئے کیروں کو چھوٹے سے ڈھیر میں اکٹھا کیا اور گھٹنوں
 کے بل اٹھ کھڑا ہوا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ خندق کی دیواروں اور مشین گنوں کے ساتھ ٹیک
 لگا کر بیٹھے ہوئے سپاہیوں کے خود زمین کی سطح پر نظر آرہے تھے۔ کل محمد گھسٹتا گھسٹتا توپ
 خانے کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اس نے رک کر لیٹے لیٹے سیلوٹ کیا۔ سیکشن کمانڈر کیپٹن ڈل
 جواب دیتا ہوا قریب سے گزرا۔ آگے جا کر کیپٹن نے ایک لمبے اور پتلے انگریز آرٹلری آفیسر سے
 کوئی بات کی اور پھر سیدھا انکے مورچوں کی طرف آیا۔ باری باری اس نے ساری مشین گنوں پر
 رک کر بات کی :

”شباباش جو انو ڈٹے رہو۔ کل ہم حملہ کریں گے۔“ جاتے جاتے وہ ایک پیکٹ سگریٹ
 ٹھاکر داس کی طرف پھینک گیا۔

”کل حملہ کریں گے، سؤر۔ یہ تیسری بار ہے۔ گپ مارنے یہیں آتا ہے۔“ ٹھاکر
 نے کہا۔

دونوں نے سگریٹ سلکائے۔ باقی پیکٹ ٹھاکر داس نے سپاہیوں کی طرف اچھال دیا۔
 وہ آنکھیں چمکا کر سگریٹوں کی طرف لپکے۔

”پر اب سر نہ اٹھے۔ لونڈو“ اس نے تہیہا کہا۔

”رات کے لیے ہمیں اور سگریٹ چاہیں۔“ نعیم نے کہا۔

”رات کے لیے تمہیں عورت بھی چاہیے، ایس؟“ وہ کھردرے پن سے ہنسا۔

”سگریٹ تو ہیں۔ اتنے خوش کیوں ہو رہے ہو۔“

وہ خاموش بیٹھے سگریٹ پیئے رہے۔ ٹھاکر داس نے بیٹھنے پر سے تھیلہ اتارا اور سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ آسمان پر اکا دکا ستارے نکل آئے تھے اور مغرب کی طرف سے بادل اٹھ رہا تھا۔

”میری بات کا غصہ مت کرو۔“ ٹھاکر داس نے کہا۔ ”میں نے بڑی خندقیں دیکھی ہیں۔ میں سپاہی تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ سپاہیوں کو بھی سگریٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ خندق بڑی خطرناک جگہ ہے۔ یہاں سپاہیوں کی دیکھ بھال پالتو جانوروں کی طرح کرنی پڑتی ہے۔ مجھے حکم دینا ہے اور انہیں لڑنا ہے اور مرنا ہے۔ لیکن جب حملہ شروع ہو گا تو وہ خود اپنے انچارج ہوں گے، اور گنوں کے اور میدان جنگ کے انچارج ہوں گے۔ اس بات کا انحصار کہ وہ کس طرح لڑتے ہیں اور کس طرح مرتے ہیں، اُس وقت پر ہے۔ اس وقت پر نہیں۔ میں اپنی ڈیوٹی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“ وہ گیلی، نرم دیوار میں ناخن چھبھوتا رہا۔ نعیم بڑھتے ہوئے اندھیرے میں غور سے اس کے چہرے کے مضبوط، کسی حد تک ظالمانہ منقوش کو دیکھتا رہا۔

”اور تمہیں پتہ ہے اس خندق میں ہمیں کب تک رہنا ہے؟ کسی کو پتہ نہیں۔ اگر تم ہنسو گے نہیں تو حملے سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔ سنا؟“ ٹھاکر داس نے کہا۔

نعیم بے دلی سے ہنسا۔ خندق میں گہرا اندھیرا تھا۔ دوسری مشین گن کے پاس ایک سپاہی باریک دھیمی آواز میں کوئی دیہاتی گیت گا رہا تھا۔ دوسرے اس کے گرد بیٹھے سن رہے تھے۔ دو سگریٹ سلگے ہوئے تھے اور وہ سپاہیوں کے دائرے میں باری باری گھوم رہے تھے۔ خندق کے اوپر تیز سرد ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بادل آدھے آسمان پر پھیل چکے تھے۔ شمالی محاذ کی طرف سے آنے والی توپ خانے کی آواز بند ہو چکی تھی۔

ٹھاکر داس نے مونچھ کو جھکا کر دانتوں میں چبایا: ”نعیم، یہ موسم دیکھتے ہو؟“

”ہوں۔“

”اسی موسم میں میں اور وہ عورت شادی کرنے کے لیے گاؤں سے بھاگے تھے۔ حیرت

کی بات ہے۔ ہوہو ایسا بادل تھا۔“

نعیم نے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ چند لمحے کے اندر اندر نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی اور اس کے معدے میں ایک پرانا، مانوس، بد مزہ سا بھاری پن پیدا ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس شخص سے، جو اس کا افسر ہے اور تاریکی میں

خندق کی دیوار کے ساتھ لیٹا ہوا ہے ، انتہائی نفرت کرتا ہے ۔ یہ وہ احساس تھا جو کئی دن سے آہستہ آہستہ اس کے دل میں پیدا ہو رہا تھا اور جس کی خاطر اس کا دماغ مستقل غیر یقینی ، سست حالت میں کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اس وقت دفعتاً وہ احساس ، خطرے اور کرب کی وجہ سے جاگے ہوئے دماغ میں ، ایک مکمل جذبے ، ایک بڑے واضح تعصب کی شکل میں ظاہر ہو گیا تھا ۔ بہت عرصے کے بعد پہلی دفعہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دماغ نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ کو کسی نامعلوم قوت کے اثر سے چھڑا کر تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا ہے ۔

اس نے نفرت سے خندق میں تھوکا ۔ ”عورتوں کا ذکر کرنے کا یہ اچھا موقع ہے ۔“
 ٹھاکر داس بھاری گلے سے ہنسا ۔ نعیم نے منہ میں بدمزگی محسوس کی اور دوبارہ تھوکا ۔
 ”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ؟“

نعیم نے انتہائی کوشش سے اپنے آپ پر قابو پایا ۔ ”شاید تمباکو خراب تھا ۔“
 ”ولایتی تمباکو تھا ۔“ ٹھاکر داس نے کہا ۔

دونوں خاموش بیٹھے اندھیرے میں جاگنے کی کوشش کرتے رہے ۔
 آدھی رات کے بعد بارش شروع ہو گئی اور متواتر چار گھنٹے تک ہوتی رہی ۔ ترپالوں کے لیے سپاہی بھیجا گیا مگر وہ ختم ہو چکی تھیں ۔ صرف توپ خانے والوں سے کینوس کے چند بستر بند حاصل ہو سکے جنہیں خیمے کی شکل میں خندق کے اوپر لکایا گیا اور پانی کو روکنے کے لیے بند بنائے جانے لگے ۔ لیکن جب بارش تھمی تو خندق میں چھ چھ انچ پانی بھر چکا تھا ۔ انہوں نے راشن کے خالی ڈبوں سے پانی نکالنا شروع کیا ۔ سیکشن کمانڈر برساقی اور دستا نے پہنے کنارے کنارے پھر رہا تھا ؛ کبھی کبھی ٹھہر کر بات کرنے لگتا : ”شلباش جوانو ۔ آواز نہ ٹھکنے پائے ۔“
 شلباش ۔

چاروں طرف ڈبوں کے زیر آب ڈوبنے اور پانی کے بہنے کی دھیمی آوازیں آ رہی تھیں ۔ صبح سے پہلے کی گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور پانی کے جھپکاؤنگی آواز تیز ہوا کے ساتھ دور تک جا رہی تھی ۔ سپاہیوں کے لمبے فوجی کوٹ بھیگ چکے تھے ۔ ان کے بوٹوں میں پانی گھس گیا تھا اور وہ سردی سے کانپ رہے تھے ۔ دشمن کے مورچوں کی طرف سے گرر گرر کی جانی پہچانی آواز آنی شروع ہوئی اور دور آسمان میں تھی سی سبز بتی ریٹکنے لگی ۔

”وہ آیا ۔“ زیر لب بہت سی آوازیں آئیں ۔ سارے سپاہی ایک ساتھ سر کے بل خندق میں گرے ۔ ان کے کانوں اور تھنوں میں کچھ گھس گیا اور اٹھکیاں نرم زمین میں دھنس گئیں ۔ کچھوں کی طرح اوندھے منہ کچھڑ میں وہ اس وقت تک پڑے رہے جب تک کہ ہوائی جہاز خوف ناک آواز پیدا کرتا ہوا اوپر سے گزر نہ گیا ۔

”اچھا ہے کہ ہمارے پاس خراب ہونے کو کچھ ہٹی نہیں۔“ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے
 ٹھاکر داس ہنسا۔ ”اوہ۔ ٹھیک ہے۔“ کیپٹن ڈل اپنی نفیس برساتی پر سے کیچڑ صاف کرتا ہوا
 سادگی سے ہنسا۔ ”میرے اوپر مت ہنسو۔ ہو سکتا ہے میں تم سے پہلے مر جاؤں۔“
 صبح ہونے تک خندقوں میں صرف کیچڑ رہ گیا تھا۔ پھونکیں مار مار کر گیلی لکڑیوں کو جلایا
 گیا۔ لیکن دھواں اٹھنے پر فوراً بجھا دیا گیا۔ جو پانی نیم گرم ہوا اسی سے سپاہی چائے بنا کر پینے
 لگے۔ بے خوابی اور دھوئیں کی وجہ سے ان کی آنکھیں سرخ انکارہ ہو رہی تھیں۔
 ”تم نے الگ چولہا کیوں بنایا ہے؟“ ٹھاکر داس نے پوچھا۔
 ”ٹھیک ہے۔“

”دھواں اٹھ رہا ہے۔ اسے بجھا دو۔ اور کوٹ سوکھنے کو پھیلا دو، پھپھڑوں کو سردی
 لگ جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ نعیم نے پتھریلے لہجے میں دھرایا۔
 ”ٹھیک ہے؟ کیا ٹھیک ہے؟“ ٹھاکر داس غصہ دباتے ہوئے بولا۔ نعیم پیٹھ موڑے
 کیلے ایندھن میں پھونکیں مارتا رہا۔
 ”لانس نائک نعیم احمد خان۔“

”نعیم ایک جھٹکے سے مڑا اور پاکلوں کی طرح دانت تنگے کر کے چیخا: ”مجھے چائے بنانے
 دو۔“

”میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔“ ٹھاکر داس گرجا اور آگے بڑھ کر اپنے بڑے بڑے بوٹوں
 سے مسل کر ادھ جلی لکڑیاں بجھانے لگا۔

نعیم نے کھینچ کر سر سے ٹوپنی اتاری اور اس کی طرف پھینکی جو اڑتی ہوئی ٹھاکر داس کے
 کان کے پاس سے گزر گئی۔ پھر اس نے رائفل کو سلنگ سے پکڑ کر اس کی طرف اچھالا۔ وہ
 اسی طرح جا کر خندق کی دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

”لو۔“ وہ جانوروں کی طرح چیخا، ”لو۔“ کچھ دیر تک وہ بد نما چہرے کے ساتھ اس کی
 طرف دیکھتا رہا، پھر پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھاکر داس نے کندھے اچکائے اور پیٹھ کر چائے پینے
 لگا۔

”لانس نائک کورٹ مارشل کروانے کی فکر میں ہے۔“ دوسری مشین گن کی ٹانگوں سے
 ٹیک لگا کر بیٹھے بیٹھے ایک سپاہی نے لاپرواہی سے کہا۔ اس کے چہرے پر میل کی لکیریں بنی ہوئی
 تھیں۔

سورج پوری حدت اور چمک کے ساتھ اوپر آ رہا تھا اور بارش کے بعد فضا کے رنگ گہرے

ہو گئے تھے۔ پلوگ سٹریٹ کا جنگل سیاہی مایل سبز اور پرسکون تھا۔ خندقوں میں بے خوابی اور تھکان سب چور غلیظ سپاہی، ٹیک لکائے بیٹھے، میلے برتنوں میں چائے پیتے ہوئے، سورج کی صحت بخش حدت کو اپنے سرد اور گیلے جسموں پر محسوس کر رہے تھے۔ باہر ڈھلوان زمین پر ان کے بڑے کوٹ پھیلے ہوئے تھے۔ گیلی، سیاہ زمین بھاپ چھوڑ رہی تھی۔ ٹھاکر داس دیر تک چائے کے ساتھ بسکٹ چباتا رہا۔ اس کے پتھریلے چہرے کی ایک ایک ہڈی اور پٹھا حرکت کر رہا تھا۔ کپچڑ کا ایک تھسا سا قطرہ اس کے ابرو پر جم گیا تھا۔ مگ خالی کر کے اس نے دوبارہ اسے چائے سے بھرا اور نعیم کی رائفل اٹھا کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

”میدان جنگ میں پہلے ہی کیا کم دشمن ہیں۔ ایس؟“ اس نے رائفل اس کی طرف اچھالی اور مگ آگے بڑھایا۔ نعیم نے رائفل کو ہوا میں پکڑا اور بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

اس دن کیولری کے دستوں کو پیچھے ہٹا لیا گیا۔ تمام دن کوئی مزید احکام وصول نہ ہوئے اور تیز دھوپ نے گیلی خندقوں میں سے جو بھاپ اڑائی اس سے گھبرا کر سپاہی جھکے جھکے چلتے ایک سے دوسری جگہ آتے جاتے رہے۔ رات کو بادل پھر جھوم کر اٹھا اور تھوڑی سی بارش کے بعد برف گرنے لگی۔ ہندوستان کے گرم ملک سے آنے والے سپاہیوں نے برف باری پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ خندقوں میں سے منہ نکالے اندھیرے میں گرتی ہوئی برف کو محسوس کر رہے تھے۔ مشین گن نمبر ۱ کے پاس ادھ گیلی ٹہنیوں کی آگ جل رہی تھی اور ٹھاکر داس سینٹ کی مدد سے بوٹوں کے تلووں سے کپچڑ چھڑا رہا تھا۔ اوپر رائفلس ایک دوسرے کے سہارے کھڑی کر کے بستر بند کا خیمہ بنایا گیا تھا۔ دوسری گن کے پاس سپاہی نیم غنودگی کی حالت میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ درمیان میں آگ جل رہی تھی۔ ایک سپاہی سنجیدگی سے بیٹھا آگ پر جرابیں سکھا رہا تھا۔ دیواروں پر ان کے چھوٹے بڑے سائے کانپ رہے تھے۔

نعیم دیر سے اپنی رائفل پر جھکا، منہ باہر نکالے دیوار کے سہارے کھڑا تھا اور برف کے تھے تھے پھوسے خاموشی سے اس کے چہرے اور بالوں پر گر رہے تھے۔ ”برف باری میں نے شملے میں دیکھی تھی۔ وہاں بھی پائٹن کے درخت تھے، شاید چیڑ کے تھے۔ یاد نہیں رہا۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا، اور جنگل، جو ہمارے گھر کے اوپر اور نیچے اور ہر طرف تھا، اور پہاڑ کی ڈھلان پر ہمارا گھر تھا، فلاور۔ مے فلاور؟ ایسا کوئی نام تھا۔ پتہ نہیں۔ اور وہ لڑکا شاید میرا پہلا دوست تھا۔ وہ گھر کے دوسرے حصے میں رہتے تھے۔ لکڑی کے برآمدے میں ریلنگ پر جھک کر ہم برف باری دیکھ رہے تھے۔ ایسی ہی رات تھی۔ شاید وہی رات ہو اور پھری آئی ہو۔“ وہ دل میں ہنسا۔ ”اس کی سفید بلی پاؤں میں بیٹھی تھی اور برف چھتوں پر، درختوں پر، پتھروں پر اور دور دور چوٹیوں پر جہاں صرف برف گرتی ہے، خاموشی سے گر رہی تھی۔ اور کمرے میں اس کی بہن منہ والا بابا بجا رہی تھی۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر تازہ گری ہوئی برف

پر رکھا۔ ”وہ لڑکا اب کہاں ہے؟ دیپک۔ حیرت ہے۔ وہ اب کہاں ہوگا؟ میرے اللہ، میرا دوست کہاں ہے؟“ وہ آنکھیں بند کر کے سوچتا رہا۔ ”شاید ڈاکٹر بن گیا ہو، جب بارش ہوئی تھی تو نالہ، جو ہمارے گھر کے پاس سے گزرتا تھا، اس میں کشتیاں چھوڑنے گئے تھے جو اس کی بہن نے بنائی تھیں تب اس نے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر بننے والا ہے۔ وہ تمام دن رنگ برنگے پتھر جمع کرتا اور انہیں پیس پیس کر بلی کو کھلاتا رہتا تھا جو اس کی مریض تھی۔ میرا پیارا دوست۔ برف باری رک گئی ہے؟ نہیں جاری ہے۔ صرف کم ہو گئی ہے۔ چھت پر، درختوں پر، دشمن کے مورچوں پر۔ آج سارا دن میں نے اس سے بات نہیں کی۔ ٹھیک ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا۔ کیوں؟ پتہ نہیں۔ نہیں نہیں، یہ بات نہیں۔ اگر ہے بھی تو ٹھیک ہے۔ سؤر۔ خندق میں وہ اس قدر مطمئن ہے۔ بھیڑیا۔ جانتا ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا، پھر بھی ہنستا ہے۔ مکار۔ ہر وقت کھاتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں ان جانوروں کو خندق میں بھی اتنی بھوک لگتی ہے۔“

گہری، تیز نفرت رینگ کر اس کے دل میں داخل ہوئی اور اس کے سارے وجود کو گرفت میں لے لیا۔ برف باری کی اس رات میں، انسانوں کے پھیلے ہوئے، پوشیدہ سمندر کے درمیان اس نے اپنے آپ کو بے حد تنہا محسوس کیا۔ دیر تک وہاں کھڑا وہ محبت، نفرت اور حسد کے جلتے ہوئے جذبوں کی اذیت سہتا رہا۔

برف باری تھم چکی تھی۔ بادل پھٹنے پر چاند ظاہر ہو گیا اور چاروں طرف ساری فضا برف کی سفیدی سے جگمگانے لگی۔ دشمن کے مورچوں میں کوئی گٹار کا ایک تار بار بار بجا رہا تھا اور اسکی گمبھیر، نرم آواز سفید اور گہری پرسکوت رات کے سحر میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس نے سر اندر گھینچ لیا۔ ایک کمزور سا نیلا شعلہ کوئلوں کے درمیان نلچ رہا تھا اور ٹھاکر داس دیوار کے ساتھ بیٹھا سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ غلیظ تھا اور ایک اونچے ٹھوڑی پر لٹک آئی تھی۔ نیلے شعلے کا سایہ رخسار کے گڑھے میں کانپ رہا تھا۔ اس کے دونوں کھلے ہوئے ہاتھ زمین پر رکھے تھے۔ اور سر چھاتی پر جھکا ہوا تھا۔ جھکی ہوئی کمر دیوار سے لٹکائے، ٹانگیں دہری کیے سویا ہوا وہ دیکھنے والے کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا کرتا تھا۔ اس کے بڑے سے، کرخت منقوش والے چہرے پر سادگی تھی۔

دیر تک کھڑے رہنے کی وجہ سے نعیم کی ٹانگوں میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ معدے میں سخت بھوک محسوس کر کے اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ چند بسکٹ کھائے گا۔

اگلے دن سہ پہر کے وقت حملے کا حکم ملا۔ ان کے ساتھ نمبر ۱ تمبر ۲ اور نمبر ۳ کیولری بریگیڈ کے زیادہ تر حصے تھے۔ حملے کی تجویز یہ تھی:

نمبر ۳ ڈبل کمپنی ، جو میجر ہمفری کی قیادت میں ہولی میک کے سیکشن کی خندقوں پر قابض تھی ، آگے بڑھے گی اور چھ سو گز کا محاذ گھیر لے گی ۔ نمبر ۱ کمپنی کیپٹن ایڈیٹر کی کمان میں روز بک پر قبضہ کرے گی ، اور جو نمبر ۲ کمپنی ان کے برابر آجائے ، چڑھائی شروع کر دے گی ۔ کمپنی کے دائیں بازو کا رخ فارم کی طرف کنٹور ۳۰ پر ہوگا ۔ نمبر ۳ کمپنی کے دو پلاٹون (کمپنی میکلین کی قیادت میں تھی) مشین گن سیکشن کے ہمراہ کیپٹن ڈل کی کمان میں اس فائر کی مدد کریں گی جو بازو کی طرف سے جارڈینز فارم کی خندقوں میں سے ہوگا ۔ نمبر ۳ کمپنی (منفی دو پلاٹون) اور نمبر ۴ کمپنی جارڈینز فارم کے پیچھے ریزرو میں رہیں گی ۔

تین بجے فائرنگ شروع ہوئی ۔ رجمنٹ دشمن کے مشین گن اور رائفل فائر کے سامنے آگئی ۔

توپ خانہ ابھی دونوں جانب سے خاموش تھا ۔ کیپٹن ڈل دوربین لگائے مشین گن کی خندقوں میں گھوم رہا تھا ۔ سورج خندقوں میں جھکے ہوئے فولادی خودوں پر تیزی سے چمک رہا تھا اور اندھا دھند چلتی ہوئی گولیوں کی آواز مغربی پہاڑیوں میں سے لوٹ کر آ رہی تھی ۔ ہوا میں بارود کی بو تھی ۔

”زاویہ نمبر ۳۹ ۔ جنوب مشرق فائر ۔“ کمپنی کمانڈر چیچا ۔

نعیم نے لبلبی دبا دی ۔ گولیوں کی بوچھاڑ نکلی اور دشمن کی خندق سے پچاس گز ادھر زمین میں دھنس گئی ۔ چھوٹے چھوٹے کنکر پتھر اور گیلی مٹی کے ڈلے ہوا میں اڑے ۔

”ڈیول ۔ (Devil)“ کیپٹن ڈل جھنجھلا کر مڑا اور دوربین سے او ۔ پی ۔ کی عمارت کو دیکھا ۔ شیشوں کو آگے پیچھے پھراتے ہوئے وہ انگریزی میں کالیاں دینے لگا:

”مجھے بے وقوف سمجھتا ہے ۔ فائر سٹاپ ۔“ اس نے مڑ کر دشمن کے مورچوں پر دوربین لگائی ۔ ”زاویہ نمبر ۴۲ ۔ جنوب مشرق ۔ فائر ۔“

نالیاں اونچی ہوئیں اور خوفناک تڑ تڑاہٹ کے ساتھ گولیوں کی دوسری بوچھاڑ نکلی ۔ اب مٹی عین دشمن خندقوں سے اڑی اور چمکتے ہوئے سیاہ خودوں کی قطار بکلیخت غائب ہو گئی ۔ صرف ایک جگہ سے دو بازو ہوا میں اٹھے اور ایک سپاہی زبردست جھٹکے کے ساتھ خندق سے باہر جا پڑا ۔ دوسری بوچھاڑ سے وہ دس گز لڑھکتا ہوا چلا گیا اور ہموار زمین پر جا کر گرے ہوئے پائن کے بے جان تنے کی طرح ساکن ہو گیا ۔

”شلباش ۔“ ٹھاکر داس چیچا : ”فائر ۔“

نعیم کے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی ۔ ایک نامعلوم سی مسرت اور پھرتی کے ساتھ اس نے لبلبی پر اٹھکی کا دباؤ بڑھا دیا ۔

”پیٹی لگاؤ ۔“ وہ چیچا ۔

”گنوں کو گرم مت کرو۔ وقفہ دو۔ شاباش۔ پکھلنے مت دو مشین گن تمہارا بہترین ساتھی ہے۔“

کیپٹن ڈل دور بین میں دیکھتا ہوا بول رہا تھا۔

رائفل اور مشین گن کی گولیاں ہوا کو چیر رہی تھیں۔ فضا میں بارود اور گرد کی دھند لہٹ پھیل گئی تھی اور سورج مردہ جرمن سپاہی کے خود پر چمک رہا تھا۔

سورج ڈھلنے لگا تو عقب سے توپ خانے نے رپید فائر (Rapid Fire) شروع کر دیا۔ دشمن کا فائر چند منٹ کے لیے رک گیا۔ کیپٹن ڈل نے دور بین میں دیکھا اور حکم دیا :
”کمپنی ایڈوانس۔“

دو سپاہیوں نے خندق پر چڑھ کر مشین گن باہر نکالی، تیسرے کو ٹھاکر داس نے ٹانگیں پکڑائیں۔ نعیم کے سپاہیوں نے اپنی مشین اٹھائی اور جھکے جھکے دوڑتے ہوئے آگے بڑھے۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ ’ساں‘ کر کے ان کے خودوں پر سے گزری۔ ٹھاکر داس کے ایک سپاہی نے بازو ہوا میں پھینکے اور پنجوں پر اٹھ کر تیز چکر میں گھوما۔ پھر وہ دھپ سے کیلی زمین پر گرا اور آواز نکالے بغیر مر گیا۔ ساری کی ساری کمپنی منہ کے بل زمین پر آ رہی۔ گولیوں کی دوسری بوچھاڑ آئی۔ تیسری ان کے جسموں سے دوایچ اوپر سیٹیاں بجاتی ہوئی گزری۔ انتہائی دہشت کے مارے پہلے انہوں نے چھوٹے چھوٹے پتھروں کے پیچھے سر چھپانے کی سعی کی، پھر زمین میں سر گاڑے، لیکن دشمن کے صحیح اور بھاری فائر کے سامنے انہیں پسپا ہونا پڑا۔ مٹی اور کنکر ان کے تھنوں میں گھس رہے تھے اور وہ زخمی سانپوں کی طرح لیٹے لیٹے اٹے پاؤں رینگ رہے تھے۔ خندق سے پانچ گز کے فاصلے پر نعیم کا ایک آدمی گولی کے زبردست دھکے سے کمائی کی طرح سیدھا پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور لٹو کی طرح تیزی سے گھومتا ہوا خندق میں جا گرا۔ ایک گولی مشین گن پر لگی اور میگزین کو، جس سے نعیم اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھا، تباہ کر دیا۔

خندق میں پہنچ کر انہوں نے مشین گنیں نصب کیں اور پیٹیاں چڑھا کر کیپٹن ڈل کی تیز، غصیلی آواز کے مطابق فائر کھول دیا۔ زخمی سپاہی دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو پکڑے گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ ”پانی۔“ اس نے خوفناک، غیر انسانی آواز میں کہا اور جھک گیا۔ اس کا سر زمین کو جا لگا اور سجدے کی حالت میں پڑا وہ کمزور، مردہ آواز میں کراہنے لگا۔ دو سپاہیوں نے اسے سیدھا لٹایا اور چھاکل منہ کے ساتھ لگائی۔ بمشکل ایک گھونٹ اس کے حلق سے اترا، باقی پانی باچھوں میں سے بہنے لگا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ بد نما ہو گیا تھا اور آنکھوں میں موت کا خوف لیے لیے وہ ٹکٹکی باندھے آسمان کو تک رہا تھا۔ جیب نعیم نے آخری بار اسے دیکھا تو وہ آنکھوں سے پیٹ کی طرف اشارہ کر رہا تھا، جسے ابھی تک اس کے خون آلود ہاتھ جکڑے ہوئے

تھے۔

حملے کے مقتولین کی فہرست : دو جوان ، ایک مشین گن ۔
 کیپٹن ونسنٹ کی کمان میں جو کمپنی تھی اس کا ایک حصہ راستہ بھول گیا اور نمبر ۲ کمپنی کے دائیں بازو پر آٹکلا ۔ شام کے وقت کیپٹن نے مدد مانگی اور نمبر ۴ کمپنی دو پلاٹون اسے بھیجی گئیں ۔ کمک پہنچنے سے پہلے اس کے سر میں گولی لگی اور وہ گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا مر گیا ۔
 دائیں بازو کی طرف زیادہ اہم واقعات کے پیش نظر ڈویژن کو توڑنا ناگزیر ہو گیا تھا ۔ اگلی صبح رجمنٹ وہاں سے ہٹا کر ہولی میک کے شمال میں پوزیشن پر بھیجی گئی ۔ شام کو دو کمپنیاں پھر اسی محاذ پر اسے اور بی خندقوں میں واپس بلا لی گئیں ۔ دو دن تک وہ اسی طرح لڑتے رہے ۔ جانی نقصان زیادہ ہوتا گیا دو دن میں ایک تہائی توپخانہ تباہ ہو گیا ۔ پرانی چھ انچ کی ہوٹزر توپیں اتنا ہی مقابلہ کر سکتی تھیں ۔ اس حالت میں انہیں جرمن حملے کا سامنا کرنا پڑا ۔

سیکنڈ بیوریمن کارپس بھاری کورنگ فائر (Covering Fire) کے نیچے اس سیکشن پر جمع ہو رہی تھی جہاں پر تھرڈ کیولری بریگیڈ کا مورچہ تھا ۔ یہ جگہ سیکنڈ کیولری ڈویژن کے بائیں بازو پر تھی ۔ نمبر ۱۲۹ کی دو کمپنیاں اگلی صفوں میں تھیں اور 5th اور 16th لانسرز کو صبح سات بجے ان سے مورچہ سنبھالنا تھا ۔ جب کہ نمبر ۱ کمپنی نے نمبر ۳ کمپنی کی خندقیں ابھی ابھی لی تھیں اور نمبر ۲ کمپنی ریزرو میں تھی ۔ چنانچہ اس وقت دشمن کے حملے نے بے ترتیبی میں اضافہ کر دیا اور نمبر ۳ کمپنی کو بھاری توپ خانے کے فائر کے سامنے پسپا ہو کر جنگل میں ایک فارم کے پیچھے پناہ لینا پڑی ۔

کیپٹن ڈل کی کمپنی ابھی تک مورچہ سنبھالے ہوئے تھی ۔ ان کے آدھے جوان ختم ہو چکے تھے اور باقی تیزی سے ختم ہو رہے تھے ۔ دشمن کی میٹریاں بری طرح گولہ باری کر رہی تھیں ۔ سیکشن کمانڈر دیر ہوئی آخری چکر لگا کر پیچھے جا چکا تھا ۔ خندقیں آدھی سے زیادہ ٹوٹ چکی تھیں اور دشمن کی بگ برتھا اور دوسری توپوں کے جواب میں انکی آرٹلری کے پاس پرانی اور چھوٹی چھ انچ دھانے کی توپیں تھیں ۔ دشمن کی صفیں تیزی سے بڑھ رہی تھیں اور غیر مانوس وردیوں والے سپاہی پانچ سو گز کے فاصلے پر حرکت کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے ۔ نمبر ۱۲۹ رجمنٹ کی خندقوں میں چھ مشین گنیں تھیں اور ابھی تک تمام چل رہی تھیں ۔

اندھیرا ہونے میں ابھی دو گھنٹے تھے اور ڈھلتے ہوئے سورج کی دھوپ گرد اور بارود کی وجہ سے زرد مٹیالے رنگ کی ہو گئی تھی ۔ گزشتہ رات کی گری ہوئی برف پر چلنے والی تیز سرد ہوا کے ساتھ خون اور بارود کی بو اور زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں سب طرف پھیل رہی تھیں ۔ بھاری آرٹلری فائر کی خوف ناک ، مسلسل آواز سے سپاہیوں کے کان پک گئے تھے اور دن رات کی گولہ باری سے وہ سست اور یزار ہو چکے تھے ۔

”پیٹی لگاؤ۔“ ٹھاکر داس چیخا۔ دو سپاہیوں نے تیزی سے آخری پیٹی بھرنا ختم کی اور میگنیزیم میں فٹ کرنے لگے۔

”بس؟“ ٹھاکر داس نے تشویش سے خالی پیٹیوں کے ڈھیر کو دیکھا۔

”رحم دین لینے گیا ہے۔“

”ابھی تک نہیں لوٹا؟“

”نہیں۔“

”تم جاؤ۔“

ریاض نے ہچکچاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

”جاؤ۔ ایک گن رہ گئی ہے۔ چوہے کی طرح مرنا چاہتے ہو؟“

وہ پیٹ کے بل باہر نکل گیا۔

ٹھاکر داس اور نعیم نے مشین گن کی نالی کے اوپر سے آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی دشمن کی صف کو دیکھا اور ان کی پشت پر خوف کی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ جھک کر چلتے ہوئے وہ دوسری مشین تک گئے۔ اس میں آدھی چلی ہوئی پیٹی لگی تھی اور ”ٹرائی پاڈ“ کے پاس چھ غلیظ، بد نما چہروں والے سپاہی مرے پڑے تھے۔ ٹھاکر داس نے لبلبی کو دبا کر دیکھا۔

”جام ہو گیا۔ ایک انچ نہیں ہلتا۔“

”ایک انچ تو کبھی بھی نہیں ہلتا۔“

”مذاق مت کرو۔“

اسی طرح چلتے ہوئے وہ اپنی جگہ پر لوٹ آئے۔

”ہم اسے نہیں لگا سکتے؟“ نعیم نے ادھ چلی پیٹی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ نہیں لگ سکتی۔ تمہیں پتہ نہیں؟ ایم۔ جی۔ کا تمہیں کیا پتہ ہے؟“

”پتہ ہے۔“

”پھر۔“

”یونہی پوچھا ہے۔“

ٹھاکر داس ایک خالی پیٹی اٹھا کر پھاڑنے لگا۔

ایک گولہ خندق سے تیس گز کے فاصلے پر گرا اور ڈائنامٹ سے ریاض اڑی ہوئی مچھلی کی طرح پلٹ کر گرا اور چت ہو گیا۔ ان دونوں نے کھڑے کھڑے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ دوسرا گولہ ان کے منہ کے آگے تین فٹ پر آگر پڑا اور مٹی کی اڑتی ہوئی دیوار نے ٹھاکر داس کو پاؤں

پر سے اٹھا کر چار فٹ دور پھینک دیا۔ سرد، گیلی مٹی اس کے منہ، ناک اور آنکھوں میں بھر گئی۔ چند سیکنڈ تک وہ سن پڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ اٹھا، اٹھکی پھیر کر حلق صاف کیا، ناک سنکی اور آنکھیں مل کر کھولیں۔ نعیم اپنی جگہ پر مبہوت کھڑا تھا۔

”کیا حال ہے؟“ ٹھاکر داس نے پوچھا۔

”مجھے کچھ نہیں ہوا۔“

”مجھے بھی کچھ نہیں ہوا۔ میں نے کئی بار مٹی چکھی ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”مگر ناک میں یہ تکلیف دیتی ہے بھینچو۔“ اس نے اٹھکیوں سے دبا کر ناک صاف کی اور لاپرواہی سے گولے کے بنائے ہوئے بارہ فٹ گول گڑھے کو دیکھتے ہوئے گھٹی آواز میں بولا: ”حیرت کی بات ہے۔ میدان جنگ میں بارود بعض دفعہ عجیب سلوک کرتا ہے۔“

”خندق تباہ ہو گئی۔“ نعیم نے بے زاری سے کہا۔

تیسرا گولہ ذرا دور آگر گرا اور باریک مٹی کی بارش نے انہیں ڈھک دیا۔

”سور۔ بیٹھنے بھی نہ دیں گے۔“ ٹھاکر داس نے کاہلی سے بڑھ کر مشین گن اٹھائی اور

مردہ سپاہیوں کے ڈھیر کے پاس جا کر رکھ دی۔

”بارود نہیں آئے گا۔ ریاض بھی گیا۔“ اس نے آنکھوں کے کونوں میں سے نعیم کو

دیکھا۔

نعیم نے رائفل کا سلنگ کندھے پر جمایا اور اچک کر باہر نکل آیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور اس کے اوپر گولیوں کی چھت بنی ہوئی تھی۔ وہ گھٹنوں اور کہنیوں کی مدد سے آگے بڑھنے لگا۔ ریاض چھ فٹ گہرے گڑھے میں بازو اور ٹانگیں پھیلائے لمبا لمبا چت پڑا تھا۔ اس کی زرد ہتھیلیاں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں، پیٹ کھل گیا تھا اور باہر لٹکتے ہوئے اسٹریوں کے ڈھیر میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ نعیم نے رک کر جھانکا گڑھے میں سے تازہ مٹی، بارود اور اسٹریوں کی بھاپ کی ملی جلی بو آ رہی تھی۔ جاتے جاتے آخری بار مڑ کر اس نے اس کے خوفناک طور پر اینٹھے ہوئے چہرے کو دیکھا جس کی ٹھوڑی، جبرے کی ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے، اوپر اٹھ آئی تھی۔ وہاں سے بیس قدم کے فاصلے پر رحم دین پڑا تھا۔ گولی اس کی گردن میں لگی تھی اور خون بہہ بہہ کر اس گڑھے میں جمع ہو رہا تھا جو اس کے سر رگڑنے سے زمین میں بن گیا تھا۔ وہ ابھی تک زمین میں آہستہ آہستہ ایڑیاں مار رہا تھا۔ نعیم نے کندھے سے پکڑ کر اسے سیدھا لٹا دیا۔ موت کا سایہ زرد، بے جان چہرے پر لہرا رہا تھا، لیکن وہ بالکل درست حالت میں تھا اور اس پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر کسی کو خیال نہ آسکتا تھا کہ یہ شخص مر رہا ہے۔ نعیم نے کان لگا کر سنا۔ وہ باریک، کمزور آواز میں کہہ رہا تھا: ”لے چلو۔ چھوڑ کے نہ جاؤ۔ آ۔ آ۔ آ۔ بھائی۔“ وہ کروٹ پر ہو گیا اور تیزی سے ایڑیاں رگڑنے لگا۔ ”چھوڑ

کے نہ جاؤ۔ بھائی۔ آ۔ اس نے زبان نکال کر شبہنم آلود گھاس کو چاٹا۔
 نعیم کا جی متلانے لگا۔ اس نے برف کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا اور اسے چوستا ہوا
 آگے روانہ ہوا۔

جنگل کی اوٹ میں اس پھونس کے جھونپڑے کے اندر تین سپاہی تیزی سے پیٹیاں بھر
 رہے تھے۔ ایک طرف گولیوں کے کرپٹ اور دوسری طرف خالی پیٹیاں رکھی تھیں۔ وہ آہستہ
 آہستہ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ نعیم دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ جھونپڑا پائین کے تنوں پر
 کھڑا تھا اور چھت سے گھاس کی داڑھیاں لٹک رہی تھیں۔ اندر کیلی گھاس اور مٹی کے تیل کی بو
 پھیلی ہوئی تھی۔ آہٹ سن کر تینوں سپاہیوں نے رائفلیں اٹھائیں اور گھٹنوں پر کھڑے ہو
 گئے۔

”فرینڈ۔“ نعیم نے کہا۔ ”پیٹیاں تیار ہیں؟“
 ”شلباش۔“

اس نے تین پیٹیاں اٹھا کر کندھے پر ڈالیں اور باہر نکل یا۔
 جب وہ خندقوں کے قریب پہنچا تو تین مشینیں خاموش ہو چکی تھیں۔ ان کے پاس سے
 گزرتے ہوئے اس نے پکارا: ”فرینڈز۔ بارود؟“
 اسے کوئی جواب نہ ملا۔ صرف ایک کے پاس سے آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔
 ”فرینڈ۔ فرینڈ، آؤ۔“

”بارود؟“ اس نے پھر پوچھا۔

چوتھی مشین جو چل رہی تھی اس پر ایک سپاہی بیٹھا تھا۔ وہ مڑے بغیر برہمی سے بولا:
 ”اپنے مورچے پر جاؤ ہمارے اندر کافی بارود پہنچ چکا ہے۔“
 چاند کی روشنی سارے میں پھیل چکی تھی۔ مشین میں پیٹی لگاتے لگاتے نعیم نے چونک
 کر اوپر دیکھا۔ ”یہ آگئے۔“

”کون؟“ ٹھاکر داس نے سرا سیمگی سے پوچھا۔

تین سو گز پر وہ رائفلیں ہاتھوں میں اٹھائے تیزی سے دوڑے چلے آ رہے تھے۔
 ”سور۔“ ٹھاکر داس دانت پیس کر چیخا اور لبلبی پر اٹھکی رکھ دی۔ گولیوں کی بارش
 صحیح مقام پر ہوئی۔ چاند کی روشنی میں ایک سپاہی بازو پھیلا کر اوندھے منہ گرا اور سیاہ جسم دور
 تک لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ ساری لائن نے سر کے بل زمین پر گر کر فائر کھول دیا۔
 ”جاؤ۔ اور پیٹیاں۔“ ٹھاکر داس نے رک رک کر فائر کرتے ہوئے کہا۔
 نعیم ایک لحظے کو ہچکچایا، پھر اچک کر خندق سے باہر نکل آیا۔ چند گز کے فاصلے پر جا کر
 وہ اچانک ٹھہر گیا اور کمال زمین پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر مڑا۔

”حوالدار -“ اس نے پکار کر کہا -

”کیا ہے؟“

”حوالدار ، ہمیں - ری ٹریٹ نہیں کرنا چاہیے؟“

ٹھاکر داس لبلبی پر اٹھکی رکھے مڑا - ”ہائیں؟ کیا کہا؟ یہ تمہارا گھر ہے - یہ سنا؟ بھول جاؤ کہ تم واپس بھی جا سکتے ہو - بھول جاؤ - جاؤ -“

نعیم نے دل میں اسے کالی دی اور آہستہ آہستہ رینگنے لگا پیٹھ پر سے گزرتی ہوئی گولیوں کی ہوا اس نے گردن پر محسوس کی -

جھونپڑے میں سے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی - اونچی ، بچوں کی سی بے ساختہ ہنسی وہ آہستہ سے دروازے میں جا کھڑا ہوا - سامنے بیٹھا ہوا سپاہی سر پیچھے پھینک کر ہنس رہا تھا - اس کی گردن کی رگیں پھول گئی تھیں اور لمبے پٹے پشت پر لٹک رہے تھے - تھوڑی دیر کے لیے نعیم کا جی چلایا کہ وہ اسی طرح ہنستا رہے ، بار بار ہنسنے -

ہنسنے والے نے اسے دیکھا - ”لانس نائک ، تم ابھی زندہ ہو؟ تمہاری مشینیں تو ساری خاموش ہو چکیں؟“ وہ لاپرواہی سے بولا -

”اتنے خوش کیوں ہو رہے ہو؟“ نعیم نے تلخی سے کہا اور پیٹھیاں اٹھانے کو جھکا -

”یہ ہمیں اپنے میل کا قصہ سنا رہا تھا جو لوگوں کی کائیں اغوا کر کے لایا کرتا تھا -“

”فضول قصے بند کرو - وہ سر پر چڑھ آئے ہیں -“

تینوں سپاہیوں کے چہرے منجمد ہو گئے -

”ہمیں پتہ ہے - پتہ ہے -“ ہنسنے والے نے گولیوں کا کریٹ اوندھا کرتے ہوئے سختی سے کہا - پھر یکلخت وہ مڑا اور پوری آواز سے چلایا : ”اور اب بھی ہم باتیں نہیں کر سکتے؟ اب بھی؟ ہمارے ہاتھ پک گئے ہیں - دیکھو - دیکھو - ہم ایسے ہی مرجائیں گے؟“

دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلائے وہ پاگلوں کی طرح سب کو دیکھ رہا تھا - نعیم نے نظریں چرا کر پیٹھوں کا وزن ایک جھٹکے سے کندھے پر برابر کیا اور باہر اندھیرے میں نکل آیا -

گولیوں کی زد میں پہنچ کر وہ پیٹ کے بل ہو گیا - چھ کی چھ مشینیں خاموش تھیں -

اپنے پیچھے اسے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی - اس نے رک کر دیکھا - ایک گولہ جھونپڑے پر

اگر گرا تھا جس سے وہ بیچ میں سے دو ٹکڑے ہو گیا تھا اور دھڑادھڑا جل رہا تھا - سانس روکے وہ

انتظار کرتا رہا - کوئی متنفس باہر نکلتا دکھائی نہ دیا - پھر ایک زبردست دھماکے سے بارود کے

کریٹ پھٹے اور پائین کے جلتے ہوئے تے دور دور تک اڑ گئے - شمال کی طرف سے چلنے والی ہوا

نے جلتے ہوئے انسانی گوشت کی بوسارے میں پھیلا دی - نعیم کے سینے میں ایک بھاری ، بد مزہ

سی شے کلبلائی اور اس نے دھیرے دھیرے بے دلی سے ریگنا شروع کر دیا۔

چاند کی روشنی میں چمکتا ہوا ٹھاکر داس کا خود اس نے دور سے دیکھ لیا، ساتھ ہی اس کی پتلی، تیز سیٹی کی آواز اس کے کان میں آئی دشمن کی طرف سے گولیاں آنا بند ہو گئی تھیں۔ صرف آرٹلری دونوں جانب سے مصروف تھی۔ وہ خندق سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جب اس نے جرمنوں کی پوری لائن کو دو سو گز پر تیزی سے اٹھتے اور چڑھائی کرتے ہوئے دیکھا۔

”پیٹیاں لے آئے؟“ دشمن سے بے خبر ٹھاکر داس نے پوچھا۔

خندق سے صرف دو لمحے کا فاصلہ تھا۔ نعیم نے بڑھنا چاہا لیکن جلتی ہوئی نفرت اور حسد

کا جذبہ غالب آ گیا۔

”نعیم۔ تم زخمی ہو؟“

وہ خاموش پڑا رہا۔ ٹھاکر داس اچک کر باہر نکلا اور اس کی طرف دوڑا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ ہوئی۔ ٹھاکر داس کے دونوں پاؤں زمین سے اٹھ گئے اور وہ ہوا میں ایک لمبی جست لے کر زمین پر گرا اور لوٹتا ہوا زور سے اس کے ساتھ آنکرایا۔

”آ آ۔ آ۔“ مردہ، غیر انسانی آواز اس کے دانتوں کے بیچ سے نکلی اور وہ بے جان ہو کر سیدھا لیٹ گیا۔ خون کی ایک پتلی سی دھار نکل کر اس کی داڑھی میں جذب ہونے لگی۔ چاند اس کے سنے ہوئے غلیظ چہرے پر چمک رہا تھا۔

ایک لمحہ انتظار کیے بغیر مڑا اور پیٹ کے بل سانپ کی سی تیزی سے پیچھے جھپٹا۔ جرمنوں نے خندق پر گولیاں برسائیں اور قبضہ کر لیا۔

زد سے باہر آکر وہ اٹھا اور پوری قوت سے بھاگنے لگا۔ آگے ان کی میٹریاں کورنگ فائر دے رہی تھیں۔ اس نے فرسٹ ایڈ کے تھیلے سے سفید پٹی نکالی اور زور زور سے سر کے گرد گھمانے لگا۔ آفیسر نے فائر روکنے کا حکم دیا۔ میٹری کے ایک گھوڑے کے سینے سے خون بہہ رہا تھا اور چار سپاہی اسے تھامے ہوئے کھڑے تھے۔

”فرینڈز۔“ قریب پہنچ کر نعیم چلایا۔ ”لانس نائک نعیم احمد خاں نمبر ۱۲۹ بلوچ۔ مشین گن ڈی ٹیچمنٹ۔ سیکشن نمبر ۰۰۰۔“

”لانس نائک۔ بولو۔“

”مورچے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا ہے۔ سب جوان ختم ہو گئے ہیں مشینیں دشمنوں کے ہاتھ میں ہیں۔“

چاند کی روشنی میں آفیسر نے لرزاں آنکلیوں سے سفید ماتھے کو چھوا۔ ”ایڈجوٹنٹ کو رپورٹ کرو۔“ اس نے کہا۔

نعیم نے میٹری پار کی تو فائر پھر شروع ہو گیا۔ اس نے رک کر میٹریوں کے اوپر سے

میدان جنگ کو اور جلے ہوئے جھونپڑے کو دیکھا۔ دھندلی، زرد رات میں بارود کا دھواں اور منجمد ہوا کی دھند آہستہ آہستہ جنوب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کی عمارت کی طرف چلا گیا۔

(۱۰)

وہ ایک سال تک بلجیئم اور فرانس کے علاقوں میں لڑتے رہے۔ نعیم بیسیوں حملوں میں شریک ہوا جن میں وہ کامیاب ہوئے اور بیسیوں جن میں انہیں شکست اٹھانا پڑی۔ جنگ میں وہ خوش قسمت رہا۔ صرف ایک گولی اس کی چھوٹی اٹھلی سے رپٹی ہوئی گزر گئی۔ اس کے علاوہ اور کوئی سکہ اس کے جسم سے نہ ٹکرایا۔ اپنے مورچوں میں اور دشمن کے مورچوں میں اس نے ہزاروں سپاہی مرتے ہوئے دیکھے۔ کسی کو آسانی کے ساتھ کسی کو اینٹھ کر مرتے ہوئے۔ کسی کے چہرے پر سفیدی اور معصومیت ہوتی، کسی پر موت کی نیلاہٹ اور تکلیف۔ کسی کی آنکھیں زندہ آدمی کی طرح جھانکتی ہوتیں، کسی کی اندھے شیشوں کی مانند ماتھے میں جڑی ہوتیں۔ کسی کی جیب میں خشک راشن اور چند گولیاں ہوتیں، کسی کے پاس بچوں اور خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں، اور ان کس سیاہ بالوں کے کچھے بطور نشانی کے ہوتے۔ اور ڈائریاں! وہ سب پتھروں پر، خندقوں میں، خشک جوہڑوں میں، برف پر، کپچڑ میں مرے پڑے ہوتے۔ وقت ہوتا تو نعیم کسی نوجوان، پرسکون چہرے کے پاس رکتا، جیسے ٹٹول کر تصویریں اور خط نکالتا، ان عورتوں کا خیال کرتا جو گاؤں کے باہر جوہڑ کے کنارے کھڑی کھڑی اپنے محبوب چہروں کے لیے ترس گئی ہیں اور نہیں جانتیں کہ ان کے عزیز، خوبصورت ہونٹ سرد کر دیے گئے ہیں اور جسم، جنہوں نے بے پناہ خوشی کی راتیں انہیں بخشیں ہزاروں میل دور خاک میں بکھرے پڑے ہیں اور بے کار انتظار کرتی ہیں، ان کھیتوں کے بارے میں سوچتا جو نوجوان ہاتھوں کے بغیر ویران ہو گئے ہیں۔ اور آگے بڑھ جاتا، بھول جاتا۔ وہ اب ان باتوں سے بے اثر ہو چلا تھا۔ اس کے باوجود اس تمام عرصے میں ایک خوف ناک بوجھ اس کے دل پر سوار رہا۔ یہ ٹھاکر داس تمام عرصے میں ایک خوف ناک بوجھ اس کے دل پر سوار رہا یہ ٹھاکر داس کا خیال تھا، دردناک احساس جرم۔ گو بعد میں اگر وہ بہت کچھ سنبھل گیا لیکن کبھی کبھی پورے چاند کی رات میں، خندق میں بیٹھے ہوئے، کسی حملے کے دوران، ٹھاکر داس کا بھوت اس کے قریب آکر کھڑا ہوتا: ”اپنی خندق میں کسی کو مت مارو۔ میدان جنگ کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔“ وہ اس خیال سے ہی خوف زدہ ہو جاتا۔ بڑی مشکل سے وہ ہتھوڑوں کی طرح پڑتے ہوئے الفاظ کو ذہن میں سے نکال پھینکنے میں کامیاب ہوتا۔ اس کے بعد کئی روز تک اس کے دماغ میں اُلو بولتے رہتے۔

سال کے وسط میں رجمنٹ کے مشرقی افریقہ جانے کے احکام صادر ہوئے اور ماہ جولائی کے ایک خوش گوار دن وہ واپس ماریسلز پہنچے۔ اگلے روز ان کو جہاز پکڑنا تھا۔ ماریسلز پر وہ دن اسی طرح خوش گوار اور چمک دار گزرا تھا۔ نعیم سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ لوگوں کے چہرے تروتازہ اور مسرور تھے۔ عورتیں بڑے گھیر والے خوش رنگ لباس اور بچے سفید نیکریں پہنے پٹریوں پر آ جا رہے تھے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا، مگر ہوٹلوں پر بھیڑ لگ چکی تھی اور ان کے رنگ برنگ شیشوں والے دروازوں پر روشنیاں جل رہی تھیں۔ مرد بڑے بڑے ہیٹ، کھلی قمیضیں اور تنگ پتلونیں پہنے کھڑے باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ عقب سے ایک دو گھوڑوں والی بکھی سڑک پر بگٹٹ بھاگتی ہوئی آئی عورتوں نے ٹھٹک کر اپنے بچوں کو مضبوطی سے پکڑ لینا اور مرد راستہ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ بکھی سبزی کے ٹوکروں سے لدی تھی اور ان پر ایک بوڑھا کسان چھاج سا ہیٹ پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے نوجوان لڑکے کے ہاتھ میں باگیں تھیں۔ گھوڑے سترست اور منہ زور تھے اور ان کے نعلوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ چند قدم پر جا کر ڈھلوان سڑک پر ایک گھوڑے کے پاؤں پھسلے اور وہ چاروں ٹانگیں پھیلا کر پیٹ کے بل کٹی گز تک پھسلتا چلا گیا۔ راہ گیر ٹھٹک کر رک گئے چند عورتوں کی ہلکی ہلکی چیخوں کی آواز بلند ہوئی۔ کسان کا لڑکا نیچے اتر کر گھوڑے کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ چند راہ گیر کسان رک کر اس کی مدد کرنے لگے۔ بوڑھا کسان سڑک پر بکھرے ہوئے چقندر چن چن کر ٹوکروں میں ڈال رہا تھا۔ گھوڑے کے تنھنے پھولے ہوئے تھے اور اس کی گرم، نم دار سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

اچانک ہجوم کے اوپر نعیم کو ایک بھاری، مانوس جسم دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ وہ جسم ایک سکھ سپاہی کا تھا جو کندھے ڈھلکائے، جھولتا ہوا پٹری پر چلا جا رہا تھا۔ اس کی وردی میلی اور شکن آلود تھی اور سپاہی کے پچائے وہ جیل سے بھاگا ہوا قیدی معلوم ہوتا تھا۔ چند قدم اس کے پیچھے پیچھے چلنے کے بعد نعیم نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ سکھ سپاہی نے پلٹ کر دیکھا۔ چند سیکنڈ تک وہ اپنی سوئی سوئی، بے حس آنکھوں سے نعیم کو تکتا رہا، پھر کسان فوجیوں کے مخصوص انداز میں بولا:

”نعیم۔ تم ابھی زندہ ہو؟“

”مہندر سنگھ۔“ نعیم نے صرف اتنا کہا۔ وہ دیر تک گرجوشی سے مصافحہ کرتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے رہے۔

”رجمنٹ سے بھاگ آئے ہو؟“ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نعیم نے تسخیر سے

پوچھا۔

”نہیں۔“

”تم نے کتنے عرصے سے داڑھی صاف نہیں کی؟“

”ہم محاذ سے لوٹ رہے ہیں۔“

”رجمنٹ؟“

”نمبر ۹ ہیڈ سن ہارس۔ انبالہ بریگیڈ۔“

”میں نمبر ۱۲۹ بلوچ میں ہوں۔ فیروز پور بریگیڈ۔ تم کس محاذ پر تھے؟“

”ادھر۔“ مہندر سنگھ نے بازو سے شمال اور مغرب میں غیر واضح سا اشارہ کیا۔
”کس سے؟“

”پہلے ترکوں سے۔ پھر جرمنوں سے۔“

وہ سڑک کے کنارے چلتے رہے۔ پٹری پر چلتے ہوئے بچے عجیب و غریب سکھ سپاہی کو
دیکھنے کے لیے رک جاتے۔

”کھانا کھاؤ گئے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”کہاں؟“

”ہوٹل میں۔“

مہندر سنگھ نے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی اور داڑھی کھجا کر ہنسا۔ نعیم نے آنکھیں سکیڑ
کر اس کے سارے چہرے کا جائزہ لیا۔ یہ کھوکھلی اور بے جان ہنسی تھی۔ وہ جس سے نعیم
اس قدر واقف، اس قدر مانوس تھا۔ اس سے اتنی مختلف تھی۔

”میں رجمنٹ کو جا رہا ہوں۔“ مہندر سنگھ نے کہا۔ ”چلو وہاں بیٹھیں گے۔ پاس ہی
ایک بڑی اچھی جگہ ہے۔“ وہ خاموشی سے چلتے ہوئے آبادی سے باہر نکل آئے۔ سورج غروب
ہو رہا تھا اور سرخی مایل زرد، کمزور دھوپ اونچے نیچے ٹیلوں، درختوں اور چھوٹے چھوٹے کنکروں
پر سے کھینچتی ہوئی مغرب میں سمٹی جا رہی تھی۔

”تم بہت بدل گئے ہو۔“ نعیم نے بوٹ کی ٹھوکر سے چند کنکر اڑاتے ہوئے آنکھوں کے
کونوں میں سے مہندر سنگھ کو دیکھا۔ اس نے سڑک پر گرے ہوئے گھوڑے کی طرح پھنکار کے
ساتھ سانس چھوڑا۔ ”میں؟ اوہ۔ نہیں۔ اتنی دیر کے بعد محاذ سے لوٹا ہوں۔ تھک گیا
ہوں۔ آج نہاؤں کا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ دوبارہ کھوکھلی آواز سے ہنسا۔

”میرا خیال تھا جنگ تمہیں کچھ نہ کہے گی۔“ نعیم نے کہا۔ وہ خاموش رہا۔

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں وہ ایک قبرستان کی چار دیواری میں داخل ہوئے۔
چاروں طرف سیمنٹ اور اینٹوں کی قبریں تھیں اور اونچے اونچے کتبے، جن پر فرانسیسی زبان میں
یادگاریں درج تھیں۔ سرخ اینٹوں کی دو سنگ پٹریاں قبرستان کے درمیان میں ایک دوسری کو

کاٹتی تھیں۔ دونوں جانب خوبانی کے درخت تھے جو سفید پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ سرخ راستوں پر ابھی ابھی کوئی جھاڑو دے کر گیا تھا۔

”پچھلے مہینے رمضان روشن پور سے بھرتی ہو کر آیا تھا۔“ مہندر سنگھ سر جھکا کر چلتے ہوئے

بولتا۔

”کیا سناتا تھا۔“

”اے۔ کچھ نہیں۔“

”روشن پور کی کوئی بات۔“

”اس سال سیلاب آیا تھا۔ دریا نے بڑی تباہی کی۔ ساونی زیادہ تر تباہ ہو گئی۔“ اس نے چلتے چلتے ایک سفید پھول توڑ کر سونگھا۔ ”پھر جانوروں میں وبا پھیل گئی۔ خصوصاً ’موکھ‘ سے بہت جانور مرے۔ لیکن میری جوڑی جو گندر سنگھ نے پہلے ہی بیچ دی تھی۔ گھوڑی اور بھینس وبا میں مر گئیں۔ نیاز بیگ خوش قسمت رہا۔ اس نے سارے جانور بیماری سے پہلے بیچ دیے تھے۔ اس کی فصل بھی بیچ گئی۔“

”رمضان کا کوٹھا بارشوں میں گر گیا اور اناج سارا بہہ گیا تو وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ کرم سنگھ بھٹی چلا گیا تھا۔ سنا ہے مل میں کام کرتا ہے۔ فقیر دین کی بہو بھاگ گئی ہے۔ اس کا لڑکا ہمارے ساتھ محاذ پر تھا، تیسرے مہینے میں مارا گیا۔ وہ اور کیا کرتی۔“

وہ دیر تک تاریک راستوں پر چلتے اور باتیں کرتے رہے۔ گاؤں کی باتیں کرنے سے مہندر سنگھ کی آنکھوں میں نامعلوم سی چمک آگئی تھی اور وہ اپنے پرانے، پھرتیلے انداز میں سنبھل کر چل رہا تھا۔

”ہمارے بعد پولیس بس دو ایک بار گاؤں میں آئی۔ پہلے چھ ماہ میں بہت سی لڑکیاں جاٹ نگر کے لونڈوں کے ساتھ بھاگ گئیں۔ اشتمال بھی ہوا۔ ہمارا جو کاکھیت تمہارے جوہڑ کے کھیت کے بدلے میں ہو گیا ہے۔ اچھا ہو گیا ہے نا؟ ایک جگہ پر سیائی کرنے سے بڑا بچاؤ رہتا ہے۔ ورنہ ایک سے دوسرے کھیت کا فاصلہ آدھے میل کا ہو تو جانور راست میں ہی رہ جاتا ہے۔ اشتمال میں سب کا فائدہ ہوتا ہے۔ ہمارا جو کاکھیت برا نہیں ہے۔ تمہارے کھیت سے اچھا ہی ہوگا۔ فکر نہ کرو۔ سب کا فائدہ ہوتا ہے۔“

گاؤں کی باتیں ختم ہو گئیں تو وہ خاموش ہو گئے۔ قبرستان میں تاریکی تھی، اور سکون وہ دونوں چپ چاپ، ہاتھ پیچھے باندھے، سر جھکائے سیدھے تاریک راستوں پر آتے اور جاتے رہے۔ کبھی کبھی چند خشک پتے اور پھل ہوا کے زور سے ٹوٹ کر اینٹوں پر آگرتے اور ان کے پاؤں تلے چرچرا کر ٹوٹ جاتے۔ کبھی وہ واپس آتے ہوئے پکا راستہ چھوڑ کر درختوں کے نیچے نیچے چلنے لگتے اور وہ پر اسرار آواز بڑھ جاتی۔ سیاہ تنوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے خوبانی

کی جھکی ہوئی شاخیں انکے چہروں سے ٹکراتیں اور سفید ، ہلکے پھول آدھی رات کی برف کی طرح اندھیرے میں آہستگی سے ان کے بالوں اور آنکھوں پر گرتے ۔ اندھیرے ، سایہ دار راستوں پر قبروں کے درمیان چپ چاپ چلتے ہوئے وہ پرانے زمانے کے دو بھوت معلوم ہو رہے تھے جنہوں نے رات کے مقررہ وقت پر اپنی اپنی قبروں سے نکل کر خاموشی سے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا تھا اور اب اپنے دوست درختوں ، خشک پتوں ، کتبوں اور سفید پھولوں کے درمیان پہل قدمی کر رہے تھے اور اپنے دلوں میں دوستی اور رفاقت کا وہ جذبہ محسوس کر رہے تھے جو ساہا سال کی ہمسائیگی کے بعد خود بخود پیدا ہو جاتا ہے ۔ نعیم نے رات کے اس سے کے ، قبرستان کے ، سفید پھولوں کے اور اپنے وجود کے اس اسرار کو بے حد واضح اور شدید طور پر محسوس کیا ۔ اسے لگا کہ ابھی کچھ دیر میں ، وقت مقررہ پر ، وہ اور اس کا رفیق بھوت خاموشی سے ایک دوسرے کو الوداع کہیں گے اور اپنی اپنی قبروں کو لوٹ جائیں گے ۔

”تم زخمی ہوئے تھے؟“ اس نے پوچھا ۔

”نہیں ۔“

”نہیں؟“ دفعتاً رک کر نعیم نے رات کی مدھم روشنی میں اس کے بھاری ڈھلکے ہوئے جسم اور اندھے شیشے کی سی مری ہوئی آنکھوں کو دیکھا ۔ ”پھر کیا ہے ۔ تم بیمار ہو؟ ایں؟“ مہندر سنگھ نے میزاری سے اسے دیکھا اور کندھے اچکا کر بولا : ”میں ٹھیک ہوں ۔“

”تم ٹھیک نہیں ہو ۔ مجھے تکلیف پہنچی ہے دیکھ کر ۔“

وہ بوڑھے ، شہ زور میل کی طرح نعیم کے ساتھ ساتھ چلتا رہا ۔

”دیکھو ، مہندر سنگھ ۔“ نعیم ایک تے پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ۔ ”تم میرے دوست ہو ۔ میں تمہاری بات سنوں گا ۔ مجھے بتاؤ تمہارے دل پر کیا ہے ۔ بتاؤ ۔ تم مجھے ایک مردہ آدمی کی طرح دکھائی دے رہے ہو ۔“

مہندر سنگھ نے بے تابی سے ادھر ادھر دیکھا ، کچھ کہنا چاہا لیکن رک گیا ، پھر بولنا چاہا اور رک گیا ۔ وہ اس گھوڑے کی طرح تھا جو چھٹی حس کی مدد سے چند قدم پر چھپے ہوئے خطرے کو پہچان کر سوار کے بار بار چلانے کے باوجود اپنی جگہ رہتا ہے ۔ اس نے ایک بار پھر بے چینی سے سارے جسم کو جنبش دی اور خفگی سے بولا : ”کیا پوچھتے ہو ۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ۔ محاذ پر بہت سے خون دیکھے ہیں ، صرف تھک گیا ہوں ۔ بہت زیادہ ۔“

وہ بھاری فوجی قدموں سے جا کر ایک بڑی سی قبر پر بیٹھ گیا ۔ اس کی رائفل کی دھات کے پتھر کے ساتھ ٹکرانے سے قبرستان کی خاموش فضا میں ایک ناخوشگوار آواز پیدا ہوئی ۔

”تم نے بہت خون کیے ہیں؟“ نعیم نے پوچھا ۔

”کیوں؟ تم نے نہیں کیے؟“

”میں نے؟“ اسے اس سوال کی توقع نہ تھی۔ ایک تیسرا بھوت دور قبرستان کے تاریک کونے میں سے ابھرا اور ان کی طرف بڑھنے لگا۔ اتہائی کوشش سے نعیم نے اس پر سے نظریں ہٹائیں اور مہندر سنگھ کے سیاہ، مہیب جسم کو دیکھنے لگا۔ وہ کمر جھکائے، قبر پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔

”لیکن میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ تم اتنے بدل جاؤ گے۔“ نعیم نے کہا۔

”کیوں۔ تم نے خون محسوس نہیں کیا؟ اپنے اندر، یہاں۔“ اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ ”کیا تم نے آسانی سے۔“

”لیکن، مہندر، تم اتنی آسانی سے قتل کر سکتے تھے۔ یاد ہے جب ہم۔؟“

”وہ اور بات تھی۔ ایک چوہا بھی اپنے بھائی کا اور اپنے خاندان کا بدلہ لے سکتا ہے۔ یہاں پر بالکل دوسری بات ہے۔“ وہ اندھیرے میں نعیم کی طرف جھکا۔ ”قتل۔ خون کا بدلہ خون۔ اس کے لیے ہمارا خون جوش مارتا ہے، ہم تیاری کرتے ہیں۔ مگر یہاں؟۔ جیسے سڑ کو یا نیل گائے کو مار دیا۔ بس مار دیا۔ لیکن اس کی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر ہم تگ آجاتے ہیں۔ تھک جاتے ہیں۔“ اس کی بھاری، بخار زدہ آواز سے نعیم کو اندازہ ہوا کہ وہ واقعی بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ اس نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔

”تمہیں پتہ ہے ہم کیوں لڑ رہے ہیں؟“ اچانک مہندر سنگھ نے پوچھا۔

”جرمنوں نے حملہ کیا ہے۔“

”کہاں؟ روشن پور پر؟“

”یہاں۔“

”پر ہم یہاں کیوں ہیں۔“ ہم“ کس لیے آئے؟“

”جرمن انگریزوں کے دشمن ہیں۔ اور انگریز ہمارے مالک ہیں۔ بس۔“

”ہمارے مالک روشن آفا ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں۔“

”انگریز روشن آفا کے مالک ہیں۔ چنانچہ۔“

”کل کتنے مالک ہیں۔ ایک دفعہ بتاؤ۔“ وہ ایک دم چڑ کر بولا۔ نعیم کے گلے میں کوئی

چیز اگر اٹک گئی۔ اس نے سگریٹ کا کش لیا اور فوراً دھواں اگل دیا۔ سگریٹ اس کی اٹھکیوں میں روشنی کی مدھم سی شعاع چھوڑتا ہوا جلتا رہا۔ رات کی سیاہی انہیں چاروں طرف سے ڈھانپنے ہوئے تھی اور بیچ میں خوبانی کے پھولوں کی سفیدی دبی دبی جگمگ رہی تھی۔ جیسے اندھیری رات میں برف گری ہوتی ہے۔

”ہم یا تو مر جائیں گے یا واپس چلے جائیں گے۔ یہاں پر کوئی نہ رہے گا۔ ہم اپنی

فصلیں کھیتوں میں چھوڑ کر اسی لیے آئے تھے کہ سینکڑوں آدمیوں کی جان لیں اور گندگی میں لوٹیں؟ مینڈک جو جاڑے آنے پر کپڑے میں گھس کر سو جاتا ہے؟ مجھے اپنے آپ سے بو آ رہی ہے۔ جوؤں نے میرے سر میں سوراخ کر دیے ہیں۔“ وہ کتے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”یقین کرو نعیم میں متگ آچکا ہوں۔ ایک گاؤں ہم نے فتح کیا۔ وہاں ایک عورت میرے ہاتھ لگی۔ چار گھنٹے تک وہ میرے پاس رہی لیکن ڈر کی وجہ سے میں نے اسے ہاتھ تک نہ لگایا۔ اتنی دیر سے میں نے دودھ نہیں پیا، سواری نہیں کی، نہایا بھی نہیں۔ میں ختم ہو چکا ہوں۔“

وہ مرتے ہوئے آدمی کی آواز میں، بھاری ٹوٹی ہوئی کراہ کے ساتھ بول رہا تھا۔ نعیم کا حلق ابھی تک صاف نہیں ہوا تھا۔ تاریک سناٹے میں اسے بہت قریب سے مہندر سنگھ کے بھاری بھاری سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جیسے پائٹن کے جنگلوں میں ہوا چلتی ہے، یا جیسے کان کے قریب سے گولیاں گزرتی ہیں۔

”پتہ ہے میں یہاں کیوں آتا ہوں۔ یہ جگہ مجھے پسند ہے۔ یہاں شریف اور دیانت دار لوگ دفن ہیں۔ یہ میں نے محسوس کیا ہے۔ ان کے کتے، ان کے نام، ان کی تاریخیں یہ چوہوں کی طرح، بددیانتی کی موت نہیں مرے۔ وہ موت میں نے دیکھی ہے۔ اپنا اپنا مقدر ہے۔“

دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”لیکن ایک بات اچھی ہے۔ ان وقتوں میں ہم ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ کون کب مر جائے کیا پتہ۔ خدا حافظ۔“

چند طویل لمحوں تک وہ نعیم کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے کندھے پر رائفل کو ٹھیک کیا اور بھاری، سیاہ جانور کی طرح جمبول کر چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

(۱۱)

سر سے اوپر نکلتی ہوئی سرخ گھاس میں مینٹ لگی رائفل کی مدد سے راستہ بناتے ہوئے آخر کار وہ پانی کے کنارے پر آئے۔ یہ ایک چھوٹی سی جھیل تھی جو جنگل کو دو حصوں میں جدا کرتی تھی۔ اس سے پرے پھر جنگل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

سیاہ اور سنہرے جنگل کے اوپر سورج غروب ہو رہا تھا اور سرخ دھوپ نے پانی میں آگ لگا رکھی تھی۔ جھیل کی سطح پر تین مرغایاں تیر رہی تھیں۔ گھاس میں سے سپاہیوں کی قطار کو نمودار ہوتے دیکھ کر وہ پھڑ پھڑا کر اٹس۔ ان کے پروں سے پانی کے قطرے چاندی کے دانوں کی طرح سطح آب پر برسے اور ڈوب گئے۔ سپاہیوں کے سروں پر ایک چکر لگانے کے بعد خوش

وضع ، محکمیں پرندوں نے آتشیں مغربی آسمانوں کی طرف رخ کر لیا ۔ ”ہاہ ۔ اوہ ۔“ لانس نائک سجن نے گہرا ، تھکا ہوا سانس چھوڑا اور ٹوپنی اتار کر چہرا پونچھنے لگا ۔ اس کے ماتھے اور کالوں پر بے شمار تھمی تھمی خراشیں آگئی تھیں اور ان پر خون کے باریک سیاہی مایل قطرے جمے ہوئے تھے ۔ اس نے اونچی آواز میں کالی دی ۔

”نشتر کی طرح تیز ہے ..“

نعیم آنکھیں سکیڑ کر سامنے والے جنگل کو دیکھ رہا تھا ۔ اچانک بے حد خوف زدہ ہو کر اس نے اپنے پاؤں پر نظر ڈالی جو آہستہ آہستہ دلدل میں اتر رہے تھے ۔ دو تین چھوٹے چھوٹے جھشکوں کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو باہر نکالا اور پوری قوت سے چلایا :

”ری ٹریٹ ۔“

جوان کو دے ، گرے ، بکھرے ، فوراً ہی ترتیب میں ہو کر گھاس میں غائب ہو گئے ۔ ”گھاس کے قانون کا خیال رکھو ۔“ نعیم اونچی کرخت آواز میں چلایا ۔ چہرے کو پچانے کے لیے اس نے ٹوپنی آنکھوں پر کھینچ رکھی تھی ۔

”عجیب ملک ہے ۔“ سجن نے پھر کالی دی اور سخت میزاری سے لمبی ، تیز دھار گھاس کو دیکھا جو بلا درد اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھی ۔ ”یہ میں نے پہلی بار دیکھی ہے ۔ اسے کیا کہتے ہیں ؟“

”دلدل ۔“ نعیم نے بتایا ۔

سپاہیوں کی قطار رائٹفلین سنبھالے پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی بڑھ رہی تھی ۔ گھاس نے چاروں طرف اندھیرا کر رکھا تھا اور زمین میں سے گیلے پتوں کی سڑاند اٹھ رہی تھی ۔ سجن نے اٹھکی سے ابرو پر لٹکتا ہوا خون کا قطرہ پونچھا اور آنکھوں کے قریب لاکر دیکھا ۔

”میرا خون سیاہ ہو گیا ہے ۔“

”نہیں ؟“

”یہ دیکھو ۔“

”کیا دیکھوں ؟“ نعیم آگے آگے چلتا ہوا بولا ۔ ”رات میں سب چیز سیاہ ہو جاتی ہے ۔“

”نہیں میں نے دن میں بھی دیکھا ہے ۔ پار سال فرانس میں میں زخمی ہوا تھا تو سرخ

خون نکلتا تھا ۔ اب کالا ہو گیا ہے ۔“

نعیم زیر لب ہنسا ۔

”پتہ ہے ، یہ پھروں کا خون ہے ۔“

”فضول باتیں مت کرو ۔“ نعیم نے خشک لہجے میں کہا ۔

”کل میں نے ایک پھر مارا تھا ۔ اس کا اسی طرح کا کالا خون تھا ۔ پھر مجھے پتہ چلا ۔ یہ

مچھروں کا خون ہے ، جو دن رات کاٹتے رہتے ہیں ۔ ” وہ ہنسا ، کھوکھلی ، زبردستی کی ہنسی جو زیادہ دیر تک میدان جنگ میں رہنے سے اکثر مرد ہنسنے کے عادی ہو جاتے ہیں ۔

دائیں جانب سے گھاس میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور زرد اور کالی دھاریوں والا لمبا جسم ان کے سامنے سے نکل بھاگا ۔ پیشتر اس کے کہ کوئی فائر ہوتا درندے نے بجلی کی سی تیزی سے جست بھری اور ایک جوان کو دیوچ لیا ۔ اس کی پشت پر شانوں کے درمیان دانت کاڑے وہ کئی طویل ، کربناک لمحوں تک اسے نوچتا رہا ۔ کئی سپاہیوں نے ایک ساتھ شست باندھی لیکن گولی چلائے بغیر تذبذب کے عالم میں کھڑے رہے ۔ ان کا ساتھی بھی خطرناک حد تک گولی کی زد میں تھا ۔ شیر کے نیچے وہ ناتوانی سے جھرجھرایا اور زخمی بھیڑیے کی طرح چیخا ۔

”فائر ۔“ آخر کار نعیم چیخا ۔ ”فائر ۔“

چند گولیاں چلیں اور درندے نے اپنے شکار کے اوپر ہی دم توڑ دیا ۔

شام پڑ چکی تھی جب تھکے ماندے ، میزار ، غلیظ سپاہیوں کی قطاریں جنگل میں سے برآمد ہوئیں ۔ یہ ایک چھوٹا سا ریگستان تھا جو جنگل کو دو حصوں میں جدا کرتا ہوا میلوں تک چلا گیا تھا ۔ یہاں ان کا کیمپ لگا تھا ۔ جرمنوں کے مورچے مغربی جنگل کے پار کسی نامعلوم مقام پر تھے مشرقی افریقہ میں Exercises کرتے ہوئے انہیں دو ماہ ہو چلے تھے ۔ یہ مشقیں انہیں خاص طور پر ’افریقی جنگ‘ سے واقف کرانے کے لیے کی جا رہی تھیں ۔ افریقہ کی خصوصی ”گھاس کی جنگ“ ۔ گھاس جو نیلی اور سرخ اور زرد اور ہر رنگ کی تھی اور تیز دھار اور دشوار گزار تھی ۔ گھاس کی جنگ کا اصول : ”پہلے گولی مارو ، بعد میں معافی مانگو ۔“ سپاہیوں کو ذہن نشین کرایا جا رہا تھا آب و ہوا شدید گرم اور مرطوب تھی اور انگریز اور فرانسیسی بٹالینوں کی حالت جلدی بیماریوں کی وجہ سے بہت خراب تھی ۔ رات کو بے شمار ، بڑے بڑے اور زہریلے مچھر نکل آتے جو کسی سپاہی کو ایک وقت میں پانچ منٹ سے زیادہ سونے نہ دیتے ۔ جوان واضح طور پر کمزور ہو رہے تھے ۔ حملے کے غیر معین مدت کے لیے ملتوی ہو جانے سے ان کے اعصاب مستقل کشیدگی کی حالت میں تھے ۔ ہر قسم کی بیماریاں سپاہیوں اور جانوروں میں پھیل رہی تھیں اور ان کا ”موریل“ تباہ ہو چکا تھا ۔ اتحادیوں کو بڑی مدد ان افریقی یونٹوں سے ملی جو بظاہر موسم اور مچھروں سے بے اثر ، اور گھاس کی جنگ کے ماہر تھے ۔ ان کے ساتھ اسی جنگل میں حبشی پلٹنوں کے علاوہ نمبر ۲۹ پنجاب ، نمبر ۲۵ ریل فیوزلرز اور ایک بٹالین کیمپ کور (Corps) کی تھی ۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی ۔ جب بھی یونٹ کا کوئی سپاہی بیمار ہو کر ، سانپ کے کاٹے سے یا درندوں کے ہاتھوں مرتا تو وہ دیر تک جاگتے رہتے ۔

”جاگ رہے ہو؟“ نعیم نے تاریکی میں کروٹ بدل کر پوچھا ۔

”مجھروں کی مدد سے۔“ سجن نے مخصوص ، کھوکھلے مزاجیہ لہجے میں کہا۔

”تم نے قمیض سی لی ہے؟“

”ہاں۔ اب ٹھوڑی سینے کی فکر میں ہوں۔“

”کس قدر بدبودار ہے۔“ نعیم نے دل میں مجھ کے تیل کو کوسا وہ اندھیرے میں چپ

چاپ آنکھیں کھولے لیٹے تھے۔ مجھ ہزاروں کی تعداد میں ان کے کانوں پر چکر لگا رہے تھے۔

سجن نے پیٹھ پر اس گانٹھ کو محسوس کیا جو قمیض سینے سے بن گئی تھی۔

”حوالدار۔“ وہ ہولے سے پکارا۔

”ہوں۔“

”یہ فضول موت نہ تھی؟“

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر نعیم نے کہا: ”عام موتوں کی طرح تھی۔“

”تو سب موتیں فضول ہوتی ہیں؟“

”نہیں اررر۔ شاید لیکن موتیں فضول نہیں ہوتیں۔ موت سے آدمی مر جاتا ہے۔“

کافی دیر کے بعد سجن نے بھاری ، مغموم آواز میں صرف اتنا کہا:

”ہاں“

پھر اس نے سگریٹ سلگایا اور دیر تک جلتی ہوئی تیلی کو ہاتھ میں پکڑے بڑے بڑے

مجھروں کو جل کر گرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ”یہ ہوا کی مانند ہیں جو کونے کونے میں بھری ہے۔“

اس نے سوچا۔

”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں،“ نعیم نے کہا، ”کہ ہم اسکا ماتم کرنے بیٹھ جائیں۔“

”نہیں۔“ سجن نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ ”پتہ نہیں نعیم، مجھے لگتا ہے کہ۔“

یوں میں بزدل نہیں ہوں، مگر اس طرح جب کوئی مرتا ہے تو میرا دل رونے کو چاہتا ہے۔“

”یہ قدرت کی برتر طاقتیں ہیں، پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ جانے کیوں۔“ وہ بے

چینی سے اپنی جگہ پر ہلا۔

”سجن۔“ نعیم اس کی طرف جھکا، ”تم نے کتنے آدمی مارے ہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے بازو ہوا میں ہلایا اور اونچی ، بے چین آواز میں بولا۔ ”اُس کا کوئی

سوال نہیں۔“

گشت والے سپاہی نے سر خمیے کے اندر داخل کر کے کہا ”آرام کرو۔ آرام کرو۔“ اور

آگے بڑھ گیا۔

”حوالدار۔“ سجن اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں جانور ہوں۔ میں نے

ساٹھ آدمی مارے ہیں۔ مگر یہ سب جنگ میں گزرا ہے۔ جنگ میں سب مارتے ہیں۔ اپنے

بچاؤ کے لیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں محسوس نہیں کرتا۔ کوئی کم، کوئی زیادہ، میں نے ہر موت محسوس کی ہے۔ “اس کی آواز ٹوٹ گئی اور وہ بیٹھے ہوئے، خشک گلے سے بولنے لگا۔
”ہر وہ آدمی جسے میں نے مارا میں نے محسوس کیا۔ اس کا خون میں نے اپنے حلق میں۔ لیکن یہ موت۔“

نعیم کو محسوس ہوا کہ اس کا گلابند ہو گیا ہے۔ وہ گھبرا کر تیز تیز بولنے لگا: ”ہم شاید جلد ہی حملہ کریں۔ دشمن کا کیمپ مغرب میں ہے جہاں دو دفعہ ہوائی جہاز نظر آیا تھا۔ اس جگہ ان کی طاقت سولہ ہزار ہے اٹلی جینس یہی بتاتی ہے۔ دو ہزار گورے اور چودہ ہزار افریقی۔ دو دو سو جوانوں کی کمپنی ہے، ساٹھ بڑی توپیں اور اسی مشین گنیں ہیں۔ یہ پچھر۔“ اس نے دل میں گالی دی۔

”حوالدار، جرمنوں کے مورچوں میں بھی پچھر ہوں گے۔“
”ہاں۔“

باہر رات جنگل پر اور ان کے خیموں پر بہت نیچے جھک آئی تھی اور مدہم سی چاندنی میں ریت کے ذرے ناتوانی سے چمک رہے تھے۔ شمال کے رخ کی ہوا سارے میں چل رہی تھی۔ نعیم اور سجن اور دوسرے خیموں میں دوسرے سپاہی دیر تک آنکھیں کھولے، آنکھیں بند کیے اپنے اپنے سینوں میں موت کے خلا کو محسوس کرتے رہے۔

انہی مشقوں کے دوران ایک روز انہیں اصل دشمن کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ تیز دھوپ میں وہ لومڑیوں کی طرح ہوشیاری سے، ہتھیار تھامے چل رہے تھے کہ چند قدم کے فاصلے پر گھاس میں سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ کمپنی پاؤں پر ہی رک گئی۔ ایک دو تین چار۔ خاموشی۔ ”بلیک برڈ“ کمپنی کمانڈر نے، کوڈ ورڈ، دھرایا۔ جواب میں گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ کمپنی سر کے بل زمین پر آ رہی۔ دونوں طرف سے فائر جاری ہو گیا۔ پتلی گھاس کٹ کٹ کر ہر طرف اڑنے لگی اور گولیاں ان کے اوپر سے گر کر جڑوں میں سے مٹی اڑاتی ہوئی زمین میں دھنسنے لگیں۔ فائروں کی خشک، پٹانے دار آوازیں جنگل کے سناٹے میں ہر طرف پھیل گئیں اور جانوروں نے شور مچا کر بھاگنا شروع کر دیا۔

چند منٹ کے بعد سامنے سے گولی چلنی بند ہو گئی اور وردیوں والے سپاہیوں کی ایک قطار گھاس میں سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑی۔ اب دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔ نعیم نے لیٹے لیٹے سامنے سے آتے ہوئے ایک سپاہی کے دل میں شست باندھ کر گولی چلا دی۔ جرمن، جو سرخ چہرے والا موٹا تازہ جوان آدمی تھا، ٹانگیں سمیٹ کر، گھٹنے ٹھوڑی سے لگا کر، گیند کی

طرح ہوا میں اچھلا اور گھنی اگی ہوئی گھاس میں جا پڑا۔ دائیں جانب سجن نے یکے بعد دیگرے دشمن کے دو سپاہیوں کو سنگین بھونکی۔ جب نعیم نے اسے دیکھا، وہ ایک کے سینے میں سے سنگین نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور مرتا ہوا سپاہی سنگین کو مضبوطی سے تھامے اس پر جھکا ہوا تھا۔ دو ایک بار جھٹکے دینے پر بھی جب سنگین نہ مچلی تو اس نے گھوڑا چڑھا کر لبلہی دبا دی۔ اس کے جھٹکے سے مردہ سپاہی نیچے گر پڑا اور خون سے چمچماتی ہوئی سرخ سنگین ہوا میں کھڑی رہ گئی۔ سجن کے چہرے پر جنگلی جانوروں کی سی وحشت تھی۔ وہ بھاگتا ہوا جا کر ایک دشمن پر پیچھے سے ٹوٹ پڑا۔

ایک ادھیڑ عمر کا کسانوں کے سے چہرے والا جرمن بھاگتا ہوا نعیم کے سامنے سے گزرا۔ اس کی سنگین کا رخ کمپنی کمانڈر کے پیٹ کی طرف تھا جو پستول ہاتھ میں لیے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ مشین کی طرح نعیم بڑھا اور سنگین اس کی پسلی میں گاڑ دی۔ جرمن کسان کے میلے زرد دانتوں کے بیچ سے ایک کربناک آواز بلند ہوئی اور وہ سنگین پر جھک گیا۔ ایک لمحے کے بعد اس نے چہرہ اٹھا کر اپنے حملہ آور کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ معاً نعیم کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے درخت کے تنے پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ جب اندھیرا دور ہوا تو وہ راضفیل اٹھانے کے لیے جھکا۔ اس وقت بے تحاشا خوف زدہ ہو کر اس نے دیکھا کہ بایاں بازو صرف دو پتلی پتلی نسون کے سہارے لٹک رہا تھا۔ بیہوش ہونے سے پہلے اس نے صاف طور پر لڑنے والوں کو اپنے ارد گرد دوڑتے ہوئے، گرتے ہوئے، تیز تیز گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے سنا۔

دائرے، دائرے، دائرے، چہرے، چہرے، چہرے، ستارے۔ ہزاروں لاکھوں ستارے۔ کبھی دور مغرب میں ایک اکلوتا سبز ستارہ جگمگاتا۔ چکر۔ جیسے ہوا کے طوفان میں ایک چکر دار سیڑھی۔ چڑھائی، اڑان، دونوں بازوؤں کی جگہ دو پر۔ اوپر اوپر، بہت اونچی اڑان۔ پھر خوبصورت جنگل آئے جن کے راستوں پر زرد پتے گر رہے تھے، اور دونوں پر پھیلائے کوئی درختوں کے نیچے نیچے پرواز کرتا چہرہ، چاند کی روشنی میں ستا ہوا، غلیظ چہرہ۔ آگے سمندر آئے، اور شکستہ ساحل جن پر سفید بادبانی کشتیاں سکون بے کھڑی تھیں۔ پھر وادی۔ بہت طویل وادی اور سائے جن پر آہستہ آہستہ بارش ہو رہی تھی۔ چہرہ، موٹے ہونٹ اور بھوری آنکھیں۔ گہرے سائے اور خاموشی، نرم بارش۔ پھر ہونٹ ایک دم پھیل گئے اور سر پیچھے پھینک کر کوئی ہنسا۔ مزید چکر۔ چاند پر برف گرنے لگی۔ ایک جہاز تیزی سے پرواز کرتا ہوا پاس سے گزرا اور چاند پر چلا گیا۔ ستارے لمبی لمبی روشن لکیریں بناتے ہوئے آسمان پر لٹکنے لگے، برف باری تیز ہو گئی۔ لکڑی کی میز اور اس پر جھکے ہوئے چند اجنبی چہرے۔ اوزار۔ کافور کی بو، چینی۔ ایک سمندری جہاز بادلوں پر کھڑا سیٹیاں بجا رہا تھا اور خالی کمروں میں ستارے لٹک رہے تھے۔ سفید

پروں والا پرندہ آہستہ آہستہ پر ہلاتا بادلوں میں غائب ہو گیا۔ چکر۔ چکروں کا تسلسل۔ سیٹیاں۔ اندھیرا، چکر چکر چکر۔۔۔

اس نے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھا تو چھت اور دیواریں ہل رہی تھیں۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت دیر سے آنکھیں کھولے پڑا تھا۔

سپاہی، ریڈ کراس، کے بیچ بازوؤں پر باندھے اس کے پاؤں کے قریب بیٹھے تھے اور کار تیزی سے تار کول کی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشے میں نرم دھوپ چھن کر آ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں جھکی ہوئی سیاہ فام عورتیں شاید چاول کی پنیری بو رہی تھیں۔

چاول بونے کا موسم ہے؟“ اس نے دل میں سوال کیا سڑک کے کنارے فوجیوں کے خیمے تیزی سے گزرنے لگے۔ اس نے گردن موڑی بازو کہنی پر ختم ہو گیا تھا اور بہت سی سفید پٹیوں میں لپٹا سٹریچر کے ساتھ جکڑا ہوا تھا۔ خوف اور نقاہت سے وہ پھر بیہوش ہو گیا۔

صبح کی ہلکی سرد دھوپ کھڑکی کے راستے اس کے چہرے کے نچلے حصے پر پڑ رہی تھی اور بڑھی ہوئی داڑھی میں سے جلد کا زرد رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ کبیل کو ٹانگوں پر کھینچ کر وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ نمایاں طور پر کمزور ہو چکا تھا۔ اس کے جبرے اور رخساروں کی ہڈیاں مھل آئی تھیں، اور تیکھے، خوب صورت نفوش میں کرخنگی ظاہر ہوتی تھی۔ سب سے نمایاں تبدیلی بہر حال اس کی آنکھوں میں آئی تھی، بڑی بڑی سیاہ، چمکدار اور بے چین آنکھیں جو بڑی گہرائی سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔

ہسپتال ایک سکول کی عمارت میں تھا۔ لمبا ہال کمرہ زخمیوں سے بھرا پڑا تھا۔ زمین پر، بڑھی ہوئی داڑھیوں والے مریض شانے سے شانہ بھڑائے ایک دوسرے کی ٹانگوں میں سر دیے پڑے تھے۔ ڈاکٹروں اور تیمارداروں کے گزرنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ ان کی ٹانگوں اور بازوؤں کے درمیان قدم رکھتے، مریضوں کی کراہوں اور کالیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھتے۔ باقی تمام کمرے اور برآمدے اور صحن زخمیوں سے اٹے پڑے تھے۔ صحت یاب ہوتے ہوئے مریض اپنی جگہوں پر بیٹھے بیٹھے نئے آنے والوں کی چیخ و پکار کو بڑی مانوسیت اور لا تعلقی سے دیکھتے رہتے، جیسے تندرست بھینسیں بچہ جنتی ہوئی بھینس کو دیکھتی ہیں۔

نعیم کے ساتھ والے بستر پر کچھ دیر ہوئی ایک پٹھان سپاہی کو لایا گیا جو ایک روز قبل زخمی ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے کاٹ دی گئی تھی اور وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھوں کے بال کپڑے میں لتھڑے ہوئے تھے اور قمیض کے گندے کف پر جوئیں چل رہی تھیں۔ ڈاکٹر کچھ دیر پہلے راؤنڈ کرتا ہوا اس کے پاس سے گزرا تھا۔

”کیا حال ہے ، جوان؟“ اس نے رک کر اپنے مخصوص ، بے حس لہجے میں پوچھا تھا ۔

”خرکس کا بچہ ، کیا حال ہے ؟ ہیں ؟ -“ وہ سوچی ہوئی آنکھیں کھول کر چلایا ، پھر دفعتاً پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ ”میں لنگڑا ہو گیا ہوں ۔ میں ۔“

”جمعے کے روز تمہاری آخری ڈریسنگ ہو گئی ۔ حوالدار نعیم احمد خان ۔“ ڈاکٹر نے اس کے کاغذ دیکھ کر کہا اور پھلانگتا ہوا گزر گیا ۔

اس کے پیچھے پیچھے ادھیڑ عمر کی خوب صورت ، اداس ، خاموش سسٹر ڈورس پانی کا برتن اٹھائے زخمی پٹھان کے پاس آئی ۔ وہ کبیل میں منہ دے کر رنج اور تکلیف کی وجہ سے داڑھی نوچ رہا تھا ۔

”مت نوچو داڑھی ۔“ سسٹر ڈورس نے پیار سے دھمکایا اور اس کا منہ دھونے لگی ۔

نعیم گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا ۔ کس قدر مستعد عورت ہے ، اس نے سوچا ۔

”مت روؤ ۔“ وہ زخمی کو مصنوعی غصے سے ساتھ جھڑک رہی تھی ۔

”سسٹر ، ہم سب تمہارے بچے ہیں ۔“ نعیم نے خوشدلی سے کہا ۔

سسٹر نے اسے سیاہ ، گہری آنکھوں سے دیکھا اور اداسی سے مسکرائی ۔

”یاد ہے پچھلے مہینے جب تم آئے تھے تو اسی طرح رو رہے تھے ۔“

”تم جھوٹ کہتی ہو ۔ میں کبھی نہیں رویا ۔“

”تمہیں اب یاد بھی نہیں رہا ۔ اس وقت تم بہت چھوٹے سے تھے ۔“

وہ ہنسا ۔ ”سسٹر ، تم بڑی محنت کرتی ہو ۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں ۔“

اس نے ایک لحظے کے لیے رک کر نعیم کو دیکھا ، پھر کپڑے سے پٹھان کا چہرہ خشک

کرنے لگی ۔ اس سے فارغ ہو کر واپس جانے کی بجائے وہ نعیم کے پاس آکھڑی ہوئی اور شستہ

انگریزی میں بولی :

”زخمیوں سے مجھے بہت کم ہمدردی ملتی ہے ، حوالدار ۔ میرے دو بچے ہیں اور میرا خاوند

پاگل خانے میں ہے ۔ اس تمام عرصے میں میں نے غلیظ اور بدبودار انسانوں کی خدمت کی ہے ،

اس لیے کہ میرے بچے نفیس ، صاف ستھری فضا میں پل سکیں ۔“ وہ رکی ۔ ”اس جگہ محض

بیماری اور موت ہی نہیں ہوتی ، حوالدار ۔ سات دن کے بعد تم چلے جاؤ گے ، لیکن اگلی بار جب

تم زندگی کی خوبصورتی اور محنت اور اچھائی کو دیکھنا چاہو تو یہاں آ جانا ۔“ وہ گندے پانی کا برتن

اٹھا کر بچتی بچاتی ، رستہ بناتی باہر نکل گئی ۔

وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھا اور اپنے ہمسائے کے پاس جا کھڑا ہوا ۔

”تمہارا نام کیا ہے ؟“

”امیر خان ۔“

”گھر؟“

”کا کا خیل - پشاور -“

”کہاں زخمی ہوئے تھے -“

”مجھے نام نہیں آتا -“

”رجمنٹ؟“

”فرئیر فورس رائفلز -“

اس تمام دوران میں زخمی کی نظریں اس کے آدھے بازو پر جمی رہی تھیں - نعیم نے وہ بازو آگے بڑھایا اور ہنسا - ”ہاں - اس کو بھی کاٹ دینا پڑا -“

چند سیکنڈ تک زخمی تعجب سے اسے دیکھتا رہا ، پھر معاً بچوں کی سی بے تکلف مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی - ہمسایگی کے ایک لمحے میں اس نے ایک مشترکہ دکھ کو پہچان لیا تھا -

باہر برآمدے میں دوپہر سے پہلے کی دھوپ پھیل رہی تھی ، اور شفاف ، شیشے کی سی فضا میں شہد کی مکھیاں اڑ رہی تھیں -

آخری پٹی کروانے کے فوراً بعد نعیم نے یونٹ میں رپورٹ کی جہاں سے اسے بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز بھیج دیا گیا -

بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز کی اونچی ، مغربی طرز کی عمارت میں داخل ہو کر اس نے اپنے کانڈ ایک کلرک کے حوالے کیے اور برآمدے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا - اسے بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا - اس کے سامنے جاٹ نگر کا خالق کھڑا تھا - انہوں نے کسان فوجیوں کے انداز میں ایک دوسرے کو پکارا اور گرمجوشی سے مصافحہ کرنے لگے - پھر خالق کی نظریں اس کی لٹکتی ہوئی خالی آستین پر رک گئیں -

نعیم خاموش رہا -

”یہ - یہ -“

”ہاں -“ نعیم نے لاپرواہی سے کہا - ”میں زخمی ہوا تھا -“

اس نے سگریٹ نکال کر خالق کو دیا - دونوں خاموشی سے دھواں اڑانے لگے -

”تمہیں یاد ہے نعیم ، جب ہم کبڈی کھیلنے کے لیے روشن پور آئے تھے تو اس ہاتھ کی ضرب سے تم نے میرا کان توڑ دیا تھا -“ اس نے غیر ارادی طور پر کان چھوا -

نعیم ہنسا - ”تمہاری بد دعا لگی ہوگی -“

”مذاق مت کرو مجھے دکھ ہوا -“

”کوئی اور بات کرو۔“ نعیم نے بے چینی سے ارد گرد دیکھا۔ ”مجھے اصل میں وہ واقعہ یاد نہیں رہا۔ تم زخمی ہوئے تھے؟“

”میں سپلائی میں تھا۔“

”انبالہ برگیڈ میں اور سب لوگ؟“

خالق آنکھیں سکیڑ کر ہولے ہولے بولنے لگا: ”عبد اللہ کو پچھلے مہینے کراس ملا تھا۔ میرا بھائی طفیل حوالدار ہو گیا ہے۔ فرانس میں ہے۔ درشن سنگھ ناکارہ ہو کر واپس چلا گیا تھا۔ روشن پور کا مہندر سنگھ مارا گیا۔“

نعیم کے ہاتھوں میں سگریٹ کانپنے لگا۔ خالق نے بات جاری رکھی:

”وہ بالکل گدھا نکلا۔ سنا ہے جب ان کی کمپنی ایڈوانس میں پڑی تو اس نے ہلنے سے انکار کر دیا۔ کمپنی کمانڈر کے بار بار حکم دینے پر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔“

”پھر؟“ نعیم نے بے دھیانی سے پوچھا۔

”پھر کیا؟ ناچار کمپنی کمانڈر نے اسے وہیں پر شوٹ کر دیا۔ بڑا اچھا سپاہی تھا، پر ذرا یہاں پر کمزور تھا۔“ خالق نے سر کو چھو کر بتایا۔

”یہاں کا موسم بھی عجیب ہے۔“ نعیم نے بے چینی سے کہا۔ ”دھوپ نکلے تو گرمی،

نہ نکلے تو سردی۔“

”تمہارا دوست تھا۔“ خالق نے کہا۔

نعیم نے لرزاں انگلیوں سے سگریٹ کے تین چار کش لیے اور اسے دور پھینک دیا۔ پھر اس نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”روشن پور میں وہ میرا واحد دوست تھا۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ فرانس میں۔“

”فرانس میں؟“ خالق نے صرف اتنا کہا لوہے کے بیچ پر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

کچھ دیر بعد وہ ایڈجوٹنٹ کے سامنے پیش ہوا۔

”حوالدار نعیم احمد خان۔“

”یس سر۔“ وہ تن کر کھڑا تھا۔

”ہمیں افسوس ہے تم زخمی ہوئے۔ لیکن رجمنٹ کو تمہاری بہادری پر فخر ہے۔ ہم نے ملٹری کراس کے لیے تمہاری سفارش کی ہے۔ اس سلسلے میں ابھی تک ڈویژنل ہائی کمانڈ کے احکامات کا انتظار ہے۔“ بوڑھے کرنل نے اس کے چہرے پر سیدھا دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رائٹل اٹھا سکتے ہو؟“

”یس سر۔“

”اس عرصے میں تم زخمی قیدیوں پر ڈیوٹی دو گے۔“

”یس سر۔“

”ڈس مس۔“

برآمدے میں مڑتا ہوا وہ ایک دھچکے کے ساتھ رکا اور پچھلے پاؤں پر لوٹ آیا۔ وہ دو مریض ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ ایک کا چہرہ سوج کر کیا ہو رہا تھا۔ دوسرے کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی، لیکن اس کے ہونٹ خوبصورت تھے اور چمکیے زرد رنگ کے بال تھے۔ اس کے جسم میں خون پہنچایا جا رہا تھا۔ اس سے اگلے کے بائیں ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلیوں پر خون آلود پٹی بندھی تھی۔ اس سے اگلا زخمی۔ اور اس سے اگلا، اور اس سے اگلا۔ وہ سب بھاری، میزار چہروں کے ساتھ لیٹے اور بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں میں دودھ دینے والے جانوروں کی سی بے بسی تھی۔ نعیم بے خیالی سے انہیں دیکھتا ہوا گزر گیا۔ اگلے موڑ پر اس کا سپاہی رائفل اٹھا کر ’ائنشن‘ ہو گیا۔ نعیم نے کندھے پر رائفل کو درست کیا اور سیڑھیوں کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ نیچے دو گلہریاں بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ یکلخت بے حد گھبرا کر وہ مڑا اور برآمدے میں چلنے لگا۔ لیکن اگلے ’ونگ‘ میں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ اسی برآمدے میں چکر لگاتا رہا۔

”وہ پہچان لے گا۔“ ایک خیال بار بار اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ ”یقیناً۔ خدایا۔ یہ کیسے سخت جان لوگ ہیں۔“ سیڑھیوں پر گلہریاں دمیں پھلائے ایک دوسری کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔

”اب کیا ہو گا؟“ اس نے سوچا۔ ”کیا ہو گا؟ کیا ہو گا؟ لاجول ولا قوۃ۔ مجھے اس طرف کے سپاہی کو چیک کرنا ہے۔ بہر حال۔“

سوچے ہوئے چہرے والے نے اپنا بے تاثر چہرہ اٹھایا اور بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ مضبوطی سے جبرے پر جیڑا جمائے وہ اگلے ’ونگ‘ میں مڑا اور سیڑھا دیکھتے ہوئے چلنے لگا۔ سپاہی نے رائفل کندھے پر رکھ کر سلام کیا۔ وہ دیوار پر نظریں جمائے اس کے پاس کھڑا رہا۔

”اس نے دیکھا ہے۔ اس نے دیکھ لیا ہے۔ یقیناً۔ قطعی۔ اس کے پاؤں ہل رہے تھے۔“ وہ آدھا لیڑیوں پر گھوما۔ ”اب اس نے دیکھ لیا ہو گا۔ بازو سے دیکھنے پر میں پہچانا جاتا ہوں؟ پتہ نہیں۔ شاید!“ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ ہوا سے اس کی خالی آستین ہل رہی تھی۔ سامنے والے درخت کے میلے، زرد پتوں پر بارش بہت دیر سے نہیں ہوئی تھی۔

”وہ میرا کیا کر سکتا ہے؟ لیس؟ ہاں۔ وہ کیا کر سکتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔“ اس خیال نے اسے بے حد سکون پہنچایا، اور وہ حیران ہوا کہ اب تک وہ کیا سوچتا رہا تھا۔

سامنے پچکے ہوئے کالوں والا ادھیڑ عمر جرمن کسان دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا اس کے سامنے سے گزر گیا۔ آگے جا کر وہ مڑا اور زخمی کے سرسوں

کی طرح کے زرد، کرخت نقوش والے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ نعیم دوبارہ اس کے سامنے سے گزرا۔ تیسری بار جب وہ اس کے قریب سے گزر رہا تھا تو زخمی نے آنکھیں کھول دیں اور سوئی سوئی میزار نظروں سے ارد گرد دیکھنے لگا۔ نعیم پر سے اس کی نظریں دوسری جاندار، بے جان چیزوں کی طرح گزر گئیں۔ ان نظروں میں شناسائی کی رمق تک نہ تھی۔ نعیم نے دل میں عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ وہ غیر ارادی طور پر ایک لحظے کے لیے اس کے سامنے رکا۔ اسے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پا کر زخمی نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ نعیم نے حیرت سے اس کی گہری، ملائم آواز کو سنا، جس کی اس کے چہرے سے کوئی مطابقت نہ تھی۔

”آفیسر، مجھے مدد کی ضرورت ہے۔“ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔

نعیم گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”ابھی یہاں دھوپ آجائے گی۔“ وہ تکلیف سے بول رہا تھا۔ ”ہر روز ایسا ہوتا ہے۔

یہاں کی دھوپ میرا مطلب ہے کہ اگر مجھے کمرے میں جگہ مل جائے تو۔“

نعیم خاموشی سے اٹھ کر ڈاکٹر کے پاس آیا۔ ”ڈاکٹر ایک مریض سخت تکلیف میں ہے۔“ ڈاکٹر نے اکتائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک معمولی اپریشن کی تیاری کر

رہا تھا۔

”دھوپ ساری اس پر آجاتی ہے۔“

”دھوپ تو ہر جگہ آجاتی ہے۔“ ڈاکٹر جھنجھلا کر بولا۔

”میرا مطلب ہے ڈاکٹر، کہ اگر اسے کمرے میں ڈال دیا جائے۔“

”تم اندر جا کر دیکھ سکتے ہو۔ پاؤں دھرنے کی بھی جگہ نہیں۔“

وہ مریض پر جھک گیا۔

”لیکن کیپٹن،“ نعیم آگے بڑھا، ”وہ سخت تکلیف میں ہے۔“ ڈاکٹر اوزار برتن میں

رکھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟ ایس؟ تمہارا بازو کیا گدھا چبا گیا ہے؟“

”مگر کیپٹن۔ وہ تو مریض۔“

”مریض۔ جرمن۔“ سب نے دیکھا کہ غصے کے مارے ڈاکٹر کے کان سرخ ہو گئے اور

اس کی گردن کے بال اٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور دانت ہیس کر دھیماسا ”سور۔“ کہنے کے بعد اوزاروں پر جھک گیا۔

نعیم نے ایک آخری کوشش کی: ”کیپٹن، سر، وہ میرے ایک دوست کی طرح ہے۔“

اس کا چہرہ بہت عزیز دوست۔ وہ فرانس میں مارا گیا تھا۔“

”زیادہ سے زیادہ تم برآمدے میں ترپال لٹکا سکتے ہو۔“ ڈاکٹر نے جھکے جھکے کہا۔
 سپاہی کی مدد سے ترپال لٹکا چکنے کے بعد وہ اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔
 زخمی اسی گہری، نرم آواز میں بولا: ”میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں، سارجنٹ۔“
 ”تم کہاں زخمی ہوئے تھے؟“
 ”لیگر نجو کی دلدل میں۔ تم؟“
 ”میں؟ ارر۔ فرانس میں۔“ نعیم نے جھوٹ بولا۔

اس نے آنکھیں میچ کر سر دیوار کے ساتھ لٹکا دیا۔ اس کے پتھریلے چہرے پر صرف ہونٹوں کے گرد ہلکا سا تبسم تھا۔ اس کے سینے پر چھوٹے چھوٹے سرخ دانے نکلے ہوئے تھے اور پسلی او پیٹ پر پٹیاں بندھی تھیں۔ نعیم رائفل کے پٹے پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتا رہا۔
 ”میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے پہچانتے ہو؟“ اس نے دل میں کہا۔

زخمی قیدیوں کا ہسپتال ایک قدیم گرجا گھر کے احاطے میں تھا۔ نعیم سیرھیٹا چڑھ کر برآمدے میں داخل ہوا۔

زخمی بہت کم بات کرتا تھا۔ وہ ہر روز نعیم کو دیکھتا اور ہولے سے مسکرا دیتا۔ گو نعیم اسے دیکھتے ہی اس سے باتیں کرنے، اس کی آواز سننے کے لیے بے تاب ہو جاتا۔ ہر روز اس کے پاؤں کے پاس رک کر وہ پوچھتا: ”کیسے ہو؟“ جس کے جواب میں اس کے منجمد چہرے پر صرف ہونٹ مسکراتے اور وہ آنکھیں بند کر لیتا۔ نعیم کے دل میں بے چینی کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔

اس روز نعیم کو دیکھ کر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکنے لگیں۔ نعیم گھٹنا ٹکا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”تم نے میری مدد کی تھی سارجنٹ۔ میں تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“ بات کرنے میں اس کی آنکھوں میں وہی نامعلوم سی نرمی آگئی جس کو دیکھنے والا محسوس نہیں کرتا، لیکن بعد میں ہمیشہ کے لیے، واضح طور پر یاد رہتی ہے۔ ”میں نے یہ کام اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ کل میری آخری پٹی ہوگی۔ میں کام کر سکتا ہوں۔ اگر تم مجھے چیر کی لکڑی کا ایک ٹکڑا اور چند اوزار لاؤ۔ میں تمہارا بازو بناؤں گا۔“

”اوہ۔“ نعیم ہنسا۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ۔ لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“
 ”مگر میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں خالی بیٹھ بیٹھ کر تنگ آ گیا ہوں۔ لاؤ گے؟“ اس کی آواز کا خفیف سا ارتعاش نعیم کے کانوں میں گونجتا رہا۔
 ”اچھا۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”تمہیں کون سے اوزار چاہئیں؟“

اگلے دن نعیم نے تین اوزار، اور چیڑ کا دو فٹ لمبا ٹکڑا لا کر اس کے آگے رکھ دیا۔
 ”ڈاکٹر سے بڑی سچ سچ کرنی پڑی۔“

”کیا کہتا تھا؟“

”کہتا تھا اوزاروں سے تم اپنا زخم کھول لو گے۔“

زخمی مخصوص دھیمے انداز میں مسکرایا اور فوراً کام میں مشغول ہو گیا۔

”مجھے بتا دینا چاہیے۔“ اس نے بارک میں لیٹے لیٹے ہزاروں بار سوچا اور اپنی جگہ پر

کسمسایا۔ اس کی بے خواب آنکھیں جل رہی تھیں اور وہ بڑی دیر سے پشت پر لیٹا تاریک چھت

کو گھور رہا تھا۔ نصف رات کے بعد نیند آنی شروع ہوئی اور ایک شدید تر کرنباک کیفیت اس

پر طاری ہو گئی۔ روزانہ رات کو اسی طرح ہوتا۔ نیند آتی، مگر وہ سو نہ سکتا۔ بخار کی طرح جلتا

ہوا بخار اس کی آنکھوں میں بھر جاتا جو آہستہ آہستہ اس کے سارے جسم کو گرفت میں لے لیتا۔

وہ جمائیوں پر جمائیاں لیتا، آنکھیں نیند کے بوجھ تلے بند ہو جاتیں، جسم ڈھیلا پڑ جاتا، پھر ایک

بے چینی اس کے دل سے نکلتی اور سارے جسم پر پھیل جاتی اور وہ مرتے ہوئے میل کی طرح

جھرنے لگتا۔ وہ انسانی جذبات کے شدید کرنباک دور میں سے گزر رہا تھا۔ چند دنوں میں

وہ نمایاں طور پر دبلا ہو گیا تھا اور بے خوابی کا خلا اس کی آنکھوں میں پھیل رہا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ زخمی سپاہی اپنے کام کو جاری رکھے۔ ہر روز رات کو فیصلہ کرتا کہ صبح

جاتے ہی اس سے تمام اوزار چھین لے گا اور لکڑی کا وہ کبخت ٹکڑا نوچ کر پھینک دے گا۔

یا۔ اس کو ساری بات بتا دے گا۔ لیکن ہر روز صبح برآمدے میں داخل ہوتے ہی اس کے

حواس جواب دے جاتے اور اس کا ارادہ دوپہر کی برف کی طرح پکھلنے لگتا اور اسے دیکھتے ہی زخمی

کے چہرے پر ہلکی سی منجمد مسکراہٹ پیدا ہوتی اور وہ جلدی سے جھک جاتا۔

”یہ سب تم کیا کر رہے ہو؟“ ایک روز نعیم نے خشکی سے کہا۔

وہ چہرہ اٹھا کر تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

اب میں بتا دوں گا۔ اب میں اسے بتانے والا ہوں، سب۔ نعیم نے سوچا۔ ”سنو۔“

ایک بات۔ تمہیں بتاؤں۔“ زخمی اسی طرح دیکھتا رہا۔ نعیم نے اس کی کوری، مخلص آنکھوں

میں جھانک کر دیکھا اور ندامت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”کیا ہے؟“ کچھ دیر کے بعد جرمن نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا تمہارے لیے کام کرنا اچھا نہیں۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ لکڑی پر جھکنے سے پہلے اس نے کہا۔

بیٹھے بیٹھے نعیم کا جی گھبرانے لگا۔ ”تم باتیں کیوں نہیں کرتے۔“

اس نے پوچھا۔

”گرتا ہوں۔“

”بہت کم۔“

”باتیں کروں گا تو کام کیسے ختم ہوگا۔“

نعیم خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ آج پہلی بار وہ دھیان سے اس لکڑی کے ٹکڑے کو دیکھ رہا تھا جس نے ان چند دنوں میں ایک لمبی گول کلائی اور مضبوط، محنتی انسانی ہاتھ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ اسے گھٹنوں میں دبائے جھکا ہوا نہایت انہماک اور کاریگری سے انگلیوں کے جوڑ بنا رہا تھا۔ اس نے کام کرتے کرتے سر اٹھایا اور بولا: ”دوستی خاموشی اور محنت میں پرورش پاتی ہے۔ باتیں ہم بازاروں اور دکانوں میں کرتے ہیں۔“

”تم میرے دوست ہو؟“ نعیم نے مسکرا کر کہا۔

”میں سمجھتا ہوں۔“

”مگر ہم تو دشمن ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔“

”نہیں،“ وہ جھکا جھکا بولا، ”میں یہ سب نہیں سمجھتا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ سب میدان جنگ میں تھا۔ یہاں تم نے میرے اوپر احسان کیا ہے، میں نے تمہارے لیے محنت کی ہے۔ ہم دونوں دوست ہیں۔“ پھر ہاتھ روک کر اس نے سر اٹھایا۔ ”سنو۔ ہیمبرگ کے قریب میرا گاؤں ہے۔ میں تیس سال تک وہاں رہا اور کسی سے نہیں لڑا۔ اب اگر واپس چلا گیا تو کسی سے نہیں لڑوں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں اگر میں لڑا، یا تم لڑے، تو کون قصور وار ہے؟ مجھے سب پتہ ہے۔ میں ترکھان کا کام کرتا تھا لیکن گاؤں کی عدالت والے مجھ سے آکر مشورہ لیا کرتے تھے۔ یہ سب زندگی کا بہاؤ ہے۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جانتا ہوں۔“

اس کی آواز بلند ہو گئی اور آس پاس کے چند زخمی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ جلدی سے لکڑی کے ٹکڑے پر جھک گیا۔ باتوں کے جوش کی وجہ سے ابھی تک اس کے زرد ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔

”یہ محنتی ہاتھ ہے۔“ نعیم لکڑی کو چھو کر بولا۔

”یہ ایک ایماندار آدمی کا ہاتھ ہے۔“ زخمی نے سنجیدگی سے کہا۔

زرد، مٹیالے بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر ہل رہی تھی۔

بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز سے لوٹنے کے بعد نعیم پہلی بار رات بھر سویا سونے سے پہلے اس نے آنکھیں بند کر کے دل میں کہا: ”کل میں اسے بتادوں گا۔ آخر کیا فرق پڑتا ہے، جب کسی بات

سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

سورج گرہ کے کلس پر چمک رہا تھا جب وہ کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔ اس کے پاس جانے سے پہلے وہ دیر تک برآمدوں اور کمروں کے چکر لگاتا رہا۔

آج وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، آنکھیں بند کیے، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ نعیم آہستہ آہستہ چلتا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کاہلی سے آنکھیں کھول کر مسکرایا۔

”تم جاگ گئے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”میں جاگ رہا تھا۔ مجھے پتہ چل جاتا ہے جب تم آتے ہو۔“

نعیم کا دل بیٹھ گیا۔

”آج تم تروتازہ نظر آرہے ہو۔“ جرمن نے کہا۔

”مجھے ملٹری کراس مل گیا ہے۔ کل بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز میں پیشی تھی۔ آج میرا یہاں

آخری دن ہے۔“

جرمن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ”میں خوش ہوں۔“ اس نے کہا اور کبیل میں

سے اوزار اور لکڑی کا بازو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”شکر ہے کل میں نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔“

نعیم نے چیزیں اس کے ہاتھ سے لے کر جلدی سے بڑے کوٹ کی جیب میں ڈال لیں۔

چند لمحے تک وہ ادھر ادھر دیکھتے رہے۔

”تمہیں افسوس نہیں ہے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”کیوں؟“

”اپنے ملک میں ہوتے تو تمہیں بھی کراس ملتا۔“

”اوہ!“ وہ ہنسا۔ ”کیا فرق پڑتا ہے؟ میں اپنے گاؤں واپس جا کر کام شروع کرنا چاہتا

ہوں۔ بس۔“

نعیم کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ ”سنو، تم بھاگنا چاہتے ہو؟“ جرمن نے چونک کر

اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے بتاؤ۔“ نعیم نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”میں تمہاری مدد کر

سکتا ہوں۔“

اتنے عرصے میں پہلی بار وہ ہنسا۔ کسانوں کی طرح منہ کھول کر، گہری، مختصر ہنسی۔

”اوہ۔ نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے افسوس ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا

ہوں۔ چند سال قید میں کاٹ کر میں واپس چلا جاؤں گا۔ دیانت دار آدمی کی طرح۔ مجھے یقین

ہے یہ مجھے گولی نہیں مارے گا۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ ، بہر حال میں خوش ہوں کہ جنگ کے باوجود بھی ہم دوست بنے ۔
میں تمہیں یاد رکھوں گا ۔“

دیر تک وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے اور مصافحہ کرتے رہے ۔ ”اب میں اسے
بتا رہا ہوں ۔ ابھی ۔“ اس نے سوچا ۔ ”دوست ۔“ اس نے پوری قوت سے اس کا ہاتھ دبایا
اور دیر تک دبائے رکھا ، پھر گرمجوشی سے ہلانے لگا اور ہلاتا رہا ۔ ”خدا حافظ ۔“ آخر بند ہوتے
ہوئے گلے سے اس نے کہا اور اٹھ کر تیزی سے برآمدے میں مڑ گیا ۔

آخری سیرھی پر پاؤں رکھ کر اس نے آخری بار مڑ کر دیکھا ۔ سامنے لیٹے اور بیٹھے ہوئے
مریضوں کی لمبی قطار تھی ۔ اس کے دماغ میں زور سے کوئی چیخا ۔ جیب میں لکڑی کے ٹکڑے
پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی ۔ وہ مڑا اور تیزی سے سیرھیاں اتر گیا ۔ زندگی میں پہلی بار اس
کا جی چاہا کہ چیخیں مار مار کر روئے ۔

باہر سڑک پر چند بچے ایک دوسرے کی قمیضیں پکڑے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے ۔

ہندوستان

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

میر تقی میر

کاؤں کی سوئی سوئی گرد آلود فضا اسی طرح قائم تھی۔ ان برسوں میں روشن پور کے بیسیوں نوجوان اجنبی سر زمینوں میں ہلاک ہو گئے تھے۔ جنگ کے میدانوں میں بکھرے ہوئے ان کے محبوب، مضبوط جسم تیز دھوپ میں بخارات بن کر اڑ گئے، اروتے سیلابوں، نئی آنہیوں اور طوفانوں نے ان کی ہڈیاں زمین میں دبا دیں۔ بیسیوں عورتیں بیوہ ہو گئیں، اور لڑکیاں محبت میں غریب ہو گئیں۔ روشن پور کی زمینوں میں سیلاب آئے اور فصلیں تباہ ہو گئیں اور کسان قرضے اور بھوک کے نیچے جھک گئے۔ جانور بیماری سے مر گئے یا بھوکے کسانوں نے کاٹ کر کھا لیے اور عورتوں اور بھینسوں کے دودھ سوکھ گئے، اور ایک وقت آیا جب پاگل آنکھوں والے کسانوں کے ڈھانچے گلیوں میں آوارہ پھرتے تھے اور چھتوں پر بڑھے ہوئے پیٹوں والے زرد رو بچے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھتے تھے، تو اس سے گاؤں پر جلے ہوئے جنگل یا بیماری سے تباہ شدہ قلعے کا شبہ ہوتا تھا۔

لیکن نیا موسم اپنے پورے رنگ روپ اور آب و تاب کے ساتھ آیا۔ سیلاب کا پانی اتر گیا اور بارشوں سے گرے ہوئے مکانوں کی دیواریں کھڑی کی گئیں، اور ہر دم جوان ہوتے ہوئے لڑکوں اور بیلوں اور بوڑھے ہوتے ہوئے کسانوں نے سیلاب کی ڈالی ہوئی سیاہ، زرخیز مٹی میں ہل چلایا اور گیہوں اور چنے اور دوسرا اناج بویا۔ دن رات کی کڑی محنت سے کھیتوں میں سبز ریشمی فصل اٹھی اور گندم کے دانوں میں گودا پڑا اور عورتوں کی چھاتیاں دودھ سے بھر گئیں اور ان کی کوکھ میں انسانی میج بڑھنا شروع ہوا اور تخلیق کی پرسکون، شفاف فضا ہر طرف پھیل گئی۔ لڑکیوں نے نئے نئے جوانوں سے محبتیں لکائیں اور رو رو کر اور گمشدہ محبوب یاد کر کر کے انہیں بتایا کہ جنگ کیسی خراب شے ہوتی ہے۔

فصلوں کے درمیان کھڑے ہو کر کسانوں نے پرقتاعت نظروں سے دیکھا کہ صبح کی تازہ، بے ضرر دھوپ ان کی گلیوں اور مکانوں کی مٹیوں میں داخل ہوئی، اور گہرے نیلے، بے داغ آسمان کے مقابل مکڑی کے چمکیلے تار اور آگ کی ”بوڑھی میا“ کاؤں کے اوپر اوپر لہرانے لگیں اور بچے ان کو پکڑنے کے لیے شور مچاتے ہوئے دوڑے۔ پھر سورج اونچا ہوا تو دھوپ ان کے صحنوں اور دالانوں میں پھیل گئی اور ایک خواب آلود، مٹیالی گرد نے، جو زندگی اور کام کی علامت ہوتی ہے، کاؤں کو لپیٹ میں لے لیا اور کھیتوں میں سے اٹھ کر وہ سائے میں آسٹھے اور دوپہر کا کھانا کھانے اور تباہ کو پینے لگے، اور اس سارے وقت کو انہوں نے بڑے سکون اور دلچسپی سے برداشت کیا، کہ جو کچھ گزرا وہ ہندوستان کے کسان کا مقدر تھا اور ایسا ہوتا ہی آیا تھا۔

گاؤں کی سوئی سوئی گرد آلود فضا اسی طرح قائم تھی۔ نعیم کو گاؤں میں رہتے چند مہینے ہو چلے تھے۔ وہ کبھی کبھی ہل چلاتا، لیکن کاشت کاری کی محنت کے اب وہ قابل نہیں رہا تھا۔ وہ شام کے وقت اکثر پنچایت گھر میں جاتا اور بوڑھے جوان سبھی اٹھ کر اس کا استقبال کرتے، جوان سروں پر پگڑیاں رکھ لیتے اور بوڑھے اس کو اپنے برابر جگہ دیتے، کیونکہ وہ واحد شخص تھا جو ابھی تک روشن پور میں جنگ سے زندہ لوٹ کر آیا تھا اور سینے پر امتیازی نشان لگاتا تھا اور ایک مربع زمین جسے سرکار کی طرف سے ملی تھی۔ لڑکیاں اسے دیکھ کر احترام سے رستہ چھوڑ کر چلنے لگتیں کیونکہ نعیم کی ماں نے انہیں بتا رکھا تھا کہ سمندر پار کے ملکوں میں کئی اجنبی عورتیں اس کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں، مگر وہ انہیں چھوڑ کر اپنے گاؤں واپس چلا آیا تھا۔ نعیم غریب الوطنی، مشقت اور اذیت کے ایک لمبے وقفے کے بعد گاؤں کو پرسکون خواب کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ جی بھر کر کھاتا، سوتا اور کبڈی کے مقابلوں اور میل گاڑیوں کی دوڑ میں فوجی وردی پہن کر شریک ہوتا۔

وہ نہر کا پل پار کر رہا تھا جب سامنے سے تین سوار نمودار ہوئے۔ یہ جوگندر سنگھ اور گاؤں کے دو جوان ہوتے ہوئے چھوکرے تھے۔ نزدیک آکر انہوں نے باگیں کھینچیں اور بلند آواز میں اس کا حال پوچھا۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“ نعیم نے پوچھا۔

”واہگرو کی فتح، سڑوں کو دیکھ کر۔“ جوگندر سنگھ بولا۔

”میلے؟“

”ہاں۔ ایک جگہ ڈیرا ملا۔ ریوڑ کا ریوڑ ہے۔“

”پھر؟“

”کل شکار ہے بڑا بھاری۔ چلو گے؟ رات میں ہم گڑھے کھودنے کو جا رہے ہیں۔“

”کل۔“ نعیم نے کہا۔

تینوں سواروں نے باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ ”ایک نیزہ نکلیا (سورج) اٹھنے پر آ جانا۔

لسی ہمارے ساتھ آکر پیٹنا۔“ جوگندر سنگھ سرپٹ دوڑتی ہوئی گھوڑی پر سے مڑ کر چلایا اور پل پر سے اتر گیا۔

”اوپر بارش ہوئی ہے۔“ نہر کے گدے پانی کو دیکھ کر نعیم نے سوچا۔

صبح وہ سو کر اٹھا تو دروازے کے باہر ہلکا ہلکا شور ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے پتلون

ٹانگوں پر کھینچی اور فوجی بوٹ پہن کر جمائیاں لیتا ہوا باہر نکل آیا۔ احاطے میں رک کر اس نے

سفید میل کی گردن کا زخم دیکھا اور فیصلہ کیا کہ شکار پر جانے سے پہلے اس پر دوائی لگائے گا۔ پھر اس نے گھوڑی کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس کے پچھلے دونوں گھٹنوں کو انگلیوں میں لے کر باری باری دبایا۔ گھوڑی کی پھڑک سے اسے اندازہ ہو گیا کہ جانور تازہ دم ہے اور سواری کے لیے تیار ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ماں کو، جو دودھ بلو رہی تھی، ہدایت کی کہ کام چھوڑ کر اس کی باگ مرمت کرنا شروع کر دے۔ پھر اس نے کونے میں سے تھوڑی سی خشک گھاس اٹھا کر گھوڑی کے آگے ڈالی اور علی کو جو دروازے میں کھیل رہا تھا، ایک ہاتھ سے اٹھا کر اس کی پشت پر بٹھا دیا۔ بچہ اس کے بال پکڑ کر گردن کے ساتھ چمٹ گیا اور اس کی ماں کیپاس کے ڈھیر کو چھوڑ کر اس کی طرف بھاگی۔ نعیم ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

احمد دین کے گھر کے آگے چند لوگ جمع تھے۔ نعیم نے جمائی لے کر جوہڑ پر اور سکھوں کے باغ پر اور آسمان پر سارے میں نظر دوڑائی۔ یہ ایک سو کر اٹھے ہوئے کسان کی طرح تروتازہ اور خوش گوار صبح تھی۔ جب دھوپ نے ابھی ابھی درختوں کی چوٹیوں کو چھوا تھا اور ان پر تھی تھی چڑیاں نلچ رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ والے مجمع میں شور بڑھ گیا۔

احمد دین اپنے دروازے پر کھڑا غصے میں چیخ رہا تھا۔ روشن آفا کا منشی گھوڑی کی باگ تھامے اپنے چند خاص آدمیوں میں گھرا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ بھاگ جاؤ کچھ نہیں ہے۔“ بازو ہوا میں نچا کر احمد دین چیخا۔

منشی نے حقے کے دو لمبے لمبے کش لیے اور گردن ٹیڑھی کر کے کڑے چالاک لہجے میں بولا:

”ہم تمہارے دالان کی تلاشی لیں گے۔“

”تم میرے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ میں دعویٰ کر دوں گا۔“ احمد دین چیخا۔ اس کی پگڑی کھل کر زمین پر گھسٹ رہی تھی اور خاک آلود داڑھی ہوا میں اڑ رہی تھی، آستین شانے پر سے پھٹ چکی تھی۔ اور غم و غصے کے آنسو اس کے رخساروں کی گہری، سیاہ جھریوں میں بہ رہے تھے۔

”میں بتلاؤں گا کہ تم نے مجھے پیٹا، میری بے عزتی کی، میری پگڑی اتاری، میری داڑھی نوچی۔ کیا میں چور ہوں۔ ہیں؟ بھاگ جاؤ۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم۔“ اس نے منشی کی طرف اٹھکی ہلائی لیکن اس کا کلا بند ہو گیا۔

کچھ دیر تک منشی کھڑا بوڑھے کسان کو عورتوں کی طرح مٹھیاں چھاتی میں دے کر روتے ہوئے دیکھتا رہا، اور اس کے دل میں اس مخصوص خوف نے سر اٹھایا جو پکی عمر کے سادہ لوح دھقانوں اور مزدوروں کو روتے دیکھ کر ہر انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے آدمیوں کو لے کر چپ چاپ ایک طرف چل پڑا۔

نعیم آہستہ آہستہ چلتا ہوا احمد دین کے پاس جا کھڑا ہوا، جو اب بے کواڑ دروازے میں بیٹھ

کیا تھا اور آنسو اس کے رخساروں پر خشک ہو رہے تھے۔ صرف ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس کھڑا رہ گیا تھا۔

”کیا بات ہے چچا؟“ نعیم نے پوچھا۔

”موٹرانہ لینے آئے تھے۔“ احمد دین کی بجائے لڑکے نے جواب دیا۔

”موٹرانہ؟“

”روشن آغا نے موٹر خریدی ہے۔“

”پھر؟“

”ہمیں موٹرانہ دینا پڑتا ہے۔“

نعیم نے ہوا میں دیکھتے ہوئے لمبی سی ”لس؟“ کی اور کچھ نہ سمجھ کر گھبرا گیا۔ ”ٹھہرو

ٹھہرو۔ دیکھو،“ وہ لڑکے پر جھک کر بولا، ”موٹرانہ کیا ہوتا ہے۔“

”جاگیر دار نے موٹر خریدی ہے۔ ہمیں اناج دینا پڑتا ہے۔“ لڑکے نے کہا۔

”کتنا؟“

”یہ زمین کے حساب پر ہے۔ میرے پاس بیس ایکڑ ہے، اور ایک جوڑی ہے۔ میں

نے ایک دھڑی دیا ہے۔“

”روشن آغا کے حصے میں سے؟“

”نہیں اپنے حصے کا۔“

”کیوں؟“

لڑکا سٹپٹا گیا۔ ”بس۔ ہم پر لازم ہے۔“

”میں ضرور دیتا۔“ احمد دین نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”سو دفعہ دیتا چوہدری، پر میرے پاس کچھ نہیں ہے اگر میں موٹرانہ دے دوں تو آٹھ

مہینے بھوسہ کھانا پڑے۔ یہ دیکھو۔“

اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیے۔ ”میں نے ساری زمین میں پھینک دی

ہے۔ کسی نے میری مدد نہیں کی۔ میں نے خود ساری بیانی کی ہے۔ میرا بیٹا جنگ میں مارا

کیا ہے اور آج انہوں نے مجھے پیٹا ہے، میری داڑھی۔“

اس نے لرزتے ہوئے بد صورت ہاتھ نعیم کے آگے پھیلانے رکھے۔ جن کے پورے

خشکی کی وجہ سے تڑخ چکے تھے۔ نعیم جیب میں ہاتھ دیے، سر جھکا کر چلتا ہوا واپس آ گیا۔ نیاز

یہ چمڑے کے تانگے سے باکیں مرمت کر رہا تھا۔

”تم نے بھی موٹرانہ دیا ہے؟“ صحن میں کھڑے ہو کر اس نے خشکی سے پوچھا۔

”ہماری تو اپنی زمین ہے۔ ہم کیوں دیس کے!“ اس کے باپ نے چھاتی پھلا کر کہا۔
 ”ہمارے نزدیک آنے کی ان کی ہمت ہے؟ سب کو سلا دوں۔ ہم نے کراس جیتا ہے۔ کوئی مذاق ہے؟“ آنکھوں کے کونوں میں سے بیٹے کو دیکھتا ہوا وہ باگیں مرمت کرتا رہا۔

نعیم نے چولہے پر سے پکی ہوئی مٹی توڑی، اسے ہاتھ میں ملا، پھر اس میں کڑوا تیل ڈالا، چھت کے کونے میں سے مکڑی کا جالا اٹھکی پر لپیٹ کر اتارا اور اس میں ملایا اور پھر اسی مقدار میں میل کا گوبر اس میں ملا کر اس کی لٹی بنالی۔ یہ مرہم میل کے زخم پر لگانے کے بعد اس نے اپنے فوجی تھیلے میں سے سفید پٹی نکالی اور باپ کی مدد سے اس پر باندھ دی۔

”اگر تم اسے خرگوش کے بچے کی طرح رکھنا چاہتے ہو تو پھر یہ کھیت میں کام کر چکا۔“
 نیاز بیگ پٹی باندھتے ہوئے جھلایا۔

”جنگ میں یہ مرہم بڑا کام دیتا ہے۔ مگر اس میں خنجر کا گوبر بہتر رہتا ہے۔“ نعیم نے کہا۔

پھر اس نے گھوڑی پر زین کسی اور باگیں اس کے منہ ڈالیں۔ نیاز بیگ کھڑا چوڑی، اداس آنکھوں کے ساتھ اسے نہایت ہوشیاری سے ایک ہاتھ کے ساتھ سب کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب نعیم نے ٹوپی سر پر جا کر کونے میں نیزہ اٹھایا تو وہ بولا:

”لسی نہیں پیو گے؟“

”سکھوں کی طرف پیوں گا۔ شکار پر جا رہے ہیں۔“ وہ اچک کر گھوڑی پر سوار ہوتے ہوئے بولا۔ گھوڑی بغیر کواڑ کے دروازے کو پھلانگ کر غائب ہو گئی۔
 جنگل گھنا تھا اور وہ شیشم، کیکر اور جٹ کے درختوں کے نیچے نیچے تین میل تک چلتے گئے۔ جگہ جگہ پر مردہ کورے اور دوسرے چھوٹے موٹے پرندے پڑے تھے۔ چاروں طرف گلے سڑے پتوں اور پرندوں کی بیٹوں کی تیز جنگلی بو پھیلی ہوئی تھی۔ نیم تاریک جنگل میں گھڑ سوار منڈا سے باندھے، نیزے اٹھائے، اونچی نیچی زمین پر سے ہوتے ایک کھلی جگہ دیکھ کر گھوڑے زور سے ہنہنائے۔

ایک سوار نے بڑی سی کالی دی۔ ”جگہ دیس کے سالے۔“ اور نیزے کا دستہ گھوڑے کے سر پر دے مارا۔ وہاں پر سب اتر پڑے۔ سورج سر پر پہنچ چکا تھا۔

”اس وقت آرام کر رہے ہوں گے۔ یہ ان کے آرام کا وقت ہے۔“ کالی دینے والا سوار نعیم کو شکار کے باریک نکتے سمجھانے لگا: ”سوتے میں سے جگایا جائے تو اندھا ہو جاتا ہے۔ پھر اسے کچھ سمجھائی نہیں دیتا۔ جدھر ہانک دو چلا جائے گا۔ اور اگر سامنے سے آ رہا ہو تو اپنی جگہ مت چھوڑو، دل میں خوف مت لاؤ، کھڑے رہو۔ جب بالکل نزدیک آ جائے تو ایک دم سامنے سے ہٹ جاؤ، سیدھا ٹھکل جائے گا۔ یہ دس گز کے اندر اندر نہیں مڑ سکتا۔ اور تم۔ تم ہانکے

میں رہنا۔ “اس نے ہچکچاتے ہوئے نعیم کے لکڑی کے بازو پر نظر ڈالی۔ ”نہیں، میرا مطلب یہ نہیں۔ تم دلیر آدمی ہو، جانوروں سے لڑے ہو، یہ تو سڑ ہیں، پر یہاں بڑے تگڑے جانوروں کی ضرورت ہے۔ سمجھے؟ تم ہانکے میں رہنا، بس۔“

انہوں نے رات کے کھودے ہوئے گڑھوں میں سے گھاس اور لکڑیاں نکالیں۔ ایک قطار میں سات گڑھے تھے۔ جو گندر سنگھ اور چھ دوسرے جوان اپنے اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں اتر کر بیٹھ گئے، اس طرح کہ ان کے گھٹنے زمین میں گڑھے ہوئے تھے اور صرف سر زمین کی سطح پر نظر آرہے تھے۔ انہوں نے نیزے سیدھے زمین کے ساتھ لٹا دیے، سر اور منہ پر کس کر منڈا سے باندھے اور ہانکے کا اشارہ دیا۔ نیزوں کے دستے ان کے کندھوں پر جمے تھے۔

ہانکنے والے سب کے سب گھوڑوں پر سوار ہوئے اور جنگل میں غائب ہو گئے۔ گھنے درختوں میں سے لمبا چکر کاٹ کر وہ آدھے میل پر اسی سیدھے میں آنکلیے اور چڑھائی کرتے ہوئے نساہیبیوں کی طرح سیدھی قطار میں بڑھنے لگے۔ شیشم کے ایک جھنڈ میں انہیں سڑوں کے ایک ریوڑ کے ملنے کی امید تھی، لیکن وہ انہیں توقع سے پہلے ہی مل گئے۔ یہ ان سیاہ فریہ، طاقت ور جانوروں کا ایک بہت بڑا ریوڑ تھا جس کا سواروں سے اچانک سامنا ہو گیا۔ سواروں نے سرعت سے پھیل کر نصف دائرہ بنایا اور انہیں گھیرے میں لے کر شور مچاتے ہوئے اس سمت میں ہانکنے لگے جدھر شکاری بیٹھے تھے۔ سارا جنگل قیامت کے شور سے جاگ اٹھا۔ پرندے پھڑ پھڑا کر اڑے اور چھوٹے چھوٹے جنگلی جانوروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سوار اپنے نیزے سروں سے اوپر اٹھائے، چیخیں مارتے ہوئے ہانکا لگا رہے تھے۔ سڑ اس اچانک حملے سے گھبرا کر چیخیں مارتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ نکلنے کی کوشش میں آخر کار اسی سمت میں بڑھتے جا رہے تھے جدھر کو ہانکے جا رہے تھے۔ اس وقت انسانوں، سڑوں اور گھوڑوں کی چیخوں میں امتیاز کرنا ناممکن تھا۔ نعیم نے سارے جسم میں مکمل سرور کی وہ لہر دوڑتی محسوس کی جو انسان، ہر انسانی قید میں آزاد ہو کر عمداً جانوروں کا رویہ اختیار کرتے وقت محسوس کرتا ہے۔ اس جنگلی ماحول میں جان لینے کی قدیم، ظالم انسانی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی۔

آخر ٹھکنے، بد صورت درندوں کا جلوس کھلی جگہ میں داخل ہوا اور شکاریوں کے سر گڑھوں میں غائب ہو گئے وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے ناک کی سیدھے میں جا رہے تھے۔ یک دم پانچ گز کے فاصلے پر نیزوں کے سرے بلند ہوئے اور سڑ اپنی تمام تر برق رفتاری اور بوجھ کے ساتھ ان کے ساتھ ٹکرائے۔ نیزے ان کی گردنوں، سینوں اور شانوں میں اتر گئے۔ زخمی جانور پیچھے ہٹے، چیخ مار کر آگے بڑھے، پیچھے ہٹے، لیکن فولاد کی تیزانی کے آگے ان کی ہڈیاں نہ گئی اور نیزہ، جو صرف آگے ہی آگے جا سکتا تھا انکی فریہ، گندھی ہوئی چربی کی تہیں پھاڑتا ہوا نیچے اترتا

گیا۔ نیزے کے دستے شکاریوں کے کندھوں میں گڑے جا رہے تھے اور وہ دانت پیس کر زور لگاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے انہیں تھامے بیٹھے تھے۔

پہلے پہلے میں صرف دو جانور رکے۔ سوار پھیل کر دو حصوں میں بٹ گئے اور گھوڑوں کو ایڑ لگا کر، ریوڑ کے جنگل میں غائب ہونے سے پہلے ان کے آگے پہنچ کر انہیں واپس موڑ لئے۔ شکاریوں نے گڑھوں میں پانسہ پلٹ کر پوزیشن لی اور نیزے پیچھے سے آنے والے گلے کے سامنے کر دیے۔ جوگندر سنگھ کی سیدھ میں ایک سؤر آیا۔ اس نے دانت پیس کر نیزہ اس کے سینے پر جا دیا۔ ایک طاقت ور جھٹکے سے سینے کی سخت کھال ادھیڑتا ہوا شانے کی طرف بڑھا اور اپنے پیچھے سفید چربی کی لکیر تنگی کرتا ہوا باہر کو پھسل گیا۔ سؤر انتہائی تیز رفتاری سے آگے اس کے گڑھے میں گرا اور اس کی تیز کینچلی نے شکاری کی پشت پر کندھے سے لے کر ریڑھ کی ہڈی تک چھ انچ لمبا، گہرا گھاؤ ڈال دیا۔ جوگندر سنگھ کے منہ سے درد کی بلبلاہٹ اٹھی۔ دوسرے لمحے زخمی جانور ایک جھونے کے ساتھ باہر نکلا اور بھاگ گیا۔ اس بار میں تین اور سؤر شکاریوں کے ساتھ زور آزمائی کر رہے تھے۔ اگلے پہلے میں چھٹا شکاری بھی مصروف ہو گیا تو ریوڑ کو نکل جانے دیا گیا۔ چینیخیں مارتا ہوا خوف زدہ درندوں کا سیلاب برق رفتاری سے جنگل میں غائب ہو گیا۔ جوگندر سنگھ اٹھا اور شیشم کے ایک بڑے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور پشت پر خون بہہ رہا تھا۔

ایک بہت گھیر والے تنے کے پاس سے گزرتے ہوئے نعیم کو سؤر کی پچھلی ٹانگیں دکھائی دیں۔ گھوڑی کا رخ موڑ کر وہ دوسری طرف جا نکلا۔ سؤر جڑ کے پاس بیٹھا تھا اور سینے سے لے کر شانے تک اس کی کھال کا جیتھرا لٹک رہا تھا۔ سفید سفید گھنی چربی میں سے خون نکل نکل کر زمین پر جمع ہو رہا تھا۔ وہ زخمی آنکھوں سے نعیم کی طرف دیکھتا ہوا پھنکارتے ہوئے بھاری بھاری سانس لینے لگا۔ گھوڑی زور سے ہنہنائی۔ اس وقت دفعتاً نعیم کے دل میں، خوف ناک، بے بس جانور کو دیکھ کر ایک تنگی، طاقت ور، پاگل خواہش پیدا ہوئی اور اس کے سوچنے کی قوت مفقود ہو کر رہ گئی۔ وہ کود کر اترا اور نیزہ اس کے زخم پر رکھ دیا۔

سؤر نے خلاف امید ایک خفیف سی جھرجھری لی اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ نعیم نے نیزہ دبایا۔ سؤر زور سے سر جھٹک کر اٹھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ نعیم نے گھٹنے زمین میں کاڑ دیے اور کندھے پر نیزے کا دستہ جا کر ایک ہاتھ سے اسے تھامے رکھا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ جانور اس کی طاقت سے باہر تھا۔ سؤر پھنکارا اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا۔ نعیم نے خوف اور تحفظِ نفس کی خواہش کے ایک انتہائی حساس لمحے میں بے حد واضح طور پر نیزے کی انی کے چربی کی دیزتہوں کو پھاڑنے کی آواز سنی، کھررر، کھررر۔

”ہے۔ کیا کرتے ہو چوہدری۔“ دور سے ایک آواز آئی اور وہ سب گھوڑے دوڑاتے

ہوئے وہاں پہنچے اور کود کود کر اترنے لگے۔

”چھوڑو مت چودھری، زور لگاؤ۔ ہٹی شلبا۔ ہٹی شلبا۔“ وہ چلائے۔ ”نیزہ اونچا رکھو۔ آگے سے، کندھا نیچا، گھٹنے گاڑو۔ ہت تیرے سؤر کا۔“

”واہکرو۔ یہ لونڈا کیا بیوقوفی کرا۔“ ایک بڑھے سکھ نے غصے سے کہا۔ ”اور پتہ ہے اس کا ایک ہاتھ ہے، ایک۔“

ان کے شور کے درمیان نعیم نے آنکھیں میچ کر بازو، کندھے، سینے اور ٹانگوں کا پورا زور لگایا۔ اچانک سؤر نے ایک اونچی، مرتی ہوئی چیخ ماری اور تھو تھنی نیزے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

”سیدھا دل میں اتر گیا۔ میں تو آواز پہچانتا ہوں۔ ایسی چیخ اسی وقت اٹھتی ہے جب نیزہ دل میں اترتا ہے۔ میری تو عمر سؤروں میں گزری ہے۔“ بڑھے سکھ نے چھاتی پھلا کر کہا۔

جانور کی ٹانگیں کانپیں اور وہ بھاری جسم کے ساتھ زمین پر آ رہا۔ مجمع میں سے ایک شور اٹھا۔ نعیم نے نیزہ چھوڑ دیا اور پرے کھڑا ہو کر پسینہ پونچھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے شکار کی طرف دیکھے بغیر وہ گھوڑی کی باگ پکڑ کر جوگندر سنگھ کی طرف چلا گیا۔ دو جوان مرے ہوئے جانور میں سے نیزہ نکالنے لگے۔

جوگندر سنگھ شیشم کے تے کے ساتھ ٹیک لگائے بٹھا تھا۔ ایک نوجوان سفید سوت جلا کر اس کی راکھ زخم میں بھر رہا تھا۔

”میں نے تمہارا بدلہ لے لیا ہے۔“ نعیم نے کہا۔

وہ تکلیف اور درد کے درمیان مسکرایا۔ ”تم دلیر آدمی ہو۔ تم میرے بھائی ہو۔ مہندر سنگھ ہوتا تو وہ بھی بدلہ لیتا۔“

ایک لحظے کے لیے نعیم کے دل میں تیز، کاٹتا ہوا درد سمٹ آیا۔

شام پڑ رہی تھی جب وہ واپس ہوئے۔ جوہڑ کے کنارے کتے بھونک رہے تھے اور اپلوں کے دھوئیں نے گاؤں کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مغرب میں ابھی تک گزرے ہوئے دن کی سفیدی رکی ہوئی تھی اور مشرقی آسمان پر ستارے ایک ایک کر کے ظاہر ہو رہے تھے۔ کھیتوں پر اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا اور میچ میچ نالیوں میں بہتے ہوئے پانی کا ہلکا شور اٹھ رہا تھا۔ نیچی چھتوں والے خاموش گھروں میں دیے تیزی سے بجھ رہے تھے کہ دن بھر سیلوں کے ساتھ کام کرنے والے کسان جلد سو جاتے ہیں۔

حوہلی کی دیوار کے پاس سے گزرتے ہوئے روشن آفاکی بجھی کو دیکھ کر نعیم چوہکا۔ گھوڑی

روک کر وہ رکابوں میں اٹھا اور دیوار پر سے جھانکنے لگا۔ مٹی کے تیل کے کئی لیپ جل رہے تھے اور احاطے میں روشن آغا کے تقریباً سبھی مزارع جمع تھے۔ وہ اپنے بہترین لباسوں میں تھے اور ان کی شوخ رنگ پگڑیوں میں کے بیچ لگے طرے آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ وہ دری پر بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ منشی دیوان خانے کے دروازے پر ظاہر ہوا اور چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں کو گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا، پھر اپنی باریک تیز آواز میں بولا:

”احمد دین۔“

سب نے مڑ کر دیکھا۔ احمد دین گھٹنوں پر اٹھا۔

”اس کے منگے اناج سے بھرے ہیں اور اس نے ’موثرانہ‘ نہیں دیا۔ روشن آغا کے سامنے پیش کیا جائے۔“ منشی نے کہا۔

احمد دین سحر زدہ سا، آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نئی ابرق لگی سفید پگڑی کا شملہ سیدھا کھڑا تھا اور اس نے لمبے لڑوں والا نیلا ریشمی تہمد باندھ رکھا تھا۔ اس کے تیل ملے ہوئے چہرے کی سیاہ جلد چمک رہی تھی۔

”میل کی طرح۔ میل کی طرح۔“ منشی نے کڑک کر کہا اور دو نوجوان لڑکوں کی طرف دیکھا۔ لڑکوں نے اٹھ کر اس کی بغلا میں ہاتھ دیے اور گھٹنوں کے بل گرا دیا۔ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر ہو گیا۔ منشی نے جھٹک کر اس کی پگڑی اتاری اور لڑکے کے ہاتھ میں دی۔

”میل کو رسی ڈالو۔“ اس نے کہا لڑکے نے پگڑی کا ایک سرا اس کے گلے میں باندھا، دوسرا ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”اس کے منہ میں چارہ دو۔“ منشی نے کہا ایک لڑکا خشک گھاس لا کر اس کے منہ میں ٹھونسنے لگا۔

احمد دین نے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلانے اور پھٹی ہوئی آواز میں چلایا: ”نہیں۔ نہیں۔“ اس کی باپجھوں سے گھاس کے تئکے لٹک رہے تھے۔ لڑکوں نے گھاس ٹھونس کر اس کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ ”چلو۔“ منشی رسی کھینچتے ہوئے بولا۔

بوڑھا کسان چوپایوں کی طرح زمین پر چلنے اور جلد جلد آنکھیں جھپکنے لگا۔ انتہائی ذلت کے احساس سے اس کا چہرہ بد نما ہو گیا، جیسے فالج زدہ، یامیدان جنگ میں مرے ہوئے آدمی کا چہرہ ہوتا ہے۔

یکلخت بہت زیادہ گھبرا کر نعیم نے گھوڑی کی پسلیوں میں ایڑیاں ماریں اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ روشن آغا کی بجھی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پگڑی ہوئی

کیکر کی چھڑی گھما کر اس کی چھت پر ماری جو پھسلتی ہوئی دروازے کے قریب جاگری کچھ دیر کے بعد دروازے میں سے ایک سایہ نکلا اور پھیلتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

گلیاں ویران اور تاریک تھیں۔ گھوڑی اپنی مرضی سے چل رہی تھی کہ اس نے پیچھے آنے والے کے تیز قدموں کی چاپ سنی اور کان کھڑے کر کے پھنکاری۔ نعیم نے مڑ کر دیکھا۔

”میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ آنے والے نے اس کی رکاب پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

نعیم نے تاریکی میں نوجوان سکول ماسٹر کی آواز پہچان لی۔ ”میرے مکان تک چلو گے؟“

”تمہارا مکان کہاں ہے؟“

”وہاں۔“ ماسٹر نے اندھیرے میں شمال کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گھوڑی سے اتر پڑا، کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا، پھر باگیں پکڑ کر خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔

”آج بہت تھک گیا ہوں۔“ چلتے چلتے نعیم نے کہا۔

”میں تمہیں سبز چائے پلاؤں گا۔“

باقی راستہ انہوں نے خاموشی سے طے کیا۔

ایک چھوٹے سے شکستہ دیواروں والے صحن کو، جس میں ایک گھوڑا کھڑا گھاس کھا رہا تھا، پار کر کے ماسٹر نے کہا۔ ”میں روشنی کرتا ہوں۔“

کمرے کی دیوار کے ساتھ گدے شیشو والی لائٹیں لٹک رہی تھی۔ اس کے اوپر چھت دھوئیں سے سیاہ ہو چکی تھی۔ چھت کیکر کے ٹیڑھے میڑھے ڈنڈوں اور پھونس کی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ بارش کے پانی کی لکیریں تھیں۔ ایک طرف چولہا تھا جس کے گرد کھانے پینے کے چند برتن دھرے تھے۔ لمبی چوڑی کھاٹ پر سفید بستر بچھا تھا جس پر کچھ کتابیں رکھی تھیں۔ میز پر پنسلیں اور بہت سے سفید کاغذ پڑے تھے۔ ایک کرسی تھی جس پر کتابیں تھیں۔ ایک ٹرنک تھا، اس پر بھی کتابیں تھیں۔

”بیٹھ جاؤ“ کرسی پر سے کتابیں اٹھاتے ہوئے ماسٹر نے کہا۔

پھر وہ کیکر کی لکڑیاں توڑ توڑ کر ترتیب کے ساتھ چولہے میں رکھنے لگا۔ خاموش، نیم روشن کمرے میں لکڑیوں کے چٹخ کر جلنے کی آواز پیدا ہوئی۔

”نعیم، تمہیں افسوس ہے؟“ وہ آگ پر لکڑیاں پھینکتے ہوئے بولا۔

”کس کا؟“

”جو ابھی ہوا۔ تم نے دیکھا نہیں؟“

کافی دیر بعد نعیم نے بھاری آواز میں کہا: ”ہاں۔“

”روشن آفا برا آدمی نہیں۔ میں نے دیکھا کہ جب احمد دین میل کی طرح چلتا ہوا اندر پہنچا

تو اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس نے سب کو باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ "وہ پانی کی کیتلی ہگ پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔" لیکن یہ بکواس ہے۔ ہمیں اس سارے چکر کو ختم کرنا ہے۔"

نعیم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ماسٹر نے کواڑ بند کر کے کنڈی چڑھا دی اور نعیم کے سامنے آکھڑا ہوا۔ "تم نے اپنے باپ کی حالت دیکھی ہے؟" اس نے گہری، صاف آواز میں پوچھا۔

نعیم کی آنکھوں میں وحشت کی ہلکی سی جھلک ظاہر ہوئی۔

"یہ سارا نظام روی نہیں؟ بتاؤ؟"

"پھر؟"

"مجھے بتاؤ،" ماسٹر نے ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا، "اگر تمہیں بتایا جائے کہ تم اس سارے نظام کو بدل سکتے ہو تو؟"

نعیم نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ "تم جانتے ہو ماسٹر میں ہر چیز کے لیے تیار ہوں۔ مگر کیسے؟"

ماسٹر جواب دینے کی بجائے جا کر چائے بنانے لگا۔

وہ پچیس تیس کے لگ بھگ جوان آدمی تھا لیکن اس کے بڑے سے، لمبوترے چہرے پر داڑھی بہت گھنی اور کھردری تھی اور جلد موٹی اور شکن آلود تھی۔ وہ ایک غریب کسان تھا۔ چائے کے دو پیالے میز پر رکھ کر وہ کھاٹ پر بیٹھ گیا اور کہنیاں میز پر رکھ کر آگے کو جھکا۔ "مجھے، اپنا، کام کرنا ہے۔ تمہارا کام تمہیں ضلع کا سیکرٹری بتائے گا۔ وہ تمہیں جانتا ہے۔ اس نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔"

"میں اسے نہیں جانتا۔ اس کا کیا نام ہے؟"

"وہ تمہیں جانتا ہے۔ ہمارے اور بھی کئی آدمی تمہیں جانتے ہیں۔"

"کانگریس؟"

"ہاں۔"

وہ خاموش بیٹھے خوشبودار، چائے کا پھیکا عرق پیتے رہے مٹی کے پیالوں میں سے دودھیا نیم گرم بھاپ اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔

"تمہارا یہاں کیا کام ہے؟" نعیم نے پوچھا۔

"پڑھاتا ہوں۔ اس کے علاوہ کئی کام ہیں جن کا تم سے مطلب نہیں ہمارے آدمی آس پاس کے گاؤں میں ہیں۔" چائے ختم کر کے نعیم اٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر؟" ماسٹر نے پوچھا۔

"میں تیار ہوں۔ تم سے مل کر جاؤں گا۔ شاید پرسوں۔"

”اللہ کرم کرے۔“ ماسٹر بے تکلفی سے بڑا سا کھردرا ہاتھ بڑھا کر سادگی سے مسکرایا۔ اس کی سادہ، بے فن آنکھیں دیکھ کر نعیم کا جی چاہا کہ گرجوشی سے اس کے ساتھ مصافحہ کرے۔ اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور ہنسا۔ اپنے اپنے راستے پر جانے سے پہلے رفاقت کے اس ایک لمحے میں اس نے اس اجنبی کے لیے بے پناہ دوستی کا جذبہ محسوس کیا۔ سر جھکائے بیٹھا، گھوڑے کو قدم قدم چلاتا ہوا وہ سنسان کلیوں میں داخل ہوا۔ گھوڑا اپنی مرضی سے، اونچے نیچے مانوس پتھریلے راستوں پر چلتا گھر کی جانب جا رہا تھا۔ پتھروں پر اس کے قدموں کی آواز اندھیرے میں دور تک سنی جا سکتی تھی۔ نہر کی پل سے اترتے ہوئے اس نے سامنے کی طرف دیکھا اور اس کا دل یکبارگی ٹھہر گیا۔ اتر کر اس نے نہر سے پانی پییا، گھوڑی کو پلایا، اور اسی سمت میں دوبارہ دیکھا۔ روشن آغا کی بجھی ایک گڑھے میں پھنسی ہوئی تھی اور تین کسان اس کے پیہے سے چمٹے زور لگا رہے تھے۔ دور سے اس نے ادھیڑ عمر، خوبصورت خالہ کو دیکھا جو اگلا پردہ اٹھائے بیٹھی تھی۔ بجھی کے برابر پہنچ کر بالکل غیر محسوس طور پر نعیم کی گھوڑی رک گئی۔ وہ منہ موڑ کر پیہے کو دیکھنے لگا۔ اجنبی گھوڑے ہنہنائے۔ خالہ تعجب اور اپنائیت سے مسکرائی۔

”نعیم، کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے کہا۔

جواب دیے بغیر وہ ڈھٹائی سے کھڑا پیہے کو دیکھتا رہا۔

”نعیم، تم نے کراس جیتا تھا؟“

”ہاں۔“ وہ نیچے دیکھتے ہوئے بڑ بڑایا۔

”کیسے؟“

اس نے سامنے دیکھا اور گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔ دائیں طرف اٹھے ہوئے پردے میں اسے ایک چہرہ نظر آیا۔ بہت پرانا، بہت مانوس چہرہ۔ اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی ابھی گاؤں میں، یا راستے کے جنگل میں، یا خواب میں یہ چہرہ دیکھا ہے اور اسے اچھی طرح سے جانتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی سوچ ختم ہو گئی اور احساس اوپر آ گیا۔ اس کی ایڑیاں زیادہ تیزی سے گھوڑی کی پسلیوں پر پڑنے لگیں۔

وہ ہلکی سڑک پر چڑھا ہی تھا کہ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ تھک چکا ہے اور اب ایک پل کو سواری نہیں کر سکتا۔ پلایا کے پاس اس نے گھوڑی روکی اور بھاری جسم کے ساتھ اتر کر دیوار پر بیٹھ گیا۔ نیچے برسائی نالہ خشک پڑا تھا اور جگہ جگہ مویشیوں کے گوبر کے ڈھیر لگے تھے۔ اس کا دایاں ہاتھ مضبوطی سے لکڑی کی کلائی کو پکڑے تھا اور وہ نیچے نالے میں چلتے ہوئے ایک مینڈک کو دیکھ رہا تھا۔ پھر غیر محسوس طریقے پر اس نے لکڑی کو بازو سے

علیحدہ کیا، وہ پہلی بار اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ انگلیوں کے جوڑوں پر نہایت کاری گری سے انسانی جلد کی جھریاں بنائی گئی تھیں، ناخن گول اور خوب صورت تھے، کلائی پر ابھرتا ہوا، کسا ہوا صحت مند گوشت تھا اور ہتھیلی میں لکیریں تھیں۔ یہ سب اس نے اس وقت بھی نہیں دیکھا تھا جب وہ بھٹی کے ہسپتال میں اسے فٹ کروا رہا تھا۔ لکڑی کے کھلے ہوئے، چوڑے ہاتھ میں سے ایک چہرہ ابھرا۔ اس چہرے کے شدید حزن اور میکسی کو محسوس کر کے اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی اور اس نے لکڑی چھاتی میں دبا لی۔ سفید ہوتے ہوئے ناخنوں کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ وہ چہرہ، وہ عورت، وہ واحد عورت تھی جو دنیا میں اسے بے پناہ رنج دے سکتی تھی۔ عمر بھر! تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ زرد ہو گیا اور تیز، کاٹتے ہوئے دانت ہوشوں میں کھسنے لگے۔

تمہارا محبوب نام، بہت پرانے خواب کی طرح محبوب اور خوب صورت، ہوا پر بہتا ہوا آیا اور میں نے چونک کر دیکھا۔ تم سامنے کھڑے تھے۔ ہمیشہ کی طرح دلکش، اداس۔ لیکن اس سے پہلے بھی میں نے تمہیں دیکھا ہے۔ کہاں؟ کہاں کہاں؟ سبزے پر، پہاڑوں پر، برف میں چلتے ہوئے، نیننی تال میں، جب لکڑی کے برآمدے میں، مونڈھے پر بیٹھ کر ٹین کی چھت پر برستی ہوئی بارش کی آواز میں نے سنی تھی تو تم گزرے تھے، اور نیچے مکئی کے کھیت میں باگھ بول رہا تھا اور جب تم گزر گئے تھے تو رات چاروں طرف پھیل گئی تھی اور ہم نے شکار کیے ہوئے پہاڑی بکرے کا شوربا پیا تھا۔ اور بازاروں میں، اور گلیوں میں، اور ریل گاڑی میں، مجھے یاد نہیں کتنی بار اور کہاں کہاں تمہیں دیکھا ہے، لیکن میں تمہیں جانتی ہوں۔ ہم سب تمہیں جانتے ہیں۔ تم روشن پور کے رہنے والے ہو اور بہت زود رنج ہو۔ تم نے ایک بازو گنوا کر ایک کراس حاصل کیا ہے۔ تم روشن پور سے چلے گئے تھے۔ تم سے کس نے کہا تھا؟ تمہیں محبت کرنے کا ڈھنگ آتا ہے؟ یہ کیسا ڈھنگ تھا؟ تم سیدھے چلے گئے، لیکن راستے میں جو جنکل آئے گا اس میں میں تمہیں پھر دیکھوں گی۔ میں جانتی ہوں، اس لئے کہ تم بھگت رہے ہو۔ میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بات صرف یہ ہے کہ تم بے حد بنیادی، بے حد قدیم اور بے حد خالص مرد ہو۔ میں نے کچھ نہیں کہا تھا، غلطی تمہاری تھی، تمہارا یہ کسبخت، مغرور، مردود سر۔ خدایا!

عذرا نے پردہ گرا کر چھکولے کھاتی ہوئی بکھی کی دیوار پر سر ٹیک دیا اور خشک، جلتی ہوئی آنکھوں سے اندر بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھنے لگی۔

سورج ڈھل رہا تھا جب وہ نقشے کے مطابق شہر کے اس چوراہے پر پہنچا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنی منزل مقصود پر کھڑا تھا۔

یہ ایک پرانی طرز کا، دو منزلہ پرانی لینٹوں کا بنا ہوا منان تھا جس کی مرمت کی طرف توجہ

نہیں کی گئی تھی۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اس نے بند دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازے پر کوئی کنڈی نہ تھی۔ دو بار کھٹکھٹانے پر بھی کوئی جواب نہ ملا تو اس نے رکاب میں سے پاؤں نکالا اور اس کے لوہے کو چند بار پرانی لکڑی کے دروازے پر مارا۔ اندر سے ایک چار پائی کھسیٹنے کی آواز آئی اور خاموشی چھا گئی۔ پھر کوئی چلتا ہوا آیا اور دروازہ کھلا۔ یہ ایک پست قد سفید بالوں والا بڈھا تھا جس نے ریلوے ملازمین کی نیلی سوت کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ عام محنتی لوگوں کا سا تھا۔

”یہاں کون رہتا ہے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”میں رہتا ہوں۔“ بڈھے نے سکون سے کہا۔ ”میں ریلوے میں ملازم تھا۔۔۔“
 نعیم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ ”اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ میں روشن پور سے آیا ہوں۔ مجھے ہری چند نے بھیجا ہے۔ ماسٹر ہری چند۔“

”ٹھہرو۔“ بڈھے نے کہا اور اندر غائب ہو گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور سرد کثیف ہوا کی مخصوص، بیمار کر دینے والی بو آ رہی تھی، جیسی تہہ خانوں میں سے آتی ہے۔ چند لمحے بعد بڈھا دروازے پر نمودار ہوا۔

”تمہیں سواری کا بہت شوق ہے۔“ اس نے نعیم کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر کہا۔ ”اسے یہاں باندھ دو۔ ہمارے ہاں سوار بہت کم آتے ہیں۔“
 اندر داخل ہو کر وہ بائیں ہاتھ کو مڑے۔ سامنے ایک اور دروازہ تھا جس میں ایک لمبے قد کا، دبلا پتلا زرد رو آدمی کھڑا تھا۔ اگلے کمرے میں بھی کوئی لیمنپ نہ تھا، ایک پچھلے کمرے میں سے نکلتی ہوئی شعاعوں نے کمرے کو نیم روشن کر رکھا تھا۔ لمبے آدمی نے گرجوشی سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔

”میرا نام بالکنڈ ہے۔ میں ضلع کمیٹی کا اسٹنٹ سیکرٹری ہوں۔“
 وہ پچھلے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے کی چھت نیچی تھی اور تین جگہ پر لیکر کے پتلے تے چھت کو سہارا دینے کے لیے زمین پر کھڑے کیے گئے تھے۔ درمیان والے تے سے مٹی کے تیل کی لائین لٹک رہی تھی۔ اس کے نیچے ایک بہت بڑی بے ڈھنگی سی میز رکھی تھی جس پر لکھے اور ان لکھے کافدوں کے انبار لگے تھے۔ ایک پرانا لکڑی کا قلمدان درمیان میں پڑا تھا۔ سٹول پر ایک ملگجے بالوں والا شخص کہنیاں میز پر رکھ کر جھکا ہوا تھا۔ اس کا چشمہ میز پر پڑا تھا۔ دوسرے سٹول پر ایک نوجوان بیٹھا چند کافد دیکھ رہا تھا۔
 ان دونوں کے داخل ہونے پر ملگجے بالوں والے نے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ میلے سنولائے ہوئے رنگ کا تھا، جیسے گھوڑے کی لید کے اپلوں کا ہوتا ہے۔

”روشن پور سے ، ہری چند نے انہیں“ بالکلند نے کہا ۔

”روشن پور سے ؟ بوڑھے نے حیرت انگیز طور پر جوان آواز میں دہرایا ۔
”نعیم احمد خا ۔“

”نعیم احمد خان ۔“ اس نے اٹھ کر گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ ”میں تمہیں جانتا ہوں ۔ تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا ۔ میں ابھی فارغ ہوتا ہوں ۔ بالکلند ۔“
وہ پھر سر ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گیا ۔ پھر اس نے چشمہ اٹھا کر لکھایا اور نوجوان کی طرف دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا ۔ ”یہ تو برا ہوا ۔ تھ تھ تھ ۔ بہت برا ۔“

آتشدان کے قریب سٹول پر بیٹھتے ہوئے نعیم نے دیکھا کہ سیکرٹری کی میز کی دو ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں ۔ ایک کی جگہ لیکر کی ٹیڑھی میڑھی موٹی شاخ میخوں سے جڑی گئی تھی ، اور دوسری طرف اوپر نیچے رکھی ہوئی اینٹیں میز کو سہارا دیے ہوئے تھیں ۔ کمرے میں اسی تہہ خانے والی بو کے ساتھ مٹی کے تیل اور جلتی ہوئی سوت کی بتی کی بو شامل تھی ۔

بغیر پتے کا ایک لفافہ نوجوان کے ہاتھ میں تھمانے کے بعد وہ نعیم کی طرف متوجہ ہوا :
”آؤ یہاں بیٹھو ۔ تمہیں دیکھ کر میں بہت خوش ہوا ہوں ۔ میں تمہیں دو سال سے جانتا ہوں ۔ تم مئی ۱۹۱۳ء کی روشن محل کی پارٹی میں تھے ۔“

نعیم نے بے حد چونک کر اسے دیکھا ، جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی بات کر رہا ہو ۔
”میں نے تمہیں دور سے دیکھا تھا ۔ اسی وقت سے ہم تمہاری تلاش میں تھے ۔ لیکن جب ہم نے یہاں پر دفتر قائم کیا تو تم جنگ پر جا چکے تھے ۔“ وہ سر ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ دبانے لگا۔ کانگریس کے ایسے کام کرو کے۔“

”اسی لیے آیا ہوں ۔“ نعیم نے مٹی کے تیل کی بو حلق میں محسوس کی ۔
”ہاں ، یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی ۔ مگر تم نے جنگ میں نوکری کی ہے ، اور امتیاز کے ساتھ“

”اوہ ۔“ نعیم نے جلدی سے اس کی بات کاٹی ، ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔“
”ٹھیک ہے ۔ ہمارے پاس فنڈ نہیں ہیں ۔ ہم صرف روٹی اور کپڑا مہیا کر سکتے ہیں اور ۔ اور ہو سکتا ہے کہ تمہاری کراس کی زمین بھی چلی جائے ۔ ضبط ہو جائے ۔“
”میں نے کہا تھا ۔ کوئی فرق نہیں پڑتا ۔“

”اچھا اچھا ۔“ وہ سٹول کھسیٹ کر نعیم کے قریب ہو گیا ۔ ”ہمیں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سخت ضرورت ہے ۔ خصوصاً اس کام کے لیے جو تمہارے ذمے ہے ۔ یہ کام عرصے سے میرے دماغ میں تھا ۔ جتنا دشوار یہ کام ہے اس سے زیادہ دشوار اس کے لیے موزوں آدمی کے انتخاب کا سوال تھا ۔ تم اس کے لیے موزوں ترین شخص ہو ۔ میں جانتا ہوں ۔ مگر تمہیں تربیت

کی ضرورت ہے۔ تم پندرہ دن تک یہاں رہو گے۔ بالکنند تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔ میرے پاس آنے کی تمہیں اب ضرورت نہیں۔ مگر جاتی دفعہ مجھ سے مل کر جانا۔ خدا حافظ۔“

اس سے مصافحہ کرتے ہوئے نعیم نے محسوس کیا کہ اس کے مردہ چہرے کے برعکس، اس کے ہاتھوں کا لمس، اس کی آواز کی مانند حیرت انگیز طور پر جوان اور گرم تھا۔ درمیانی کمرے میں اگر بالکنند نے لائین روشن کی۔ کمرے میں صرف ایک چار پائی تھی جس پر بستر لگا ہوا تھا۔ بالکنند نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میرا بستر ہے۔ تم اس پر سو سکتے ہو۔ جوئیں ووئیں نہیں ہیں، بے فکر رہو۔“

”تم کہاں سوؤ گے؟“ نعیم نے پوچھا۔
 ”میں بھی سو جاؤں گا۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔
 نعیم نے ٹوپی اتار کر اس کے ساتھ گرد آلود چہرہ صاف کیا اور بستر کے کونے پر بیٹھ گیا۔
 ”میں سویر سے بھوکا ہوں۔“

”چاول پک گئے ہوں گے۔“ بالکنند نے اپنے آپ سے کہا۔
 کچھ دیر کے بعد نعیم نے گوبھی کے شوربے کے ساتھ سرخ ابلے ہوئے چاول پیٹ بھر کر کھائے اور بالکنند سے ہاتھ کاٹنا ہوا سگریٹ قبول کیا جس کا کاغذ خاصا ردی تھا۔
 دو ہفتے کے بعد نعیم نے سیکرٹری کی میز پر سے اٹھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا: ”خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ سیکرٹری نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ”اچھی طرح سوچو، سمجھو دیکھو اور سنو، اور وہی کرو جو مناسب اور درست ہو اور۔ اپنی جان کی حفاظت کرو۔ تم میرے بیٹے ہو، لیکن سب سے اول تم ہندوستان کے بیٹے ہو۔ خدا حافظ۔“
 دروازے پر وہ بالکنند سے رخصت ہوا۔

”تم بہت خطرناک لوگوں میں جا رہے ہو۔ مگر ہم میں سے کسی کو یہ کام بھی کرنا تھا۔“
 بالکنند نے اپنی تیز چمکیلی آنکھوں سے، جو اس کے چہرے پر اجنبی دکھائی دیتی تھیں، دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری زندگی تمہاری نسبت ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ بہت زیادہ۔ میں دعا کروں گا کہ تم ہندوستان کی آزادی اپنی آنکھوں سے، اپنے وجود کی پوری قوتوں کے ساتھ دیکھو اور....“

”بالکنند۔“ نعیم نے لائین کی دھندلی روشنی میں اسے مخاطب کیا۔

”تمہاری آنکھیں بڑی غیر معمولی ہیں۔ مجھے پسند ہیں۔“

بالکنند لڑکیوں کی طرح شرمایا، اور اس کے زرد چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی:

”زندگی کی زیادہ تر قوتیں جو ہم پر عمل پیرا ہوتی ہیں ، عموماً آنکھوں پر اثر انداز ہوتی ہیں ۔ تم بھی جب اصل زندگی کے ، تکلیف دہ اور گرد آلود محنت کے چند سال گزار لو گے ، اور تمہارے جسم پر چند اور خراشیں آجائیں گی ، تو تمہاری آنکھیں بھی غیر معمولی ہو جائیں گی ۔ یا روشن ، یا اندھی ۔ یہ تمہاری آنکھوں پر منحصر ہے ۔“ وہ منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا ۔ اس کے چہرے پر ، جو لائین کی روشنی میں آگیا تھا ، الوداعی نظر ڈالتے ہوئے نعیم نے اس کے ہونٹوں کی خفیف ، اداس مسکراہٹ کو محسوس کیا ۔

(۱۳)

”آج چالیس روز ہو گئے ۔“ اس نے لیٹے لیٹے سوچا اور سیدھا ہاتھ پھیلا کر پتھریلی زمین کو محسوس کیا ۔

یہ ایک بڑا سا ، تاریک کمرہ تھا جس کا فرش اور دیواریں بڑے بڑے ، میلے پتھروں کی بنی ہوئی تھیں ۔ چھت اونچی اور تاریک تھی ۔ کمرے کی واحد کھڑکی بند تھی ۔ ایک بے کواڑ کا دروازہ لکڑی کے بھاری تختے کی مدد سے بند کیا گیا تھا ۔ چھت کے قریب چھوٹے سے سوراخ نما روشندان میں آنے والی روشنی کمرے کی تاریکی میں اضافہ کر رہی تھی ۔ وہ دیر سے فرش پر لیٹا ہوا تھا ۔

”آج چالیسواں دن ہے ۔“ اس نے مایوسی سے سوچا ۔ ”اور میں نے کچھ نہیں کیا ۔ بلکہ ان کے ساتھ مل کر خود ۔ خود بھی ۔“ وہ جھلا کر اٹھا اور گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھ گیا ۔

”اور یہ شیلما ۔ کبجنت ۔“

”ایک ۔ دو ۔ تین ۔ تین لائیں ، جب میں بھی شامل تھا ۔ تین ۔“ اس نے تکلیف سے دہرایا ۔ ”ایک کے لیے تو میں نے خود ڈائنامائٹ ۔ بالکنڈ کو اگر پتہ چل جائے کہ اس کے عزیز ہندوستان کے ساتھ میں کیا سلوک کر رہا ہوں ۔ عزیز ہندوستان مائی فٹ ۔ میں کیا کر سکتا ہوں ۔ یہ ضروری تھا ۔ ان خطرناک ، مایوس ، بھیرٹیوں ، حرامزادوں ۔“ اس نے بہت دل میں کالی دی ۔ ”دھشت پسندوں کے ہاتھ رہنے کے لیے اور کیا کر سکتا ہوں ۔“ خیالات کی روانی کے پیچھے ، یا درمیان میں کہیں : اس نے یہ بھی سوچا کہ یہ تیسری بڑی کالی ہے جو اپنی عمر میں اس نے دی ۔ ”ایسے نامراد لوگ میں نے میدان جنگ میں بھی نہیں دیکھے ۔ یا اللہ ، وہ انگریز ، کس قدر بے دردی سے اسے ۔“ میں نے جھرجھری لی ۔

دروازے پر لکڑی کا تختہ آہستہ سے ہٹا اور ایک لڑکی کا گول چہرہ نمودار ہوا ۔

”لکڑ بند ، کیا حال ہے ؟“ اس نے بچوں کے شوخ لہجے میں پوچھا ۔

”ٹھیک ہے۔“

لڑکی تختہ ہٹا کر اندر آگئی۔ اس کا چہرہ چھوٹا اور جسم گدرا یا ہوا تھا وہ اپنی عمر کے لحاظ سے لمبی دکھائی دیتی تھی۔

”تم آج کیوں نہیں گئے؟“ اس نے نعیم پر جھک کر پوچھا۔

”میری طبیعت خراب تھی۔“

”بارود لگانے سے ڈرتے ہو؟“

”بکو مت۔“ وہ پھر فرش پر لیٹ گیا۔ کمرے میں دو ایک بے مقصد چکر لگانے کے بعد

لڑکی باہر نکل گئی۔ جو ذرا سی روشنی دروازے کے رستے آ رہی تھی ختم ہو گئی۔

”آج میں نہیں گیا۔ ٹھیک ہے۔ کل درد سر کا بہانہ بھی نہ بناؤں گا، صاف انکار کر

دوں گا۔ پہلے ہی کافی بے گناہ خون بہا لیا ہے۔ لیکن اس کا فائدہ؟ میں سب کچھ کہہ کیوں

نہیں چکتا ہوں۔ اسی؟ لاقوۃ۔ مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں ان سے کچھ

نہیں کہہ سکتا۔ یہ اتنے اچھے، اتنے دکھی، اتنے۔ اور یہ شیلہ، شیلہ، یہ لڑکی۔“ لکڑی کا تختہ

پھر کھسکا اور شیلہ نے اندر جھانکا۔

”لکڑ بند، چائے پیو گے؟“

”نہیں۔“ اس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

وہ اندر آکر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”کیوں، بارود لگانے سے ڈر لگتا ہے؟“

”مت ہنسو۔“ نعیم نے خفگی سے کہا۔

”کیوں، بارود تو میں بھی لگا سکتی ہوں۔“ وہ دوبارہ ہنسی۔

نعیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا دیکھتے ہو؟“ شیلہ نے آنکھیں چمکا کر کہا۔

وہ چپکے سے اٹھ کر دیوار کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چند لمحوں تک وہ کھڑکی کی زنگ آلود چٹخنی

سے الجھتا اور سرخ ہوتا رہا۔

”اسے مت کھولو۔“ شیلہ نے کہا۔ ”بابا ناراض ہو گا۔“

اس نے کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا سرکایا۔ روشنی کی ایک لمبی لکیر کمرے میں داخل ہوئی۔

سامنے چھوٹے سے پہاڑی گاؤں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ اوپر نیچے پنے ہوئے لکڑی

کے مکان دور سے سیڑھیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ گاؤں کے دامن میں گھنے، سیاہ باغ

تھے۔ ان سے نیچے کھیتوں میں دھان کی فصل کھڑی تھی۔

”اور یہ کبخت بابا، آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ کس کے ساتھ ہے!“ اس نے ہتھیلیوں

سے آنکھوں کو ملا۔ ”اتنی مدت سے دن کی روشنی میں ہریالی نہیں دیکھی۔“

”لکڑ بند سنو۔“ شیلہ اس کے قریب آکر بولی۔

”مجھ کو لکڑ بند مت کہو۔“ نعیم نے خشکی سے کہا۔

”کیوں؟“

”کیوں؟ کیوں؟“ اس نے جل کر نقل اتاری۔ ”نعیم احمد خان میرا نام ہے۔“

”بھائی نے مجھے بنایا تھا کہ تمہارا یہ۔“ اس نے مصنوعی ہاتھ کو ڈرتے ڈرتے چھوا۔

”لکڑی کا ہے۔ تو۔ ہمارے گاؤں میں ایک لنگڑا تھا، ایک باؤلا تھا۔ ہم اسے لنگڑا اور اسے باؤلا کہتے تھے۔“

”اچھا تو سنو۔ ہم یوں نہیں کہتے۔ ہم کہتے ہیں نعیم احمد خان اور شیلہ رانی۔ کہو؟“

”نعیم احمد خان اور شیلہ رانی۔“

دونوں ہنس پڑے۔ دھان کے کھیت پر سے مرغابیوں کی ڈار گزر رہی تھی۔

”نعیم احمد خان، تم بات کیوں نہیں کرتے؟“

”کرتا ہوں۔“

”کب؟ اتنے مہینے ہو گئے تم نے کبھی بات نہیں کی۔“

”صرف ایک مہینہ اور دس دن ہوئے ہیں۔“

”تم بڑا حساب رکھتے ہو۔“

”اچھا سنو۔ میرا یہ ہاتھ اصلی ہاتھ ہے۔ دیکھو۔“ اس نے لکڑی کی اٹھکیوں سے اس کی

ناک کو چھوا۔ ”یہ تمہاری ناک ہے۔ میں محسوس کر سکتا ہوں۔ یہ تمہاری آنکھیں ہیں۔ یہ

ہونٹ ہیں، یہ کال ہیں، یہ ٹھوڑی ہے۔ یہ گردن ہے۔“ وہ دیر تک لڑکی کے چہرے کی

گندمی، بے داغ جلد پر سرد، ٹھوس اٹھکیاں پھیرتا رہا، اور اس نے محسوس کیا جیسے کہ وہ اس

کی اصلی اٹھکیاں ہیں اور ان میں خون دوڑ رہا ہے اور لڑکی کی جلد کا گرم لمس خون میں شامل ہو

کر اس کے سارے بدن میں گردش کر رہا ہے اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے ہیں۔

لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”نعیم احمد خان، تم کل۔“

”نعیم احمد خان مت کہو۔ صرف نعیم کہو۔“

”تمہارے کتنے نام ہیں۔“

وہ ہنسا۔

”نعیم کل جاؤ گے؟“

”کہاں؟“

”لائن پر -“

”نہیں - تمہیں ہر بات کا کیسے پتہ ہوتا ہے -“ وہ غرایا -

”مجھے ہر بات کا پتہ ہوتا ہے -“ لڑکی نے آنکھیں نچا کر کہا - ”کیوں نہیں جاؤ گے؟“

”میں یہ کام نہیں کر سکتا -“

”یہاں کیوں آئے ہو پھر؟“

”کیوں؟ اررر - پتہ نہیں -“

”پتہ نہیں؟“ لڑکی نے ہلکا سا قبہہ لگایا - ”روٹی یہاں مفت نہیں ملتی جناب - واپس

جائے -“

”اوہ -“ نعیم نے کال پھلا کر سانس چھوڑی - ”میں واپس چلا جاؤں گا -“

لڑکی آنکھیں جھپکاتی ہوئی اس کی طرف دیکھتی رہی ”نعیم ایک بات بتاؤ -“

”کیا -“

”تم مجھ سے ملنے کے لیے یہاں رہ گئے تھے؟“

”نہیں -“

”پھر؟“

”میری طبیعت خراب تھی -“

وہ ایک دم بچھ گئی - ”اچھا!“ اس نے باہر دیکھتے ہوئے بے خیالی سے کہا - کھڑکی میں سے آتی ہوئی ستاروں کی روشنی میں اس کے ہونٹوں کی باریک ، سرخ جلتی ہوئی لکیریں بہت مدہم ہو گئیں -

نعیم ہنسا اور سیدھے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا - ”اچھا مانا کہ تمہارے لیے ٹھہر گیا

تھا -“

لڑکی کی آنکھیں اندھیرے میں چمکیں - ”تو ٹھیک ہے -“

”کیا؟“

”میں تبھی سمجھ گئی تھی - تمہاری آواز بیماروں والی نہیں تھی -“

اندھیرے میں نعیم نے کھوکھلی ہنسی کی آواز واضح طور پر سنی - اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی

بند کرنا چاہی لیکن شیلارستے میں کھڑی رہی -

”کیا دیکھ رہی ہو؟“

”کاؤں -“

”تمہارا بھی کاؤں تھا؟“

”ہاں - وہ میدانوں میں تھا اور بڑا زرخیز تھا -“
 ”ناگپور کے قریب؟“

”ہاں - تمہیں کیسے پتہ ہے؟“

”تمہارے بھائی نے بتایا تھا - تمہارا وہاں کوئی دوست تھا؟“
 ”نہیں -“

”تم جھوٹ بولتی ہو -“

”نہیں - نہیں -“ وہ نیچی آواز میں چیخی -

نعیم نے کندھے اچکائے - ”یونہی مجھے خیال ہوا تھا؟“

دونوں خاموش کھڑے رہے - پھر لڑکی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا : ”مدن گھر سے بھاگ گیا - میں اکیلی اکیلی کھیلا کرتی تھی - گاؤں میں ہر سال بیضہ پھیلتا تھا - پہلے ماں مری ، پھر باپ - پھر مدن کہیں سے آگیا - پھر -“

”مجھے پتہ ہے -“ نعیم نے ہاتھ سے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا - ”مجھے سب پتہ ہے - تمہارے بھائی نے بتایا تھا -“
 ”کب؟“

”جب پہلی بار لائن پر گئے تھے - تم پر بہت ظلم ہوئے ہیں -“

”اچھا -!“ شیلانے تعجب سے ، بے دھیانی سے اندھیرے میں دیکھتے ہوئے کہا -
 چاند کی آخری تاریخیں تھیں اور سارے میں تاریکی اور ستاروں کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی - سامنے پہاڑی پر اوپر نیچے بنے ہوئے مکانوں میں دیے جل رہے تھے اور بجھ رہے تھے - ان کی کھڑکی کے نیچے ایک پہاڑی جھرنا بہتا تھا - پتھروں پر بہتے ہوئے پانی کی کھنک ، جو دور چلتے ہوئے رھٹ کی آواز سے مشابہ تھی ، ان کے کانوں میں آ رہی تھی - رات کا ایک پرندہ پھر پھر اڑا کر کھڑکی کے سامنے سے گزرا -

”میں جاؤں؟“ لڑکی نے سہم کر کہا -

”ٹھہرو -“

”ابھی فرشتہ گزرا تھا -“ لڑکی نے کہا -

وہ ہنسا - ”نہیں - چمگادڑ تھی -“

”چمگادڑ؟“ شیلانے خوف زدہ آواز میں دہرایا - ”ایسا مت کہو - وہ فرشتہ تھا - یہ جب بھی گزرتا ہے وہ آجاتے ہیں - مجھے اب جانا چاہیے -“

لیکن وہ کھڑی رہی -

”تم کہاں سوتی ہو؟“

”ساتھ والے کمرے میں۔“

”اچھا؟ میں سمجھا گاؤں چلی جاتی ہو۔“

”تم دروازے کے پاس سوتے ہو۔“

”تمہیں کیسے پتہ ہے؟“

”تم بڑے زور کے خراٹے لیتے ہو۔ مجھے غصہ آ جاتا ہے۔“

”اچھا؟“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ”تختہ ہٹانے کا شور ہوتا ہے؟“

”نہیں۔ میں نے کئی بار ہٹا کر تمہیں دیکھا ہے۔“

”کیوں؟“

”تم سونے نہیں دیتے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا تختہ تمہارے اوپر دے ماروں۔“

وہ پھر مسکرایا۔ ایک اور چمکاوڑ پھڑپھڑاتی ہوئی کھڑکی کے پاس سے نکل گئی۔ شیلانے ہاتھ اٹھا کر اس کی کہنی پر رکھا اور آنکھیں پھیلا کر اندھیرے میں پرندے کا تعاقب کیا۔ پھر وہ چپکے سے باہر نکل گئی۔

آدھی رات کے قریب، بارش ابھی شروع ہوئی تھی کہ وہ تینوں آگئے۔ کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے آتش دان پر پڑا ہوا دیا روشن کیا۔

”بارود کیلی ہو گئی؟“ اقبال نے قمیض آتش دان پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ میرے پیٹ پر تھی۔“ بنرجی نے قمیض کا دامن جھٹکا اور کمر پر سے بارود کی

پیٹی کھولنے لگا۔

”آتش دان سے دور رکھنا۔“ اقبال نے کہا۔

”سن سن کر کان پک گئے ہیں۔ خاموش رہو۔“ بنرجی نے ہوا میں منہ اٹھا کر کالی دی۔

پھر اقبال اور بنرجی نے ایک ساتھ اسی نامعلوم شے کو تلخ لہجے میں کالیاں دیں، اور کپڑے اتارنے لگے۔

نعیم دیوار کے سہارے، گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھا، سرخ بے خواب آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ ان کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ دن آتش دان پر بیٹھا آگ جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اقبال نے کمرے سے پستول کھول کر کیل پر لٹکایا۔ کیل اکھڑ گئی اور سن کے خول میں لپٹا ہوا بڑا سا پستول آواز پیدا کرتا ہوا فرش پر گر پڑا۔ اقبال چند لمحے تک اسے اٹھانے کا ارادہ کرتا رہا، پھر آتش دان کے پاس ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

”سگریٹ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ دن نے کہا۔

اس نے کندھے ڈھلائے اور دیوار پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اوپر دیا جل رہا تھا۔

اس کے پہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں آنکھوں اور رخساروں کے گڑھوں پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ دیوار کے ساتھ یوں ساکت بیٹھا وہ چکنی سیاہ مٹی کا بت معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے بال کھردرے گھنگریالے اور غلیظ تھے، اور مضبوط بناوٹ کا چہرہ کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ نعیم کے دل میں اس کے لیے بے معلوم سارحم پیدا ہوا۔ اس نے اٹھ کر، کیل گاڑی، اس کا پستول لٹکایا، اور اس کے پاس جا کر ایک سگریٹ نکال کر دی۔

”کیسے ہو؟“ خاموشی سے سگریٹ سلکا کر اقبال نے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“

”کیا کرتے رہے؟“

”کچھ نہیں۔“ نعیم نے آگ میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سوچتا رہا۔“

”تم سوچ لیتے ہو؟“ بنرجی پلٹ کر تسخر سے پوچھا۔

”ہاں۔“ نعیم نے ڈھٹائی سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بہتر ہے کہ سوچنا چھوڑ دو۔“ وہ دیوانہ وار گیلے سگریٹ کو سلکانے کی کوشش کرتا ہوا

بولتا۔ ”میں نے بھی چھوڑ دیا ہے۔“

دن نے ایک لکڑی توڑ کر آگ میں پھینکی اور مسکرایا۔ ”تمہارے لیے یہ کام مشکل

تھا، تم نے چھوڑ دیا۔“

”کیوں۔“ یہ میں نے ہی سوچا تھا کہ ہم سب میں سے آگ جلانے کے لائق صرف تم ہو۔ دیکھو، تم کم سے کم وقت میں آگ جلا لیتے ہو۔ میں خوش ہوں۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر آگ تاپی۔ ”ہم سب خوش ہیں۔“

اس کے چھوٹے سے مکار، ذہن چہرے پر تعریضی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اپنے دو کبیل گھسیٹ کر وہ آگ کے قریب آگیا۔ بند کمرے میں پتھروں پر پڑی ہوئی دھول اڑی اور اس کی ناگواری کو سب نے محسوس کیا۔

”تم اپنے بستر سے جدا نہیں ہو سکتے؟“ اقبال نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ”عورتوں کی طرح۔“

”ہم کھڑکی بھی نہیں کھول سکتے۔“ دن نے کہا۔

بنرجی سگریٹ کو اٹکلیوں میں پھراتا ہوا سوچ رہا تھا۔ نعیم اس کی طرف جھکا۔

”تم واقعی خوش ہو سادھو کر؟“

”ہاں۔ تم نے ایسی خوف ناک شکل کیوں بنا رکھی ہے؟“ اس نے ییزاری سے سگریٹ

کو آگ میں اچھالا۔ ”گیلا ہو گیا ہے۔“

”بارود کی بجائے تمہیں تمباکو پچانا چاہیے تھا۔“ نعیم نے کہا۔

”ہاں - شاید -“

”اب بارود پیو -“

شیلما المونیم کے بڑے برتن میں پانی بھر کر لائی اور اسے آگ پر رکھ دیا -
 ”بڈھا کچھ کھانے کو دے گا؟ میں بھوک سے مر رہا ہوں -“ من نے کہا -
 ”پتہ نہیں -“ وہ کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی - کھنے سیاہ بالوں کی لٹ اس کے کال پر
 لٹک رہی تھی اور آنکھیں آگ کی روشنی میں چمک رہی تھیں -
 ”شیلما - کچھ کھانے کو دو -“ من نے نرمی سے کہا - نعیم نے محسوس کیا کہ اس کا ماتھا
 اور آنکھیں بالکل اپنی بہن سے مشابہ تھے - شیلما اچھا کہہ کر باہر نکل گئی - کچھ دیر کے بعد بڈھا
 ہاتھ میں کھانے کا برتن لیے داخل ہوا -

”آج کچھ آلو پکائے ہیں ، لونڈو -“ اس نے جنوبی ہند کے کسانوں کے لہجے میں کہا :
 سخت گندا برتن آلوؤں کے اشتہا آور سرخ شوربے سے بھرا ہوا تھا اور اس میں سے ہلکی ہلکی
 بھاپ اٹھ رہی تھی - چاروں مرد اپنی اپنی مصروفیت چھوڑ کر برتن کے گرد جمع ہو گئے - بڈھا
 اپنے حقے پر جھک گیا -

”روٹیاں -“ دو آدمی ایک ساتھ بولے -

”اوہ -“ بڈھے نے بڑے فوجی کوٹ کی جیب میں سے چند میلی روٹیاں نکال کر انہیں
 دیں - پھر اس نے مادھو کر بنرجی کی لمبی ، باریک ، چھری کپڑے کے خول میں سے نکالی اور
 اس کی مدد سے حقے کی نالی میں جما ہوا تمباکو کا میل کھرچنے لگا -

دیر تک وہ آتش دان کے سامنے بیٹھے بھوکے ، تھکے ہوئے جبروں کے ساتھ کھانا چباتے
 رہے - آگ کی روشنی میں ان کی کنپٹیوں اور جبروں پر ایک ایک ہڈی اور پٹھا الگ الگ دکھائی
 دے رہا تھا - باہر بارش لگاتار ہو رہی تھی - کھڑکی پر اس کی ہلکی ، مسلسل آواز کمرے کی خاموشی
 اور اداسی میں اضافہ کر رہی تھی - اندر پیڑ کے جلنے کی ہلکی پھنکار اور کھانا کھانے کی آوازیں
 تھیں - بڈھا ایک پتھر پر آنکھیں بند کیے بیٹھا حقہ پی رہا تھا -

”لونڈیا کے لیے کچھ رہنے دو - اور کچھ نہیں ہے -“ آنکھیں بند کیے وہ بولا -

چاروں مردوں نے اسے گھور کر دیکھا - پھر تقریباً سب نے ایک ساتھ ہاتھ کھینچ لیا -
 برتن بڈھے کے حوالے کر کے وہ آگ کے قریب ہو کر بیٹھ گئے - مادھو کر نے کیلے
 سگریٹ کو سلکانے کی چند منٹ بے کار کوشش کے بعد اسے آگ میں اچھال دیا اور ہوا میں کالی

دی -

”آج کیا ہوا؟“ نعیم نے اقبال کو مخاطب کر کے پوچھا -

وہ منہ پھیر کر قیض ، جواب خشک ہو چکی تھی ، پہننے لگا -

”ڈاک خانہ خاموش ہو گیا؟“ نعیم نے پھر پوچھا۔

”اوں۔ ہوں۔“

”اور تار؟“

”ہوں ہنک۔“ اقبال نے آگ میں دیکھتے ہوئے دوبارہ ناک میں سے ملی جلی آواز نکالی۔

”تم بول نہیں سکتے؟“ نعیم نے تیزی سے کہا۔

اقبال نے خفگی، علیحدگی اور اکتاہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور دیوار پر سر رکھ دیا۔ ”میزار

مت کرو۔ میں تھکا ہوا ہوں۔“

”تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔ تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔“

اقبال نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ ”ہم نے ایک آدمی کو خاموش کیا ہے۔

میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔“ اس نے آہستہ آہستہ کہا۔

”صرف جب مجبور کر دیے جاؤ۔ ورنہ کچھ نہیں۔ تم کچھ بھی یاد نہیں رکھنا چاہتے۔ تم

نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے متعلق بات کر سکو۔ میں جانتا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے۔“

”بیکار بیٹھے بیٹھے تم ناکارہ ہو گئے ہو۔“ مادھوکر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”اچھا ہوتا تم

ہمارے ساتھ چلتے۔“

”اور۔ اور۔“ نعیم سخت غصے میں کچھ کہتا کہتا رک گیا۔

مادھوکر اس کی طرف جھکا۔ ”اور یہ کیا چلن ہیں تمہارے۔ باؤلے ہو؟“

نعیم خاموش بیٹھا چھوٹی چھوٹی کمزور لکڑیوں کو اٹکیوں سے توڑتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس نے

اپنے آپ پر قابو پایا۔

اقبال دیوار سے لگا لگا سو گیا تھا۔ من اپنی ران کے زخم کو گرم پانی سے دھو رہا تھا۔

بند کھڑکی سے لگا تار بارش کی آواز آرہی تھی۔ مادھوکر نے چند لکڑیاں آگ پر پھینکیں۔ چیڑ

کے دھوئیں کی تیز بو کمرے میں پھیلی، پھر لکڑیاں بھڑاک سے جل اٹھیں۔ شیلہ اپنے بھائی کے

زخم پر پٹی باندھنے لگی۔

”کون تھا؟“ نعیم نے پوچھا۔

”چوکیدار۔“ من نے بتایا۔

”پھر؟“

”پھر وہ ہوشیار ہو گئے۔“

”کیوں؟“

”ہم سے غلطی ہو گئی۔“

”اے قتل کرنا ضروری تھا؟“ نعیم نے مشکوک نظروں سے اقبال کی طرف دیکھتے ہوئے

پوچھا۔

”اوہ۔“ دن نے کندھے اچکائے۔ ”شروع حملے میں ہم سے غلطی ہوئی، جو بعد میں۔“

یوں کرنا ہی پڑا۔“

شہد کی سی صاف آواز میں نعیم بولا: ”میں جانتا ہوں۔“

”کیا؟“

”اسی وجہ سے وہ خوف زدہ ہے۔“ اس نے پھر اقبال کی طرف دیکھا۔

”خوف زدہ؟“ مادھو کر حیرت سے پکارا۔ ”وہ ایک مچھر کی طرح قتل کر سکتا ہے۔ پتہ

ہے تمہیں؟“

”غلط۔“ نعیم نے غصے سے گھونسا اپنی ران میں مارا۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں وہ اس

وقت خواب میں بھی یہی دیکھ رہا ہے۔“

دن اور مادھو کر نے تمسخر سے اسے دیکھا۔

”کیا دیکھتے ہو؟“ اس نے آگ کی طرف ہاتھ پھیلایا۔ ”یہ سبق میں نے میدان جنگ میں

سیکھا تھا۔ تم کسی انسان کو مچھر کی طرح نہیں مار سکتے۔ کبھی نہیں۔“ وہ آگے کی طرف جھک

کر بیٹھ گیا۔ ”سنو۔ بہت سے مچھروں کو۔ یہ اس نے مجھے بتایا تھا۔ بہت سی چیونٹیوں کو

تم آسانی سے مار سکتے ہو۔ ایک کو نہیں۔ وہ بے گناہ آدمی تھا، اور ایک آدمی تھا، اور مزدور

تھا یا کسان تھا، اور غریب بھی تھا، چنانچہ وہ ہمیشہ اس کے خواب میں آئے گا۔ میں جانتا

ہوں۔“

یکلخت مادھو کر کا قہقہہ بلند ہوا۔ اونچا، زور دار، وحشی قہقہہ۔ اقبال نے گہرا کر

آنکھیں کھول دیں۔ ہنستے ہنستے مادھو کر کی آنکھیں ابھر آئیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے ہاتھ

چوڑا کر کے اقبال کی ران پر مارا۔

”تم خواب میں کیا دیکھ رہے تھے؟“

اقبال خاموش غصے کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

”بے گناہ آدمی، اور ایک آدمی۔“ وہ ہنستے ہنستے جھک گیا۔ ”بے گناہ آدمی اور ایک آدمی

سنا؟ یہ کہتا ہے چوکیدار تمہارے خواب میں آئے گا۔ وہ بے گناہ آدمی اور ایک آدمی ہے۔

بے گناہ اور ایک۔ ہنہ۔ ہنہ ہو ہو ہا ہا ہا۔ بے گناہ اور ایک۔“

اقبال اسی طرح سر دیوار سے ٹیکے سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا رہا، پھر کھسک کر زمین پر

لیٹ گیا۔ ”شور مت مچاؤ۔ مجھے سونے دو۔“ اس نے ییزاری سے کہا۔

آہستہ آہستہ مادھو کر خاموش ہو گیا۔ پھر بھی وقفے وقفے پر خاموش ہنسی کے جھٹکتے اس کے پیٹ اور شانوں پر ظاہر ہوتے رہے۔ بارش تھم چکی تھی۔ کھڑکی کی درزوں میں سے جھرنے کا ہلکا شور اندر آ رہا تھا۔ آتشدان میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔ مردوں پر غنودگی طاری تھی اور وہ سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیند کسی کو نہیں آ رہی تھی۔

”میں آج سوچتا رہا۔ ہم پتھر چھوڑ کر میدانوں میں کیوں نہیں چلے جاتے۔“ دھیمی، صاف آواز میں نعیم نے کہا۔ اقبال آنکھیں کھول کر جلتے ہوئے کوٹلوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور چہرہ آگ کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ خاموش لیٹا رہا۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔“ دن نے گرم اینٹ سے زخم پر ٹکور کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں پر کیا ہے؟ پتھروں میں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ پتھر پانی بھی جذب نہیں کرتے۔ یہاں پر جو پانی بہتا ہے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ یہ جگہ بانجھ عورت کی طرح ہے۔“

”یہ جگہ زیادہ محفوظ ہے۔“

”محفوظ؟ یہ ساری جگہ محفوظ ہے۔“ نعیم نے بازو پھیلا کر کہا۔ ”یہ دنیا انسان کا گھر ہے۔ ساری دنیا۔ جہاں کھانے کو ملتا ہے وہ جگہ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔“

”ہنہ۔“ دن ہنسا ”کھانے کو؟ کھانے کو کسے ملتا ہے ہمیں؟ مزارعوں کو؟ کھانے کو کون دیتا ہے؟“ زخم پر اینٹ کی تپش محسوس کر کے اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ ”تم چاند پر سے آئے ہو یا میدانوں میں سے؟ تمہیں وہاں کھانے کو ملتا تھا تو وہ جگہ تمہارے لیے محفوظ تھی۔ تم یہاں کیوں آئے؟“

”اسی لیے تو.....“

”سنو۔“ دن نے بات کاٹی۔ ”کھانے کے لیے میلوں کو بھی ملتا ہے۔ مگر میلوں اور انسانوں میں بڑا فرق ہے۔ وہاں میلوں اور آدمیوں کو ایک ہی برتن میں کھانا ملتا ہے۔ تم نہیں جانتے؟ انسانوں کی پگڑی سر پر ہوتی ہے، گلے میں نہیں ہوتی۔ انسانوں کو کھانا عزت سے، آبرو سے ملنا چاہیے۔ وہاں پر کھانا صرف میل کی ناند میں ملتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ نعیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرایا۔ ”لیکن عزت اور آبرو کے لیے ایک بہت بڑی جنگ کی ضرورت ہے۔ اس سے بھی بڑی جو میں نے دیکھی ہے ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔ ہم کمزور ہیں۔ نیچے جا کر ہم ایک وسیع جنگ شروع کر سکتے ہیں۔ ایک نئی جنگ، جو بغیر اسلحے کے ہوگی مگر لاکھوں اور کروڑوں میں ہوگی۔ اس طرح، جیسے ہم کر رہے ہیں، ہم کوئی جنگ نہیں جیت سکتے۔“ ”نیچے جا کر؟“ دن نے سخت جھلا کر کہا۔ ”نیچے جا کر ہم پھر انہی لاکھوں کروڑوں میں مل جائیں جن سے ہم بھاگے ہیں؟ پھر میلوں کی طرح کام

کریں؟ تمہیں پتہ ہے وہ کتنی محنت کرتے ہیں اور انہیں کھانے کو کتنا ملتا ہے۔ وہ کتنے کھٹے کام کرتے ہیں اور کتنے کھٹے سوتے ہیں؟ تم نے میرے باپ کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ یا اپنے باپ کو؟ ان کی انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی ہیں اور پیٹھ کی کھال دھوپ میں جل گئی ہے اور آنکھوں میں پسینہ بہہ بہہ کر وہ اندھے ہو گئے ہیں اور ان پر اتنا قرض ہے کہ سات پشتیں ادا نہیں کر سکتیں۔ اور تم نے مالکوں کے مکان دیکھے ہیں، اور زمینیں، اور مویشی؟ اور جتنا دودھ روزانہ ان کے گھر میں جاتا ہے اتنا تم نے ساری عمر میں بھی پیا ہے؟ تم کہاں کی بات کرتے ہو۔“

”اوہ۔ من۔“ نعیم نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ ”ان لوگوں سے بچ کر تم کہاں جاسکتے ہو! اس جنگ میں سبھی شریک ہیں۔ ہندوستان کتنا بڑا ملک ہے۔ اس میں کتنے جاگیردار، کتنے مالک اور کتنے نوکر ہیں۔ اس کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں۔ ہم چند آدمی غاروں میں چھپ کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ درندوں کی زندگی اور درندوں کی جنگ ہے۔ ہم اپنے والدین کی نسبت بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے محنت کی اور خاموش رہے۔ بڑی خاموش، بڑی طاقتور جنگ۔ ہم نہ محنت کرتے ہیں نہ جنگ کرتے ہیں، محض چوری کرتے ہیں۔“

مادھوکر نے ایک لکڑی کھٹنے پر رکھ کر چٹاخ سے توڑی اور اسے آگ میں پھینک کر بولا: ”درندے بغاوت کر سکتے ہیں، میل نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ میں نے ایک سرکس دیکھا تھا۔ رنگ ماسٹر نے جب چھاٹا پٹھایا تو شیروں نے اس پر حملہ کر دیا اور اس کو پھاڑ ڈالا۔ کبھی میلوں کو بھی مالکوں پر حملہ کرتے تم نے دیکھا ہے۔ وہ صرف آپس میں لڑتے ہیں۔ کبھی کبھی۔ میلوں سے انسان بننے کے لیے پہلے درندے بننا پڑتا ہے۔“

”مالکوں کی بحث بیکار ہے ہماری اصل جنگ ان سے ہے جنہوں نے مالکوں کو بنایا ہے۔ جو کاریگروں کے ہاتھ کاٹ دیتے ہیں اور سوچنے والوں کے دماغ شل کر دیتے ہیں۔ وہ غیر ملکی جو ہمارے مالک کو غریب کر رہے ہیں۔ تم ان سے لڑنے کا طور نہیں جانتے۔ اس کے لیے...“

”میں جانتا ہوں۔“ من نے اس کی بات کاٹی اور آگے جھک کر بیٹھ گیا۔ ”میں شاید تم سب سے زیادہ ہی جانتا ہوں۔ میں نے تین سال تک کتابیں پڑھی ہیں۔ معاشیات اور تاریخ۔ یہ مت سمجھو کہ میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان انگریزوں کی سلطنت ہے، اور ایسے کئی ہندوستان انگریزوں کی ملکیت ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ کیا حاصل کر رہے ہیں اور کس طریقے سے حاصل کر رہے ہیں۔ انہوں نے سکول اور کالج کھولے ہیں، ریل گاڑی چلائی ہے، ہسپتال بنائے ہیں۔ لیکن وہ کتنا ریونیو اکٹھا کر رہے ہیں۔ تمہیں ہندوستان کا رقبہ معلوم ہے؟ وہ کتنی کھلی تجارت ہندوستان کے اندر اور باہر کر رہے ہیں، مجھے

سب پتہ ہے۔ مگر میں نے تاریخ بھی پڑھی ہے۔ دنیا کی ہر جنگ کا آغاز اسی طرح ہوا۔ ملکوں کی نہیں، لوگوں کی جنگ کا۔ ہر تحریک جو ملک کے اندر پھیلی اسی طرح پھیلی۔ بیشک بعض جنگیں آخر میں زیادہ باوقار اور زیادہ سنجیدہ طریقے پر فیصل ہوئیں۔ لیکن ابتدا میں کیا تھا؟ چند لوگ، جن کا سر پر خون سوار تھا۔ محکومیت اور ظلم سے سوئے ہوئے دماغ اور ہاتھ پاؤں تقریروں اور جلسے جلوسوں سے نہیں جاگتے۔ اور حکومت، جس کی جڑیں مدتوں سے مضبوط ہو رہی ہوں، ان باتوں سے کبھی نہیں چونکتی۔ وہ ہنکامے سے چونکتی ہے۔ اور گو جنگ کو ختم کرنے اور جیتنے والوں نے ہمیشہ ان چند لوگوں کی مذمت کی اور انہیں برا بھلا کہا، لیکن بعد میں آنے والوں نے تاریخ کی کتابوں میں لکھا کہ وہ لوگ جنہوں نے جنگ جیتی اسے کبھی شروع نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دماغ میں خون تھا۔ جو شروع کرتے ہیں ان کے بازوؤں اور سینوں میں خون ہوتا ہے۔ آزادی کی ہر تحریک کو شروع کرنے کے لیے درندوں کی ضرورت ہے۔“

اس نے اکڑی ہوئی زخمی ٹانگ کو مشکل سے دھرا کیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ باہر بارش ایک بار پھر تیزی سے شروع ہو گئی۔

نعیم نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”میں نہیں سمجھتا۔ میں نہیں سمجھتا۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارے پاس کیا تجویز ہے، کیا پروگرام ہے، مجھے کچھ پتہ نہیں۔ تم خود اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تم بغیر تجویز کے، بغیر ارادے کے مارتے اور تباہ کرتے ہو اور خود اس پر پھبتاتے ہو۔ میں جانتا ہوں۔ میں محسوس کر سکتا ہوں۔ تمہاری زندگیوں میں ایک مہیب خلا ہے۔ تم جو کچھ کرتے ہو اسے بھلا دیتے ہو۔ تم کچھ یاد رکھنا نہیں چاہتے۔ تمہارے پاس محض احساس جرم ہے۔ ایسے کبھی جنگیں جیتی جاتی ہیں۔“

مدن اسی طرح رانوں پر جھکا بیٹھا تھا؛ سر اٹھا کر بولا: ”تمہارے پاس کیا تجویز ہے؟“

”کہ یہ جنگ سب لوگوں کی ہے، میری تمہاری یا اقبال کی نہیں۔ ان تمام لوگوں کی جو کھیتوں میں، بازاروں میں، سڑکوں پر اور ریل کے شیشنوں پر اور بندر گاہوں پر جھکے ہوئے ہیں اور محنت کر رہے ہیں۔ جن کے چہروں پر مشقت کی لکیریں پڑ چکیں اور جو نہیں جانتے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔ ہم۔“ مدن نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ ”یہ تم نے پہلے بھی بتایا تھا۔ میں پوچھتا ہوں تمہارے پاس کیا تجویز ہے؟ زمین ہمیں مل جائے گی؟“

”ہاں۔“

”ہم اُس کے مالک بنا دیے جائیں گے؟“

”یقیناً۔“

”ملک کا ریونیو ملک پر خرچ ہو گا؟“

”ہونا چاہیے۔“

”جاگیرداری ختم کر دی جائے گی؟“

”ہاں۔ اُس کے ساتھ جاگیردار اور مزارع کا رشتہ بھی ختم ہو جائے گا۔“

مدن کی آنکھیں چمکیں۔ ”کیسے؟“

”اُن کے پاس جا کر انہیں بتایا جائے کہ وہ محنت کر رہے ہیں اور اس کی قیمت اُن کو نہیں مل رہی۔ اور کہ اُن پر ظلم ہو رہا ہے اور وہ اسے ختم کر سکتے ہیں۔ کہ دنیا کی تمام تر

طاقت اُن کے قبضے میں ہے۔۔۔“

”اور یوں انہیں بتاتے بتاتے ہم جیل میں چلے جائیں؟ کچھ کیے بغیر۔“ مدن نے تیزی

سے کہا۔

”کچھ کیے بغیر؟“ نعیم تقریباً چیخ پڑا۔ ”جیل جانے سے پہلے پہلے تم ہندوستان بھر میں اہگ لگا سکتے ہو۔ تم بھی اپنی طاقت سے بے خبر ہو مدن۔ جب تم چلے جاؤ گے تو وہ لوگ دوسرے لوگوں کو بتائیں گے، اور جب وہ لوگ چلے جائیں گے تو دوسرے دوسروں کو بتائیں گے، اور جب وہ کم سیدھی کر کے کھڑے ہوں گے تو۔“

”ٹھیرو ٹھیرو۔“ مدن نے بیتابی سے بات کاٹی۔ ”زیادہ باتیں مت کرو۔ سنو۔ میں

کاؤں کا اچھوت تھا۔ مجھے کس طرح وہاں سے نکلنا پڑا۔ تمہیں سب پتہ ہے۔ میں زمیندار کے کتوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا اور رہتا سہتا تھا۔ پھر میں کئی سال تک ملک بھر میں دھکے

کھاتا رہا۔ اب میں پچیس برس کا ہوں۔ پچیس برس ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ پچیس برس

میرے دل میں محفوظ ہیں۔ میں نے سب کچھ یاد رکھا ہے۔ میں اُس کے متعلق بات کرنا چاہتا

ہوں۔ سنو گے؟ پچیس برس۔ اور میں نے ایک روز پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ تمہیں پتہ

ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اور تم احساس جرم کی بات کرتے ہو۔ تم نے دو سال کی جنگ دیکھی

ہے اور ڈینگ مارتے ہو۔ میں نے ایک ایک دن دیکھا ہے اور پچیس برس نکل گئے ہیں۔

میرے پاس یاد رکھنے کو بہت کچھ ہے۔ اور وہ میری بہن ہے جو میرے بعد فاحشہ عورت بنے

گی۔ اس لیے میں جیل میں جانا پسند نہیں کرتا۔ سنا تم نے؟“ اُس نے اڑھی ہوئی اٹھکی نعیم

کی چھاتی میں چھوٹی۔ ”تمہیں اب چاہیے کہ جا کر سو جاؤ، یا دفع ہو جاؤ۔ مجھے پتہ چل گیا ہے

کہ تمہارے دماغ میں کچھ نہیں ہے۔ سب بکواس ہے۔“ بات ختم کر کے اُس نے زخمی

ٹانگ کو سیدھا کیا اور ہونٹ کاٹنے لگا۔ نعیم خاموش بیٹھا غصے سے بند کھڑکی کو دیکھتا رہا جس کی

درزوں میں سے بارش کا پانی اندر آ رہا تھا۔

اچانک مادھو کر بنرجی بول اٹھا: ”تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم یہ سب کچھ نہیں چاہتے۔ ہم

ہمیشہ سے جانوروں کی طرح رہتے آئے ہیں؟ ہم نے کبھی صاف ستھری جگہ پر بیٹھ کر صاف

ستھرے برتنوں میں، الگ الگ برتنوں میں نہیں کھایا؟ یا کھانے کی خواہش نہیں کی؟ اسی؟“ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں غصے میں آئے ہوئے نیولے کی آنکھوں کی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔

”ٹھیرو۔“ اقبال نے ایک جلتی ہوئی لکڑی نکال کر زمین پر ماری۔ چھوٹی چھوٹی چنگاریاں ادھر ادھر اٹس۔ مادھو کر سی سی کرتے ہوئے بازو پر گری ہوئی چنگاریوں کو ملنے لگا۔ ”پاکل ہو گئے ہو؟“ وہ چیخا۔

”تم زبان چلائے جاؤ گے تو ہو جاؤں گا۔ تم نے کیا کیا ہے جو اب بک بک کر رہے ہو۔ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ تمہیں پتہ نہیں؟ اور تم۔“ لکڑی کا جلتا ہوا سرا نعیم کی ناک کے نیچے ٹھونکتے ہوئے وہ چیخا۔ ”تم کل لائن پر جا رہے ہو۔ ہم سے پہلے۔ اور اپنی یہ فضول باتیں ختم کر دو ہمیشہ کے لیے، سنا؟ ہمارے پاس پہلے ہی بہت کام ہے۔“

غصے اور خوف کے مارے نعیم جلدی ہے اٹھ کر اپنے کنبلوں کی طرف چلا گیا۔ اقبال نے لکڑی آتشدان میں پھینکی اور آگ کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔

دروازے کے قریب اپنے کنبلوں پر لیٹ کر نعیم نے ٹانگ پر ہاتھ پھیرا اور پتلون کی جیب میں پستول کو محسوس کیا۔ تاریک چھت کو گھورتے ہوئے، سونے سے پہلے، اُس نے بہت سے گڈمڈ خیالات کے درمیان واضح طور پر محسوس کیا کہ آگ لحظہ بہ لحظہ بجھتی جا رہی ہے اور کھڑکی پر بارش تقریباً رک چکی ہے۔

اس کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ آتشدان کی راکھ میں سے دو زندہ کوئلے جھانک رہے تھے۔ چھت کے قریب روشندان کے سوراخ میں سے تاروں کی مدھم روشنی داخل ہو رہی تھی۔ آتشدان کے گرد سوائے تینوں مردوں کے بھاری سانسوں کی آواز خاموش کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں سردی تھی۔

سارا جسم ایک دفعہ اکڑا کر ڈھیلا چھوڑ دینے کے بعد اس نے جلد پر مصنوعی حرارت کی ایک تہہ رینگتی ہوئی محسوس کی اور آنکھیں میچ کر سوچا کہ اس وقت کیا بچا ہو گا۔ دوسری بار وہ آدھ منٹ تک اکڑا رہا۔ ”آج جانے کہاں جانا پڑے۔“ اس نے سوچا۔ ”اور کام کیا ہو گا! ڈائنامائٹ اٹھانے والا کام تو آسان تھا۔ اگر میں بھاگ جاؤں، ابھی، فوراً۔“ پھر اس خیال کو دل سے نکالنے اور سردی کم کرنے کے لیے وہ تیسری بار اکڑا۔ ”بارش رک گئی ہے۔“ اس نے دل میں کہا۔ ”نیند کیوں نہیں آ رہی؟“ اندھیرے میں خالی الذہن ہو کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر کنبل میں سے ہاتھ نکال کر اُس نے لکڑی کا تختہ آہستہ سے کھینچا۔ تختہ پتھریلے فرش پر ہلکی سی بھدی آواز نکال کر دروازے سے الگ ہو گیا۔ کچھ دیر تک جنگلی چوہے کی طرح بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھا، اور بڑا فوجی کوٹ شانوں پر ڈال کر گھٹنوں پر چلتا ہوا رینگ کر تختے کے پیچھے سے نکل گیا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ چند سیکنڈ تک وہ تھو تھنی اٹھائے بو سونگھتے ہوئے شکاری کتے کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر دروازے میں کھڑا رہا۔ ”یہاں پر آگ کبھی نہیں جلائی گئی۔“ اُس نے خشکی محسوس کر کے دل میں کہا اور اُسی طرح دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ فرش پر لکڑی کی آواز کو بند کرنے کے لیے اس نے کوٹ ہاتھ پر لپیٹ لیا۔ چلتے چلتے اس کا سر سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اُس نے دل میں کالی دی اور مڑ کر دوسری دیوار کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ کوٹ آواز نکالے بغیر زمین پر گھسٹ رہا تھا۔

یوں چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے چلتے ایک بار مڑ کر اس نے اپنے آپ پر نظر ڈالی۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا لیکن اسے خیال آیا کہ وہ ایک ریچھ یا بڑے سے بھیڑیے کی مانند چل رہا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے دل میں نامعلوم سی خوشی محسوس کی اور خاموشی سے ہنسا۔

اگلے کونے پر مڑتے ہوئے کسی نے اس کا کوٹ پکڑ کر کھینچا۔ ”ادھر آؤ۔“ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ آواز اس قدر دھیمی تھی کہ وہ پہچان نہ سکا۔ پھر جب اچھی طرح سے اُس کے چہرے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے کے بعد اُسے یقین ہو گیا تو وہ اُس کے بستر میں گھس گیا۔

”تمہیں سردی لگ رہی ہے؟“ اُس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”کبیل چھوٹا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔

”ٹھیرو۔“ اُس نے کبیل پر بڑا کوٹ پھیلا دیا اور اس کے ساتھ لگ کر لیٹ گیا۔ ”اس

کمرے میں اور کون ہے؟“

”کوئی نہیں۔“

”اور بلا؟“

”باہر سوتا ہے۔“

”اتنی سردی میں؟“

”ہاں۔“

ٹھنڈک محسوس کر کے وہ اکڑا۔

”میرے پاؤں کو سردی لگ رہی ہے۔“ اس نے کہا۔

”اندر کر لو۔“

اُس نے لڑکی کی طرف کروٹ لے کر پاؤں اندر کر لیے۔

”تم نے مجھے دیکھا تھا؟“ اُس نے شیلہ کے چہرے پر اٹھکیاں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“

”تمہاری نظر بڑی تیز ہے۔“

”میں سوئی نہیں۔“

”رات سے جاگ رہی ہو؟“

”ہاں۔“

”میں کتنی دیر سویا؟“ اس نے پوچھا۔

”تم سوئے تھے؟“

”ہاں۔“

”ابھی تو تم باتیں کر رہے تھے۔“

”اوہ۔ میں سمجھ رہا تھا بہت سو کر اٹھا۔“ اس نے اس کی گردن کو چوما۔ ”تمہاری

گردن بڑی نرم ہے۔“

”آج تم کیوں لڑ رہے تھے؟“

نعیم نے جواب دینے کی بجائے دوبارہ اُسی جگہ چوما۔

”ان سے مت لڑا کرو۔“ شیلا نے پھر کہا۔

”کیوں؟“

”وہ تمہیں مار دس گے۔“

اُس نے اُس کے ہونٹوں کو دبا کر چوما۔

”انہوں نے پہلے بھی ایک کو مارا تھا۔“ لڑکی نے کہا۔

”کب؟“

”وہ پار سال ہمارے ساتھ آیا تھا۔ تب ہم بہار میں تھے۔ دو مہینے وہ ہمارے ساتھ

پھر کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ اقبال نے اُسے گولی مار دی۔“

نعیم خاموش لیٹا اُس کے بدن پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

”مجھے اقبال سے نفرت ہے۔“ شیلا نے اُس کے پہلو پر ہاتھ رکھا۔

”تم قیض اتار کے کیوں سوتے ہو؟“

”میری پرانی عادت ہے۔“

”تمہیں سردی نہیں لگتی؟“

”نہیں۔“

نعیم نے اُسے گردن کے نیچے نرم جگہ پر چوما۔

”شیلا۔“ اُس نے بھاری آواز سے کہا۔

”آہستہ بولو۔“

”شیلا - “ اُس نے سرگوشی کی - ”تمہیں پتہ ہے بوسوں کا مزا کیسا ہوتا ہے؟“

”نہیں -“

”مجھے چومو -“

شیلا نے آہستہ سے اُس کے کال کو چوما -

”نہیں - ہوشوں پر -“

”اوں ہنہ -“

”کیوں؟“

”یہ مرد کا بوسہ ہے - مجھے شرم آتی ہے -“ وہ اس کی بغل میں منہ دے کر بولی -

”اچھا سنو - یہ پانی کی طرح ہوتے ہیں - جب پیاس لگی ہو تو پانی میٹھا لگتا ہے - جب

نہ لگی ہو تو بد مزہ لگتا ہے - دراصل اس کا کوئی مزہ نہیں ہوتا -“

وہ اس کی چھاتی میں منہ دے کر ہنسی - ”تم عجیب باتیں کرتے ہو -“

وہ خاموشی سے اُس کی قمیض الگ کرتا رہا -

شیلا نے اُس کی چھاتی میں ناک رگڑی - ”تمہاری چھاتی میں بال نہیں ہیں -“ اُس نے

کہا -

”تمہاری چھاتی میں بھی نہیں ہیں -“

”عورتوں کے نہیں ہوتے -“

”مردوں کے بھی نہیں ہوتے -“ وہ شرارت سے بولا -

”ہوتے ہیں -“

”کب ہوئے ہیں؟“

”اُن سب کے ہیں -“ اُس نے اندھیرے میں دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا -

نعیم کے دل میں حسد کا ایک عجیب ، تیز غصیل جذبہ پیدا ہوا - ”ان کی بات مت

کرو -“ اُس نے خفگی سے کہا -

”جن مردوں کی چھاتی میں بال نہیں ہوتے وہ مکار ہوتے ہیں -“ وہ ہنسی -

”تمہیں کس نے بتایا ہے؟“ اس نے غصے سے کہا -

دیر تک وہ دونوں برابر برابر لیٹے رہے - اُن کی سانسوں کی ہلکی پھنکار کمرے میں بلند ہو

رہی تھی - انہوں نے ایک دوسرے کے جوان، صحت مند جسموں کی حرارت ہوشوں سے لے کر

پاؤں کی اٹھکیوں تک رینگتی اور سارے کمرے میں پھیلتی ہوئی محسوس کی -

”شیلا - تمہارا جسم بہت ملائم ہے -“

وہ خاموش رہی -

”تمہارے بدن پر کوئی خراش نہیں۔ کسی زخم کا نشان نہیں، تمہاری آنکھیں پھر بھی چمکیلی ہیں۔“

”چمکیلی ہیں؟“

”ہاں۔ یہ میرے ایک دوست کی بات ہے۔“

”تمہارا دوست بھی خوبصورت ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

باہر بارش پھر شروع ہو گئی۔

”لیکن۔ شیلہ؟“ نعیم نے کہا۔

”ہوں۔“

”تم۔ بہت چھوٹی ہو۔“

”نہیں ٹھیک ہوں۔“

”تمہاری عمر کتنی ہے۔“

شیلہ نے غصے میں آکر باہیں اُس کی گردن کے گرد کسبیں اور پھنکارنا سرگوشی میں بولی:

”تم چھوٹے ہو۔ اگر تم عورتوں کے ساتھ بڑے نہیں ہوتے تو کبھی بڑے نہ ہو گے۔“

دُور گاؤں میں ایک مرغ کے اذان دینے کی آواز بند دروازے میں سے آئی۔

”اب ہمیں سو جانا چاہیے۔“ نعیم نے کہا۔

”سو جانا چاہیے؟“ شیلہ نے پوچھا۔

”ہاں۔ اب ہمیں سو جانا چاہیے۔“

دونوں نے سر ڈھانپ لیے۔ ہوا کے ساتھ بارش کی آواز تیز ہو گئی۔ اچانک شیلہ نے سر

اٹھایا اور بولی: ”نعیم، تم چلے تو نہیں جاؤ گے؟“

”نہیں۔“ نعیم نے بے تابی سے اُس کا سر اپنی طرف کھینچا۔ تیز سرد ہوا بڑے

دروازے کی درزوں میں سیٹیاں بجانے لگی۔ کبل میں کئی جگہ سے سردی داخل ہو رہی تھی۔

دفعتاً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”چپ رہو۔ کبجنت۔“ نعیم نے دانت پیس کر اُس کا منہ بند کیا۔ شیلہ نے اس کا ہاتھ

پٹایا اور ہونٹ دانتوں میں دبا کر سسکی۔ پھر اس نے نعیم کی چھاتی پر منہ رگڑا، اسے چوما، اور

دیر تک سسکتی رہی، حتیٰ کہ اس کی چھاتی جگہ جگہ سے بھیگ گئی۔ آہستہ آہستہ وہ خاموش ہو

گئی۔

”کیوں روتی ہو؟“ نعیم نے غصے اور بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

”مجھے خیال ہوا تھا تم مجھے چھوڑ جاؤ گے۔“ اس نے کہا اور وحشیوں کی طرح اسے چومنے

لکی -

”بے وقوف لڑکی -“

کاؤں میں سحر کا پہلا مرغ بولا تو وہ آہستہ سے اٹھا اور اپنے کمرے میں داخل ہوا - لیٹنے سے پہلے اس نے تختہ دروازے کے ساتھ برابر کر دیا - زمین پر سیدھا لیٹے لیٹے پشیمانی کا ہلکا سا سایہ اُس کے ذہن پر سے گزر گیا -

پھر تختہ ہٹنے کی آواز سن کر وہ چونک پڑا - شیلہ دروازے میں میٹھی بلی کی طرح آنکھیں چمکا رہی تھی -

”کیا ہے؟“ اُس نے پوچھا -

”تمہارا کوٹ -“

اُس نے ہاتھ بڑھا کر کوٹ تختے کے نیچے سے کھینچ لیا - ”ٹھیک ہے -“ وہ وہیں میٹھی رہی -

”جاؤ -“ اس نے کہا - شیلہ کی آنکھیں عجیب طرح سے چمکیں -

”جاؤ -“ وہ دانتوں کے بیچ میں سے چیخا -

وہ سادگی سے ہنس پڑی - اُس کے سفید دانت اندھیرے میں جھلملانے لگے - نعیم نے اٹھ کر تختہ برابر کر دیا، لیکن دیر تک وہ تختے پر چمکتی ہوئی آنکھیں اور سفید دانت دیکھتا رہا - نیچے پتھروں پر جھرنے کا پانی بہ رہا تھا اور بارش تھم چکی تھی -

”تو تمہیں بس اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ مال گاڑی گزر گئی یا نہیں -“ اقبال نے نقشے پر انگلی دوڑاتے ہوئے کہا - ”ہم مال گاڑی پر بارود ضائع نہیں کرنا چاہتے - ٹھیک ہے -“ بات ختم کر کے اُس نے پہلی دفعہ سگریٹ نکال کر نعیم کو دیا -

سوراخ میں سے دھوپ کی لکیر کمرے میں داخل ہو رہی تھی - کمرہ پار کرتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گیا - دھوپ کی لکیر اُس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی - آتش دان پر پڑے ہوئے شکستہ شیشے میں اُسے اپنا چہرہ نظر آیا: غلیظ اور زردا بڑھی ہوئی داڑھی میں اسے اپنے آپ کو پہچانتے میں کافی دقت ہوئی - یکبارگی ایک سرکش خیال نے اُس کے دل میں سر اٹھایا -

”ٹھیک ہے - ٹھیک ہے - میں اس کا حق دار ہوں -“

پشیمانی کا سایہ اُس کے ذہن سے چھٹ گیا اور اُس نے پہلی دفعہ گزری ہوئی رات کے سرور کو اپنے اعضاء پر محسوس کیا -

(۱۴)

درخت کے تنے سے لگ کر بیٹھے ہوئے اس نے ہزاروں بار پتھروں کے اوپر سے وادی میں

دیکھا۔ ”آدھی رات ہو گئی۔“ وہ نہ لب بڑھایا۔

مغرب کی طرف سے اٹھا ہوا بادل تیزی سے آسمان پر پھیل رہا تھا اور تارے ایک ایک کر کے چھپتے جا رہے تھے۔ ہوا نمدار اور سرد ہو گئی تھی اور اس کی کھوپڑی میں گھستی جا رہی تھی۔ ”گرمی کے دنوں میں یہاں نامراد سردی ہوتی ہے۔“ سینے پر کوٹ لپیٹے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اُسے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی اور وہ بار بار ریلوے لائن پر اور سامنے ڈھلان پر دیکھ رہا تھا۔ بادل کے ساتھ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور پہاڑی درختوں کی چوٹیاں جو ستاروں کے مقابل صاف دکھائی دیتی تھیں غائب ہو چکی تھیں۔

”اب تو مسافر گاڑی کا وقت ہو گیا۔ مال گاڑی شاید لیٹ ہے۔“ اُس نے پھر بات کی، لیکن اُسے خیال آیا کہ تیز چلتی ہوئی ہوا اُس کی آواز کو کہاں سے کہاں لے جائے گی۔ تے کے پیچھے سے سر نکال کر اس نے اندھیرے میں دیکھا۔ پہاڑ۔ ڈھلان۔ لائن۔ سرنگ۔ وادی۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ لیکن ان جگہوں کی جائے وقوع کا اُسے صحیح اندازہ تھا۔ شروع رات میں، جب مطلع صاف تھا، وہ یہ سب جگہیں دیکھ چکا تھا۔ اتنی دیر تک اکیلا بیٹھا رہنے کے بعد وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کی خواہش محسوس کر رہا تھا۔ اس خیال کو دل سے نکالنے کے لیے وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پتھروں کی اُس حد تک گیا جہاں سے ڈھلان شروع ہوتی تھی۔

”اس راستے سے آئیں گے۔“ اس نے کہا۔ ”جانے کہاں مر گئے۔ کبجنت سؤر۔ میں کہوں گا مال گاڑی گزر گئی۔ بارود لگا دو۔ ہاں، دیکھا جائے گا بعد میں۔“ وہ دل میں ہنسا۔

ڈھلان کے کنارے لیٹ کر اُس نے بازو ہوا میں بھیلایا دیا۔ ”اب کیا ہو گا؟ گھڑی تو پہلی لائن پر کم ہو گئی۔ اب بتاؤ!“ بچپنے میں ایک پہاڑی مقام پر وہ اسی طرح ڈھلان کے کنارے لیٹا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کیا۔ لیکن وہاں سبزہ تھا، اور دھوپ تھی اور ہوا میں خوش گوار گرمی تھی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ نیچے کود جائے۔ اس نے نیلی نیکر پہن رکھی تھی اور اس کے ساتھ چچا کا بڑا کتا تھا جو سبزے پر اس کے برابر لیٹا ہوا تھا۔ آس پاس اور بہت سے ہندوستانی اور انگریز بچے تھے۔ وہ اکیلا تھا۔ یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟ شاید! اور کون تھا؟ ارر۔ لیکن اوہ، خدایا۔ کس قدر خوبصورت“ اس نے زور سے آنکھیں میچ کر مٹھی ہوا میں چلائی اور ہنسا۔ کس قدر خوب صورت وقت تھا اور اس وقت پتا نہیں چلا۔ اس وقت کبھی پتا نہیں چلتا۔

دیر تک اسی طرح لیٹے رہنے کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک کال جو ہوا کے

سامنے تھا برف کی طرح جم چکا تھا اور بال اڑ اڑ کر آنکھوں میں پڑ رہے تھے۔ کبجنت مردوں ابھی تک غائب ہیں۔ پیٹ میں سخت بھوک محسوس کر کے وہ دل میں گالیاں دینے لگا۔

”یہاں سے کود جاؤں۔“ خیال کی مضحکہ خیزی پر وہ ہنسا۔ ”یا بھاگ جاؤں۔ واپس؟ نہیں۔“ اس نے ترچھی ٹکابوں سے اندھیرے میں دیکھا۔ ”نہیں۔“ آہستہ آہستہ رات کا سرور اس کے بدن پر پھیل گیا۔ وہ اٹھا اور چالکی سے مسکراتا ہوا گھٹنوں اور ہتھیلیوں پر چلنے لگا۔ پتھروں پر لکڑی کی آواز کورکنے کے لیے اس نے کوٹ کی آستین کو نیچے دبا لیا۔

اس وقت رات کی بارش کے پہلے قطرے اس کے چہرے پر گرے۔ تے کے ساتھ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں بھیگ گئیں۔ بارش ابھی ہلکی تھی، ابھی تیز ہو گئی۔ اس نے پہاڑی درخت کو کالی دی جس سے بارش میں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ”ایک چنار کا درخت وہ گھڑا ہے، مگر عین راستے میں ہے۔“ بھیڑیے۔ کیا میں سردی اور بھوک سے یہاں مر جاؤں؟“ بارش تیز ہو گئی۔ اُس نے سردی سے کانپتے ہوئے گیلاکوٹ چھاتی اور کندھوں پر کس کر پیٹ لیا۔ اُس کی پتلون ٹانگوں سے چمٹ گئی تھی اور بڑے فوجی بوٹوں میں پانی بھر گیا تھا۔

ہوا کے ساتھ ڈھلان پر سے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ وہ بیتابی سے بڑھا، مگر بارش کے شرانے نے اس کی ہمت پست کر دی۔ پتھروں پر چڑھنے اور باتیں کرنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ ”بے وقوف جاہل، اتنا کلا پھاڑ رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

دور مشرق میں، پہاڑ کے پیچھے گاڑی کی تیز و سل سنائی دی اور سامنے کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس لوٹی۔ وہ چونکا۔ بارش اور ہوا کے شور کے باوجود اُس نے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف طور پر سنی۔ ”کون سی گاڑی ہے؟“ اُس نے سانس روک کر سوچا۔ مال گاڑی؟ نہیں، اب مسافر گاڑی کا وقت ہے۔ ”مال گاڑی شاید لیٹ ہو گئی، یا کہیں گھڑ میں گر گئی، یا جب میں پانچ منٹ کے لئے سو گیا تھا تو گزر گئی ہوگی۔ یقیناً۔ اب کیا ہو گا؟ خدایا، اگر وہ دو منٹ پہلے بھی پہنچ گئے تو بارود رکھ سکتے ہیں۔ یقیناً پہنچ جائیں گے۔ وہ تو اب یہ آگئے۔“ اُس نے کان لگا کر سنا۔ باتوں کی آواز ڈھلان کے کنارے پر آگئی تھی، اچانک بند ہو گئی۔ وہ دیر تک ہوا کے رخ کان لگائے کھڑا رہا، لیکن اُس کے کان میں پانی بھر گیا۔ ”خدایا۔“ اُس نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ ”میں یہ بالکل نہیں چاہتا۔ تم جانتے ہو۔ میں اس وقت یہاں محض اس لیے ہوں کہ اپنا فرض انجام دینا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا یا اللہ کہ وہ وہیں بیٹھے رہیں، یا پھر بارود والے کا ڈھلان پر سے پاؤں پھسل جائے، پتھر تو اب پھسلواں ہو ہی چکے ہیں، یا پھر۔“ آواز اب سامنے پتھروں پر سے آ رہی تھی۔ اُس کا دل یکبارگی دھڑکا۔ اندھیرے میں دو سائے اُس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ایک کسان تھا جو گدھے پر بھوسا لادے جا رہا تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے اُس نے سن کی خالی بوری کا چھاتا بنا کر سر پر اوڑھ رکھا تھا اور گدھے کی پونچھ

پکڑے باتیں کرتا ہوا چل رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے کچھ کھاتا جا رہا تھا۔ کمزور سا گدھا گیلے بھوسے کے بوجھ سے مر رہا تھا۔

”اب تمہارا پاؤں پھسلتا ہے، میں؟ کم ذات۔ میں تیرے بہانے جانتا ہوں۔“ وہ جھڑک کر بولا۔ ”تیری چابی میرے ہاتھ میں ہے، فکر مت کر۔ کمین۔ تو ہے ہی کمین۔ تیرا باپ بھی کمین تھا۔ جس روز خریدا اسی روز مر گیا۔ تو چھوٹا سا رہ گیا۔ چاروں سے خریدا تھا، کمین نہیں تو اور کیا ہوتا؟ دیکھ تو ڈھلان پر ٹانگیں نہ پسارتا تو ہم کبھی کے گاؤں پہنچ چکے ہوتے۔ سارا بھوسا خراب ہو گیا۔ تجھے ذرا سے کو میں نے پالا تھا، تو کسی کا احسان نہیں مانتا؟ میں؟ کمین چار۔“

وہ مسلسل کھاتا اور باتیں کرتا ہوا گزر گیا۔

”شاید سرخ گندم کی روٹی ہے۔“ نعیم نے سوچا۔ اس کا جی چاہا کہ اسے دھکا دے کر گرا دے اور روٹی اس سے چھین لے۔ پھر وہ ہنسا۔ ”یہ مجھ سے بھی بے وقوف نکلا۔“

کاڑی سرنگ میں سے نکلی اور دھشت ناک آواز پیدا کرتی ہوئی گزر گئی۔ انجن کی بتی سے ٹھکتی ہوئی روشنی کی لکیر میں دور تک چمکتی ہوئی بوندیں گر رہی تھیں۔ نعیم نے ہوا میں کوئلے کے گیلے دھوئیں کی بو سونجھی۔ یہ مال کاڑی تھی۔

”اب میں کہوں گا مال ابھی نہیں گزری۔“ وہ اپنی چالکی پر مسکرایا۔ لیکن اسی لمحے بھوک اُس کی استریوں میں زور پکڑ گئی۔ مسلسل کٹکٹاتے ہوئے داتوں کے درمیان سے اُس نے بے شمار کالیاں دیں۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر بارش، بھوک اور انتظار نے اُس کا حال بدتر کر دیا۔ اور بغیر سوچے سمجھے وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈھلان پر اترتے ہوئے کئی بار اس کا پاؤں پھسلا لیکن وہ کوستا کلبلاتا ہوا، آستین سے ناک اور آنکھوں کا پانی پونچھتا ہوا، جانے بوجھے راستوں پر بھاگتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر وہ دکان میں داخل ہوا۔ چھپر تلے لکڑی کے تخت پوش پر بڑھا لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ اُس کے پالتو کتے نے تخت پوش کے نیچے سے نکل کر دم ہلائی۔

پہلے کمرے میں سخت اندھیرا تھا۔ تختے کی درزوں میں سے دھسے کمرے میں جلتی ہوئی آگ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ کمرے کے فرش پر وہ بھاری قدموں سے جھول کر چلتا ہوا بڑھا۔

”کون ہے؟“ ایک دھیمی، مانوس آواز اس کے کانوں میں آئی۔

شیلہ اس کے قریب آکھڑی ہوئی۔ ”نعیم۔“

اُس نے مد کر تھکی ہوئی نگاہ اُس پر ڈالی۔

”وہ ابھی جاگ رہے ہیں۔“ شیلہ نے کہا۔

ایک بڑی سی کالی اس کے منہ سے نکلی۔ جیب سے ہاتھ نکالے بغیر وہ سارے جسم کے ساتھ تختے سے ٹکرایا، تختہ زمین پر گر پڑا اور اس پر سے چلتا ہوا وہ اس طرح کمرے میں داخل ہوا جیسے کہ دروازے میں کچھ تھا ہی نہیں۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ ایک سرخ داڑھی والا اجنبی بڑھا پتھر پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اس نے ٹھنڈے کپڑے کا خاکی کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر بڑی سی پگڑی تھی۔ اس کا چہرہ گول اور تروتازہ تھا اور وہ کسی طور سے ان کے گروہ کا آدمی دکھائی نہ دیتا تھا۔ من اس کے قریب لیٹا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہم تمہارے انتظار میں تھے۔ تم غصے میں دکھائی دیتے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔“ اقبال نے کہا۔ وہ آتش دان کے قریب اپنی مخصوص جگہ پر ایک کہنی کے سہارے لیٹا پستول صاف کر رہا تھا۔

نعیم اس کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ ”آئے کیوں نہیں؟“
 اُس نے کندھے اچکائے اور ڈھیلے چھوڑ دیے۔ ”بارش ہو رہی تھی۔ بارود کیسے لیا جا سکتا تھا۔“

”تو اطلاع بھی نہیں دے سکتے تھے؟“ نعیم نے غصے کو دبا کر کہا۔
 ”ہم نے مادھو کو بھیجا تھا۔“ من نے آنکھیں کھول کر جواب دیا۔
 ”میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ صرف ایک گدھا گزرا تھا، اور ایک آدمی جو گدھے سے بدتر تھا، میں سردی سے مر رہا ہوں۔“ اس نے لکڑیوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر اٹھا کر بچھتے ہوئے کوٹلوں پر پھینکا اور بیٹھ گیا۔ چیڑکی لکڑیوں نے مخصوص، تیز دھواں چھوڑا اور جل اٹھیں۔ اس کے بوٹوں میں بھرا ہوا پانی نکل نکل کر فرش پر بہنے لگا۔ کندھوں پر گیلے کوٹ کے بوجھ کو بے طرح محسوس کر کے اس نے کافی کشمکش کے بعد اسے اتار کر وہیں پھینک دیا، بالوں میں اٹھلیاں ڈال کر پانی نچوڑا اور ہاتھ گود میں رکھ کر آگ کی حرارت محسوس کرنے لگا۔
 من نے سر اٹھا کر اقبال کی طرف اٹھکی ہلائی۔ ”وہ نکما آدمی، میں کہتا ہوں، شراب پینے کے لیے کھاؤں چلا گیا ہو گا۔ تم نے ایسے ایسے آدمی اکٹھے کر رکھے ہیں جو۔ نقصان دیں گے۔ سب کو نقصان دیں گے۔“

اقبال نے ریوالور کی چمکی تیزی سے اٹھکیوں میں گھمائی اور خاموشی سے بڑھے کی طرف دیکھا۔

”کچھ کھانے کو دو۔“ نعیم نے لکڑی کے گیلے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔

”کچھ کھانے کو دو۔ میں نے کل صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“
 ”تم سے کس نے کہا تھا؟“ اقبال چپکے سے بولا۔

”کس؟“

”کہ مت کھاؤ۔ اس وقت تو کچھ نہیں ہے۔“

”لیکن ن ن۔“ انتہائی غصے کی وجہ سے وہ ستلانے لگا۔

”آج ایک نیا مہمان آگیا تھا۔“ مدن نے بڑھے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ۔“ اس کی بات ختم ہونے سے پہلے نعیم کا ضبط ٹوٹ گیا۔ زمین پر ہاتھ ٹیکے بغیر وہ مشین کی طرح سیدھا اٹھ کھڑا ہوا۔ چند سیکنڈ تک اچانک اور شدید غصے کی وجہ سے گنگ کھڑا وہ سب کو باری باری دیکھتا رہا، پھر مڑ کر کمرے میں تیز تیز چکر لگانے لگا۔ آنسو اُس کے حلق اور آنکھوں میں عود کر آئے۔

آہستہ آہستہ اس نے بولنے کی قوت دوبارہ حاصل کی۔

”تو میں بھوکا مر جاؤں؟“ وہ ہوا میں ہاتھ پھینک کر چیخا۔ ”میں گدھا ہوں؟ ایک گدھے کو بھی چارہ نہ دو گے تو کام نہ کرے گا۔ چار گھنٹے تک میں وہاں چوہے کی طرح بھیگتا رہا۔ کس لیے؟ تم جانور ہو؟ تم نے کبھی انسان نہیں دیکھے؟“ وہ رکا اور ہاتھ پتلون کی جیب میں دے کر کندھے جھکا کر کمرے میں پھرنے لگا۔ مدن نے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیں۔ ”مت چیخو۔“ اُس نے کہا۔ اقبال اسی طرح سکون سے بیٹھا پستول میں گولیاں ڈالتا اور نکالتا رہا۔ کمرے میں صرف لکڑی کے جلنے اور حقہ گڑگڑانے کی آوازیں تھیں۔

”میں چالیس روز سے تمہارے ساتھ ہوں اور میں نے ایک دن پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔ میں اپنی مرضی سے یہاں ہوں؟ ہرگز نہیں، تم وحشی ہو اور وحشیوں کا کام کر رہے ہو۔ مجھے اس سارے کام سے نفرت ہے۔“ غصے اور مایوسی کی حالت میں الفاظ اُس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

”میں آج ہی یہاں سے جا سکتا ہوں۔“

اقبال کہنی پر اٹھا اور نظریں اُس پر گاڑ کر صاف آواز میں بولا: ”ٹھیرو۔ تم کون ہو؟ بتاؤ؟“ اس کے صاف، بظاہر پر سکون آواز میں ایک ظالمانہ جذبہ تھا جو صرف نعیم نے محسوس کیا۔

”خفیہ پولیس؟“ اقبال نے پوچھا۔

نعیم کے ذہن میں سفید غبار دوپہر کی برف کی طرح پکھلنے لگا۔ دفعتاً اُس نے محسوس کیا کہ وہ نہایت غلط مقام پر آپہنچا ہے۔ تیز رکی ہوئی نظروں کے سامنے اُس نے سوچا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا، کہ زیادہ باتیں بنانا اب بے کار تھا۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں پر بیٹھ گیا۔

”پہلے بھی خفیہ پولیس نے ایک بھیجا تھا۔ ہم نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔“ مدن نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر کہا۔

”میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔“ نعیم نے کہا۔ لیکن تین طرف سے جمی ہوئی نظروں نے اُسے مجبور کر دیا۔ اُس نے گھبرا کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں کانگریس کا آدمی ہوں۔“

مدن آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کبیل اُسکے کندھے سے ڈھلک کر نیچے جا پڑا۔ کچھ دیر تک وہ حیرت اور تسخر سے اُسے دیکھتا رہا، پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اُس کے بڑے سے، شرمیلے چہرے پر تلخی اور مضحکہ تھا۔ ”کانگریس؟ نامردوں کی جماعت؟ کلرکوں اور جاگیرداروں کی؟ جو صوفوں پر بیٹھ کر آزادی کی جنگ لڑتے ہیں۔ ہلبا۔ ہلبا۔“

”یہ غلط ہے۔“ نعیم نے ہاتھ کو جنبش دی۔ ”تم نہیں سمجھتے۔ کانگریس میری جماعت ہے۔ مجھے دیکھو۔ میں جاگیردار ہوں؟ کلرک ہوں؟ میں سیدھا سادا کسان ہوں۔ ہاتھ سے کام کرنے والا مزدور ہوں۔ ہمارا اور تمہارا فرق۔“

”تم کسان ہو۔“ مدن نے اس کی بات کاٹی۔ ”اسی لیے انہوں نے تمہیں نکال دیا ہے۔ یہاں بھیج دیا ہے۔ وہ گورنر کی دعوتوں میں جاتے ہیں اور اپنے درمیان سانوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ انہوں نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔ بس۔ اور تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟ بولو۔!“

”دیکھو۔“ نعیم نے اعصابی انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ ”جن لوگوں سے میں ملا ہوں وہ میری اور تمہاری طرح کے انسان تھے۔ نادار اور محنت کش۔ شاید کسان، یا مزدور، مجھے علم نہیں، لیکن وہ کبھی گورنر کی دعوتوں میں نہیں گئے۔ اور میں۔ یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تم لڑائی کا ڈھنگ نہیں جانتے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی بڑا دماغ بھی چاہیے۔ چند لوگ کی دہشت پسندی سے کیا ہو گا؟ اس جنگ میں ہم بھی اتنے ہی شریک ہیں جتنے تم۔“ اُس نے رک کر پسینہ پونچھا جو اس سرد رات میں اس کے ماتھے پر نمودار ہو گیا تھا۔ ”ہماری تحریک عوام میں ہے۔ کسانوں اور مزدوروں میں، لاکھوں اور کروڑوں لوگوں میں، جن کے ہاتھ میں بے پناہ طاقت ہے۔ تم نے تاریخ اور معاشیات کا مطالعہ کیا ہے مگر عقل سلیم بھی ایک شے ہے۔ ایک ریل گاڑی اڑانے سے تم کیا کر لو گے؟ ہندوستان میں ہزاروں ریل گاڑیاں چل رہی ہیں۔ آزادی کے لیے ریل گاڑیوں سے نہیں، ان میں سفر کرنے والے لاکھوں لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایک پروگرام چاہیے، ایک ضابطہ، تمہارے پاس کیا ہے؟ چند گروہ ہیں جو اٹھلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، اور ان کا بھی آپس میں کوئی رابطہ نہیں۔ تم بغیر سوچے سمجھے کام کرتے ہو۔ تمہارے پاس سوچنے کے لیے کچھ ہٹی نہیں۔ میں نہیں سمجھتا،“ اُس نے مایوسی سے سر ہلایا، ”کہ یہ سب کیا ہے!“

”اور تم کیا سمجھتے ہو؟“ مدن نے اُس پر اٹھلی ہلائی۔ ”تم۔“

”سنو۔“ نعیم نے اکڑی ہوئی ٹانگیں اٹھائی کیں اور بڑھے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس سے حقہ پکڑ کر دو لمبے لمبے کش لینے کب بعد اس نے حقہ واپس کر دیا اور کندھے جھکا کر بیٹھ گیا۔

”سنو۔“ اُس نے دوبارہ کہا اور گہرے استغراق میں بولنے لگا۔ ”میرا یہ پختہ یقین ہے

کہ اگر بزدلی اور تشدد میں انتخاب کرنا پڑ جائے تو بزدلانہ طور پر ذلت اور بے بسی کا شکار ہونے کی بجائے ہندوستان کو مسلح طور پر اپنی عزت کی حفاظت کرنی چاہیے۔ مگر ساتھ ہی میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ عدم تشدد، تشدد سے کہیں زیادہ افضل اور سزا دینے سے معاف کر دینا کہیں زیادہ مردانہ فعل ہے۔ اپنے دشمن کو معاف کر دینا ایک سپاہی کا زیور ہوتا ہے۔ مگر سزا نہ دینا اسی وقت معاف کر دینا کہلاتا ہے جب معاف کرنے والے میں سزا دینے کی طاقت موجود ہو۔ ایک چوہیلا، جب کہ بلی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہوتی ہے، بلی کو معاف کر دینے والی نہیں کہلا سکتی کیونکہ وہ خود مجبور اور بے بس ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی میرا یہ بھی یقین ہے کہ ہندوستان ایسا بے بس بھی نہیں ہے۔ طاقت جسمانی قوت نام نہیں، حقیقی طاقت ایک غیر مفتوح آہنی ارادے سے پیدا ہوتی ہے۔

”عدم تشدد کا اصول محض رشیوں کے لیے نہیں بنا تھا۔ بلکہ عام انسانوں کے لیے بھی وہ ویسا ہی قابل عمل ہے۔ عدم تشدد انسانوں کے لیے ایسا ہی زندگی کا قانون ہے جیسے تشدد وحشی جانوروں کے لیے ہے۔ تشدد کا جذبہ وحشی جانوروں کے اندر مخفی ہوتا ہے، اور وہ سوائے حیوانی طاقت کے اور کسی قانون کو نہیں جانتے۔ مگر شرف انسانیت ایک بلند تر طاقت کے سامنے سر جھکا دینے کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی روحانی طاقت کے سامنے۔ ہمارے رشی جنہوں نے ایک تشدد آمیز ماحول میں عدم تشدد کے قانون کو دریافت کیا، نیوٹن سے بڑھ کر نابغہ روزگار اور ولنکٹن سے بڑھ کر بہادر سپاہی تھے۔ انہوں نے ہتھیاروں کے استعمال کو جاتے ہوئے ان کے ناکارہ پن کو سمجھ لیا تھا۔ اور اسی لیے انہوں نے ایک تھکی ماندہ دنیا کو یہ اپدیش دیا تھا کہ اُس کی نجات کا راز تشدد کی بجائے عدم تشدد میں مضمر ہے۔ عدم تشدد کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایک مضبوط ارادے والے بدکردار شخص کے سامنے عاجزانہ طور پر ہتھیار ڈال دیے جائیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی پوری روحانی قوت کے ساتھ ظالم کے ظلم کا مقابلہ کیا جائے۔

”پس میں ہندوستان کو اس کی کمزوری کی وجہ سے عدم تشدد اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دے رہا، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان اپنی طاقت اور قوت کا احساس رکھتے ہوئے عدم تشدد کو اختیار کرے۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ یہ جانے کہ وہ اپنے اندر ایک ایسی روح رکھتا ہے جو تباہ ہونا نہیں جاتی اور جو ہر جسمانی کمزوری پر غالب آ سکتی ہے۔ میں ان لوگوں کو جو تشدد پر یقین رکھتے ہیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ غیر متشدد اور امن پسند ترک موالت کا ایک دفعہ تجربہ کر کے دیکھیں۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ عدم تشدد اپنی کسی اندرونی ذاتی کمزوری کی وجہ سے ناکام ثابت نہیں ہو گا بلکہ اس وقت ناکام ہو گا جب اس پر پورے طور سے عمل نہ کیا جائے۔ اور وہ وقت حقیقی خطرے کا وقت ہو گا۔ کیونکہ اس وقت وہ بلند ہمت انسان جو اپنی قومی ذلت کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتے اپنے غصے کا عملی اظہار شروع کر دس گے اور تشدد کو

اختیار کر لیں گے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو اس ظلم سے نجات دلوانے کی بجائے، جس کا وہ تختہ مشق بنائے جا رہے ہیں، تباہ ہو جائیں گے۔
 ”یہ تمہارا فلسفہ ہے؟“ من نے مسکرا کر پوچھا۔

”میرا اتنا بڑا دماغ نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔ یہ تمہارا گرو ہے۔ کاندھی۔“ وہ طنز سے مسکرایا۔ ”کاندھی راہب۔ سادھو۔ ولی اللہ۔ جو ہوا میں باتیں کرتا ہے۔ اُس کا حلیہ تم نے کبھی دیکھا ہے؟ اور تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں ملک لے کر دینے والا ہے؟ وہ کبھی گورنر کی دعوت میں نہیں گیا؟ اُس کی تقریریں اور فلسفے تمہاری کیا مدد کریں گے؟ جنوبی افریقہ میں اس نے کیا کیا، جانتے ہو؟“ وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے ماتھے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی وہ مانوس رگ جو خطرے یا جوش کے وقت ظاہر ہوتی تھی، ابھر آئی۔

”اس کا سر حلوہ کدو کی طرح ہے۔“ اقبال نے زہریلا قہقہہ لگایا۔

”اوہ۔“ نعیم نے مایوسی سے ہاتھ ہوا میں ہلایا۔ ”تم نہیں سمجھتے۔ من۔ یہ فلسفہ کاغذ پر نہیں، ہاتھوں پر لکھا گیا ہے۔ اس میں کام کرنے کی طاقت ہے۔ ذرا سوچو، ہمارے ہزاروں آدمی ملک بھی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم پر قانون کی کوئی پکڑ نہیں۔ ہم صرف اپنا حق مانگتے ہیں۔ لیکن تم۔ جرم کرتے ہو۔ تم جرم کرتے ہو اور غاروں میں چھپ جاتے ہو اور ہمارے آدمیوں کو پکڑ کر جیل میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ ہمارا کام رک جانا ہے۔ سمجھے؟“ وہ رکا۔
 ”ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ نوجوان، جن کے پٹھوں میں طاقت ہے۔“

اقبال آنکھیں سکیڑے اُسے دیکھ رہا تھا، لاپرواہی سے بولا: ”ہماری ضرورت ہمارے کام کو ہے۔ کانگریس کو بزدلوں اور لنگڑوں اور لنجوں کی ضرورت ہے“ ”بکومت۔“ نعیم چیخا۔
 ”میں بزدل نہیں ہوں۔ میں نے جنگ کے میدان میں بازو کھویا ہے۔“

اقبال نے ریوالور کو الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر احتیاط سے اسے سیدھا کیا اور ایک وحشی لیکن پکے ارادے کے ساتھ حقے کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ دھماکے کے ساتھ مٹی کا حقہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑا اور بدبودار پانی زمین پر بہنے لگا۔ لکڑی کی نالی سرخ داڑھی والے کے ہاتھ میں رہ گئی جو پتھر پر ٹانگیں پھیلائے ششدر بیٹھا تھا۔ من سکون سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اقبال ریوالور کو خول میں ڈالنے لگا۔

پتلون کی جیب میں پستول پر نعیم کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ باہر سے بڑھا گھبرایا ہوا داخل ہوا۔ سوتے سے ایک دم جاگ اٹھنے سے اس کے بال لوسے کے تاروں کی طرح کھڑے تھے، جسم پر صرف ایک دھوٹی تھی اور داڑھی پر رال بہ رہی تھی۔

”کون مر گیا؟“ قریب آکر اس نے خوف زدہ، سرخ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر سرخ داڑھی والے نے حقے کی نالی سے نعیم کی طرف مبہم سا اشارہ کیا۔ بڑھے نے جھپٹ کر نالی اس کے ہاتھ سے چھینی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر غصے سے سب کو باری باری دیکھنے لگا۔

”چاند ماری کی اچھی جگہ ڈھونڈی ہے تم نے۔“ اُس نے اقبال سے کہا۔ ”میرا بھی میڑا غرق کرو گے۔ اسی لیے میں نے تمہیں رکھا ہے؟“ غصے اور گھبراہٹ کی وجہ سے وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکا اور کہنیاں باہر نکال کر کمرے کی چوڑائی میں چکر لگانے لگا۔ کبھی کبھی وہ رک کر سب کو دیکھتا، کچھ کہتا کہتا رک جاتا، اور پھر چلنے لگتا۔ نعیم جیب سے ہاتھ نکالے بغیر اٹھا اور اپنے کبیل پر جا کر لیٹ گیا۔ انتہائی کوشش کے ساتھ اس نے اپنی اٹکلیوں کو اسی وحشی انسانی جذبے کے تحت عمل کرنے سے باز رکھا۔

پھر بات کیے بغیر بڑھا سب کی طرف ملامت اور سرزنش سے دیکھتا ہوا باہر جانے کو بڑھا، نعیم کے اوپر کھڑا ہو کر بولا: ”سوتے میں اس کی جان مت لینا۔“ اور باہر نکل گیا۔ کچھ دیر کے بعد سرخ داڑھی والا آہستہ آہستہ چلتا ہوا نعیم کے پاس آیا۔ خاکی کوٹ کی جیب میں ادھر ادھر تلاش کرنے کے بعد اُس نے ہاتھ باہر نکالا اور چند خشک کھجوریں اُس کی طرف بٹھائیں۔

”میرے پاس کچھ کھجوریں ہیں۔“ اس نے کہا۔

ایک لحظے تک نعیم اُس کی سادہ، بے مطلب آنکھوں اور بے تکلفی سے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا رہا، پھر اُس نے کھجوریں لے لیں اور دیوار کی طرف کروٹ لے کر غیر معمولی اشتہاء کے ساتھ کھانے لگا۔

جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو ستاروں کی مدہم روشنی سوراخ میں سے داخل ہو رہی تھی۔ ”بارش تھم گئی۔“ اُس نے سوچا۔ آتش دان کے قریب گھپ اندھیرا تھا اور تین طرف سے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔ اس کا ذہن بالکل خالی تھا اور وہ دوبارہ سو جانے کی شدید خواہش محسوس کر رہا تھا۔ بند آنکھوں کے سامنے سفید پردہ اور ستارے لیے وہ خاموش لیٹا کبیل کی آرام دہ حرارت کو محسوس کرتا رہا۔ پھر تختہ سر کا کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ اندھیرے میں آسانی سے چلتا ہوا وہ اس کے بستر پر جا کھڑا ہوا۔ بستر میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ گھٹنوں پر بیٹھ کر اُس نے تاریکی میں ہاتھ پھیلایا اور شیلہ کے چہرے کو چھوا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ نعیم کی اٹکلیوں کے نیچے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لحظے تک وہ اسی طرح جلتی ہوئی خشک آنکھوں پر اٹکیاں رکھے بیٹھا رہا اور اس کے دل میں اس اجنبی لڑکی کے لیے بے پناہ ہمدردی اور رنج پیدا ہوا۔

”تم سوئی نہیں؟“ اس نے پوچھا۔
 ”نہیں۔“ شیلانے بھاری آواز میں سرگوشی کی۔

رات بھر؟“

”ہوں۔“

خاموشی سے اس کے برابر لیٹ کر اس نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اس کے پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے احسان مندی کے جذبے سے اس کے سر اور ماتھے کو چوما۔ وہ بلی کے بچے کی طرح اس کے سینے سے لگ کر سبکنے لگی۔ اس کی گرم، بخار زدہ سانس نعیم کی تنگی چھاتی پر سے گزری اور اس کی جلد میں ایک درد آلود کپکپاہٹ میدار کرتی ہوئی ہڈیوں میں اتر گئی۔ نعیم نے انتہائی تکلیف وہ احساس کے ساتھ ایک بازو کے پورے زور سے اسے بھینچا۔

”تم سوئی کیوں نہیں؟“

”ابھی تم خراٹے لے رہے تھے۔“

”تم نے جگایا کیوں نہیں؟“

”میں کئی بار گئی۔ پھر لوٹ آئی۔“

”کیوں؟“

پتہ نہیں۔“ وہ کہنیاں اس کی چھاتی پر رکھ کر اٹھی۔ ”آج وہ تمہیں مار دیتے تو؟“

”تو کیا تھا؟“

وہ اُس کے سینے سے چمٹ گئی۔ ”میں اُسے مار دیتی۔ یقیناً۔ رپچھ۔“

”کیسے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”بارود کے تھیلے پر کوئلہ رکھ کر۔“

”یوں تو سب مر جاتے۔“

”پر زیادہ تو وہ مرتا۔ بارود اُس کے سر کے نیچے ہوتا ہے۔“

وہ چپکے سے ہنسا۔ ”عجیب طریقہ ہے۔“

”اس طرح میں نے تمہیں مارنے کا بھی منصوبہ بنایا تھا۔“

”مجھے؟“

”ہاں۔“

”کب؟“

”پہلے پہل۔“

”کیوں؟“

”تم بات جو نہیں کرتے تھے۔“

”پھر۔“

”پھر میں نے سوچا۔“ اُس نے نعیم کی گردن پر ہونٹ رکھ کر کہا۔ ”میں خود تم سے بات کروں گی۔“

وہ پھر ہنسا۔

”میں تمہیں مار دیتی تو اچھا تھا۔“ اُس نے کہا۔

”کیوں۔“

کہنیاں نعیم کی چھاتی میں گاڑ کر دھیمی، پھنکارتی ہوئی آواز میں وہ بولی: ”میں آج رات بھر جاگتی رہی۔“

”اوہ۔ مجھے معاف کر دو۔ اب میں آگیا ہوں۔“ اُس نے اسے ہونٹوں پر چوما۔

”نعیم۔“

”ہوں۔“

”تمہیں اب چلا جانا چاہیے۔“

وہ خاموش لیٹا اس کی جلد سے ٹکلتی ہوئی ہلکی، نشہ آور حرارت کو محسوس کرتا رہا۔ اُس نے سوچا کہ وہ حرارت اپنی قوت ضائع کیے بغیر شیلہ کی جلد سے نکل کر اُس کی جلد میں داخل ہو رہی ہے، اور اسے زیادہ صحت مند، زیادہ مضبوط اور زیادہ ریشمیں بنا رہی ہے، جیسی صحت مند اور مضبوط اور ریشمیں وہ دوسری جلد ہے، جیسی صحت مند اور ریشمیں وہ حرارت ہے۔ اپنی چھاتی کے ہلکے سے جھکاؤ میں، جو شیلہ کی چھاتیوں کے درمیانی جھکاؤ کے عین نیچے تھا، سردی محسوس کر کے اُس نے پورے جسم کے ساتھ اسے بھینچا۔

”یہ لوگ بھیڑیوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔“ شیلہ نے کہا۔

”ہاں۔“

”ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”ہاں۔“

”تمہارا گھر ہے؟“

”ہاں۔“

”کہاں۔“

”کہاں؟“ وہ بمشکل اُس کی بات سمجھ رہا تھا۔ ”دلی میں۔“

”ہم پھر دلی چلے جائیں گے۔ میں نا؟“ شیلہ نے اس کے منہ پر کال رکھا۔

”ہاں۔“

”ہم پھر شادی کر لیں گے۔“

ہاں۔

”تم مجھ سے شادی کر لو گے نا؟“

ہاں۔

”نہیں، مجھے بتاؤ۔“ اُس نے بضد ہو کر پوچھا۔

”ہاں۔ ہاں۔“ نعیم نے سختی سے دھرایا اور اُس کے ہونٹوں کو دبا کر چوما۔

”پھر ہم میاں بیوی کی طرح رہیں گے۔“

ہاں۔

”تم کیا کرتے ہو؟“

”میں؟ کھیتی۔“

”ہم بھی کھیتی کرتے تھے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”میں سارا کام کر لیتی ہوں۔“

”اچھا؟“

”دودھ بلو لیتی ہوں۔ چارہ کاٹ لیتی ہوں۔ چاول پکا لیتی ہوں۔ گوبر۔ بھی تھوپ

لیتی ہوں۔“

وہ ہنسا۔

”میں سارا کام کروں گی۔ تمہاری ماں بھی ہے؟“

ہاں۔

”میں تمہارا سارا کام کروں گی۔“ خوشی سے بے حال ہو کر لڑکی نے اُس کے بال دونوں

ہاتھوں میں پکڑ کر کھینچے۔ ”ہاں۔ ہاں۔“ پھر اس نے دونوں بازو اُس کی گردن کے گرد کس

کر لپیٹے اور اُس کے کال کا ایک طویل، گرم بوسہ لیا۔ ”میں نے بڑی دیر ہوئی گھر میں کام

نہیں کیا۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“ وہیں پر ہونٹ رکھے رکھے اس نے بھاری، آزرده

لہجے میں کہا۔

نعیم کے دل میں ایک نامعلوم سے بے چینی، ایک رنج پیدا ہوا۔

”اب وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں۔ اب وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔“ شیلانے جواب دیا۔

”صبح ہونے والی ہے۔“

”ہاں۔ صبح ہونے والی ہے۔“

”اب ہمیں سونا چاہیے۔“

”اب ہمیں سو جانا چاہیے۔“ شیلانے دھرایا۔

اور نعیم نے محسوس کیا کہ اُس کی رائے میں اور اس کی رائے میں، اُس کی رضامندی میں اور اس کی رضامندی میں، اس کے وجود میں اور اس کے وجود میں کوئی فرق، کوئی فاصلہ نہیں ہے، اور ان کے درمیان مکمل سمجھوتہ، مکمل صلح اور مکمل امن، ہے، جیسے میاں بیوی کے مابین ہوتا ہے۔

تمام دن وہ اکیلا اکیلا پہاڑیوں پر پھرتا رہا۔ وہ چھتیس گھنٹے سے بھوکا تھا۔ اُس کا دماغ کافی حد تک سن ہو چکا تھا اور وہ سارے بدن میں کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ کبھی کبھی خیالات کا مختصر سا، تیز ریلا کہیں سے آتا: ”اب کیا ہو گا! چلا جاؤں؟ رک جاؤں!“ جواب دینے سے پہلے وہ بے دھیان ہو جاتا۔

دوپہر کے وقت وہ ایک چٹان کے سائے میں سو گیا۔ جب اٹھا تو سورج غروب ہو رہا تھا اور چٹان کا سایہ دور تک چلا گیا تھا۔ اٹھتے اٹھتے معدے میں شدید درد محسوس کر کے وہ پریشان ہو گیا۔

”بھوک کی وجہ سے ہے۔“ اس نے کہا اور آہستہ آہستہ پتھروں پر اترنے لگا۔ بڑھا اپنے مستقل اچھی انداز میں روٹی کے میلے گدے پر بیٹھا تھا اور ایک کسان لکڑی کے بیچ پر بیٹھا دودھ پی رہا تھا۔ مٹی کے میلے برتن بڑھے کے آگے رکھے تھے۔ ایک بڑی سی کڑاہی میں دودھ گرم ہو رہا تھا جس پر میلے رنگ کی موٹی بالائی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ کڑاہی کے پاس چھوٹا سا گراموفون پڑا تھا۔ اس کے ہرے رنگ کے بھونپو پر مکھیوں کی بیٹوں کے بے شمار کالے کالے داغ پڑ گئے تھے۔ گراموفون دن بھر کھسے ہوئے ریکارڈ بجا بجا کر اب خاموش ہو چکا تھا۔

نعیم تخت پوش کے کونے پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ تباکو کی وجہ سے اس کے معدے کا درد بھاری اور بدمزہ ہو گیا۔ اس نے دیوار پر تھوکا۔ کسان نے دودھ کا پیالہ بیچ پر رکھا اور خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ نعیم اُسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

بڑھے نے پیالہ اٹھا کر میلے برتنوں میں رکھا اور نعیم کو دیکھ کر مسکرایا۔ ”کیا دیکھتے ہو۔ یہ کسانوں کا طریفہ ہے۔ آتے جاتے ہوئے کوئی بات نہیں کرتے۔“

”میں بھی کسان ہوں۔“ نعیم نے دوبارہ تھوکا۔ ”تھوڑا سا دودھ دو۔“

بڑھے نے اسی پیالے میں دودھ ڈال کر اسے دیا۔

”کل تم نے بڑی غلطی کی۔ تم نے کیا کہا تھا؟“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”پتہ نہیں۔ لیکن ان کا مزاج ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔“

نعیم نے چند بڑے بڑے گھونٹوں میں پیالہ خالی کر کے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر ستارے تھے اور تاریکی۔ وہ اندر داخل ہوا۔

اندھیرے فرش پر سے گزرتے ہوئے اس نے اگلے کمرے میں مردوں کے باتیں کرنے کی آواز سنی۔ اس سے پہلے کہ وہ تختے کو چھوتا کسی نے تیزی سے اس کا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ مڑا۔ شیلہ اسے کھینچتی ہوئی اپنے بستر تک لے گئی۔

”اندر مت جاؤ۔“ اس نے کہا۔

”کیوں۔“

”وہ تمہیں مار دس گے۔“

دھوس کی طرح بل کھاتا ہوا غصہ اس کے دماغ میں چڑھا۔ ”وہ میرے نزدیک بھی نہیں آئیں گے۔“ آہستہ آہستہ اس نے کہا اور ہاتھ چھڑا کر پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔

”میں نے خود سنا ہے۔“ شیلہ نے کہا۔ ”وہ تمہیں آتشدان تک پہنچنے سے پہلے مار دس گے۔“

”میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ مجھے ان سے بات کرنے دو۔ میں نے ان سے زیادہ آدمی مارے ہیں۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ شیلہ اس سے لپٹ گئی اور رو کر بولی۔ ”مت جاؤ۔ وہ تمہیں مار دس گے۔ نہیں۔ نہیں۔“

”میرا بستر اندر پڑا ہے۔“ نعیم نے درشتی سے کہا۔

”تم باہر بیٹھو۔ جب وہ سو جائیں گے تو میں لے آؤں گی۔“

نعیم سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

”پھر ہم چلے جائیں گے۔“ شیلہ نے کہا۔

کچھ دیر تک وہ اسی طرح کھڑا جھومتا رہا۔ پھر آہستہ سے ہاتھ چھڑا کر باہر نکل آیا۔ یہ پورے چاند کی رات تھی۔ وہ مسلسل چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک اور بے خواب تھیں اور وہ لکڑی کے تحت پوش پر لیٹا تھا۔ دوسری طرف بڑھا لٹاف میں سکڑا ہوا سو رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے مادھو کر اندر سے نکلا تھا۔ برآمدے میں رک کر اس نے نیولے کا سا سر گھما کر ادھر ادھر دیکھا اور تھیلے کو کندھے پر درست کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ چھپر تلے تاریکی کی وجہ سے وہ نعیم کو نہ دیکھ سکا تھا۔ باتوں کی آواز اب بند ہو چکی تھی۔

پھر وہ دروازے میں نمودار ہوئی۔ نعیم کا کبیل اور تھیلہ اسے پکڑا کر واپس چلی گئی۔ جب دوبارہ باہر آئی تو اپنے کبیل رسی میں باندھ کر اس نے کندھے پر اٹھا رکھے تھے اور ہاتھ میں ایک پوٹلی پکڑے ہوئی تھی۔

”چلو۔“ اس نے کہا۔

نعیم نے اندھیرے میں گہری نظروں سے اسے دیکھا اور دیکھتا رہا۔

”یہ روٹی ہے۔“ ہاتھ اٹھا کر اس نے سادگی سے کہا۔ ”راستے کے لیے۔“
 اسی طرح دیکھتے ہوئے نعیم نے تھیلا کندھے پر لٹکایا۔ پھر اس نے پورے بازو کے ساتھ،
 مضبوطی لیکن آہستگی سے اسے پیچھے کو دھکیلا۔
 ”تم یہیں رہو۔“ اس نے کہا اور کبیل اٹھا کر باہر نکل گیا۔
 شیلانے بھاگ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ”نہیں۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
 تم نے کہا نہیں تھا؟“
 اس نے آزدگی سے پوچھا۔

”میں گاؤں نہیں جا رہا ہوں۔“ مڑ کر دیکھے بغیر نعیم نے کہا اور رفتار تیز کر دی۔
 شیلانے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے اس کے بڑے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کھینچا۔
 ”میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ تم کہاں جا رہے ہو۔ تم نے کہا نہیں تھا؟“
 نعیم نے ایک لمحے کو رک کر اسے دیکھا، اس کا ہاتھ جیب سے نکالا اور تیزی سے چل پڑا۔
 ”نعیم۔“ وہ اس کی آستین کو مضبوطی سے پکڑے بھاگتی رہی۔ میں سارا کام کر سکتی
 ہوں۔ میں تمہارے ساتھ۔“

”جاؤ۔“ ڈرے ہوئے کتے کی طرح دانت نکال کر وہ چیخا اور بھاگ اٹھا۔
 سیدھا رستہ چھوڑ کر وہ ایک پتھریلی، خطرناک ڈھلان پر اترنے لگا۔ شیلانے پتھروں کو پکڑ
 پکڑ کر دو ایک قدم اتری، پھر ایک چٹان پر بیٹھ گئی۔
 ”نعیم۔“ آخری بار اس نے کہا اور بلک کر رونے لگی۔ پتھروں پر پھسلتا، گرتا، لڑھکتا
 ہوا وہ تیزی سے نیچے اتر رہا تھا۔

”سور، لکڑ بند۔“ شیلانے چلا کر کہا اور پوری طاقت سے ایک بھاری پتھر اس کے پیچھے
 لڑھکا دیا۔ پتھر شور مچانا ہوا نعیم کے قریب سے تیزی کے ساتھ گزر گیا۔
 ڈھلان کے دامن میں جھرنے کے ٹھیرے ہوئے پانی کے کنارے پر پہنچ کر اس نے
 آستین سے پسینہ خشک کیا اور سخت پیاس محسوس کی۔ پانی کی سطح کے ساتھ ہونٹ ملا کر اس
 نے چاند اور ستاروں کو دیکھا، بڑھی ہوئی داڑھی کو دیکھا اور رات کو چاروں طرف پھیلتے ہوئے
 محسوس کیا۔

پیاس بجھا کر وہ ستانے کے لیے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنا سیاہ دستے والا استرا نکالا اور
 دیر تک اسے تھیلے کے چمڑے پر تیز کرتا رہا۔

پانی پر جھک کر داڑھی مونڈتے ہوئے اس نے سوچا: ”پتہ نہیں کہاں چلا جاؤں۔ میں
 کیسے اس کو۔ میں کیسے...“

پچھلی رات کی سرد ، بوجھل ہوا پانی کی سطح پر ہولے ہولے چل رہی تھی ۔ اسے نیند آ گئی ۔

(۱۵)

گلاب کے پودوں کو پانی دے کر عذرا نے ہاتھ والا فوارہ نیچے رکھا اور سورج کی طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی ۔ یو کلپٹس کی چوٹیاں آسمان کی جانب ہل رہی تھیں اور برآمدے پر زرد پھولوں والی ولایتی میل جھکی ہوئی تھی ۔ یہ ستمبر تھا ۔ اس نے ملال سے بالوں کی لٹ کو، جو ماتھے پر آگری تھی ، پیچھے کیا ۔ پھر سنتھے کی باڑ پر اس کی نظر دوڑنے لگی ۔

ہر ایک پودے پر اس نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن آپ سے آپ چلنے والی گولیوں کی طرح وہ ایک سے دوسرے ، دوسرے سے تیسرے پودے پر آگے کی طرف پھسلتی گئی ۔ جب باڑ ختم ہونے میں پانچ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے ایک بھرپور اور مخلص کوشش کے ساتھ آنکھوں کو روکا اور سنتھے کے سبز ، رس دار، بد مزہ پتوں پر نظریں جما کر کھڑی ہو گئی ۔ چند سیکنڈ تک وہ اسی طرح کھڑی رہی ، پھر اس نے ایک گہرا ، پرسکون سانس لیا ۔

باڑ کے پیچھے سبزی پر اٹھارہ بیس نوجوانوں اور بچوں کا ہجوم اس وقت کسی اوٹ پٹانگ کھیل میں مصروف تھا جس میں سبھی لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے ۔ بدلتے ہوئے موسم کی خوشگوار گرم دھوپ سبزے پر اور جنگلی سنتھے کے گھیردار پودوں اور باڑوں پر پھیلی ہوئی تھی ۔ درختوں پر پتے زرد ہونا شروع ہو چکے تھے اور فضا میں خزاں کا زرد ، مٹیالا رنگ ظاہر ہو رہا تھا ۔ ابھی کچھ دنوں میں خزاں کی ہوائیں چلیں گی تو باغبان اور اس کی بیوی بڑی بڑی جھاڑوؤں سے باغ کی روشوں پر خشک پتوں کے ڈھیر جمع کریں گے اور آگ جلائیں گے ، یا زمین میں دبا دیں گے جو کھاد بنے گی اور موسم بہار کی آمد پر گلاب کی جڑوں میں ڈالی جائے گی ۔ خزاں کے بگولے اور کھڑکھڑاتے ہوئے خشک پتے ۔ سارے موسم اس قدر خوبصورت ہیں ، اللہ ۔ جاڑے بھی ، جب پچھلے پہر کو ہی شام ہو جاتی ہے اور آتشدان کے قریب محفلیں جمتی ہیں ۔ مٹھلیں سلپہر اور اونٹنی جرابیں اور کوٹ اور کہانیاں اور ریکارڈ اور آتشدان میں لکڑی کے چٹھنے کی آوازیں آتی ہیں اور باہر جاڑوں کی بارش جو بے آواز آہستگی سے گمنام اندھیروں میں دور دور تک گرتی ہے ۔ اور قہوہ ، اور پھر دس بجتے ہیں اور روشن محل کے قانون کے مطابق سب اپنی اپنی خواہگاہوں کو چلے جاتے ہیں ۔ قہوہ اور بارش ۔ بھاپ اور بارش ۔ سارے موسم!

اس نے سہم کر باڑ کے پیچھے اس دیوانے ، شور مچاتے ہوئے مجمعے کو دیکھا ۔ وہ وہاں

سے چلی آئی تھی اور اب واپس جانا، ادھر دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مگر دیکھ رہی تھی۔ کیوں؟ وہ؟ ہشت! کھیلتے اور باتیں کرتے ہوئے گروہ کا شور بڑھ گیا۔ یہ روشن محل کا پچھواڑا تھا جہاں اونچی نیچی کٹی ہوئی گھاس تھی اور بے ترتیب بائیس تھیں اور گلاب کے چند پودے تھے۔ سامنے والے خوبصورت کٹے ہوئے قطعوں میں انہیں محفلیں منعقد کرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہاں روشن آغا کی بڑے پیمانے کی سرکاری دعوتیں، جیسی کل شام پرویز کے سول سروس میں داخل ہونے کی خوشی میں ہوئی تھی، ہوتی تھیں جن میں مشہور و معروف لوگ شرکت کرتے تھے اور تقریریں ہوتی تھیں اور سیاست پر گفتگو کی جاتی تھی۔ چنانچہ آج بعد دوپہر، ہمیشہ کی طرح بڑی پارٹی کے بعد ان کی اپنی منظور شدہ چھوٹی پارٹی ہو رہی تھی۔ اسی تقریب کے سلسلے میں، لیکن اسے کہیں زیادہ مسرت، ہنگامے اور غیر ذمہ داری کے ساتھ، جیسے گائے کے پیچھے پیچھے بچھڑا چلا جاتا ہے۔ وہی پرانے مانوس چہرے تھے، وہی محبوب دوست، وہی پرانی خوشی اور اپنائیت۔ ارشد، گریگن، شیریں، پرویز، طالع، طلعت، پھر سب کے چچا زاد بہن بھائیوں کا ایک گروہ، اور چھوٹی نسل کا ہجوم، صرف غیث پہلی مرتبہ شریک ہوا تھا۔ اور وہ۔ وہ، وحید، صاحبزادہ وحید الدین آف رسول پور! وہ سب سے الگ خاموشی سے گھاس پر بیٹھا تھا اور اس کا لمبا جسم باڑ کے پتوں میں سے دکھائی دے رہا تھا اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلی آئی تھی۔ کیوں؟۔ کیوں؟

بلند ہوتے ہوئے شور میں اس کے خیالات کی گاڑی تھم گئی۔

”تمہارا تو کوئی کہنا ہی نہیں مانتا۔ تم کیا مقابلہ کرو گی۔“ ارشد کہہ رہا تھا۔

شیریں درمیان میں ہی بول اٹھی: ”ہمارے میں زیادہ ڈسپلن ہے۔ تم اپنے آدمی سنبھالو۔“

”اچھا تو دو گروپ؟“ ارشد نے لکار کر پوچھا۔

”قطعاً۔“ گریگن نے اسی جارحانہ انداز میں جواب دیا۔

”مقابلہ؟“

”مقابلہ۔“

ارشد نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ”کس میں؟“

”تم بتاؤ۔“

”تم بتاؤ۔“

”ہم نہیں بتاتے۔“

”ہم بھی نہیں بتاتے۔ کوئی زبردستی ہے۔“ تھوڑی دیر کے لیے کارروائی رک گئی۔

”لپ اینڈ نوز میں کر لو۔“ تماشائی ہجوم میں سے کسی نے تجویز کیا۔

”ٹھیک ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔“ ایک غلغلہ بلند ہوا اور کھلبلی مچ گئی۔ دونوں ٹیمیں آمنے سامنے اکٹھی ہونے لگیں۔ آ جاؤ۔ ادھر آؤ۔ یہاں کھڑے ہو جاؤ۔ ارے میاں پینک میں ہو؟ دیکھو۔ نہیں نہیں۔ ہاں ہاں۔ دیا سلائی۔ دیا سلائی کہاں ہے؟ ارے دیا سلائی کوئی آدمی جا کے لاؤ بھائی۔

”مالی۔“ شیریں نے آواز لگائی۔ مالی نے بیڑی کنارے کنارے بہتی ہوئی پانی کی نالی میں پھینکی اور دوڑا۔

”دیا سلائی۔“

”ابھی لیا بی بی۔“ مالی سوتی واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ مارتا ہوا روشوں پر بھاگنے لگا۔ ”دو۔ دو۔“ ارشد نے دو انجلیاں ہوا میں ہلائیں۔ ”سیدھی قطار میں کھڑے ہوؤ میاں۔ سپورٹس مین شپ کہاں گئی تمہاری۔ ایک ایک فٹ پر۔ ایک ایک فٹ۔“ قیامت کے شور پر قابو پانے کے لئے ارشد چلاتا ہوا تیزی کے ساتھ قطار کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ سامنے گھاس پر بٹھے ہوئے وحید کے اوپر کھڑا غیاث اس کا کندھا ہلا رہا تھا۔ ”اٹھو۔“

”میں نہیں کھیلتا۔“ وحید نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح کندھا چھڑا کر کہا۔

”ارے واہ۔ کوئی بات ہے! سپورٹس مین شپ سپرٹ کا یہ حال ہے؟ ڈوب مرے۔“

بازو سے پکڑے پکڑے وہ اسے قطار کے سرے پر لے گیا۔

ارشد کرسی پر کھڑا جوش سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ سامنے لڑکیوں کی قطار تھی جس کے آگے شیریں اور گریگسن ہڑبڑائی پھر رہی تھی اور اپنی کھلاڑیوں کو کھیل کے قوانین ذہن نشین کرا رہی تھیں۔

”خاموش۔ خاموش، بھائیو۔“ ارشد نے دونوں بازو ہوا میں ہلا کر کہا۔ ”دوستو اور

بھائیو۔ یہ کھیل کا مقام نہیں، ہماری ناک کا سوال ہے۔“

”بلکہ مقام ہے۔“ ایک لڑکی نے چپکے سے کہا۔

”بالکل درست ہے۔“ پرویز سنجیدگی سے بولا۔ لڑکوں نے تالیاں پیشیں۔ چند ایک

نے ناکوں کو چھو کر دیکھا۔

”خاموش۔ یہ تالیاں پٹنے کا مقام بھی نہیں، بلکہ رونے کا مقام ہے کہ آج لڑکیاں ہمارے

مقابلے پر میدان میں نکل آئی ہیں۔“

”ہٹیر۔“ مسرت کے ایک ریلے میں غیاث نے تالی بچائی لیکن فوراً ہی موقع کی نزاکت کا

خیال کر کے رک گیا۔ اکلوتی تالی فضا میں ہلکا سا پٹاخہ چھوڑ کر ختم ہو گئی۔ ارشد نے اسے سختی

سے گھورا۔ قطار کے سب لڑکوں نے گھورا۔ غیث اتہائی مسکین شکل بنا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ واقعے کی شدید مضحکہ خیز نوعیت کو محسوس کر کے لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ارشد نے تقریر جاری رکھی۔

”دوستو۔ آؤ ہم عہد کریں کہ آج ہم منظم و ضبط کا بہت بڑے پیمانے پر مظاہرہ کریں گے۔ آؤ ہم۔ آؤ۔“ الفاظ اس کے ذہن سے غائب ہو گئے۔ دو بار اس نے ”آؤ۔ آؤ“ کہا، جس کے جواب میں قطار میں سے کوئی مستعدی سے بولا: ”آگئے!“ الفاظ کی تلاش میں اس نے مٹھی ہوا میں بلند کی اور چند منٹ تک ہلاتا رہا۔

پھر یک یک وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوا اور ان پر اٹکی ہلائی۔ ”اور تم۔ سنو۔ تم اپنی تقریر کرو۔ سنا؟“ اس نے نہایت بد تمیزی سے کہا

لڑکیوں کی صفوں میں انتشار پھیل گیا اور پھر کرسی کے لیے باؤلی تلاش شروع ہوئی۔ آخر بچوں کے گروہ سے ایک کرسی پھین کر لائی گئی جس کی ایک ٹانگ پارٹی کے ابتدائی دور میں ہی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی ٹانگ جوڑنے اور کامیاب پلیٹ فارم بنانے میں کافی وقت صرف ہو گیا۔

ارشد کی خطابت اب اپنے عروج پر تھی۔ وہ ہاتھ لہرا لہرا کر کہہ رہا تھا: ”آج ہم ایک خوفناک چیلنج سے دو چار ہیں۔ آج۔“ کہ ایک لڑکی کی مداخلت سے اس کی تقریر رک گئی۔ لڑکی نے ایک قدم آگے بڑھ کر اعلان کیا: ”لڑکیاں کم ہیں۔“

”نہیں پوری ہیں۔“

”نہیں کم ہیں۔“

”پوری ہیں۔ دھاندلی مت کرو۔“

اب تمام لڑکے بادل ناخواستہ متوجہ ہوئے۔ سب نے اپنی اپنی جگہ پر گننا شروع کیا: ”ایلس، شیریں، طلعت۔ عذرا کہاں ہے؟“

”کہاں ہے؟“

”ہاں ہاں، کہاں ہے؟“

”کون؟“

”یہی تو پوچھ رہا ہوں۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“

”عذرا کہاں ہے؟ عذرا۔“ کورس بلند ہوا۔ پھر باڑ کے عقب میں عذرا عذرا کی پکار مچی اور کونے کونے میں پھیل گئی۔

”میں ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔ تم کارروائی جاری رکھو۔“ وحید نے جاتے جاتے ارشد کی پیٹھ ٹھونکی۔

اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر شیریں پہلے تقریر شروع کر چکی تھی۔ جب ارشد نے بولنا شروع کیا تو ان کی آوازوں نے مل کر عجب شور پیدا کر دیا جس میں صاف طور سے کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔ مگر اس بات سے بے پروا دونوں مخالف ٹیمیں نہایت اعتماد اور وفاداری کے ساتھ سنتی رہیں۔

وہ وہاں سے کیوں چلی آئی تھی؟ کیوں؟ اس نے جھک کر فوارہ اٹھایا، پھر فوراً نیچے رکھ دیا اور کھڑی رہی۔ ابھی ابھی وہ گھاس پر اس کے قریب بیٹھی تھی اور وہ جھک کر اس کے کان میں کہہ رہا تھا: ”آہستہ برگ گل بہ فشاں...“ اور اس کی بھاری، نرم آواز اس نے گردن کی جلد پر پھیلتی ہوئی محسوس کی تھی اور اس کے سانس کی نیم گرم بھاپ اس کے گال سے ٹکرائی تھی (اس نے بے خبری میں ہاتھ اٹھا کر گال کو چھوا) اور وہ دفعتاً بے حد خاموش ہو گئی تھی۔ وہ خوف زدہ تھی۔ کیوں؟ وہ اس قدر دلکش، اس قدر مضبوط، اس قدر نازک تھا، ہاں، آنکھوں میں! یہ فی الواقع بڑی عجیب بات تھی، لیکن بہر حال تھی۔ کہ دوسری طرف دیکھتے ہوئے اس نے اس کی نظریں اپنے گال میں اترتی ہوئی محسوس کی تھیں اور اس نے ادھر دیکھنے سے احتراز کیا تھا۔ مگر کچھ ہی دیر میں جب ان تیز، کاٹتی ہوئی نظروں کے نیچے اس کے گال کی جلد کپکپانے اور اس جگہ پر خون ابلنے لگا تھا تو اچانک بہت زیادہ گھبرا کر اس نے ادھر دیکھا تھا اور دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گائے کے بچے کی سی نرمی اور نزاکت تھی۔ خدایا۔ وہ دوبارہ اسے اپنی طرف جھکتے ہوئے دیکھ کر وہاں سے چلی آئی تھی۔ اپنے تکلیف زدہ دل کے ایک میکانکی اشارے پر کچھ سوچے سمجھے اور محسوس کیے بغیر!

مگر کیا یہ سب ٹھیک تھا؟ وہ جانتی تھی۔ اس نے محبت کا تجربہ کیا تھا اور اس کے دل میں رنج تھا۔ وہ سب جانتی تھی، اور اسی لیے اس وقت کی، اس ایک لمحے کی دہشت اس پر سوار تھی۔ اس نے دوبارہ فوارہ اٹھا لیا۔ گلاب کے تھے پودے کو پانی دیتے ہوئے اپنے نام کی پکار۔ اس کے کان میں پڑی اور اس وقت اپنے تمام گزشتہ رنج کو یکجا کر کے اس نے فیصلہ کیا کہ اب کسی شک، کسی لغزش کی گنجائش نہیں تھی۔

روش پر اسے جانے پہچانے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ’وحید۔ صاحبزادہ وحید الدین آف۔ کبجنت!‘ چھوٹے چھوٹے، تیز مستعد قدموں کے نیچے سرخ بھری چہرہ رہی تھی۔ ان قدموں سے وہ اتنی واقف اور مانوس تھی جتنی وہ روشن آفا اور پرویز اور تقریباً سب دوستوں کے قدموں سے تھی۔ ’آہستہ برگ گل...‘ جانے کس کا شعر تھا لیکن وہ اس سے واقف تھی۔ میں یہاں سے چلی جاؤں؟ میں بخدا ہرگز یہ نہیں۔ آہستہ برگ گل...‘ فوارہ خالی ہو رہا

تھا لیکن اس نے پانی دینا جاری رکھا۔ پانی پودے کی جڑوں میں سے بہہ بہہ کر روش پر پھیل رہا تھا۔ تھے پودے کی پتیوں پر پانی ڈالنے کا عمل اسے بہت بھلا لگا۔ سارے پانی کو وہیں پر ختم کر دینے کی دیوانی خواہش بڑی شدت سے اس کے دل میں پیدا ہوئی اور ایسا کرتے ہوئے ایک عجیب، بے وجہ خوشی کی لہر اس کے وجود پر پھیل گئی اور اس کے کان سنسنانے لگے۔ گردن پر اسی جگہ اس نے اس کے سانس کی بھاپ کو محسوس کیا۔ ”عذرا میگم آپ کیوں چلی آئی؟“

”میرا گلاب سوکھ رہا تھا۔ صاحبزادہ صاحب۔“ اس نے اسی اخلاق سے جواب دیا۔

”دونوں ہنس پڑے۔ عذرا نے فوارہ نیچے رکھ دیا۔“

”وجید نے جوتے کی نوک سے پانی کو چھوا۔ ”ابھی ابھی میں اس سبزے کو دیکھ رہا تھا جس پر تم بیٹھی تھیں۔“

”اچھا۔!“ عذرا نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

”میں نے اسے چھوا تو وہ ابھی تک گرم تھا اور اس میں سے تمہاری خوشبو آ رہی تھی۔“

”اوہ۔“ وہ ہنسی۔

”تم نے کبھی سبزے کو دیکھا ہے“ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وجید نے پوچھا ”جس پر سے کوئی اٹھ کر گیا ہو؟“

”کیس؟ نہیں۔“

”اس کی ایک ایک پتی آہستہ آہستہ اٹھتی ہے اور جانے والے کے جسم کی حرارت اور خوشبو چھوڑتی ہے۔ سبزے کی عجیب خاصیت ہوتی ہے۔ دن بھر اس کو آنے جانے والے روندتے رہتے ہیں لیکن اس کا ایک ایک سبک، ایک ایک پتی سر اٹھاتی ہے اور بڑھتی ہے۔ ہمیشہ۔ ہمیشہ۔“

باڑ کے پیچھے ایک وقت ارشد اور شیریں کی تقریروں سے فضا گونج رہی تھی اور مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ دونوں سرخ راستے پر آتے اور جاتے رہے۔

”کس قدر ہنگامہ کر رہے ہیں یہ لوگ۔“ عذرا نے خوش دلی سے کہا۔

”ہنگامہ ہنگامہ۔“ وہ اکتاہٹ سے بولا۔ ”لڑکیوں میں وہ ایک چیز اررر۔ وہ جسے انگریزی میں گریس کہتے ہیں، ہونی چاہیے۔“

”کیس؟ لپ اینڈ نوز؟“ عذرا نے باڑ کے پار دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”وہ دیکھو عذرا تم نے بے چارے پودے کو اتنا پانی دے دیا کہ پتیوں پر ابھی تک بوندیں رکی ہوئی ہیں۔ یوں جیسے ان کے ساتھ چھوٹی چھوٹی آنکھیں لگی ہوں۔“

عذرا اس کی طرف دیکھ کر تسمخر سے مسکرائی اور ایک ایک پلٹ کر چلنے لگی۔ وہ تیز تیز قدم رکھتا ہوا اس سے آگے۔

”میں کبھی اندازہ نہیں کر سکا کہ ابھی، اگلے لمحے تم کیا کرنے والی ہو۔“ اس نے ہوا میں ہاتھ پھیلایا۔ ”گدھر کو جانے والی ہو، کیا کہنے والی ہو۔ یہ تمہاری شخصیت ہے۔ پتہ نہیں کیوں عذرا، پر یہ سچ ہے کہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم بڑی عجیب و غریب لڑکی ہو۔“

”پتہ نہیں کیوں وحید۔“ عذرا نے اسی لہجے میں کہا۔ ”پر یہ سچ ہے کہ میں سمجھتی ہوں کہ تم بہت باتیں کرتے ہو۔“

”ٹھیک و عذرا۔ میری بات سنو۔“

وہ اس کے لہجے کو محسوس کر کے ٹھٹک کر رک گئی۔

”ہم ایک دوسرے کو اتنے عرصے سے جانتے ہیں۔ اتنے عرصے سے ایک دوسرے سے

واقف ہیں، ان راستوں سے۔ واقف ہیں۔“

گھبراہٹ میں عذرا نے راستے سے اتر کر سبزے پر قدم رکھا۔

”میں اررر۔ اپنے آپ کو بہتر محسوس کرتا ہوں جب۔ تم سے ملتا ہوں۔ اس کا مطلب

سمجھتی ہو کیا ہے۔ تم۔“

وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ وحید وہیں کھڑا جھلملاتی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا، پھر وہ بھی ان

میں جا ملا۔

کھیل کا مقابلہ شروع تھا۔ چند لمحے تک وہ گم سم کھڑی رہی۔ رنج اور تسمخر کے شدید

احساس کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ایک انجانی خوشی بھر گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ پورے

زور کے ساتھ چیخے، اور وہ گلا پھاڑ کر چلائی: ”شبابش۔ شبابش۔“

یہ اوپری متوسط طبقے کے ہندوستان کی وہ خوش تربیت، صحت مند نسل تھی جو انگریزی

درس گاہوں میں تعلیم پا رہی تھی یا پاپچی تھی اور دن بدن پھیلتی جا رہی تھی۔ لیکن جن برسوں

کی ہم بات کر رہے ہیں اس وقت یہ لوگ تعداد میں ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں میں

بسنے والے کروڑوں کسانوں، مزدوروں اور محنت کش طبقے کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر

تھے، اور شہروں سے باہر اپنے کھلے، ہوا دار مکانوں میں رہتے تھے۔

سونے سے پہلے عذرا نے مشرقی دریچے کے پٹ کھولے اور دور دور تک پھیلی ہوئی رات

کو دیکھا۔ یوکلپٹس کے پتے ہوا میں ہل رہے تھے۔ وہ دریچے کے پتھر پر بیٹھی ان کی ہلکی

خوشبو (جس کے ساتھ قطعی طور پر زکام کا خیال شامل تھا) کو سونگھتی رہی۔ برآمدے میں کسی

نوکر کے گزرنے کی چاپ سنائی دی۔ دس بج گئے۔ اس نے سوچا۔ وہ سہم کر اٹھی اور درپے

بند کر کے پردہ ہموار کر دیا۔ گزرے ہوئے دن کی مسرت ابھی تک اس کے اعضا پر موجود تھی۔

اس نے تپائی کا سبز لیمپ جلایا اور بڑی بتی گل کر کے بستر میں گھس گئی۔ لیٹے لیٹے اس نے دیکھا کہ کارنس پر پڑی ہوئی تمام چیزوں پر گرد کی تہہ جم رہی تھی۔ وہ اٹھی اور اپنے رات کے لباس سے رگڑ کر انہیں صاف کرنے لگی۔ کانسی کے چھوٹے چھوٹے محسے اور ہاتھی۔ سفید پتھر کا تاج محل۔ چینی کے گلدان۔ خشک پھولوں کو نکال کر اس نے آتشدان میں پھینکا۔ سنہری فریم میں سے جھانکتی ہوئی روشن آغا کی تصویر۔ پھر اس کی نظر اپنے سازوں پر پڑی۔ اس نے آہستہ سے دو اٹکیاں سازوں پر رکھیں، پھر ارد گرد چھائے ہوئے گننام، نازک سکوت کو توڑ دینے کے ڈر سے فوراً اٹھا لیں۔ وہ اس مقدس خاموشی کو توڑنا نہیں چاہ رہی تھی۔ کسی بھی شے، کسی بھی احساس کو جو اس وقت ظاہر تھا اور جم چکا تھا، وہ بکھیرنا نہیں چاہتی تھی۔ حتیٰ کہ دن، جو گزر چکا تھا، اپنی طرف سے اسے ختم کرتے ہوئے وہ ڈر رہی تھی اور اسے جاری رکھنے کے لیے مصروفیتیں تلاش کر رہی تھی۔ کل کا دن شاید کچھ بھی ساتھ نہ لائے، اس نے سوچا۔ آج کا یادگار دن، یہ لمحہ، یہ لحظہ، یہ پل، کس قدر تیز رفتار ہے۔ تیز اور مسرور۔ آہستگی سے اس نے سازوں کو جھاڑا اور واپس آگئی۔ الماری میں اس کی کتابیں بھی گرد آلود تھیں۔ پھر ایک اچانک خیال سے کہ اندھیرا پھیلنے سے وقت کی اڑان ختم جائے گی اٹھ کر ایک جلد باز جنبش سے اس نے میز کا لیمپ گل کر دیا۔ مگر اس لحظے، اور اس سے اگلے لحظے، اور اس سے اگلے، اس نے رات کے گزرنے کی سرسراہٹ کو صاف طور پر سنا اور اپنے احساس کی شدت پر دل میں تعجب کیا۔ اسی جلد بازی کے ساتھ اس نے لیمپ جلایا اور مدھم سبز روشنی میں کارنس پر چمکتی ہوئی چیزوں کو خوشی سے دیکھا۔ بیک وقت بے چینی اور سکون جو اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا اس کے زیر اثر اس نے لیمپ بجھایا اور جلایا، بجھایا اور جلایا۔

ان گنت بار ایسا کرنے کے بعد آخر کار دن بھر کی تھکاوٹ نے اسے خود بخود سلا دیا۔ بڑھتی ہوئی رات میں لیمپ صبح تک جلتا رہا۔

(۱۶)

شروع ماگھ میں ایک روز بہت سویرے نعیم شیشم ٹم کے اس پیڑ کے نیچے پہنچا جہاں سے روشن پور کے کھیت شروع ہوتے تھے اور آنے والوں کو پہلی مرتبہ کاؤں کے درخت اور دیواریں دکھائی دیتی تھیں۔ ملگجی روشنی میں اس نے دھوئیں اور دھند میں لپٹے ہوئے اس پرانے، محبوب کاؤں کو دیکھا اور اس کا دل یکبارگی دھڑکنے لگا۔ مشرق کی طرف ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ گیہوں اور چنے کی فصلوں پر ماگھ کی دھند دور دور تک تیر رہی تھی اور کھیتوں کی لکیریں کہرے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان ساری آباد اور غیر آباد زمینوں پر تیز سرد شمالی ہوا چل رہی تھی۔ وہ میلا لمبا کوٹ،

گرم فوجی ٹوپنی اور بڑے فوجی بوٹ پہنے شیشم کے قدیم، سیاہ تے کی آڑ میں کھڑا تھا۔ پھر بھی ہوا اس کا کوٹ اڑا کر ٹانگوں میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کڑا کے کی سردی میں بھی دس کوس پیدل چلنے کے بعد اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جھک کر پتلے شیشے کا سا کھڑے کا ٹکڑا اٹھایا اور منہ میں رکھ کر چوسنے لگا۔ پھر وہ اس وقت تک کھڑا محبت، افسردگی اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ گاؤں کو دیکھتا رہا جب تک کہ سرد ہوا کے ٹھپیڑوں نے اسے چلنے پر مجبور نہ کر دیا۔

بوٹوں پر لگے ہوئے کھڑے اور کچھڑ کو تے سے رگڑ کر صاف کرنے کے بعد وہ دوڑتا ہوا اس چھوٹے سے ٹیلے پر سے اترا اور جانے پہچانے کھیتوں میں داخل ہوا۔، خاموش، منجمد صبح میں بھاری بوٹوں کے نیچے کھڑے کے ٹوٹنے کی آواز بلند ہونے لگی۔ اس نے گیہوں کی چند نرم پتیاں توڑ کر منہ میں رکھیں اور چبانے لگا۔ ”ابھی یہ کچھ نہیں کہتیں۔ پھاگن میں زبان کو کاٹنے لگیں گی۔“ سبز تھوک ٹھکتے ہوئے اس نے سوچا۔ ”احمد دین نے اس دفعہ پھر دیر میں میانی کی ہے۔“

اگلے کھیت میں، اور اس سے اگلے میں اسے چند کسان ملے جو منہ اندھیرے ہل کندھوں پر اٹھائے میلوں کے پیچھے پیچھے نکل آئے تھے۔ نعیم کوٹ کا کالر کھڑا کیے، ٹوپنی میں منہ چھپائے خاموشی سے ان کے پاس سے گزر گیا۔ اس نے سب کو پہچانا۔ گرو۔ دینانا تھ۔ کرم سنگھ۔ امام دین پہلوان۔ یہ وہی پرانے لوگ تھے جن سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ وہ سب حقوں سے منہ ہٹا کر غیر مانوس لباس والے اس راہگیر کو دیکھتے ہوئے گزر گئے۔ صرف امام دین نے اسے دیکھ کر کبسل لپیٹتے ہوئے کہا: ”سن چودہ میں ایسا جاڑا آیا تھا۔“ پھر نعیم کو خاموشی سے گزر کر جاتے ہوئے دیکھ کر میلوں کو مخاطب کر کے بولا: ”نیاز بیگ کے لونڈے کی طرح چلتا ہے۔“ نعیم کا جی چاہا کہ رک کر اس سے بات کرے، لیکن ہوا کے دھکوں کے نیچے چلتا رہا اور بات کیے بغیر ہی اس نے اپنے آپ کو حیرت انگیز طور پر مطمئن اور مسرور پایا۔ گنے کی فصل زیادہ تر کاٹی جا چکی تھی، کہیں کہیں دودو چار چار مرلے کھڑی تھی۔ ”شاید شکر بنا رہے ہیں۔“ جیب سے ہاتھ نکال کر اسنے ایک گنے کو چھوا۔

کھیتوں کے بچوں بیچ چلتا ہوا وہ جوہڑ کے کنارے پر آ نکلا۔ چلتے چلتے اس نے ایک کنکر اٹھا کر جوہڑ کی سطح پر پھینکا۔ پتھر کے کھڑے کے ساتھ ٹکرانے کی آواز پیدا ہوئی اور کنکر وہیں پڑ رہا۔ نعیم نے رک کر حیرت سے پانی کی سطح کو دیکھا اور ایک بڑا پتھر اٹھا کر پھینکا۔ اب کے کھڑے کے ٹوٹنے اور پتھر کے پانی میں ڈوبنے کی آواز جوہڑ کی خاموش سطح پر سے اٹھی اور اس نے لہروں کو کھڑے کے نیچے دور دور تک پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ ”میں نے تمہارے لیے رستہ بنا دیا ہے، پھلیو۔“ اس نے خوشی سے دل میں کہا۔

جوہڑ کے کنارے پر اکلوتا گھر دیکھ کر اسے مہندر سنگھ کی یاد آئی ، اور پھر کتنے ہی مردہ دوستوں کی یاد ، جو اس کے ساتھ روشن پور سے روانہ ہوئے اور لوٹ کر نہ آئے ۔ اس نے ٹانگوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس کی اور کندھے جھکائے وہاں سے گزر گیا ۔

رستے کے موڑ پر وہ ٹھٹک کر رک گیا ۔ سامنے مغلوں کا گھر تھا ۔ اس کا اپنا گھر ! ”لیکن ۔ اوہ !“ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نزدیک گیا ۔ دروازے پر شیشم کی لکڑی کا کواڑ تھا جس پر خوش نمائی کی خاطر بے شمار لوہے کی کیلیں گاڑی گئی تھیں ۔ دیوار پکی سرخ اینٹوں کی تھی ، جیسی روشن آغا کی حویلی کی تھی ۔ دیوار کے اوپر سے پکے مکان کا چوبارہ نظر آ رہا تھا ۔ دو دفعہ نعیم نے آہستہ آہستہ دروازے پر ہاتھ رکھا اور اٹھا لیا ۔ ”دو برس ۔“ اس نے سوچا ۔ ”اس عرصے میں کیا نہیں ہو سکتا ! میرا باپ زندہ ہے ؟ یہ کس کامکان ہے ؟“ وہ دیر تک وہیں کھڑا کندھے دیوار کے ساتھ رگڑتا اور زمین پر پاؤں مارتا رہا حتیٰ کہ دن کا اجالا سارے میں پھیل گیا اور جوہڑ کی سطح پر کہرا پگھلنے لگا ۔ اس وقت ساتھ والے گھر کے بے کواڑ کے دروازے سے ایک میل کا سر نمودار ہوا ۔ پھر ہمسایہ احمد دین ، جو اس کی پیٹھ پر سوار حقہ پی رہا تھا ، ظاہر ہوا ۔ قریب سے گزرتے ہوئے اس نے بوڑھی ، مشکوک نگاہوں سے نعیم کو دیکھا ۔ نعیم نے ٹوپی ماتھے پر اونچی کر کے اسے سلام کیا ۔

”ہا ۔ آہا ۔ آہا ہا ۔“ بوڑھے ہمسائے نے دونوں ہاتھ پھیلا کر حیرت اور مسرت کے مارے منہ کھولا اور دھوئیں اور بھاپ کا ایک بادل چھوڑا ۔ ”نیاز بیگ کا بیٹا ہے تو ؟ تو کب آیا ؟ یہاں کیا کر رہا ہے ؟“ وہ نوجوانوں کی سی پھرتی سے چھلانگ لگا کر میل پر سے اتر آیا اور نعیم کی آستین کو پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا ۔ ”ابھی آ رہا ہے ؟ کلکتے سے ؟ تو تو موٹا ہو گیا ہے ۔“

پھر وہ اس کا بازو چھوڑ کر دھڑا دھڑ دروازہ پھینٹنے لگا : ”نیاز بیگ ! ابھی تک سو رہا ہے بڑھے اچھی !“ وہ چلایا ۔ ”دیکھ تیرا بیٹا آیا ہے ۔ باہر کھڑا ہے کب سے ۔ تیرا بیٹا جس کے کراس کی زمین سے اس دفعہ من من کا تریوز اترتا اور جس کے اناج سے تو نے محل کھڑا کیا ہے اور جس کے سبب تو چوہدری بن گیا ہے ، وہ باہر آیا ہے ۔ اور تو نے گھوڑی بھی نہیں بھیجی ؟ ایسا جاڑا پڑ رہا ہے ۔ تو نے آگ جلائی ہے ؟ اب عورتوں کا پیچھا چھوڑ کر باہر آ ۔“

پھر دروازہ پیٹنا اور چلانا چھوڑ کر وہ مڑا اور اس کے کوٹ کے بٹن مروڑتے ہوئے بولا : ”میں نے کئی بار تمہیں پوچھا ۔ تم کلکتے میں تھے ۔ میرا بیٹا مارا گیا ہے ۔ اب سب کے بیٹے میرے بیٹے ہیں ۔ اور تمہیں پالا تو نہیں لگ گیا ؟ بولتے کیوں نہیں ۔ تھ تھ تھ ۔ ایک دفعہ مجھے بھی پوس کی ایک رات سفر میں آگئی تھی تو تین روز تک میں بول نہ سکا ۔ میری زبان اکڑ گئی تھی ۔“

نعیم نے ہنس کر اسے یقین دلایا کہ وہ بات کر سکتا تھا۔ ”مگر مجھے سردی لگ رہی ہے۔“ اس نے کہا۔

شیشم کی لکڑی کا میخوں والا دروازہ چرچرایا اور اس نے اپنے باپ کو دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی احمد دین کے منہ سے پھر ملامت آمیز الفاظ کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ اس کی طرف توجہ دیے بغیر نیاز بیگ نعیم کو دیکھتا رہا۔ اور نعیم نے دیکھا کہ دو برس کے عرصے میں اس کا باپ بہت بوڑھا ہو گیا تھا کہ جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا منہ کھل گیا اور نچلا جیڑا تیزی سے کانپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد باپ اور بیٹے نے اپنے آپ کو سنبھالا اور نیاز بیگ نے باہر نکل کر اس کے ماتھے کو اور داڑھی کو اور گردن اور کوٹ اور اصلی اور نقلی ہاتھوں کو چوما۔ ساتھ ساتھ وہ مبہم سی آوازیں نکالتا گیا جو گونگے آدمی کی ان آوازوں سے مشابہ تھیں جو وہ خوشی کے وقت یا باتیں کرنے کی کوشش میں حلق سے نکالتا ہے۔ شور سن کر آس پاس کے گھروں سے عورتیں اور لڑکے باہر نکل آئے اور کھڑے ہو کر باپ بیٹے کے ملنے کا تماشا دیکھنے لگے۔ اندر جانے سے پہلے نعیم نے ارد گرد نظر ڈالی۔ دیکھنے والوں نے نظریں جھکا لیں۔ روشن آغا کے بعد وہ پہلا شخص تھا جس کا احترام کرنا کاؤں والوں نے سیکھا تھا۔

گھر کے اندر نعیم کی ماں اپنی پرانی عادت کے مطابق اونچی آواز سے رو رہی تھی۔ اس نے حیرت سے دیکھا کہ اس کی ماں پر ان برسوں کا بہت کم اثر ہوا تھا۔ اس کے بال سیاہ اور جلد ملائم اور چکنی تھی۔ وہ اسے گھیر کر اپنے کمرے کی طرف لے گئی۔ پکے فرش کو پار کرتے ہوئے نعیم نے چھوٹی عورت کو دیکھا جو پانچ سال کے علی کو لیے اپنے وازے میں کھڑی تھی۔

”ہم لاکم بخت۔“ نیاز بیگ بڑھیا پر چیخا۔ اور اب ہو ہو بند کر۔ جاتی نہیں کہ سن چودہ کے بعد بس اب کے سال جاڑا پڑا ہے۔ ہو ہو ہو۔“ وہ اپنی بیوی کی نقل اتارنے لگا۔

کمرے میں داخل ہو کر نعیم فرش پر پاؤں مارتا ہوا بولا: ”میرا خون جم گیا ہے۔“

تھوڑی دیر کے بعد نعیم کوٹ اور ٹوپی اتار کر سرخ کوٹلوں کے آگے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھینس کے گرم دودھ کا کٹورا اور سرخ گیہوں کی روٹی تھی اور وہ سردی سے اکڑے ہوئے جیڑوں کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔

”یہ سب تمہاری زمین کا ہے۔“ نیاز بیگ اسے بتا رہا تھا۔

”میری؟“ دودھ اور روٹی چباتے ہوئے نعیم بے دھیانی سے بولا۔

”ہاں۔ آخر کراس کی زمین تھی۔ ان دو برسوں میں اتنا پھل پڑا۔ اتنا پھل پڑا کہ میں

نے یہ سب بنایا اور نور پور کے دس کسانوں کو بیج کے لیے اناج دیا اور ابھی تک کوٹھی بھری رکھی ہے۔ جب تم سو کر اٹھو گے تو سب دکھاؤں گا۔ یہ فرش اور چوبارہ اور دیواریں میں نے خود

بنائی ہیں ، اور ایک جوڑی (میل) جاٹ نگر کے چوہدریوں سے خریدی ہے ۔ جب میں جیب میں رقم ڈال کر جاٹ نگر جانے لگا تو لوگوں نے کہا چوہدریوں کے ہاں خریدار بن کر جانا کوئی مذاق نہیں ۔ سنبھل کر جانا ۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا تو انہوں نے عزت سے تمہارا نام لیا اور مجھے اپنے پاس بٹھایا ۔“

”ایسی چادرس ہمارے پاس گیارہ اور ہیں ۔“ اس کی ماں نے خوشی سے بستر کی چادر کو چھو کر کہا ۔

”تو بیچ میں مت بول ۔“ نیاز میگ نے اس پر اٹھکی ہلائی ۔ ”سارے گاؤں کو پتہ ہے ۔ گیارہ اور ہیں ۔“

نعیم نے برتن خالی کر کے زمین پر رکھ دیا اور آستین سے منہ صاف کیا ۔ اس وقت علی ، جو بے آواز قدموں سے اس کے قریب آکھڑا ہوا تھا ۔ پیچھے سے ٹکل کر بولا : ”میرے لیے شہر سے کیا لائے ہو ؟“

نعیم نے بچے کی اداس ، معصوم آنکھوں میں دیکھا اور اس کے دل میں شدید کم مائیگی کا احساس پیدا ہوا ۔ اسنے منہ پھیر کر دل میں گالی دی ۔

”میں شہر نہیں گیا تھا ۔“ اس نے علی کے کال کو چھو کر کہا ۔

”جاؤ جاؤ ۔ تنگ مت کرو ۔ تھکا ہوا ہے ، اسے آرام کرنے دو ۔“ نیاز میگ نے ہاتھ سے لڑکے کو پرے دھکیل دیا ۔ پھر کندھے سے پکڑ کر کھینچتا ہوا نعیم کو باہر لے گیا ۔

”یہ مشکلی میل اس علاقے میں دور دور تک مشہور ہے ۔ اسے کھولنے کے لیے تین دفعہ چور آئے تھے ۔ پھر میں نے دروازے میں مینجیں ٹھونک دس ۔ یہ سب میں نے اپنے ہاتھ سے ٹھونکی ہیں ۔ میں نے کام کرنا نہیں چھوڑا ۔ خود بیانی کرتا ہوں ، فصل کاٹتا ہوں ، جب ہاتھ سے کچھ نہ کرو گے تو کیا پاؤ گے !“ اس نے فخر سے دونوں ہاتھ پھیلائے ۔ سوکھی جلد میں سے لکڑی کی طرح سخت اور خشک ہڈیوں کے جوڑا بھرے ہوئے تھے ۔ ”یہ کھلیان بھی میں نے بنایا ہے ۔ آؤ اناج دیکھو ۔“ اس نے اناج والے کمرے کا تالا کھولا ۔ نعیم نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں ڈیرھی ہو گئی تھیں اور چلتے ہوئے اسے ٹھوکرس لگ رہی تھیں ۔

”بلبا ، تم بہت بوڑھے ہو گئے ہو ۔“ نعیم نے ہنس کر کہا ۔

نیاز میگ کی آنکھوں میں یکبارگی دہشت کی جھلک آگئی ۔ وہ اس سوال کا متوقع تھا ۔

اس نے منہ پھیر کر گیبوں کی مٹھی بھری اور مصنوعی سخت لہجے میں بولا : ”میں کسی کے لیے عورتوں کی طرح نہیں روتا ۔ میں کام کرتا ہوں ۔ میں نے مکان بنایا ہے ۔ محنت سے انسان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا ۔“

لیکن نعیم نے صاف طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے ، اور مکان بنانے

کے باوجود بیٹے کے صدمے نے اسے ختم کر دیا ہے۔

جب دھوپ گاؤں کی گلیوں میں داخل ہوئی اور کھیتوں کا کہرا پکھل کر زمین میں جذب ہو گیا تو وہ کوٹلوں کی آگ سے گرم کیے ہوئے کمرے میں گھس کر سو گیا۔

وہ سو کر اٹھا تو دھوپ ڈھل چکی تھی اور نیاز بیگ صحن میں گھوڑی کو لٹائے نعل ٹھونک رہا تھا۔ نعیم کو دیکھ کر بولا: ”دو مرے گنا رہ گیا تھا، آج سارا چھیل دیا ہے۔ رات کو آخری کڑاہ چڑھے گا۔ یہاں سے من گڑ رکھ لیا ہے۔ اسٹاٹھ میں بیچوں گا جب بھاؤ چڑھے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔“

گھوڑی کی نعل ٹھونک کر وہ دونوں گنا ڈھونے کے لیے روانہ ہوئے۔ کھیتوں کے بیچ بیچ نیاز بیگ آگے آگے چلتا ہوا مستقل باتیں کرتا رہا۔ اس نے ہر ایک کھیت کے کاشتکار کی کاہلی اور کام چوری کے قصے سنائے اور پچھلے دو برس میں جو جو فصلیں ان کے کھیتوں میں سے اتریں ان کا اپنی فصلوں کے ساتھ مقابلہ کر کے بتاتا رہا۔

گاؤں سے باہر نکل کر نعیم کی نظر غیر ارادی طور پر مغربی کونے کی جانب اٹھ گئی۔ وہ پھونس کی چھت والا ایک کمرے کا مکان تھا جس کے احاطے کی شکستہ دیواریں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ نعیم نے چلتے چلتے خفیف سی جھرجھری لی اور نظریں چرائیں۔

”یہاں سے ہماری زمین شروع ہوتی ہے۔“ نیاز بیگ نے ہاتھ پھیلا کر بتایا۔ ”تم ایک قدم ایسی جگہ پر نہیں رکھ سکتے جہاں فصل کی جڑ نہ ہو۔ آ۔ ہم۔ میرے گنے کو دیکھنے کے لیے سارا جاٹ نگر پل پڑا تھا۔“

نعیم کو گنوں پر کام کرتی ہوئی تین لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اس نے پھر ہاتھ پھیلایا۔

”آ۔ ہا۔ ہا۔ یہ احمد دین کی بہو ہے، یہ بیٹی ہے۔ اس کی کٹائی ختم ہو گئی ہے۔ محنتی لڑکیاں ہیں۔ ہمارے گھر میں اب ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے۔“ وہ نعیم کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔ ”اور تو۔ تو کون ہے؟“

تیسری لڑکی جو تیز معلوم ہوتی تھی سفید سفید دانت نکال کر ہنسی۔ ”میں رجمو کی بیٹی ہوں۔ تم نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا ہے چچا

نیاز بیگ کھسیانا ہو کر پاؤں پٹکنے اور ان کے گرد گھومنے لگا۔ ”کام کرو۔ جوان لڑکیوں کو زیادہ بولنا نہیں چاہیے، کام کرو۔“

لڑکیاں جو نوجوان اور صحت مند تھیں ہنسیں، نعیم کو دیکھ کر شرمائیں اور پسینے سے نم کالوں اور چھاتیوں کے ساتھ کام میں جٹ گئیں۔ وہ گنے چھیل رہی تھیں۔

رات کو مویشیوں کے احاطے میں گڑ کا کڑاہ چڑھا، جیسے ہر روز رات کو چڑھتا تھا۔ نیچے

گنے کے چھلکے کی آگ جلائی گئی۔ نئے میل جوتے ہوئے نیاز بیگ نے ایک بار پھر ان کی تعریف کی اور جاٹ نگر کے چوہدری کا قصہ دہرایا۔ گاؤں کا ایک نوجوان جو لہا بیلنے پر آ بیٹھا تھا اور چھیلے ہوئے گنے اس میں دے رہا تھا۔ ایک اور نوجوان تھوڑے تھوڑے وقفے پر رس نکلے ہوئے گنے کا گودا اٹھا کر سوکنے کے لیے پھیلا دیتا اور خشک گودا آگ میں جھونک دیتا۔ تیسرا نوجوان رس کے بھرے ہوئے گھڑے اٹھا اٹھا کر کڑاہ کے پاس قطار میں رکھتا جا رہا تھا۔ نیاز بیگ کھڑا ابلتے ہوئے رس میں لکڑی ہلا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ بھنڈی ترٹی کی جڑوں کا رس کڑاہ میں نچوڑتا جس سے گڑ کا میل کٹ کر اوپر آجاتا۔ لکڑی کے چمچے سے میل اتار کر وہ پھر لکڑی ہلانے لگتا۔ جوش کھاتی ہوئی رس کی میٹھی، گرم خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ نیاز بیگ بولتا جا رہا تھا۔

”منڈی کے سارے گڑ کے سوداگر میرا نام جانتے ہیں۔ پچاس گاؤں کا گڑ رکھ دو، میرے گڑ کو یوں پہچان لیں گے جیسے اس پر میرا نام لکھا ہو۔ سوڈے کی ایک چٹکی نہیں ڈالتا۔ اور لٹھے کا سا سفید گڑ نکالتا ہوں۔ بھنڈی کی کیا بات ہے، ساری کرامات ہاتھ کی ہے۔“

عام دستور کے مطابق گاؤں سے کئی نوجوان، جن کی اپنی فصل نہ تھی، وہاں جمع تھے۔ دن بھر کا کام ختم کرنے کے بعد اس وقت وہ آگ سے اپنے آپ کو گرم کرنے اور گڑ کھانے کے لیے آ بیٹھے تھے اور نیاز بیگ کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ اور گپیں مار رہے تھے۔ کسانوں کے سادہ، اکھڑ مذاق، گاؤں کی لڑکیوں اور اپنے معاشقوں کی باتیں اور دن بھر کی اور کئی چھوٹی موٹی خوشی اور غم کی باتیں؛ اور کہانیاں؛ چاند کی اور ستاروں کی اور رات سے متعلق ہر ایک چیز کی توہمات سے بھرپور کہانیاں؛ اور گانا۔ بیلنے والے نوجوان نے گانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے بیلنے میں گنے دیتا جا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ کان پر رکھے منہ چاند کی طرف اٹھائے گا رہا تھا۔ وہ چاند کے اور محبوب لڑکی کے بارے میں ایک دیہاتی گیت تھا۔ نعیم نے سوچا کہ یہ گیت صرف رات کا گیت تھا۔ سرد رات میں گانے والے کی بھاری، بے فن آواز فضا میں جمی ہوئی چاندنی کو توڑتی ہوئی دور تک جا رہی تھی اور سننے والوں کے دلوں میں بیٹھ جاتی تھی۔ سیدھی سادی دیہاتی آوازوں میں لچک اور لہراؤ کی کمی کے باوجود اس قدر گہرائی اور وزن ہوتا ہے۔ اس نے سوچا۔ وہ سب سے الگ چھلکے کے ڈھیر پر بیٹھا پاس سے گزرتے ہوئے میلوں کو ہر پھیرے پر چھڑی جاتا جا رہا تھا

ایک پہر رات گزر چکی تھی جب شیشم کا میخوں والا دروازہ چرچرایا اور ایک شخص کبل میں لپٹا ہوا اندر داخل ہوا۔ آگ کی روشنی میں آنے پر نعیم نے ماسٹر کا چہرہ پہچانا اور اس کے جسم میں انجانے خوف کی جھرجھری پیدا ہوئی۔ چند نوجوانوں کے سلام کا جواب دے کر اور نیاز بیگ

کی سنی ان سنی کر کے وہ نعیم کے پاس آکر بیٹھ گیا۔
 ”میں نے سنا تھا تم آگئے ہو۔“ اس نے میلوں پر چند چھلکے پھینکتے ہوئے کہا۔
 نعیم خاموش رہا۔

”دو سال۔ کیا کرتے رہے؟“

”کام۔“ نعیم نے مختصراً جواب دیا۔

”کہاں؟ کہاں کہاں؟“

”تو۔“

”تو کیا؟“ ماسٹر نے بیتابی سے پوچھا۔

”تو جگہوں پر۔ مجھے نام یاد نہیں رہے۔“

”کام بنا؟“

”چند ایک جگہ پر بنا۔ باقی میں تو خفت ہی اٹھانی پڑی۔“

”اوہ۔“ وہ اداسی سے بولا۔ ”خفت تو ہوتی ہی ہے۔ خفت۔ عزیز دوست، آزادی

اور فتح سے پہلے ضرور آتی ہے۔ خفت طاقت ہے، طاقت جو کمزوری سے پیدا ہوتی ہے، جو کم

مایگی کے احساس سے۔“ باتیں کرتے کرتے اس نے سر اٹھایا اور نعیم کی آنکھوں میں شدید کچھاؤ

دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔ ”اوہ۔ ان باتوں کا یہ وقت نہیں۔“

”مجھے ان باتوں کی کوئی خواہش نہیں۔“ نعیم نے تیزی سے کہا۔

ماسٹر نے اس کے چہرے پر برہمی کے آثار کو تعجب سے دیکھا اور خاموش بیٹھا گئے کے

چھلکے کو اٹکلیوں میں مروڑتا رہا۔ بیلنے پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے پھر کانا شروع کر دیا تھا۔ اس

کی اونچی، جاندار آواز رات کے سناٹے میں نعیم نے جیسے بہت دور سے سنی اور اس کے دل

میں کانا سننے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ گیت، جس میں محبوب لڑکی کا ذکر تھا، اور گیہوں

اور مکئی کے کھیتوں کا، اور گھوڑوں، شاہسواروں، کبڈی کے کھلاڑیوں اور نوجوانوں کے ناچ

کا، اور محبت کے غم کا اور محبوب مردوں کی موت کا ذکر تھا، آدھی رات کا گیت جس میں ماگھ

کی سرد چاندنی کی تمام تر موسیقی گھلی ہوئی تھی، جس میں زندگی کی کتنی ہی چھوٹی بڑی مسرتیں

تھیں جن سے وہ اتنا عرصہ محروم رہا تھا۔

ماسٹر نے آنکھوں کے کونوں میں نعیم کو دیکھتے ہوئے سوال کیا: ”اب کہاں جاؤ گے؟“

”اب میں کہیں نہیں جا رہا۔ یہیں رہوں گا۔“

دیر تک وہ خاموش بیٹھے گویے کی آواز سنتے رہے اور مٹی کے آبخوروں میں سے مکھن ملا

گرم گرم گڑ کھاتے رہے جو نیاز بیگ نے ان کو دیا تھا۔ ”جس گھوڑے کو اس کا ایک آبخورہ

کھلا دو وہ چاروں پاؤں پر اٹھ کر یہ دیوار پھاند جائے گا۔“ اس نے کہا تھا۔ ”گھاؤ۔ سن چودہ

کے بعد اتنا جاڑا...“

گڑ سے لتھری ہوئی انگلیاں صاف کرتے ہوئے ماسٹر پھر بولا: ”تمہارے بعد بہت لوگ تمہیں پوچھنے آئے۔“

”کون تھے؟“

”ریونیو کے اور پولیس کے۔“

”پھر؟“

”چوہدری کہتا رہا تم کلکتے گئے ہوئے ہو۔ جب وہ اتنا پتا پوچھتے تو کہتا: ’اتنا سا تو شہر ہے، جا کے خود ڈھونڈ لو؛۔“

نعیم ہنسا۔ ”بابا اس معاملے میں ہوشیار ہے۔“

کانے کے سر بڑھتی ہوئی رات میں چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ ماسٹر نے، جو بظاہر کیت سے بے خبر بیٹھا تھا، پیالہ رکھا اور اداس مگر مضبوط آواز میں بولا:

”ایک نئی مصیبت کھڑی ہوئی ہے۔“

”کیا؟“

”ہندو مسلم سوال۔“

”اوہ۔“

”دلی میں فساد ہوئے ہیں۔ مسجد کے آگے باجا بجانے پر، گٹو کشی پر، اب یہاں پر بھی کچھ لوگ آگئے ہیں، جو ان چیزوں کو ہوا دے رہے ہیں۔“

نعیم کا جی چاہا کہ ان لوگوں کے متعلق کچھ پوچھے لیکن اس موضوع سے اسے جو ہچکچاہٹ اور نامعلوم سی دہشت تھی اوپر آگئی اور وہ چپکا بیٹھا رہا۔

”یہ چیزیں صحت مند تحریکوں کو تباہ کر دیتی ہیں۔“ ماسٹر نے پھر بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اسے زیادہ دیر تک نہ کھینچ سکا اور بات جلد ہی ختم ہو گئی۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماسٹر نے اپنا بڑا سا، بے تکلف ہاتھ بڑھایا۔ نعیم نے بے دلی سے مصافحہ کیا۔

”خفا مت ہونا، ماسٹر۔ میں اب کہیں نہیں جاسکتا۔ میں نے اپنا کام ختم کر دیا ہے۔ اب میں یہیں رہوں گا۔ تم نے میرے باپ کی حالت دیکھی ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ ہر شخص کا اپنا کام ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔“ ماسٹر نے جلدی سے کہا، لیکن وہ اپنے چہرے پر ناگواری کے اثرات کو چھپانہ سکا۔

جانے سے پہلے نعیم نے اس کا ہاتھ گرجوشی سے دبایا۔ اور اس وقت اسے عجیب سا

احساس ہوا۔ اسے لگا کہ وہ ہاتھ محض مردہ گوشت اور ہڈیوں کا بھاری وزن تھا۔ اس کی چھٹی حس نے، جو ایسے موقعوں پر تیزی سے کام کرنے لگتی تھی، اسے آنے والے خطرے کا نامعلوم سا پتا دیا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے بڑے سے، اداس چہرے کو غور سے دیکھا۔

”ماسٹر، تم نے مجھے اپنی کہانی نہیں سنائی۔ تم نے کہا تھا۔۔۔۔۔“
 ”ابھی وقت نہیں، پھر کبھی سہی۔“ اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اونچے ہوتے ہوئے چاند کے نیچے وہ اجنبیوں کی طرح جدا ہوئے، یہ جانے بغیر کہ وہ آخری بار مل رہے ہیں۔ گانے والے کی آواز دیر تک ان کے پیچھے بلند ہوتی رہی۔ صبح سو کر اٹھنے کے بعد نعیم نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ دھوپ ابھی صحن میں نہیں آئی تھی۔ رات بھر جاگنے کے بعد اس کا باپ اب سو رہا تھا۔ اس نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ نقلی ریشم کے سرخ لحاف میں اس کا بوٹھا جسم گٹھڑی بنا ہوا تھا۔ اس نے ارد گرد ٹوکے ڈھکے ہوئے رکھے تھے اور تازہ گڑ کی میٹھی، گرم باس کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ نعیم مسکرا کر صحن میں نکل آیا۔ اس کے ماموں کا لڑکا راول اور علی نلکے کے پاس کھڑے تھے۔ اس نے کان سے پکڑ کر علی کو اٹھایا اور ہوا میں اچھالا۔ لڑکا آواز نکالے بغیر اس کے کندھے پر آن گرا اور اس کی گردن کا گھوڑا بنا کر بیٹھ گیا۔ نعیم ان دونوں کو لے کر احاطے میں نکل آیا۔

”تم تو بڑے لمبے ہو گئے ہو۔“ اس نے بڑے لڑکے کی گردن پنچے میں دباتے ہوئے کہا۔
 لڑکے اس کے ساتھ مانوس نہ تھے اور شرما رہے تھے۔ مگر چند ہی باتوں میں کھل گئے۔

”میں گھوڑی دوڑا لیتا ہوں۔“ علی اس کی گردن پر چڑھا چڑھا بولا۔
 ”میں گھوڑی پر کھڑا ہو کر اسے دوڑا لیتا ہوں۔“ راول نے کہا۔
 ”جب میں تمہارے جتنا تھا تو اس پر سیدھا لیٹ کر دوڑایا کرتا تھا۔“ نعیم نے گپ ماری۔

”سیدھا لیٹ کر؟“ دونوں لڑکے تعجب سے یک زبان ہو کر بولے۔
 ”لو اسے دوڑاؤ۔“ نعیم اسے سفید گھوڑی کے قریب لے گیا جس کی تعریف اور خریداری کی لمبی کہانی، جو اس نے اپنے باپ سے سنی تھی، وہ اب بھول چکا تھا۔
 علی مینڈک کی طرح اس کے کندھے پر سے کود کر گھوڑی کی پشت پر جا پہنچا۔ گھوڑی

اس اچانک دھچکے سے پچھلے پاؤں پر اٹھی اور علی اس کی ایال پکڑنے کی کوشش میں پھسل کر زمین پر آ رہا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے قہقہے لگائے۔ علی کھسیانا ہو کر ہنسا اور ڈھٹائی سے اس کی دم کے ساتھ لٹکنے لگا۔

”کلکتے میں بھی گھوڑے ہوتے ہیں۔“ راول نے پوچھا۔

”ہاں۔ گاڑیوں میں جتتے ہیں۔“

”میل گاڑیوں میں؟“

”نہیں گھوڑا گاڑیوں میں۔“

”گڑ بھی ہوتا ہے؟“

وہ وہیں کھڑا ان کے ساتھ گپیں مار رہا تھا کہ اس نے صحن میں اپنے باپ کی آواز سنی۔ اب کھانے کا وقت تھا۔ وہ تینوں اندر جا کر نیاز میگ کے گرد تخت پوش پر بیٹھ گئے۔ پہلے انہوں نے رات کا مکھن ملا گڑ گرم کر کے کھایا، پھر بھینس کا دودھ اور روغنی روٹیاں۔ نیاز میگ ہر شے اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہتا جا رہا تھا:

”کھاؤ کھاؤ۔ کسان اور گھوڑا جب تک کھاتے رہیں جوان رہتے ہیں۔ جب کھانا بند کر دیں تو مر جاتے ہیں۔ کسان اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔“ اور خود بھی اس پر عمل کرتے ہوئے گھوڑے کی خوراک کھا رہا تھا۔ نعیم متعدد بار اس کے مختصر سے بوڑھے جسم اور اس کی خوراک کا مقابلہ کر کے دل میں حیران ہوا۔ آخر میں انہوں نے کچے آموں کا اچار اور تریوز کھایا۔

”بھینس کا معدہ خراب ہو جائے تو اچار کی پھانک دیتے ہیں۔ اچار کھاؤ۔ پیٹ ہلکا ہو جائے گا۔“ نیاز میگ نے کہا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد نعیم نے اپنے فوجی تھیلے میں سے فرانس سے خریدا ہوا سگار نکال کر سلکایا اور دھوپ میں بیٹھ کر پینے لگا۔ جنگلی انگور کی میل اس کے سر پر جھکی ہوئی تھی اور اس میں کٹی تھی تھی چڑیاں پر پھیلائے بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ سردیوں کا آسمان گہرے نیلے رنگ کا تھا اور فضا میں مکڑی کے چمکیلے تار اڑ رہے تھے۔ تلخ، سیاہ تمباکو پیتے ہوئے اس نے ایک لمبے عرصے کے بعد جاڑوں کی ایک سہانی صبح اور خوش گوار گرم دھوپ کا لطف اٹھایا اور آنکھیں بند کر کے فرانس کے بازاروں اور عورتوں کے خوبصورت لباس کو یاد کیا۔

نیاز میگ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور لالچی نظروں سے سگار کو دیکھنے لگا۔

”اس کا دھواں بڑا تلخ ہے۔ مجھ کو زیادہ نہیں بھاتا۔“ سگار پر نظریں جمائے وہ بولا۔ نعیم نے اس کا مطلب سمجھ کر تھیلے میں سے دوسرا سگار نکال کر اسے دیا اور اس کے لگانے میں مدد کی۔ نیاز میگ نے تمباکو کا کش لے کر ا فیمچیوں کی طرح آنکھیں میچ لیں۔

”تمہارے تھیلے کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ فکر نہ کرو۔ میں نہیں پسند کرتا کہ لوگوں کی غیر موجودگی میں ان کی چیزوں کو چھیڑا جائے۔“ اس نے کہا۔

جب تک سورج اوپر آیا وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ نیاز بیگ نے مصنوعی سخت لہجے میں، مگر دل میں ڈرتے ڈرتے پہلی بار اس سے پوچھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا اور کیوں اتنا وقت ضائع کر کے آیا تھا۔ اس کے جواب دینے پر کہ اس نے وقت ضائع نہیں کیا تھا، نیاز بیگ نے پوچھا کہ پھر اس نے کیا تیر مارا تھا۔ نعیم کمال چالاک سے اس سوال کا جواب ٹال گیا اور اس کو یقین دلانے لگا کہ اب وہ کہیں نہیں جائے گا۔

جب سورج کی کرنیں سیدھی ہو گئیں اور دھوپ ان کی جلد جلانے لگی اور وہ وقت ہوا جب کاؤں کی عورتیں کھیتوں میں کام کرنے والے مردوں کا کھانا لے کر جاتی ہیں تو انہوں نے باہر ہلکا ہلکا شور سنا جو بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ یاہر نکلے۔ کسانوں کی ایک ٹولی گلی کے موڑ پر نمودار ہوئی اور ان کے گھر کے سامنے سے گزر کر اگلے موڑ پر غائب ہو گئی۔ اس ٹولی میں زیادہ تر نوجوان تھے جن کے چہروں پر دبے دبے جوش کی زردی اور خوف و ہراس کے نشانات تھے۔ ان میں سے کوئی باتیں نہ کر رہا تھا اور نہ ہی ان کے لب ہل رہے تھے، پھر بھی ایک عجیب طرح سے ان کے درمیان سے دھیمہ دھیمہ دبا ہوا شور اٹھ رہا تھا۔ ان میں نعیم اور اس کے باپ نے چند اجنبی شکلیں دیکھیں۔ جب وہ گزر گئے تو نیاز بیگ کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ، اور پیچھے پیچھے نعیم اس گلی کی طرف بڑھا، جس میں سے وہ لوگ نکلے تھے۔

طویل اور ویران گلی میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ گھروں کے دروازے بند اور نیم واتھے لیکن کوئی متنفس نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ دونوں ابھی وہیں کھڑے تھے کہ گلی کے دوسرے سرے سے ایک عورت بھاگتی ہوئی داخل ہوئی۔ سورج اس کے پشت پر تھا اور سرا سیمگی میں اس کے دونوں پاؤں میچ میں بہنے والے نالی کے دونوں طرف باری باری پڑ رہے تھے اور وہ عجیب مضحکہ خیز طریقے سے بھاگ رہی تھی۔ اس کا لہنگا ہوا میں اڑ رہا تھا اور وہ اپنے دو سالہ بچے کو چھاتی میں دبائے ہوئے تھی۔ نزدیک آنے پر انہوں نے پہچانا، وہ رحمت کی بہو تھی۔ نیاز بیگ کو دیکھ کر اس کے زرد، کانپتے ہوئے ہونٹوں سے چیخ نکلی: ”مار دیا۔ خون کر دیا ظالموں نے۔“ اور بچہ اس کے ہاتھوں سے لٹک گیا۔

نیاز بیگ نے لپک کر بچے کو سنبھالا۔ ”کس کو۔ کس نے؟“

”اس کو۔ ماسٹر کو، ہائے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”کہاں۔ کہاں پر؟ کیوں۔ میں؟“ نیاز بیگ نے بے صبری سے پوچھا۔

عورت کے منہ سے صرف اتنا نکلا: ”ہائے چچا نیاز بیگ وہ بڑا بھلا مانس تھا۔“

یکلخت بے حد اکتا کر نعیم پلٹا اور گھر میں داخل ہوا۔ بے چینی سے اس نے گھوڑی کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ گھوڑی نے جھرجھری لی اور مانوسیت سے اس کے کندھے پر منہ رگڑا۔
”مجھے کیا۔!“ فضا میں دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

پھر وہ سیدھا اپنی ماں کے پاس جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی ماں، جو بیٹے کے آنے پر مغرور ہو گئی تھی، صبح صبح دوسری عورت کے ساتھ خوب زور کی جنگ کرنے کے بعد اس وقت اطمینان سے میٹھی حقہ پی رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہاں سے اٹھ کر وہ باورچی خانے میں گھس گیا۔ باجرے کی میٹھی روٹی کا ٹکڑا توڑ کر چبانے لگا، پھر اسے ٹھکنے کی کوشش میں اگل دیا اور لعاب کا گولہ اس کے حلق میں جا کر پھنس گیا۔ غصے سے جھلا کر اس نے روٹی کا ٹکڑا دور پھینکا اور اونچی آواز سے بولا:

”مجھ کو اس سے کیا غرض!“

صبح میں کھڑا ہو کر وہ نلکے کی ہتھی مروڑتا رہا، پھر اس نے اچک کر ہمسائے احمد دین کے صحن میں دیکھا، انگور کی میل پر میٹھی ہوئی ستلی کو پکڑنے کی کوشش کی، گائے کے چار دن کے بچھڑے کو بازو میں لے کر اٹھایا اور رکھ دیا، دروازے میں کھڑے ہوئے علی کو اشارے سے بلایا جو اپنی ماں کے ڈر سے کمرے میں غائب ہو گیا۔ پھر وہ دوبارہ نلکے کے پاس گیا اور ٹوٹی کے ساتھ منہ لگا کر بہت سا پانی پیا۔ جب پانی پی چکا تو جیب میں ہاتھ دے کر باہر نکل گیا۔
اب کلی میں اگا دکا آدمی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے اور نیچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ پاس سے گزرتے ہوئے میراثی کو روک کر نعیم نے پوچھا: ”کیا بات ہوئی ہے؟“

”گٹو کشی کی بات تھی چوہدری۔ مدت سے تمہیں پتہ ہے سائیں کے ڈیرے پر پندرھویں کے پندرھویں گائے ذبح ہوتی آئی ہے۔ آج ہندو ضد پر آگئے۔ ضد پز کیا آگئے، یہ سب ان سڑوں کی شرارت ہے جو باہر سے آئے ہیں۔ بس جھگڑا بڑھ گیا۔ ماسٹر، جو پچارا ادھر کا نہ ادھر کا، سمجھانے گیا اور سڑوں نے اسے ختم کر دیا۔ تھ تھ تھ۔ اس نے صرف اتنا کہا۔“ وہ میراثیوں کے مخصوص انداز میں بات بڑھاتا چلا جا رہا تھا کہ نعیم وہاں سے چل پڑا۔
کھیتوں میں چلتا ہوا وہ اس جگہ پہنچا جہاں شیشم اور لیکر کے ذخیرے کے گرداگرد جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی کچی دیوار کھچی ہوئی تھی۔ پگڈنڈی پر ایک جگہ مٹی کا ایک برتن ٹوٹا پڑا تھا اور لسی بہہ کر زمین میں جذب ہو چکی تھی۔ پاس ہی ایک چنگیر اور باجرے کی روٹیاں بکھری پڑی تھیں۔ یہ اس عورت کی تھیں جسے موت کے نظارے نے پریشان کر دیا تھا۔ نعیم نے پنجوں پر اٹھ کر دیوار کے اوپر سے دیکھا۔ لیکر کے ایک درخت کے نیچے ماسٹر مرا پڑا تھا۔ اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے اور زرد مردہ چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ ذرا فاصلے پر ایک مریل سی بھورے رنگ کی گائے گھاس چر رہی تھی اور ڈکرا رہی تھی۔ جب نعیم کی ٹانگیں کانپنے لگیں تو

اس نے بے دلی سے دیوار پر تھوکا اور واپس چل پڑا۔

گاؤں میں داخل ہوتے وقت اس نے نوجوانوں کے ایک گروہ کو دیکھا جو لٹھ اور بلم ہاتھوں میں تھامے ، چہروں پر خطرناک ارادوں کی چھاپ لیے ایک جگہ جمع تھے۔ نعیم کندھے جھکائے ، جیب میں ہاتھ دیے تیزی سے ان کے پاس سے گزر گیا۔

”مجھ کو اس سے کیا غرض!“ اس نے تیسری بار اپنے آپ سے کہا۔ لیکن رات کو سونے کے لیے جب وہ بستر پر لیٹا تو اندھیرے میں ماسٹر اس کے قریب آکھڑا ہوا اور وہ رات بھر جاگ کر بے گناہ انسانی خون کی اذیت سہتا رہا۔

وہ ماہ مارچ کا پہلا دن تھا جب نیاز بیگ منہ اندھیرے آخری بار فصل کو پانی لگانے کے لیے کھیتوں کو گیا۔ ایک گھنٹے تک وہ زرد ہوتی ہوئی گیہوں کی فصل کے درمیان پھرتا اور پانی کھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب پانی کھلا تو وہ کدال اٹھا کر کپڑے میں گھس گیا اور پانی کاٹ کاٹ کر مختلف کھیتوں کو لگانے اور باتیں کرنے لگا :

”پہلے تو ایک گھنٹے کے بعد آیا نامراد ، اور جو آیا تو برف کی طرح لگ رہا ہے۔ میں؟“ وہ جھڑک کر بولا۔ ”پر ٹھیر ، فکر نہ کر ، میرا بھی اتنا گیہوں ہے کہ ایک گھنٹے میں گھر سوار احاطہ نہیں کر سکتا۔ تیرا بھی پھرتے پھرتے بھر کس نہ نکل گیا تو مجھے پکڑ ليو۔ تو بس دو قدم چل کر زمین میں گھس جاتا ہے۔ میں؟ آمیرے ساتھ ، تجھے پتا چلے کہاں تک جانا ہے ، آ ، نہر کے بچے ، بیٹی مان ، اتنا گیہوں سارے گاؤں میں کسی ایک کی ملکیت نہیں ہے۔ میں بڑھا آدمی ہوں ، شرم کر ، جب جوان تھا تو پتا ہے ساری ساری رات تیرے اندر کھڑا رہتا تھا اور پتا بھی نہیں چلتا تھا ، اس گندم کو بیچ کر مجھے اپنے بیٹے کی شادی کرنی ہے۔۔۔ مجھے اس کی بیماری کا علم ہے۔ اسے ایک عورت کی ضرورت ہے۔ یہ مرد کی بڑی بیماری ہے۔ میں؟“ اس نے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھا اور اپنی کامیاب تشخیص پر دل میں ہنسا۔ ”عورت کو پا کر اس کی ساری کاہلی دور ہو جائے گی اور وہ خود بخود کام کرنے لگے گا۔ سنا تو نے ، کسی کو بتانا نہیں ، نہر کے بے وقوف بچے ، میں؟“ وہ منہ پھیلا کر ہنسا اور بڑھتی ہوئی سردی کے اثر کو روکنے کے لیے زور شور سے باتیں کرنے لگا۔

آخر جب سردی کی وجہ سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں تو اس نے پاؤں خشک کر کے جوتا پہنا اور کدال کندھے پر رکھ کر کنارے کنارے پھرنے لگا۔

سورج دو نیزے سے بھی اوپر آچکا تھا جب وہ گھر لوٹا۔ مکھن اور بادام ملے ہوئے گڑ اور بھینس کے دودھ کا ناشتہ کرنے کے بعد وہ اٹھا اور سبزی کی کاشت کے لیے زمین تیار کرنے کے واسطے نکل پڑا۔ ہل کو اٹھا کر کندھے پر رکھتے ہوئے اس نے جھنجھلا کر چھاتی کو ملا۔ ”یہ

کیا سویر سے ہو رہی ہے نامراد - " اور سینے میں پھرتے ہوئے درد کو کالی دی -
 "سبزی کی بیانی اب تک ختم بھی ہو جانی چاہیے تھی - پھاگن نکلا جا رہا ہے - یہ لونڈا اگر
 کسی کام کا ہوتا - " میلوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس نے دل میں بیٹھے کے ناکارہ پن پر
 تاسف کا اظہار کیا -

ہل چلانے کے دوران اس نے درد کو تھوڑے تھوڑے وقفے پر تیز ہوتے ہوئے محسوس
 کیا مگر اسے کام اور باتوں کے شور میں دبائے رکھا - اس کے علاوہ اسے مکھن بادام اور گڑ کی
 خوراک پر مکمل بھروسہ تھا جس نے ہمیشہ اسے گھوڑے جتنی گرمی پہنچا کر ساری تکلیفوں سے
 بچائے رکھا تھا - "کسان اور میل اگر معمولی تکلیفوں سے بیٹھ جائیں تو دنیا کے کام ہو چکے -"
 دانت پیس کر اس نے میلوں سے کہا -

سورج سر پر پہنچ چکا تھا جب اس نے سبزی کے لیے چھ انچ زمین پلٹ کر رکھ دی -
 کھیت کے کنارے پر کھڑا ہو کر وہ تھوڑی دیر کے لیے ختم کیے ہوئے کام کی مسرت میں سینے
 کی تکلیف کو بھول گیا - گھر پہنچ کر اس نے ابلی ہوئی کاجرس کھائیں اور حقہ پینے کے لیے بیٹھ
 گیا - مگر حقہ اس سے زیادہ دیر تک نہ چل سکا - تبناکو کے ہر کش پر درد میں اضافہ ہوتا گیا -
 ابھی سارے جانوروں کے لیے چارہ لے کر آنا تھا اور پھر نیاز بیگ کے لیے تو ہر بیماری کا علاج
 کام تھا - سخت محنت ! "پسینے کے ساتھ ساری انسانی اور حیوانی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں -"
 اس نے کہا اور رسی اور دراتی اٹھا کر چارہ کاٹنے کے لیے چل پڑا - احاطہ پار کرتے ہوئے اس نے
 دن بھر کے بھوکے مویشیوں کو رحم اور محبت کی نظر سے دیکھا -

"میں نے دو بار کھایا ہے اور تم نے چار بار کھایا ہے - اور ان کا کوئی خیال نہیں ؟
 میں ؟" اس نے راول کی گردن میں دراتی چبھو کر کہا -
 "جا تو رہے ہیں - " لڑکا گردن ملتے ہوئے غصے سے بولا -

چارہ کاٹتے ہوئے وہ درد کی شدت سے لڑکے پر ، دراتی پر اور چارے پر گرجتا رہا -
 "اگر ایک جانور بھی بھوک سے مر گیا تو میں تم سب کو گھر سے نکال دوں گا - وہ میرے
 بڑے بچے ہیں - تم چھوٹے ہو - عورتوں کی کیا پروا ہے - " اس نے رعونت سے کہا -
 چارہ کاٹ کر انہوں نے دو گٹھے بنائے اور سروں پر اٹھا کر جھولتی ہوئی مخصوص چال کے
 ساتھ گھر کی جانب روانہ ہوئے - سارے رستے وہ بخار اور درد کی شدت سے مید کی طرح کانپتا رہا -
 اس کے بدن پر بال کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے اور جلد جھرجھرا رہی تھی - جب اس کی
 آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے تو اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دل میں بولا : "میں ان
 راستوں پر آنکھیں بند کر کے چل سکتا ہوں - میں یہاں پیدا ہوا تھا -"

لیکن گھر کے دروازے پر گٹھا اس کے سر سے گر گیا اور وہ گردن پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا -

وہ اسے اٹھا کر اندر لائے اور گھر کے تمام نقلی ریشم اور سوت کے لحاف اسے اڑھا دیے۔ دونوں عورتوں نے اس کی چھاتی پر تلی کے تیل کی مالش کی اور پودینے اور جنگلی بنفشے کے پھولوں کی چائے بنا کر اسے پلائی۔

تیل اور چائے کی حرارت سے وہ ہوش میں آگیا اور نعیم کو پاس بلا کر ہدایتیں دینے لگا: ”سبزی کے لیے میں نے زمین تیار کر دی ہے۔ کریلے اور کدو کے میج علی کی ماں سے لے لینا اور چار دن کے اندر اندر بو دینا۔ ورنہ زمین خراب ہو جائے گی۔ تم نے سوسوں کے پھولوں کو دیکھا ہے! پھاگن نکلتا جا رہا ہے۔ اور گیہوں کو اب پانی نہیں لگے گا۔ آج آخری بار لگا دیا۔ یہ شاید اسی کی برکت ہے۔ بد بخت برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ اور چنے چیت کے پہلے دنوں میں تیار ہو جائیں گے۔ لیکن تمہیں ان کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اُس وقت تک میں بھلا چنگا ہو جاؤں گا۔ اس وقت چارہ کاٹ کر جانوروں کو ڈال دو۔ سورے سے بھوکے ہیں۔ اور گھوڑی کے پچھلے پاؤں کے نعل گھس گئے ہیں۔ چڑھنے سے پہلے تھے ٹھونک لینا، ورنہ کھر زخمی ہو جائیں گے۔“

نعیم پشت پر ہاتھ باندھے کھڑا ”اچھا بابا۔ اچھا بابا“ کہتا جا رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے نیاز بیگ کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا، لیکن اس نے اپنے لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے ہدایتیں جاری رکھیں

”اور کام کرو۔ کام کرو۔ محنت سے میں نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔ محنت سے تم اسے کھڑا رکھو گے ورنہ یہ گر جائے گا۔ میں اچھا ہو جاؤں تو تمہارے لیے عورت کی تلاش میں نکلوں گا۔ فکر نہ کرو۔ عورتیں ناکارہ ہوتی ہیں۔ لیکن کسان کے لیے عورت بڑی مفید ہوتی ہے۔ فکر نہ کرو۔“ وہ ہوشوں میں مسکرایا۔

”اچھا بابا۔“ نعیم نے کہا۔ وہ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ شام کے وقت جب کمرے میں دیا جلا تو اُس نے آخری بار نعیم کو پاس بلایا۔ جب وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا تو اس نے اسے نزدیک آنے کا اشارہ کیا اور اُسے مضبوطی سے پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ موت کو سامنے دیکھ کر اُس کا سارا غرور ختم ہو گیا تھا ہے اس وقت وہ فقط ایک مرتا ہوا انسان، اور ایک باپ تھا۔

بنفشے کے پھولوں کی چائے اور تلی کے تیل کے باوجود آدھی رات کے قریب وہ مر گیا۔ اُس کے جنازے پر سارا گاؤں اُٹ آیا۔ مرنے والے کا بیٹا روشن آغا کے بعد گاؤں کا امیر ترین شخص تھا، اور ابھی کنوارا تھا۔ آنے والوں میں بعض ایسے کسان بھی تھے جو اُس کے باپ کے پرانے دشمن تھے، اور ایسے بھی جو اُس کی سخت طبیعت اور اس کی ڈینگوں کی وجہ سے اسے ناپسند کرتے تھے، اور وہ بھی تھے جو ایک نئی نئی حاصل کی ہوئی دولت کا خیال کر کے جلتے

تھے۔ اس وقت وہ سب غمزہ دکھائی دے رہے تھے اور نعیم کے پاس بیٹھے افسوس ظاہر کر رہے تھے۔

”جس وقت مجھے خبر ملی میں مکئی کے کھیت میں تھا۔ میرے ہاتھ پھاوڑے پر رک گئے۔ یوں لگا میرے بچے کہ جیسے دل پر کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہو۔“ ایک بوڑھے کسان نے مٹھی ہوا میں لہرا کر کہا۔

”مجھے میری عورت نے بتایا کہ چوہدری ن۔۔۔۔۔ ن۔۔۔۔۔ اتنا کہنے کے بعد دوسرے کسان نے ایسا حلیہ بنایا کہ سب سمجھے اب وہ رونے والا ہے۔“ چوہدری نیاز بیگ بڑا بختا اور آدمی تھا۔ وہ جیل جانے لگا تو۔۔۔۔۔ اُس نے رک کر دوبارہ رونے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی کئی سننے والوں کے چہرے بھی بگڑ گئے۔ بولنے والا فوراً اصلی حالت پر آیا اور ہاتھ پھیلا کر بات جاری رکھی۔ ”اتے اتے۔ اتے اتے بڑے تریوز تھے اُس کے کھیت میں جو اس نے مجھے دے دیے۔ ہائے وہ تریوز اب کہاں۔“ وہ جھکا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ یا سننے والوں میں سے کوئی روتا اُس نے خشک آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا اور بات جاری رکھی۔ ”جب وہ جیل سے آیا تو اُس نے کبھی ان تریوزوں کا ذکر مجھ سے نہ کیا۔ ہا۔۔۔۔۔“

کچھ دیر تک رونے کی بے سود کوششوں میں اُس کا ساتھ دینے کے بعد حاضرین اس کی اس قدر صریح بہانے بازی سے تنگ آ گئے اور ان میں غصے کی لہر بڑھنے لگی۔ ایک مرتبہ جب وہ جھکا تو اُسے اسی حالت میں چھوڑ کر تیسرے کسان نے بے صبری سے اپنی بات شروع کر دی : ”چوہدری بڑا دل والا جوان تھا۔ جب مجھے میلے پر جاتے ہوئے دیکھا تو ہمیشہ میری پیٹھ ٹھونکتا اور کہتا: عیش کر بیٹا۔ عیش کر۔ ایسے زندہ دل بوڑھے اب مرتے جاتے ہیں۔“ اسی طرح ہر ایک نے باری باری کسانوں کے چالاک اور بے فن انداز میں مرنے والے کو یاد کر کے افسوس ظاہر کیا۔

جب انہوں نے جنازہ اٹھایا اور بڑی مشکل سے دونوں واویلا کرتی ہوئی عورتوں کو لاش سے جدا کر چکے تو ایاز بیگ اپنے بھاری، ٹھگنے جسم کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اور تھوڑی دیر تک وہ دروازے میں کھڑے مجمعے کے اوپر خلا میں دیکھتے رہے۔ نعیم نے دور سے انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ مگر جب آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نزدیک آئے اور اپنا بوڑھا، پلپلا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا تو وہ مڑا اور سب لوگوں کے درمیان ان سے لپٹ کر رونے لگا۔

(۱۷)

نعیم کو گاؤں میں رہتے ہوئے چند مہینے ہو چکے تھے۔ اس نے دو جوڑی میل اور خرید لیے تھے

اور اپنے باپ کی، اپنی اور ایاز بیگ کی زمین کی، جو ساری ملا کر چار جوڑیوں کے لیے کافی تھی، اپنی نگرانی میں مزارعوں سے کاشت کروا رہا تھا۔ اس سال کٹائی کے موقع پر اس نے گاؤں سے باہر ایک کمرے کا پکا مکان بنوایا اور اس میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ آبائی مکان میں دونوں عورتیں، بچے اور مویشی رہتے تھے اور نعیم کھانا کھانے کے لیے وہاں جایا کرتا تھا۔

اپنے باپ کے آخری الفاظ وہ کبھی نہ بھولا۔ کام، کام، کام۔ یہ اس کی زندگی کا مقولہ تھا، اور کام ہی سے وہ زمینوں اور مکانوں کو کرنے سے بچائے ہوئے تھا۔ علی الصبح سے لے کر دوپہر تک وہ کھیتوں میں رہتا، ہر روز بڑھتی ہوئی فصل کی رفتار کو دیکھتا اور مزارعوں کو اس کے متعلق ہدایات دیتا۔ حصے پر دی ہوئی زمین کی اسے فکر نہ تھی۔ زیادہ وقت وہ اس زمین پر صرف کرتا جو خود کاشت تھی، جس کے میل اور بیج اس کے اپنے اور مزارے اس کے ملازم تھے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ تمباکو پیتا اور گھنٹہ بھر آرام کرتا۔ پھر اٹھ کر کتابوں میں جنسوں کی خرید و فروخت اور قرض اور ادھار کا اگلا پچھلا حساب دیکھتا۔ اس کے بعد مویشیوں کو دیکھنے کے لیے جاتا اور ایک دن چھوڑ کر باقاعدگی سے گھر میں عورتوں کے پاس جا کر بیٹھتا، قاعدے کی رو سے ادھار دھار کی باتیں کرتا، ان کی روزانہ ضروریات اور شکایتیں سنتا، مکان کی مرمت اور مکھن کے ذخیرے کے متعلق پوچھتا اور یہ دیکھ کر خوشا ہوتا کہ دونوں عورتیں اب مکمل صلح اور دیانت داری کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ شام کے وقت وہ باقاعدگی سے (کبھی کبھی پوری فوجی وردی میں) پنچایت گھر جاتا جہاں وہ پھر تمباکو پیتا، اور اگر منشی غیر حاضر ہوتا تو پنچایت کی صدارت کرتا اور گاؤں کے روز مرہ کے چوری اغوا وغیرہ کے مقدمے سنتا۔ اس طرح اب وہ چھوٹے موٹے زمیندار کی طرح رہ رہا تھا اور گاؤں کے باشندوں کی نظر میں اس کی حیثیت مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔

لیکن اس دلی اطمینان اور فارغ البالی کی زندگی اور مویشیوں کی ایک بھاری تعداد کے باوجود اس کا مزاج تیز اور تند ہوتا گیا۔ میل جول والے کسانوں کا کہنا تھا کہ یہ خصوصیت اسے اپنے باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی، لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔ اس پر بھی وہ اکثر کسی چھوٹی موٹی بات پر اپنے صحیح ہاتھ کے ایک طاقت ور گھونے کے ساتھ گاؤں کے کسی کمین یا مزارعے کی ناک سے خون جاری کر دیا کرتا، جس کی ندامت کو مٹانے کے لیے اسے کٹائی کے موقع پر دل کھول کر ہر ایک کو دینا پڑتا۔

اس عام عزت افزائی کے باوجود وہ ذاتی تعلقات بڑھانے سے ہچکچاتا تھا، اور گاؤں میں مہندر سنگھ کے بعد اب تک کوئی شخص اس کے زیادہ نزدیک نہ ہو سکا تھا۔ کبھی کبھی وہ زمینداری کے معاملات راول کے سپرد کر کے اپنا فوجی تھیلا اٹھا کر چند دن کے لیے ایاز بیگ کے پاس دلی چلا جایا کرتا۔

خزاں کے موسم میں وہ دلی گیا تو ایاز بیگ نے اسے سنہرے حروف میں چھپا ہوا اعلیٰ درجے کے ڈیز کاغذ کا ایک کارڈ دیا۔ یہ سہ رنگی کارڈ روشن محل سے جاری کیا گیا تھا اور چند دن میں ہونے والی پرویز کی شادی کا دعوت نامہ تھا۔ اُس پر انگریزی زبان میں اس کا نام اور دعوت کی عبارت لکھی تھی۔ اسی طرح کا دوسرا کارڈ ایاز بیگ کے نام کا میز پر پڑا تھا۔ نعیم نے اسے دیکھا اور ہلکے دل سے میز پر رکھ دیا۔ لیکن وہ زیادہ دوبارہ اٹھایا اور رکھا، اٹھایا اور رکھا، ہاتھ میں الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر سلیقے سے بہہ کر کے اپنے کوٹ کی اندورنی جیب میں رکھ لیا۔ ایاز بیگ نے کھڑکی پر جھک کر سگار پیتے پیتے اس کے تانے کے رنگ والے چہرے کو زرد اور پھر سرخ ہوتے ہوئے دیکھا۔

”چلو گے؟“ انہوں نے بظاہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ نعیم نے اٹکیاں چٹختے ہوئے کہا۔

ایاز بیگ نے سگار کو کھڑکی کے پتھر پر مسلا اور ایسے لہجے میں، جس سے نعیم کو کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کس سے مخاطب ہیں، بولے: ”روشن محل کی دعوت ہے۔ ایسی دعوتیں روز روز کہاں۔۔۔۔۔“

معدے میں بد مزگی محسوس کر کے نعیم نے اکالدان میں تھوکا اور بے چینی سے چھاتی کو ملا۔

بالوں کو ناریل کے تیل سے چکنا کرنے کے بعد نعیم نے انہیں ٹھیک طرح بٹھایا اور داڑھی مونڈی۔ رخساروں کو تولیے سے خشک کرتے ہوئے اس نے ذرا مایوسی کے ساتھ دیکھا کہ ٹھوڑی کے نیچے گوشت نمودار ہو رہا تھا اور جبرٹوں کے پاس چہرہ فریہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور دیہات کے تیز موسموں نے اس کی جلد کو، جو کبھی سفید اور ملائم تھی، کھردرا کر دیا تھا۔ پھر اس نے چرمی تھیلے میں سے پورا فوجی تقریبی لباس نکال کر پہنا، ٹوپی میں مرغابی کا پر لکایا، سینے پر جنگی ملازمت کی رنگین رن فیتیاں اور نیچے چمکتی ہوئی دھات کا کراس لٹکایا؟ اسی تھیلے میں سے آخری تین فرانسیسی سگار نکال کر اوپر کی جیب میں رکھے اور جانے سے پہلے لکڑی کا ہاتھ احتیاط سے جیب میں ڈال کر آستین سے ڈھک دیا۔

روشن محل میں داخل ہوتے وقت کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں اور سرخ بھری کے راستے دیکھ کر اسے وہ دن یاد آیا جب وہ پہلی دفعہ یہاں آیا تھا۔ آج بھی پہلی دفعہ آ رہا تھا۔ پہلی دفعہ وہ ہمیشہ تقریبات پر ہی آتا تھا، یہ سوچ کر وہ دل میں ہنسا۔

ان سارے برسوں کے دوران روشن محل میں ایک ”کارڈن ہاؤس“ کے علاوہ کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ باغ کے جنوبی کونے میں اونچے اونچے کیلے کے پودوں میں چھپا ہوا بانس اور لکڑی کا یہ ”کارڈن ہاؤس“ ایاز بیگ کے نقشے کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔ یہ اسے وہاں داخل ہوتے ہی

ایاز میگ نے بتایا۔ گھاس کے قطعوں پر برآمدوں میں اور باغ کے راستوں پر آج اس پہلی والی تقریب سے کہیں زیادہ چہل پہل تھی۔ دعوت ولیمہ پر مدعو انسانوں کا ایک ہجوم تھا۔ جو باتوں اور قبہوں کے شور میں نہ ادھر ادھر آ جا رہا تھا۔ میچ میچ میں اسے مانوس شکلیں بھی نظر آئیں۔ یہ وہی لڑکے اور لڑکیاں تھے جن کے ساتھ چند برس پیشتر وہ انہی درختوں کے نیچے کھیلا کودا تھا۔ وہ اب جوان ہو چکے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے اپنے جوان ہونے اور ایاز میگ کے بہت بوڑھے ہو جانے کا خیال آیا۔

”مبارک ہو۔“ ان دونوں نے پرویز سے ہاتھ ملایا۔
 ”ہیلو۔“ پرویز نے گرمجوشی سے نعیم کے ساتھ مصافحہ کیا اور دیر تک اس کا ہاتھ تھامے اس کی آنکھوں میں پرانی دوستی کو تلاش کر کے محبت سے ہنستا رہا۔ پھر وہ مڑ کر ایاز میگ سے بولا:

”معاف کیجئے گا، میری بیوی ابھی ادھر گئی ہے۔“
 ”کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔“ ایاز میگ نے کہا۔
 پھر نعیم نے ہاتھ اٹھا کر خالہ کو سلام کیا۔ ادھیڑ عمر خوبصورت عورت نے پسندیدگی کی نظروں سے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔
 ”بہت دن کے بعد آئے ہو نعیم میاں۔“ اس نے کہا۔
 نعیم مسکرایا۔ اسی وقت اس نے اپنے آپ کو بہت سے آشنا، ہنستے ہوئے چہروں میں گھرا پایا۔

”ہلو ہلو ہلو“ کا شور اٹھا اور اسے اتنے ہاتھ ملانے پڑے اور ایسے زور دار طریقے پر پرانی دوستی کو تازہ کیا گیا کہ اس کا بازو تھک گیا۔ یہ وہی پرویز اور عذرا کا گروپ تھا۔
 ”کہاں چلے گئے تھے نعیم۔ اتنی دیر کے بعد۔“ ایلس گریگن نے اپنے مخصوص تیز پر مسرت لہجے میں پوچھا۔

”جنگیں فتح کر کے آ رہا ہے۔ دکھائی نہیں دیتا۔“ ملامت بار نظروں سے ایلس کو دیکھتے ہوئے ارشد نے نعیم کے جسم کی ساری لمبان کی طرف اشارہ کیا۔
 معصوم طلعت، جو ویسی کی ویسی چھوٹی سی لڑکی تھی، بولی: ”ارے نعیم، اوہ تم تو ہیرو بن گئے سچ میچ کے۔ سب میں سے۔ اب تمہاری ہیرو ورشپ ہوگی۔“ جوش مسرت سے اس نے آنکھیں میچ لیں اور مٹھیاں کس کر کانوں پر بچانے لگی۔
 ”ہم نے اخبار میں پڑھا تھا۔“ شیریں نے کہا۔

”کیا؟“ نعیم نے پوچھا۔
 ”تمہارے کارنامے کے متعلق اور۔“ ایک لمحے کے لیے اس کے اردگرد خاموشی چھا گئی

اور اس نے پیشمان ہو کر موضوع بدل دیا۔ ”تم ہندوستان میں تیسرے آدمی ہو جسے یہ اعزاز دیا گیا ہے۔“

”ہاں۔“ وہ آہستہ سے ہنسا۔ اُن کی اس بے ضرورت چشم پوشی پر اسے صدمہ ہوا۔
 ”ہل لو۔“ عقب سے کسی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
 ”صاحبزادہ صاحب۔“ نعیم نے مڑ کر مصافحہ کیا۔

”ارے میاں کہاں غایب رہے اتنے برس۔ بڑے میدان مار کے آرہے ہو واللہ کیا شان دار سپاہی ہو ابا ہا ہا۔“ وجید نے پسندیدگی سے اسے دیکھا۔ ”اب تو بڑے مشہور و معروف آدمی۔۔۔“

”نعیم تم ان سے ملے۔“ شیریں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”سیگم بلقیس وجید الدین آف۔۔۔۔۔“

”ہاں میری بیوی سے ملو نعیم۔“

”آپ انہیں جانتی ہیں بلقیس بھابی۔“ طلعت نے معصومانہ انداز میں کہا۔ ”آپ انہیں نہیں جانتیں؟ ارے واہ۔ بھئی نعیم، یعنی نعیم احمد خان، ہمارے بہت پرانے دوست ہیں۔“ بلقیس نے انجانے پن سے سر کو خوبصورت جنبش دی۔ وہ ایک پتلی سی زرد رو جاگیردارانہ نقوش والی لڑکی تھی۔ نعیم نے ذرا سا جھک کر احتیاط سے اسے سلام کیا۔ وہ عمد آ زیادہ اخلاق برتنے کی کوشش نہ کر رہا تھا۔ اس میں ایک قدرتی رعونت آگئی تھی جو اس کی آنکھوں اور ہوشوں کی کرخنگی سے برابر میل کھاتی تھی۔ اس کے ساتھی اس کی شخصیت میں اس تبدیلی کو اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے گھیرے اس کے چست، بے داغ فوجی لباس اور چمکتے ہوئے کراس اور ٹوپنی کے پر کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ درمیان میں وہ اپنے آپ کو سنبھالے، سب میں سے سر نکالے کھڑا سنجیدگی اور احتیاط سے ہنستا رہا، اس شخص کی طرح جو بیک وقت مغرور، رنجیدہ اور مسرور ہو۔

جب مہمان زیادہ اکتھے ہونے لگے تو وہ اسے کمروں کی طرف لے گئے اور چند ایک ادھر ادھر بکھر گئے۔ اندر اس کا اتنے لوگوں سے تعارف کرایا گیا کہ اسے سگار پھینکنے کے لیے باہر آنا پڑا۔ موٹے موٹے بیپاریوں اور جاگیرداروں اور سیاسی لیڈروں نے اسے بے اعتنائی سے دیکھا اور فانوسوں کی روشنی میں صوفوں میں دھنس کر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

نوجوان عہدیدار، جو پرویز اور وجید کے دوست تھے، اسی خوش دلی کے ساتھ اس سے ملے جو ان لوگوں کا خاصہ تھا۔ انگریز عورتوں اور مردوں نے اس کے سینے پر لٹکتے ہوئے کراس کی عزت میں اپنی جگہ کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور اپنے نزدیک بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس نے کئی جگہ رکھنا چاہا لیکن ارشد، شیریں اور غیث اس کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ ان خوشدل

لوگوں کے لیے نعیم ایک دوسری دنیا کا بے حد دلچسپ باشندہ تھا جو طبقاتی اختلاف کے باوجود مغرور اور باوقار تھا اور کسی طرح سے ان کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہو چکا تھا اور اس وقت فوجی لباس بے حد دلکش لگ رہا تھا۔

آخر اس گہما گہمی سے تنگ آکر وہ ایک جگہ پر بیٹھ گیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر زمیندار تھا جس نے اپنے پاس اسے جگہ دی۔ اس نے دیہاتی کا لباس پہن رکھا تھا۔

’ہا۔ نوجوان، تم فوج میں ملازمت کر چکے ہو؟ فوج واقعی تم جیسے نوجوانوں سے بنتی ہے، جو ملک فتح کرتی ہے۔ جوانی میں میں بھی فوج میں بھرتی ہونا چاہتا تھا لیکن میرا وزن کم تھا۔ شاید میں زمینداری کے لیے ہی موزوں تھا۔ اہا ہا۔‘ اس نے نعیم کو چھاتی پر چھوا۔

’کیسا عالی شان تفریح ہے۔ میں نے دور سے دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ تم نے اصل جنگیں لڑی ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے بھئی کہ ہی ہی ہی۔ میں سادہ سا آدمی ہوں لیکن جب تم اندر داخل ہوئے تو میرا دل چلایا کہ تم میرے پاس آکر بیٹھو۔ تم نے برا تو نہیں مانا۔‘

’اوہ ہرگز نہیں۔‘

’دراصل میں فوج کا ابتدا سے شیدا ہوں۔ لیکن ارر۔ میں شاید زمینداری کے لیے ہی موزوں تھا۔ تم کہاں سے آرہے ہو؟‘

’روشن پور سے۔‘

’آہا۔ پھر تو تم میزبانوں میں شامل ہو۔ ہی ہی۔‘ وہ کم پڑھے لکھے خوش باش دیہاتی رئیسوں کی طرح ہنسا اور نعیم کو کندھے پر تھپتھپا کر بولا؛ ’’روشن آغا سے میری ملاقات بیٹی میں ہوئی تھی ایک بار بس۔ مگر کیا وضع داری ہے صاحب، غازی آباد سے مجھے بلا بھیجا۔‘‘

’آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟‘ نعیم نے پوچھا۔

’مختصر سی زمینداری ہے بھائی۔ غازی آباد میں۔ لیکن میرے باغوں میں اول درجہ کا کلاب ہوتا ہے۔ جنگ میں تم نے پھول کہاں دیکھے ہوں گے۔ میرا کاؤں پھولوں کا کاؤں ہے، کلاب کے پھولوں کا کاؤں۔ تم وہاں ضرور آنا۔‘

’یہ بات تو نہیں۔ غیر ملکوں میں میں نے بہت اچھے اچھے پھول دیکھے ہیں۔‘

’ابھی تو میں بیانی کی تیاری کر رہا تھا جب روشن آغا کا سندیش ملا۔‘

’آپ کون سی گندم بوتے ہیں؟‘ نعیم نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

’سفید۔ روشن پور میں سرخ گندم ہوتی ہے، میں جانتا ہوں، جو ایکڑ میں بمثل بیس

من اترتی ہے۔ میری سفید گندم۔‘

وہ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ ہی دیر میں نعیم اس کے باتونی پن سے اکتا کر اور غازی آباد آنے کا وعدہ کر کے اٹھا اور برآمدے میں نکل آیا۔ سکار جلا کر اس نے ادھر ادھر

دیکھا۔ پرویز ارشد غائب ہو چکے تھے اور ادھیڑ عمر کے باوقار، اجنبی کسان اس کے ارد گرد چل پھر رہے تھے۔ اگلے برآمدے میں اس کی مڈبھیڑ روشن آغا سے ہوئی۔

”ہاں نعیم۔“ وہ مسرت اور تعجب سے بولے۔ نعیم نے جھک کر سلام کیا۔
 ”تم یہاں کیوں نہیں آتے؟“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے بولے، ”نیاز بیگ کی موت کا ہمیں بہت رنج ہوا۔ ہمارا پیغام مل گیا تھا؟“
 ”جی ہاں۔“

”ہم لوگ ایک ہی نسل کے آدمی تھے۔ نیاز بیگ اور ایاز بیگ اور ہم سب۔ اب تم لوگوں کو چاہیے کہ ہم سے ملا کرو۔ نئی نسل کچھ اس قدر بے مروت واقع ہوئی ہے۔“ وہ اداسی سے ہنسے اور گزر گئے۔

کمروں میں سے ابھی تک کئی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ خصوصاً خواتین اس فوجی لباس اور سیدھے جسم والے شخص کو دیکھ رہی تھیں جس کے چہرے کی پیدائشی خوبصورتی کے ساتھ نقوش کی خالص مردانہ کرسٹنگ اور بھاری پن نے مل کر اس میں بلا کی کشش پیدا کر دی تھی اور جو سر اٹھائے، ایک ہاتھ جیب میں ڈالے ڈالے برآمدوں میں گھومتا پھر رہا تھا۔

پھر کھانا شروع ہونے کی خبر نا معلوم طریق پر چاروں طرف پھیل گئی اور مہمانوں کا ہجوم باہر کی طرف، جہاں کھانے کی میزیں لگی تھیں، بھٹکنے لگا۔ پام کے ایک بڑے گیلے پر پیر رکھے سگار پیتے پیتے اس نے اپنی قطعی بے وجہ زود رنجی کو محسوس کیا۔ وہ سب ایک ایک کر کے اس کے پاس سے گزرتے گئے۔

برآمدے کے آخر پر اوپر کی منزل کو جاتے ہوئے لکڑی کے زینے پر اترتی ہوئی عذرا کا سامنا خالہ سے ہوا۔

”بی بی آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ سارے مہمان تو آچکے۔“ خالہ نے کہا۔
 عذرا لکڑی کے جنگلے پر ہاتھ رکھے بے دھیانی سے کھڑی رہی۔ نیچے برآمدے میں نعیم ان کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

”خالہ، آپ اس سے ملیں؟“

”نعیم! ہاں۔ وہ اسی طرح دلکش اور خلیق ہے۔“ خالہ نے سہم کر بات شروع کی۔
 لیکن۔ لیکن، اوہ۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ جیسے دسمبر میں پتھر کی دیوار۔ اس کا ایک بازو ضائع ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری ہے۔ موت! وہ کپکپا کر زینہ چڑھنے لگیں۔
 نعیم باہر جانے کے لیے مڑا۔ اسی وقت عذرا جیسے ہوا پر چلتی ہوئی اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ چند سیکنڈ تک دونوں شذر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس نے ہندوستانی شادیوں کا زرتار لباس پہن رکھا تھا اور بے حد زرد نظر آ رہی تھی۔

پھر نعیم نے سنبھل کر سگار کی راکھ جھٹکی اور اسی سروں لاتعلق لہجے میں بولا: ”عذرا سیکم، کیسی طبیعت ہے؟ میں کھانے پر جا رہا تھا۔“

”اچھا۔ چلیے۔“ عذرا نے اس کی نظروں سے بچنے کے لیے دور ہجوم کے ایک حصے پر دیکھتے ہوئے بے خیالی سے کہا۔ لیکن کوشش کے باوجود اس کے قدم نہ اٹھ سکے۔ نعیم بد اخلاقی سے گملے پر پیر رکھے کھڑا رہا۔ باہر کھانا کھاتے ہوئے لاتعداد مہمانوں کا شور آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا اور وہ دونوں وہاں خاموش کھڑے اس ملاقات کے بے ڈھنگے پن کو اور ایک دوسرے کے وجود کو شدت اور بے چینی کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ غیر محسوس طریقے پر نعیم نے فیصلہ کیا کہ اب بات کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

آخر عذرا نے اس تکلیف دہ خاموشی کو توڑا۔ ”بہت دنوں کے بعد تم۔ آپ سے ملاقات ہوئی۔“

”میں کام میں لگا رہا۔“ نعیم نے ایک مصروف آدمی کے مختصر لہجے میں کہا اور عذرا کے وجود کی نفی کرنے کو سگار کا دھواں اس کے منہ پر چھوڑا۔

لیکن ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس شدت اختیار کر گیا اور وہ ایک بار پھر برتنوں کے ٹکرانے اور انسانی آوازوں کے ملے جلے شور کے نیچے خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ برآمدے کے بیرونی شور اور اندرونی سناٹے کو انہوں نے ایک ساتھ محسوس کیا۔ بے چین لمحے ایک ایک کر کے ان کے سروں پر ٹپکتے رہے۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ حتیٰ کہ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی ملاقات اور یہ گفتگو انتہائی مضحکہ خیز اور بے مصرف ہے۔

”آپ جنگ میں گئے تھے۔“ عذرا نے سرسری طور پر کہنا چاہا، مگر اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

اچانک نعیم کا زخمی احساس انتہا پر پہنچ گیا۔ تیز تیز سانسوں کے ساتھ اس کی چھاتی اٹھنے اور بیٹھنے لگی اور وہ رک رک کر بولا: ”ہاں مجھے حکومت کی ملازمت مل گئی تھی۔ باوجود تمہارے۔۔۔ تمہارے باوجود۔“

ایک جھٹکے سے عذرا نے اس کی طرف دیکھا۔ شدید رنج سے اس کے ہونٹ اور کال کانپ اٹھے۔

”نعیم۔ نعیم۔ تم۔ تم مغرور ہو۔“ اس نے کہا۔ دفعتاً آنسوؤں کا ایک ریلا اسکی آنکھوں میں اور حلق میں عود کر آیا۔

اور اس وقت، دونوں نے، اپنی اپنی جگہ پر، ایک ہی وقت میں، دیکھا، اور محسوس کیا، کہ محبت کا جذبہ فاصلے، اختلاف اور چوہنی بازوؤں کے باوجود طاقت ور ہے۔ وہ مڑی اور دوڑتی ہوئی خالی کمرے میں داخل ہوئی۔

”عذرا - عذرا -“ نعیم اس کے پیچھے لپکا -، کمرے سے گزرتے ہوئے ایک ملازم نے عذرا کو روتے ہوئے دیکھا اور ٹھٹک کر رک گیا - پھر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور چپکے سے باہر نکل گیا -

چمڑے کی ایک بڑی سی مطالعے کی کرسی میں پوری طرح سما کر بیٹھی ہوئی عذرا نے ہونٹ سختی سے اندر کی طرف داب رکھے تھے اور چھوٹی سی لڑکی کی طرح دکھائی دے رہی تھی - جذبات کے ہنگام سے اس کا چہرہ زرد اور خوف زدہ تھا - نعیم فرش پر ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھا اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں لیے گھور رہا تھا -

”نعیم -“ دیر کے بعد عذرا نے ہونٹ ڈھیلے چھوڑ کر صاف اور کمزور آواز میں کہا -

”عورتیں بے شرم نہیں ہوتیں، پر محبت ضرور کرتی ہیں -“

”مجھے معاف کر دو - معاف کر دو -“ وہ اس کے ہاتھ میں منہ چھپا کر کہتا رہا -

اور پھر وہ ہوا جو روشن پور والوں کی تاریخ میں آج تک نہ ہوا تھا - اور حقیقتاً جو ہندوستان کے جاگیردار اور امراء کے طبقے میں بہت کم ہوا تھا -

روشن محل پر موت کا سکوت طاری تھا اور موسم خزاں کی وہ شام اونچی چھتوں والی اس مہیب عمارت پر آہستہ آہستہ جھکتی آ رہی تھی - برآمدوں میں اور بند دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں پر روشنیاں جل رہی تھیں، لیکن کوئی متنفس دکھائی نہ دے رہا تھا - گھر کے تمام نوکر گھر کے پچھواڑے اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے تھے اور برآمدوں میں قدم دھرتے ہوئے ڈر رہے تھے - سڑک پر سے گزرنے والوں کو پہلی نظر میں سنسان برآمدے اور روش پر اکٹھے کیے ہوئے خشک پتوں کے ڈھیر دیکھ کر اس جگہ کی ہمہ گیر ویرانی کا احساس ہوتا تھا -

اوپر کی منزل میں سرخ شیشوں والے بڑے دریچے پر یو کلپٹس کے پتے سایہ کیے ہوئے تھے - ان کے پیچھے عذرا کمرے میں خالی پلنگ کے کونے پر بیٹھی تھی - پلنگ پر عذرا گھٹنوں اور کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی تھی - کمرے کی فضا پر دھماکے سے پھٹنے والی خاموشی طاری تھی -

”آہ -“ خالہ نے ہاتھ اٹھا کر ہوا میں پھیلائے اور پھر گود میں رکھ لیے - ”کس قدر خوفناک -! آج تک ایسا نہیں ہوا - کبھی نہیں - تم سوچ نہیں سکتیں؟“ کچھ دیر تک وہ عذرا کی بے حرکت پشت کو دیکھتی رہیں، پھر سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر آہستہ آہستہ دبائے لگیں -

عذرا اٹھ کر آتش دان تک گئی اور کمرے کی طرف پشت کیے دیر تک کھڑی رہی - ”کیا نہیں ہوا؟“ اُس نے بظاہر کارنس پر دھرے دھات کے محسمے سے پوچھا -

”کہ روشن پور والوں کی لڑکیاں نچلے طبقے میں شادی کریں -“ خالہ نے سر چھوڑ کر کہا -

عذرا کلدار گڑیا کی طرح مڑی۔ بجلی کی روشنی میں اُس کے دبلے، چوبی چہرے میں سے پیلاہٹ پھوٹ رہی تھی اور اس کی آنکھیں خشک اور پھیلی ہوئی تھیں۔
 ”نچلا طبقہ، نچلا طبقہ، نچلا طبقہ کیا ہے!“ اس نے ایک ساتھ سختی اور بے چارگی سے کہا۔
 ”کیا وہ کمین ہے؟ کیا وہ ہماری زمین کاشت کرتا ہے؟ اس کے پاس اپنے مویشی نہیں ہیں، اور گھوڑے، اور مکان۔۔۔۔۔“

”ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں۔ ان کے باوجود وہ بے حیثیت ہے۔ اس کا باپ ایک معمولی کسان تھا۔“ خالہ نے اس عورت کے پُر عزم اور جسارت آمیز لہجے میں بات کی جو خود باحیثیت طبقے میں چور دروازے سے داخل ہوئی ہو اور اپنی زندگی سے بیک وقت خوف زدہ اور مطمئن ہو۔ ”اور اس کے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ تم نادان ہو۔ اسے ایک کسان عورت کی ضرورت ہے۔“

”وہ کسان نہیں۔“ عذرا نے اسی عزم اور بیچارگی سے کہا۔ ”وہ پڑھا لکھا ہے۔ وہ یہاں پر بھی رہ سکتا ہے۔ اور۔“ اس نے دھات کے محسمے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس کی بے جان آنکھوں میں دیکھ کر بولی:

”کیا وہ بہادر نہیں ہے؟“

”اوہ۔“ خالہ دکھ سے ہنسی۔ ”ہاں۔ وہ بہادر ہے، اور مغرور اور پرکشش بھی۔! لیکن

وہ ناکارہ ہو چکا ہے۔ وہ۔“

عذرا نے دھل کر اسے دیکھا، اور پہلی بار اس کی آنکھوں میں خالہ کے لیے خوف اور نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ بوڑھی عورت نے اسے دیکھا اور اپنی بات ختم کرنے کا عزم کھو دیا۔ کمزور آواز میں وہ بولی:

”اور روشن آغا۔ تم انہیں صدمہ پہنچاؤ گی؟“

”عذرا، جس نے چند لمحے پہلے سفید ہونٹ دانتوں میں دبا کر اپنے آپ کو رونے سے روکا تھا۔ کلنٹ پریشان ہو گئی۔ اس نے ٹھٹک کر دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھا اور بھاگتی ہوئی آگر پلنگ پر گر پڑی۔“

”بابا۔ نہیں، نہیں، بابا۔ وہ مجھے نہیں روکیں گے۔ نہیں۔“ خشک آنکھوں کو ہاتھوں

سے ڈھانپ کر اس نے دھرایا۔

خالہ دل میں رحم اور محبت اور مستقبل کا خوف لیے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اس نے

آہستہ سے عذرا کی پشت پر ہاتھ رکھا: ”اٹھو بی بی، کھانا کھاؤ۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ عذرا نے دھرایا۔ ”بابا سے کہہ دو میں انہیں صدمہ نہ پہنچاؤں گی۔“

لیکن۔ نہیں۔“

ساتھ والے کمرے میں روشن آغا دیواروں کے ساتھ ساتھ چکر لگاتے ہوئے تھک کر بیٹھ گئے۔ بازو سینے پر باندھ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور سر صوفے کی پشت پر ٹیک دیا۔ ان کا چہرہ بہت بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ پرویز کونے کے سٹول پر سے اٹھا اور اپنا سیاہ ہیٹ اٹھا کر چپکے سے باہر نکل گیا۔ باغ کی طرف کھلنے والے دریچے کے آگے صوفے پر اس کی ماں اور بیوی رشتے کی بہن شیریں خاموش بیٹھی دہشت سے روشن آغا کو دیکھتی رہیں۔

دروازے کے رستے عذرا کے ہولے ہولے سسکنے کی آواز آ رہی تھی، اور باہر باغ کے نیم تاریک، سنسان راستوں پر خزاں کی ہوا میں خشک پتے کھڑا کھڑا رہے تھے۔

اس کے بعد اس سلسلے میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر اس کہانی کے احاطے سے باہر ہے۔ مختصر یہ کہ جاڑوں میں نعیم اور عذرا کی شادی ہو گئی۔ پھر بھی یہ بتانا ضروری ہے کہ شادی کو روکنے کے لیے جو دیوانہ وار کوششیں ہوئیں اور صوبے بھر کے تعلقداروں کی جانب سے اس انتہائی مضحکہ خیز خیال کی جو مخالفت ہوئی وہ امراء کے اس طبقے کی اپنی انفرادیت اور علیحدگی برقرار رکھنے کی خواہش کی خصوصیت سے مظہر تھا۔ شادی بہر حال عذرا کی قوت ارادی کی بدولت، جس نے اس سے پہلے کہ روشن آغا اس تکلیف دہ سکیم سے تعاون کرنے پر اپنے آپ کو مجبور کرتے گھر کے دوسرے افراد کو اپنی بے پناہ بیچارگی اور عزم سے متاثر کر دیا تھا، انجام پائی۔

گاؤں کے باغ میں روشن آغا نے انہیں شان دار مکان بنوا کر دیا جس میں دونوں نے رہائش اختیار کر لی۔ مگر کچھ عرصے کے بعد عذرا کثرت کے ساتھ طویل وقفوں کے لیے دلی جا کر رہنے لگی جہاں کی اونچی، چمکدار زندگی میں گاؤں کی اور غیر دلچسپ فضا کے مقابلے میں اس کے لیے زیادہ کشش تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں نعیم زیادہ تر وقت روشن آغا کی زمینداری کے معاملات پر صرف کرتا جس کا تمام تر بندوبست اب براہ راست اس کی زیر نگرانی ہو رہا تھا۔

(۱۸)

وہ ایک ایسی صبح تھی جب بہار کا زور ٹوٹ چکا ہوتا ہے اور دھوپ میں تیزی آجاتی ہے۔ جب پتوں کا رنگ شوخ سبز سے گہرا سبز ہو جاتا ہے اور ڈالیوں پر موسم بہار کے آخری پھول کھلتے ہیں اور آسمان مٹیالا اور گرم ہونا شروع ہوتا ہے۔ جب اوس گرنی بند ہو جاتی ہے اور عورتیں رات کو سونے کے لیے چھت سے باہر نکل آتی ہیں اور مرد دن بھر درانتیوں کے دندانے بناتے اور میلوں کے کھر صاف کرتے رہتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں کٹائی سے پہلے کا خوف سایہ کیے

رہتا ہے اور ہونٹوں پر پڑی جمی ہوتی ہے۔ جب دور دور تک سونے کے رنگ کی تیار فصل گرد کے طوفانوں میں لہراتی ہے اور چنبیلی کے پودوں پر گرما کی پہلی کلیاں نمودار ہوتی ہیں۔ سورج نعیم کے مکان کی دیواروں سے اوپر آچکا تھا اور دھوپ صحن میں پھیلتی جا رہی تھی۔ عذرا پچھلی شام کو دلی سے لوٹی تھی اور رات بھر وہ خوب لپٹ کر سوئے رہے تھے۔ چنانچہ صبح وہ خوش و خرم اٹھے تھے۔ نعمت خانے کے فرش پر بیٹھ کر زور زور سے ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے انہوں نے سرخ سنگتروں اور بھنے ہوئے جو کے لیے اور دودھ کا ناشتہ کیا۔ پھر انہوں نے چائے پی اور مویشیوں کے احاطے میں نکل آئے۔ بھوری بھینس کی گردن کا زخم کھلوا کر دیکھا اور اپنے سامنے جانوروں کے رکھوالے سے اس پر ہلدی اور سوسوں کے تیل کی پٹی کرائی۔ پھر وہ دوسرے جانوروں کے پاس سے گزرے اور نعیم نے، جو گزری ہوئی رات کی جسمانی آسودگی کے زیر اثر ملنسار موڈ میں تھا، ہر ایک جانور سے الگ الگ اس کا حال پوچھا۔ دھوپ میں جگالی کرتی ہوئی سیاہ اور سفید گایوں، بھینسوں، بھیڑوں اور دوسرے مویشیوں نے اسکا جواب اپنی سیاہ آنکھوں کے ساتھ اس قانع اور لا تعلق انداز میں دیکھ کر دیا جس کے ذریعے مویشی اپنی آسودگی اور گہری محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ صرف دونوں گھوڑے خوشی سے ہنہناتے اور دموں کو پھیندنے کی طرح ہوا میں لہرایا، جس پر نعیم نے اپنے باپ کی بات دہرائی کہ گھوڑے کسان کے عقل مند اور نزدیک ترین رشتہ داروں میں سے ہوتے ہیں۔

مویشیوں سے ملاقات کرنے کے بعد انہوں نے رکھوالی کے کتوں کو صبح کا کھانا کھاتے ہوئے دیکھا اور دوپہر کے راتب کے متعلق نوکر کو ہدایات دیں۔ پھر وہ گوالے کی کوٹھڑی میں گئے اور صبح کے دودھ کی مقدار دیکھی۔ وہیں پر انہوں نے کل شام کی اتری ہوئی بھیڑوں کی اون کا معائنہ کیا۔ پھر وہاں سے وہ گھر کے پچھوڑے سبزی کی کیاریوں میں گئے اور شیشے کی طرح چمکدار پانی کو شرانے سے نالی میں بہتے اور آگے جا کر خاموشی کے ساتھ، اپنے رستے میں آنے والے ہر بھورے اور خشک مٹی کے ڈھیلے کو سیاہ کرتا ہوا گہرائیوں میں اتر رہا تھا، جہاں پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے بیجوں کے ہزاروں تھے تھے سوراخوں میں رچ بس کر انہیں نرم اور گداز بناتا ہوا نازک نازک، ریشمیں کونپلوں کی تخلیق کر رہا تھا جو پانی کے اترنے ہی کے ساتھ خاموش اور چور انداز میں بڑھتی اور زمین پھاڑ کر باہر نکلتی آ رہی تھیں۔ عذرا کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے یہ سب دیکھ کر اور محسوس کر کے نعیم کی آنکھیں تخلیق کے سرور سے مند گئیں اور اس نے سوچا کہ وہ بنیادی طور پر کسان ہے اور کسان کا بیٹا ہے اور عذرا کی اونچے چھتوں والی دنیا میں وہ چور دروازے سے داخل ہوا ہے۔ لیکن اس خیال نے، جس نے کہ آگے جا کر زندگی میں کئی بار اسے لاپار کر دیا، اس وقت اس کو محظوظ کیا اور آہستہ آہستہ سے مسکرا کر اس نے عذرا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ساتھ لکایا۔

”بابا کہا کرتے تھے زمین ماں ہے اور پانی باپ ہے، اور فصل اولاد ہے۔“ اس نے کہا۔
عذرا نے آنکھوں میں محبت کی ساری مستی بھر کر اسے دیکھا اور ایک انجانے خیال سے
مسکرائی۔

وہاں سے چاسکو کی بڑھتی ہوئی باڑ کے ساتھ ساتھ لمبا چکر کاٹ کر باغ میں نکل آئے اور بل
کھاتے ہوئے سینگ راستوں میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے کھلتے اور مرجھاتے ہوئے پھولوں
اور پودوں کا معائنہ کیا۔ کھمٹے اور لیموں کی شاخوں کی چھانٹی اور چنبیلی کی قطار کے نیچے نلانی کرنے
کا حکم دے کر وہ واپس ہوئے۔ واپسی پر انہوں نے صبح کے دو گلدستے بنانے اور اس وقت
انہیں گزرتی ہوئی بہار کا احساس ہوا اور انہوں نے ایک دوسرے سے ان وقتوں کا ذکر کیا جب
پانچ پانچ گلدستے بنانے پر بھی پودے اسی طرح لدے پھندے رہتے تھے۔ نعیم نے گرے
ہوئے بے شمار خشک پتوں اور پھولوں کو زمین میں دبا دینے اور اس طرح عمدہ کھاد تیار کرنے کی
تجویز پیش کی جسے عذرا نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ وہاں نمی اور سائے میں پڑے پڑے وہ خود
بخود گل سڑ جائیں گے اور نلانی پر زمین میں رل مل جائیں گے۔ نعیم اپنی بیوی کی اس احمقانہ
دلیل پر دل میں ہنسا۔

پھر وہ اپنے مخصوص پیپل کے درخت کے نیچے پہنچے اور ڈالیوں میں سے چھن کر آتی ہوئی
دھوپ میں ناڑ کے مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ عذرا اون کے گولے سنبھال کر اس کے موزے
بننے لگی اور نعیم نے مونڈھے پر کھسک کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صبح کا
پہلا سگریٹ سلکاتا کچھ یاد آنے پر اٹھا اور اندر سے جا کر لکڑی کی ایک تختی اٹھا لیا۔ کئی روز سے
یہ زیر بحث تھا کہ اس پر کیا لکھ کر پھانک پر لٹکایا جائے۔ ہر روز کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکنے کے
باعث اسے ملتوی کر دینا پڑتا۔ آج اس نے یہ کام ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے تختی
مونڈھوں کے درمیان لا کر رکھی تو عذرا نے مسکرا کر سلاٹیاں ایک طرف رکھیں اور جھک کر بیٹھ
گئی۔ بڑی دیر تک وہ دونوں پچھلے دنوں کی تجویزوں پر غور کرتے رہے۔ نعیم اور عذرا۔
روشن محل۔ مے فلاور (ایک بہت بھولا ہوا نام نعیم نے پیش کیا)۔ اور اسی طرح کے کئی اور
نام۔ لیکن اس سارے مباحثے کا کوئی مطلب نہ نکلا اور جب ہر ایک نام اور ہر ایک سطر کسی نہ کسی
وجہ کی بنا پر کسی نہ کسی طرف سے مسترد کر دی گئی تو انہوں نے ہار کر اس کا فیصلہ مویشیوں کے
رکھوالے پر چھوڑ دیا جو کسی کام سے ادھر سے گزر رہا تھا۔ بوڑھے رکھوالے نے ان کے اصرار
کرنے پر، کسانوں کے انداز میں شرماتے ہوئے ایک سادہ سی سطر پیش کی جو دفتراً ان دونوں کو
بے حد بھاگتی اور وہ اس پر متفق ہو گئے۔ اسی وقت نعیم نے سیاہ روغن کے ساتھ تختی پر لکھا:
”یہاں نعیم اور اس کی بیوی رہتے ہیں۔“ اور سوکھنے کے لیے دھوپ میں رکھ دیا۔ پھر اس نے

سگریٹ سلکایا اور مسرت اور سکون کے ساتھ صبح کی دھوپ کو ٹانگوں پر پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔

موزے بنتے ہوئے عذرا بار بار اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کوئی بات کرنا چاہ رہی تھی۔ نعیم اونگھ رہا تھا۔ اس کا بھاری جسم مونڈھے پر پھیلا اور سر چھاتی پر جھکا ہوا تھا۔ دھوپ اس کی ٹھوڑی تک پہنچ چکی تھی اور ایک کان ایک کال تپش سے لال ہو رہے تھے۔ اوپر کے ہونٹ پر پسینے کے تھے تھے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کا سگریٹ ہیپیل کے ایک زرد پتے پر گرا تھا اور سگریٹ اور پتا دونوں لاکھ ہو چکے تھے اور ان پر مکڑی کا ایک باریک تار چمک رہا تھا۔ مونڈھے کی پشت پر ایک تھی سی سبز رنگ کی چڑیا بیٹھی تھی جو کبھی کبھی پھدک کر اس کے کندھے پر آ بیٹھتی، لیکن اس کی غنودگی میں، جو دھوپ کی آرام دہ حرارت، تازہ ہوا، قوت بخش کھانے اور جسمانی آسودگی کا نتیجہ تھی، چڑیا کی مداخلت سے کوئی فرق نہ آیا۔ قریب سے بہتی ہوئی نالی میں سطح آب پر دھوپ کی چنگاریاں برس رہی تھیں۔

آخر اس کی گہری نیند سے بے چین ہو کر عذرا نے اون کے گولے اور سلائیاں مونڈھے پر رکھیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ جھڑے ہوئے پتوں پر اس کے چلنے کی آواز سے نعیم کی آنکھ کھل گئی۔

”اوہ۔ میں سو گیا تھا!“ وہ ہنسا۔

”دھوپ آگئی تھی۔“ عذرا نے سرسری طور پر کہا۔ پھر وہ بے چینی سے مڑ کر باغ میں داخل ہو گئی۔

دیر تک وہ خنک، سایہ دار راستوں پر گھومتے رہے۔ دھوپ میں سے اٹھنے کے بعد درختوں کا سایہ انہیں آرام دہ اور بھلا محسوس ہوا۔ دوپہر سے پہلے کا آسمان روشن اور چمکدار تھا اور فضا بے حد خاموش اور شانت۔ راستوں کے ساتھ ساتھ پانی کی نالیاں اپنے مخصوص دھیمے شور کے ساتھ بہ رہی تھیں اور درختوں کی چوٹیوں پر اڑتی ہوئی سبز چڑیوں کے پر دھوپ میں چمک رہے تھے۔

ہریالی اور سکون کے اس لمحے میں اگر کسی جان دار کے دل میں بے چینی تھی تو وہ عذرا تھی۔ لکڑی کے پھانک پر جھک کر وہ بولی: ”جلیانوالہ باغ کا واقعہ سنا؟“

”ہاں۔“ نعیم نے کہا۔ ”مگر مجھے تفصیلات معلوم نہیں ہوئیں۔ بہت آدمی مرے؟“

”ایک ہزار کے قریب موتیں بتلاتے ہیں۔ ابھی تو مارشل لا لگا ہے۔ مکمل بلیک

آؤٹ۔ پنجاب میں ہر طرف سے داخلہ بند ہے۔“

وہ لکڑی کے جھکے پر جھکی رہی۔ نعیم سامنے فصلوں میں سے گزرتی ہوئی ایک جوان کسان عورت کو دیکھ رہا تھا۔ عورت نے سر پر مٹی کا دونا اور روٹیوں کی چنگیر اٹھا رکھی تھی اور ہلکی

ہوئی فصل میں سے گزرتے ہوئے اس کا سر اور کندھے منظر آ رہے تھے۔ ایک کوا بڑی آہستگی سے چنگیر میں آکر بیٹھا اور روٹیوں پر چونچ مارنے لگا۔ نعیم مسکرا کر اس وقت تک کوئے اور عورت کو دیکھتا رہا جب تک کہ وہ منظر سے غائب نہ ہو گئے۔

”شاید خلافت کے سلسلے میں ہوا۔“ پھر اس نے کہا۔

”خلافت اور رولٹ ایکٹ۔“

”ارر۔ رولٹ ایکٹ؟“

”ہاں۔ تم نے تو اب اخبار پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں رولٹ ایکٹ۔ کا بھی پتا نہیں!“ عذرا نے جھلا کر بات ختم کر دی۔

”نعیم ناک کو چھو کر شرمندگی سے ہنسا۔“ رولٹ ایکٹ! دراصل میں مصروف۔“

”مصروفیت کی بات نہیں۔ تم یوں ہی لا تعلق ہوتے جا رہے ہو۔“

عذرا نے تیزی سے کہا اور چل پڑی۔

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے آگر مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ عذرا موزے بننے لگی اور نعیم نے سکریٹ سلکایا۔ لیکن جلد ہی عذرا سلائوں پر اٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگی اور اس کی ذہنی کشمکش اوپر آگئی۔ اس نے جلد جلد کئی بار نعیم کی طرف دیکھا، آخر دونوں ہاتھ گود میں رکھ دیے۔

”تم جنگ پر سے لوٹ کر دو سال تک کیا کرتے رہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں؟۔“ کانگرس کی طرف سے کام کرتا رہا۔“

وہ پھر سلائوں پر جھک گئی۔

”کیوں؟“ نعیم نے پوچھا۔

”مجھے علم ہے۔“

”پھر؟“

”اب کیوں نہیں جاتے؟“

نعیم نے تعجب سے اسے دیکھا۔ غنودگی جو ابھی تک اس پر چھائی ہوئی تھی دفعتاً غائب ہو گئی۔ ”پگھلی ہو؟ تمہیں چھوڑ کر میں کہاں جاؤں!“

عذرا نے سر اٹھا کر اپنی بھوری، مضطرب آنکھوں سے نعیم کو دیکھا۔ ”کیوں کیا ہندوستان آزاد ہو گیا؟“

نعیم کے دل میں ایک بہت پرانے خوف نے سر اٹھایا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ امن اور سکھ کی اس گھڑی میں ایک فرد واحد کے اضطراب اور بے چینی نے متعدد بیماری کی طرح ہر شے کو گرفت میں لے لیا تھا۔ نعیم نے پیپل کے تے پر ہاتھ رکھ کر نالی میں تھوکا۔ اس کے سینے

میں ایک بھاری، بے نام سی خلش ابھر رہی تھی۔

عذرا اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ ”نعیم۔“ اس نے آنکھیں اٹھا کر کہا اور نعیم نے دیکھا کہ ان میں اس عورت کی، ہزار عورتوں کی بھرپور قوتیں یکجا تھیں۔ اتہائی کوشش سے وہ ذرا سا مسکرایا۔

”چلو چلیں۔“ عذرا بولی۔

”کہاں؟“

”امر تسر۔ دونوں! ہیں، نعیم؟“

”عذرا۔ یہ زندگی آسان نہیں ہے۔ تم نہیں جانتیں۔“

”لیکن اتنی دلچسپ ہے۔ اس بار دلی گئی تو ڈیسائی سٹرز نے بدیشی مال کی دکانوں پر

پکھنگ کی تھی۔ ان کی تصویریں سارے بڑے بڑے اخباروں اور رسالوں میں چھپیں۔ اور

جہاں بھی میں گئی انہیں کا تذکرہ رہا۔ ہر موقع پر، ہر پارٹی میں۔ تم کانگریس پارٹی کے ممبر

ہو۔ ہم آسانی سے جا سکتے ہیں۔ نہیں۔ نعیم؟ ہم دونوں۔ ہیں، نعیم؟“ اس نے لجاجت

سے دونوں ہاتھ اس کے بازو پر رکھے۔ ”میں اس جگہ سے اکتا گئی ہوں۔“

نعیم نے اس کے کندھوں کے گرد بازو لپیٹ کر اپنی طرف کھینچا اور مسکرا کر بولا۔

”اچھا۔“

راستوں کے ساتھ ساتھ نالیوں میں بہتا ہوا پانی خاموش فضا میں اپنی مدھم مویستی بکھیرتا

رہا، اور اس کے اوپر اسی خاموشی سے انسانی خواہشات کی آفت نے نعیم اور عذرا کو اپنی گرفت

میں لے لیا اور وہ خوشی خوشی جا کر موٹھوں پر بیٹھ گئے۔

ذہنی اور اعصابی آسودگی کے اس وقت میں نعیم نے اپنی بیوی کی بات کو لہروائی سے سنا

اور ٹال دیا۔ لیکن آنے والے دنوں میں عذرا کے حواس پر اس طاقتور خواہش کا جادو سوار رہا

اور ہر کام اور ہر بات اس نے بے خیالی اور بے دلی سے کی سوائے اس ایک بات کے، یہاں تک

کہ آہستہ آہستہ نعیم پر بھی اس کا رنگ چڑھنے لگا۔

وہ انکوائری کمیٹی میں شامل کر لیا گیا جو انڈین نیشنل کانگریس نے غیر سرکاری طور پر امرت

سرفائرنگ کی تفتیش کے لیے مقرر کی تھی، اور مارشل لاء کی پابندیاں ہلتے ہی وہ امر تسر پہنچے۔

(۱۹)

”یہ ہے وہ جگہ۔“ کبڑے بڈھے نے ہاتھ سے اشارہ کر کے انہیں بتایا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں انہوں نے سارا دن بسر کیا تھا اور اس سے پہلے کئی ایسے دن گزارے

تھے۔ ایک کھلی سی جگہ کے گردا گرد چار فٹ اونچی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں کنواں کھدا تھا۔ یہ جگہ تین اطراف سے اونچے اونچے سہ منزلہ مکانات میں گھری ہوئی تھی۔ ایک طرف سے راستہ باہر کو نکلتا تھا۔ یہ جگہ، جو جلیانوالہ باغ کہلاتی تھی، باغ سے زیادہ مویشی باندھنے کا باڑہ معلوم ہوتی تھی۔ یہاں پر انہوں نے پچھلے چند روز فائرنگ کے سلسلے میں اخباری نمائندوں، سائسی ورکروں، تاجروں اور وکیلوں کے بیانات قلمبند کرنے میں صرف کیے تھے۔ لیکن آج اتفاق سے راستے میں انہیں یہ بوڑھا مچھلی فروش مل گیا تھا جو باتیں کرنے کے شوق میں اس وقت انہیں وہاں لے آیا تھا جب کہ ان کے پاس کاغذ اور پنسل ختم ہو چکے تھے۔

وہ ٹھکنے جسم اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ والا کبڑا بڈھا تھا جس کی کمر کے خم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ پیدائشی تھا یا بڑھاپے کی وجہ سے نمودار ہوا تھا۔ اس کا لباس خستہ حالت میں تھا اور جسم سے مچھلی کی بو آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اور داڑھی کے بال بھی گندے تھے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کی توانائی اور معصومیت تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اکیلے پیدا ہوتے ہیں اور اکیلے ہی مر جاتے ہیں مگر جنہیں اپنی سادگی اور خوش دلی کی بنا پر لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور باتیں کرنے کے کافی مواقع میسر آتے ہیں۔

ان کے دیکھتے دیکھتے وہ نوجوانوں کی طرح اچک کر دیوار پر چڑھا اور دونوں پاؤں جوڑ کر آرام سے بیٹھ گیا۔

”یہ ہے وہ جگہ، میرے بچو۔“ اس نے اسی انداز میں ہاتھ پھیلا کر دھرایا۔ ڈھلتی ہوئی زرد دھوپ میں سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے لیکن جلیانوالہ باغ پر مکمل ویرانی تھی۔ صرف دو گورے سپاہی کمر سے ریوالور لٹکائے اندر گھوم رہے تھے۔ دیوار پر چڑھ کر بیٹھے ہوئے اس قدیم، سال خوردہ بڈھے کو اس کے ساتھیوں نے اشتیاق سے دیکھا اور انہیں محسوس کیا ہو وہ ایک اجاڑ اور خشک سمندر کے کنارے پر کھڑے ہیں اور تہہ میں ڈوبے ہوئے شکستہ جہاز اور کشتیاں تنگی ہو گئی ہیں۔

عذرا نے سہم کر دونوں ہاتھ دیوار پر رکھے۔ ”ہمیں سب کچھ بتاؤ، مچھلی والے۔“ اس نے کہا۔

”ہمیں سب کچھ بتاؤ جو ہوا، بوڑھے مچھلی والے۔“ ان سب نے کہا۔ ”میں تو مچھلی بیچتا ہوں، بچو، شروع سے۔ جب سے میں پیدا ہوا۔ نہیں، بلکہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا۔ کیونکہ جب میں پیدا ہوا اس وقت تو میرا باپ مچھلی بیچتا تھا اور میری ماں انہیں نمک لکایا کرتی تھی تاکہ وہ تازہ رہیں اور ان میں سڑانڈ پیدا نہ ہو۔ وہ بڑی اچھی اور نیک دل عورت تھی۔ میرا باپ اسے پیٹتا کرتا تھا اور وہ مجھے پیٹتی تھی۔ لیکن سال کا زیادہ تر حصہ ہم امن اور سکون کے ساتھ رہتے تھے۔ مارپیٹ صرف اس وقت ہوتی تھی جب مچھلیاں

میرے باپ کے ہاتھ نہ لگتیں۔ مجھے یاد ہے کہ گرمیوں کا موسم جنگ اور مصیبت کا زمانہ ہوتا جب کہ دریا میں سیلاب آ جاتا اور مچھلیاں گدے پانی میں بہت نیچے چلی جاتیں اور جال کے پھندے میں نہ آتیں۔ پھر میرا باپ سخت خفا ہوتا۔ دریا میں وہ مچھلیوں کو کوستا اور جال کو اور کستی کو اور سورج کی تپش کو کوستا اور برابر غصے سے میری جانب دیکھتا جاتا اور مجھے ٹھونکنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا۔ لیکن میں ہمیشہ اس کے پنچے سے بچ نکلتا کیونکہ میں اس کی طرف پیٹھ کیے چپو چلاتا جاتا اور اس کے کوسنے ایک کان سے سن کر دوسرے کان اڑا دیتا اور جب کنارہ آتا تو پوری قوت سے دوڑتا اور جلد ہی اس کی زد سے باہر ہو جاتا۔ پھر میں تمام دن گھر کا رخ نہ کرتا کیونکہ مجھے علم ہوتا کہ وہاں افراتفری کا عالم ہوگا۔ میں مچھیروں کی جھونپڑیوں سے پرے پرے گندے پانی کے گڑھوں پر مارا مارا پھرتا اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑ کر چباتا رہتا۔ سیلاب کے دنوں میں میں ہمیشہ نمک کی ڈلی جیب میں رکھتا کیونکہ کچی مچھلیاں نمک کے بغیر آسانی سے نہیں کھائی جا سکتیں۔ پہلے پہل کچھ دقت ہوئی پھر بعد میں عادت ہو گئی اور میں مزے لے لے کر انہیں کھانے لگا۔ وہ میرے جسم میں بے انتہا گرمی اور خون پیدا کرتیں۔ پھر شام ہونے پر میں گھر جاتا اور دروازے کے باہر اندھیرے میں کھڑے ہو کر دیکھتا۔ ماں کی سوجی سوجی آنکھیں دیکھ کر مجھے علم ہو جاتا کہ اس کی ٹھکائی ہوئی ہے۔ جب میں باہر کھڑا کھڑا نیند کے چکولے کھانے لگتا تو اپنے کتے کے پلے کو زمین پر دے مارتا جس پر وہ چنچنے لگتا اور میری ماں کو میری آمد کا پتا چل جاتا۔ لیکن وہ کافی ہوشیار ہوتی تھی، اس لیے وہ بہانے بازی سے کام لے کر پیسار بھری آواز میں مجھے پاس بلاتی اور کوئی کام کرنے کو کہتی، مثلاً یہ کہ کتا سویر سے بھوکا ہے۔ اس کے لیے مچھلی لے جاؤ۔ جب میں اندر داخل ہوتا تو وہ دروازے کی اوٹ میں سے نکل کر مجھے پکڑ لیتی اور میرے کان مروڑتی اور آنکھیں نکال کر مجھ پر چیختی اور مجھے آوارہ گرد، کام چور اور بد بخت کے ناموں سے پکارتی۔ یہ تقریباً تقریباً وہی نام تھے جن سے میرا باپ ٹھونکتے وقت اسے مخاطب کیا کرتا تھا۔ پھر وہ میرے منہ پر زور زور سے طمانچے مارتی۔ پہلے پہل میں سچ مچ رو دیا کرتا، لیکن بعد میں جب میں عادی ہو گیا تو جھوٹ موٹ شور مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیتا اور میرا باپ نیند سے اٹھ کر ہم دونوں کو گالیاں دیتا۔ وہ چند ہفتے سخت آفت اور بد امنی کے ہوتے۔

”ایک بار جب سیلاب بہت عرصے تک جاری رہے اور مفلسی کے مارے ہمارا برا حال ہو گیا اور ہمارے سارے کتے فاقے سے مر گئے تو میرا باپ بے حد چڑچڑا ہو گیا اور بہانہ تلاش کرنے کی تکلیف کیے بغیر مجھے پٹینے لگا۔ تب میں نے ایک تجویز سوچی۔ ایک روز حسبِ معمول جب کوئی مچھلی ہمارے ہاتھ نہ لگی تو میرے باپ نے خالی جال کستی میں دے مارا اور ساری دنیا کو کوستے ہوئے میرے سر پر کھڑا ہو کر مجھے ٹھونکنے کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے چپو سر سے اویر اٹھا

کر اپنا پچاؤ کیا اور کہا :

”ٹھیرو بابا - میری بات سنو۔“

”اس نے ہاتھ روک لیا اور خفگی سے چھینکیں مارتا اور کھنکارتا ہوا مجھے گھورنے لگا۔ میں نے کہا: دیکھو۔ اگر تم مجھے مارو گے تو میں کشتی نہیں چلاؤں گا۔ پھر کیا کرو گے؟“

”میں خود کشتی چلا لوں گا۔ اس نے سٹریل مزاجوں کی طرح جواب دیا۔

”اور مچھلیاں کون پکڑے گا؟“ میں نے جیلہ جوئی کی۔

”مچھلیاں؟“ اس نے داڑھی میں اٹھکیاں ڈال کر سوچا۔ پھر کوسنے دے کر کہنے لگا:

”مچھلیاں ملتی کہاں ہیں۔“ میں نے فوراً کہا: ”جب سیلاب کم ہو گا پھر؟ پھر کون پکڑے گا؟“

”وہ اسی طرح داڑھی میں اٹھکیاں ڈالے سوچتا رہا، پھر خاموشی سے جا کر جال پر بیٹھ گیا۔

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی کیونکہ اس کے بعد اس نے کبھی مجھ پر ہاتھ نہ اٹھایا۔

”لیکن بدامنی کا زمانہ زیادہ دیر تک نہ رہا۔ کیونکہ جاڑوں کی آمد کے ساتھ ساتھ پہاڑوں پر برف بگھلنی بند ہو جاتی اور دریا کا پانی صاف ہو جاتا اور مچھلیاں اوپر آ جاتیں اور ایک بار پھر ہمارے پاس سینکڑوں کی تعداد میں مچھلیاں جمع ہو جاتیں جنہیں میری ماں تک لگا کر خشک کرتی اور بوریوں میں بھر دیتی اور ہم چند نئے کتے پال لیتے اور میرا باپ خوش مزاج ہو جاتا اور ہم تمام جاڑے، خزاں اور بہار کے موسم مکمل صلح کے ساتھ شریف اور امیر لوگوں کی طرح بسر کرتے، اور ہر روز شام کے وقت میری ماں آگ کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ باندھ کر چھت کی طرف دیکھتی اور کہتی: تیرا شکر ہے مالک کہ سیلاب گرمیوں میں آتے ہیں اور جاڑوں میں نہیں آتے ورنہ اگر سردیوں میں مچھلی نہ ملے تو پھپھڑے کا بخار ہو جائے یا جوڑوں میں درد شروع ہو جائے، اور اوپر سے تو تو میں میں جو ہو وہ الگ، تیرا شکر ہے، اپنی پٹائی کو وہ ہمیشہ تو تو میں میں کے نام سے یاد کرتی۔“

بڈھا سانس لینے کے لیے رکا تو پانچوں سننے والوں نے جس بے تابی کا اظہار کیا اس سے واضح تھا کہ اس کی بے تکی باتوں نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔

”ہمیں فائرنگ کے متعلق بتاؤ، مچھلی والے۔“ سب نے ایک ساتھ کہا۔

”ٹھیرو۔“ بڈھے نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا۔ ”سب کچھ بتاؤں گا۔

رات کے آٹھ بجے تک ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں۔ مجھے یاد کرنے دو۔ آج کئی روز کے بعد تم لوگ بات کرنے کو ملے ہو ورنہ اس شہر میں ایک سے ایک ہونق ہو رہا ہے۔ جس کسی سے بات کرو لگتا ہے جیسے قبر سے اٹھ کر آ رہا ہے اور بول نہیں سکتا۔ حالانکہ میں نے اس سے کہیں زیادہ آدمی وبا میں مرتے ہوئے دیکھے ہیں۔ تو میں اپنی ماں کی بات کر رہا تھا۔ وہ بڑی نیک دل، ہوشیار اور خدا پرست عورت تھی۔ لیکن وہ جلد ہی مر گئی اور اس کا سارا کام ہمارے گلے پڑ گیا۔

پھر ہمیں اس کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔ اب میرا باپ اکیلا ہی کسی نہ کسی طرح سے مچھلیاں پکڑ کر لاتا اور ہمیں ان کو نمک لگا کر دھوپ اور چھاؤں میں سکھاتا اور تھیلوں میں بھرتا۔ رات کو ہم آمنے سامنے بیٹھ کر خشک مچھلیاں مریچوں کے ساتھ کھاتے۔ میرے باپ کو بڑھاپے کی وجہ سے کبھی کبھی مچھلیاں کھانے کی عادت نہ پڑ سکی اور وہ جب تک زندہ رہا اسی تکلیف میں مبتلا رہا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ آگ جلانے میں ہم میں سے کوئی بھی ماہر نہ تھا۔ مجھے مزے لے لے کر مچھلیاں چباتے ہوئے دیکھ کر وہ انتہائی خفا ہوتا اور کہتا: 'جانور کے بچے، مگر مجھ کے بچے، کیسے مزے لے رہا ہے!' اس پر میں ہنس کر کہتا: 'بابا تم مچھیرے ہو اور مچھلی نہیں کھا سکتے۔ کیسے مچھیرے ہو!'

”میں انسان کی اولاد ہوں، جانور کی اولاد نہیں ہوں۔، وہ کہتا کبھی کبھی اسے جلانے کے لیے میں کہتا: 'میں زندہ مچھلی بھی کھا سکتا ہوں۔ تم کھا سکتے ہو؟'

”چپ رہو۔ تم بکتے ہو۔“ وہ کہتا۔

”اچھا؟‘ میں کہتا، ”تو یہ لو۔“ یہ کہہ کر میں لکڑی کی بالٹی میں، جس میں مچھلیاں پالا کرتا تھا، ہاتھ ڈال کر ایک زندہ مچھلی نکالتا اور منہ میں پکڑ لیتا۔ میرے دانتوں کے درمیان تڑپتی ہوئی مچھلی کو دیکھ کر وہ غصے سے پاگل ہو جاتا اور ایک لمبی سی خشک مچھلی اٹھا کر میرے پیچھے دوڑتا۔ میں خشک مچھلی کے ڈر سے، جو کہ بید کی طرح لگتی ہے، باہر بھاگ جاتا اور اندھیرے میں کھڑا ہو کر اس کی غصیلی آواز سنتا رہتا: 'کیسا زمانہ آگیا ہے۔ سانپوں اور سؤروں کے بچے انسانوں کے گھر پیدا ہونے لگے ہیں۔ ایسا کبھی سنا تھا! زندہ مچھلی کو۔۔۔ زندہ آدمی کھاتا ہے۔ ایک زندگی دوسری زندگی کو۔۔۔' میں باہر کھڑا ہو کر خاموشی سے ہنستا اور مچھلی کھاتا رہتا۔ “بڈھا بازو ہوا میں پھیلا کر ہنسا جس سے اس کے آخری تین دانت، جو اس کے منہ میں رہ گئے تھے، تنگے ہو گئے اور آنکھوں کے گرد جھریاں پڑ گئیں۔ اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس کرنے کے باوجود سننے والے وقت کی کمی کی وجہ سے گہرائے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ادھر ادھر کی باتیں چھوڑ کر جلد اصل موضوع پر آجائے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں بڈھے نے بات جاری رکھی:

”لیکن جلد ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ گھر کا کام چلانے میں ہم کس قدر ناکام رہے ہیں۔ تمام مچھلیاں جو میں سکھا کر بوریوں میں بھرتا دو دن کے بعد بو دینے لگتیں اور انہیں گھر میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ چونکہ وہ بیچنے کے قابل بھی نہ ہوتیں اس لیے جتنی ہم کھا سکتے ایک دو روز میں جلد جلد کھا لیتے، باقی کلی سڑی مچھلیاں دریا میں بہا دیتے۔ اس کے بعد میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ہماری روزانہ کی آمدنی میں نمایاں کمی ہوتی جا رہی ہے، اور ایک وقت آیا کہ جتنی مچھلی گھر میں آتی روز کی روز ہم ہضم کر جاتے۔ خشک مچھلی کے مقابلے میں میرے باپ کو تازہ کچی مچھلی

زیادہ بھاگتی جس کی چربی نرم اور نکمیں ہوتی ہے۔ چنانچہ ادھر وہ چند مچھلیاں لا کر رکھتا ادھر کھڑا کھڑا چٹ کر جاتا۔ میں نے سوچا یوں کام نہیں چلے گا۔ آخر ایک دن کچھ اپنی کچھ اپنے باپ کی نا اہلی پر جھلا کر میں نے جھونپڑی کا دروازہ بند کیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

”ماگھ کا مہینہ تھا، یا شاید پھاگن کا۔ مجھے یاد ہے پہاڑوں پر برف جمی تھی اور دریا کا شفاف پانی تہہ کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس میں دوڑتی بھاگتی ہوئی مچھلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں کستی چلا رہا تھا اور میرا باپ میری طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو چکی تھیں اور ان پر زرد زرد نسیمیں ابھر آئی تھیں۔ لیکن موسم بڑا شان دار تھا۔ دریا اور آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا اور ہوا ہمارے بال اڑا رہی تھی اور میرے باپ کے اڑتے ہوئے بال برف کی طرح سفید تھے اور دھوپ میں خوش نما لگ رہے تھے اور ہوا کی وجہ سے جو ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں ان پر ہماری کستی ڈول رہی تھی۔ چلتے چلتے ہم مچھلیوں کے خطے میں داخل ہوئے۔ یہاں پر دریا، کنارے کو کاٹتا ہوا بہت اندر تک چلا گیا تھا اور ٹھیرے ہوئے پانی کی ایک تھی سی جھیل کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہاں پر ہم نے ہزاروں کی تعداد میں مچھلیاں دیکھیں۔ رنگ برنگ کی، چھوٹی بڑی، قسم قسم کی مچھلیاں پانی میں کھیل رہی تھیں اور دھوپ چھن چھن کر ان کے جسموں پر پڑ رہی تھی۔ میرے باپ نے جال پھینکا۔ مچھلیوں میں افراتفری مچ گئی۔ جال میں بہت سی بڑی بڑی مچھلیاں آئیں اور انہیں کستی میں لاد کر ہم واپس لوٹے۔ میں بے حد خوش تھا اور تیز تیز چپو مار رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ میرے باپ نے جال میں ہاتھ ڈال کر کلبلاتے ہوئے ڈھیر میں سے ایک مچھلی نکالی اور اسے ہاتھ میں پکڑے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ بڑی خوبصورت مچھلی تھی۔ اس کا رنگ گہرا نیلا اور اوپر بڑے بڑے سنہری رنگ کے چانے تھے۔ وہ گردن کے پر پھلا پھلا کر سانس لے رہی تھی اور کھلی ہوئی آنکھوں سے جانے کدھر دیکھ رہی تھی۔

”پانی خوب صورت ہے۔ میرے باپ نے آہستہ سے کہا۔ ”میرا گھر بد صورت ہے۔ تو اپنے گھر جا۔“ میرے باپ نے کہا اور ہاتھ لٹکا کر اسے پانی میں چھوڑ دیا۔ مجھے اس کی اس احمقانہ حرکت پر بڑا تاؤ آیا اور میں نے اسے متوجہ کرنے کو ناک میں نے آواز نکالی۔ لیکن وہ گہری سوچ میں تھا۔ پھر اس نے دوسری مچھلی اٹھائی۔ اس کا جسم قرمزی رنگ کا تھا اور اوپر سیاہ لکیریں تھیں اور اس کی آنکھوں کا رنگ سرخ تھا اور دم بھی سرخ تھی۔ تم خوبصورت ہو۔ میرا گھر بد صورت ہے۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ۔ میرے باپ نے کہا اور اسے بھی چھوڑ دیا۔ پانی میں داخل ہوتے ہی مچھلی نے تیزی سے دم چھنکی اور تہہ میں چلی گئی۔ پھر میرے باپ نے ایک اور مچھلی اٹھائی جس کی جلد سفید ریشم کی طرح تھی اور جس پر دنیا کے ہر رنگ کے نقطے اور لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کا سر اور آنکھیں اور ہونٹ بھی سفید تھے۔ میرے باپ نے یہ کہہ کر اسے بھی چھوڑ

دیا: ”تم بھی خوبصورت ہو۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ۔ مجھے پیٹ بھرنے کے لیے بس چند ایک نکمی اور بد صورت پمچھلیوں کی ضرورت ہے۔“

”غرضیکہ کنارے پر پہنچنے سے پہلے پہلے تمام عمدہ عمدہ پمچھلیاں اس نے ضائع کر دیں۔ میں خاموش بیٹھا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ مگر دل میں میں مطمئن تھا کہ بالآخر مجھے روزانہ کے نقصان کا راز معلوم ہو گیا ہے۔ کنارے پر اتر کر میں نے اس سے کہا: دیکھو بابا تم کل سے گھر پر رہو گے۔ دریا پر میں جاؤں گا۔“

”کیوں؟“ اس نے خفگی سے پوچھا۔
 ”کیوں؟“ میں چیخ کر بولا۔ ”تم ساری پمچھلیاں تو ضائع کر دیتے ہو۔ کیوں!“ میں غصے سے کانپ رہا تھا۔ میری عمر اس وقت گیارہ برس کی تھی لیکن میرے تیور دیکھ کر وہ ڈر گیا اور خاموشی سے سر جھکا کر آگے آگے چلنے لگا۔ راستے میں اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا: ”جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے اور تمہاری عورت مر جائے گی تو تمہیں پتا چلے گا۔“ میں غصے میں تھا اس لیے اس کی بات کے جواب میں خاموش رہا۔

”اس کے بعد وہ ہمیشہ گھر پر رہتا اور میں دریا پر جاتا۔ ہمارے پاس پھر پمچھلیوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا اور پمچھیروں کی بستی میں ہم ایک بار پھر متمول خاندانوں میں شمار ہونے لگے۔ مگر اب میرا باپ بوڑھا اور اندھا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سارا سارا دن چھاؤں میں پمچھلیوں کو پھیلانے کی رکھوالی پر بیٹھا رہتا اور دوسرے پمچھیروں کو لڑنے جھگڑنے سے منع کرتا اور جو لوگ اپنی عورتوں کو پیٹتے ان کو نصیحت کرتا کہ عورتوں کو پیٹنا نہیں چاہیے ورنہ وہ مر جاتی ہیں اور پھر بڑھاپے میں کچی پمچھلیاں کھانے کی لعنت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

”اسی طرح جب میں سن بلوغت کو پہنچا تو وہ مر گیا۔“
 بڑھا سانس لینے کے لیے رکا اور سادگی سے ہنس کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے تین دانت پھر نمودار ہو گئے۔ اب وہ سب اس بڑھے کے باتونی پن اور اس کی باتوں سے اکتا چکے تھے اور نعیم تو اس سے کوئی فائدہ مند تفصیلات حاصل کرنے کی امید قطعی طور پر کھو چکا تھا۔ صرف عذرا، جسے نعیم یا اس کے ساتھیوں کے کام سے زیادہ سروکار نہ تھا، اس سے دلچسپی لے رہی تھی۔

”پھر، پمچھلی والے؟“ عذرا نے کہا۔

”ہمیں تیرہ اپریل کا واقعہ بتلاؤ، پمچھلی والے، ورنہ ہم چلے جائیں گے۔“ مردوں میں سے

ایک نے کہا۔

”اوہ اچھا اچھا۔ میں آٹھ بجے سے پہلے پہلے سب کچھ بتا دوں گا۔ میرے پچو۔ گھبراؤ

مت، کیونکہ آٹھ بجے تمہیں چلے جانا ہو گا۔ اُس وقت یہاں کرفیو شروع ہو جاتا ہے۔ جب میرا

باپ مرگیا تو میں اکیلا رہ گیا۔ پھر میں نے گھر کے کام کے لیے ایک عورت کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن بد قسمتی سے میرا قد بہت چھوٹا رہ گیا تھا۔ جو بھی عورتیں مجھے ملیں بہت قد آور نکلیں اور انہوں نے میرے ساتھ رہنا پسند نہ کیا۔ جو دو ایک عورتیں راضی ہوئیں وہ بد مزاج نکل آئیں، اور بد مزاج عورتیں، تم اتنے ہو پچو، مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے عورتوں کی تلاش میں وقت ضائع کرنا ترک کر دیا۔ پھر میں نے اپنے باپ کی ٹوکری نکالی اور اس میں روزانہ کی تازہ مچھلیاں ڈال کر بیچنے لگا۔ اب گھر کا کوئی کام نہ تھا اور عورت کی ضرورت نہ تھی۔ میں خوش خوش اکیلا رہنے لگا اور اب تک رہتا ہوں۔ میرے پاس اب بھی میرے باپ کی ٹوکری ہے جس میں مچھلیاں بیچتا ہوں۔ حالانکہ اپنا گاؤں چھوڑ کر اب میں اس شہر میں آ گیا ہوں۔ میں نے آج تک کچی مچھلی اور اہلی ہوئی مکئی کے سوا کچھ نہیں کھایا۔ میں اس وقت تک اپنے باپ سے پانچ برس زیادہ دنیا میں رہ چکا ہوں۔ میں جلیانوالہ باغ میں سے کہیں بڑے موقعے دیکھے ہیں۔ سن ستاون کا غدر، جب میرا باپ نیا نیا فوت ہوا تھا، اور اس صدی کے شروع کا سرخ بخار، اور۔ اور، لیکن تم لوگ چونکہ اس واقعے کا اصرار کرتے ہو اس لیے میں تمہیں اسی کا قصہ سناؤں گا۔ میں اس دن کی اور اس سے پہلے کئی دن کی ایک ایک بات بتا سکتا ہوں۔ سن ستاون کے پچاس برس کے بعد غدر کی ایک ایک بات سن کر ایک شخص نے مجھ سے پوچھا تھا: ”تم کیا کھاتے ہو۔“ میں نے بتایا: ”مچھلی اور اہلی ہوئی مکئی۔“ تو وہ کہنے لگا: ”اسی لے تم عقل مند آدمیوں میں سے ہو۔“ بڑھے نے بیٹھے بیٹھے کمر سیدھی کی اور اندھیرے میں اس کے تین سفید دانت دکھائی دیے جس سے سننے والوں نے اندازا لگایا کہ وہ اپنے سادہ بے تکلف اور متکبرانہ انداز میں ہنس رہا تھا۔ ”بدامنی چوتھے مہینے کے نوے دن ہی شروع ہو گئی تھی جب شہر کے چار بازاروں میں نو انگریزوں کو مار دیا گیا۔ ہر بات میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ انہوں نے مجھے ٹھیرایا۔ وہ دو تھے۔ میں سمجھا مچھلی کے کالہک ہیں۔ خوشی میں نے ٹوکری نیچے رکھی۔ ایک وہیں کھڑا رہا، دوسرا کیمبرہ آنکھ سے لگائے لگائے پیچھے ہٹتا ہوا دور تک چلا گیا۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے تصویریں لیں۔ پھر جیب سے چاندی کا ایک سکہ نکال کر میری طرف اچھالا۔ سکہ ذرا غلط نشانے پر پڑا اور میں نے پاگلوں کی طرح ناچ ناچ کر اور گھوم کر اسے ہوا میں پکڑنے کی کوشش کی۔ اس نے اور تصویریں لیں۔ آخر سکہ زمین پر گر پڑا۔ جب میں اسے اٹھا چکا تو وہ جارہے تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے۔ اب۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کھلی کے موڑ سے دو آدمی ان پر حملہ آور ہوئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ ایک کی تلوار اس کے، جس نے تصویریں لی تھیں، پیٹ کے پار ہو گئی۔ دوسرے کی تلوار اس کے ساتھی کی پسلیوں میں اٹک گئی۔ دونوں گرتے ہی ختم ہو گئے۔ میں واقعے کی سرعت کی وجہ سے ششدر رہ گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ابھی میں نے ان غیر ملکیوں

سے روپیہ قبول کیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے وہ سؤر مجھ پر بھی حملہ آور ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے روپیہ اندرونی جیب میں رکھا اور ٹوکری اٹھا کر وہاں سے کھسک آیا۔ اگلے بازار میں میں نے تین اور لاشیں دیکھیں جو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پڑی تھیں۔ ان کے چہرے ابھی گرم تھے۔ وہ بھی تینوں غیر ملکی تھے، جن کے سنہرے بال خون اور گرد کی وجہ سے بدرنگ ہو رہے تھے۔ ان کے پاس کیمے نہیں تھے۔ کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے ہاتھ خالی تھے۔ بازار میں لوگ عجلت سے دکانیں بند کر رہے تھے۔ چند ایک لاشوں کے آس پاس کھڑے تھے اور ان کے چہرے بچوں کی طرح زرد اور خوفزدہ تھے۔ مجھے ان لوگوں کی حالت پر بڑا ترس آیا کیونکہ میں اس سے بھی بڑے بڑے موقعے دیکھ چکا تھا اور یہ صورت حالت میرے لیے معمولی تھی۔ چنانچہ ان میں دلچسپی لیے بغیر میں وہاں سے گزر گیا، بلکہ میں نے اپنا کاروبار بھی بند نہ کیا اور برابر مچھلی کی آواز لگاتا رہا۔ دربار صاحب کے بڑے دروازے کے سامنے میں نے ایک اور انگریز کو دیکھا جو مر رہا تھا۔ ایک پتلی سی چھری اس کی گردن کے آر پار ہو چکی تھی اور وہ اس کے دستے کو پکڑے جان کنی کی حالت میں سے گزر رہا تھا۔ دو پہر کے وقت شہر کا سب سے بڑا شہر چوک ویران پڑا تھا اور آس پاس کوئی جان دار دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں وہاں سے بھی گزر گیا۔ لیکن وہ بڑا خوبصورت لڑکا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود میں اسے دوبارہ دیکھنے سے باز نہ رہ سکا۔ راستے کے موڑ پر رک کر میں نے دیکھا۔ مرتے ہوئے اس شخص کا چہرہ آسمان کی طرف تھا اور نوجوان ہونٹ سرد ہو چکے تھے۔ بچو، تم خوش قسمت ہو کہ ابھی نوجوان ہو اور لا علم ہو۔ میں بڑھا مچھلی والا ہوں۔ لیکن ایک زمانہ گزار چکا ہوں اور زندگی کی چند ایک باتوں کا علم رکھتا ہوں۔ نوجوان چہرے، اور آنکھیں، اور ہونٹ دنیا کی خوش نما چیزیں ہیں۔ لیکن جب وہ سرد کر دیے جاتے ہیں۔ میں نے مچھلیاں دیکھی ہیں جو موت میں بھی آنکھیں کھول کر مسکراتی رہتی ہیں، مگر نوجوان۔ ان کی دوسری بات ہے۔ اس سے انسان کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کا خیال دل سے نکالنے کے لئے میں نے زور سے مچھلی کی آواز لگائی۔ اسی طرح کچھری تک پہنچتے پہنچتے میں نے تین اور لاشیں دیکھیں جو نالیوں کے کنارے اور پٹریوں پر پڑی تھیں۔ اور لاشوں کے علاوہ میں نے ایک آگ دیکھی، پوشیدہ اور خاموش آگ جو سڑکوں اور گلیوں اور بازاروں میں دوڑتے ہوئے شہریوں کے درمیان لپک رہی بھی آگ جو جسموں کے بجائے دلوں اور آنکھوں میں لگی تھی۔ ایک خوفناک غصہ جو تمام شہریوں کے سروں پر لہرا رہا تھا۔ اور میں تمہیں سچ بتاتا ہوں بچو، تم نے نہیں دیکھا میں نے دیکھا ہے۔ میں نے ہزار ہا مردہ انسان اور حیوان اور مچھلیاں دیکھی ہیں۔ اور سرخ وبا میں ایک ایک دروازے سے تین تین مردے بیک وقت نکلتے اور عورتوں کو ماتم کرتے ہوئے دیکھا ہے، اور جب ریل گاڑیوں کی ٹکر ہوئی تو میں وہاں پر موجود تھا اور میں نے دیکھا کہ ایک آدمی کی گردن کے پاس دوسرے کا سر پڑا تھا، اور میں نے جینتے چلاتے اور ایک دوسرے پر حملہ

کرتے ہوئے قافلوں کو دیکھا ہے مگر کبھی خوفزدہ نہیں ہوا، کبھی نہیں، کیونکہ اس میں خوفزدہ ہونے کی کوئی بات ہی نہیں، لیکن وہ خاموش اور دبا ہوا غصہ جو اس شہر کے ہر نفس، ہر جان دار اور ہر بیڑ میں سانس لے رہا تھا اسے دیکھ کر میں گھر چلا آیا۔

”اس وقت سے شہر کا تمام کاروبار بند ہو گیا اور سڑکوں پر اور بازاروں میں فوجی ٹرک اور گورے سپاہی پھرنے لگے اور شہر کے باشندے، جو چپے چپے پر بکھرے ہوئے تھے، اب گلیوں، کونوں اور محلوں کے اندر گروہوں میں اکٹھے ہونے لگے، جیسے ایک مچھلی کے جال کو قینچی سے بیچ میں سے کاٹ دیا جائے تو جگہ جگہ سے کچھوں میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اور انہی میں سے ایک گروہ تھا جس نے کہ بازار میں اس انگریز عورت کی بے حرمتی کی جو فساد کی جڑ بنی۔ یہ انتشار کا تیسرا روز تھا۔ میں حسب معمول مچھلیاں اٹھائے پھر رہا تھا۔ اور دل میں کڑھ رہا تھا کیونکہ ان میں سڑاند پیدا ہو چکی تھی اور مجھے ان سے نفرت ہو رہی تھی۔ لیکن میں نے ہوشیاری سے کام لے کر اب آواز لگانی بند کر دی تھی کیونکہ کئی دن گزر جانے پر اب ان میں خویساں کم ہی رہ گئی تھیں، اور اس امید میں انہیں لیے چپ چاپ پھر رہا تھا کہ شاید کوئی نیک دل شوقین انہیں خرید لے۔ بڑے بازار میں جب اس گلی کے مقابل پہنچا جو بازار کو سبزی منڈی کے ساتھ ملاتی ہے تو ٹھٹک کر رک گیا۔ گلی میں سے ایک گوری عورت دوڑتی ہوئی نکل رہی تھی۔ اس کے پیچھے شہریوں کا ایک گروہ شکاری کتوں کی طرح لگا ہوا تھا۔ بازار کے وسط میں انہوں نے عورت کو آیا۔ چاروں طرف سے اسے گھیرے وہ پلید نظروں سے اسے گھورتے رہے۔ عورت کے بال راکھ کے رنگ کے تھے اور اس کی اوڑھنی غائب تھی۔ اس کی ٹانگیں کچھڑ میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے درمیان کلدار گڑیا کی طرح بہت آہستہ آہستہ ایڑیوں پر گھوم رہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید مچھلی کی طرح بے جان تھا۔ کچھ دیر تک ہجوم خاموش رکا کپچلیاں چمکاتا رہا۔ پھر ایک شخص آگے بڑھا اور عورت کی قیض کو گلے سے پکڑ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دامن تک پھاڑ دیا۔ عورت نے چیخ ماری جس سے سارا طلسم ٹوٹ گیا اور مجمع اس پر پل پڑا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ بیس پچیس آدمیوں کے نیچے غائب ہو گئی لیکن اس کی چیخیں زمین کے ساتھ ساتھ مجھ تک پہنچتی رہیں۔ میرے سامنے وہ سب اسے کوؤں کی طرح نوچتے رہے۔ مگر وہ عجب سخت جان ربرٹ کی عورت تھی بھٹی واہ وا۔۔ میں نے اس سے زیادہ۔ عجیب و غریب عورت آج تک نہ دیکھی۔ ادھر ہجوم کا دباؤ ذرا کم ہوا ادھر وہ اچھل کر ان کے بیچ میں سے نکلی اور ایک طرف کو بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب اس کے بدن پر پھولدار قیض کہیں دکھائی نہ دیتی تھی، صرف اس کے چوتڑوں پر ہلکا سا زبر جامہ اور چھاتی پر عورتوں کے پہننے کا کپڑا لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے بال سر پر کھڑے تھے اور وہ ٹانگیں پھیلا کر پوری رفتار سے چڑیلوں کی طرح بھاگ رہی تھی۔ اس کے پلے ہوئے سفید کولہے اور رانیں ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہل رہی ہیں۔ آہ۔ اس وقت

مجھے خیال آیا تھا کہ یہ عورت اگر شام کے وقت گھر میں بیٹھ کر مچھلی کھا رہی ہو تو شاید آنکھوں کو بھلی لگے۔ آہ۔ اس کے بعد وہ گروہ اسی کھلی میں غائب ہو گیا۔ میں دل میں انہیں لعنت ملامت کرتا ہوا واپس چلا آیا۔

”اس رات پہلی بار مجھے اچھی طرح سے نیند نہ آئی۔ اس سے پہلے مجھے یاد نہیں کہ کبھی میری نیند میں گڑ بڑ ہوئی ہو۔ میں خوب سونے کا عادی ہوں کیونکہ نیند صحت کے لیے مفید ہوتی ہے۔ لیکن اس رات میں خشکی کے مارے ہوئے مریضوں کی طرح جاگتا رہا۔ پھر مجھے اپنی صحت کے متعلق بڑا فکر ہوا۔ پہلے میں نے آگ لا کر کمرے کو خوب گرم کیا۔ پھر بچی کھچی مچھلیوں کو آڑا ترچھا دیوار کے ساتھ کھڑا کیا تاکہ گلنے نہ پائیں۔ پھر کونے میں جا کر چٹائی پر لیٹ گیا جو کہ میری روزانہ سونے کی جگہ ہے۔ لیکن نیند نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ یہ شاید سڑاند کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ میں اٹھا اور مچھلیوں کو ایک ڈھیر میں اکٹھا کر کے ٹوکری کے نیچے ڈھک دیا۔ پھر اپنی مقررہ جگہ پر واپس آ کر داہنی کروٹ لیٹ گیا کیونکہ اس طرح میں گہری نیند سوتا ہوں۔ نیند پھر بھی نہ آئی۔ میں اٹھ کر چٹائی آگ کے قریب لے گیا۔ مگر چند ہی سانس لیے ہوں گے کہ گرمی کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اب میں اکڑوں بیٹھا تھا اور اپنی جسمانی حالت پر غور کر رہا تھا کہ سوچتے سوچتے مجھے ایک تجویز سوجھی۔ میں نے ٹوکری اٹھائی اور گندی مچھلیوں کو چن کر ایک طرف رکھا۔ ”نیند تو آتی نہیں۔ آؤ تم سے کہیں ہی ماریں۔“ میں نے کہا اور ایک سڑی ہوئی مچھلی اٹھائی۔ مچھلی کی باپھیں کھلی ہوئی تھیں۔

”میرا باپ زندہ ہوتا تو تمہیں مرنے سے پہلے ہی چھوڑ دیتا۔ لیکن میں تمہیں آسانی سے نہیں چھوڑنے کا۔ کان کھول کر سن لو“ میں نے کہا۔ تم لاکھ ہنسو، لیکن تمہارے بچے اور دوسرے رشتہ دار تمہاری موت پر آنسو بہا رہے ہوں گے۔“ مچھلی اسی طرح ہنستی رہی۔ مجھے اس پر غصہ آگیا۔ ”تم سوتی نہیں؟ بے آرام جانور۔ تمہیں مرے بھی ایک عرصہ ہو گیا پر بے دید آنکھیں اسی طرح کھلی ہیں۔ نہ خود سوتی ہو نہ کسی کو سونے دیتی ہو۔ لو۔ یہ کہہ کر میں نے اسے آگ میں اچھال دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں خشک مچھلی تر ترا کر جلنے لگی ہے۔ مگر اس کی آنکھیں اسی طرح کھلی تھی اور آگ میں پڑی ہوئی وہ ابھی تک ہنس رہی تھی۔ میں نے غصے میں دوسری مچھلی کو بھی اٹھا کر آگ میں پھینکا۔ یہ مقابلتاً سنجیدہ چہرے والی مچھلی تھی لیکن یہ بھی جاگ رہی تھی۔ جلتی ہوئی مچھلی کی چربی کی بو ہر طرف پھیل رہی تھی جو کہ، اگر تم نے کبھی سوچھی ہے پچو تو تمہیں پتا ہو گا کہ کافی اشتہاء آور ہوتی ہے۔ مگر آدھی رات کے وقت میں نے زیادہ کھانا مناسب نہ سمجھا اور بھوک کو کسی اور وقت پر ٹال کر ایک اور مچھلی اٹھائی۔

”تمہاری جلد بڑی خوبصورت اور نرم ہے۔ شاید کوئی کاکھ مل جائے۔ تم آرام کرو۔“

یہ کہہ کر میں نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔

”یہ تجویز کارگر ثابت ہوئی اور کافی دیر تک ان کے ساتھ گپ شپ کرنے اور ناکارہ مچھلیوں کو جلانے کے بعد میں خود بخود سو گیا۔“

”صبح جو سو کر اٹھا تو سورج سر پر آن پہنچا تھا اور باہر پہل پہل تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ آج کئی روز کے بعد سر دکھیں آباد ہوئی تھیں۔ میں نے اچھی طرح سے آنکھیں مل کر نیند کو دفع کیا۔ وہ سب بڑی جلدی میں تھے اور ایک ہی طرف کو جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مچھلی کی نیلامی شروع ہو چکی ہے اور وہ اس فکر میں ہیں کہ اچھی اچھی مچھلی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ لیکن ایک بات جس سے وہ مچھلی کے کاکھک معلوم نہ ہوتے تھے ان کی خاموشی تھی۔ وہ بات کیے اور شور مچائے بغیر تیز تیز چل رہے تھے۔ ان میں ہر قسم کے لوگ تھے؛ بڑھے جوان، چھوٹے، بڑے، پتلے موٹے، لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ سب کے رنگ زرد تھے اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہ رہے تھے۔ انہیں اسی حالت میں دیکھ کر مجھے جستجو ہوئی۔ جلد جلد ٹوکری میں مچھلیاں بھر کر باہر نکلا اور ان میں شامل ہو گیا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ دی، پھر میں نے بھی ہونٹ بھینچ لئے اور انہی کی طرح اکڑ کر چلنے لگا۔ وہ تعداد میں بے شمار تھے۔ آگے اور پیچھے حد نظر تک ان کی قطاریں تھیں اور وہ ہر طرف سے آرہے تھے۔ اسی طرح چلتے چلتے ہم بازار کے منہ پر پہنچ گئے۔ وہاں پر بہت سے مسلح گورے سپاہی کھڑے تھے۔ جب ہمارا ہجوم بازار میں داخل ہونے کو بڑھا تو انہوں نے نشستیں باندھ لیں اور ادھر ادھر بکھر کر میدان جنگ کی طرح مورچہ لگا لیا۔ ہم ڈر کر رک گئے۔ پھر بازار میں سے ہندوستانی لائٹھی بردار پولیس کا ایک دستہ برآمد ہوا جس نے ہم پر لائٹھیاں برسائی شروع کیں جو کسی کو لگیں کسی کو نہ لگیں، لیکن اس سے یہ ہوا کہ ہم بازار میں داخل نہ ہو سکے۔ ایک لائٹھی میری ٹوکری پر لگی جس سے وہ گر پڑی اور ساری مچھلیاں بکھر گئیں۔ انہیں اکٹھا کرتے ہوئے چند لائٹھیاں میری پیٹھ پر بھی پڑیں لیکن میں نے ساری مچھلیوں کو اکٹھا کر کے چھوڑا۔ جب میں اٹھ رہا تھا تو میرے کان میں گونج دار نعروں کی آواز آئی۔ یہ ایک دوسرا ہجوم تھا جو مخالف سمت سے آکر بازار میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس کو بھی لائٹھیوں کی مدد سے روکا گیا اور وہ ہمارے ساتھ آ ملا۔ ان کے آ کر ملتے ہی ہمارے لوگوں کی زبانوں میں جان پڑ گئی اور گونجا مجمع یکبارگی پوری طاقت سے چلا اٹھا۔ اب ہم ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ اور ایک لمبا چکر کاٹ کر اس طرف کو بڑھ رہے تھے جہاں اس وقت موجود ہیں۔ میرے چاروں طرف لوگ دھکم پیل کر رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ ان کے چہروں سے اب خوف و ہراس غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ خون اور جوش ابھر آیا تھا۔ ان کے منہ گرد آلود تھے اور بار بار دل دھلا دینے والی آواز میں کھل رہے تھے۔ ہم دیر تک اچھل اچھل کر اور پھلانگیں لگا کر چلتے ہوئے اور شور و غل مچاتے ہوئے سڑکوں پر بڑھتے رہے۔ راستے میں کئی چھوٹے چھوٹے ہجوم ہمارے ساتھ آ کر مل گئے اور کئی جگہ مسلح سپاہیوں

نے ہمیں روکنے کی کوشش کی -

”جب ہم یہاں داخل ہوئے تو باغ میں انسانوں کا ایک سمندر تھا جس کا کوئی کنارہ نہ تھا - ہم سے پہلے بھی یہ بھرا ہوا تھا، جب ہم داخل ہوئے تو بھی یہ بھرا ہوا تھا، اور ہم سے بعد میں بھی گھنٹوں اس میں لوگوں کا سیلاب داخل ہوتا رہا اور یہ بھرا ہی رہا - گرد کا ایک طوفان پاؤں تلے سے اٹھ کر سروں پر منڈلا رہا تھا - لاکھوں لوگوں نے قیامت کا شور مچا رکھا تھا اور انتشار کا یہ عالم تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوا جا رہا تھا - گرد میری ناک میں گھس رہی تھی اور میرے پاؤں ہزاروں پاؤں کے نیچے کچلے جا رہے تھے اور کھلی بہار میں بھی میرے سر میں سے پسینے کی دھاریاں بہ رہی تھی - میں ان کو کوس بھی رہا تھا لیکن وہاں سے نکلنا بھی مشکل تھا - اس ریلے پلٹتے اور شور مچاتے ہوئے مجمعے میں میں واحد شخص تھا جس کے سر پر ٹوکری تھی اور مجھے اس بات پر دل میں شرم محسوس ہو رہی تھی - پھر اسی وقت میری نظر بارہ سال کے ایک بچے پر پڑی جو شاید اپنے باپ سے بچھڑ گیا تھا اور ہجوم میں دھکے کھا رہا تھا اور رو رہا تھا - مجھے اس پر بڑا ترس آیا - اس کا ہاتھ پکڑ کر گرتا پڑتا میں اسے ایک طرف لے گیا - وہ روتا رہا - میں نے ٹوکری میں ٹٹول کر ایک اچھی سی پٹھلی نکالی اور اس کے ہاتھ میں تھمائی جسے دیکھ کر وہ چپ ہو گیا اور خوش خوش ایک طرف کوچل پڑا - پھر میں نے سوچا یہ ٹوکری لے کر آنے کے یہ فائدے ہیں -

”دروازے میں سے ابھی تک چلاتے ہوئے لوگ داخل ہو رہے تھے - مسلمان اپنے خدا اور مذہبی راہنماؤں کا نام لے کر اور ہندو اور سکھ اپنے خداؤں کو پکار پکار کر نعرے لگا رہے تھے - جب میں مڑا تو سب لوگ ایک سیاہ داڑھی والے شخص کی طرف دیکھ رہے تھے جو ایک اونچی جگہ پر کھڑا مجمعے کو چپ کرانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا - اس کی داڑھی ہوا میں ہل رہی تھی لیکن وہ اپنی کوشش میں کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا - دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پیچھے ایک گورا نمودار ہوا جس نے فوجی افسروں کی وردی پہن رکھی تھی - اس نے دھکا دے کر کالی داڑھی والے کو نیچے گرا دیا اور اسی کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہنے لگا - ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی اور اس کی انتہائی غصیلی آواز ہمارے کانوں میں آئی - اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی لیکن اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ وہ ہمیں وہاں سے دفع ہو جانے کو کہہ رہا ہے - اچانک شور پھر بلند ہوا اور اس کی آواز دب گئی - ایک طرف سے کسی نے جوتا اتار کر اس کی طرف پھینکا - پھر ہر طرف سے جوتوں کی یلغار شروع ہو گئی - ساتھ ساتھ مجمع مسلسل حرکت میں تھا - کیونکہ اس دھکم پیل میں ایک جگہ رکنا سخت مشکل تھا - اب آس پاس سے ہزاروں نئے اور پرانے جوتے پھینکے جا رہے تھے اور ہوا میں جوتوں کی یلغار تھی، جیسے دریا کی سطح پر سے مرغلیوں کی ڈار اڑ کر ایک لمحے کے لیے اندھیرا کر دیتی ہے - لیکن فوجی افسر کے ارد گرد کے لوگ ڈرے ہوئے

چپ چاپ کھڑے تھے اور پیچھے سے آنے والے جوتے ان کے سروں پر گر رہے تھے۔ اس وقت میں نے ہوشیاری سے کام لے کر اپنے جوتے سنبھال کر رکھے کیونکہ میرے پاس، تم جاتے ہو پچو کہ جوتوں کا صرف ایک جوڑا ہے۔ جب جوتے ختم ہو گئے تو لوگوں نے اپنے کپڑے اتار اتار کر پھینکنے شروع کر دیے۔ اب پکڑیوں، قمیضوں اور بنیانوں کے گولوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور جلد ہی آدھے سے زیادہ لوگ تنگے بدن ہو گئے بلکہ بعض تو بے حیائی سے کام لے کر سب کچھ ہی نکال کر پھر نے لگے۔ جب سب کچھ ختم ہو گیا تو صرف شور باقی رہ گیا جو کہ، ہجوم اور وہ فوجی افسر مل کر مچا رہے تھے۔ اتنے میں میرے آگے کھڑا ہوا ایک شخص مڑا اور میری ٹوکری کی طرف بڑھا۔ میں پیچھے ہٹا تو عقب سے دس بارہ ہاتھوں نے ٹوکری گھسیٹ لی اور اس میں سے مچھلیاں اٹھا کر خونبار نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر پورے زور سے انہوں نے مچھلیاں ہزاروں انسانی سروں کے اوپر سے اس طرف کو پھینکیں۔ جن لوگوں پر وہ گریں انہوں نے اٹھا کر آگے پھینکیں، پھر آگے، اور آگے، اور اسی طرح ایک مچھلی جا کر فوجی افسر کی آنکھوں کے درمیان لگی۔ اس نے وہیں پر اسے پکڑ لیا اور ایک لحظے تک اسے دیکھتا رہا، پھر سر اٹھا کر مجمعے کو دیکھا، پھر مچھلی کو، پھر مجمعے کو، - دفعتاً اس نے مچھلی سر سے بلند کی اور پوری طاقت سے اسے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے منہ پر کھینچ مارا۔ پھر اس نے بازو ہوا میں پھینکے اور پاگلوں کی طرح چیخ مار کر چلایا۔ اسی وقت گولی چلنی شروع ہوئی۔

”پھر وہ منظر شروع ہوا جو زندگی میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ سارے باغ میں افراتفری پھیل گئی اور وہ بھگدڑ مچی جو صاف پانی میں جال پھینکنے پر مچھلیوں میں مچتی ہے۔ لیکن پیچھا کرتی ہوئی گولیاں انسانوں سے بہت تیز بھاگتی ہیں، پچو۔ ایک وہ شخص تھا جو میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے دوڑ رہا تھا، گولی لگنے پر ہوا میں اچھلا اور وہیں پر ٹنگ گیا، کیونکہ نیچے آنے سے پہلے چند اور گولیاں اس کے جسم میں داخل ہوئیں اور اس نے ہوا میں قلا بازی کھائی، پھر اور گولیاں اور ایک اور قلا بازی اور اس طرح جب سرکس کے مسخرے کی طرح کرتب دکھانے کے بعد وہ زمین پر آیا تو کب کا مچکا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی جوش و خروش تھا اور وہ بد شکل نہ ہوا تھا، کیونکہ اس نے موت دیکھی ہی نہ تھی۔ یہ عجیب و غریب موت تھی۔ دیکھتے دیکھتے اس کا جسم گرتی ہوئی لاشوں میں چھپ گیا۔ یہ سارا قصہ چند لمحے کا ہے۔ وہاں سے آندھی کی طرح بھاگتے ہوئے مجھے اپنی ٹوکری دکھائی دی جو گولیاں لگنے پر گیند کی طرح اچھل رہی تھی۔ پھر بھاگتے بھاگتے میں چیخ مار کر رک گیا۔ چند گز کے فاصلے پر وہ کنواں تھا۔ وہ خشک کنواں تم دیکھ رہے ہو؟ ہاں وہی۔ میرے ساتھ بھاگتے ہوئے زیادہ تر لوگ اس میں جا گئے۔ ان کے اوپر دوسری طرف سے آنے والے گرے۔ پھر اس میں ہر طرف سے آنے والے زندہ اور مردہ لوگ گرنے شروع ہوئے اور انسانوں کی چیخوں نے گولیوں کی آواز کو دبا دیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے کنواں مردہ

اور نیم مردہ لوگوں سے بھر گیا اور لوگ آسانی کے ساتھ اس پر سے دوڑتے ہوئے گزرنے لگے۔ گولیوں کی بوچھاڑ کے نیچے نیچے دوڑتا ہوا میں اس دیوار کے پاس سے گزرا جہاں میں اب بیٹھا ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو پچو؟ اب یہاں پر کوئی نہیں ہے لیکن اس وقت اس ساری دیوار پر آدمی لٹکے ہوئے تھے۔ ان کی ٹانگیں دیوار سے اندر کی طرف تھیں اور سر اور بازو باہر کی طرف لٹک رہے تھے اور ان کے پیٹ دیوار پر تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو دیوار کو اس جگہ سے نیچا دیکھ کر پھاندنے کے لیے اوپر چڑھے اور گولیوں کی زد میں آگئے اور اندر سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوئے تھے جیسے دھوبی نے بے شمار پاجامے اور کوٹ اور پتلون سوکھنے کے لیے دھوپ میں پھیلا دیے ہیں۔ تم نے دیوار میں یہ سوراخ دیکھے ہیں؟ آہ۔ تم جو یہ سب باتیں لوگوں سے پوچھتے پھرتے ہو پچو، تم کبھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس باغی شہر کو کتنی بڑی سزا ملی۔ آہ۔ باہر نکلتے ہوئے مجھے چند کتے دکھائی دیے جو ایک مچھلی کو کھینچ رہے تھے۔ یہ وہی سفید اور چمکدار مچھلی تھی جو میں نے اس خیال سے الگ کر دی تھی کہ شاید کوئی گلاب مل جائے۔ اس وقت اس کے ایسے انوکھے گلاب دیکھ کر مجھے بڑی ہنسی آئی۔ لیکن ہنسنے کا وقت نہ تھا اس لیے میں جان پجانے کی خاطر سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ آیا۔

بھاگتا بھاگتا میں اس جگہ پہنچا جہاں ایک روز پہلے اس گوری عورت کی مٹی پلید کی گئی تھی۔ وہاں پر تمام مجمع رکا ہوا تھا۔ عقب سے گولیاں چلنے کی آواز برابر آرہی تھی۔ جب میں ہجوم کو چیر کر آگے بڑھا تو عجیب منظر دیکھا۔ بازار کے دونوں طرف گورے سپاہیوں کی قطاریں نشست باندھے گولی چلانے کے لیے تیار کھڑی تھیں اور بازار کے بیچوں بیچ انسانی جسموں کا ایک دریا تھا جو بہ رہا تھا۔ وہ سب زمین پر لیٹ کر پیٹ کے بل ریٹنگے ہوئے پھیس گز کا وہ ٹکڑا طے کر رہے تھے۔ انہیں کہنیوں یا گھٹنوں سے کام لینے کی بھی اجازت نہ تھی۔ انہیں بتایا گیا اور ہم سب کو بتایا گیا کہ ہمیں سانپ کی طرح پیٹ پر چل کر یہاں سے گزرنا ہے جہاں پر کہ ان کی عورت کے ساتھ سانپوں کا سا سلوک کیا گیا تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ جو کوئی بھی کہنیوں پر اٹھتا، اور جو کوئی بھی گھٹنوں پر اٹھتا اسے گولی مار دی جاتی۔ اور پھر انہوں نے ایسا کیا کہ بازار کے ایک طرف جمع ہو کر ریٹنگے ہوئے جسموں سے چھ انچ اوپر اوپر گولی چلانا شروع کر دی اور جان پجانے کے لیے بھگوڑوں نے مٹی میں سر کاڑ دیے اور پاؤں کی انگلیوں اور ناخنوں کی مدد سے ریٹنگے لگے۔ لیکن باغ سے بچ کر نکل بھاگنے والوں کے لیے یہی ایک راستہ تھا اور لوگوں کا رش ہر لحاظ بڑھتا جا رہا تھا۔ جس شخص کے سامنے جگہ بنتی وہ سر کے بل گر کر اڑدھوں کے اس جلوس میں شامل ہو جاتا۔ اور تم جانتے ہو پچو کہ ہم مچھیروں کے لیے یہ کام معمولی ہوتا ہے۔ میں ابھی چھ سال کا تھا کہ میرے باپ نے، اس کی روح کو ثواب پہنچے، مجھے پانی کی سطح پر اوندھے منہ لیٹ کر بغیر ہاتھ پاؤں ہلانے مردے کی طرح تیرنے کا ڈھنگ سکھایا تھا۔ اس لیے جب میری

باری آئی تو میں پھرتی اور آسانی سے رینگنے لگا۔ لیکن گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے مجھے اپنا سر زمین میں گاڑنا پڑا جس سے میری کھوپڑی زخمی ہو گئی اور کئی دن تک سو جی رہی۔ پھر بھی میں نے یہ کام ہوشیاری اور چالاکی سے سرانجام دیا، مگر میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ جو بڈھا رینگ رہا تھا، اس کے سر پر ایک بال بھی نہ تھا اور کھوپڑی سے خون بہہ رہا تھا، اس کا ایک کال مٹی میں دبا دبا اپنے پیچھے ایک چوڑی لکیر چھوڑتا جا رہا تھا اور وہ بڈھوں کی طرح بھونڈے پن کے ساتھ رو رہا تھا۔ جب راستے کے اختتام پر ہم اٹھ کر بھاگتے تو میں نے دیکھا کہ یہ وہی نورانی داڑھی والا بڈھا تھا جو ہر جمعرات کو مجھ سے مچھلی خریدا کرتا تھا اور جس کے تین جوان بیٹے تھے اور پنساری کی بہت بڑی دکان تھی۔ اس کے بعد میں اس طرف نہیں گیا لیکن میں نے دور سے کئی بار دیکھا کہ ایک مدت تک لوگ وہاں سے اسی انداز میں لیٹ کر گزرتے رہے جو انسانوں کی آمد و رفت کا سخت معیوب طریقہ ہے۔ میری آبائی ٹوکری بھی اس روز کھو گئی۔

”اب تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے بچو۔ کیونکہ ابھی یہاں پر کرفیو لگ جائے گا اور اس کے بعد بارہ گھنٹے تک جو بھی یہاں پایا گیا اسے گولی مار دی جائے گی۔ میں نے کافی مغز ماری کی ہے۔ لیکن تم نے خود ہی کہا تھا؛ بڈھے، ہم کو سب کچھ بتاؤ۔ مگر تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں نے اس سے بڑے بڑے موقعے دیکھے ہیں اور یہ باتیں میرے لیے معمولی ہیں۔“

”تم یہاں سے نہیں اٹھو گے بابا؟“ ایک سننے والے نے پوچھا

”نہیں۔“

”تم ہندو ہو یا مسلمان؟“ نعیم نے جلدی سے سوال کیا۔

”آہ ہا۔ یہ اچھا سوال ہے۔“ وہ اٹھکی اٹھا کر ہنسا۔ ”یہ اچھا سوال ہے۔ واقعی۔ لیکن مجھے پتا نہیں۔ یہ کچھ ایسا ہے کہ میں مصروف ہی رہا۔ میرا باپ بھی مصروف آدمی تھا۔ پھیرے کا کام دراصل جان توڑ کام ہوتا ہے۔ ادھر ادھر کی باتوں پر تو دھیان ہی نہیں دے سکتے۔“ اس نے گورے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے انہیں بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ مجھے کچھ نہیں کہتے۔ میں آدھی آدھی رات تک یہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ یہ جانتے ہیں کہ میں ان باتوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ میں مچھلی بیچنے والا بڈھا ہوں۔“

واپس آتے ہوئے وہ دیر تک مڑ مڑ کر اُس سیاہ، مختصر بیولے کو دیکھتے رہے جو اس سال خوردہ بڈھے کا تھا جو باتیں کر کر کے تھک چکا تھا اور اب سکون سے دیوار پر تنہا بیٹھا تھا اور ایک غیر آباد رات اس کے چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ رات ان کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن اس شام کے بعد کئی برسوں تک دیوار پر بیٹھا ہوا وہ اکلوتا، سیاہ جسم ان پانچوں کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔

پنجاب کا دورہ ختم کرنے کے بعد سال کے آخری دنوں میں نعیم اور عذرا لاہور اسٹیشن سے دلی جانے والی رات کی گاڑی پر سوار ہوئے۔ جس کمرے میں وہ چڑھے اس کی تمام نشستیں سوئے ہوئے مسافروں سے گھری ہوئی تھیں، سوائے ایک کے جو کہ اوپر والی نشست تھی۔ تمام رات دونوں میاں بیوی کو ایک ہی سیٹ میں بسر کرنا تھی، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ وہ اوپر چڑھے اور لحاف میں گھس کر سو گئے۔ جگہ کم تھی اور گاڑی انہیں بری طرح ہلا رہی تھی لیکن اتنا عرصہ ایک مصیبت زدہ خطے میں بسر کرنے کے بعد گھر واپس جانے کے خیال سے ان کے اعصاب مکمل طور پر سکون تھے اور وہ رات بھر خوب گہری نیند سوئے رہے۔

جب عذرا جاگی تو لحاف کے اندر آنکھیں کھول کر اس نے کونوں کناروں میں سے داخل ہوتی ہوئی دن کی روشنی کو دیکھا اور اسے کافی وقت گزر جانے کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی بہت سی اونچی مردانہ آوازوں کا شور اس کے کان میں پڑا۔ اس نے لحاف کا کونا اٹھا کر دیکھا۔ یہ شور چند فوجی افسروں کی باتوں کا تھا جو سب کے سب غیر ملکی تھے۔ وہ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر آمنے سامنے دو نچلی سیٹوں پر جمع تھے۔ ان میں سے دو پورے فوجی لباس میں تھے، تین کو ان کے ہندوستانی میرے لباس پہنا رہے تھے۔ اور باقی دو، جو طور اطوار سے فوجی افسر ہی معلوم ہوتے تھے، رات کے لباس میں پاس پاس بیٹھے سگار پی رہے تھے،۔ رات کے لباس میں ایک اور شخص بھی تھا جو ان کے پاس ہی سیٹ پر بیٹھا بظاہر ان کی باتوں سے لاتعلق ایک انگریزی کتاب پڑھ رہا تھا اور پائپ پی رہا تھا۔ دو سیٹوں کے درمیان ایک چھوٹی سی میز پر شیمپین کی بوتل رکھی تھی۔ دو افسر، جو لباس پہننے سے فارغ ہو چکے تھے، چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں سے گھونٹ گھونٹ شراب پی رہے تھے، اور اونچی، لا پروا آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ صبح کی نرم دھوپ کھڑکی کے شیشوں میں سے اندر آرہی تھی اور گاڑی تیزی سے آموں کے ایک باغ کے پاس سے گزر رہی تھی۔ عذرا نے انبالہ کے گرد و نواح کے آم کے باغوں سے ڈھکے ہوئے علاقے کو دیکھا اور دل میں گھر واپس آنے کی خوشی، جو ہر انسان کو ہوتی ہے، محسوس کی۔ اس نے شفقت اور مہربانی کی نظر نعیم پر ڈالی جو بچوں کی طرح سو رہا تھا۔ وہ دیر تک خاموش لیٹی اس کے جسم کی گرمی کو جذب کرتی رہی۔

اچانک ایک مانوس نام سن کر اس نے کان کھڑے کیے۔ اس کا تذکرہ اس انگریز فوجی نے کیا تھا جو گلابی لکیروں والا پاجامہ اور ڈریسنگ کاؤن پہنے ہوئے تھا اور سب سے اونچی آواز میں، سب سے زیادہ جارحانہ انداز میں بول رہا تھا:

”لاہور میں میں نے ہنٹر کمیٹ کو بتایا کہ مجھ میں کتنی انسانیت ہے۔“ اس نے تیزی

سے کہا، ”ورنہ۔“

”بالکل درست ہے۔“ دوسرے فوجی نے اٹھکی سیدھی کر کے کہا، ”ورنہ کون نہیں جانتا کہ کیا کچھ کیا جا سکتا تھا۔“

”میں ہندوستانیوں کے اس مقدس شہر کو جلا کر رکھ کر سکتا تھا۔ اور ان کا طرز عمل دیکھ کر میرے جی میں آیا کہ اس قانون شکن اور باغی ہجوم کو نیست و نابود کر دوں اور ان کے بچوں اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ لیکن محض انسانی رحم و کرم اور خدا ترسی کے جذبے نے مجھے روک لیا۔ میں نے ایک لاقانون قوم کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ پر انکوائری بٹھائی گئی۔“

”یہ انکوائری کمیٹیوں کے لوگ اتہائی جاہل ہوتے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ ان میں سے کسی کو اگر تمہاری جگہ پر کھڑا کر دیا جائے تو وہ وہی کرے گا جو کچھ تم نے کیا۔ بہر حال اب اس قصے کو ختم کرو اور اپنی کامیابی کا جام نوش کرو۔“

اس تجویز کا ایک عام اظہار مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا اور سب فوجیوں نے، جن میں کتاب پڑھنے والے اور تین لباس پہننے والے بھی شامل تھے، آگے بڑھ کر اپنے اپنے گلاس اٹھائے۔ اس تجویز کے بانی نے ہر ایک کے گلاس میں باری باری شراب انڈیلی اور پھر سب نے ایک ساتھ گلاس سروں سے اوپر اٹھا کر خوشی کا نعرہ لگایا اور غٹا غٹ پی گئے۔ اس کے بعد ڈریسنگ کاؤن والا پھر جوشیلے، اعصابی لہجے میں تیز تیز باتیں کرنے لگا۔ نعیم اور عذرا کو یہ جانتے میں دقت نہ ہوئی کہ وہ شخص جلیانوالا باغ کا فاتح بریگیڈیئر جنرل ڈائر تھا۔ دلی سٹیشن پر وہ اسی لباس میں اتر گیا۔

عذرا اس کی شاندار شخصیت اور جارحانہ انداز سے مرعوب ہوئی لیکن نعیم کے ہاتھ اسے مار کرانے کے لیے کانپنے لگے۔

(۲۰)

روشن آفا متواتر ایک گھنٹے سے بالائی منزل کی بالکونیوں میں چکر لگا رہے تھے۔ اسی طرح وہ پچھلے چند گھنٹوں میں روشن محل کے تمام برآمدوں، غلام گردشوں اور خالی کمروں میں گھوم چکے تھے۔ سر نیہوڑائے، ہاتھ پیچھے باندھے وہ گہرے متفکر انداز میں چل رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ پشت پر سے کھول کر بازوؤں کو سینے پر باندھ لیتے، اور پھر سیدھے چھوڑ کر چلنے لگتے۔ باہر ڈرائیو کے اخیر پر موٹر گاڑیوں اور بہیلیوں کی ایک قطار کھڑی تھی اور ان میں آنے والے ڈاکٹر اور نرسیں گھر کے دوسرے افراد کے ہمراہ، جن میں نعیم اور عذرا بھی شامل تھے، گول کمرے میں جمع تھے۔

تمام ڈاکٹر اطمینان سے بیٹھے اخبار او ذاتی کاغذات دیکھ رہے تھے اور سکریٹ پی رہے تھے۔ گھر کے لوگوں کے چہروں پر سرا سیمگی کے آثار تھے اور وہ بے چینی سے وقت کے گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کبھی کبھی بے داغ لباس میں کوئی نرس بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی آکر کسی ڈاکٹر کی کرسی پر جھک جاتی اور کھسر پھسر کرنے کے بعد اسی سمت میں غائب ہو جاتی۔ ڈاکٹر اکتائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا اور پھر کاغذات پر جھک جاتا۔ اندر بڑے بڑے طویل کمروں کے پیچھے وقفوں پر اس کو چیرتی ہوئی ایک تیز، درد آلود چیخ بڑے کمرے تک پہنچتی، جو گھر والوں کے چہرے زرد اور ڈاکٹروں کی اکتاہٹ میں اضافہ کر دیتی۔

باہر برآمدوں، زینوں اور گیلریوں میں گھر کے نوکر، مہریاں اور مالی ایک بیکار مصروفیت کے ساتھ ایک دوسرے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ خاص طور پر عورتیں خاموش ہنسی سے کمال نچاتی ہوئی مسلسل ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں اور اپنے خاوندوں کے علاوہ دوسرے مردوں کے قریب سے گزرتے ہوئے بے وجہ طور پر مسکرائے جاتی تھیں۔ ان کے بازو چاندی کے موٹے موٹے کڑوں اور کنگنیوں سے کہنیوں تک چھپے ہوئے تھے اور شور کرنے کے ڈر سے وہ انہیں تھامے ہوئے تھیں۔ روشن آغا کو لکڑی کے بڑے زینے پر اترتے ہوئے دیکھ کر وہ سب سایوں کی طرح کمروں میں غائب ہو گئے۔

انہوں نے دونوں ہاتھ اونی ڈریسنگ کماؤن کی جیبوں میں گہرے ٹھونس رکھے تھے اور تیز اعصابی چال سے چل رہے تھے۔ دروازے پر آکر وہ رکے اور ایک طویل، مشتاق نگاہ کمرے کی ساری گولائی میں پھینکی۔ ایک سفید فام ڈاکٹر سے ہدایات لے کر واپس جا رہی تھی۔ اس کے غائب ہوتے ہی وہ اذیت ناک چیخ بلند ہوئی۔ روشن آغا عجلت سے مڑ کر چلنے لگے۔ برآمدے کی لمبائی طے کرتے ہوئے وہ کئی جگہ پر رکے، پام کے پتوں کو توڑ کر دانتوں میں چبایا، ناخنوں سے برآمدے کے ستون پر لکیریں کھینچیں اور زرد رنگ کی میل میں سے چڑیوں کو اڑایا۔ وہ دوبارہ دروازے کے سامنے سے گزرے تو ان کے دوست ڈاکٹر انصاری اٹھ کر ان سے آملے۔

”ہلو روشن آغا۔“ سنہرے رنگ کی سگار دانی کھول کر بٹھاتے ہوئے وہ بولے۔

”نہیں ڈاکٹر، شکریہ۔ تمہا کو کی خواہش نہیں ہے۔ لیکن ڈاکٹر۔ پہلے بھی میرے دو بچے ہو چکے ہیں، پر ایسی حالت میری کبھی نہیں ہوئی،“ انہوں نے ایک تھکی ہوئی سانس چھوڑی،

”شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔“

ڈاکٹر نیم تمسخر، نیم سنجیدگی سے ہنسا: ”بوڑھے تو ہم سب ہو رہے ہیں۔ پر یہ کوئی ایسی

بات نہیں“

”لیکن کیا یہ ممکن ہے ڈاکٹر۔“ انہوں نے رک کر پوچھا، ”کہ۔ یعنی آخری بچے سے کم

ویش بیس سال کے بعد۔ یعنی۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ۔“

”یقیناً۔۔۔“ ڈاکٹر انصاری نے سگار کا دھواں پام کے پتوں پر چھوڑا، ”میں نے ایسے کیس بھی دیکھے ہیں جب شادی کے چالیس برس کے بعد پہلا بچہ ہوا۔“

”مضحکہ خیز۔ قطعی مضحکہ خیز۔؛ روشن آغا کپکپاتی ہوئی اٹکیاں چٹختے ہوئے بولے،

”لیکن میں نے زندگی بھر ایک دن میں اتنا پیدل سفر طے نہیں کیا ہے جتنا کہ آج۔ ڈاکٹر۔“

”اطمینان رکھو۔ اب وقت گزرا ہی چاہتا ہے۔؛ ڈاکٹر نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ روشن آغا کو اسی طرح برآمدے میں چکر لگاتے ہوئے چھوڑ کر وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔ جب اندر سے آنے والی چیخیں بلند ہو گئیں تو عذرا نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے جھک کر نعیم کے کان میں کچھ کہا۔ نعیم اٹھ کر باہر نکل آیا۔ اسے دیکھ کر روشن آغا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ایک دفعہ کچھ کہنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا، پھر سر جھکا کر چلنے لگے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ، غیر محسوس طور پر، اب انہوں نے اسے برابر کے آدمی کی طرح مخاطب کرنے کے خیال کو قبول کر لیا تھا۔ اب وہ ان میں سے تھا۔

دو دفعہ برآمدے کی لمبائی طے کرنے کے بعد آخر نعیم بولا: ”ہمارا پنجاب کا دورہ خاصا کامیاب رہا“

”ہا۔ ہا، پنجاب میں تم لوگوں نے بڑے دن لگائے۔ کیا نتیجہ نکلا؟“

”کمٹیٹی نے تمام اہم اور قابل اعتماد لوگوں سے رابطہ قائم کیا، جن سے ہمیں چشم دید حالات معلوم کرنے کا موقع ملا۔ گورنمنٹ کے اعلان کے مطابق چار سو آدمی مرے اور زخمی ہوئے۔ فی الواقع مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔“

”ہوں۔“ روشن آغا تشویش سے بولے، ”تشدد! انکوائری کمیٹی میں اور کون لوگ تھے؟“

”دیش بھاندو داس، جواہر لال نہرو، سعید احمد اور چند اور لوگ تھے۔ انکوائری رپورٹ عنقریب شائع ہونے والی ہے۔“

”پنجاب کے حالات میں مجھے بڑی دلچسپی ہے۔ لیکن اس وقت۔۔۔“ انہوں نے ہاتھ سے اندر کی طرف اشارہ کیا، ”اس معاملے نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ میں کبھی اتنا پیدل نہیں چلا۔“

نعیم نے ایک قریبی عزیز کی طرح چند باتیں ان کی تسلی کے لیے کہیں اور کمرے میں واپس آ گیا۔

اب عذار اٹھ کر باہر جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اندر سے چیخوں کی آواز آنی بند ہو گئی اور شہد کی مکھیوں کا شور آہستہ آہستہ قریب آنے لگا۔ ڈاکٹروں نے اپنے اپنے کافذات اور سگریٹ تپائیوں پر رکھ دیے اور جنہوں نے چشمے لگا رکھے تھے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ گھر کے باقی

افراد اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے ، باہر نوکروں میں کھلبلی مچ گئی ۔ اندر سے دو نرسیں نکلیں اور اپنے ڈاکٹروں کو جا کر خوشخبری دی ۔ ان کے پیچھے پیچھے خالہ نمودار ہوئیں اور تیزی سے کمرہ پار کر کے برآمدے میں پہنچیں ، ایڑیاں اٹھا کر دونوں ہاتھ روشن آغا کے کندھوں پر رکھے اور بولیں: ”سیکم محفوظ ہیں ۔ آپ کو یاد کر رہی ہیں ۔“

”اوہ ۔ سچ ؟“ انہوں نے دونوں بازو برآمدے میں پھیلائے ۔ پھر اپنے بڑے بڑے ہاتھوں میں خالہ کا ہاتھ دبوچ لیا اور اسے منہ کے قریب لا کر چوما ۔ ”آہ ، یہ اذیت ناک وقت تھا ۔ رب امجد ۔“

ڈاکٹر انصاری ان کی طرف آئے : ”مبارک ہو روشن آغا ۔ آپ بچی کو دیکھ سکتے ہیں ۔ زچہ کی حالت مکمل طور پر تسلی بخش ہے ۔“

”مبارک ہو ۔ مبارک ہو؛ پکارتے ہوئے روشن آغا دروازے کی طرف بڑھے ، دھلیز پر پہنچ کر رکے ، پھر پلٹ کر برآمدے میں پڑی ہوئی بید کی لمبی کرسی پر دراز ہو گئے ۔ کاریاں ایک ایک کر کے رخصت ہو رہی تھیں ۔ آرام وہ کرسی پر پوری طرح پھیل کر انہوں نے پاؤں ٹھنڈے فرش پر رکھے اور آنکھیں بند کر لیں ۔ سب لوگ اندر کے کمروں کی طرف چلے گئے ۔ آہستہ آہستہ برآمدے میں سناٹا چھا گیا ۔ چند منٹ کے اندر اندر روشن آغا کا سر چھاتی پر ڈھلک آیا اور وہ اونگھنے لگے ۔

صرف نوکروں میں ایک خاموش کھلبلی مچی رہی ۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے کبھی اندر کے کمروں میں جھانکتے اور کبھی طویل خالی برآمدے میں دیکھتے، جہاں روشن آغا تنہا سو رہے تھے اور ان کا ملازم خاص خاموش اشاروں سے ان چڑیوں کو اڑا رہا تھا جو برآمدے کی میلوں اور پام کے پتوں میں شور کرنا چاہتی تھیں ۔

وہ آہگ ، جو بڑھے چھلی والے نے امر تسر میں دیکھی تھی ، آہستہ آہستہ ملک بھر میں پھیل گئی ۔

یہ سارے مہینے نعیم اور اس کی بیوی کسانوں میں پھرتے رہے اور انہوں نے ایک بہت بڑی ، بدلتی ہوئی دنیا دیکھی ۔ سر اٹھاتے اور کمر سیدھی کرتے ہوئے کسانوں کی دنیا جو تیزی سے بدل رہی تھی ، اور اپنی حیثیت اور طاقت کا علم، جو متعدد بیماری کی طرح کسانوں میں پھیلتا چلا جا رہا تھا ۔ گو ان کی یہ ساری کاروائی روشن آغا کے علم سے باہر تھی اور گو عذرا کے لیے کسانوں اور ان کی زندگیوں میں کوئی کشش نہ تھی پھر بھی اپنے خاوند کے ہمراہ بہر حال وہ پھرتی رہی اور اپنے دیہاتی گھر کو مرکز بنا کر انہوں نے چاروں طرف اپنا کام جاری رکھا ۔

ہندوستان کے شدید موسموں میں وہ دور دور کے گاؤں میں پیدل چل کر پہنچے اور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے مخاطب ہوئے کسان ، جو نعیم اور اس کی طرح کے ہزاروں

کارکنوں کی کوششوں سے اب ان کی باتوں کا مطلب سمجھنے لگے تھے، ان کے گرد جمع ہوتے اور ان کی عدم تعاون کی ہدایتوں کو خاموشی اور جذبے کے ساتھ سنتے۔ پہلے پہل ان کو یہ باتیں وحشت ناک معلوم ہوئیں، کیونکہ ان باتوں میں کوئی فلسفہ نہ تھا اور یہ سیدھی سادی، تنگی بغاوت کی باتیں تھیں۔ ان پڑھ اور پیدائشی لاعلم کسانوں کے لیے یہ قبول کرنا بڑا مشکل کام تھا کہ ان کی زمینوں کا مالک، جاگیردار، ان کا محسن نہیں بلکہ دشمن تھا۔ جب پہلے پہل انہوں نے یہ باتیں سننا شروع کیں تو ٹیکس کی عدم ادائیگی اور زمیندار کو اس کے واجبی حصے سے زیادہ انج نہ دینے کے خیال سے ان کے دل میں خوف اور ہراس کے جذبات پیدا ہوئے اور انہوں نے ان لوگوں کو کہ جو یہ سبق دیتے تھے مجرم تصور کیا، پر اس کے ساتھ ہی دل کے چور میں انہیں یہ ساری باتیں بھاگائیں اور چھوٹی بڑی انسانی مسرتوں اور آسائشوں کی چاہ نے، جن سے وہ اب تک محروم رہے تھے، کیڑوں کی طرح ان لوگوں کو عقیدت کی نظروں سے دیکھا۔ لیکن زندگی کا خوف، جو ان کی نس میں بس چکا تھا، ان پر چھایا رہا تھا اور انہوں نے ان لوگوں کو اپنے سے علیحدہ اور مختلف انسان سمجھا اور ان کے قریب آنے سے گھبراتے رہے۔

لیکن انہی لوگوں نے جب بھوک اور پیاس کا اظہار کیا، ان کے پاس بیٹھ کر کھانا کھایا اور پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا، ان کے کھیتوں اور کھلیانوں میں بیٹھ کر حقہ پیا اور ان سے باتیں کیں، ان کی فصلوں اور مویشیوں کی بیماریوں کے بارے میں پوچھا اور مشورے دیے، ان کے ہمراہ زمین پر سو کر راتیں بسر کیں اور سب کے ساتھ مل کر کھایا، اور کسانوں کی سادہ، بے فن قصے کہانیاں سنیں اور محفوظ ہوئے، ان کے کھیتوں میں چھوٹے موٹے کام کرنے میں مدد کی اور وہ سب کچھ کیا جو ہر کسان کرتا ہے تو ان کا عمومی پن سب پر واضح ہو گیا اور انہوں نے نئے سرے سے ان کی باتیں سنیں جنہوں نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ملک کے لاکھوں کھیتوں میں جھک کر کام کرتے ہوئے کروڑوں کسانوں نے سر اٹھایا اور کمر سیدھی کی اور غرور سے ابرو پر اٹھکی تھپکا کر پسینہ خشک کیا۔ یہ ہندوستان کا بد نصیب کسان تھا جس نے ان گنت مصیبتیں بغیر احساس کے جھیلی تھیں۔ اس چہرے پر بے شمار لکیریں اور گہری تھکن کے آثار تھے اور اس کا جسم موسموں کی شدت میں تنگا رہ رہ کر قرمزی، نیلا اور سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس کے حصے کا اناج زمینداروں کے گھروں میں تھا اور اس کی عورتوں کے زیور مہاجنوں کے پاس رہن رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور وہ نادار تھا۔ اس کی ملکیت میں ایک دراتی اور ایک کدال تھی اور اس کے ہاتھوں میں اپنی محنت تھی۔ اس پر جو آفتیں نازل ہوئیں ان میں سبھی کچھ شامل تھا: زمیندار اور مہاجن سے لے کر خشک سالی سیلاب، ہیضہ، پلینک، میعادی بخار اور مویشیوں کی وباؤں تک! لیکن ہندوستانی کسان میں صدے برداشت کرنے کی حیرت ناک قوت ہوتی ہے۔ ہر تھپیڑے کے ساتھ وہ ذرا اور جھک جاتا اور گزر

جانے پر پھر گھٹنے سیدھے کر لیتا لیکن اس کی کمر سیدھی کرنے اور سر اٹھانے کے لیے ایک یرونی طاقت کی ضرورت تھی جو ساہا سال کی مظلومیت کا طوفان اس کے اندر سے نکالتی اور اسے ان مصائب سے آگاہ کرتی جو کہ وہ بغیر احساس اور علم کے جھیل رہا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو ملک کی تین چوتھائی آبادی پر مشتمل تھا اور جس پر ملک کی تمام خوراک اور بندوبست کا انحصار تھا۔ آخر جب حالات اور واقعات کے زور سے وہ یرونی طاقت میسر آگئی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے مظلومیت کا احساس غصے اور نفرت کی قوت میں تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے اپنے آلام زدہ مقدر کو محسوس کیا اور یہ بڑی بات تھی۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار کسان نے اپنی حیثیت میل سے بلند تر خیال کی۔

اور اس سے بڑی بات یہ کہ انہیں اپنی طاقت کا علم ہوا۔ ایک گاؤں میں، جہاں چند ماہ پیشتر سیلاب نے تباہی مچا دی تھی اور اناج کا ایک ایک دانہ تک کھیتوں میں نہ ملا تھا، نعیم کو رہتے ہوئے پانچ روز ہو چکے تھے۔ گاؤں میں قحط سالی کا عالم تھا اور مٹھی بھر اناج پر کسانوں کا پورا پورا خاندان گزارہ کر رہا تھا۔ اس وقت زمیندار کے کارندے گزشتہ فصل کی مقررہ مقدار کی عدم ادائیگی پر ٹیکس وصول کرنے اور دوسری صورت میں قرضے کے اندراج پر کاشت کاروں کے نشان انگوٹھے حاصل کرنے کی غرض سے وارد ہوئے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار تھے اور ہر ایک دروازے پر رک کر اونچی، درشت آوازوں میں مطالبہ کر رہے تھے۔ ان سے ذرا فاصلے پر ایک کھلیان میں گاؤں کے زیادہ تر مرد جمع تھے۔ یہ وہ کسان تھے کہ دو یا دو سے زیادہ دن سے ٹھوس خوراک کی کوئی مقدار جن کے حلق سے نہ اتری تھی۔ وہ سب کھلیان کے تنگے فرش پر بیٹھے تھے جہاں سے گھاس اور بھوسے کا آخری تیکا تک اٹھا کر مویشیوں کو ڈال دیا گیا تھا۔ نعیم درمیان میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور چاروں طرف وہ سب خاموش بیٹھے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے فاقہ زدہ تھے اور وہ ایسے پرندوں کی طرح تھے جو طوفان باد و باراں میں گھر گئے ہوں۔

جب چلاتے ہوئے کسانوں کی آوازیں قریب آنے لگیں تو کسانوں کے چہروں پر سارے جسم کا پچا کچھا لہو اکٹھا ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ آوازیں کھلیان کی دیوار کے پاس آگئیں۔ دیوار کے پیچھے سے ایک عورت کے رونے کی آواز آئی کہہ رہی تھی: ”میرا خاوند گھر پر نہیں ہے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔“ جواب میں وہی درشت آوازیں کالیاں دیتی ہوئی سنائی دے اور ایک شخص اندر داخل ہو کر کسی بھاری شے سے دیوار سے ٹھونکنے لگا، جس سے اس گھر اور کھلیان کی مشترکہ دیوار ملنے لگی۔ ملی جلی آوازوں کا شور بلند ہو گیا: ”ٹسوے مت بہا۔ تیرا خاوند کہاں ہے؟ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ دیکھ لو۔ میرا خاوند گھر پر نہیں ہے۔ چور بہانے باز۔ کتیا کی اولاد۔“

ایک کسان کھلیان میں سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سارے کسان نکل کر

دروازے پر جمع ہو گئے۔ نعیم کھلیان میں اکیلا رہ گیا۔
 ”یہاں کیا کر رہے ہو۔ کام چور۔“ ایک گھڑ سوار نے چلا کر پوچھا۔
 ”وہ سب خاموش کھڑے ابلتے ہوئے غصے سے انہیں دیکھتے رہے۔
 ”تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے؟ یا تمہارا کوئی عزیز مر گیا ہے۔“ گھڑ سوار دوبارہ چلایا،
 پھر کوئی جواب نہ پا کر وہ کود کر گھوڑے سے اترا اور چلبک ہوا میں لہرا کر چلایا: ”فصل کا حساب
 دو۔“

”ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔“ پہلے کسان نے کہا۔
 ”کیوں نہیں ہے؟“ غصے سے اندھا ہو کر وہ دوبارہ کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور چلبک کو
 پوری طاقت سے ہوا میں پٹھانے لگا۔ گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر اٹھ کھڑا ہوا۔
 اتہائی نفرت اور غصے کے زیر اثر کسان ایک لمحے کے لیے گنگ رہ گیا اور تھکے ہوئے
 گھوڑے کی طرح سانس لینے لگا۔ پھر اس کے گلے سے تیز، پھٹی ہوئی آواز نکلی:
 ”کیوں نہیں ہے؟ میں؟ یہ دیکھو۔“ اس نے پاس بندھے ہوئے میل کے پہلو میں
 چاروں اٹکیاں اتار دیں جو اس کی تنگی پسلیوں میں غائب ہو گئیں۔ میل دھشت زدہ آواز میں
 ڈکرایا، ”اور یہ۔“ اس نے اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھایا۔
 اور یہ ایک خوفناک نظارہ تھا، جس کا حال وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے فاقہ زدہ انسانی
 جسم دیکھے ہیں۔ اپنی پسلیوں میں اس کی اٹکیاں ایک ایک پور تک اتر گئیں۔
 ”سور“ وہ اُس پھٹی ہوئی آواز میں چیخا، ”بھاگ جاؤ۔ جاؤ۔۔۔ ہم آگ لگا دیں گے۔
 کھلیانوں کو۔۔۔ گھروں کو۔۔۔ سب کو۔۔۔“

کسانوں میں جانوروں کے گلے کی سی بلبلاہٹ بلند ہوئی اور وہ خالی ہاتھ اوپر اٹھا کر
 بڑھے۔ سواروں نے ٹھٹک کر دیکھا اور خاموشی سے گھوڑے موڑ کر واپس چلے گئے۔ اس کے
 بعد کوئی اس فصل کا حساب وصول کرنے کے لیے نہ آیا اور اس چھوٹی موٹی بغاوت کو عمداً نظر
 انداز کر دیا گیا۔۔۔

جب موسم میں ذرا شدت آئی تو عذار نے، جو پہلے ہی دیہات اور دیہاتیوں سے میل جول
 رکھنے سے اکتا چکی تھی، اپنے خاوند کے ہمراہ جانا چھوڑ دیا اور روشن پور میں بیٹھ کر اپنے دل میں
 شہری زندگی کی چمک دمک اور شہرت کی خواہشات کے زہر کو پالنے لگی۔ جب بھی نعیم پھر پھرا کر
 اور عذرا کی کشش سے مجبور ہو کر گھر آتا تو وہ اس سے کہتی: ”تم کاؤں کاؤں پھرا کرتے ہو، پہلے
 اپنے مزارعوں کو زمینیں بانٹو۔“ اس پر وہ جواب دیتا: ”سب روشن آغا کے مزارعے ہیں۔
 میرے کوئی مزارعے نہیں ہیں۔ میری زمینوں پر میرا بھائی اور ماموں کا لڑکا کام کرتے ہیں۔“
 ”چپ ہو جاتی۔ لیکن وہ دلی نہ جا سکتی، کیونکہ اپنے خاوند سے اسے عشق تھا اور وہ محبت کی

ادھ مٹی خواہشوں کو لے کر، اکیلی رہتی ہوئی، خلش اور جذبے کے ساتھ اس کا انتظار کرتی رہتی۔
 نعیم اب مکمل طور پر کسانوں میں کم ہو چکا تھا۔ انفرادی طور پر کسی سے اس کے
 تعلقات نہ تھے، کیونکہ ایک فرد کی حیثیت سے کسان موٹے دماغ کا، ان پڑھ اور غیر دلچسپ
 شخص ہوتا ہے اور اس سطح پر وہ نعیم کا دوست نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اجتماعی طور پر نعیم نے
 انہیں قابل اعتماد اور وفادار پایا۔ ان کا ادھ بتکا، گونگی لا علم آنکھوں والا، جوم پالتو جانوروں کی طرح
 برتاؤ کرتا اور دیکھنے والے کے دل میں رحم کے جذبات پیدا کرتا تھا۔ اجتماع کی شکل میں وہ
 ایک ایسی پھٹنے والی قوت کا یقین دلاتے تھے جس پر مکمل بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت ان
 کا نعرہ صرف ایک تھا؛ ”سوراج۔“ اس ایک لفظ میں، جو کانگریس نے انہیں دیا تھا، ان کی آئندہ
 زندگی کی آسائشوں کے تمام مبہم اور غیر مبہم تصورات شامل تھے۔ نعیم اور اس کے ساتھیوں
 نے یہ بہت بڑا، تیزی سے بدلتا ہوا منظر دیکھا اور محسوس کیا اور خود کو اس میں شریک پا کر محفوظ
 ہوئے۔

دسمبر کے شروع میں ’پرنس آف ویلز‘ کے ہندوستانی دورے کے سلسلے میں حکومت
 نے تمام سیاسی پارٹیوں کو دبانا شروع کیا۔ جب انڈین نیشنل کانگریس نے دورے کا بائیکاٹ
 کرنے کا اعلان کیا تو اسے خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔ اس پر بھی والڈیروں کے ناموں
 کی فہرستیں شائع ہوتی رہیں اور عام ہڑتال اور شاہی خاندان کے ایک فرد کی آمد کے موقع پر حکومت
 کی طرف سے جاری کردہ تمام احکامات کی خلاف ورزی اور تفریبات کے بائیکاٹ کی ہدایت کے
 اشتہارات عوام میں تقسیم کیے جاتے رہے نتیجے کے طور پر حکومت کے اعصاب جواب دے
 گئے اور وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

روشن پور میں جس گھر کے دروازے کی تختی پر لکھا تھا؛ ’یہاں نعیم اور اس کی بیوی رہتے
 ہیں‘ وہاں پچھلے چند روز سے عذرا مستقل بے چینی کے ساتھ نعیم کا انتظار کر رہی تھی۔ پرنس
 آف ویلز کی آمد کا اسے علم ہو چکا تھا اور اسے دیکھنے، اس کے ساتھ باتیں کرنے اور اس کے پاس
 بیٹھنے کی خواہش نے اس کے دل میں کرب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک لمبی مدت تک وہ اس
 دنیا سے محروم رہی تھی جس کا کہ وہ باشندہ تھی اور اس دنیا کی کشش کو محسوس کر کے وہ راتوں کو
 سو بھی نہ سکتی تھی۔ گزشتہ چند ایک طویل، بے خواب راتوں نے اسے بڑی اذیت دی تھی،
 جن میں اسے نعیم کے جسم کی حسرت اور دلی کی زندگی سے اپنی محرومی کا شدت کے ساتھ احساس
 ہوا تھا۔

آخر ایک سہ پہر کو نعیم آپہنچا۔ اس رات کے لیے وہ سب کچھ بھول گئی۔ اس رات
 اس نے اپنے آپ کو محض یہ یقین دلایا کہ اس کا محبوب جسم اس کے قبضے میں ہے اور اب کہیں
 نہیں جائے گا۔ پو پھٹنے کے وقت نعیم کو ہلتا ہوا پا کر وہ کسمپائی اور اس کے ساتھ لگ کر بولی:

”ہم دلی جائیں گے نعیم۔ پرنس آف ویلز آرہے ہیں۔ چلیں گے نا؟“
 نعیم نے، جو ہلکی ہلکی مکان، بستر کی حرارت اور عذرا کے جسم کی لذت سے مدہوش تھا،
 صرف استا کہا: ”ہاں۔ ہاں۔“

لیکن دوسری رات کو جو وہ سونے کے لیے لیٹے تو عذرا کے ذہن میں صرف ایک سوال
 تھا جو اس نے چھوٹے ہی کیا: ”ہم دلی جائیں گے نعیم۔“
 وہ یوں چونکا جیسے اس نے پہلی دفعہ سنا ہو۔ ”کیوں؟“
 ”پرنس آف ویلز۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ اس نے اداسی سے کہا، ”اس سے پہلے ہی شاید میں گرفتار ہو جاؤں۔“
 ”کیوں؟“

”ہم نے بائیکاٹ کیا ہے اس کے دورے کا۔“
 ”نہیں۔“ عذرا نے بچوں کی طرح کہا، ”لیکن نہیں۔ تم گرفتار مت ہونا، ہم دلی جائیں
 گے۔ اسی؟“

”دلی میں کچھ بھی نہ ہوگا۔ وہ جہاں جائے گا وہاں ہسپتالیں کرائی جائیں گی۔ اس کے
 خلاف مظاہرے ہوں گے۔“
 ”مگر کیوں؟“ عذرا سٹپٹا گئی، ”وہ شاہی خاندان کا استا شریف انسان ہے۔ اسے سیاست
 سے کیا مطلب۔“

”یہ پارٹی کا فیصلہ ہے، عذرا، میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔؟ نعیم نے آہستہ سے اسے
 ساتھ لگاتے ہوئے کہا، ”اور تم۔ تم تو سب کچھ سمجھتی ہو پھر پوچھ رہی ہو؟“
 وہ سیدھی لیٹی بے خواب آنکھوں سے چھت کو گھورتی رہی، یہ قطعاً بھول کر کہ وہ اپنے
 خاوند کے ساتھ لیٹی تھی۔ اس کا جسم سرد تھا اور اس کا خاوند اس کے ذہن سے بالکل نکل چکا
 تھا۔ عذرا کے جسم کو آہستہ آہستہ دباتے ہوئے نعیم پر غنودگی طاری ہونے لگی۔
 ”لیکن نعیم،“ اچانک عذرا نے کہا، ”پھر ہم مظاہرہ کریں گے۔ کر سکتے ہیں نا!“
 نعیم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی بات ذہن نشین کرتا رہا۔ ”ہاں۔“
 ”ہاں ہم مظاہرہ کریں گے۔ تم گرفتار مت ہونا، بس۔“ عذرا خوشی سے بولی۔
 ”لیکن۔ روشن آغا تمہیں ایسا کرنے دیں گے؟“

”روشن آغا۔۔۔۔۔؟“ وہ اس کے ہونٹوں پر اٹھکی پھیرتے ہوئے سوچنے لگی، ”ہاں، ارر۔
 ہم کلکتے چلے جائیں گے۔ تمہارے چچا کے ہاں، ٹھیک ہے؟ ٹھیک ہے نا۔“
 ”ہاں ٹھیک تو ہے۔“ نعیم نے کمزور آواز میں کہا۔

”ہم کلکتے جائیں گے۔ تم گرفتار مت ہونا میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تم

گرفتار مت ہونا - اچھا“

وہ خاموش رہا -

”تم گرفتار نہیں ہوؤ گے نا - نعیم -“ عذرا نے اس کی ٹھوڑی پر ہونٹ رکھتے ہوئے

کہا، ”وعدہ کرو نا -“

نعیم نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر دبایا : ”اچھا -“ اس نے جلدی سے کہا اور اپنی بیوی

کے غالب آتے ہوئے ارادے سے بچنے کی کوشش میں اس کے جسم کا سہارا تلاش کرنے لگا -

کلکتے کے صدر بازار کے فٹ پاتھ پر وہ گھنٹے سے کھڑے تھے - بازار میں مکمل ہڑتال تھی

لیکن تماشائیوں کا پتلا، جھوم بند دکانوں کے آگے آگے گھوم رہا تھا - بازار کے بیچوں بیچ رستہ

صاف تھا اور دو رویہ غیر ملکی اور مقامی پولیس کے آدمی کھڑے تھے - وہ اپنی تقریبی وردیوں

میں ملبوس، مستعدی سے سیدھی قطاروں میں کھڑے، خوبصورت دکھائی دے رہے تھے - سڑک

پر انگریز فوجی اور پولیس افسر موٹر سائیکلوں پر گھوم رہے تھے - پرنس آف ویلز کا جلوس

گورنمنٹ ہاؤس سے روانہ ہو چکا تھا -

شہر کے تمام بازاروں اور گلیوں میں مکمل ہڑتال تھی - دکانوں اور گھروں کے دروازے

بند تھے اور ان پر شناختی تختیاں الٹی لٹک رہی تھیں - لوگوں کی چال بے مصرف اور نکالیں کوری

تھیں اور چالیس لاکھ نفوس پر مشتمل ایشیا کے اس سب سے بڑے شہر میں دنیا کا تمام کاروبار

معطل ہو چکا تھا - فٹ پاتھ پر پھرنے والوں میں انسانوں کی نسبت مویشیوں اور کتوں کی تعداد

زیادہ تھی - لیکن عوام کے عدم تعاون کے باوجود فوج اور پولیس کی بھاری تعداد کی مدد سے شہر

پر تقریبی رنگ لانے کی کوشش کی گئی تھی - شہزادے کے جلوس کے رستے میں رنگ برنگ

کی جھنڈیاں اور غبارے اڑ رہے تھے اور فاصلے پر پام کے پتوں اور سرو کے مصنوعی پودوں سے

بڑے بڑے استقبالیہ دروازے کھڑے کیے گئے تھے -

نعیم ایک مدت کے بعد اس شہر میں واپس آیا تھا جو ساری دنیا میں اس کا محبوب شہر

تھا - جس طرح دنیا میں نادار سے نادار شخص کو اپنے بچپن کا گھر محبوب ہوتا ہے اور جس طرح ان

زمانوں کو یاد کرتے وقت اس کے چہرے پر وہ دمکتا ہوا حسن پیدا ہو جاتا ہے جو لڑکپن کی عمر

کے ساتھ مخصوص ہے اس طرح نعیم نے ان سارے زمانوں کو یاد کیا جو گزر چکے تھے - جب وہ

درمیانے قد کا گورا سالڑ کا تھا اور روزانہ اس راستے سے، جہاں پر اس وقت وہ اپنی بیوی کے ہمراہ

کھڑا تھا، سکول کو جایا کرتا تھا - اور اس کے پاس رنگ برنگ پنسلوں کا ایک ڈبہ تھا جو وہ ہمیشہ

اپنے بیگ میں رکھتا اور صرف اپنے خاص خاص دوستوں کو دکھایا کرتا تھا - ان میں خوبی یہ تھی کہ

جس رنگ کی پنسل تھی اسی رنگ کی اس سے لکھائی بھی ہوتی تھی - اور اس کی نیکر کی جیب میں

بہت عرصے تک شیشے کی ایک خالی دوات رکھی رہی تھی -

جس میں اس نے تتلیوں کے چمکدار پر جمع کیے تھے اور رات کو سونے سے پہلے جسے وہ اندھیرے میں جیب سے نکال کر تکیے کے نیچے رکھ لیا کرتا تھا، کیونکہ اس میں اس قدر قیمتی، اس قدر خوبصورت تتلیوں کے پر تھے جو ہاتھ لگانے سے ٹوٹتے تھے۔ پھر ایک روز سمندر کے ساحل پر ریت میں کھیلتے ہوئے وہ دوات کہیں گم ہو گئی اور ہمیشہ کے لیے اسے یاد رہ گئی تھی۔ جیسے گم شدہ محبوب چیزیں ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ اسے تلاش کرتے ہوئے اس نے ریت پر سے بہت سارے چمکدار پتھر اور سیپیاں چن کر جیبوں میں بھر لی تھیں لیکن شیشے کی وہ دوات ہمیشہ اس کے ذہن میں چمکتی رہی اور اس کے ذہن میں اور بھی بہت کچھ تھا جس میں اس کے سکول کے دوست، نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والے گول مٹول بچے، اور اس راستے پر یہی لوگ، گندمی اور سیاہ رنگ، موٹے جسم اور ٹھگنے قد کے یہ لوگ شامل تھے جو آج بھی اس طرح اس کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ ان کے جسموں پر اسی طرح سفید دھوتیاں لپٹی تھیں اور ان کے ہمراہ ان کی لمبے سیاہ بالوں اور خوبصورت آنکھوں والی عورتیں تھیں جن کے چہرے گندمی تھے۔ یہ اور اسی طرح کی ہزاروں چھوٹی چھوٹی چیزیں۔ ان سب کو یاد کر کے نعیم نے دل میں پرانی یادوں کی خلش محسوس کی، وہ خلش جو ہر شخص، خواہ وہ کسان ہو یا شہری، مہذب ہو یا غیر تہذیب یافتہ، زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور محسوس کرتا ہے۔

سڑک پر اب فوجی گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی آمدورفت تیز ہو گئی تھی اور قطار میں کھڑے باوردی جوانوں کو فوجی سلامی کی ہدایات دینے والے کڑک کڑک کر بول رہے تھے۔ عذرا نعیم کا بازو تھامے اس کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی اور اس کا چہرہ زرد تھا۔ ان کے ارد گرد مجمع کم ہوتا جا رہا تھا۔

”کافذ تمہاری ساڑھی میں ہے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”ہاں۔“ عذرا نے اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔ اس کی آواز سے اس کی گھبراہٹ ظاہر تھی۔ کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑی نعیم کے بازو پر اعصابی اٹھکیاں بجاتی اور ایک ٹانگ ہلاتی رہی۔ پھر منہ اس کے کان کے قریب لے جا کر آہستہ سے بولی: ”کس طرح کریں گے؟“ نعیم نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک موٹی سی عورت اس کے ساتھ ٹکرا گئی۔ وہ درمیانی عمر کی عورت تھی اور ان لوگوں میں سے دکھائی دیتی تھی جو بہت زیادہ جسمانی آسائش اور فریبی کی بدولت خوش شکل سے بد شکل ہو جاتے ہیں۔ وہ پٹری پر چہل قدمی کرتے ہوئے ایک میل سے بچنے کے لیے اس سے ٹکرا گئی تھی حالانکہ نعیم نے، اس مضبوط عورت کا گرا ہوا پلو زمین پر سے اٹھا کر اس کے سر پر رکھا اور پلپلے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا۔ عورت، جو تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہی تھی، تشکر سے ہنسی اور جلدی سے گذر گئی۔ نعیم نے چند لمحے تک ان لوگوں کے گزرنے کا انتظار کیا، جن کا راستہ عورت اور میل نے روک رکھا تھا،

پھر عذرا کی طرف جھک کر بولا :

”ہمارے پیچھے دکان کا بورڈ میری پہنچ میں ہے۔ اس پر لکائیں گے۔“
 ”اچھا!“ عذرا نے پیچھے دیکھے بغیر بے خیالی سے کہا اور ایک ٹانگ ہلاتی رہی۔ نعیم نے
 تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

”گرفتار تو اسی وقت کر لیے جائیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کہیں مظاہرے سے پہلے ہی نہ
 پکڑ لیے جائیں۔“ اس نے کہا۔ عذرا نے سنایا نہیں، اس کا اسے پتا نہ چل سکا۔ وہ اسی
 طرح سڑک کی طرف منہ کیے، کہیں بھی نہ دیکھتی ہوئی، خاموش کھڑی رہی۔
 اس کے بعد وہ زیادہ تر خاموش رہے۔ کبھی کبھی پچھلتی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے
 کو دیکھ لیتے۔ ان کے سامنے سے گزرتی ہوئی شہریوں کی ایک ٹولی ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ سب
 کے سب خالص بنگالی باشندے تھے اور بڑی فرصت سے سڑک کا نظارہ کرتے اور آہستہ آہستہ
 باتیں کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مگر اب وہ اچانک خاموش ہو کر ایک شخص کو دیکھ رہے تھے
 جو ان کے درمیان آ کر رک گیا تھا۔ اس نے سفید کھدر کا لباس پہن رکھا تھا اور چہرے سے
 پڑھا لکھا بنگالی معلوم ہوتا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟ یہاں کیوں جمع ہو؟“ وہ چاروں طرف دیکھ کر دبی ہوئی غصیلی آواز
 میں بولا، ”دکانیں اس لیے بند کی تھیں کہ ان کا استقبال کرو؟ جاؤ۔۔ چلے جاؤ، ایک ایک
 شخص، خدا کے لیے!“

آناً فاناً وہ ٹولی تتر بتر ہو گئی۔ غالباً اس کی طرح کے اور بھی کئی لوگ وہاں پہنچ چکے تھے
 جو انہوں نے جگہ جگہ پر کھڑی ہوئی اور حرکت کرتی ہوئی کئی ٹولیوں کو بکھرتے اور غائب ہوتے
 ہوئے دیکھا۔ ہر طرف سے لوگ گلیوں میں اور بازار کے موڑوں پر نظروں سے اوجھل ہونے
 لگے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے پٹریاں ویران ہو گئیں اور شہری لباس میں انسان کی شکل خال خال نظر
 آنے لگی۔ ان کے ارد گرد کتے اور میل پھرنے لگے۔ کچھ وقت اسی ویرانی کے عالم میں گزر گیا
 ۔ پھر انہوں نے ایک فوجی لاری موڑ پر سے نمودار ہوتی اور زن سے گزرتی ہوئی دیکھی جس کے
 پیچھے وہی کھدر کے لباس والا شخص اور اُس کے تین ساتھی بیٹھے تھے۔ ان کے اوپر دو مسلح
 گورے سپاہی کھڑے تھے۔ کھدر پوش خاموش، مطمئن نظروں سے باہر کو دیکھ رہے تھے۔
 نعیم نے ہولے سے مسکرا کر عذرا کو دیکھا۔ وہ لاری پر سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھ رہی تھی،
 زرد رو اور نروس! اسی وقت بازار کے دوسرے سرے سے پرنس آف ویلز کا جلوس داخل ہوا۔

کاشن دینے والوں کی کڑک دار آوازیں دو رویہ سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے
 تک پھیل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی فوجی جوان، جو کھڑے ستارے تھے، ہتھیار بجا بجا کر

سیدھے ، مستعد فوجی انداز میں کھڑے ہوتے گئے ۔ فوجی بینڈ کی ولولہ انگیز دُھن آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی ۔ پا پپا ۔ ۔ پا پپا ۔ ۔ قریب اور قریب ، پا پپا ۔ ۔ پا پپا ۔ ۔ فوجی جوانوں کا جذبہ سر فروشی پھٹنے کی حد تک پہنچ چکا تھا ، خون کو گرمانے والی موسیقی کے زیر اثر ان کے سخت ، اکڑے ہوئے جسموں میں بے پناہ طاقت عود کر آ گئی تھی اور ان کا جی بے اختیار اپنے بادشاہ پر فدا ہو جانے کو چاہ رہا تھا ، پا پا ، پپا پپا ۔ ۔ پپپ پپا ۔ ۔ پا پپا ۔ ۔ نعیم نے پھرتی سے مڑ کر لگتا ہوا بورڈ اتارنا چاہا لیکن وہ کیلوں میں الجھ گیا ۔ ٹین کے ڈپوار کے ساتھ ٹکرانے کی آواز پیدا ہوئی ۔ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں زیر لب کوستے ہوئے نعیم نے اسے زور سے کھینچا جس سے اس کی رسی ٹوٹ گئی اور وہ اس کے ہاتھ میں آ گیا ۔ وہ اپنی جگہ پر اکھڑا ہوا ۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا ۔ بینڈ کے شور میں فوج یا پولیس کا کوئی آدمی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا ۔ اس کی چھپھلتی ہوئی نگاہ اوپر اٹھ گئی جہاں اس نے دیکھا کہ دکانوں کے چوباروں کی کھڑکیوں کے پٹ نیم وا تھے اور ان میں سے سینکڑوں چمکتی ہوئی آنکھیں چوروں کی طرح جھانک رہی تھی ۔ نعیم نے کہنی عذرا کے پہلو میں چبھوئی اور دبی ہوئی آواز میں بولا : یہ لو ۔ کاغذ ۔“

وہ دم بخود کھڑی نزدیک آتے ہوئے جلوس کو دیکھتی رہی ۔
 ”کیا دیکھ رہی ہو ؟ کاغذ کہاں ہے ؟“ نعیم نے سہٹا کر اس کے کان میں کہا ۔
 اسی طرف دیکھتے دیکھتے عذرا دھیمی ، غیر حاضر آواز میں بولی : ”ہاں ؟ ۔ ۔ بورڈ اتار لیا ؟“
 ”ہاں ۔ یہ ہے ۔“

بینڈ بجاتے ہوئے شاندار وردیوں والے فوجی ان کے سامنے سے گزر رہے تھے ۔ ان کے پیچھے موٹر سائیکل سواروں کا دستہ تھا ۔ پھر چار گھوڑوں والی سنہرے رنگ کی رتھ ، جس میں انگریز شہزادہ گورنر صاحب بہادر کے ہمراہ بیٹھا تھا ۔ اُن کے سامنے کی سیٹ پر آگے کی طرف پشت کئے دو انگریز عورتیں بیٹھی تھیں ۔ ویلز کا شہزادہ اپنی جگہ پر سیدھا بیٹھا تھا ، خوبصورت ، متین اور باوقار ، جیسا کہ شاہی خاندان کے ایک فرد کو ہونا چاہیے ، لیکن متردد ! اُس کے دونوں جانب رتھ کے پائیدانوں پر دو گرانڈیل ہندوستانی باڈی کارڈ سرخ اور سنہری لباس میں مجسموں کی طرح سیدھے ساکت کھڑے تھے ۔ ایک بڑی سی سنہری چھتری اس پر سایہ کیے ہوئے تھی ۔

اچانک شہزادے نے نظریں اوپر اٹھائیں اور دیکھتا رہا ۔ پھر وہ ذرا سا گورنر کی طرف جھکا ۔ گورنر نے بھی اسی سمت میں دیکھا اور اس کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار پیدا ہوئے ۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف نگاہ دوڑائی ، پھر سامنے دیکھا ۔ سرو کے مصنوعی درختوں سے بنے ہوئے تقریبی گیٹ کی لکڑی پر برقی روشنی سے لکھے ہوئے یہ الفاظ بار بار ظاہر اور غائب

ہو رہے تھے :

“Tell your Mother, We are Unhappy”

گورنر پیچھے کی طرف دیکھتا تو حروف غائب ہو جاتے ، سامنے دیکھتا تو ابھر آتے ۔ اس پر اسرار روشنی کے منبعے کا پتلا نہ چل سکا ۔

رتھ ان کے نزدیک آتا جا رہا تھا ۔ گورنر اپنی خفت چھپانے کو ناگواری سے ہنس رہا تھا اور کوئی بات کر رہا تھا ۔ شہزادہ اس کی طرف دھیان دیے بغیر گہری متردد نظروں سے برابر ان الفاظ کو تکیے جا رہا تھا جو لکڑی کے تختے پر بن رہے تھے اور مٹ رہے تھے ۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے چہرے پر فکر مندی کی کوئی علامت ظاہر نہ ہونے دی ۔

ان کو اپنے سامنے پا کر آخر نعیم نے قدم بڑھایا ۔ ”کافذ نکالو ۔“ اس نے کہا ۔

وہ شہزادے پر نظریں جمائے کھڑی رہی ۔ نعیم اس کا بازو ہلا کر نیچی آواز میں چیخا :

”نکالو ۔“

”ایس ؟“ وہ سوئی سوئی آواز میں بولی : ”تم نے بورڈ اتار لیا ؟“

”ہاں ۔ ۔ ہاں ۔“

نعیم نے بورڈ اس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا جو اس نے ہاتھ لٹکائے لٹکائے پکڑ لیا اور شہزادے پر سے نظریں ہٹائے بغیر ، سحر زدہ سی ، کھڑی رہی ۔ انہیں گزرتے ہوئے دیکھ کر نعیم نے سیدھے ہاتھ کے پورے زور سے اس کا بازو مروڑا اور سانپ کی طرح خاموشی سے پھنکارا :

”اوہ ۔ ۔“ عذرا کے منہ سے نکلا اور انتہائی رنج کے مارے اس نے نعیم کے کندھے پر

سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں ۔ بورڈ پاؤں میں گر پڑا ۔

اب ان کے سامنے سے گھڑ سوار فوج کے جرنیل ، حکومت برطانیہ کے ’نائٹ‘ ، والیان ریاست ، اور ان کے بعد درجہ بدرجہ سرکاری افسروں کی ایک لمبی قطار اپنی اپنی جگہ پر گھوڑوں ، رتھوں اور موٹروں پر گزر رہی تھی ۔ دو رویہ فوجی جوان سلامی دیتے ہوئے یوں کھڑے تھے جیسے کاڑ دیے گئے ہوں ۔ پرنس آف ویلز اس دروازے کے نیچے سے گزر رہا تھا جس پر سے روشنی کے الفاظ کو ہٹا کر اب اگلے دروازے پر Project کیا جا رہا تھا ، اچلانک پرنس کے برابر والی گلی سے چند لوگوں کا ایک گروہ نمودرا ہوا ۔ ان کے جسم تنگے اور سیاہ تھے اور سر منڈے تھے جن پر لکھا تھا :

TELL YOUR MOTHER

چند شانے میں وہ ٹولی غائب ہو گئی ۔ تھوڑی دیر کے بعد اسی گلی میں سے چند کانیں باہر ہانک دی گئیں جو فوجیوں کے درمیان سے سر نکال کر کھڑی ہو گئیں ۔ ان کے گلوں میں بھی

بورڈ لٹک رہے تھے جن پر رقم تھا : "Tell your Mummy we are dry" انہیں بھی فوراً ستر بتر کر دیا گیا۔

نعیم عذرا کو تھام کر واپس چلنے لگا۔ عذرا کا سر ابھی تک اس کے کندھے پر ٹکا ہوا تھا۔ چلتے چلتے نعیم نے اس کے آہستہ آہستہ بڑبڑانے کی آواز سنی۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید دلازادی کے آثار تھے۔ نعیم کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر اس نے نظریں چرائیں۔

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" نعیم نے فکر مندی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
اٹے لٹکتے ہوئے بورڈوں کے نیچے نیچے، ایک دوسرے کو تھامے ہوئے، وہ چلتے گئے۔

(۲۱)

۱۹۴۳ء کے موسم گرما میں نعیم کو ایک اور بلا خیز تجربہ ہوا۔ وہ واقعہ اپنی جگہ پر ایک نیا تجربہ ہونے کے علاوہ اس کی زندگی میں ایک انوکھے، انجانے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ واقعہ اس روز پیش آیا جب چار دن کی مسلسل بارش کے بعد دھوپ ٹھکی تھی اور نعیم نے پہلی بار کسی اونچی جگہ سے مجمعے سے خطاب کیا تھا۔

وہ یادگار دن تھا۔ اس روز ہوا میں برساتی پروں والے مکوڑے اڑ رہے تھے اور کیکروں پر جھینگر بول رہے تھے۔ جھینگر جو ایک سانس میں اتنے زور سے چلائے جاتا ہے کہ کہیں پر دکھائی نہیں دیتا۔ پیڑوں پر جھینگر اور برساتی نالوں کے کنارے مینڈکوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، اور گاؤں کے بچے اور کام چور نوجوان ستلی کے جال کندھوں پر رکھ کر کہیں مارتے ہوئے مچھلیاں پکڑنے کو چل دیے تھے اور اپنی تفریح کے حق میں یہ دلیل دے رہے تھے کہ چار روز سے مستقل اندر بیٹھ بیٹھ کر وہ عموماً بنتے جارہے تھے اور مچھلیاں مکوڑے کھا کھا کر فریہ ہوتے جارہے تھے۔ ایک لحاظ سے یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔

چند روز پیشتر نعیم کو جاٹ نگر میں جلسہ منعقد کرنے کے سلسلے میں دلی سے ہدایات موصول ہوئی تھیں۔ چنانچہ بارش سے بھگے ہوئے چاروں کھونٹ میں اس نے اپنے گھڑ سوار دوڑا دیے اور خود بھی روزانہ فوجی برساتی اوڑھ کر جاٹ نگر جانے لگا۔ جاٹ نگر آس پاس کے دو سو گاؤں میں سب سے بڑا گاؤں تھا اور اناج اور کپاس کی بڑی بھاری منڈی تھی۔ انہوں نے منڈی کے احاطے میں جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بارش سے بچاؤ کی خاطر کئی سو گز ٹاٹ جوڑ کر بڑی سی تریپال بنائی گئی جسے موٹے موٹے رسوں کی مدد سے باندھ کر سائے کا انتظام کیا گیا۔ مگر قسمت سے اس روز دھوپ ٹھکی آئی اور کیکروں پر جھینگر ایک تال سے بولنے لگے۔

صبح دس بجے نعیم کاؤں میں داخل ہوا تو پولیس کی جمعیت کو دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ اتنے دنوں سے جلسے کی خبر اڑنے کے باوجود جاٹ نگر میں پولیس کا کوئی آدمی نہ دیکھ کر وہ بے چین ہو رہے تھے۔ یہ جلسے جلوسوں کی ممانعت کا علاقہ تھا۔ ان کے دس میں سے نو اجتماع خلاف قانون ہوتے تھے، اور وہ روز روز کی پولیس کی موجودگی کے اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ اس موقع پر ان کی غیر موجودگی انہیں کھٹکنے لگی تھی۔ آخر اس روز انہیں موجود پا کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ سب ہندوستانی پولیس کے لٹھ بند جوان تھے اور ان میں سے سوائے چند افسروں کے کوئی بھی مسلح نہ تھا۔ ان جلسوں میں، ہر چند کہ خلاف قانون ہوتے، بلوے کا زیادہ امکان نہ ہوتا، جس کی وجہ سے مسلح کارڈ کی ضرورت نہ سمجھی جاتی اور زیادہ سے زیادہ لائٹھی چارج کی نوبت آتی۔

لائٹھیاں پٹک پٹک کر اکھڑ انداز میں چلتے اور کسانوں کے دروازوں پر کھڑے ہو کر لسی پیتے ہوئے پولیس کے جوانوں کے پاس سے گزر کر نعیم مقررہ جگہ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ پولیس کی بھاری تعداد نے منڈی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ منڈی میں داخل ہونے کا واحد راستہ لکڑی کے لمبے لمبے تختے، جو رسوں کی مدد سے ایک دوسرے سے بندھے تھے، کھڑے کر کے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے آگے پہرہ لگا تھا۔

بڑی دیر تک ادھر ادھر سے اندر گھسنے کی ناکام کوششیں کرنے کے بعد نعیم اور اس کے ساتھیوں کو لکڑی کے تختوں کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھ رہنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ زمین گیلی اور اونچی تھی اور جگہ جگہ پر بارش کا پانی کھڑا تھا۔ جوں جوں سورج اوپر آتا جا رہا تھا دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی اور نم زمین سے بھاپ اٹھ اٹھ کر جس پیدا کر رہی تھی۔ یہ برسات کا مخصوص، تکلیف دہ موسم تھا۔ اس کے ساتھ ہی زائرین جلسہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب تک سورج سر پر آیا منڈی کے سامنے کا میدان اور اس سے آگے بازار کا ایک حصہ کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ یہ جاٹ نگر کے علاوہ ارد گرد کے کئی کاؤں کے لوگ تھے جو جلسے کی خبر پا کر پہنچے تھے۔ اس بولا دینے والے موسم میں انتظار کرتے کرتے جب کچھ بن نہ آئی تو انہوں نے واویلا شروع کر دیا۔

سب سے آگے نعیم اور اس کے ہمراہ چند لوگ، جو جلسے میں بولنے کے لیے دلی سے آئے تھے، زمین پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ پیچھے مڑ کے دم بدم بیتاب ہوتے ہوئے مجمعے کو دیکھ لیتے۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر پولیس کے سپاہی لاپرواہی سے لائٹھیاں پٹکاتے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے لکڑی کے وہ تختے تھے جن کی حفاظت کا ذمہ ان کے سر تھا۔ لیکن اب وہ مجمعے کے خاموش احتجاج سے اس حد تک اکتا چکے تھے کہ تختوں کے دروازے کو چھوڑ کر دور دور تک چلے جاتے، کبھی بیٹھنے والوں کے پاس آ کر

مصنوعی غصے کے ساتھ انہیں دھمکاتے اور کبھی ان کا ٹھٹھہ اڑانے لگتے۔ کچھ دیر پہلے نعیم کی توجہ اس کے ایک ساتھی نے ایک تختے کی طرف دلائی تھی جو کسی وجہ سے ٹوٹ چکا تھا اور ایک پتلے سے رے کے ذریعے لٹک رہا تھا۔ رستہ، جو تختے کے ٹوٹنے سے بن گیا تھا، ایک آدمی کے گزرنے کے لیے کافی تھا۔

وہ بیٹھے انتظار کرتے رہے اور زمین کی گرم مرطوب بھاپ ان کے سروں میں چڑھتی رہی اور برسات کی کڑی دھوپ ان کے بھیجے پگھلاتی رہی اور طویل، صبر آزما، بیکار انتظار نے ان کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نعیم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ سپاہی، جس نے ابھی ابھی انہیں اپنی ماؤں کے ساتھ جا کر سونے کا مشورہ دیا تھا، پندرہ گز کے فاصلے پر پرے جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا کوئی اور ساتھی بھی دس دس گز کے فاصلے پر نظر نہ آ رہا تھا۔ دفعتاً نعیم نے ہوا میں ایک جست بھری اور ٹوٹے ہوئے تختے کے راستے سے صاف گزر گیا۔ ساتھ ہی اس کے تین چار ساتھیوں نے چھلانگیں لگائیں اور اسی راستے سے اندر داخل ہو گئے۔ تقریباً اسی وقت سارا ہجوم بلبلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے پر ٹوٹ پڑا۔ تین چار تختے ایک ساتھ ٹوٹ گئے اور اچھلتے کودتے، ریلٹے پلٹتے ہوئے مضبوط، محنتی کسانوں کا مجمع ایک دیوار کی طرح حرکت کرتا ہوا گزرنے لگا۔ یہ سارا واقعہ اس قدر تیزی سے اور میکانیکی طور پر عمل میں آیا کہ چند لمحوں کے لئے پولیس کے سپاہی حیران و پریشان اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ایسا پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ پہلے کبھی اگر منتخب جگہ کو روک دیا جاتا تو لوگ جہاں کٹھے ہو جاتے وہیں پر جلسہ کر لیا کرتے، لیکن یہ تو صریحاً سول نافرمانی تھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ حواس یکجا کرتے پچاس کے لگ بھگ کسان اندر پہنچ چکے تھے۔ دیکھتے دیکھتے لکڑی کے تختوں کی باڑ دھڑام سے زمین پر آگری اور چند لوگ اس کے نیچے آکر زخمی ہو گئے۔ اب پولیس کی برستی ہوئی لائٹیوں کے نیچے مجمع دوڑتا ہوا منڈی کے احاطے میں داخل ہونے لگا۔

نعیم بھاگتا ہوا کپاس کی گیلی کاتھوں کے ایک ڈھیر پر جا چڑھا۔ سب سے اونچی کاتھ پر کھڑے ہو کر اس نے لوگوں کو خاموش کرانے کے لیے سیدھا بازو فضا میں بلند کیا۔ آگے آگے کے لوگ خاموش ہو کر قریب سرک آئے اور آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ عقب میں مجمع ابھی تک دوڑ بھاگ رہا تھا اور پولیس کی لائٹیاں برس رہی تھیں۔ نعیم نے بولنا شروع کیا۔ اس کا جلسے کو خطاب کرنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ اس کام کے لیے دلی سے چند لوگ آئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ہجوم میں کم ہو چکے تھے اور نعیم اسی میکانیکی قوت کے زیر اثر اوپر جا چڑھا تھا۔ اس کے پاس کہنے کو کوئی خاص بات نہ تھی، پھر بھی اس نے بولنا شروع کر دیا اور کئی منٹ تک بے سکان بولنا چلا گیا۔ اس کا ایک بازو مستقل ہوا میں اٹھا ہوا تھا۔ اس

وقت اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ کب اس نے بولنا شروع کیا تھا اور کب ختم کیا، یا یہ کہ اس نے کیا کہا۔ بعد میں اسے صرف اتنا یاد رہا کہ وہ ان سے پر امن رہنے کے سلسلے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن بے خودی کے اس لمحے میں اسے کسی شے کی خبر نہ رہی۔ اس نے ایک عجیب کیفیت اپنے اوپر طاری ہوتی ہوئی محسوس کی۔ اس کیفیت کے دوران صرف اس کی آنکھیں اور اس کا احساس کام کرتا رہا۔ اس کے سامنے، بلکہ اس کے نیچے، پھیلتا سکڑتا، اٹھتا بیٹھتا اور پھٹتا دبتا ہوا مجمع، مجمع نہ رہا تھا، یا افراد کے ہجوم کا تصور غائب ہو چکا تھا۔ اب یہ محض ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو اپنی ہی قوت کے تحت پھیل اور سکڑ، اٹھ اور بیٹھ رہا تھا اور جس کی کمان اس کے ہاتھ میں تھی، وہ جو سب سے اوپر اکیلا کھڑا تھا، اکیلا اور قوی اور غالب! خود مختاری کے اس لمحے میں اپنے آپ سے، اس سارے منظر سے الگ ہو کر اس نے یہ سب دیکھا اور محسوس کیا، اور اسے اپنے آپ پر ایک ایسی ہستی مطلق کا گمان ہوا، اس ٹھوس، ابلتے ہوئے لاوے کے سیلاب کی تمام تر نقل و حرکت جس کے قبضے میں تھی۔ اپنے اس اختیار کو عمل میں لانے کے لیے اس نے بازو سے ہوا میں چند بے تکی اشارے بھی کیے۔ اس انوکھی کیفیت کو موثر طریقے پر الفاظ میں بیان کرنا تقریباً ناممکن ہے، لیکن یہ ان محدودے چند بلاخیز ذاتی تجربوں میں سے ایک تھا جن سے کہ عمر بھر اسے کبھی گزرنا پڑا تھا۔

جب وہ اسے گرفتار کرنے کے لیے آئے تو وہ بازو سر سے اوپر اٹھائے، نیم وا، پُر سکوت آنکھوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے جھٹکے سے اس کا بازو نیچے کیا اور جب وہ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنانے لگے تو حیران رہ گئے۔

اسی موسم گرما کی ایک چمکدار صبح کو روشن پور کے باہر بہت سے بچے کنکروں کی گولیاں کھیل رہے تھے کہ اچانک ان میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ لڑ بھڑ کر تتر بتر ہو گئے۔ لڑائی کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ کنکروں کے لین دین پر ہوگی، یا دھکم پیل میں کسی کے ضرب آگئی اور وہ سبج پا ہو گیا، بہر حال ایک مختصر سی دھنکا مستی کے بعد سب نے اپنے اپنے قیمتی پتھر فوضے میں کیے اور چھوٹی چھوٹی ٹولیاں میں بٹ کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جگہ، جہاں کچھ دیر پہلے چیخ و پکار مچی تھی، ویران ہو گئی۔۔۔ صرف ایک لڑکا، جسے چند لڑکوں نے پکڑ کر زد و کوب کیا تھا، بیٹھا روتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نے رونا بند کر دیا اور غصے میں بھرا اٹھلی سے مٹی میں لکیریں کھینچتا رہا۔ لکیریں کھینچتے کھینچتے اسے چند کنکر دکھائی دیے جو مٹی میں چھپے تھے اور افراتفری میں کسی کے رہ گئے تھے۔ اس نے انہیں اٹھا کر ہتھیلی پر رکھا، پھونک مار کر گرد اڑائی، پھر کرتے کے دامن سے رگڑ کر صاف کیا اور ان پر نظریں جما کر ہنسنے لگا۔ وہ بڑے خوبصورت پتھر تھے، شیشے کی طرح چمکدار اور دودھ کی طرح سفید۔ لڑکا انہیں جیب میں ڈال کر

اٹھ کھڑا ہوا اور گرد سے اٹا ہوا کرتا جھاڑ کر خوشی خوشی ایک طرف کو چل دیا۔
 اس سے پہلے بڑے لڑکوں کا جو ہجوم بکھرا تھا اس میں علی بھی تھا۔ اس نے عائشہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ عائشہ بہت سے پیپیل کے پتے جیب میں ٹھونے ہوئے تھی اور ایک ایک پتا نکال کر ان کی پیپنیاں بناتی جا رہی تھی۔ لیکن پتے خستہ اور خشک تھے اور گولانے کی کوشش میں ٹوٹے جا رہے تھے۔ جھلا جھلا کر ایک کے بعد ایک پتا پھینکتے ہوئے وہ ہاتھ کی پشت سے مستقل بالوں کی لٹ کو پیچھے کیے جا رہی تھی جو ہوا کے زور سے بار بار اس کی آنکھوں پر آگرتی تھی۔ جب اس کی جیب کا ابھار نمایاں طور پر کم ہونے لگا تو اسے نقصان کا خدشہ ہوا اور وہ دیر دیر کے بعد پتے نکالنے لگی۔ ہر پتا نکالنے کے بعد وہ ہاتھ کی کستی سی بنا کر چوب پر رکھتی اور پتوں کی مقدار کو جانچتی اور ہر بار کھٹتی ہوئی تعداد کا خیال کر کے اس کا دل دہل جاتا۔ پتوں کے ختم ہونے تک وہ صرف ایک بار پیپی کی آواز نکال سکی تھی اور وہ بھی چند سیکنڈ کے لیے۔ پھر پتا تڑخ گیا اور ہوا پہلو میں سے سرکنے لگی۔ رونکھی سی ہو کر اس نے آخری پتا منہ میں ڈال کر چبایا اور سبز رنگ کا تھوک اگلا۔ پھر وہ اداس سی ہو کر چلنے لگی۔
 علی ایک دوسرے لڑکے کے ساتھ، جو ان کے ہمراہ چلا آ رہا تھا، باتیں کرنے میں مشغول تھا۔
 ”سلیمان نے جس بنٹے پر فساد کیا ہے اس کا میں اٹے ہاتھ سے نشانہ لگا سکتا تھا۔“ علی کہہ رہا تھا۔

علی کی بات سن کر دوسرا لڑکا، جو چھوٹی عمر کا مگر بہت بڑے سر اور چہرے کا مالک تھا، زعم میں آگیا اور تھنے پھلا کر شیخی سے بولا: ”سلیمان؟ سلیمان تو رونے والا ہے رونے والا۔ میں اس بنٹے کا اٹے پاؤں سے نشانہ کر سکتا تھا۔ وہ روتا ہے اور فساد کرتا ہے۔ جب دھمکاؤ تو چوہا بن جاتا ہے۔ تم نے دیکھا؟“ بات ختم کر کے وہ فخریہ طنز کے ساتھ ہنسا۔
 ”میں اسے جانتا ہوں۔ گھوڑ دوڑ پر ہماری گھوڑی اس کے پاس سے گزری تھی تو اس کی ہوا سے ہی وہ گر پڑا تھا اور دونوں سچے پیشاب وہیں پر نکل گئے تھے۔“ بات کو ختم کر کے علی نے اپنے دوست کے فخریہ طنز کے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی، کیونکہ یہی ایک چیز تھی جس کی وجہ سے وہ اس بڑے سروالے بد صورت لڑکے کو پسند کرتا تھا اور اسے یہ احساس تھا کہ اس بات میں وہ کبھی ڈھنگ سے اس کی نقل نہ کر سکتا تھا۔

”تمہاری گھوڑی اچھی تھی۔ بیچاری بخار سے مر گئی۔“ دوسرے لڑکے نے کہا۔
 ”لیکن وہ گھاس کو سونکھتی بھی نہ تھی۔ بس سبز چارہ کھاتی تھی۔“ علی نے کہا۔
 ”سبز چارہ پیٹ لٹکا دیتا ہے۔“

”اس کی قصبت ہی خراب تھی۔ جب سے مری ہے ہمارا چارہ خوب ہو رہا ہے۔“
 ”یہ چارے کا موسم ہے۔ کاٹ کاٹ کر ہاتھوں میں گلٹیاں پڑ گئی ہیں۔“ اس نے

چھوٹا سا سخت ہاتھ پھیلایا جس کی انگلیاں تڑخی ہوئی تھیں۔

”گلتیاں اچھی ہوتی ہیں۔ تم گھوڑی کو خوب ٹھونک سکتے ہو۔“ علی پھر اسی پسندیدہ انداز

میں ہنسنا۔

”ہاں۔ گلتیاں اچھی ہوتی ہیں۔ ایک بار پڑ جائیں تو پھر نہیں ٹوٹتیں۔“ اسی طرح راستہ

چلتے ہوئے وہ بچوں کے شیخی خورے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ گاؤں کے باہر ایک شکستہ

دیوار والے مکان کے قریب پہنچ کر دوسرے لڑکے کی چال دہیمی پڑ گئی۔

”میرا گھر آگیا ہے۔“ اس نے کہا۔ پھر کوئی مزید بات کیے بغیر وہ اپنے اپنے راستے پر مڑ

گئے۔

جب وہ دونوں اکیلے رہ گئے تو عائشہ نے علی کی آستین پکڑ کر کھینچی: ”علی۔۔ علی۔“

”ہنہ۔“ وہ اکھڑوں کی طرح بولا۔

”ہمیں پیپل پر سے پتے اتار دو۔“ لڑکی نے لجاجت سے کہا۔

”کیوں؟“

”پینیاں بنائیں گے۔“

”کہاں ہے۔“ علی اس طرف سے، جدھر پیپل تھا، نظر ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”وہ ہے۔ وہ ہے۔“ عائشہ نے اس کا بازو کھینچا، کندھا کھینچا، پھر ٹھوڑی سے پکڑ کر

چہرہ گھمایا اور انگلی ناک کی سیدھ میں کر کے درخت دکھایا۔ ”وہ ہے۔“

”اچھ چچ ا؟“ وہ آنکھیں سکیڑ کر دیکھتے ہوئے بولا، یوں جیسے بڑی دقت سے پیپل کو

دیکھنے میں کامیاب ہوا ہو۔

پیڑوں پر چڑھنے کا وہ شوقین تھا لیکن اس وقت عائشہ کی خواہش کے مقابل سخت گیر ہو

گیا۔

”چلو۔“ اس نے آہستہ لیکن با اختیار لہجے میں کہا۔

پیپل سے ذرا فاصلے پر اس نے بازو عائشہ کے کندھے پر سے اٹھا لیا۔ درخت کی جڑ کے

پاس پہنچ کر رک گیا اور اونچی اونچی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”یہ۔ یہاں سے چڑھو۔“ عائشہ نے تنے کے بڑے بڑے سوراخوں میں اشارہ کرتے

ہوئے بتایا۔ وہ چپکا کھڑا رہا۔ لڑکی تنے پر ہاتھ رکھ کر تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم راول کے ساتھ کیوں کھیلتی ہو؟“ علی نے سختی سے پوچھا۔

”راول؟ وہ بھی میرے ساتھ کھیلتا ہے۔“

”ہنہ۔“ اس نے غصے اور طنز کی ملی جلی آواز ناک میں سے نکالی، ”وہ اس پر نہیں چڑھ

سکتا۔“

”اچھا! عائشہ آنکھیں پھیلا کر بولی، ”پتا نہیں۔“

”پتا نہیں کیا ہوا؟“ وہ چیخا، ”وہ اس پر نہیں چڑھ سکتا۔ بس۔“

کچھ دیر تک وہ تند نظروں کے ساتھ عائشہ کی طرف دیکھتا رہا، پھر سامنے سے درخت پر چڑھنا شروع کر دیا، جہاں پر کہ چڑھنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

تھی سی لڑکی سہمی ہوئی خاموش کھڑی اس کی پے درپے ناکام ہوتی ہوئی کوششوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس سے نہ رہا گیا اور تے کے سوراخوں کی طرف اشارہ کر کے مری ہوئی آواز میں بولی:

”یہ۔۔۔۔۔ ادھر سے چڑھو۔“

”تم میرے کام میں دخل نہ دو۔“ علی جھڑک کر بولا اور پیپل کے ہاتھی جیسے تے کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔ آخر وہ اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ بندر کی طرح ایک سے دوسری شاخ پر پھلانگتے ہوئے اس نے سوکھے سوکھے پتے نیچے پھینکنے شروع کیے۔

”ہرے ہرے پتے پھینکو۔“ عائشہ نے کہا۔

”ہرے ہرے پتے نہیں ہیں۔“ وہ بے اعتنائی سے بولا۔

عائشہ بھری ہوئی کھڑی خاموشی سے گرتے ہوئے خشک پتوں کو دیکھتی رہی۔ علی ایک شاخ کو گھوڑی بنا کر بیٹھ گیا۔

”یہاں۔ کہیں راول آ سکتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”نہیں“ سہمی ہوئی آواز میں نیچے سے عائشہ نے جواب دیا اس پر وہ خوش ہو گیا، لیکن اپنی مسرت کا کھلے بندوں اظہار کرنے کی بجائے چالکی سے ہونٹوں میں مسکراتا ہوا شاخوں میں پھرنے لگا۔ صرف اس نے اتنا کہا:

”یہاں ہرے پتے بھی ہیں۔“

عائشہ دوڑ دوڑ کر سبز اور نرم پتے اٹھانے لگی۔ جب اس کی جیب بھر گئی تو خوشی سے منہ اٹھا کر بولی: ”اب آ جاؤ۔“

پیپل کی پھیلی ہوئی جڑوں پر بیٹھ کر وہ دونوں پیپنیاں بناتے اور بجاتے رہے۔ سورج کے اٹھنے کے ساتھ ساتھ ہوا گرم ہوتی جا رہی تھی اور جیٹھ کی کڑی دھوپ کھیتوں اور فصلوں پر پھلتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ مویشی اور کسان ہانپتے ہوئے جا کر سائے میں بیٹھ گئے اور گاؤں کی زمینوں اور کلیوں میں ایک عام دیہاتی وحشت پھیل گئی۔ مشقت اور گرمی کے اس وقت میں علی اور عائشہ پیپل کی جڑوں پر بیٹھے پیپنیاں بجا رہے تھے اور گپیں مار رہے تھے۔ پیپل کا سایہ گھنا اور خشک تھا اور گرمی کے مارے ہوئے کوئے اور چڑیاں پتوں میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور ادھر ادھر بیٹھیں کر رہے تھے۔ دونوں بچوں کے قریب سے ٹھنڈے کنوئیں کے پانی میں نالی ہلکے شور کے ساتھ بہ رہی تھی۔ اوپر سے ایک ایک دو دو کر کے چڑیاں آتیں، پانی میں ڈبکیاں لگاتیں اور پر جھٹک کر واپس چلی جاتیں۔ ان کے پروں سے پانی کے تھے تھے قطرے اڑتے

اور ہوا کے زور سے بچوں کے کالوں اور آنکھوں پر آگرتے ۔
جب پتے ختم ہو گئے تو علی نے جیب میں سے پتھر نکالے اور پیپل کے تنے پر رگڑنے لگا ۔

”پیپل کی چھال سے بنٹے چمک جاتے ہیں ۔“ اس نے کہا
عائشہ نے بھی اپنے کنکر نکال کر تنے پر کھسنے شروع کر دیے ۔ میچ میچ میں وہ چھوٹی چھوٹی بے ترتیب باتیں کرتے اور زور شور سے اپنے اپنے پتھر درخت پر گھستے جا رہے تھے ۔ علی نے اپنا پتھر ہتھیلی پر رکھ کر اس پر تھوکا اور گرتے سے صاف کیا ۔
”میرا چمک گیا ہے ۔“

عائشہ نے بھی اس کی نقل اپنا اپنا پتھر تھوک سے صاف کیا اور دکھا کر بولی : میرا بھی چمک گیا ہے ۔“

علی چڑ گیا اور گھٹنوں کے بل اوندھا ہو کر اسے درخت کی جڑ پر زور زور سے کھسنے لگا ۔ لڑکی نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا ۔ دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے ۔ پھر علی اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ ”میرا زیادہ چمکدار ہے ۔“ اس نے کہا ۔
”میرا بھی چمکدار ہے ۔“
”میرا زیادہ ہے ۔“
”نہیں میرا ۔“

”میں نے پتے اتار کر نہیں دیے تھے ؟“

عائشہ مرعوب ہو کر چپکی ہو گئی ۔ علی غصے میں بھرا آہستہ آہستہ پتھر جڑ پر رگڑتا رہا ۔
”اگر زیادہ باتیں کرو گی تو کمال کی چٹکی بھر لوں گا ۔“ پھر اس نے کہا اور ساتھ ہی اس کے کمال کی چٹکی بھر لی ۔ عائشہ کا منہ لال ہو گیا ۔ اس نے آتشیں نظروں سے علی کو دیکھا ۔ غصے کے جھٹکے سے بالوں کی ایک لٹ اس کے بھبھوکا چہرے پر آگری تھی اور وہ پھری ہوئی اسے دیکھے جا رہی تھی ، دیکھے جا رہی تھی ۔ علی کھسیانا ہو گیا ۔ بولا :
”کیوں ، راول نے تمہارے کمال کی چٹکی نہیں لی تھی کل ؟ میں نے دیکھا تھا ۔“
دفعتاً عائشہ رونے لگی ۔ علی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ لڑکی کی آواز لحظہ بہ لحظہ اونچی ہوتی جا رہی تھی ۔

”اچھا ۔ اب کچھ نہ کہوں گا ۔ اب چپ ہو جاؤ ۔“ اس نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن وہ روتی رہی ۔
”اچھا ۔ تم راول کے ساتھ جا کر کھیلو بیشک ۔ جاؤ ۔“ اس نے کہا ۔ وہ اسی طرح روں روں کرتی رہی ۔

”اچھا یہ لو۔“ علی نے کنکر آگے بڑھایا۔ اس کی چمک دیکھ کر عائشہ للچا گئی اور آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا، لیکن رونا بند نہ کیا۔

”یہ لو۔ میرے پاس اور بھی ہیں۔ سب تم لے لو۔“ علی نے سارے خوبصورت پتھر اس کے حوالے کر دیے۔ آہستہ آہستہ وہ خاموش ہو گئی۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ علی نے بازو اس کے کندھے پر رکھا اور وہ گھر کی جانب چل پڑے۔

ابھی وہ گھر سے ذرا فاصلے پر تھے کہ علی نے بڑی ماں کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ دوسری کھلی میں غائب ہو گئی تو علی عائشہ کو کھینچتا ہوا بھاگنے لگا۔ مویشیوں کے احاطے میں داخل ہو کر وہ بولا: ”تم یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“

”مجھے بھوک لگی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔“

دبے پاؤں صحن میں داخل ہو کر اس نے دیکھا گرمیوں کی دوپہر اپنے عروج پر تھی اور اس کا جادو، جو خاموشی اور ویرانی کا جادو ہوتا ہے، انسان اور حیوان پر یکساں چل چکا تھا۔ چھوٹی ماں کے کمرے کا کواڑ کھلا تھا اور وہ عائشہ کی ماں کے ساتھ زمین پر سوئی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ صحن کے کونے میں جو ذرا سا سایہ تھا وہاں گائے اور اس کا بچھڑا آنکھیں میچے بیٹھے تھے اور دونوں کے سروں پر ایک ایک کوا بیٹھا خاموشی سے زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ کھلی اور ویران جگہوں کا ایک پر سکوت سحر تھا جسے محسوس کر کے وہ دل میں خوش ہوا۔ صحن کو پار کر کے وہ بڑی اماں کے پاس باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ کونے میں کچی دیواروں کا ڈربہ سا بنا تھا۔ اس نے آہستہ سے اس کا کواڑ ہٹایا اور اندر گھس گیا۔ ڈربے کی چاروں دیواروں میں سوراخ تھے اور دھواں، جو سارے میں بھرا تھا، سوراخوں کے رستے آہستہ آہستہ باہر نکل رہا تھا۔ درمیان میں اپلوں کی آگ پر دودھ کی بھری ہوئی ہانڈی رکھی تھی دودھ پر سرخ رنگ کی موٹی بالائی کی تہہ جم چکی تھی۔ علی دھوئیں سے اندھا ہو رہا تھا لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کر جانی پہچانی جگہ پر سے ایک لمبا سا ناڑ اٹھایا اور پھونک مار کر اسے صاف کیا۔ پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بالائی کو احتیاط سے ایک طرف ہٹایا اور ناڑ کا سرا دودھ میں ڈبو کر دوسرے سرے سے پینے لگا۔ سرخ مائل میٹھا گرم ریشمی سیال اس کے حلق میں اترنے لگا۔ دودھ گاڑھا اور مقوی تھا، چنانچہ چند گھونٹ سے ہی وہ سیر ہو گیا۔ ناڑ کو دودھ میں سے نکال کر کرتے کے دامن سے صاف کرنے کے بعد اس نے اسے واپس رکھا، اٹھکی سے بالائی کو اپنی جگہ پر پھیلایا اور بے آواز قدموں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ تازہ ہوا میں دو چار لمبے لمبے سانسوں کے ساتھ دھواں، جو اس کی ناک اور حلق میں بھر گیا تھا، صاف کرنے کے بعد اس نے کہا: ”چلو۔“

عائشہ کے گلے میں بازو ڈال کر وہ چل پڑا۔ عائشہ چند قدم دھیرے دھیرے اس کے

ساتھ چلی ، پھر رک گئی ۔

”تم کل جا رہی ہو ؟“ علی نے پوچھا ۔

وہ خاموش کھڑی رہی ۔

”کیا ہے ؟ چلو ۔“

”مجھے بھوک لگی ہے ۔“

”جاؤ جا کر دودھ پی آؤ ۔“ علی نے اس کے گلے سے بازو نکال کر کہا ، ”ہمارا مت پینا ۔

بڑی ماں کا پینا ۔ اور سیدھے ہاتھ کے کونے میں میرا ناڑ پڑا ہے ، اس سے پینا ۔ اور بالائی
مت توڑنا ، پی کر برابر کر دینا ، نہیں تو پتا چل جائے گا ۔“

وہ وہیں کھڑی کھڑی بسورتی رہی ۔

”جاؤ ۔ میں یہیں کھڑا ہوں ۔“

”میں نہیں پیتی دودھ ۔“

”کیوں ؟“

”مجھے قے ہوتی ہے ۔“

”ہنہ ۔“ علی اپنے پسندیدہ انداز میں ہنسا ، ”عورتیں نخرے کرتی ہیں ۔ میں دو سیر دودھ

پی سکتا ہوں ۔ پر مرد تو نخرے نہیں کرتے ۔ اچھا ٹھہرو ، تم یہیں پر ٹھہرو ۔“

لومڑی کی طرح چلتا ہوا وہ بڑی ماں کے دروازے پر جا کر کھڑا ہوا ۔ کچھ دیر تک اکیلے ہی
زنگ آلود کنڈی کو کھولنے کی کوشش کرنے کے بعد وہ باہر آیا اور اشارے سے عائشہ کو بلا کر لے

کیا ۔

”گھوڑی بنو ۔ یہاں ۔ آں بس ۔ بیٹھنا نہیں ، چونڈی گھاؤں کا نہیں تو ۔“ اس نے

آہستہ سے اس کے بالوں کی لٹ پکڑ کر کھینچی ۔ لڑکی غصے سے سرخ ہو گئی مگر چاروں ہاتھوں

پاؤں پر گھوڑی بنی رہی ۔ علی نے اس کے اوپر کھڑے ہو کر کنڈی کھولی اور وہ اندر داخل ہوئے ۔

”بٹھا دو ۔“ اس نے عائشہ کی جیب سے ایک پتھر نکالا ۔ اسے استعمال کرنے سے پہلے وہ

دیر تک اوپر چھتی پر پڑی ہوئی گھڑیا کا نشانہ باندھتا رہا ۔ پتھر عین نشانے پر پڑا اور کچی گھڑیا میں

بڑا سا سوراخ ہو گیا جس میں سے گڑ کی ڈھیلیاں نیچے گرنے لگیں ۔

انہیں جیبوں میں بھر کر جب وہ باہر نکل رہے تھے تو بڑی ماں صحن میں داخل ہوئی ۔

دونوں بچوں کے اوسان خطا ہو گئے ۔ بڑی ماں وہیں سے چلائی :

”ٹھہر جاؤ چورو ۔ آج تمہاری بوٹیاں کروں گی ۔“

وہ دونوں آگے آگے اور بڑی ماں اونچی آواز سے کوستی ہوئی پیچھے پیچھے بھاگنے لگی ۔ اسی
طرح انہوں نے تپتے ہوئے صحن کے تین چکر لگائے ۔ پھر وہ دونوں بچپن کی پھرتی اور قوت کے

بل پر بوڑھی عورت کی زد سے نکل بھاگے۔

جب وہ احاطے سے باہر نکل رہے تھے تو عائشہ رونے لگی۔

”کیا ہے؟“ علی نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

”میرے پیر جل گئے ہیں۔“

”ہنہ، یہ عورتوں کے نخرے ہیں۔“ وہ سختی سے بولا، لو، یہ گڑ کھاؤ۔“

عائشہ اس سے گڑ لے کر کھانے لگی۔

”تم کل جا رہی ہو؟“

”ہاں۔“

باہر سنسان دوپہر اسی طرح تپ رہی تھی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے جوہڑ کی طرف چلے گئے جدھر درختوں کا سایہ تھا۔

اگلے روز عائشہ اور اس کی ماں رخصت ہوئے۔ عائشہ کی ماں نے، جو علی کی خالہ تھی، اسے پاس بلا کر چوما اور سر پر پیار دیا۔ پھر دونوں ماں بیٹی گھوڑیوں پر سوار ہوئیں۔ جب دونوں بہنیں دنیا بھر کی باتیں کر چکیں تو گھوڑیاں، جو رخصت ہوتے ہوئے مہمانوں کو لے کر جانے کی عادی تھیں، بغیر اشارے کے چل پڑیں۔

دھوپ زرد ہو رہی تھی اور دونوں گھوڑیاں جوہڑ کے کنارے آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ جوہڑ کے پانی میں ان کے زرد عکس دوسرے کنارے پر چلتے ہوئے کسانوں کو دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پانی میں ان کا عکس دیکھ کر چونکتے اور ان کی طرف اشارہ کر کے کہتے: ”نعیم کے جانور اچھی نسل کے ہیں۔ اس کی موسی جا رہی ہے۔“ دو ادھیڑ عمر کسان ان کو دیکھ کر رکے، ایک نے ہاتھ ہوا میں اٹھا کر بلند آواز میں کہا: ”نعیم کی موسی، اللہ فضل کرے۔“ گو وہ نعیم کی بجائے علی کی خالہ تھی لیکن کاؤں کے لوگ خوشامد کے طور پر یہی کہہ کر بلاتے اور اس گھر کا ہر فرد نعیم کا نام اپنے نام کے ساتھ منسوب دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ کسان کے جوا بیہیں اس نے دوسرے کنارے سے ہاتھ ہوا میں اچھالا اور منہ میں کہا: ”اللہ فضل کرے“، جس کی آواز دوسرے کنارے تک نہ پہنچ سکی۔ دونوں کسان تھوڑی دیر تک کھڑے سادہ، شہوانی نظروں سے اسے دیکھتے رہے، پھر اس نے کہا: ”خوب عورت تھی، اب تو ڈھل گئی ہے“ اور ہنس کر اپنے راستے پر ہو لیے۔ اسی طرح انہوں نے اونچی آواز میں الوداع کہا اور جونہ جاتے تھے انہوں نے محض پسندیدگی کی نظروں سے اسے اور اس کی گھوڑی کو دیکھا اور گھر جا کر اپنی عورتوں سے ان کا تذکرہ کیا اور اس طرح سارے کاؤں کو پتا چل گیا کہ کاؤں سے باہر، بڑے مکان میں رہتے تھے۔

علی جوہڑ کے کنارے بڑے پتھر پر بیٹھا تھا۔ آج دن بھر وہ کھیلتا رہا تھا اور ایک بار بھی

کھیتوں پر نہ گیا تھا۔ دوپہر پلنے تک وہ ایک سو سے زیادہ بار عائشہ سے پوچھ چکا تھا: ”آج تم جا رہی ہو؟“ اور ہر بار اس کے اثبات میں جواب دینے پر ایک سخت سی ”ہنہ“ کر کے بچپن کے غرور میں اس کو ٹال گیا تھا، لیکن دوپہر کے بعد جب وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے تو وہ دفعتاً خاموش ہو گیا۔

جب عائشہ کی گھوڑی اس کے برابر پہنچی تو وہ اٹھ کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔“ اس نے کہا

”کیوں؟“ عائشہ نے پوچھا۔

”راستہ خطرناک ہے، عورتوں کو اکیلے نہیں جانا چاہیے۔“

”کیا ہے؟“

”رستے میں بھیڑیے ہیں۔ جنگل میں۔۔۔“

”ہنہ۔۔۔ ہمارے پاس گھوڑیاں ہیں۔“ عائشہ نے بد دماغی سے جواب دیا۔

”وہ گھوڑیوں کو پھاڑ کھاتے ہیں اور عورتوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔“

”ارے باپ رے۔“ عائشہ آنکھیں پھیلا کر دہشت سے بولی، ”پھر؟“

”کوئی فکر نہیں۔ میں ساتھ جاتا ہوں۔“

عائشہ احسان مندی سے اس کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

انہوں نے روشن پور کے کھیت پار کر لیے تھے اور اب دوسرے گاؤں زمینوں میں چل

رہے تھے۔ عائشہ کی ماں کی گھوڑی آگے نکل چکی تھی اور علی سینے پر بازو باندھے عائشہ کی گھوڑی

کے ساتھ چل رہا تھا۔ مختلف کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی

باتیں کرتے رہے۔ عائشہ، جو گھڑ سواری اور گھر جانے کے خیال سے کافی مسرور تھی، بڑے

اشتیاق سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ مثلاً یہ کہ کس طرح وہ

ایک دفعہ تین بھیڑیوں کو جل دے کر ان کے پنچے سے نکل آیا تھا، اور یہ کہ اس جنگل میں جو

ایک عجیب سا درخت تھا اس کے نام کا کسی کو پناہ تھا مگر اس کے پتوں کی کھاد بڑی عمدہ بنتی

تھی، اور یہ کھیت، جن میں سے وہ گزر رہے تھے، ان کے نہیں بلکہ دوسرے گاؤں کے تھے

اور ان کے کھیتوں کی طرح زرخیز نہ تھے کیونکہ اس گاؤں کے لوگ کام چور اور کھلنڈرے تھے اور

محنت سے جی چراتے تھے۔ اور یہ کہ بھیڑیے مردوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتے بلکہ عورتوں

کو دبوچتے ہیں، ان کس زیورات اور قیمتی کپڑے اتار کر اپنی بیویوں کو پہناتے ہیں اور عورتوں

کو ان کی خدمت پر مامور کر دیتے ہیں۔ عائشہ نے بھیڑیے کی بیوی کی خدمت کار بننے کے خیال

پر خوف اور تعجب کا اظہار کیا۔ پکی سڑک پر پہنچتے پہنچتے ان کو شام ہو گئی۔

گھوڑی سخت اور ہموار زمین کو محسوس کر کے خوشی سے ہنہنائی اور تیز ہو گئی۔ علی

ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ عائشہ نے، جو اچھی خاصی سوار تھی لیکن گھوڑی کی عادتوں سے واقف نہ تھی، اسے روکنے کے لیے باگیں کھینچیں۔ گھوڑی نے اگلے پاؤں اٹھا کر ہوا میں چلانے شروع کر دیے۔

”میں اس کے ساتھ دوڑ سکتا ہوں۔ اسے چھوڑ دو۔“ علی نے کہا۔

”ابھی یہ چاروں پاؤں پر آجائے گی۔“

”تو کیا ہے۔ میں خرگوش کی طرح دوڑتا ہوں۔“ وہ تیزی سے بھاگنے لگا۔

”تو لو۔۔۔“ عائشہ باگیں ڈھیلی چھوڑ کر بولی اور چمٹ کر بیٹھ گئی۔ ڈھیل پا کر گھوڑی آسانی سے دوڑنے لگی۔

”میں اس سے بھی تیز دوڑ سکتا ہوں۔“ علی نے دانت پیس کر کہا اور سر گھوڑی کے سر سے آگے نکال لے گیا۔ عائشہ نے آہستہ سے ایڑیاں گھوڑی کی پسلیوں پر ماریں۔ گھوڑی چار پاؤں پر دوڑنے لگی۔ علی اب پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا اور تیز ہوا کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے پانی بہ رہا تھا۔ پل کے پل میں گھوڑی فراٹے بھرتی ہوئی اس کے پاس سے نکل کر گرد کے طوفان میں غائب ہو گئی۔

جب گرد و غبار ذرا کم ہوا تو اس نے دیکھا کہ سوار اور گھوڑی دونوں حدِ نظر سے باہر جا چکے تھے۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جا کر پلایا پر بیٹھ گیا۔ نیچے ایک تنہا سا برسائی نالہ بہ رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا جو اندھیرے میں اس کی نظروں سے غائب ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے طبیعت میں سخت بد مزگی محسوس کی۔ اس کے دل میں ایک محبوب دوست کے پچھڑنے کا رنج تھا، مگر ابھی وہ اس عمر کو نہ پہنچا تھا کہ اس رنجیدہ جذبے کو جان سکتا۔ چنانچہ وہ پلایا پر بیٹھا بے دلی سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ قریب کی فصل میں سے ایک گیدڑ کان کھڑے کر کے نکلا اور نالے پر آ کر پانی پینے لگا۔ علی واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

اب اسے پتا چلا کہ وہ تنگ تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ پوری طاقت سے بھاگ رہا تھا تو جوتے اس کے پاؤں سے اتر گئے تھے۔ وہ اندھیرے میں سر جھکا کر دیکھتا ہوا اسی راستے پر چلنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر ایک جوتا مل گیا لیکن بہت تلاش کرنے کے بعد بھی دوسرا جوتا نہ ملا۔ رات چاروں طرف پھیل گئی تھی اور وہ اکیلا تاریک راستوں کو دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ رنج سے مجبور ہو کر وہ رونے لگا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کی ماں نے جھپٹ کر اسے گود میں لے لیا اور اس کا ماتھا چوم کر بولی:

”کیوں روتا ہے میرے لال۔ ایس؟ بتا۔“

”میرا جوتا کھو گیا ہے۔“ اس نے بمشکل کہا۔

”پھر کیا ہے۔ چپ ہو جا میرے لال، وہ پرانا اور پھٹا ہوا جوتا تھا۔ مت رو۔“
لیکن اس رات وہ پرانے اور پھٹے جوتے کے علاوہ اور بہت سے انجانے رنج کی وجہ سے
دیر تک لیٹا سسکیاں لیتا رہا۔

(۲۲)

جیل جانے کا خیال نعیم کے لیے انوکھا نہ تھا۔ اس سے پہلے اس کے ہزاروں ساتھی جیل
جا چکے تھے، پھر بھی جیل کے بڑے دروازے میں داخل ہوتے وقت اس کے جسم میں عجیب
سی سنسناہٹ دوڑ گئی اور دل کے دھڑکنے کی آواز اس نے صاف طور پر سنی کہ بالآخر یہ ایک ان
دیکھی اور انجانا دنیا تھی۔

وہ اپنی دس فٹ مربع کوٹھری میں بیٹھارات کا کھانا کھا رہا تھا اور آستین سے آنکھیں پونچھتا
جا رہا تھا۔ کوٹھری میں ایک چھوٹا سا سوراخ روشن دان کے نام کا تھا۔ جس میں سلاخیں لگی
ہوئی تھیں۔ روشنی کے لیے ایک مٹی کی ایک دیڑھ چڑھ چکی تھی اور اس میں کیڑے مکوڑے
اور پچھوؤں کے چلنے سے لکیریں بن گئی تھیں۔ ایک کونے میں چٹائی بچھی تھی جو کہ اس کا بستر
تھا۔ سالن نمک مرچ اور دال کے چند دانوں کو پانی میں ابال کر بنایا گیا تھا اور روٹی کے آٹے میں
ریت اور مٹی ملی ہوئی تھی، اس کے باوجود سارے دن کی بھوک کے مارے اس نے بکری کی
طرح وہ کھانا کھا لیا اور کھانے کے دوران دل میں پریشان ہوتا رہا کہ دھواں، جو بادل کی طرح اس
کے کمرے میں بھر گیا تھا، کس طرح صاف ہو گا اور وہ ایسے دھوئیں میں کیسے سو سکے گا۔ لیکن
جیل میں پہلا دن گزارنے کا ستاؤ کھانا کھانے کے بعد جب ذرا کم ہوا تو اسے خود بخود نیند آنے
لگی۔ اس نے کونے میں پڑے ہوئے ایک پتھر کو اٹھا کر چٹائی کے سرہانے کی جگہ پر رکھا اور
اس پر سر رکھ کر لیٹ گیا، لیکن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کو دھاریوں میں بہتے ہوئے پسینے
کو خشک کرنے کے لیے اٹھنا پڑتا۔ برسات کے مخصوص جس کی رات تھی اور نعیم کے ارد گرد
دھواں اور پرانی، سال خوردہ ہوا بھاری تھوں میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ایک دفعہ پسینہ پونچھتے
ہوئے آستین لگنے سے دیوار کی مٹی اڑی اور اس کی ناک میں جا کھسی۔ وہ چھینکتا ہوا اٹھ کر بیٹھ
گیا۔ اس وقت یہ سوچ کر دل میں اسے افسوس ہوا کہ اس کے ساتھ نچلے درجے کے اخلاقی
قیدیوں کا سا سلوک کیا گیا تھا۔

وہ بہت دن کے بعد زمین پر سویا تھا۔ رات میں کئی بار اس کی آنکھ کھلی اور اسے ان
دنوں کا خیال آیا جب وہ جنوبی ہندوستان کے گاؤں اور شہریوں میں ایک لمبے عرصے تک زمین

پر سوتا رہا تھا۔ صبح جب وہ جاگا تو آنکھیں بند کیے کیے اس نے عادتاً اپنی بیوی کو پکارا۔ کمرے میں وہی جمود تھا، لیکن دھواں غائب ہو چکا تھا اور دن کا اجالا دروازے میں سے اندر آ رہا تھا۔ آسمان کا وہی چھوٹا سا حصہ دکھائی دے رہا تھا جو اس نے کل کو ٹھہری میں داخل ہونے کے بعد دیکھا تھا۔ سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ کھلی جگہ میں لوہے کی سلاخوں کا ایک اونچا اور گول سا جنگل بنا تھا جس کے اندر بہت سے لوگ لکڑی کے ایک شہتیر کو کھینچتے ہوئے گول دائرے میں گھوم رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ کنوئیں میں سے پانی کھینچنے کے لیے سیلوں کی جگہ پر کام کر رہے تھے۔ ایک بد نما چہرے والا شخص ان کی نگرانی پر کھڑا تھوڑے تھوڑے وقفے پر گالیاں دے رہا تھا۔ چڑیا گھر کے سے اس منظر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے نعیم نے گننا شروع کیا۔ وہ تعداد میں اٹھارہ تھے اور برابر نگران کو اور ایک دوسرے کو کوس رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ دروازے کی سلاخوں پر ہاتھ رکھے رکھے وہ ان کی اس بے حس خوش دلی پر محظوظ ہوتا رہا۔

پھر اپنے قریب ہی ایک کرخت انسانی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ یہ ایک اتنے ہی کرخت نقوش والا شخص تھا جو قیدیوں کے لباس میں تھا اور بازو پر ’ڈبلیو۔ او‘ (وارڈ اور سیئر) کا بلا لگائے ہوئے تھا۔ وہ ایک دوسرے قیدی کو گردن سے پکڑ کر کھینچتا ہوا بڑے معمولی، روزمرہ کے انداز میں گالیاں دے رہا تھا۔ جواب میں قیدی بھی گالیاں دے رہا تھا اور قسمیں کھا رہا تھا۔ نعیم کے برابر پہنچ کر وہ رکا اور کوری کوری نظروں سے اسے تکتے لگا۔

”سورج نکل آیا ہے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”ہاں، ابھی ایک چیل گزری تھی۔“ اس نے کرخت، بے معنی لہجے میں جواب دیا۔ (جلد ہی نعیم قیدیوں کے اس طریق سے واقف ہو گیا، جب وہ خود بھی سر اٹھا کر آسمان کے اس حصے کو، جو ان کے سروں پر تھا، دیکھنے اور پرندوں پر پڑتی ہوئی دھوپ سے طلوع و غروب کا اندازہ لگانے لگا۔)

”رات بھر تم کتے کی طرح سوئے رہے۔“ وارڈ اور سیئر پھر اسی ناخوشگوار آواز میں بولا۔ رات بھر کی خجالت نے نعیم کے دماغ میں ایک دم غصے کی شکل اختیار کر لی۔ اس نے سارے جسم کے ساتھ دروازے کو دھکیلا: ”کتے۔“ اس نے خشمگین لہجے میں کہا۔ وارڈ اور سیئر بے حس نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ منجمد چہرے کے ساتھ منہ کھول کر ہنسا:

”میں تین بار یہاں سے گزرا۔ تمہیں پتا ہے؟“

”یہاں آؤ۔“ نعیم نے غصے کو دبا کر کہا۔ وہ بے شرمی سے چلتا ہوا اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ نعیم نے سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر زور سے گھونسا اس کی ناک پر مارا۔ ”سور۔“

اس غیر متوقع حملے سے وہ لڑکھڑا گیا اور ناک چھو کر بولا: ”کیوں - کیوں!“

”کالی کیوں دی؟“ نعیم نے کہا۔

”کالی؟“ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے کئی بار ناک چھو کر دیکھا۔ ”کالی؟“

”ہاں - میں نے چوری نہیں کی۔“

”پھر کیا کیا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”میں نے؟ - میں نے -“ نعیم نے بے خیالی سے اس کی ناک کو دیکھتے ہوئے

کہا، ”کچھ نہیں کیا۔“

”قتل کیا ہے؟“

”نہیں۔“

”زنا کیا ہے؟“

”نہیں۔“ نعیم چیخا۔

”پھر تمہارا دماغ چل گیا ہے۔“ وارڈ اور سیئر نے کہا، ”مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی سزا تم کو

ملے گی۔ کتے کے بچے۔“

وہ نفرت سے اسے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ نعیم کا جی چاہا کہ دروازے کی سلاخوں کو چبا ڈالے،

لیکن جب وہ چلا گیا تو دفعتاً وہ اپنی پیش قدمی اور اس دوسرے شخص کی شدید بے حسی پر دل میں خوف زدہ ہو گیا۔

دن کی روشنی تیز ہوتی جا رہی تھی لیکن دھوپ کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ سامنے جنگلے

کے اندر قیدیوں کے پانی کھینچنے کا نظارہ کرتے کرتے اچانک نعیم کے دل میں ایک بے کلی پیدا

ہوئی۔ دھوپ کہاں تھی؟ اور پرندے! آسمان کا مختصراً سا حصہ اس کی نظروں کے سامنے بے

رنگ اور ویران تھا۔

وہ قیدی، جسے وارڈ اور سیئر وہاں چھوڑ گیا تھا، اس کے قریب آیا۔

”مجھے مت مارنا۔ میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔“ اس نے نعیم کی زد سے باہر رہتے

ہوئے کہا۔ نعیم خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ بھی دیکھنے والے میں تنفر اور ناگواری

پیدا کرتا تھا، گو کبھی خوبصورت رہا ہو گا۔ ”تم کیوں آئے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے کچھ پتا نہیں۔“ نعیم نے ایک لمحے تک سوچے ہوئے چہرے کے ساتھ دیکھتے رہنے

کے بعد کہا۔

”یہاں پر تم کچھ نہیں چھپا سکتے۔ دو دن میں تمہاری اصلیت کا پتا چل جائے گا۔ شکل

سے تو کچھ ایسے حرامی معلوم نہیں ہوتے۔“

”میں نے ’سوراج‘ کے لیے تقریر کی تھی۔“ نعیم نے جلدی سے کہا۔

”سوارج“

”آزادی کے لیے۔“

اس کی آنکھوں میں امید کی ایک رمق ظاہر ہوئی : ”آزادی ؟ ہم آزاد ہو جائیں گے ؟“

”نہیں ، ملک کی آزادی کے لیے۔“

”ملک ؟ ایں ۔۔ اور ہم ؟“

”پہلے تمہارے ماں باپ اور بیوی بچے اور زمینیں آزاد ہوں گی ۔ پھر جب تمہاری سزا ختم

ہو جائے گی تو تم بھی آزاد ہو جاؤ گے۔“

”آہا ہا ہا۔“ وہ دیوانوں کی طرح ٹکٹکی باندھ کر ہنسا۔ اس کے چہرے پر ہنسی کی رمق

تک نہ بکھری۔ نعیم نے اپنی پشت پر خوف کی سرسراہٹ محسوس کی۔ ”یہ تو میں بھی جانتا

ہوں۔ تب میرے ماں باپ اور بیوی بچے اور زمینیں سب مرچیک ہوں گی۔“

”مرچیک ہوں گی ؟“

”یہ دیکھو۔“ اس نے کندھا آگے بڑھایا جس پر اس کی تاریخ رہائی ۱۹۷۲ء لکھی تھی۔

”اڑتالیس سال اور۔“

”ایں ؟“ نعیم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”وہ دوبارہ منہ کھول کر ہنسا : ”یہ تقریر والی تو تم بکواس کر رہے ہو ، لیکن تمہارے جھوٹ

کا ہمیں پتا چل جائے گا۔ چرس پیو گے ؟“

”نہیں۔“

”کیوں ؟ پیسے نہیں ہیں ، نواب کے بچے ، یوں تو کتے کی کالی پر سبج پا ہوتے ہو۔“

”جاؤ اپنا کام کرو۔“ نعیم نے خاموش غصے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے بیٹا۔“ قیدی جاتے جاتے مکاری سے بولا ، ”میں تمہارا

دوست ہوں۔ چرس کی ضرورت پڑے تو مجھ سے کہنا۔“

غصے کے ساتھ ساتھ نعیم کے دل میں اس کے لیے رنج پیدا ہوا۔

ایک وارڈر نے آکر اس کی کوٹھری کا دروازہ کھولا اور گندم کی آدھی بوری چکی کے پاس لا

رکھی۔

”آج شام تک اس کو ختم کرنا ہے۔“ اس نے مخصوص کرخت آواز میں ، جس سے نعیم

اب آشنا ہوتا جا رہا تھا ، کہا۔ پھر جاتے جاتے اس کی منظر بن چھوٹے کھانے پر پڑی اور وہ رک

گیا۔ ”تم نے کھانا نہیں کھایا ؟“

”یہ ؟ یہ جانوروں کا کھانا ؟“ نعیم نے رک رک کر کہا۔

”آہا۔۔۔ میل کے بیجے ، تو تم اپنی ساس کے گھر آئے ہو !“ پھر وہ ایک دم آنکھیں نکال

کر چیٹا ، ”سنو - اگلے ہفتے تمہارا وزن ہو گا - اگر ایک تولہ بھی کم ہوا تو تمہیں مویشیوں کا گور کھلایا جائے گا - سنا؟“ دروازہ بند کرتے ہوئے وہ سلاخوں میں ناک ٹھونس کر پھر چیٹا - ”تم نے بیلوں کو دوا پلانے والی نال دیکھی ہے؟ تم جیسے کتوں کو گور کھلانے کے واسطے ہم اس کا استعمال کرتے ہیں -“

نعیم زخمی سؤر کی طرح اسے دیکھتا رہا -

دن بھر وہ چکی پیستا اور بار بار اٹھ کر دروازے کی طرف جاتا رہا - کئی بار اس نے دروازے کو دھکیل کر ، بیٹھ کر اور لیٹ کر باہر کی دنیا کو ذرا دور تک دیکھنا چاہا ، لیکن آسمان کو دیواروں سے باندھ دیا گیا تھا اور اس پر کوئی پرند نہ تھا - دوپہر کے قریب لیکا ایکی گرم سورج دیوار کے عقب سے اس کے سامنے آگیا اور اس نے گھبرا کر آنکھیں پھیر لیں - دھوپ کڑی اور بے رنگ تھی - وہ واپس چکی کی طرف لوٹ آیا اور پیٹ میں بھوک محسوس کر کے کھانے پر پل پڑا - آسمان پر ابھی اجالا تھا جب جیل کا ایک افسر اور ایک وارڈر اس کی کوٹھری میں داخل ہوئے - وہ چکی پر سر رکھے اونگھ رہا تھا - جیل کے افسر نے جوتے کی نوک اس کی پسلی میں چبھوئی -

”تم نے ڈیلیو - او - نمبر ۱۹ کو مارا تھا؟ آج صبح -“

”ہاں -“ گردن کا پسینہ پونچھتے ہوئے نعیم نے جواب دیا -

یہ کہتے ہوئے کہ اس نے اسے کالی دی تھی نعیم جھجک گیا کہ اب وہ ان کالیوں سے مانوس

ہو چکا تھا - وہ خاموش رہا -

”اٹھو -“ جیل کے افسر نے پھر اس کے پہلو میں جوتے کی نوک ماری - ”اس کے لیے

تمہیں پانی کھینچنا پڑے گا -“

باہر نکل کر اس نے کسی بات پر ، جو اس کے نگران آپس میں یا اس کے ساتھ کر رہے تھے ، دھیان نہ دیا اور خوشی سے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا - سہ پہر کی زرد دھوپ میں چند کبوتر اس کے سر پر سے گزر رہے تھے - اس نے چند لمحے آزادی کا سرور محسوس کیا - آہنی جٹکے میں پہنچ کر اس نے تیز کرخت آوازوں میں غل مچاتے اور پانی کھینچتے ہوئے قیدیوں کو قریب سے دیکھا - چوبیس گھنٹے تک تنہائی میں رہنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اب وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں آگیا ہے - وہ بد نما شخص ، جسے اس نے مارا تھا ، اسے قطار میں کھڑا کر کے رس پہنانے لگا -

”ایک اور میل آیا ہے -“ قطار میں سے آواز آئی -

”سؤر کی طرح پلا ہوا ہے -“ دوسرے نے کہا - قطار میں سے زور دار ہنسی کی آواز بلند

ہوئی - نعیم کا جی اس خوشدل گروہ کے ساتھ گھلنے ملنے اور باتیں کرنے کو چاہنے لگا - اس نے

اپنے ساتھ والے سے پوچھا: ”تم کسان ہو؟“

”میں میل ہوں۔“ اس نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ پسینے میں بھیکے ہوئے، ہانپتے ہوئے قیدیوں کی قطار سے پھر ہنسی کی آواز اٹھی۔

ہر چکر پر وارڈر اور سیٹر اس کی پسلیوں پر چھڑی مارتا جا رہا تھا۔ پہلے چند چکر تو باہر آنے کی خوشی میں اس نے آسانی سے مکمل کر لیے، پھر اس کی کمر اور ٹانگوں میں سخت درد ہونے لگا۔ اس وقت اس کے دل میں اپنی اور اس نوع کی مشقت کرنے والے دوسرے انسانوں کی شدید ذلت کا احساس پیدا ہوا۔ جسمانی تکلیف اور خفت کے احساس میں اس نے نگران کو گالیوں اور چابکوں کو نظر انداز کر دیا۔

جب انہیں کھولا گیا تو چند منٹ تک وہ آنکھیں بند کیے کھڑا اپنے جسم کی منتشر اور ضائع ہوتی ہوئی قوتوں کو یکجا کرتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر وارڈر اور سیٹر نمبر ۱۹ کو دیکھا۔

”تمہارے پاس سگریٹ ہیں؟“

”کیوں، نوابی ختم ہو گئی؟“ وارڈر اور سیٹر نے رعونت سے کہا۔ نعیم خفت سے ہنس کر ناک کھجانے لگا۔

”چلو۔“ وارڈر اور سیٹر نعیم کو لے کر اس کی کوٹھری کی طرف چل پڑا۔ ”تم اگر مجھ سے صلح رکھو تو میں سگریٹ مہیا کر سکتا ہوں؟“

”میں تمہاری طرح باہر پھر سکتا ہوں؟“ نعیم نے پوچھا۔

”نہیں۔ ہم عمر قید والے ہیں۔ ہم نے اچھا چال چلن دکھایا ہے اس لیے ہمیں ڈیلیو۔ او۔ بنا دیا گیا ہے۔ میں نے بارہ سال کاٹ لیے، بتیس سال اور ہیں۔ دیکھو۔“ اس نے اپنا کندھا دکھایا جس پر اس کی تاریخ رہائی ۱۹۵۶ء لکھی تھی۔ دروازہ بند کر کے جاتے ہوئے وہ بولا: ”اب تم نے کسی پر ہاتھ اٹھایا تو درے لگیں گے۔ سنا، حرامی؟“

شام کے وقت وہ اندھیرے میں بیٹھا تھا کہ کسی نے دروازہ کھولا۔ ”اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہو؟“ حکیمانہ لہجے میں کوئی بولا۔

”تمہارا باپ آنکھوں کو لگتا ہے، دھواں۔“ نعیم نے جل کر کہا۔

”دیا جلاؤ۔ یہاں چالاکیاں نہیں چلیں گی۔“ چلنے والے کو چکی کی ٹھوکر لگی اور اندھیرے میں اس کے کوسنے کی آواز آئی۔

دیا جلانے سے دھوئیں کا بادل چھت کو چڑھنے لگا۔ ”میں بھاگ کر کہیں نہیں جاؤں گا، بے فکر رہو۔“ نعیم نے کہا۔

”ہنہ۔“ دوسرا شخص بڑبڑایا۔ یہ وہی اور سیٹر تھا جس نے صبح کو اسے گوبر کھلا کر اس کا وزن بڑھانے کی دھمکی دی تھی۔ ”یہ؟ یہ سارا؟ کام چور گدھے کے بچے۔۔۔ ہیں؟“ وہ

یکلخت چیخا ۔

”میں اس سے زیادہ نہیں پیس سکتا ۔“

”کیوں ؟“ وہ جارحانہ انداز میں بڑھا ۔

”میرا ایک ہاتھ ہے ۔“ نعیم نے چیخ کر کہا اور جلدی سے بازو تھکا کر کے آگے بڑھایا ،

”دیکھو ۔ دیکھو ۔“

”ہیں ۔“ حیرت کے مارے اس کامنہ کھلے کا کھلا رہ گیا کپکپاتی ہوئی انگلیوں کے ساتھ نعیم

نے آستین اتار کر اسے ڈھک دیا ۔

”دو ۔ دو ۔ مجھے دو ۔“ اوورسیئر نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھایا ،

”تم اسے نہیں رکھ سکتے ۔ یہ قانون ہے ۔ دو ۔“ اس نے لکڑی کی انگلیوں کو پکڑ کر جھٹکا

دیا ۔ جس سے نازک کمائیاں کھل گئیں اور لکڑی کا ٹکڑا بازو سے الگ ہو گیا ۔

نعیم نے بھیڑیے کی طرح دانت نکال کر جھپٹا مارا اور لکڑی کا ٹکڑا اس سے چھین لیا ۔

ایک پل کے لئے اس نے اپنے آپ کو تولا اور پھر ہاتھ اٹھا کر لپکا ۔ اوورسیئر تیزی سے باہر نکل

کر غائب ہو گیا ۔ ٹکڑا ہاتھ میں لٹکائے لٹکائے نعیم جنگلی جانور کی طرح کمرے میں چکر لگاتا رہا ۔

غیض کی حالت میں اس کی سوچنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی ۔ جبلی طور پر خطرے کو محسوس کر

کے اس نے اسے چکی کے نیچے چھپا دیا ۔

تھوڑی دیر کے بعد جیل سپرنٹنڈنٹ ، جیلر ، اوورسیئر اور ایک سپاہی اس کی کوٹھری میں

داخل ہوئے ۔

”کہاں ہے“ سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا ۔

”میرا ایک ہاتھ ہے ۔“ نعیم نے آستین چڑھا کر اسے کٹا ہوا بازو دکھایا ۔

”لکڑی کا کہاں ہے ؟“

نعیم خاموش بیٹھا بازو پر ہاتھ پھیرتا اور زیر لب بڑبڑاتا رہا : ”میرا ایک ہاتھ ہے ۔“ ۔ ایک

ہے ۔“

چکی کے نیچے سے اسے تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دیر نہ لگی ۔ کچھ دیر تک وہ سب

تعجب اور دلچسپی کے ساتھ اسے دیکھتے رہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی کاریگری کی تعریف

کرتے رہے ۔ پھر وہ اسے لے کر باہر نکل گئے ۔

”جب تم جاؤ گے تو دے دیا جائے گا۔“ جاتے جاتے سپرنٹنڈنٹ نے کہا ۔

برسات کی اس بند رات میں آدھے بازو کو پکڑ کر لیٹے لیٹے اس کے دل میں میکران تنہائی

اور عظیم نقصان کا احساس پیدا ہوا ، جیسے اس کے تمام ساتھیوں کے کارواں اسے چھوڑ کر آگے

نکل گئے ہوں ۔

اسی طرح ایک مدت تک جیل میں رہتے رہتے وہاں کے ماحول اور وہاں کے باشندوں سے مانوس ہو گیا ، جس طرح انسان تقریباً ہر چیز کا عادی ہو جاتا ہے ۔ اس پر بھی ایک خلش ، جو ہر ذہین انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے ، اس کی روح میں چبھی رہی ۔ کبھی کبھی وہ خلش باہر نکل کر ایک بھاری درد کی طرح اس کے سارے جسم کو جکڑ لیتی اور ان دنوں میں وہ بے حد آزرہ ہو جاتا ۔ یہی چیز تھی جو اسے وہاں کے معمولی باسیوں سے ممتاز کرتی تھی اور جس نے دوسروں کو اس کی عزت کرنے پر مجبور کیا ۔

ان قیدیوں میں معمولی اخلاقی قیدی تھے جن کی سزائیں نسبتاً مختصر تھیں ۔ اس کے بعد عمر قید والوں کا عجیب و غریب گروہ تھا ۔ عموماً عمر قید چودہ سال یا بیس سال کی ہوتی ہے لیکن بعض اوقات انہیں اس سے کہیں زیادہ لمبی سزا بھگتنا پڑتی ، مثلاً کئی کئی جرموں کا ایک ساتھ مقدمہ چلایا جاتا اور سب کی سزائیں جمع کر کے ان پر عائد کر دی جاتیں ۔ نعیم کے جیل میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو کئی کئی سال جیل میں گزار کر ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے تھے اور ابھی ان کی سزا کے بیس بیس سال اور تیس تیس برس باقی تھے یہ لوگ ، جو اپنی عمروں کا بہترین حصہ جیل میں گزارتے ہیں ، ساہا سال تک کوئی عورت یا بچہ یا مذہبی رہنما نہیں دیکھتے ۔ وہ باہر کی دنیا سے علیحدہ اور قطعی بے خبر ہوتے ہیں اور اپنی عمریں ہر قسم کے دوستانہ انسانی رشتوں سے دور رہ کر بسر کرتے ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو نفرت اور انتقام کے مکروہ انسانی جذبات میں لپیٹ لیتے ہیں اور زندگی کی اچھائیوں اور مہربانیوں کو یکسر بھول جاتے ہیں ؛ حتیٰ کہ آہستہ آہستہ ان کے یہ ناپاک جذبات بھی معدوم ہو جاتے ہیں اور ایک اذیت ناک بے حسی ان پر طاری ہو جاتی ہے ۔ نعیم کو ابتدا میں انہی لوگوں سے واسطہ پڑا اور یہی لوگ اس کے دوست بنے ۔

جیل کی زندگی میں کوئی تبدیلی ، کوئی تنوع نہ تھا ۔ روز بہ روز ، سال بہ سال وہی کڑی ، بے رنگ دیواریں اور پرانے غیر دلچسپ چہرے ۔ آسمان کا قطعی وہی حصہ جو پہلے روز نظر آیا تھا ہمیشہ نظر آتا رہا اور کبھی کبھار اس پر سے پرندے گزرا کرتے ۔ عام طور پر آسمان مٹیالا ، یک رنگ رہتا ۔ صرف برسات کا موسم نعیم کے لیے خوشی کا پیغام لے کر آتا جب بادل آسمان پر چلتے اور یوں لگتا جیسے آسمان چل رہا ہے ۔ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہوئے گھنٹوں لیٹا آسمان پر آگے پیچھے دوڑتے ہوئے بادلوں اور سرکتے ہوئے آسمان کو دیکھا کرتا ۔

جیل کی زندگی رنگوں سے یکسر مبرا ہوتی ہے ۔ کسی طرف ہریالی یا سرخی نہیں ہوتی ۔ کسی کو گھاس یا سبزیاں اگانے کی اجازت نہ تھی ۔ رنگین لباس برسوں نظر نہیں آتے ۔ دوپہر کے قریب سفید ، گرم سورج اچانک سامنے آ جاتا ہے اور قیدیوں کے آسمان کو پار کر کے اسی صورت میں غائب ہو جاتا ہے اور طلوع و غروب کے رنگ قیدیوں کے حافظے سے محو ہو جاتے ہیں ۔ گول ، بد رنگ دیواروں میں چکر لگا لگا کر نظریں کند ہو جاتی ہیں اور رنگوں میں تمیز کرنے کی

صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ ذہانت سے گفتگو کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، چاروں طرف وہی گنے چنے، قدیم، بد نما چہرے، جنہیں دیکھ دیکھ کر نظریں پک جاتی ہیں۔ جیل وہ جگہ ہے جہاں پر انسان کے دل میں کھلی سر سبز جگہوں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے لیے چاہت اور آرزو پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کی ان معمولی معمولی چیزوں کی خواہش دل اور آنکھوں میں خلا پیدا کر دیتی ہے اور سوچنے والے ذہنوں میں دیوانگی جنم لیتی ہے۔

کافی عرصے کے بعد جیل کی فضا میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی جب عدم تعاون کے سلسلے میں والنٹیروں نے قید میں آنا شروع کیا۔ نعیم کی آنکھوں کا خلا پر ہونے لگا اور ارد گرد اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر وہ واپس احساس کی دنیا میں چلا آیا۔ نو وارد ترو تازہ چہروں اور چمکتی ہوئی آنکھوں والے لوگ تھے اور پرانے باشندوں سے ہر حالت میں مختلف تھے۔ انہوں نے آتے ہی جیل کے ماحول کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کھلے بندوں حکام اور جیل کا نظام سخت کر دیا گیا اور زائد مشقت اور درے بازی کے واقعات روز بروز بڑھنے لگے۔ ایک واقعہ، جو نعیم کو بہت عرصے تک یاد رہا، ایک سولہ سالہ لڑکے کا تھا۔ وہ ذہین چہرے والا خوش مزاج اور دلیر لڑکا تھا اور اس کے چہرے پر لڑکپن کا مخصوص دمکتا ہوا حسن اور دلربائی تھی۔ عدم تعاون کی تحریک میں سکول چھوڑ کر جیل چلا آیا تھا۔ آتے ہی اس نے قانون شکنی شروع کر دی۔ اس کی پیش قدمیوں سے تنگ آ کر حکام نے اس کے لیے درے بازی کی سزا تجویز کی۔ اسے مادر زاد تنکا کرنے کے بعد درے بازی کی تکون کے ساتھ باندھ دیا گیا اور جلا دوں نے، جو کہ وارڈ اور سیٹروں میں سے ہی منتخب کیے گئے تھے، کوڑے برسائے شروع کیے۔ تیل پلائے ہوئے ٹھوس چمڑے کا کوڑا اس کے کنوارے، بے داغ جسم پر پڑتا اور کاٹتا ہوا چلا جاتا۔ اس کے سارے بدن میں جھرجھری پیدا ہوتی اور وہ پوری آواز سے چلاتا: ”انقلاب زندہ باد۔“ حتیٰ کہ درد کی شدت سے اس کا چہرہ کافذ کی طرح سفید اور جسم نیلا پڑ گیا اور اس کی آواز آہستہ ہوتی ہوئی بالکل بیٹھ گئی اور وہ گردن ایک طرف ڈھلکا کر رونے لگا۔ گیارہ کوڑوں کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔

جیل کے عملے نے اپنی زندگیوں میں ایسے قیدی کب دیکھے تھے جو اپنی مرضی سے جیلوں میں داخل ہوئے تھے اور جو اس قدر ذہین، چست اور خوش و خرم تھے اور جنہوں نے ان کا ہر حکم ماتنے سے انکار کر دیا تھا۔ قید سے نکلنا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اس کے لیے انہیں صرف ایک معافی نامہ لکھنا ہوتا تھا اور آئندہ کے لیے پرامن چال چلن کا وعدہ کر کے وہ باہر جا سکتے تھے۔ ان کے بارے میں جیل کے عملے کی اعلیٰ حکام کی طرف سے خاص ہدایات موصول ہوئی تھیں۔ ان دنوں میں ان جیلروں کو خاص ترقیاں اور خطابات عطا کیے گئے جن کا سلوک قیدیوں کے ساتھ خصوصی طور پر سنگدلانہ تھا۔

ایک مرتبہ نعیم کی ساتھ والی کوٹھری میں کچھ دیر کے لیے چند خاتون قیدیوں کو رکھا گیا جو عدم تعاون کے سلسلے ہی میں قید ہوئی تھیں۔ وہ تعلیم یافتہ اور مہذب طبقے کی عورتیں تھیں لیکن انہیں پختہ اور عادی مجرم عورتوں کی زبانی، جن کے ساتھ انہیں ٹھہرایا گیا تھا، کچھ اس قسم کی باتیں سننا پڑیں :

”تم تو بڑی خوبصورت ہو۔“

”جیلر کے ساتھ سوؤ تو چھوٹ جاؤ گی۔“

”نفیم لو گی؟“

”تمہارے خاوند نامرد ہیں جو یہاں آگئی ہو؟“

اس کے علاوہ گندے الفاظ اور کالیوں کی بھرمار تھی جو اس آفت خیز دور میں ہندوستان کی ہزاروں مہذب عورتوں کو سہنا پڑی۔ نعیم نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی بیوی کو کبھی جیل میں نہ آنے دے گا۔

سال کے آخری دنوں میں روشن آغا کے سیاسی دوستوں کی مجلس منعقد ہوئی جیسے گزشتہ کئی برسوں سے ہوتی آ رہی تھی۔ یہ لوگ ملک کی متوازی سیاسی جماعتوں میں ایک سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے آپ کو ”لبرل“ کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ بارسوخ اور روشن خیال تعلقہ دار طبقے سے تعلق رکھنے والے تقریباً سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین اور تن آسان لوگ تھے جن کے پیچھے شان دار خاندانی روایات تھیں۔ یہ لوگ سیاست میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

دسمبر کی وہ سرد صبح روشن محل میں چہل پہل لے کر آئی تھی۔ بڑے گیٹ پر پہلیاں رکی تھیں اور اندر برآمدے کے سامنے موٹر گاڑیوں کی قطار تھی۔ یہ دلی کی جاڑوں کا خوبصورت ترین دن تھا جب کہ رات بھر پڑی ہوئی شبینم خشک ہو چکی تھی اور مہمان، جو زیادہ تر صبح کے انگریزی لباس میں تھے، ہلکے رنگ کی ٹائیاں اور شوخ رنگ سکارف لگائے، ہاتھوں میں سگریٹ، سگار اور سنگترے کے رس کے گلاس تھامے باہر سبزے پر نکل آئے تھے۔ کئی ایک سبزے پر بچھے ہوئے سفید بید کے مونڈھوں پر بیٹھے ستا رہے تھے۔ ایک انگریز خاتون، جو ہندوستانی لباس میں تھی، مونڈھے کی پشت پر چھوٹی سی پھولدار چھتری لگائے تین مردوں کے ساتھ بیٹھی پھلوں کا رس پی رہی تھی۔ اس نے آنکھوں کی عینک لگا رکھی تھی۔

”گریپ فروٹ۔“ خاتون کے پاس بیٹھے ہوئے ایک مرد نے قریب سے گزرتے ہوئے میرے سے کہا میرا مستعدی سے جھکنے کے بعد اندر کی طرف لپکا اور پل کے پل میں معزز مہمان کے لیے گریپ فروٹ کا رس لے آیا۔

وہ سب دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بٹے ہوئے دھیمی، ملائم آوازوں میں گفتگو کر رہے تھے۔ خلاف معمول آج استقبال کے رسمی فرائض انجام دینے کے لیے کوئی نظر نہ آ رہا تھا۔ خالہ

بیمار تھی، پرویز کی تعیناتی ضلع میں کہیں ہو چکی تھی اور عذرا ان دنوں روشن پور میں تھی۔ چنانچہ نو وارد مہمانوں کے گاڑیوں سے اترتے ہی روشن محل کا ایک ملازم ادب سے جھک کر اطلاع دیتا کہ روشن آغا فلاں مہمانوں کے ساتھ اندر، مجلس کے خصوصی نشست کے کمرے میں اور باقی مہمان باہر دھوپ میں ہیں۔ آنے والا اپنی مرضی کے مطابق اندر یا باہر کی طرف بڑھ جاتا۔ لیکن جاڑوں کی اس صبح کو تازہ، چمکدار دھوپ آنکھوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی اور سبزے پر پھیلا ہوا اجلا مجمع، نو واردوں کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔

روشن آغا اپنے اہم مہمانوں کے ساتھ سنجیدہ گفتگو میں محو تھے کہ باہر دو گھوڑوں والی ایک بہلی آ کر رکی اور اس میں سے تین مہمان اترے۔ تینوں ادھیڑ عمر کے تھے۔ ایک نے کشمیری برہمنوں کا اور دوسرے نے مرٹھوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ تیسرا دبلا پتلا، لمبو ترے چہرے والا آدمی انگریزی لباس میں تھا اور آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ تینوں سیدھے اندر کی جانب بڑھے۔ انہیں برآمدے میں آتا دیکھ کر روشن آغا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ہم اندر آ سکتے ہیں؟“ دروازے میں رک کر مرہٹے نے اپنائیت اور ادھیڑ عمر خوش طبعی کے لہجے میں کہا۔ روشن آغا وہیں کھڑے کھڑے دونوں بازو پھیلا کر بولے: ”ہر وہ عالی ظرف روح جو دنیا میں آئی ان دروازوں پر عزت اور محبت سے قبول کی جائے گی۔“ پھر انہوں نے آگے بڑھ کر تینوں کا پر جوش استقبال کیا۔ دوسرے مہمان اپنی اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ان کے میزبان نے نو وارد مہمانوں کا تعارف کرایا۔ ہندوستانی لباس میں دونوں شخص بالترتیب پونا اور بھٹی سے آئے ہوئے تھے اور ”مجلس خدام ہند“ سے تعلق رکھتے تھے۔ دبلے چہرے والا شخص لکھنؤ کے ایک مشہور انگریزی اخبار کے عملے کا ممتاز رکن تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں تینوں مہمان آرام سے دھنس کر صوفوں میں بیٹھ چکے تھے اور کافی پی رہے تھے جس کی خواہش انہوں نے خود ہی ظاہر کی تھی۔ انہیں دیکھ کر باہر کے لوگ بھی اندر آ آ کر بیٹھ رہے تھے۔ ہر طرف گرمجوش مصافحوں اور استقبالیہ جملوں کا شور تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں نشست کا کمرہ لوگوں سے بھر گیا۔ لمبے ریشمی پردے اکٹھے کر دیے گئے اور کھلے درہچوں میں سے صبح کی دھوپ اندر آنے لگی۔

باہر جو گروپ بنے ہوئے تھے ٹوٹ کر بکھر چکے تھے، چنانچہ نئے نئے ساتھی مل جانے پر گفتگو پھر شد و مد سے شروع ہو چکی تھی۔ درہچوں میں سرما کے پھول دھات کے قدیم گلدانوں میں سجائے گئے تھے۔ لوگوں کے سروں کے اوپر اوپر مکھیوں کی بھنک کی طرح شائستہ انسانی آوازوں کی گونج تیر رہی تھی اور تمباکو کا دھواں سورج کی شعاعوں میں سفید، ریشمی چادر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

”تاریخ کا مطالعہ سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے از حد ضروری ہے۔“ ڈاکٹر امبیدکر، جن کی جاگیریں اودھ کے علاقے میں تھیں، پائپ منہ میں ڈالے ڈالے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سفید فام شخص سے کہہ رہے تھے۔ ”ہمیں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جب قومیں تاریخ کے علم کی کمی کی وجہ سے سیاسی جدوجہد پارگنیں۔ میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کے عوام کو، جو نوے فیصد ناخواندہ ہیں، کیسے سیاسی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ یہ جو بعض لوگ، عوامی تحریکوں کا چرچا کر رہے ہیں یہ کس حد تک دانش وری ہے، آپ بتا سکتے ہیں؟ عظیم انقلاب فرانس، یا حال کی بات کریں تو روسی انقلاب جو رونما ہوا تو مختلف حالات اور تاریخی پس منظر اور قطعی مختلف قسم کے عنصر کے ہاتھوں۔“

”عوام دانش وروں کے ہاتھ میں ایک خطرناک ہتھیار ہیں۔“ سفید فام نے ’Quote‘ کیا۔ خاتون، جو مستقل دھوپ کی عینک لگائے ہوئے تھیں۔ سیاست کے موضوع سے اکتا کر اب بچوں کی نفسیات کا ذکر کر رہی تھیں۔ ”ایک عجیب بات، جو میں سوچ سوچ کر نہیں تھکتی، یہ ہے کہ ہندوستانی بچوں کی ناک ہر وقت کیوں بہتی رہتی ہے؟ حالانکہ استوائی خطہ۔۔“ انہوں نے راجہ صاحب کرم آباد سے کہا جو نرگس کا پھول سونگھتے ہوئے اخلاق سے مسکرائے جا رہے تھے۔

پروفیسر اقبال سنگھ۔ جن کی کرنال میں اوسط درجے کی جاگیر تھی پر جو تھے اشلکچوڑ آدمی، حسب معمول ادب کا ذکر کر رہے تھے۔ ”اس کی تو بہت بعد کی بات ہے بھائی، آپ ٹیگور کا مقابلہ آسانی کے ساتھ رومین رولاں سے بھی نہیں کر سکتے جو کہ اس کا ہم عصر تھا۔ مثلاً رومین رولاں میں جو معاشی شعور۔“

”مگر فرانسیسی نقاد۔“ دائیں پہلو سے ایک شخص نے بات کرنے کی سعی کی جس پر پروفیسر اقبال سنگھ جھلا گئے۔

”میں فرانسیسی نقادوں کو نہیں مانتا۔ فرانسیسی شہر پسند ہیں، قطعی طور پر۔۔“ فرانسیسیوں نے نہ شاعری اچھی کی ہے، نہ فلسفہ دانی وہ صرف ادب میں اور آرٹ میں نئی نئی تحریکیں چلانے میں ماہر ہیں، وہ بھی دو چار روز میں پرانی ہو کر فرسودہ ہو جاتی ہیں۔ سارے فرانسیسی تخلیقی ادب کی بنیاد گھٹیا افواہوں اور تہمت تراشی پر ہے۔“

”گو تھک طرز تعمیر ہندوستان سے ہی ایشیا اور افریقہ میں پھیلا۔“ اگلے صوفوں پر بات ہو رہی تھی۔

”افریقہ میں؟ لاجول ولا قوۃ۔“ کسی نے کہا۔

تھوڑی دیر تک اسی طرح مختلف دائرہ اجباب میں ذاتی پسند کے مضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ ’ٹیپو‘ تیز ہوتا گیا، پھر اچانک، تحریک اور ترغیب کے بغیر، بھنبھناہٹ کی وہ یکسانیت

ایک طرف سے ٹوٹ گئی جب روشن آغا کے پاس بیٹھے ہوئے ”مجلس خدام ہند“ کے نمائندے نے سب کو مخاطب کر کے بولنا شروع کیا :

”افواج انکلتیہ کے ملک سے انخلا کا مطالبہ اس وقت میں سخت غیر دانش ورانہ ہے۔ اس کے سپرد محض ملک کے دفاع کا کام ہے اور اس نے اپنے فرائض ایمان داری سے سرانجام دیے ہیں۔ جنگ عظیم میں انہوں نے اپنی قدر و قیمت واضح کر دی ہے۔ اپنے ملک کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہمارے ملک کو بھی جنگ کی ہولناکیوں سے بچایا اور ملک کے ستر بتر عوام میں سے ایک فوج کھڑی کی ہے۔ کیا ہماری فوج ہندوستان کو جنگ سے بچا سکتی تھی؟ جب کہ فوج کا ملک کی اندرونی پالیسی میں کوئی دخل نہیں ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس کی موجودگی سے انتقال منظم و نسق میں کون سی رکاوٹ پڑ سکتی ہے۔ اگر وہ لوگ ہماری فوج کی سربراہی چھوڑ کر چلے گئے تو۔۔۔ آپ جانتے ہیں؟ ایک غیر منظم، مسلح فوج۔۔۔ اوہ۔۔۔ اس نے آنکھیں میچ کر اس خوفناک خیال پر ہلکی سی جھرجھری لی۔

پروفیسر سنگھ نے وہیں سے اس کی بات اٹھائی: ”ہندوستان میں کون سے اسلحہ جات بن رہے ہیں؟ اب ہوائی جنگ کا زمانہ شروع ہو چکا ہے۔

ہم ترقی یافتہ جنگوں کا ارر۔۔۔ ترقی یافتہ ملکوں کے حملوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟“ لکھنؤ کے انگریزی اخبار کے نمائندے نے اپنے خاکستری رخساروں پر ہاتھ پھیرا اور چشمہ ناک پر ٹھیک کرتے ہوئے بولا: ”نازک ترین مسئلہ جو اس وقت درپیش ہے ”ڈکٹیٹر ازم“ کا ہے۔ وہ آمرانہ پالیسی جس کی طرف بعض انتہا پسند جماعتیں ملک کو لے جا رہی ہیں۔“ یہ الفاظ اُس نے نظریں اٹھائے بغیر مفکرانہ لہجے میں کہے اور اسی طرح نیچے دیکھتا ہوا بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر امبید کر نے پہلی بار پائپ منہ سے نکالا۔ ”ابھی پروفیسر سنگھ نے۔۔۔“

لیکن ان کی بات ختم ہونے سے پہلے کشمیری برہمن، جو سب سے پہلے بولا تھا، بے خیالی

میں بول اٹھا:

”سوراج! سوراج کیا ہے؟ قومیت! قومیت کیا ہے؟ یہ بین لاقوامیت کا دور ہے۔ اشتراکی قومیں اور یورپی اقوام اس قومیت کے جذب میں علیحدگی میں جا پڑی ہیں اور اب معاشی تکلیفات میں مبتلا ہیں۔ کوئی قوم آج اکیلی زندہ نہیں رہ سکتی۔ خود مختاری اور نیشنلزم کا نعرہ ایک نہایت تنگ خیال معاشی اور سیاسی نظریے کا حامل ہے۔ کیا ہم ترقی یافتہ ملکوں سے تجارتی تعلقات منقطع کر کے اپنی ساکھ قائم رکھ سکتے ہیں؟ خود مختاری! اور اسے حاصل کرنے کا جو طریقہ کار بتلایا جاتا ہے۔۔۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

اخبار کا نمائندہ کالوں پر ہاتھ پھیرتا اور سینک ٹھیک کرتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھا گیا اور انگریزی میں بولنے لگا: ”یہی طریقہ کار ہے جو سراسر غلط ہے، ”ڈائریکٹ ایکشن“، جسے بعض انتہا پسند

جماعتیں اچھا رہی ہیں ، قطعی طور پر دہشت انگیزی ہے ۔“
 تمام مہمان خاموشی سے بیٹھے سگریٹ پیتے رہے ۔ خاتون نے سیاہ عینک اتار کر صاف کی
 اور دوبارہ لگالی ۔ پھر مرثوں کے لباس والا شخص ، جو اس تمام دوران میں خاموش بیٹھا رہا تھا ،
 چھڑی کو اٹکیوں میں گھما کر پہلی دفعہ بولا :

”دوسروں پر اعتراضات کرنے سے پیشتر بہتر ہے کہ اپنا نقطہ نظر واضح کیا جائے ۔ ہر
 بات وقت اور حالات کے مطابق وقوع پذیر ہوتی ہے ۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم مرکزی حکومت
 کی باگ ڈور سنبھال سکیں ۔ ہمیں دفاع یا خارجہ پالیسی سے تعلق نہیں ہے ، لیکن وزارت خزانہ
 اور ملک کا عام بندوبست ہمارے ہاتھوں میں ہونا چاہیے ۔ اس کا مطلب ۔۔۔“ اس نے چھڑی
 اٹھا کر ایک پل کی سوالیہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا ، پھر فیصلہ کن انداز میں چھڑی زمین پر
 ٹیکتے ہوئے بولا ؛ ”ڈومینین سٹے ٹس ۔“

اس کے باوجود صبح کا زیادہ تر وقت دوسروں پر اعتراضات کرنے میں صرف ہوا ۔ دوپہر
 کے قریب سب مہمان اس کاروائی سے اکتا گئے اور خالی خالی نظروں سے خطاب کرنے والوں کو
 دیکھنے لگے ۔ واضح طور پر دوپہر کے کھانے کا انتظار ہو رہا تھا ۔ یہ دعوت ان دعوتوں میں سے
 تھی جن کے لیے روشن محل مشہور تھا ۔

کھانے کے بعد معزز مہمانوں کی گرائی طبع کا خیال کرتے ہوئے عجلت کے ساتھ ایک
 ریزولوشن پاس کیا گیا جس میں ملک کی انتہا پسند جماعتوں کی دہشت انگیز کاروائی کی مذمت کی گئی
 اور ”ڈومینین سٹے ٹس“ کا مطالبہ کیا گیا ۔ زیادہ تر مہمان غنودگی کی حالت میں تھے اور بعض
 صوفوں پر دراز باقاعدہ قیلولہ کر رہے تھے ۔

(۲۳)

سائمن کمیشن کے لکھنؤ پہنچنے سے دو روز قبل عذرا وہاں پہنچی ۔ لکھنؤ میں اسے دو کام
 کرنا تھے : ایک نعیم سے ملنا ، دوسرے سائمن کمیشن کا استقبال ۔

اس سلسلے میں لاہور کے واقعات اور لالہ لاجپت رائے کی موت کے باعث ملک بھر میں
 سائمن کمیشن کی بے پناہ تشہیر ہو چکی تھی اور جن شہروں میں ابھی اسے جانا تھا وہاں ہفتوں پہلے
 سے سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ اس کا استقبال کرنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں ۔ اس سے متعلق
 خبروں کو اتہائی اہمیت دی جا رہی تھی ۔ ملک کے بڑے بڑے اخباروں میں اس کی نقل و
 حرکت اور دیگر مصروفیات کا حال جلی حروف میں چھاپا جاتا تھا اور ہر مجلس ، ہر محفل میں اس کا
 تذکرہ تھا ۔ عذرا اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتی تھی ۔ دلی میں روشن آغ کے ڈر سے

وہ کسی مظاہرے میں شریک نہ ہو سکتی تھی ، چنانچہ اس نے لکھنؤ جانے کی ٹھان لی ، جہاں پر وہ ضلع جیل میں نعیم سے بھی مل سکتی تھی ۔ اس ملاقات کو بہر حال اس نے اس وقت تک ملتوی رکھا جب تک کہ سائمن کمیشن کا استقبال نہ کر لیا ۔

لکھنؤ کی اس شفاف صبح کو وہ کانگریس کے دفتر سے روانہ ہوئے ۔ شہر ، اور آس پاس کے دیہات سے آئے ہوئے وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے ۔ ان میں سے زیادہ تر تو شہر پہنچنے کے لیے رات بھر پیدل چلتے رہے تھے ۔ گرد آلود بالوں اور تھکے ہوئے چہروں والے وہ جاہل ، تنگے اور بیکس لوگ ایک ایک دو دو کر کے جمع ہوتے ہوئے اب ایک مہیب اور محرک قوت کی شکل اختیار کر چکے تھے جس پر قابو پانے کا کام حکومت کی مسلح انتظامی مشینری کے سپرد تھا ۔ مویشیوں کے گلے کی طرح ایک دوسرے سے بھڑنے ، ریلتے پلٹتے اور گرد اڑاتے ہوئے ان لوگوں کی آنکھوں میں کوئی تہیہ ، کوئی بغاوت نہ تھی ۔ صرف لا علمی اور امید تھی ، جو بھوکے مویشیوں کی آنکھوں میں دور سے چارے کا کھیت دیکھ کر پیدا ہوتی ہے ۔ ان کا نظارہ دیکھنے والے کے دل میں ایک مجموعی طاقت کے ساتھ ساتھ بے اندازہ رحم کے جذبات پیدا کرتا تھا ۔

عذرا نے انہیں دیکھا ، اور سوچا ۔

”ان کو کون دھوکا دے سکتا ہے ! انہیں کون پیٹھ دکھا سکتا ہے !“

ہزاروں انسانی سروں کے اوپر جگہ جگہ چھوٹے بڑے سیاہ جھنڈے لہرا رہے تھے اور ہجوم میں بار بار تین انگریزی الفاظ کی پکار اٹھ رہی تھی : Simon, Go Back شاید یہ انگریزی زبان کے صرف تین الفاظ تھے جو ان میں سے بہت سوں نے عمر بھر میں سیکھے تھے اور ان کا مطلب ان میں سے کسی کو بھی نہ آتا تھا لیکن وہ انہیں اس جذبے سے دہرائے جا رہے تھے جیسے ان کی سینکڑوں برس کی مشقت اور غربت کا انعام انہی تین لفظوں میں پنہاں تھا ۔ مختلف سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے ان کے ساتھ مزید جتنے آکر ملتے گئے اور ریلوے سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے اس لیے چوڑے جلوس میں کئی ہزار کا اضافہ ہو چکا تھا ۔ راستے میں سب سڑکوں پر پولیس اور فوج کا پہرہ تھا ۔ پچھلی شام اسی طرح کے ایک جلوس کو لاٹھی چارج کے ذریعے منتشر کیا جا چکا تھا ۔

ریلوے سٹیشن کے سامنے ایک میدان میں انہیں روک دیا گیا ۔ گھڑ سوار پولیس کے جوان آہنی زنجیر کی طرح ان کے آگے کھڑے ہو گئے ۔ ان کے چہروں پر کوئی جذبہ نہ تھا ۔ وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں دیکھنے سے احتراز کر رہے تھے اور ہجوم کے سروں کے اوپر اوپر دیکھ رہے تھے ۔ پیچھے میدان میں فوج اور پولیس کی ایک بھاری تعداد بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھی اور ان میں سے پرے ضلع کے تمام حکام ، جن میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی ، پھیلے ہوئے تھے ۔ انہوں نے اپنی ٹوپیاں آنکھوں پر نیچے تک کھینچ رکھی تھیں اور دھوپ میں ان کے چہرے زرد دکھائی دے رہے تھے ۔ کئی لوگ آگے بڑھنے کے امکان نہ پا کر زمین

پر بیٹھنے شروع ہو گئے اور جب وہ سامنے کھڑے ہوئے مسلح فوجیوں کے چوہنی چہروں کو دیکھ دیکھ کر اکتا گئے تو آپس میں باتیں کرنے لگے۔ عذرا نے اپنے قریب چند کسانوں کو دیکھا۔ پہلے انہوں نے قطار کو توڑ کر چھوٹا سا دائرہ بنایا۔ پھر ایک نے سن کا ایک ٹکڑا جلا کر آگ سلکائی، دوسرے نے پگڑی ٹٹول کر تمباکو اور گڑ نکالا، تیسرے نے حقہ تیار کیا۔ پھر وہ بیٹھ کر باری باری کش لگانے اور دلجمعی سے باتیں کرنے لگے۔ عذرا نے سنا، وہ گاؤں کی باتیں کر رہے تھے، اور فصلوں کی اور میلوں کی، اور تمباکو کی تعریف جو شراب سے زیادہ کڑوا تھا، اور جنس کی گرانی کی شکایت، اور اپنی عورتوں کی جو آٹھ آٹھ ماہ کی حاملہ تھیں اور کھیتوں میں کام نہ کر سکتی تھیں، اور روزمرہ کی کتنی ہی ایسی باتیں جو ہر شام کو چوپال میں بیٹھ کر کیا کرتے تھے، اور عذرا نے خاموشی سے دل میں تعجب کیا کہ یہ معمولی معمولی لوگ کس قدر آسانی کے ساتھ وقت کی گرانی کو قبول کر کے نظر انداز کر دینے کے قابل تھے اور اس لحاظ سے وہ سامنے کھڑے ہوئے اور پھرتے ہوئے ان لوگوں سے کس قدر مختلف تھے جو اذیت ناک توجہ اور احتیاط کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھے۔

اکلی صف میں کھڑے کھڑے اس نے پرویز کو دیکھا جو گھڑ سواروں کی قطار کے پیچھے میدان کو پار کر رہا تھا، اور وہ حیران رہ گئی۔ اس کے اندازے کے مطابق اسے اس وقت دلی میں ہونا چاہیے تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال ہوا کہ پرویز نے اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ گھبرا گئی۔ اس سارے عرصے میں پہلی بار اسے خیال آیا کہ وہ کس قدر نامناسب جگہ پر کھڑی تھی، کتنے نامناسب ماحول میں! دوکانداروں اور مزدوروں اور کسانوں کے درمیان، اور وہ پرویز کی بہن تھی، خان بہادر غلام محی الدین آف روشن پور کی لڑکی تھی، اور روشن محل میں چیف کمشنر کو مدعو کیا جاتا تھا، کہ وہ گھڑ سواروں کے دوسری طرف کے گروہ سے تعلق رکھتی تھی اور اس طرف کھڑی تھی، تنہا، غیر محفوظ! اسے دل میں شرم محسوس ہوئی،۔ اسی وقت پولیس کے جوانوں کی قطار بیچ میں سے ٹوٹ کر سامنے سے ہٹ گئی اور سامنے گرد کا طوفان دکھائی دینے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گرد میں سے نکل آئے۔ یہ گھڑ سوار فوجیوں کی قطار تھی جو میدان کے سارے طول میں پھیلی ہوئی تھی اور تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

پوری رفتار سے حملہ آور ہوتے ہوئے گھڑ سواروں کا نظارہ یقیناً حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ ہجوم کی پہلی قطاروں میں ہلچل مچ گئی اور لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھنے لگے۔ پھر ایک بیک، کسی ان دیکھی طاقت کے تحت مجمع ساکت ہو گیا اور فضا پر مکمل خاموشی چھا گئی، جیسے کمرہ امتحان میں ہزاروں طالب علموں پر چھا جاتی ہے۔ صرف گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز باقی رہ گئی جو برق رفتاری کے ساتھ لحظہ بہ لحظہ قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر پتھر کی طرح گڑے ہوئے مجمعے کے ساتھ ٹکرا کر انہوں نے باگیں کھینچ لیں اور گھوڑے اگلے پاؤں اٹھا کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔

عذرا نے اپنے سر پر گھوڑے کے سم ہوا میں کانپتے ہوئے دیکھے اور اپنے آپ کو ایک لمبے قد کے مرد کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی مگر نیچے آتے ہوئے گھوڑے کا سم اس کے ماتھے سے ٹکرا گیا ، جس سے وہاں پر خفیف سا زخم آگیا اور قطرہ قطرہ خون بہنے لگا۔

اس کے بعد لاٹھی چارج شروع ہوا۔ سکوت اسی تیزی کے ساتھ ٹوٹ گیا اور چاروں طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ تیزی کے ساتھ سرسراتے اور مار گراتے ہوئے مگدر اور لاٹھیاں ان کے سروں پر سے گزرنے لگی۔ اچانک وہ بے حد خوف زدہ ہو کر واپس بھاگی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے لاٹھیوں کی ضربوں سے گرتے ، اٹھتے اور حاسدانہ جذبے کے ساتھ اپنی جگہ کی حفاظت کرتے ہوئے مرد دیکھے۔ ان کے ہاتھ واپس مار گرانے کے لیے بے چین ہو رہے تھے اور ان کے چہرے شدید نفرت سے سیاہ ہو گئے تھے۔ اور غصے ، ذلت اور جسمانی تکلیف کے مارے دانت تنگے کر کے وہ زمین سے اٹھ رہے تھے۔ عذرا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے گھڑ سواروں کے چند چہرے دھائی دیے۔ ان پر بھی وہی شدید نفرت اور متناؤ تھا۔ دفعتاً کہرام اور افراتفری کے اس وقت میں عذرا کے دماغ نے بے حد واضح طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے سوچا کہ کس طرح انسانوں کے دو گروہ ، بغیر کسی دیرینہ عناد اور جان پہچان کے ، نفرت اور انتقام کے جذبات لے کر اچانک آمنے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں ، کہ حاکم اور محکوم گروہوں کے درمیان اس تیسرے گروہ کی ، جو محکوم گروہ میں سے چنا جاتا اور ہتھیاروں کے طور پر استعمال ہوتا تھا ، کس قدر لایعنی اور مضحکہ خیز پوزیشن ہے۔ چند لمحوں کے اندر اندر خیال کی یہ تیزی غائب ہو گئی اور وہی کنفیوژن پھیل گیا۔ لیکن یہ وقت اسے بہت دیر تک یاد رہا اور اس واقعے کے گزر جانے کے بہت عرصے کے بعد اس نے نعیم سے اس کا ذکر کیا کہ کس طرح خطرے اور ابتری کے لمحے میں اس کا ذہن حیرت ناک طور پر واضح اور تیز تھا۔

ہجوم کے عقب میں اس نے ایک شخص کو دیکھا جو اٹے پاؤں بھاگتے ہوئے مجمع کی تصویریں لے رہا تھا۔ وہ ماتھے کے زخم پر سے کپڑا بٹھا کر عین اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ مختصر سی مزاحمت کے بعد لوگ شدید ہوتی ہوئی ضربوں سے بلبلا کر بھاگ اٹھے۔ حملہ آوروں نے کچھ دور تک ان کا تعاقب کیا ، پھر رگ گئے۔ مجمع آگے جا کر بٹھہر گیا اور اس وقت تک رکا رہا جب تک کہ سائمن کمیشن کے ارکان گاڑی سے اترے بغیر لکھنؤ سٹیشن پر سے خاموشی کے ساتھ گزر نہ گئے۔

نعیم کی مشقت میں نمایاں طور پر کمی کر دی گئی تھی اور اب وہ محض قیدیوں کے پھٹے پرانے کپڑے مرمت کرنے کے کام پر مقرر تھا ، آہستہ آہستہ اس نے سینے سلانے میں کافی مہارت حاصل کر لی اور اس کام سے خوش رہنے لگا۔

اس روز وہ آہنی جنگلے سے ٹیک لگائے بیٹھا ایک قیض سی رہا تھا کہ (Convict Overseer) No.19 c.o. اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ان کے عقب میں شور مچاتے ہوئے قیدی پانی کھینچ رہے تھے اور دھوپ سیدھی ان کے سروں پر پڑ رہی تھی۔ No.19 c.o. نے شیشے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جیب سے نکالا اور اس میں دیکھ دیکھ کر داڑھی کے سفید بال نوچنے لگا۔ نعیم اپنے کام میں مصروف رہا۔ اوور سیئر نے دو ایک بار کھانس کر اور پاؤں زمین پر رگڑ کر حسب معمول اپنی آمد کی اطلاع دی۔ جب نعیم نے اسے کوئی اہمیت نہ دی تو اس نے اپنی ٹانگیں، جو وہ پہلے ہی پسارے ہوئے تھا، بڑھا کر عین اس کی ناک کے نیچے رکھ دیں۔

”کیا کر رہے ہو؟“ اس نے شیشے میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اندھے ہو؟“ نعیم نے جواب دیا

”میں نے کسی لٹچے کو آج تک کپڑے سیتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

”یہ کیا باتیں مت کرو۔“ نعیم نے اکتا کر کہا۔ اوور سیئر کے پسارے کا مطلب سمجھ گیا۔

اس کا جی چلا کہ تھے خوبصورت جوتے کی تعریف کرے کہ جیل میں ایسی چیزیں کم دیکھنے میں آتی تھیں۔ مگر وہ جوتے کے مالک سے اس حد تک اکتا چکا تھا کہ خاموشی سے قیض پر جھکا رہا۔ اوور سیئر شیشے میں دیکھ کر بال نوچتا اور پاؤں ہلاتا رہا۔

”تم کتنے برس کے ہو؟“ نعیم نے کپڑا سیتے سیتے پوچھا۔

”پینتیس۔“

”کتنی سزا باقی ہے؟“

”چالیس۔“

”باہر جانے سے پہلے مر جاؤ گے۔“

”پتا نہیں۔ شاید!“

”پھر داڑھی میں سے سفید بال کیوں نکالتے ہو؟“

”کیس؟“ وہ شیشہ زمین پر رکھ کر داڑھی کھجاتا ہوا سوچنے لگا۔ پھر قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”سور۔ تم کیا سوچتے رہتے ہو!“ وہ یقیناً اچھے موڈ میں تھا، کیونکہ اس نے پاؤں آگے کھسکایا اور بولا: ”تم نے میرا جوتا دیکھا؟“

”نہیں۔“ نعیم نے جل کر کہا۔

”ہا ہا۔۔۔ لومڑی کے بچے۔ دیکھو کیسا خوبصورت ہے۔ پتا ہے میں نے کیسے لیا

ہے؟“

”نعیم خاموشی سے کپڑا سیتا رہا۔ اس نے جوتا اتارا اور اس پر بچے کی طرح پیار سے ہاتھ پھیر کر بولا: ”دس مہینے تک میں اس کی راہ دیکھتا رہا۔ گرم چند کو جاتے ہو، وہ لمبا شخص اچھی

جو پار سال باہر گیا تھا ، اسے سال بھر تک میں افیم کھلاتا رہا۔ جب جانے لگا تو بولا! 'استاد ، تمہیں دنیا سے کیا چاہیے ؟' میں نے کہا : "میرے پیر کی درگاہ پر سلام پہنچا آئیو ۔" پھر میں نے سوچا مدت ہوئی میں نے نیا جوتا نہیں پہنا ۔ پیر کو گولی مارو ۔ تو اس دن کا گیا ہوا کل وہ حرامی لوٹا اور اسے باہر والی نالی میں رکھ گیا ۔ رات بھر میں اسے نکالنے میں لگا رہا ، جب نکلا تو بھگیے ہوئے چوہے کی طرح دکھائی دے رہا تھا ، پر اسے میں نے نکال کر چھوڑا ۔ تمہارا باپ بھی اسے نہ نکال سکتا ۔ دیکھا اچھا ہے نا ؟"

کافی دیر کے بعد نعیم نے تلخی سے کہا : "ہاں!"

"تم جلتے ہو اسی لیے اس کی تعریف نہیں کرتے ۔ اسے نکالنے میں میری کھوپڑی پر تیرہ زخم آئے ہیں ۔"

"تمہاری شیخیاں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں ۔"

"چپ رہو ۔" وہ غرایا اور شیشہ اٹھا کر داڑھی صاف کرنے لگا ۔ دونوں خاموش بیٹھے ،

پھر اوور سیئر کی کلکت پکار اٹھا : "حرام زادہ!"

نعیم نے سر اٹھا کر دیکھا ۔

"پسو ہے ۔" اس نے پسو کو اٹھکیوں میں مسلا ، جس سے خون اس کے پوروں پر پھیل

گیا ۔ "یہ بہن چود داڑھی میں بھی گھس آتے ہیں ۔" وہ وحشیوں کی طرح ناخنوں سے داڑھی

کھجانے لگا جس سے اس کے کال جگہ جگہ سے زخمی ہو گئے اور ان سے خون رسنے لگا ۔ نعیم تمسخر

سے ہنسا ۔

"دیکھو ۔" اوور سیئر نے اٹھکی اٹھائی ، "میں چاہے مروں یا زندہ دنیا میں چلا جاؤں ، "میری

داڑھی میری اپنی ہے میری ۔" اس نے اٹھکی سینے پر بجائی ، "تم نے اس میں دخل دیا تو تمہاری

داڑھی جلا دوں گا ۔"

دونوں پھر اپنے اپنے کام میں لگ گئے ۔ ذرا دیر بعد اوور سیئر نے شیشہ جیب میں ڈالا اور

اٹھ کھڑا ہوا ۔ "آج ملاقات ہے ۔"

"لیس ؟ آج ملاقات ہے ؟" نعیم چونکا ۔

"ہاں ۔ تمہاری بیوی آئے گی ؟"

"پتا نہیں ۔ تمہاری ؟"

"نہیں ۔ میری بیوی اب دوسرے مرد کے ساتھ رہتی ہے ۔" وہ جانے کے لیے مڑا ،

پھر رک کر بولا ، "پہلے ہر سال آیا کرتی تھی ۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا : "تمہارے خواہش نہیں

ہوتی ؟" کہنے لگی : "ہوتی ہے ۔" میں نے کہا ؛ "جاؤ ، جس مرد کے ساتھ جی چاہے رہو ۔ مجھے اس

کی پروا نہیں ۔" اس کے بعد وہ نہیں آئی ۔ "کچھ دیر تک وہ وہیں کھڑا ، ہتھیلی پھیلا کر اس میں

دیکھتا رہا۔ ”لیکن کبھی کبھی۔۔۔ مجھے یاد آتی ہے۔“
 نعیم اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر داڑھی مونڈنے اور بازو حاصل کرنے کے لیے چلا گیا۔

دوپہر کے بعد ملاقات شروع ہوئی۔ حسب معمول قیدیوں اور ملاقاتیوں کو سات سات کی ٹولیوں میں آمنے سامنے دس گز کے فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا۔ نعیم نے داڑھی مونڈ لی تھی لیکن اس روز وہ اپنا بازو حاصل نہ کر سکا، جیسے کہ وہ ہمیشہ ملاقات سے پہلے چند منٹ کے لیے حاصل کر لیا کرتا تھا۔ عذرا بائیں کونے میں کھری تھی۔ وہ اس کے سامنے والی جگہ پر جا کھڑا ہو گیا۔ اتنے فاصلے پر سے، اور ایسے جگمگت میں خوش آمدید کے الفاظ ادا کرنا ناممکن تھا، چنانچہ کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑے رہے، پھر عذرا نے جیب سے اخبار نکال کر لہرایا۔

”ہم نے کل سائمن کمیشن کے لیے مظاہرہ کیا تھا۔“ نعیم کو ایک لفظ سنائی نہ دیا۔ تمام قیدی اور ملاقاتی ایک وقت۔۔۔۔۔۔ چلا چلا کر باتیں کر رہے تھے۔

”ہم نے سائمن کمیشن کا کالی جھنڈیوں سے جلوس نکالا۔“ وہ دوبارہ چلائی، ”یہ دیکھو۔ یہ تصویر، میری تصویر۔ لو۔“ اس نے اخبار نعیم کی طرف بڑھایا جسے نگران ملاقات نے آہستگی سے اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ وہ چلاتی رہی: ”ہم نے انہیں یہاں پر اترنے نہیں دیا۔ وہ چوروں کی طرح سٹیشن پر سے ہی چلے گئے۔ مجھے زخم آگیا تھا۔ یہ۔“ اس نے ماتھے پر سے کپڑا اٹھا کر دکھایا۔

نعیم کو یہ سن کر خفت ہوئی۔ وہ غیر شعوری طور پر اپنی میوی اور اس کے خاندان پر متفخر تھا۔

”تمہیں گھر پر رہنا چاہیے۔“ اس نے تلخی سے کہا۔
 ”لیس؟“

”تمہیں گھر پر رہنا چاہیے۔“ اس نے دوبارہ کہا۔ عذرا نے کچھ نہ سنا۔
 ”وہاں پرویز بھی تھا۔ وہاں پر۔“ وہ بولتی رہی۔

اس وقت نعیم کو کھلے دروازے میں سے باہر کا نظارہ دکھائی دیا۔ ایک عورت ہاتھ میں سبزی کا تھیلا لٹکائے گزر رہی تھی۔ ایک بچہ اس کا دامن تھامے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے مسحور ہو کر ایڑیاں اٹھائیں اور عذرا کے کندھے کے اوپر سے باہر دیکھنے لگا۔ ایک خواب ناک کیفیت اس کے سارے وجود پر طاری ہو گئی، جس میں اس کے کان کبھی کبھی کام کرنا شروع کر دیتے اور عذرا کی آواز سنائی دیتی۔ اس کی تمام تر قوتیں آنکھوں میں مرکوز ہو چکی تھیں۔ سبزی سے بھرا ہوا ایک ٹرک گزرا جس میں سے چند شلغم گر کر سڑک پر بکھر گئے۔ پھولدار چھاتے والی ایک عورت، تانگے، میل، کتے؛ ایک خوبصورت کتے کو دیکھتے رہنے کی کوشش میں وہ

کھسکتا کھسکتا ساتھ والے قیدی کی بغل میں گھس گیا، جس نے ہکا دے کر اس کا طلسم توڑ دیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ والے دو قیدی بیک وقت پوری آواز سے چلا رہے تھے :

”لال کائے نے کیا دیا ہے؟“ ایک نے پوچھا۔

”دو روپے۔“ اس عورت نے چلا کر دوسرے کی بات کا جواب دیا، جو اپنے ملاقاتی سے

جوار کا بھاؤ پوچھ رہا تھا : ”دو روپے من۔“

پہلا قیدی بھنجنجھلا گیا : ”چپ رہو سؤر۔“ وہ دوسرے کی پسلیوں میں کہنی مار کر غرایا۔
نعیم کو ہنسی آگئی۔ عذرا خاموشی سے اس کے بازو کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کئی بار باری باری عذرا کو اور اپنے بازو کو دیکھا۔

”ہاں۔، وہ لے گئے ہیں۔“

”کیوں؟“ عذرا نے پوچھا۔

”مل جائے گا۔ صاف کرنے کو دیا ہے۔“ اس نے جھوٹ بولا اور لٹکتی ہوئی آستین کو

مروڑنے لگا۔

”یہ لو۔“ نگران کی آنکھ پچا کر عذرا نے سگرٹوں کا ایک پیسٹ اس کی طرف اچھالا۔

چند منٹ کے بعد ملاقات ختم ہو گئی اور وہ دل میں ایک بھاری، لامقام سی خلش لے

کر وہاں سے لوٹ آیا۔

اس نے عذرا کی کمی کو اس وقت محسوس کیا جب کہ وہ جا چکی تھی۔ وہ اپنی کوٹھری میں

آکر لیٹ گیا اور خواہش کی شدت میں اس کے حلق سے نیم مردہ جانور کی طرح ایک خشک، کرب

آلود کراہ نکلی۔ اس کا جی چلایا کہ وہ اس کے قریب بیٹھے، اسے چھوئے، اسے محسوس کرے،

اس کی جلد کی ہلکی ہلکی گرمی، ہلکی ہلکی خوشبو کو سونکھے اور جذب کرے، اس کے جسم کی ڈھلانوں

پر ہاتھ پھیرے۔ وہ آہستہ آہستہ پتھر کی دیوار پر ہاتھ پھیرنے لگا اور جلتی ہوئی خواہش کا دھیمہ،

کچلتا ہوا درد اس کے جسم پر پھیلتا گیا۔ وقفے وقفے پر وہ مرتے ہوئے جانور کی سی خشک، مختصر

آوازوں میں کراہنے لگتا۔

چند گھنٹے کے مدقوق جذبے میں گھلنے کے بعد اس کی آنکھیں نمایاں طور پر اندر دھنس گئیں

اور رخساروں کی ہڈیاں باہر نکل آئیں۔

اندھیرا ہونے سے پہلے C.O. نمبر ۱۹ اس کی کوٹھری میں آیا۔

”اٹھو۔ اندھا جیب کترا جا رہا ہے۔“

”جا رہا ہے؟“ نعیم نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ دنیا میں۔“ پھر وہ چونک پڑا، ”بس؟ تم بیمار ہو؟“

”نہیں۔“ نعیم نے جھوٹ بولا، ”میں نے کھانا نہیں کھایا۔“
 اور سیٹر جیل والوں کو کالیاں دینے لگا جو کھانے میں ریت ملا کر دیتے تھے۔ پھر وہ
 دونوں اندھے جیب کترے کی طرف چل پڑے جو چھ ماہ گزار کر باہر جا رہا تھا۔
 اس کے گرد سب پرانے قیدی، جنہیں اس وقت باہر پھرنے کی اجازت تھی، جمع تھے
 اور اس کے ساتھ ٹھٹھا کر رہے تھے۔ C.O. نمبر ۱۹ نے جاتے ہی ایک زور دار دھپ اس کی کمر
 پر جمایا جس سے اس کا سر زمین سے جا لگا۔ پھر وہ اس کی داڑھی پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولا:
 ”اندھے سؤر، بڑے خوش ہو رہے ہو۔ دنیا میں جا رہے ہو اس لیے؟ ابھی کوئی دن
 میں پھر یہاں آؤ گے۔“

اس نے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے داڑھی کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ ”اب
 کے میں ان حرامیوں میں تو نہیں آؤں گا۔ میری داڑھی کا ستیاناس کر دیا ہے۔“
 ارد گرد ہنسی کی ایک لہر اٹھی۔
 ”اندھے، تم دنیا میں کس کے پاس جاؤ گے؟“ ایک نے پوچھا۔
 ”باپ کی قبر پر۔“
 ”کیوں؟“

”وہاں میں نے کچھ نقدی دبا رکھی ہے۔ ابھی کچھ روز اس پر گزاران کروں گا جب تک
 ان کا آدمی میرے پیچھے لگا رہے گا۔ پھر اپنا دھندا شروع کروں گا۔“
 ”پھر تم کھر جاؤ گے؟“
 ”میرا کھر کوئی نہیں۔“
 ”بیوی؟“

”اوں ہنہ۔“ اس نے گونگوں کی طرح سر ہلایا۔

”ماں؟“

”اوں ہنہ۔“

”باپ؟“

اندھے نے بڑی سی کالی دی۔ ”گدھے کے بچے، اسی کی قبر پر تو جاؤں گا۔“
 ”اندھے، اب تم پہلی جیب کب کاٹو گے؟“ اسے ستگ کرنے کے لیے ایک قیدی نے
 پوچھا۔

”ہٹ جاؤ۔۔۔ ہٹ جاؤ۔“ اچانک اندھے نے چیخ کر کہا اور دہکے مار مار کر سب کو
 پیچھے ہٹا دیا۔ ”کھجلی شروع ہو گئی۔“ پھر وہ وحشیوں کی طرح ناخنوں سے پاؤں کو کھر چنے لگا۔
 اس کے پاؤں غلیظ تھے اور ان پر جگہ جگہ پھٹے ہوئے زخم تھے۔ کھرینے سے زخم پھل گئے اور ان

سے خون رسنے لگا۔ اندھا بے دردی سے کھرچ رہا تھا اور درد کے مارے سی سی کرتا جا رہا تھا۔ دوسرے قیدی ارد گرد کھڑے قہقہے لگاتے رہے۔

آخر اوورسیئر نے گالیاں دے کر سب کو چپ کرایا اور وہ اسے بڑے دروازے تک چھوڑنے کے لیے گئے۔ بہت سی اباہیلیں دوسرے آسمانوں پر سے اڑ کر جیل کے آسمان پر آ گئی تھیں۔ اندھے کے جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ سب فطری طور پر خاموش اور اداس ہو گئے۔ وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے بڑے آہنی گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ شام کے دھندلکے میں وہ سب غول بیلابانی کی طرح بے جان بازو لٹکائے حریص، بے نور نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً C.O. نمبر ۱۹ ان میں سے نکل کر بھاگ پڑا۔ اندھے جیب کترے کے پاس جا کر وہ رکا اور پاؤں سے جوتا اتارنے لگا۔

”لو۔ یہ لے لو۔ پہن لو۔“ وہ جوتا اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولا۔

اندھے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جوتے کو ٹٹولا اور پچوں کی طرح ہنس پڑا۔ جلد جلد اسے پاؤں میں پہن کر اس نے ہاتھ بڑھا کر اوورسیئر کے کال میں چٹکی بھری اور باہر نکل گیا۔ C.O. نمبر ۱۹ ہنستا ہوا نعیم کی طرف آیا۔ ”میری کھوپڑی ابھی تک زخمی چوہے کی طرح دکھ رہی ہے۔“ اس نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں نے سوچا وہ دنیا میں جا رہا ہے اور اس کے پاؤں میں کھجلی ہے۔“

تاریکی تیزی سے چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی اپنی کوٹھریوں کی طرف لوٹ آئے۔

جب عذرا روشن محل پہنچی تو وہاں کی فضا کشیدہ تھی۔ اس کا استقبال پرانے، پُر محبت طریقے پر نہ کیا گیا۔ اس کی ماں، جو پہلے ہی اس سے لا تعلق رہتی تھی، کچھ نہ بولی۔ خالد نے اسے بتایا کہ پرویز اس سے پہلے پہنچ چکا تھا اور وہ اور روشن آفا سخت خفا تھے۔ پرویز کی بیوی بظاہر اس واقعے سے بے خبر اپنے اسی سرپرستی اور برتری کے رویے کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے ملی۔ عذرا نے چھوٹی بہن کو اٹھا کر پیار کیا اور اس سے باتیں کرتی رہی۔ صرف روشن محل کے تمام ملازم اور ان کی عورتیں باری باری سلام کے لیے حاضر ہوئیں۔

پھر اس نے مضبوطی سے ماتھے پر کپڑا جمایا اور ناشتہ کیے بغیر بھاری دل کے ساتھ روشن آفا کو سلام کرنے گئی۔ وہ اپنی سٹڈی میں چمڑے کی لمبی کرسی پر بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے ان کے سر پر سبز رنگ کا فرشی لیمپ جل رہا تھا۔ پرویز اسٹول پر چڑھ کر بیٹھا ہوا دھات کی راکھ دانی کو دریچے کے فرش پر چلا رہا تھا۔ روشن آفا نے سنجیدگی سے اس کے سلام کا جواب دے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے اٹھ کر اس کا ماتھا نہ چوما، سر پر ہاتھ نہ رکھا، کوئی ایسا اشارہ نہ کیا جس سے انہوں نے کئی بار پریشان حال موقعوں پر عذرا کے دل میں سکون اور سلامتی کا احساس

پیدا کیا تھا۔ وہ دوسرے کونے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ پرویز عمداً اس کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے راکھ دانی کے ساتھ مصروف رہا۔ دفعتاً عذرا نے پہلی دفعہ روشن آغا کے کمرے میں اپنے آپ کو غیر محفوظ اور کمزور محسوس کیا، وہ جگہ جہاں پر وہ ہمیشہ محبت اور سلامتی کی تلاش میں آیا کرتی تھی۔

کمرے پر کڑی خاموشی طاری تھی۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی، وہی پرانی کرسیاں اور صوفے، اور پردے اور کتابیں۔ کیسی عجیب بات تھی۔ الماریوں میں جانے کون کون سی کتابیں بھری پڑی تھیں، اسے نے کبھی انہیں اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ ان الماریوں میں کون کون سے کپڑے ٹنگے تھے؟ کس کے؟ اس نے کبھی ان پر برش نہ کیا تھا۔ سامنے سبز لیمپ کے نیچے اس کا باپ بیٹھا تھا، تیزی سے بوڑھا ہوتا ہوا، زرد، رنجیدہ اور پروقار، جیسے ایک شریف النسب انسان کو ہونا چاہیے؛ وہ اسے نہ جانتی تھی۔ اس نے کبھی اس کے منگھلیں سلپہر سیدھے کر کے نہ رکھے تھے۔ وہ کبھی اس قالین پر بلی کی طرح نہ لیٹی تھی۔ وہ ان سب چیزوں سے اس قدر الگ، اس قدر اجنبی ہو چکی تھی، پل کے پل میں، کیسی عجیب بات تھی۔

روشن آغا نے کتاب بند کر کے بازو کی چھوٹی میز پر رکھی اور سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر سیدھا اس کی طرف دیکھ کر آزرده، لیکن مضبوط لہجے میں بولے: ”آپ لکھنؤ میں تھیں، بی بی۔“

عذرا نے گونگوں کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔ روشن آغا نے چشمہ اتار کر کتاب پر رکھا اور ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملا۔ ”ہم نے سنا آپ نے وہاں کسی ہنگامے میں شرکت کی۔“

”میں نعیم سے ملنے گئی تھی۔“ عذرا نے یکساں آواز میں کہا۔

”تو آپ کا خیال ہے ہم نے غلط سنا؟“ انہوں نے غصے کو دبا کر کہا اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگے۔

”مجھے تمہارے کارنامے دیکھنے کے لیے چشمے کی ضرورت نہیں ہے۔“ پرویز نے تیزی سے کہا۔ عذرا نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور کوئی سخت بات کہنے کے لیے اس کے ہونٹ کانپے۔ پرویز نے گھبرا کے نظریں ہٹالیں اور راکھ دانی میں اٹھکی گھمانے لگا۔

”نعیم نے پہلے ہی اپنی حب الوطنی سے ہماری عزت بڑھائی ہے۔ ہمارے خاندان میں پچھلے سو برس سے کسی نے ایسے کام نہ کیے تھے۔“ روشن آغا خشکی اور طنز سے ہنسے۔ عذرا اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

میں۔ تمہیں روشن آغا اور روشن محل کا نام برقرار رکھنے کے لیے پرورش کیا تھا۔“

روشن آغا اب واضح طور پر تلخی سے بولے، ”آپ سے امیدیں وابستہ کی تھیں۔ یہ نہیں کہ

چھوٹے لوگوں کی طرح آپ ہنگامے اور قانون شکنی کریں۔ اب آپ بھی جیل جاؤ گی؟“
جواب دینے سے پہلے وہ ایک لمحے کو دل میں کانپی، پھر سیدھا اپنے باپ کی آنکھوں میں
دیکھتے ہوئے بولی: ”اس کے ساتھ اور بھی کئی بڑے بڑے لوگ جیل گئے ہیں۔ انہوں نے کوئی
گھٹیا جرم نہیں کیا ہے۔“

”مجھے علم ہے جیل میں ان کے ساتھ اخلاقی مجرموں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔“ پرویز
راکھ دانی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ٹوٹنے سے پہلے وہ چند لمحے بے خیالی کے آتے ہیں ان میں اس
نے باری باری کئی بار اپنے باپ اور بھائی کو دیکھا، لیکن جواب نہ دے سکی۔ بے کسی اور ذلت
کے شدید احساس کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور رونے لگی۔ آہستہ آہستہ
دو بار اس نے کہا: ”بابا۔۔۔ بابا۔۔۔“

چند طویل لمحوں تک دونوں مرد پشیمانی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر پرویز اسٹول
سے اترتا اور باہر نکل گیا۔ روشن آغا نے چشمہ اتار کر واپس کتاب پر رکھا اور بار بار آنکھوں کو
کھولنے اور بند کرنے لگے۔ لیمپ کی روشنی میں وہ بے حد زرد نظر آ رہے تھے اور ان کی
آنکھوں کی پوریس کپکپا رہی تھیں۔ پھر وہ اٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے عذرا کے سر پر جا کھڑے
ہوئے۔ عذرا نے رک رک کر کہا:

”بابا۔۔۔ میرا شوہر جیل میں ہے، اور آپ۔۔۔ آپ۔۔۔“

جیب سے ہاتھ نکال کر انہوں نے آہستہ سے عذرا کے سر پر رکھا اور تیزی سے باہر نکل
گئے۔

ناشتہ کیے اور کسی سے ملے جلے بغیر عذرا نے جا کر اپنے کمرے کھلوائے اور صفائی کروائی۔
پھر دیر تک دریچے میں کھڑی ہاتھ بڑھا کر یوکلپٹس کے پتوں کو توڑتی رہی۔ دوپہر کے قریب
اسے بھوک محسوس ہونے لگی۔ کھانا اس نے وہیں پر منگوایا اور خالہ سے، جو اسے دیکھنے آئی تھی،
نرمی سے کہا: ”میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

کھانا کھا کر وہ پھر دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔ کھانا مقوی اور لذیذ تھا اور وہ ایک پُر شکم
توانائی اور فرحت محسوس کر رہی تھی، وہ احساس جو اکثر بہت سارا رونے کے بعد بھی ہوتا ہے۔
یوکلپٹس کے پتے توڑتے ہوئے اس کی نظر میلے ناخنوں اور بازوؤں پر پڑی جن پر سفر کی تمام گرد
جمی ہوئی تھی۔ اس نے نہانے کا ارادہ کیا۔

کپڑے اتار کر اس نے زیتون کا تیل سارے بدن پر ملا اور ہتھیلیوں کی مدد سے آہستہ
آہستہ اسے جلد میں جذب کرنے لگی۔ اس نے ربڑ کی طرح دبتی اور ابھرتی ہوئی اپنی گندمی،
تندرست جلد کو دیکھا اور اس کے بدن میں گہرا سرور اور امنگ پیدا ہوئی۔ سرور، جس میں
پیاس چھپی ہوئی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور کمرے میں پھرنے لگی۔ قد آدم آئینے

کے سامنے رک کر اس نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اپنے جسم کو ہر زاویے سے دیکھا۔ اس کا بدن کنواری لڑکیوں کی طرح کسا ہوا، لچکدار اور مضبوط تھا۔ دیر تک وہ معطل ذہن کے ساتھ بند کمروں میں چکر لگاتی رہی اور اس کے روئیں روئیں میں سوزش پیدا ہوئی، سوزش اور پیاس، اس مرد کے لیے جس سے وہ محبت کرتی تھی۔ حسرت اور محرومی کے اذیت ناک لمحے ایک ایک کر کے اس پر سے گزرتے رہے۔

آخر بند دریچے کے پتھر پر کال رکھے رکھے وہ رفتہ رفتہ واپس آگئی۔ اس نے اپنے آپ پر نظر ڈالی اور لال ہو کر غسل خانے میں گھس گئی۔ بڑی دیر نہاتے رہنے کے بعد جب وہ بالوں کو برش کر رہی تھی تو اس کا جسم مردوں کی طرح سرد ہو چکا تھا اور دل میں ایک بے نام سی، بیمار کر دینے والی کسلمندی باقی رہ گئی تھی۔

(۲۴)

C.O. نمبر ۱۹ کا ایک دوسرے اوورسیٹر کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور اس نے آہنی جینکے پر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا۔ سزا کے طور پر اسے دو ماہ کے لیے کوٹھری کی قید اور سخت مشقت کا حکم سنایا گیا۔ سزا کے دوران وہ بند دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہتا اور ہر آنے جانے والے کو کالیاں دیا کرتا۔ اس کے چہرے پر درندوں کی سی بے روح تنیدی کا اثر نمایاں بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ برسات کا موسم تھا۔ یہ موسم قیدیوں کے واسطے سارے سال میں دلچسپ موسم ہوتا تھا۔ جب بارش سے دیواروں کا رنگ گہرا ہو جاتا اور آسمان پر بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور بہت سی اباہیلیں سروں پر اڑا کرتیں۔ برسات کا موسم ان کے لیے رونق اور تبدیلی کا پیغام لے کر آتا۔

بارش صبح سے ہو رہی تھی۔ جب کپڑے سی سی کر نعیم کی آنکھیں اور اٹھکیاں درد کرنے لگیں تو اس نے انہیں ایک طرف رکھا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ رک کر خوشی سے آسمان کی طرف دیکھتا اور پھر چلنے لگتا۔ چلتا چلتا وہ سی۔ او نمبر ۱۹ کی کوٹھری کے آگے سے گزرا۔ اس کے دروازے پر تالا لگا تھا اور وہ سلاخوں کے ساتھ ٹیک لگائے خاموش بیٹھا تھا۔ نعیم وہاں سے گزر گیا۔ موسم کی وجہ سے وہ دل میں اپنے آپ کو اس قدر مسرور اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا کہ اوورسیٹر کا خاموش، پتھر بلا چہرہ دیکھ کر اسے کوفت ہوئی اور واپسی پر اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ قیدی نے لحظہ بھر کو سنگین نظروں سے سگریٹ کی طرف دیکھا، پھر ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا۔

”جب تم تئے تئے آئے تھے تو میں نے بھی تمہیں سگریٹ دیے تھے۔ اس کا بدلہ اتارتے ہو؟“ اس نے کہا۔

نعیم نے سنی ان سنی کر کے دونوں سگریٹ جلائے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”تمہیں بہترین موسم میں قید کیا گیا ہے۔“ اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

”موسم؟“ اور سیئر نے بے خیالی سے دھرایا، ”اچھا ہے؟“

”دیکھ نہیں رہے ہو؟“

اس نے باہر دیکھا۔ ”ہاں، اچھا ہے۔ اب ایلیں ہیں؟“

”ہاں“ نعیم نے کہا، ”بہت سی ہیں۔“

اور سیئر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ نعیم کو اس کے استفسار پر دل میں خوشی

ہوئی، کیونکہ اس نے کبھی ان چیزوں، بادلوں، موسموں پرندوں وغیرہ کے متعلق دلچسپی ظاہر نہ

کی تھی۔ دونوں خاموش بیٹھے برآمدے کی چھت سے ٹپ ٹپ گرتی بوندوں کو دیکھتے رہے۔

سگریٹ ختم کر کے نعیم نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہاری داڑھی میں پھر سفید بال آگئے

ہیں۔“ ”اِس؟ داڑھی میں؟ وہ کچھ دیر تک متفکرانہ طور پر داڑھی کو کھینچ کھینچ کر دیکھنے کی

کوشش کرتا رہا، پھر یکایک آنکھیں نکال کر چیخا: ”میری داڑھی میری اپنی ہے۔ تم اس میں

کیوں دخل دیتے ہو؟ تم میری عورت ہو؟“

نعیم چالکی سے ہونٹوں میں ہنسا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں عجیب سا سرور

پیدا ہوا، اپنی آزادی اور دوسرے کی قید کا سرور۔ اس کا جی چلایا کہ اور سیئر کو پتھر کے سخت اور

بے حس شخص کو، جس نے آج تک کبھی کوئی خواہش، کوئی احساس یا کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی

تھی، اذیت دے۔ برسوں کا بغض تھوڑی دیر کے لیے اوپر آ گیا۔ یہ بغض بے وجہ تھا، لیکن

ایک لمبے عرصے تک جیل کے غیر معمولی ماحول میں رہنے کے بعد ایسے جذبات عام لوگوں کے

دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس نے جیب سے دوسرا سگریٹ نکالا اور جب اور سیئر نے لینے

کے لیے ہاتھ بڑھایا تو واپس کھینچ لیا۔

”پہلے وعدہ کرو آئندہ مجھے کالی نہ دوگے۔“

اور سیئر وحشیوں کی طرح ہونٹ چبانے لگا۔ آخر جب سگریٹ پینے کی خواہش اس پر

غالب آگئی تو وہ غصے اور کالیوں کو ضبط کر کے بولا: ”نہیں دوں گا۔“ اور لہکیوں کی طرح سگریٹ

نعیم کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

نعیم نے دونوں سگریٹ سلکانے اور خاموشی سے بارش کو دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ بارش

بالکل تھم گئی اور رہا سہا پانی برآمدے کی چھت پر سے قطرہ قطرہ گرنے لگا۔

”آج میں اس کا بھیجا نکال دوں گا۔“ اور سیئر نے اپنے آپ سے کہا۔

”کس کا؟“

”نمبر ۱۷ کا۔ اس نے مجھ سے افیون طلب کی ہے اور رپورٹ کرنے کی دھمکی دی ہے۔
ناجائز باپ کی ناجائز اولاد۔“

جب دوسرا سگریٹ بھی ختم ہو گیا تو نعیم نے اسے بارش کے پانی میں اچھال دیا اور
دھوئیں کے تھے سے مرغولے کو، جو بجھتے ہوئے سگریٹ سے اٹھا تھا، ہوا میں تحلیل ہوتے ہوئے
دیکھتا رہا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ پھر اس نے پوچھا۔

”نام؟“ اوور سیٹر نے داڑھی میں اٹکیاں گھمائیں، پھر بالوں کو دھرا کیا اور دانتوں میں
لے کر چبانے لگا۔ پھر یکایک غور و فکر کو چھوڑ کر اس نے قہقہہ لگایا: ”مہندر۔“
”کیوں ہنستے ہو؟“

”مادر چود نام بھول گیا تھا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا، ”مہندر۔“

”مہندر۔ سنگھ؟“ نعیم نے کچھ اپنے آپ سے، کچھ اس سے پوچھا۔

”سنگھ کی ماں۔“ وہ بولا، ”خالی مہندر۔“

کچھ دیر کے لیے نعیم کو ایک پرانے، گم شدہ دوست کی تکلیف وہ یاد آئی، لیکن جیل
کی لمبی زندگی، جس نے اس کے جذبات کو کند کر دیا تھا، آڑے آگئی۔

”ہاں تو مہندر“ اس نے کہا، ”تم نے قتل کیا تھا؟“

”سات۔“

”سات؟“ نعیم چونک اٹھا۔

جواب میں اوور سیٹر تلخی سے ہنسا۔

”کیسے؟“ نعیم نے پوچھا۔ وہ منظر جا کر نعیم کو دیکھنے لگا۔ اس کے تیور دیکھ کر نعیم کو
کالی یا کسی سخت جواب کی توقع ہوئی، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے خود بخود کہنا شروع کر دیا:
”ہماری سات مائیں تھیں اور ہم گیارہ بھائی تھے۔ بہت سی زمین تھی جس میں ہم
سبزیاں اور ہر قسم کے اناج بویا کرتے تھے۔ دوسری مائیں سب بد شکل اور پھوڑ تھیں۔ میری
ماں سب سے کم عمر اور شکل والی تھی کیونکہ وہ ایک ایسے شخص کی بیٹی تھی جس کے پاس بہترین
کپاس کا بیج تھا اور اس نے اپنی بیٹیوں کو کھیتوں میں کام کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ
وہ گھر میں ہی چھوٹا موٹا کام کر کے پلٹی تھیں۔ دوسری عورتیں میری ماں سے جلتی تھیں کیونکہ
میرا باپ مہینے میں بیس روز ہمارے پاس سوتا اور دس روز باقی سب کے پاس۔ تیسری ماں،
جو چڑیل سے مشابہ تھی، ہم سے اس لیے بھی جلتی تھی کہ ہر سال کپاس کی فصل کے موقع پر
میری ماں اپنے باپ کے گھر سے سوت لاکر میرے باپ کے لیے کپڑے بنایا کرتی تھی۔ اس کا

بیٹا بڑا بد معاش تھا وہ اسے ہمارے خلاف بھڑکاتی رہتی تھی۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑا اور طاقتور تھا اور مجھ سے جھگڑنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔ کئی دفعہ اس نے ادھر ادھر کے بہانے کر کے مجھے کھیتوں میں پکڑ کر مارا۔ میں اس وقت چپ رہا لیکن دل میں ارادہ کر لیا کہ بڑا ہو کر اس کا بدلہ لوں گا۔ جب میرا باپ مر گیا تو میری ماں نے دوسری عورتوں سے کہا اب ہمارا مرد مر گیا ہے اور فساد کی جڑ ہی نہیں رہی اس لیے اب ہمیں صلح سے رہنا چاہیے۔ چنانچہ وہ مل جل کر رہنے لگیں۔ لیکن میرے دل میں کینہ بیٹھ چکا تھا، جوں جوں بڑا ہوتا گیا اسے پالتا رہا۔ میرا بھائی بھی ساتھ ساتھ بڑا ہو گیا، اور وہ بڑا بد معاش نکلا۔ اس نے گاؤں میں بد معاشوں کا گروہ بنا لیا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے۔ وہ لوگوں کے میل چرا کر بیچ دیتے اور کسانوں کی عورتیں اٹھا کر لے جاتے اور کھڑی فصلیں کاٹ لیتے۔ گاؤں والے ان سے خوف کھاتے تھے۔ ایک روز میں اپنے کھیت میں کھڑا تھا کہ وہ دندناتے ہوئے وہاں سے گزرے۔ میرا بھائی مجھے مخاطب کر کے بولا: ”تمہاری ماں فاحشہ عورت ہے۔ اس نے ہمارے باپ کی عزت مٹی میں ملا دی ہے۔ وہ موچیوں اور کمین لوگوں کے ساتھ سوتی ہے۔“ یہ سن کر مجھے دکھ ہوا۔ میں نے کہا: ”اس وقت میں تمہارا کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارے ساتھ تمہارے ساتھی ہیں اور میں اکیلا ہوں۔ لیکن یاد رکھو، ایک نہ ایک دن میں تمہیں قتل کر دوں گا۔“ وہ میری دھمکی کا ٹھٹھا اڑا کر چلا گیا۔

”اس رات میں نے اپنی ماں سے پوچھا: ”موچیوں کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے

ہیں؟“

اس نے کہا: ”اچھے ہیں۔“ اس پر میں نے اسے بھائی کی بات بتائی اور اسے قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ سن کر میری ماں خوف زدہ ہو گئی اور دروازے کی کنڈی لگا کر باہر چلی گئی۔ جب کافی دیر گزر گئی تو میں نے اٹھ کر اندر سے دروازے کے قبضے اکھاڑے اور باہر نکل آیا۔ میری ماں کی چارپائی خالی تھی۔ اسی وقت میں نے اسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ میرا شک مکمل ہو گیا۔ میں نے اس کا کلا گھونٹ کر وہیں پر اسے ختم کر دیا۔ اسی رات کو میں نے بد معاش بھائی کو بھی قتل کر دیا اور جنگل میں بھاگ گیا۔ وہاں پر مجھے چند ایسے آدمی مل گئے جو میری طرح مفرور تھے اور بھوکوں مر رہے تھے۔ میں نے صلح کر کے گروہ بنا لیا اور ڈکیتیاں شروع کر دیں۔ ایک روز خواہش کے زور کرنے پر میں چھپ چھپا کر اپنی بیوی سے ملنے کے لیے گاؤں گیا تو دیکھا کہ میرے بچے کو اس بد معاش کے بیٹے نے قتل کر دیا ہے۔ میں پاگل ہو گیا۔ ایک پہر کے اندر اندر میں نے اس بد معاش کی بیوی اور چاروں بیٹوں کو ہلاک کر دیا اور واپس آ گیا۔ کافی عرصے تک ہم ڈاکے مار کر اور مسافروں کو لوٹ کر پیٹ پالتے رہے۔ آخر ایک روز شراب پی رہے تھے کہ پکڑے گئے۔ میرے قتلوں کے عینی گواہ موجود نہ تھے چنانچہ مجھ پر ڈکیتوں کے مقدمے چلے اور اڑتالیس سال کی سزا ملی۔ ایک سگریٹ دو۔“

”نہیں ہے۔“ نعیم نے کہا۔ وہ غصے میں بھرا ہوا بیٹھا رہا۔
 اب رفتہ رفتہ دن کا اجالا غائب ہو رہا تھا۔ بارش پھر شروع ہو چکی تھی۔ یکایک نعیم نے محسوس کیا کہ مہندر نے بیٹھے بیٹھے، بھاری بھاری سانس لینے شروع کر دیے ہیں۔
 ”اس کے بعد میں نے اس جگہ کو اپنا گھر بنا لیا۔ اب انہوں نے یہاں پر ہی مجھے قید کر دیا۔ سؤر۔ کتے۔“ یہاں آکر اس کی آواز پھیل کر پھٹ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں میں سلاخوں کو پکڑ کر وحشیوں کی طرح دروازے کو جھنجھوڑا۔ نعیم نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر دفعتاً وہ رونے لگا۔ عذاب کی شدت سے اس کا چہرہ بد نما ہو گیا تھا اور وہ ایک ایسے آدمی کی طرح رو رہا تھا جو رونے سے قطعی نا آشنا ہوتا ہے، جیسے کتنا کھانستا ہو۔
 ”میری بیوی دوسرے مرد کے ساتھ سوتی ہے۔ میں نے برسوں سے۔۔“ اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

اس ادھیڑ عمر کے سخت گیر انسان کو جیل کی تمام تر ناداری، اذیت اور کوفت کے بوجھ سے ٹوٹ کر بچے کی طرح روتے ہوئے دیکھ کر نعیم کے دل میں ایک خوفناک احساس پیدا ہوا۔
 جس طرح ایسا ایک وہ رویا تھا اسی طرح چپ ہو گیا۔ خاموش، بھاری بھاری سانس لیتے ہوئے، ایک دوسرے سے نظریں پچاتے ہوئے وہ دونوں بیٹھے رہے۔ پھر اوور سیئر اپنی کرخت آواز میں بولا:

”تم بھیڑیے کی طرح سخت دل ہو۔“

اس دوسرے شخص کے دکھ اور اپنی رکھائی پر نعیم کو اپنے کینے پن کا احساس ہوا۔ وہ ندامت سے ہنسا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں مانتا ہوں کہ جیل رہنے کے لیے اچھی جگہ نہیں ہے۔“ اس نے سلاخوں پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا، ”فکر نہ کرو۔ میں نے بھی کئی برس سے کچھ نہیں دیکھا۔ مثلاً: بلغ، اور بچے۔ اور ارر۔۔۔۔ انگور۔“

وہ کوشش کر کے دوبارہ ہنسا اور ادھ سے کپڑوں کا گٹھا اٹھا کر اپنی کوشٹری کی طرف چلا گیا۔

(۲۵)

جس روز نعیم رہا ہوا اس کے ساتھیوں نے جیل کے دروازے پر اس کا استقبال کیا اور اسے پھولوں سے لاد دیا۔ جیل کی بے آب و گیاہ دنیا سے نکل کر دفعتاً اتنے بہت سارے خوشبودار رنگ رنگ کے پھول اور پرانے ساتھی پا کر۔ وہ لوگ جن کے چہروں پر محبت اور احسان مندی کے کثیر جذبات تھے۔ نعیم کے سینے کا خلا پر ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں زندگی کی نرمی اور محبت اتر آئی۔ اس تھوڑے سے وقت میں ہی اس نے اپنے آپ کو پھر اسی پرانی دنیا کا مسرور و توانا

انسان محسوس کیا۔ ایک مقصد کے لیے کام کرنے والے لوگوں میں زندگی اور رفاقت کی ایسی بے پناہ قوتیں ہوتی ہیں۔

عذرا کو اطلاع ملنے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ وہ اسے دلی کے سٹیشن پر ملی۔
”روشن محل چلیں گے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”نہیں۔ روشن پور جائیں گے۔ میں نے ٹکٹ لے لیے ہیں۔“ عذرا نے کہا۔
سفر کے دوران نعیم لوگوں کی ہکا بھوکوں سے بے خبر اس کے دونوں کندھوں پر بازو رکھے محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ ان سارے سالوں نے عذرا میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تھی۔ وہ اسی طرح حسین اور شاندار تھی۔ اس کا بدن زندہ مچھلی کی طرح سخت اور چکنا تھا۔ صرف اس کے چہرے پر زردی تھی اور آنکھوں کے گرد کی جلد سنو لائٹ تھی، جس سے ایک طویل، خاموش اذیت کا پتا چلتا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹ اسی طرح بھرے ہوئے اور نم تھے۔ نعیم کے ذہن میں ایک پرانا، مضحک خیال ابھرا، کہ اگر ان ہونٹوں کو انگلیوں میں پکڑ کر آہستہ سے دبایا جائے تو یہ پھٹ جائیں گے اور ان میں سے رس بہنے لگے لگا۔ اس نے چپکے سے مسکرا کر عذرا کو اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کا دل ایک طاقتور احساس سے بھر گیا، قوی انسانی رشتوں کا احساس، جس سے وہ ایک لمبی مدت تک نا آشنا رہا تھا۔

شام گہری ہو چلی تھی جب وہ روشن پور پہنچے۔ لکڑی کے پھانک پر لٹکتی ہوئی تختی کو نعیم نے آہستہ سے چھوا، پھر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اندھیرے میں اس نے بہتے ہوئے پانی کے ہلکے شور کو سنا اور رات کے پھولوں کی خوشبو کو چاروں طرف پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ دونوں رکھوالے کتے عذرا کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر چونکے اور کان کھڑے کر کے ہوشیاری سے دم ہلانے لگے۔ ستاؤں درختوں کے نیچے نیچے تاریک، سرد راستوں پر سے گزرتے ہوئے نعیم نے جسم پر خوشگوار تھکن اور بھوک محسوس کی۔ درختوں پر دن کے پرندے سونے سے پہلے شور مچا رہے تھے اور رات کے خاموش پرندے پھر پھڑا کر اڑ رہے تھے۔

نعمت خانے میں داخل ہو کر نعیم نے کہا:

”ہم یہاں بیٹھ کر کھائیں گے۔“ اور فرش پر بیٹھ گیا۔

”اچھا۔“ عذرا نے خوشی سے جواب دیا۔ وہاں بیٹھ کر انہوں نے جنگلی پرندوں کا بھنا ہوا گوشت کھایا جو گرم اور قوت بخش تھا۔ اس کے بعد انہوں نے قہوہ پیسا جو روشن محل کی خوشبودار چائے کی پتیوں کا تھا۔ قہوے کے دوران عذرا کی نظر نعیم کے بازو پر پڑی اور وہ چونک اٹھی۔ پھر بغیر کچھ کہے اس نے رنجیدگی سے لکڑی کی ٹوٹی ہوئی انگلی کو چھوا۔ نعیم کی زبان پر غلیظ سی کالی آئی جسے وہ بمشکل روک سکا۔ ”انہوں نے توڑ دی ہے۔“ اس نے جلدی سے بات ختم کر دی۔ مسرت کے اس وقت میں جب کہ خوش ذائقہ کھانے سے اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا اور

جسم میں ایک خوشگوار تھکن گد گدا رہی تھی وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جو اسے ناخوش کر دے۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے دودھ مانگا۔

”پرندوں کے گوشت کے ساتھ دودھ نہیں پیا کرتے۔ بھول گئے ہو؟ عذرا نے کہا۔
نعیم کو یاد آیا کہ یہ اس کے باپ کی نصیحتوں میں ایک تھی، چنانچہ وہ کندھے اچکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

تاریک کمرے میں لیٹ کر اس نے اپنی بیوی کے بھرے ہوئے ہونٹوں کو شوق اور جذبے سے چوما، اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا، اپنے باسی اور ضائع ہوتے ہوئے جسم کو اس کے صحت مند اور گدرائے ہوئے بدن کے ساتھ رگڑا اور دیر تک اس کی ہلکی ہلکی خوشبو اور حرارت کو جذب کرتا رہا۔ پھر بازو اس کے گرد لپیٹ کر کس کے اپنے ساتھ چمٹا لیا، یہاں تک کہ اسے خدشہ ہونے لگا کہیں عذرا کا سانس نہ رک جائے۔ مگر عذرا بھی اسے بھینچے ہوئے تھی۔ اسے اپنی بیوی کی زندگی اور خواہش کا احساس ہوا۔ اس نے اس کی گردن میں نرمی سے دانت گاڑ دیے اور ایک مختصر سے لمحے کے لیے خود کو اس کے وجود کا ایک حصہ تصور کیا۔ اگلے لمحے دفعتاً اس کے دل میں دہشت پیدا ہوئی اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔

آہستہ آہستہ وہ اس سے الگ ہو گیا۔ کچھ دیر تک دونوں مردوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے رہے۔ پھر عذرا نے آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ نعیم سیدھا لیٹا لیٹا ہونٹ کاٹتا رہا حتیٰ کہ رستے ہوئے خون کا ٹمکین ڈانٹھ اس نے اپنی زبان پر محسوس کیا۔
”جیل۔ کی وجہ سے ہے۔“ اس نے خفگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔“ عذرا نے نرمی سے کہا اور اسے چھوٹے سے بچے کی طرح ماتھے پر چوما۔ ”تم کس قدر کمزور دکھائی دے رہے ہو۔“
”جیل کے مضر کھانے کی وجہ سے ہے۔“ نعیم کی آواز میں ابھی تک خفگی اور خفت کا اثر تھا۔ اس نے ہوا میں بڑی سی کالی دی۔ ”میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کل شکار کے لیے جاؤں گا۔ گھوڑے کی سواری مرد کے لیے مفید ہوتی ہے۔“
”میں بھی جاؤں گی۔“

”تم ہر جگہ میرے ساتھ نہیں جا سکتیں۔“ نعیم نے کہا۔
”نعیم۔ آؤ باتیں کریں۔“ عذرا نے آہستگی کے ساتھ اس کا سر لحاف سے نکالا۔

اس کے باوجود وہ دیر تک خاموش لیٹے رہے۔ پھر نعیم نے پوچھا:
”کراس کی زمین چلی گئی؟“

”ہاں، ضبط ہو گئی۔“

”اب میں غریب آدمی ہوں۔“ نعیم نے کہا۔

”ہاں۔ ہم اب غریب لوگ ہیں۔“ عذرا نے دھرایا، ”لیکن ہمارے پاس ساری زمینیں ہیں۔“

”وہ ہماری نہیں ہیں“

”علی تمہاری اور روشن آغا کی زمینیں خراب کر رہا ہے۔“

نعیم چونکا۔ ”کیوں؟“

”پتا نہیں۔ لوگ کہتے ہیں اپنی ماں کے کہنے پر کرتا ہے۔ ہماری فصل کا اس نے بہت

نقصان کیا۔“

”ہوں۔“ وہ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر پوچھنے لگا: ”روشن آغا کیسے ہیں؟“

عذرا خاموش رہی۔

”مجھ سے خفا ہیں؟“

”پتا نہیں۔“

”تم سے؟“

عذرا نے اس کی چھاتی میں منہ چھپا لیا۔ ”مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ رو کر

بولی۔

نعیم اس کی گردن اور پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ”میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کل صبح کھیتوں کو جاؤں گا۔ ان چیزوں سے میں ایک مدت تک محروم رہا ہوں۔ اور کوئی وجہ نہیں۔“

اس کی آواز میں خفت یا خفگی نہ تھی، سچائی اور درد مندی تھی۔

چند روز کاؤں میں رہنے اور شکار کیے ہوئے تیترا اور خرگوش کا گوشت کھانے کے بعد نعیم بالکل تندرست ہو گیا۔ اس کی سوئی قوتیں کھلی زمین اور کھلی ہوا کے لمس سے سیدر ہو گئیں اور میاں بیوی محبت اور کام کی پوری توانائی اور مصروفیت کے ساتھ رہنے لگے۔

کئی دن کی کڑی نگرانی کے بعد نعیم کو پتا چل گیا کہ علی، غالباً اپنی ماں کے ایما پر اس کی زمینداری اور فصلوں کے ساتھ شرارت کر رہا تھا اور کاؤں کے آوارہ لوگوں کے ساتھ مل کر بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اسی دم اسے شہر بھیج دینے کا فیصلہ کیا۔

ایک روز صبح سویرے وہ اسے اپنے باپ کے گھر میں مل گیا، جہاں نعیم دونوں عورتوں سے ملنے کے لیے گیا تھا۔

”میرے ساتھ چلو۔“ اس نے علی سے کہا۔

”کہاں؟“ علی نے نوجوان، بے خوف نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”باہر“

گھر سے نکل کر وہ کھیتوں کے بیچوں بیچ چلنے لگے۔ ڈیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر مڑتے ہوئے کبھی ایک آگے نکل جاتا کبھی دوسرا۔ دھوپ کھیتوں میں پھیل چکی تھی۔ ہل جوتے ہوئے کسانوں نے دونوں بھائیوں کو ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تعجب سے دیکھا اور ان پر اللہ کی رحمتیں بھیج کر حال پوچھا۔ جب سے علی نے ہوش سنبھالا تھا وہ پہلی بار دونوں بھائیوں کو ایک ساتھ دیکھ رہے تھے، اور وہ علی کی کدورت سے بھی واقف تھے۔ جب وہ باہر والی حویلی کی دیوار کے پاس سے گزر رہے تھے تو نعیم نے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا:

”تم یہاں کیوں نہیں آتے؟“

”مجھے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ اکھڑ پن سے بولا۔

نعیم نے کڑی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ سولہ سال کا تھا لیکن پیچھے سے چلتا ہوا پورا جوان دکھائی پڑتا تھا۔ اس کا قد نعیم سے چھوٹا تھا مگر ہاتھ پاؤں اپنے باپ کی طرح بڑے بڑے اور مضبوط تھے۔ اس کا رنگ سیاہی مائل سرخ تھا اور گردن کی جلد میل کی طرح مضبوط تھی۔ اس کا رنگ سیاہی مائل سرخ تھا اور گردن کی جلد میل کی طرح موٹی اور سخت تھی۔ اس کی چال میں لا پرواہی اور پھرتی تھی۔ نعیم نے محسوس کیا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے ساتھ سختی سے کام لینا پڑتا ہے۔ قدرتی طور پر اس نے اپنی طاقت کا جائزہ لیا۔ اسے اپنے اوپر اعتماد تھا۔

لیکن اپنے بھائی کے ساتھ معاملہ چکاتے ہوئے وہ دل میں ہچکچا رہا تھا۔

”تم ہل میں جتتے رہے ہو؟“ اس نے تمسخر سے پوچھا۔

”تم مذاق کرنے کے لیے مجھے یہاں لائے ہو؟“

نعیم ہنسا۔ ”یونہی مجھے خیال آیا، تمہاری گردن میل کی طرح ہے۔“

علی کا ہاتھ آپ سے آپ گردن کی طرف اٹھ گیا، اس کی جلد جھرجھرائی لیکن وہ خاموش چلتا رہا۔ جب وہ حویلی سے کافی دور نکل آئے تو نعیم نے پوچھا:

”تم کام کیوں نہیں کرتے؟“

”کرتا ہوں۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا۔

”تمہارے دوست گاؤں کے ناکارہ ترین لوگ ہیں۔“

”تمہیں کیا؟“

”ان کے پاس زمین کا ایک مرلہ اور میلوں کی جوڑی تک نہیں اور ان کی جوانی ڈھل رہی ہے۔“

”انہیں کوئی پسند نہیں کرتا۔“

”تمہیں کیا؟“ علی نے دہرایا۔

نعیم کو سخت طیش آیا۔ وہ تیز غصیلی آواز میں بولا: ”جاہل کسان۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔“

نہرو - میری بات کا جواب دو -

علی بے خوفی سے پلٹ کر کھڑا ہو گیا - نعیم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا -

”تم نے میرے بعد فصلوں کو کیوں تباہ کیا؟ اور اب بھی تم ڈنڈے بجاتے پھرتے ہو اور میرے

کاموں میں روڑے اٹکاتے ہو، کیوں؟ تمہارے سر میں میل کی عقل ہے؟“

”تم توجج کو گئے تھا نا -“ علی نے بے خوف، طنزیہ لہجے میں کہا لیکن بات ختم کرتے کرتے

اس کی زبان لڑکھڑا گئی کیونکہ اس کا بڑا بھائی، جسے وہ شروع سے بڑا دیکھتا آیا تھا، دانت پیس کر

اُس کی طرف بڑھ رہا تھا -

”سور، میں تجھے شہر چھوڑ کر آؤں گا -“ نعیم نے کہا اور مضبوطی سے اس کے بازو پر ہاتھ

رکھا - اگلے لمحے ایک زور دار جھٹکے کے ساتھ علی ہاتھ چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا -

شکاری کتوں کی طرح جھاڑیوں اور پانی کی نالیوں پر سے زقندیس بھرتے وہ دیر تک ایک دوسرے

کے پیچھے بھاگتے رہے - دور دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں نے رک کر، آنکھوں پر

سایہ کر کے انہیں دیکھا اور ہنسے :

”چھوٹا لونڈا بڑے کو ورزش کرا رہا ہے -“ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا -

علی خرگوش کی طرح آسانی اور پھرتی سے بھاگ رہا تھا - وہ جھاڑیوں میں اور ہل جتی ہوئی زمین

میں بھاگنے کا عادی تھا - لیکن نعیم اپنی عمر کی وجہ سے سست رفتاری اور بے ڈھنگے پن سے

کوستا ہوا بھاگ رہا تھا - کبھی کبھی وہ تھک کر رک جاتا تو علی بھی ٹھہر جاتا اور آنکھوں کے کونوں

میں سے اسے دیکھتا رہتا - سانس لے کر وہ وہ پھر بھاگنے لگتے - نعیم گھوڑے کی طرح ہانپ رہا

تھا اور جانتا تھا کہ اس طرح وہ اس کم عمر لڑکے کو نہیں پکڑ سکتا، مگر وہ اس کا پیچھا شروع کر

چکا تھا اور اب رکنے کے خیال سے خفت محسوس کر رہا تھا - آس پاس دور دور تک کوئی بشر نہ

تھا اور بھاگتے ہوئے بھائیوں کے پاس سے کٹی خرگوش اور گیدڑ جھاڑیوں میں نکل نکل کر ادھر

ادھر دوڑ رہے تھے - ایک خرگوش نعیم کی ٹانگوں سے ٹکرایا اور دور تک قلبا زیاں کھاتا ہوا چلا گیا -

”خرگوش کو پکڑ کر لے جاؤ - اس کا گوشت دوڑنے کے لیے مفید ہوتا ہے -“ علی نے کہا -

وہ بھاگتے رہے -

آخر بہت تھک کر نعیم ایک پتھر پر ٹانگ رکھ کر ہانپنے لگا - علی بھی رک گیا، اور کچھ دیر کے

بعد زمین پر بیٹھ گیا - اسے بیٹھتے دیکھ کر نعیم بھی بیٹھنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ پتھر کے نیچے

سے ایک خرگوش نکل بھاگا - وہ اچھل پڑا -

”اب تم نے خرگوش پیدا کرنے شروع کر دیے ہیں -“ علی نے پکار کر کہا -

نعیم خفت سے ہنستا ہوا بیٹھ گیا - ”چپ رہ جاہل باتونی - آج تو نے مجھے بڑا خوار کیا -“ پھر

وہ بظاہر اپنے آپ سے لیکن بلند آواز میں بولا، ”شکر ہے میں نے جنگ میں ٹانگ تو نہیں

کھوٹی ، ورنہ یہ لونڈا کبھی ہاتھ نہ آتا ۔
 ”گھر والوں کے دانت نہیں گنا کرتے ۔“ علی نے کہا، ”میں جانتا ہوں تم مجھے کبھی نہیں پکڑ سکتے ۔“

دونوں اپنا اپنا سانس ملاتے رہے ۔ جنوب کی طرف سے بادل اٹھ رہا تھا ۔
 ”بارش آئے گی ۔“ نعیم نے تشویشناک لہجے میں کہا ۔
 ”بارش ابھی اچھی نہیں ہے ۔ گیہوں کے لیے ۔“ علی نے کہا ۔
 جب دونوں کے سانس مل گئے تو بغیر کچھ کہے اٹھ کر پھر بھاگنے لگے ۔ اب علی نے گاؤں کا رخ کر لیا تھا ۔ نعیم کو ایک تدبیر سوچنی تھی ۔ جب وہ اس کی حویلی کی دیوار کے پاس سے گزر رہے تھے تو اس نے اپنی مخصوص سیٹی بجائی ۔ رکھو لے کتے گھر کی چار دیواری پھاند کر علی پر ٹوٹ پڑے ۔ وہ لاتوں کے زور دار جھٹکوں کی مدد سے ان سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنے لگا لیکن کتے پلے ہوئے اور خونخوار تھے اور اسی مقصد کے لیے رکھے گئے تھے ۔ اتنے میں نعیم اس کے اوپر پہنچ گیا ۔ اس نے اسے گردن سے پکڑ کر کتوں کے پنجے سے چھڑایا ۔ علی گردن چھڑانے کی لگاتار کوشش کر رہا تھا ۔ نعیم نے دانت پیس کر اس کی رگوں کو انگلیوں میں دبایا ۔ درد کی شدت سے وہ بلبلا اٹھا ۔

”ایک ہاتھ سے تمہیں اور تمہارے تین دوستوں کو سنبھال سکتا ہوں ۔“ نعیم نے کہا ۔
 اسے گردن سے پکڑے پکڑے وہ گھوڑی کے پاس لے کر آیا، اچھل کر اس پر سوار ہوا،
 کالر سے پکڑ کر علی کو اٹھایا اور اپنے پیچھے بٹھا لیا، پھر گھوڑے کی رسی اتار کر اپنی اور علی کی کمر کے گرد پھینکی اور کس کر باندھ دی ۔ گھوڑا بھاگنے لگا ۔

”میں اب بھی بھاگ سکتا ہوں ۔“ اس نے ضدیوں کی طرح کہا ۔ وہ برابر رسی تڑا کر بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا ۔

نعیم نے باگیں کھینچ لیں ۔ جب گھوڑا رکا تو وہ کندھے کے اوپر سے پیچھے دیکھ کر درشت لہجے میں بولا : ”کیا مرضی ہے ؟ لڑائی کی ؟“

”نہیں ۔“

”پھر چپکے بیٹھے رہو ۔“

”پھر عائشہ سے میرا بیباہ کر دو ۔“ علی نے بے خوفی سے کہا ۔

نعیم چونکا، گردن موڑ کر کنکھیوں سے پیچھے دیکھا، لمبا سا معنی خیز ’ہوں‘ کیا، پھر سلمنے دیکھ کر لمبا سا سانس چھوڑا اور ہونٹوں میں مسکرایا ۔

پوری رفتار سے گھوڑا بھگاتے ہوئے وہ مصنوعی سختی سے بولا: ”تو اسی لیے تم نے اسکا ادھم مچا رکھا تھا ؟“

علی خاموش رہا۔

”میں سمجھا تمہاری ماں تمہیں سبق دے رہی ہے۔“

”میں عورتوں کی باتوں پر نہیں چلتا۔“ علی نے کہا۔

نہر کے پل پر چند کسانوں نے دونوں بھائیوں کو اس ہیئت کڈائی میں دیکھ اور مسکرا کر ان کا حال پوچھا،۔ پل پر سے اتر کر نعیم نے کہا:

”لیکن راول؟“

”میں اسے قتل کر دوں گا۔“ علی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”بکو مت۔ میں انتظام کر دوں گا۔“

تھوڑی دور جا کر علی کسمسانے لگا: ”رسی ڈھیلی کرو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

نعیم نے گھوڑا روک کر رسی کھولی اور اس کے گلے میں لپیٹ دی۔ علی چلتے گھوڑے پر سے چھلانگ لگا کر اترا اور رکاب پر ہاتھ رکھ کر چلنے لگا۔

”راول مجھ سے بڑا ہے لیکن مجھ سے تیز نہیں دوڑ سکتا۔ میں نے پچھلی فصل پر اسے کٹائی میں بھی مات دی تھی۔۔۔ اور وہ ایک خرگوش بھی نہیں پکڑ سکتا۔“ وہ باتیں کرتا ہوا ساتھ ساتھ دوڑتا رہا۔

جب وہ شہر پہنچے تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ وہ سیدھے کپڑے کی مل پر گئے جس کی تعمیر کا کام زوروں پر تھا۔ کچی دیواروں اور پھونس کی چھت والے عارضی دفتر میں بیٹھا ہوا بھرتی کا کلرک ادھیڑ عمر اور خاکستری رنگ کا شخص تھا جس کی عینک کے فریم کی ایک طرف سے دھاگوں کی مدد سے مرمت کی گئی تھی۔ نعیم نے علی کو پیش کیا۔

”نوکری کے لیے ہے؟“ کلرک نے عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے تیز، باریک آواز میں

پوچھا۔

”ہاں۔“

”کیا عمر ہے لونڈے کی؟“

”سولہ سال۔“

”عمر کم ہے۔“ کلرک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”میں سب کام کر سکتا ہوں۔“ علی نے سادگی سے کہا۔ کلرک چشمہ اتار کر اس کی طرف

متوجہ ہوا۔

”فیکٹری ایکٹ کے تحت۔“ اس نے بات شروع کی۔ نعیم، جو ضبط کیے کھڑا تھا، آگے

بڑھا اور چیخ کر بولا:

”جب میں سولہ سال کا تھا تو انہوں نے میرے ہاتھ میں سنگین دی تھی اور پکڑ کر جنگ

پر لے گئے تھے۔“

کلرک نے اس غیر متوقع طرز عمل سے چکرا کر کمر سیدھی کی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

علی کو مل میں بھرتی کروا کے نعیم اسی روز گاؤں لوٹ آیا۔

(۲۶)

اس سال کے آخری دن دلی کے ایک اجتماع میں مسلمانوں کی دو جماعتوں کو متحد کر دیا گیا اور اس طرح ایک واحد جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جس نے رفتہ رفتہ ایک زبردست متوازی اور مخالف سیاسی قوت کی حیثیت اختیار کر لی اور آگے چل کر واقعات کی تشکیل میں اہم حصہ لیا۔ اس موقع پر صدارت کرنے کے لیے فرانس سے آغا خاں III تشریف لائے جن کی وجہ سے ملک کے طول و عرض میں اس کانفرنس کا چرچا ہو گیا اور وہ مسلمان بھی، جو کہ مخالف سیاسی نظریات رکھتے تھے، اس میں شریک ہونے کے لیے آنے لگے۔

اس سے پہلی رات نعیم اور عذرا روشن آغا کوشب بخیر کہنے کے بعد اپنے کمروں کو لوٹے۔ عذرا صحت مند اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ نعیم صحت مند اور دل کش دکھائی دینے کے باوجود کھویا کھویا سا تھا اور اس کی آنکھوں میں وہ پُر قناعت ٹھہراؤ نہ تھا جو اس کی بیوی کی نظروں میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا تھا۔ برسوں کی پُر آشوب زندگی نے اس کے دل میں آرام دہ اور پر آسائش رہائش کے لیے تنفر اور میزاری پیدا کر دی تھی اور وہ اسی بے نام خلش کا شکار تھا جو اس وقت ملک کے کروڑوں دلوں میں پیدا ہو چکی تھی۔ وہ روزانہ کی طرح سونے کے لیے بستر پر لیٹے، یہ جانے بغیر کہ وہ رات ان کے لیے بلا خیز تھی۔

آہستہ آہستہ روشن محل کی تمام خواب کابھوں کی روشنیاں گل ہو گئیں سوائے دوسری منزل کی ایک خواب گاہ کے، جس کے سبز شیشوں والے دریچے تھے اور ان میں سے پھوٹتی ہوئی مدہم روشنی میں یو کلپٹس کی چوٹیاں ہل رہی تھیں۔ جاڑوں کی غیر آباد رات چاروں طرف پھیل چکی تھی اور شیشوں کے دوسری طرف وہ دونوں ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے نیند سے پہلے کی باتیں کر رہے تھے۔ روٹی کے نرم گدوں میں کسمساتے ہوئے، دن بھر کی چھوٹی چھوٹی، غیر دلچسپ، خواب اور باتیں۔

باتیں کرتے کرتے عذرا کسی خیال سے چونک پڑی۔

”کل آغا خان کی کانفرنس ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہوں۔“ نعیم نے غنودگی کی حالت میں سر ہلایا۔ عذرا نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا

منہ اپنی طرف کیا ۔

”روشن آغا بھی جارہے ہیں پر میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ آغا خان کو بہت سال ہوئے میں نے بھٹی میں دیکھا تھا۔ اس قدر شاندار شخصیت ہے ان کی، اللہ ۔ تم نے دیکھے ہیں؟“

”میں بھٹی نہیں گیا تھا۔“ نعیم جل کر بولا۔ عذرا کو پہلے ہی نیند آ رہی تھی، اس بات سے بالکل ہی دبا گئی۔ اسے خاموش ہوتے ہوئے دیکھ کر نعیم کو اپنے طرز عمل پر ندامت محسوس ہوئی۔

”تم روشن آغا کے ساتھ چلی جانا۔“ اس نے کہا۔

”کیوں؟“

”پرنس آف ویلز سے مل کر ہمیں کوئی خاص خوشی نہ ہوئی تھی۔“ وہ تمسخر سے ہنسا۔

”اوہ۔ وہ تو ہم ایسی غلط جگہ پر تھے۔“

نعیم نے کروٹ بدلی اور بازو اس کے جسم کے گرد لے جا کر اسے چوما۔ ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم خفا ہو گئیں؟“ اس نے دوبارہ اس کی گردن کا ایک طویل، بے مزہ بوسہ لیا۔

”آؤ اب سو جائیں۔“ اس نے کہا، لیکن عذرا اپنے محبوب ہونٹوں کے لمس سے پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔

”لیکن آغا خان، اوہ“ اس نے ہتھیلی نعیم کے کال پر رگڑتے ہوئے کہا، ”وہ ایسی پر اسرار شخصیت کے مالک ہیں۔ نہیں؟“

”ہوں۔“ نعیم اب اپنی بیوی کے طرز عمل سے پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔

”مگر تم۔ تو مخالف پارٹی سے ہو۔“ عذرا نے پوچھا۔

”مسلم لیگ، کانگریس کے خلاف نہیں ہے۔ اور پھر وہ مسلمانوں کی جماعت ہے۔ میں

دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ کیا کہتے ہیں۔“

”اچھا۔“ عذرا نے یکساں آواز میں کہا۔ اس کے ذہن میں آنے والے دن کی باتیں

اکٹھی ہو رہی تھیں۔

”کل نئے سال کی رات ہے۔ نعیم۔۔۔ دو سال ہوئے ارشد اس رات کو ہمارے ساتھ

تھا۔ اگلے روز اس کا حادثہ ہو گیا۔“ نعیم خاموشی سے کسمسایا۔

”کل وجید کی پارٹی پر جائیں گے۔ ایس نعیم؟ کل نئے سال کی رات ہے۔“

”ہوں۔“

”وجید کی بیوی بڑا عمدہ رقص کرتی ہے۔ گریگن کنبہ بھی وہاں آئے گا۔ وہ سب رقص

کے شیدائی ہیں۔ کونونٹ میں ہم سب نے رقص سیکھا تھا۔ لیکن ہم نہیں ناچیں گے۔ بیٹھ

کر تاشا دیکھیں گے۔ اچھا؟“

”ہوں اوں۔“

”تم فوجی تقریبی لباس پہن سکتے ہو؟“

”پتا نہیں۔؟“

”گر اس تو چلا گیا۔“ کچھ دیر تک وہ بے حس و حرکت لیٹی رہی، پھر اس نے ہاتھ پھیلا کر نعیم کے سینے پر رکھا اور آزدگی سے بولی، ”گتنا اچھا ہوتا اگر تم جیل نہ جاتے۔ نعیم۔“

نعیم کی آنکھیں آپ سے آپ وا ہو گئیں اور وہ بے خیالی سے چھت کو گھورنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا اور نیند اس کی آنکھوں سے ہوا کی طرح غائب ہو گئی۔ اس کے سینے میں ایک بھاری، درد آلود شے کلبلائی۔ اس نے آہستگی سے، اسے چھوئے بغیر، اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اذیت اور تبدیلی کے اس لمحے میں اس کے دل میں ساتھ لیٹی ہوئی عورت کے لیے شدید تنفر پیدا ہوا۔ اس کا جسم ایک دھیمے، مسلسل ارتعاش کی حالت میں تھا۔ میکانکی طور پر اس نے گردن موڑی اور بے شرمی سے ابھری ہوئی چھاتیوں اور موٹے شہوانی ہونٹوں کو دیکھا۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اس نفسانی عورت میں، اس نفسانی چہرے پر حسن کی رفق تک نہ تھی، اس کے ہونٹوں کے پھیلے ہوئے کناروں اور ابھرے ہوئے گالوں سے صرف شہوت اور بازاری پن عیاں تھا۔ وہ بستر سے اٹھا اور آتشدان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اس نے کہنیاں آتشدان پر ٹیک دیں اور سر کو ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

عذرا بستر پر ششدر بیٹھی رہی۔

”ہندوستان میں بہت لوگوں کے پاس بہادری کے تمغے ہیں۔ تم ان کے پاس جا سکتی ہو۔“ وہ اسی طرح کھڑے کھڑے بولا۔

عذرا نے عجیب سی، پرسکوت آواز میں صرف استا کہا: ”نعیم، پاگل ہو گئے ہو!“

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ نعیم کی ایک ٹانگ تیزی سے کپکپا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے جذبات کے ابال پر قابو پایا۔ اب اس کے دل میں ایک سرد اور قطعی جذبہ تھا۔ ہتھیلی پر سر رکھے رکھے اس نے مڑ کر اس عورت کو دیکھا۔

”تمہاری وجہ سے میدانِ جنگ میں میں نے ایک ساتھی کو قتل کیا تھا۔ تمہیں پتا ہے؟“

عذرا اچھے سے اسے دیکھتی رہی۔

”وہ میرا دوست تھا۔ اپنی عورت کا تذکرہ کرتا رہتا تھا۔ میں نے اسے ختم کر دیا۔“

”میں قصور وار تھی؟“ عذرا نے آزدگی سے پوچھا۔

نعیم نے سپاٹ، غیر جذباتی لہجے میں اپنی بات جاری رکھی، ”میں نے غلطی کی۔ تم قابل

نفرت ہو۔“

عذرا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور وہ کل کی طرح بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ غصے اور رنج کے آنسو اس کی آنکھوں میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ تیز تیز سانس لیتے ہوئے وہ رک رک کر بولی:

”تم۔ تم۔ تم سے شادی کر کے مجھے کیا حاصل ہوا؟ تم۔ ایک بچہ تک نہیں۔ یہ سارے

سال۔ قابلِ نفرت۔“

”چپ رہو۔ نعیم نے وحشیوں کی طرح دھات کا گلدان اٹھا کر اس پر پھینکا۔ عذرا فطری طور پر اس سے بچنے کے لیے ایک طرف کو جھکی، دھات کا بھاری وزن فرش سے ٹکرایا اور کمرے کی خاموش فضا میں شور پیدا کرتا ہوا دور چلا گیا۔

”بھل جاؤ۔“ وہ آگے بڑھ کر دھاڑا۔

عذرا کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ برسوں تک اکٹھا رہنے کے بعد وہ دفعتاً ایک دوسرے کے مقابل آن کھڑے ہوئے تھے۔ ہنوز اجنبی اور متنفر! انتہائی ذلت کے احساس سے اس نے چیخنا چاہا، لیکن وہ صرف اتنا کہہ سکی: ”تم۔ تم۔“ پھر اس نے رونا چاہا لیکن صدمے کی شدت سے رو بھی نہ سکی۔ ایک لمحے میں جذبے کی یہ ساری وارداتیں اس پر سے گزر گئیں۔ آخر اس کی آنکھیں آگ برسانے لگیں۔ تیز، مکروہ آواز میں اس نے کہا:

”میرے باپ کا گھر ہے۔ میرے باپ کی زمینیں ہیں جو تم کھاتے ہو۔ تم۔“

نعیم کی آنکھوں میں موت دیکھ کر وہ تیزی سے مڑی اور ڈرے ہوئے بچے کی طرح بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد نعیم نے اس کے اور اپنے وجود کے لیے عجیب سی نفرت اور حقارت محسوس کی، اس قسم کی نفرت جو زنا بالجبر کے بعد انسان کو ہوتی ہے۔ دیر تک وہ تعجب کرتا رہا کہ کس طرح اتنے عرصے تک وہ اس عورت سے محبت کرتا رہا تھا۔

جب تک جذبات اعتدال پر آئے وہ اپنے آپ کو بے حد کمزور محسوس کرنے لگا تھا، پھر بھی وہ کہیں رات کے پچھلے پہر کو جا کر سو سکا اور اُجالا ہونے پر جاگ گیا۔

بند دریچے کے شیشے پر اٹھکیاں پھیلائے وہ بے خیالی سے کھڑا رہا۔ کئی مرتبہ اس نے رات کے واقعے کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن محض اپنی اٹھکیوں کو اور چھن کر آتی ہوئی دھوپ کو اور شیشے پر پڑتے ہوئے یو کلپٹس کے پتوں کے سائے اور دریچے کے پتھر کو دیکھتا اور محسوس کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک بے معنی خلا اور تعطل تھا۔ وہ آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے کھڑا گونگی، بے تاثر نظروں سے اس نئی صبح کو دیکھتا رہا جو ہر روز کی طرح دنیا پر طلوع ہوئی تھی۔

دروازہ ، جو رات بھر کھلا رہا تھا، ہلا اور خالہ بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے بوڑھے خوبصورت چہرے پر بے خوابی اور رنج کے آثار تھے۔ کمرے کے وسط میں رک کر وہ نعیم کی ساکت، بے جان شبیہ کو دیکھتی رہی، پھر میز پر پڑی ہوئی راکھ دانی کے کناروں پر اٹھکی پھیرنے لگی۔ نعیم مڑا اور نا آشنا نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔ وہ ہلکے پھلکے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ایک دوسرے انسان کو سامنے پا کر رفتہ رفتہ نعیم کے حواس بجا ہو گئے۔ بجلی کی سی تیزی سے سارا واقعہ، جو گزشتہ شب اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان گزرا تھا، اس کے ذہن میں کوند گیا اور وہ پشیمانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

کمرے کو پار کرتے ہوئے دھات کا کلدان نعیم کے پیر سے ٹکرایا اور ناخوشگوار، مانوس آواز پیدا کرتا ہوا ایک طرف کو لڑھک گیا۔ وہ آگے آگے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”مجھے ساری بات کا علم ہے۔“ خالہ نے کلدان قریب کھینچ کر باسی پھولوں پر اٹھکیاں پھیرتے ہوئے کہنا شروع کیا، ”عذرا رات بھر میرے پاس بیٹھی روتی رہی۔“

”وہ اپنے باپ کے پاس نہیں گئی۔“ نعیم نے تلخی سے کہا۔

”آآآ۔۔۔ یہ معمولی باتیں ہیں۔ معمولی۔ میاں بیوی کے لیے یہ معمولی باتیں ہیں۔“

نعیم نے سگریٹ سلکایا اور کندھے پر دھواں چھوڑا۔ ”ٹھیک ہے۔“ اس نے یکساں آواز میں، جس میں خفیف سی پشیمانی تھی، کہا۔

”روشن آغا کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے تم جانتے ہو۔ مجھے ان بچوں سے گہرا تعلق ہے۔ اور۔ اور مجھے یہیں رہنا ہے۔“

نعیم نے سر اٹھایا۔ وہ رنجیدہ، متجسس نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ نعیم اس کے سر کے اوپر سے شیشوں پر دیکھنے لگا جہاں صبح کی ہوا میں ہلتے ہوئے پتوں کا سایہ لرز رہا تھا۔ کلدان لڑھکتا ہوا جا کر دیوار کے ساتھ لگ گیا تھا۔ اور اس کے پھول جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ بستر پر شکنیں تھیں۔ بند کمرے میں سگریٹ کا دھواں بہت دھیرے دھیرے تحلیل ہو رہا تھا۔ اس نے آخری کش لے کر سگریٹ راکھ دانی میں مسلا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

بوڑھی عورت کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جب نعیم نے دوسرا سگریٹ سلکایا تو وہ کہنیاں میز پر رکھ کر ہلکی پھلکی مسرور آواز میں باتیں کرنے لگی۔

”کاش تم اس کو ٹھیک طرح سے سمجھ سکو۔ اررر۔ تم اس کی طبیعت سے واقف نہیں ہو سکتے نعیم۔ تم ہمیں میں سے ہو۔ تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ تم اس کے شوہر ہو۔ اسے اپنی ماں کی طرف سے خود سری اور قوت ملی ہے، لیکن اس نے روشن آغا کی تربیت، ضبط اور شفقت بھی پائی ہے۔ اسے تم سے بڑی محبت ہے۔ انسانوں کے ساتھ اتنی عمر تک میل

جول رکھنے کے بعد ان کی فطرت کے متعلق میں بہت کچھ جان گئی ہوں۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ تم آج اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ، جہاں بھی تم جا رہے ہو، مجھے پتا نہیں، لیکن۔۔۔ ٹھیک ہے نا؟“

”ٹھیک ہے۔“ نعیم نے کندھے جھٹکا کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا

جب وہ برآمدے میں اترا تو اسی وقت عذرا دوسرے سرے سے ظاہر ہوئی۔ وہ برآمدے میں اس طرح داخل ہوئی تھی جیسے دھکیل دی گئی ہو، زرد اور کمزور، سفید لباس میں کلدار گڑیا کی سی شان کے ساتھ چلتی ہوئی! دور سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر انہوں نے نظریں چرا لیں۔ وہ عجیب کنارہ کش نظریں تھیں، ان میں کسی پرانی شناسائی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایک لفظ بولے بغیر وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔

جامع مسجد کے سامنے ایک وسیع میدان میں خیمے اور قناتیں لگی تھیں اور انسانوں کی ریل پیل تھی۔ یہ ہندوستان کی تمام اہم اور بااثر مسلم جماعتوں کی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی چنانچہ پشاور سے لے کر بھٹی تک کے مسلمان وہاں پر جمع تھے، یوں دعوت نامے ملک کی ہر سیاسی جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو جاری کیے گئے تھے۔ جلسے کی کارروائی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ پنڈال میں اور پنڈال کے باہر بے پناہ رش تھا۔ ہر طبقے اور ہر نسل کے مسلمان ان قناتوں کے نیچے گھوم رہے تھے۔ اور بیٹھے ہوئے تھے۔ مختلف نقوش، مختلف لباسوں اور مختلف زبانوں والے ان گنت گروہ باتوں میں مشغول تھے۔ لکڑی کے سٹیج پر، مائکروفون کے پاس، جلسے کے چند منتظمین عجلت سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے اور ان کے مکالموں کے بعض حصے مائکروفون میں سنائی دے رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر ایک شخص اس میں ناک ٹھونس کر پکارتا: ”ہیلو ہیلو ہیلو۔“ ملے جلے شور کے اوپر اوپر اس کی آواز چاروں طرف گونجتی۔ کوئی اس کی طرف دھیان نہ دیتا۔

سٹیج سے لے کر جلسہ گاہ کے دروازے تک قیمتی سرخ قالینوں کا رستہ بنایا گیا تھا جس کے دونوں جانب سرما کے سفید پھولوں کی قطاریں تھیں۔ جلسہ گاہ کے باہر سرو اور پام کے درختوں کا ایک بہت بڑا تقریبی دروازہ بنایا گیا تھا جس کے نیچے استقبالیہ کمیٹی کے ارکان کھڑے تھے اور آ جا رہے تھے۔ اندر سٹیج پر اور لکڑی کی سیڑھیوں پر قرمزی رنگ کے قالین بچھے تھے اور مائکروفون کے پاس ایک میز اور صدر جلسہ کی اونچی پشت اور زردوزی کے کام والی نمٹلیں کرسی رکھی تھی۔ سٹیج کے دائیں بائیں کانفرنس میں شرکت کرنے والے مندوبین کی نشستیں تھیں جو تقریباً تمام کی تمام پر ہو چکی تھیں۔ سامنے مسلم لیگ کی دونوں جماعتیں تھیں جن کے سربراہ، محمد علی جناح اور سر محمد شفیع، نمایاں طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ وہیں پر ڈاکٹر اقبال بھی تھے۔ دائیں طرف خلافت کمیٹی کے ارکان تھے جن میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی

تھے۔ بائیں طرف جمیعتہ العلماء ہند کے باریش چغہ پوش نمائندے تھے جن میں مولانا حسین احمد مدنی اور شبیر احمد عثمانی شامل تھے۔ ان تینوں بڑی جماعتوں کے بیس بیس منتخب نمائندے شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ ان کے پیچھے معزز اور منتخب نمائندوں کی نشستیں تھیں۔ ہندوستانی مسلمان اُمراء جو اپنی شان و شوکت کی وجہ سے سمندر پار تک مشہور تھے، اپنے بیش قیمت آرائشی چغوں اور تقریبی لباسوں اور خطابوں کے ہمراہ آئے تھے۔ ان کے مخملیں لبادوں پر قیمتی دھات کے تاروں کی کشیدہ کاری کی ہوئی تھی اور انہوں نے چمکدار ستاروں والی خاندانی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ چند ایک نے صبح کا انگریزی لباس بھی پہن رکھا تھا۔ وہ سادہ مگر با اختیار انداز میں ٹانگیں پھیلائے آرام وہ نشستوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں خوابیدہ اور بے مصرف تھیں۔ ان کے پیچھے تنگے سروں اور ادھ تنگے جسموں کا ایک سمندر تھا جو دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ وہ لا تعداد، غیر اہم لوگ تھے جو ہر تحریک اور تبدیلی کی پشت پر آخری اور اصل قوت ہوتے ہیں۔ وہ تیز، بے صبر اور مشتاق چہروں کے ساتھ کارروائی شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کانگریس کے جلسوں کے برعکس اس جلسے میں، مسلمان عورتوں میں پردے کے رواج کی سختی کے باعث، خواتین کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ چنانچہ جب نعیم اور عذرا جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو بہت سی متجسس نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ دونوں محتاط، بے لوج چال سے چلتے، ہجوم سے اپنے آپ کو الگ رکھتے ہوئے، اگر امراء اور عوام کی درمیانی نشستوں پر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ بیٹھتے بیٹھتے نعیم نے ایک اچھتی ہوئی نظر اپنی بیوی پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہزبائی نس سر آغا خان اپنے ذاتی علی اور استقبالیہ کمیٹی کے ارکان میں گھرے ہوئے داخل ہوئے۔ تمام لوگ اٹھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ آغا خاں صبح کے سفید انگریزی لباس میں تھے۔ انہوں نے چھڑی والا ہاتھ اٹھا کر لوگوں کے سلام کو قبول کیا اور بھاری، ٹھکنے جسم کے ساتھ، دھیمی پر وقار چال سے چلتے ہوئے سٹیج کی سیرئیاں چڑھ کر کرسی صدارت پر بیٹھ گئے۔ بھرے پنڈال میں موت کی خاموشی چھا گئی۔ اس اچانک سناٹے میں دفعتاً نعیم نے اپنے آپ کو ان گنت انسانوں میں گھرا ہوا محسوس کیا۔ اپنی موجودگی کو محسوس کیا اور آنکھوں کے کونوں میں اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر رنگ جھلک آیا تھا اور بڑی بڑی مایع آنکھوں سے جذبات ظاہر تھے۔ وہ کرسی کی پشت کو چھوڑ کر سیدھی بیٹھی ہوئی صدر کو دیکھ رہی تھی، مسخر اور مضطرب! آغا خان نے سفید ہیٹ اتار کر میز پر رکھ دیا اور چھڑی اس کے ساتھ کھڑی کر دی۔ انہوں نے کسی اعصابی جھلپٹ کا اظہار نہ کیا۔ نعیم کے دل میں جلن سے ملتا جلتا ایک جذبہ پیدا ہوا۔ وہ اراداً کسمسایا اور سیدھا عذرا کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اسی پکھلی ہوئی تیغی حالت میں عذرا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور گرم سرگوشی میں،

خیالات کی شدت سے رک رک کر بولی :

”ابھی وہ بولیں گے تو سننا ، وہ بہترین انگریزی ۔۔۔“

نعیم کی آنکھوں میں سرد غصہ دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا، اگلے لمحے وہ کانوں تک سرخ ہو گئی ۔ اس نے مضبوطی سے ہونٹ بند کر لیے اور نیچے دیکھنے لگی ۔ کافی دیر کے بعد جب نعیم کے ذہن نے کام کرنا شروع کیا تو سٹیج پر سر شفیع کہہ رہے تھے :

”۔۔۔۔۔ میں پنجاب مسلم لیگ کو آل انڈیا مسلم لیگ میں مدغم کر دینے کے ریزولوشن سے اتفاق کرتا ہوں اور اسے محمد علی جناح کی قیادت میں دیتا ہوں اور خود بھی ان کی قیادت قبول کرتا ہوں ۔“

تالیوں اور نعروں کے شور میں سر شفیع اور محمد علی جناح بڑھ کر آپس میں گلے ملے اور دیر تک مصافحہ کرتے رہے ۔

”آج ہندوستان کی مسلمان جماعت ایک ۔۔۔۔۔“ سر شفیع نے کہنا شروع کیا ۔

”جماعت نہیں ”قوم“ کہو“ محمد علی جناح خفگی سے انگریزی میں بولے ۔

ہندوستان کی مسلمان قوم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئی ہے ۔“ انہوں نے کہا اور اچھتی ہوئی نگاہ صاحب صدر پر ڈالی جو بے حد اداس نظر آرہے تھے ۔

اس مقام پر اس کا ذہن پھر تاریکی میں چلا گیا اور احساس اوپر آ گیا ۔ وہ اکیلا بیٹھا تھا، ہزاروں انسانوں میں گھرا ہوا بیٹھا تھا ، اس کے پاس اس کی بیوی بیٹھی تھی جس کے لیے اس کے دل میں کوئی جذبہ نہ تھا ۔ وہ برسوں تک ساتھ ساتھ رہے تھے ، ساتھ سوئے تھے، ہنوز اجنبی تھے ۔ وہ بے شرمی کی حد تک نفسانی اور خوبصورت تھی، وہ محبت کرنے والی تھی، وہ بیہودہ عورت تھی، وہ اونچے طبقے کی عورت تھی ، وہ برتر تھی، وہ تہذیب و تمدن کی عورت تھی ، وہ برتر تھی، وہ تہذیب و تمدن کی عورت تھی ، وہ ایک نکما مرد تھا، نکما اور نادار ۔ معمولی ، بے حد معمولی ۔۔۔

ریزولوشن پاس کیا جاتا ہے ۔“ ایک شخص ، جو شکل و شبہت سے اہم دکھائی دیتا تھا ، مائکروفون پر کہہ رہا تھا، ”یہ نتیجہ ووٹنگ کے بعد نکالا ۔۔۔“

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے مولانا محمد علی کوڈ کر سٹیج پر چڑھے اور مخصوص جوشیلے انداز میں اسے پرے دھکیل کر مائکروفون پر قبضہ جما لیا ۔

”لیکن اس طرح ہم جائنٹ الیکٹریٹ کو قبول نہیں کر سکتے ۔“ انہوں نے کہنا شروع کیا ، ”سیاست چند مادی فوائد کا نام ہے ۔ وہ اگر ہماری شرائط ماتے پر تیار ہیں تو ہم جائنٹ الیکٹریٹ

قبول کرتے ہیں ، ورنہ نہیں ۔ اس کے لیے انہیں ہم کو تصفیہ حقوق (Reservation Seats) دینا ہو گا ، تیسرا حصہ مرکز میں اور صوبوں میں بھی WEIGHT AGE انہوں نے سوالیہ نظروں سے مجمع کی طرف دیکھا ۔ یہ موقع پا کر پہلا شخص ، جو ریزولیشن کا اعلان کر رہا تھا، پھرتی سے آگے بڑھا اور مولانا سے تیز تیز باتیں کرنے لگا ۔ اس کے انداز سے انکساری اور منت ظاہر تھی ۔

مائکروفون کو خالی دیکھ کر ایک شخص، جو آغا خان کے کان کے پاس جھکا ہوا تھا، آگے بڑھا اور گھبرائی ہوئی آواز میں لنچ کے وقفے کا اعلان کرنے لگا ۔

”دوسری نشست دوپہر کے کھانے کے بعد ہوگی ۔“ اس نے کہا ۔ مولانا محمد علی نے تیز نظروں سے اسے دیکھا ۔ لیکن اسی وقت صاحب صدر اٹھ کھڑے ہوئے ۔ انہوں نے اپنا ہیٹ اٹھا کر سر پر رکھا اور سٹیج سے اتر آئے ۔ مائکروفون کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کا ایک فقرہ لوگوں کو سنائی دیا ۔ وہ انگریزی میں کہہ رہے تھے:

”محمد علی کو سنبھالے رکھو ۔ لنچ کے وقفہ میں اسے مت بولنے دینا ۔“

مولانا کے گرد بہت سے لوگ اکٹھے ہو رہے تھے ۔ سٹیج کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے خلافت کمیٹی کے ارکان برافروختہ چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھے اور احتیاط کے ساتھ ہجوم سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے ۔ ایک بار پھر بہت سے سر اس زرد رو ، باوقار خاتون کی جانب مڑ گئے ۔ روشن محل کی سیردھیوں پر وہ اسی طرح جدا ہو گئے ۔ انہوں نے کوئی جذبہ، کوئی شائستگی محسوس نہ کی ۔ انہیں یکجا رکھنے والی کوئی قوت ان کے درمیان باقی نہ رہی تھی ۔ اسی شام کو نعیم روشن پور لوٹ آیا ۔

اسی سال چھ اپریل کو ”ڈنڈی ساحل“ پر مہاتما گاندھی نے نمک سازی کا قانون توڑ کر ”سول نافرمانی“ کا آغاز کیا ۔

(۲۷)

ہندوستانی میدانوں کا بہترین موسم تھا ۔ وہ موسم جس میں روشن پور کی انگور کی بیلیں ہری ہو جاتی تھیں اور جنگلی کلاب جگہ جگہ کھلنے لگتا تھا اور خوش حال شہد کی مکھیاں اپنے اپنے چھتے پر کر کے ، تازہ شہد کی خوشبو سے بد مست ، شفاف اور چمکدار فضا میں اڑتی پھرتی تھیں اور کھیتوں میں گیہوں اور چنے کی فصل تیار کھڑی ہوتی تھی ۔ یہ بہار کے آخری دن تھے جب ہواؤں میں خوشگوار حرارت پیدا ہونے لگتی ہے ۔ آسمان کا رنگ ، جو جاڑوں میں گہرا نیلا تھا، گدلا دودھیلا ہو جاتا ہے اور شاخوں پر پھول مرجھا کر دن بھر گرتے رہتے ہیں اور چڑیاں کو سے دوپہر کو آسمان پر

ادھم مچانے کی بجائے سایہ دار درختوں اور مکانوں کی چھتوں میں آرام کرنے کے لیے چلے آتے ہیں اور بدلتے ہوئے موسم کا مخصوص، بہت اداس کر دینے والا، شدید حسن سارے دنوں میں دور دور تک پھیلا رہتا ہے۔

گاؤں کے باہر نعیم کی حویلی میں نمک بن رہا تھا۔ حویلی مدت سے بند پڑی تھی اور باغ ویران ہو چکا تھا۔ پانی کی نالیاں سوکھی پڑی تھیں اور دو ایک جگہ مردہ کوے گرے پڑے تھے اور آغاز گرما کی اٹھتی ہوئی ہواؤں میں زرد پتے ان پر سے اڑتے ہوئے گزر رہے تھے۔ گھر کے مالکوں میں سے کوئی بھی وہاں پر نہ تھا۔ شیشم کے ایک قدیم درخت کے نیچے گاؤں کے تمام نوجوان جمع تھے۔ انہوں نے بجلی سے مرا ہوا ایک درخت کاٹ کر آگ جلا رکھی تھی۔ آگ پر گڑ بنانے والا کڑا دھرا تھا جس میں پانی ابل رہا تھا۔ وہ سب خاموش، پُر اشتیاق چہروں کے ساتھ ادھر ادھر پھر رہے تھے اور دھڑا دھڑا آگ جلا جا رہے تھے۔ دن کا تیسرا پہر جا رہا تھا۔ وہ اب باتیں کر کے اور آگ جلا کر تھک چکے تھے۔ صبح سے دوپہر تک کئی بار کڑا دھرا پانی ابل کر خشک ہو چکا تھا پر نمک کہیں پر بھی دکھائی نہ دیا تھا۔ اب سارے کسان لونڈے جھلا گئے تھے اور ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔

”کچھ منہ سے بول، کوؤں کے سردار۔ باپ کی حویلی میں نمبردار بنے بیٹھے ہو۔“ لے لے کالوں والے پرتاپے نے کہا۔ علی اپنے سیاہ رنگ پر طنز سن کر لال ہو گیا، مگر خوش بیٹھا رہا کیونکہ نمک بنانے کے سلسلے میں وہ دوسروں سے زیادہ کچھ نہ جانتا تھا اور سب سے اونچی اور چودہراہٹ والی جگہ پر بیٹھا تھا کہ وہ اس کے بھائی کا بلوغ تھا۔

”ان کو بتاؤ پانی سے گڑ کیسے بنتا ہے!“ گنچے علی بخش نے کہا اور اکیلا ہنسنے لگا۔

پیدائشی گنجا علی بخش خاموشی سے ٹوپی میں تمباکو جا کر آگ دھرتا رہا، پھر حقہ لے کر دوسروں سے ہٹ کر جا بیٹھا۔ وہ طبعاً خسیس آدمی تھا۔ اور اپنے تمباکو میں سے کسی کو حصہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس سے پرے راول اور آٹے کی مشین والا سنتو کہ سنگھ بیٹھے بحث کر رہے تھے۔ راول اپنی بال دار پنڈلیوں پر سے کپڑا اٹھا کر اسے دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ کہ یہ ٹانگیں مرد کی ٹانگیں تھیں اور اس کی ملائم اور چکنی ٹانگوں پر چونکہ بال نہ تھے اس لیے وہ عورت کی ٹانگیں تھیں۔ سنتو کہ جواب میں کہہ رہا تھا کہ راول کی ٹانگیں ریچھ کی ٹانگوں کی مانند تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ان کی بحث خاموشی پر ختم ہو گئی اور راول کی طرف دیکھنے لگا۔ گنجا علی بخش خطرہ محسوس کر کے جھگڑنے کا کوئی بہانہ تلاش کرنے لگا۔

”کیوں بے، خاموش کیوں بیٹھا ہے؟ عائشہ کا دکھ لگا ہے؟“ وہ بولا۔

”تیری ماں کا دکھ لگا ہے۔“ راول نے خشونت سے جواب دیا۔ گنجا کھی کھی کر کے

ہنسا۔ ”تیرے سر میں بھوسا بھرا ہے۔ وہ تو میری ماں سے بڑی جوان ہے۔“

راول لال پیلا ہو کر اٹھا اور اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔ ”اور بک بک کی تو تیری ٹانٹ توڑ دوں گا۔ گنجے خسیس۔“ وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ گنجا اس اچانک حملے سے گھبرا گیا۔ اور دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ راول کچھ دیر تک اسی انداز میں آنکھیں نکال کر اس پر جھکا رہا، پھر جھٹکے کے ساتھ حقہ اٹھا کر خفگی سے مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتا ہوا اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ جب حقہ پی پی کر اس کا غصہ اتر گیا تو گنجا علی بخش حقہ واپس لینے کی غرض سے اس کے پاس جا بیٹھا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

جب سارے کنوؤں کا پانی باری باری ابالا جا چکا اور کچھ بھی نہ بنا تو علی کو سوچا کہ کھارے کنوئیں کا پانی آزمایا جائے؛ چنانچہ اس کے مشورے سے کھارے پانی کے ٹین گدھوں پر لاد کر لائے گئے اور کڑا بھر دیا گیا۔ پانی ابلنے لگا اور سب ایسی چمکتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگے کہ کبھی فصل کے پھوٹنے کو بھی نہ دیکھا ہو گا۔ ابلتے ابلتے جب پانی دو انچ نیچے چلا گیا اور خشک جگہ پر سفید سفید نمک چھوڑ گیا تو بہت سوں نے یک زبان ہو کر کہا: ”نمک“ اور اس پر جھپٹ پڑے۔ ہر ایک نے باری باری اٹھکی مل مل کر اسے چکھا۔

”نمک ہے۔ نمک۔“ پرتاپے نے پوری آواز سے چلا کر کہا۔

”ٹھہریے کھانا نہیں۔“ سنتو کہ سنگھ اس کا بازو جھٹک کر بولا ”کیا پتا کیا ہے۔“

”پر بن تو گیا۔“

”ہاں ہاں، بن تو گیا۔“

سب نوجوان کڑا کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور بچوں کی طرح مسرور اور مشتاق نظروں سے ابلتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں بجلی گرا ہوا درخت ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگ میں جھونک دیا گیا اور سہ پہر کی دھوپ کے باوجود شعلے، جو کڑا سے اوپر اٹھ رہے تھے، کسانوں کے جھکے ہوئے، مضبوط ہڈیوں والے چہروں پر جھلمانے لگے۔

پانی کی سطح برابر نیچے جا رہی تھی اور وہ ہر دم کاٹھا اور گدلا ہوا جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ سب خوشی کے اولین اثر سے گنگ ہو گئے۔ پھر ایک ایک کی اٹھ کر علی پر ٹوٹ پڑے۔ سنتو کھے نے علی کو کندھوں پر اٹھا لیا اور ناچنے لگا۔ اس کے گرد تمام لڑکوں نے ناچنا اور گانا شروع کر دیا۔ بیچ بیچ میں وہ رک کر خوشی کے نعرے لگانے لگتے۔ ان میں سے ایک نے بھی شراب نہ پی رکھی تھی، لیکن ایک نامعلوم نشہ تھا جو ان کے حواس پر طاری تھا۔ ناچتے ناچتے ان میں سے کئی ایک نے تہمد نکال دے تھے۔ یہ وہ پاگل خوشی کا منظر تھا جو کسانوں میں کبڈی کے مقابلوں یا فصل کے موقعوں پر دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ تمام اس وقت کسانوں کے فحش عشقیہ گانے اور دلاوری کی داستانیں گا رہے تھے۔ کوئی لے سر یا آہنگ نہ تھا، صرف ایک ترنگ تھی اور کسانوں کا ملا جلا شور! علی لمبے سکہ کے کندھوں پر بیٹھا تھا اور اس کا سیاہ رنگ خون کی یورش

کی وجہ سے رگڑے ہوئے تانبے کا سا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فتح مندی کی وحشیانہ چمک تھی اور وہ بازو ہوا میں پھینک کر چیخیں مار رہا تھا۔ ایک شخص، جو اس دیوانے گروہ میں شامل نہ تھا، راول تھا۔ وہ سب سے الگ اپنی جگہ پر بیٹھا زہریلی، بد نما نظروں سے علی کو دیکھے جا رہا تھا۔۔۔

جب وہ ناچ ناچ کر نڈھال ہو گئے تو بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ پانی اب سوکھ چلا تھا۔ انہوں نے کڑاہ اتار کر نیچے رکھا اور دو لونڈے گاؤں کو دوڑا دیے۔ گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھے اور ادھیڑ عمر کسان مٹھی مٹھی بھر اناج لے کر اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ کٹائی میں ابھی چند دن باقی تھے اور بعض کسانوں کے گھروں میں چند پاؤ اناج رہ گیا تھا۔ لیکن اس وقت انہوں نے اناج والوں سے کہا:

”ایک پاؤ اناج دے دو۔ کٹائی پر سیر بھر لے لینا۔“
”کھانے کو؟“

”نہیں، نمک کے لیے۔“

”لے لو، لے لو۔ تم بس پہر بھر آکر کٹائی کرا دینا۔“ امیر کسانوں نے کہا۔ اور اس طرح مٹھی بھر اناج کے بدلے انہوں نے محنت کا سودا کیا۔ اپنا اپنا اناج لا کر انہوں نے پھیلی ہوئی چادر پر ڈالا اور چٹکی چٹکی بھر نمک لے کر گھروں کو لوٹ آئے۔

”چلو اچھا ہوا۔ گھر میں نمک بھی نہ تھا۔“ ایک بوڑھے کسان نے نمک کو پگڑی کے کونے میں باندھتے ہوئے کہا۔

”اچھا کیا ہوا۔“ پیچھے آتا ہوا سرخ داڑھی والا کسان بولا، ”یہ کھانے کے لیے نہیں ہے۔“
”ایس؟“

”مجھے پرتاپے نے بتایا تھا۔“

”کیا بتایا تھا؟“

”صرف قانون توڑنے کے لیے ہے۔“ سرخ داڑھی والے نے زمین پر تھوک کر کہا،

”یہ اچھا نمک نہیں ہے۔“

”سؤروں نے اچھا سودا کیا ہے۔“ پہلے کسان نے ہنس کر کہا اور زور سے زمین پر تھوکا۔

جلد ہی آس پاس کے گاؤں میں خبر پہنچ گئی اور رات گئے تک دوسرے قصبوں سے لوگ

آتے رہے۔ وہ میلوں میں جاتے ہوئے کسانوں کی طرح ٹولیوں میں بٹ کر آئے اور نمک کی جمی

ہوئی کھردری ڈلیوں کو سروں کے گرد گھماتے ہوئے واپس لوٹے۔ جب سارا نمک ختم ہو گیا اور

رات گہری ہو گئی اور وہاں کوئی بھی نہ رہا سوائے ان لڑکوں کے جنہوں نے نمک بنایا تھا تو خاموشی

کے اس وقفے میں دفعتاً ان پر اپنی لاقانونیت اور جرم کا انکشاف ہوا۔ عجلت کے ساتھ اٹھ کر

انہوں نے اناج کی گٹھڑی ، جس میں گیہوں ، جوار ، باجرہ ، مکئی ، سبھی کچھ تھا ، باندھی اور اسے دورہ کرتی ہوئی پارٹی کے لوگوں کے پاس پہنچا دیا جو حویلی کے پچھلے برآمدے میں دیا جلانے کام کر رہے تھے ۔ پھر انہوں نے کڑاہ کو اٹھا کر چولہے میں اوندھا گرایا ، تازہ مٹی میں اسے دفن کیا اور اوپر خشک مٹی ڈال کر زمین ہموار کر دی ۔

پھر وہ اسی نامعلوم خوف کے زیرِ اثر خاموشی سے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے ۔

راول اندھیرے میں درخت کی جڑ کے پاس بیٹھا رہا ۔ اس نے کسی کام میں حصہ نہ لیا تھا ۔ جب علی گروہ کو چھوڑ کر گھر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر مڑا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے کھیتوں کے بیچوں بیچ اس کی جانب بڑھا ۔

گاؤں کا پہلا گھر ابھی دو کھیت دور تھا جب علی نے اپنے پیچھے تیز تیز قدموں کی آواز سنی ۔ وہ رک گیا ۔ چاند کی مدھم روشنی میں آنے والا جنگلی بلے کی سی پھرتی کے ساتھ اسکے قریب آکھڑا ہوا ۔ چند لمحے تک وہ خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ۔ پھر آنے والے نے زمین پر تھوکا ۔

”تم آج کتے کے بچے کی طرح شور مچا رہے تھے ۔ ہیں ؟“

علی نے نیم تاریکی میں راول کی آواز پہچان لی

”تم نے آج بہت کام کیا ہے ۔ تھک گئے ہو گے ، جاؤ جا کر آرام کرو ۔“ علی نے طنز سے کہا ۔

”آج ہم میں سے ایک ہی آرام کرے گا ۔“ راول نے مٹی کے ڈھیلے کو ٹھوکر ماری ۔

ڈھیلا ٹوٹ گیا اور سیاہ مٹی اڑ کر علی کی ٹانگوں پر پڑی ۔ اس نے ہوا میں کالی دی ۔ ”میں بدلہ لینے آیا ہوں ۔“

”مجھے تم سے کوئی بدلہ نہیں لینا“

”بزدل ۔ حرامی ۔“

”میں عورتوں کے لیے کسی سے نہیں لڑتا ۔“ علی نے ٹالتے ہوئے کہا ۔

”کانٹے کے بچے ، حرامی ۔ اپنی ماں کے لیے بھی نہیں لڑو گے ؟“

علی کی رگیں آہستہ آہستہ کھینچنے لگیں ۔ کئی لمحوں تک وہ آمنے سامنے کھڑے اجنبی جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ۔ پھر انہوں نے کپڑے اتارے اور ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے ۔

وہ اچھل اچھل کر ، بیچ بیچ کر ایک دوسرے پر وار کرتے رہے ۔ دونوں خالی ہاتھ تھے لیکن

اپنی بہترین اور مضبوط ترین اٹھلی کے جوڑوں سے ایک دوسرے پر چوٹ لگا رہے تھے ۔ ان

کے پاؤں میں سے گرد اٹھ رہی تھی اور آہستہ آہستہ ان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ اس خاموش اور نیم تاریک رات میں گرد و غبار کے درمیان وہ دیر تک رقابت اور دیوانگی کا ناچ ناچتے رہے حتیٰ کہ ان کے جسم گرد آلود ہو گئے اور وہ منہ کھول کر ہانپنے لگے۔ بھر رفتہ رفتہ علی تھکنا شروع ہوا۔ اسے ہمیشہ سے راول کی برتری کا احساس تھا لیکن اب اس نے واضح طور پر اپنی طاقت زائل ہوتی ہوئی محسوس کی اور پہلی بار اس کے دل میں نو عمری کے خوف نے سر اٹھایا۔ اپنے مقابل کو سست پا کر راول نے سیاہ درندے کی طرح ہوا میں جست بھری اور چاروں ہاتھوں پاؤں کی بھرپور کوشش سے علی کو دیوچ کر نیچے گرایا۔ پھر اسکے اوپر جم کر اس نے اس کے بغلوں میں گھٹنے دیے اور گردن کو مروڑنا شروع کیا۔ علی بلبلا اٹھا۔ اس کی لمبی وحشیانہ چیخ، جو زخمی سؤر کی چیخ سے مشابہ تھی، خاموش رات میں دور تک چلی گئی۔ ساتھ والے کھیت میں سرخ داڑھی والا کسان سو رہا تھا۔ چیخ سن کر وہ اٹھا اور کابلی سے چلتا ہوا اُن کے سر پر آکھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک کمر پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد گرد کی وجہ سے کھانسنے لگا اور حلق صاف کرتا ہوا واپس لوٹ گیا۔

”جنے کب پولیس آجائے۔۔۔۔ اور لونڈوں کو مستی آئی ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔

اب راول تھوڑے تھوڑے وقفوں پر اس کی گردن کو دبا رہا تھا اور علی گہری گہری، کرب ناک مختصر چیخیں مار رہا تھا۔

”مت چلاؤ۔۔۔۔ حرامی۔“

علی خوفزدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔

”میں تمہیں قتل کر سکتا ہوں۔“ راول نے اطمینان سے کہا۔

”کیوں؟“

”اس کو لے کر تم ماں کی ٹانگوں میں نہیں بیٹھ سکتے۔“

”کیوں؟“ علی نے اسے باتوں میں لگانا چاہا۔

”تمہیں پتا نہیں؟“ راول نے سارا بوجھ اس کی گردن پر ڈال دیا۔ علی کے حلق سے چیخ

اور کالی ایک ساتھ نکلی۔

جب راول گردن دباتے دباتے تھک گیا تو خاموش اسکے اوپر بیٹھ گیا۔ علی ذرا دیر کے بعد

ہوش میں آ کر گلے کی رگوں کو ملنے لگا۔

”تمہارے جسم سے بو آرہی ہے۔ اٹھو۔“ پھر اس نے چالکی سے کہا۔

”کیوں؟ میں کتا ہوں۔“ راول نے اس کی گردن پر بوجھ ڈالتے ہوئے کہا،

”میں کتا ہی تھا۔ میں ہی تھا۔ لو۔ میں اس کے قابل نہ تھا۔ میں کتا ہوں۔ میں ہوں۔“

لو۔“ علی تکلیف کی شدت سے پھر چیخنے لگا۔ دوسری دفعہ جب راول دم لینے کو رکا تو علی نیچے

سے رو کر بولا ۔

”میری فصل کھڑی ہے اور میرا بھائی یہاں نہیں ہے اور تم ۔“

”میں تیری فصل کی پروا نہیں کرتا۔ تیری فصل کی ماں ۔“

”تو کیا یہاں رہے گا ، سؤر ؟ تیری فصل کو بھی چوہے کھائیں گے ۔“

راول کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ۔ وار کاری پڑتا دیکھ کر علی پھر بولا :

”پولیس یوں بھی آنے والی ہے ۔ وہ تجھے پکڑ کر لے جائیں گے اور تیری فصل کا بھی

منقصان ہوگا ۔ بات کو کٹائی تک رہنے دو ، پھر میں خود تم سے لڑوں گا ۔ میں کوئی بزدل

ہوں ؟“

راول نے جواب دینے کی بجائے دونوں گھٹنوں کا بوجھ اس کی گردن پر ڈال دیا ۔ علی کی

چینیں لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی گئیں اور وہ بچوں کی طرح رونے لگا ۔ آخر شدید اذیت کی وجہ سے وہ

بیہوش ہو گیا ۔

راول نے الگ ہو کر کپڑے اٹھائے ، پسینہ خشک کیا اور حلق صاف کر کے زور سے علی

کی پیٹھ پر تھوکا ۔

”ابھی اتنا ہی کافی ہے ۔ پھر کٹائی کے بعد سہی ۔“

آہستہ آہستہ کھیتوں کی گرد بیٹھ گئی اور فضا میں رات کی صاف ہوا چلنے لگی ۔ لیکن ضربات

کی شدت سے علی صبح تک وہیں پڑا رہا ۔

اس سے ٹھیک چوتھے روز نعیم پشاور سٹیشن پر جا کر اترا اس اجنبی سرزمین پر قدم رکھتے

ہی سب سے پہلا خیال جو اس کے دل میں آیا امیر خان کا تھا، اس کا لنگڑا دوست جو کئی سال

پہلے ایک مشترکہ دکان میں اس کا ساتھی تھا اور جس سے دوبارہ ملنے کا اس نے وعدہ کیا تھا ۔ اس

وقت ، مصروفیت کے باوجود دفعتاً پرانی رفاقت کا احساس حسیں اس کے دل میں جاگا اور وہ ،

کہ محبت کا محتاج تھا ، سب سے پہلے اس سے ملنے کو روانہ ہو گیا ۔

امیر خان کا گاؤں پشاور کا ایک نواحی گاؤں تھا ۔ جو پتھروں کے ایک بہت بڑے ٹیلے

کے پیچھے چھپا ہوا تھا ۔ جب نعیم اس ٹیلے پر چڑھا تو سارا گاؤں اس کے سامنے آگیا ۔ رات

پڑنے والی تھی اور پتھر یلے مکانوں کے صحنوں میں کہیں دیے جل رہے تھے ۔ صرف گاؤں کے

ایک کونے میں بہت سی روشنی سیاہی مائل فضا میں آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی ۔ وہ گاؤں ایک

دوسرے مخروطی شکل کے ٹیلے پر واقع تھا ۔ مکانات ٹیلے کی ڈھلانوں پر اوپر نیچے بنے ہوئے تھے

اور ان میں دھواں اٹھ رہا تھا ۔ شام کے دھندلکے میں اس نے ٹیلے کے دامن میں پھیلے ہوئے

سیاہ پیڑوں کے باغ دیکھے اور اس سے نیچے وادی میں ادھ کٹی فصلوں کے کھیت ، اور دور سے

بہتے ہوئے پانی کا شور سنا اور دم بخود کھڑا رہا ۔ اس نے آگے بڑھنے کی خواہش محسوس نہ کی ۔

چاروں طرف پھیلتی ہوئی رات میں وہ اکیلا ٹیلے پر کھڑا دیکھتا رہا۔ سفیدی مائل آسمان کے مقابل ٹیلے کی چوٹی پر اس کی سیاہ، لمبی شبیہہ ایک برق زدہ درخت کی طرح ساکت دکھائی دے رہی تھی۔ اسے وہ گاؤں بے حد مانوس اور خوشگوار معلوم ہوا۔ اس نے یاد کرنا چاہا، لیکن اسی دم اس کے دل میں خطرے کا احساس پیدا ہوا۔ وہ ایسے دیس میں تھا۔ جہاں آسمان کے مقابل سیاہ شبیہوں کو دیکھ کر گولی مار دی جاتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اترنے لگا۔

راستہ پتھروں سے اٹا ہوا اور ڈھلوان تھا۔ وہ پتھروں پر سے پھسلتا پھلانگتا اور دل میں گاؤں والوں کو کوستا ہوا اترتا رہا۔ وادی کو پار کر کے سیاہ باغوں میں سے گزرتے ہوئے نمدار ہرے پتوں کی خوشبو اس کی ناک میں داخل ہوئی اور اسے گھنے جنگلوں کی مخصوص خنکی اور سناٹے کا احساس ہوا۔ بہتے ہوئے پانی کا مسلسل شور اس کے کانوں میں آرہا تھا لیکن پانی رستے میں کہیں بھی نہ ملا، حالانکہ اس سناٹے اور سکوت کے وقت بہتے ہوئے پانی کے کنارے کھڑا ہونا اور اسے پار کرنا اس کے جی کو اچھا لگتا۔

گاؤں میں داخل ہو کر اسے اکا دکا آدمی گلیاں اور رستے پار کرتے ہوئے ملے۔ تقریباً سبھی نے بڑی بڑی گھیر دار شلواریں پہنی ہوئی تھیں اور کندھوں پر راشٹلیں لٹکا رکھی تھیں۔ ان سے پوچھ کچھ کرتا ہوا آخر وہ گاؤں کے مغربی کونے میں ان مکانوں کے آگے جا کھڑا ہوا جہاں سے نارنجی روشنی کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور اندر باہر شادی کا ہنگامہ تھا۔ یہی امیر خان کا گھر تھا۔ رنگ برنگ بھڑکیلے لباس پہنے اونچی آواز میں باتیں کرتے ہوئے مرد اور عورتیں اندر باہر آ جا رہے تھے۔ مکان کا احاطہ جلتی ہوئی چکنی لکڑی کی مشعلوں سے روشن تھا اور لکڑی میں سے تیل نکل نکل کر زمین پر ٹپک رہا تھا۔ جگہ جگہ دار چینی اور لونگ کی انگلیٹھیاں سلگ رہی تھیں اور ان کا خوشبودار دھواں مشعلوں کے دھوئیں سے مل کر ساری فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ احاطے کے وسط میں بہت سے لوگ جمع تھے اور ان کے درمیان ایک دبلا پتلا بڈھا کان پر ہاتھ رکھے اونچی، کرخت آواز میں مکا رہا تھا۔ اتنی ساری خوشی اور ہنگامہ دیکھ کر نعیم سہم گیا۔

”میں غلط وقت پر آیا ہوں۔“ اس نے سوچا، ”میں اس کی خوشی میں مغل ہوں گا۔“ وہ وہیں پر کھڑا رہا۔ وہ احاطے میں سے گزر آیا تھا اور کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ اب وہ گھر کے اندر جانے والے دروازے کے پاس اندھیرے میں اکیلا کھڑا تھا۔ آنے جانے والے اس کی طرف توجہ دیے بغیر گزر رہے تھے۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا کانے والے کی آواز سنتا رہا۔ گیت کے بول ناقابل فہم زبان میں تھے لیکن اس کی لے میں وہی مستی اور ترنگ تھی جو اس کے اپنے گاؤں میں میلوں اور شادیوں کے موقعوں پر گونجا کرتی تھی۔ پھر کانے والے کے گرد گھیرے میں لہر پیدا ہوئی اور امیر خان ایک بیساکھی کی مدد سے چلتا ہوا نمودار ہوا۔ وہ منہ میں تیز تیز باتیں کرتا ہوا اندر کی جانب آ رہا تھا۔ مشعل کے نیچے آکر رکا، چاروں طرف پھپھکتی

ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر چل پڑا۔ وہ اسی طرح صحت مند تھا جیسے برسوں پہلے نعیم نے اسے دیکھا تھا۔ آگ کی روشنی میں اس کا چہرہ نارنجی اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ صرف اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ اس نے سرخ ریشم کا لمبا کرتا اور سرخ پھولوں والی واسکٹ پہن رکھی تھی اور سر پر تیز نارنجی رنگ کا صاف باندھا ہوا تھا۔ اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر نعیم آہستہ آہستہ چلتا ہوا روشنی میں آکھڑا ہوا۔

”ایس؟“ امیر خان آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے بڑبڑایا، ”بولو، تم بالکل اس کی طرح چلتے ہو۔“ پھر بیساکھی پر مینڈک کی طرح پھدک کر اس نے دو چھوٹی چھوٹی چھلانگیں بھریں حتیٰ کہ اس کی چھاتی نعیم کی چھاتی سے آگئی۔ قریب سے دیکھ کر امیر خان نے اسے پہچان لیا اور اس کا چہرہ ایک سادہ، بے اختیار مسکراہٹ میں پھیل گیا۔ اس نے اچک کر نعیم کے کال میں چٹکی بھری۔

”ابا نعیم۔ میں اندھا ہو رہا ہوں مگر تمہیں دس ہزار انسانوں اور مویشیوں کے ہجوم میں پہچان سکتا ہوں۔“

”پہچان لیا؟“ نعیم نے اپنا مضبوط بازو اس کے گرد لے جاتے ہوئے کہا۔

”اٹھا۔۔۔۔۔ ہم کڑے وقتوں کے ساتھی ہیں۔ میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ ہم برے وقتوں کے دوست ہیں۔“ وہ اسے دبا دبا کر ٹٹولنے کے بعد کھینچتا ہوا کانے والے کے پنڈال کی طرف لے جا رہا تھا۔ رستے میں اس نے اس کے سخت چوہی بازو کو حیرت سے آنکھوں کے قریب لا کر دیکھا، اٹھکیوں سے دبا دبا کر محسوس کیا اور اسی طرح بے اختیار ہنس پڑا۔

”اچھا ہے۔ اچھا ہے۔“ اس نے تعریفی انداز میں سر ہلا کر کہا۔

”مجمع میں داخل ہوتے وقت اس نے مڑ کر اطلاع دی: ”میرے بیٹے کی شادی ہے۔“

”مبارک ہو۔“ نعیم نے کہا۔ وہ دونوں لوگوں کے سروں کو پھلانگتے ہوئے دائرے کے وسط میں جا کھڑے ہوئے۔

”ابے او بڈھے مینڈک، اب ٹرانا بند کر۔“ امیر خان نے کانے والے سے کہا۔ پھر پنڈال کی طرف مخاطب ہوا: ”ہم برے وقتوں کے دوست ہیں۔ صوبے دار نعیم خان۔ یہ بہادر آدمی ہے اور میرے بیٹے کی شادی میں مہمان ہوا ہے۔“

تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور نووارد سے جھک جھک کر ہاتھ ملانے کے بعد اس کے لیے راستہ چھوڑنے لگے۔ بڈھا اور اس کا مہمان سب سے اونچی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔ نعیم پختنگنی عمر کے باوجود لال ہو رہا تھا۔ امیر خان کرخت آواز میں سننے والوں سے اپنی اور اسکی پہلی ملاقات کا قصہ بیان کر رہا تھا۔

کانے والے نے پھر کانا شروع کر دیا۔ دو ایک دفعہ اس نے نعیم کے سامنے آکر کانے کی سعی کی لیکن امیر خان نے اس کے سر میں بیساکھی مار کر اسے بھگا دیا۔ پھر اس نے بیساکھی پاس

بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کی پسلیوں میں چبھوئی۔

”یہ میرا بیٹا ہے۔ وزیر خان۔“

نوجوان اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا نو عمر لڑکا تھا اور باپ کی نسبت زیادہ خوبصورت تھا۔ وہ دولہوں کے رنگین لباس میں تھا اور ہاتھ میں بہت سے پھولوں کے ہار لٹکائے ہوئے تھا۔ وہ اکھڑ پن سے کھڑا اپنی بیساک آنکھیں نعیم کی آنکھوں میں ڈالے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر نو عمری اور کنوار پن کی دمک تھی۔ نعیم نے اسے رشک سے دیکھا، جیسے ایک ادھیڑ عمر کا انسان اپنی گزری ہوئی خوبصورت جوانی کی جھلک پر نوجوان میں دیکھتا ہے۔

”فوج میں ہے۔“

”خوبصورت جوان ہے۔“

”ہاں ہاں۔“ امیر خان ہنسا، ”اس نے ابھی جنگ نہیں دیکھی۔ ابھی اس کے گالوں پر

خون ہے۔ تمہیں کراس ملا تھا؟“

”نعیم خاموش رہا۔“

”تم کو توقع تھی نا۔ تم نے بتایا تھا۔“

”نہیں۔“ نعیم نے جھوٹ بولا۔

”آہ۔۔ ہا،“ امیر خان نے تاسف سے ہاتھ پھیلا کر کہا، ”بہادروں کی کوئی قدر نہیں۔“

”کوئی قدر نہیں۔“

”تم اپنے بیٹے کی شادی کہاں کر رہے ہو؟“

”ساتھ والے گاؤں میں۔ اپنی ہی برادری ہے۔ ابھی اس میدان میں مقابلہ ہو گا۔“

اس نے مغربی سمت میں اشارہ کر کے بتایا۔

”مقابلہ؟“

”ہاں۔“

کچھ دیر تک وہ وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر امیر خان اٹھ کر اندر چلا گیا۔ نعیم کو

میزبانوں نے جو تمباکو پلایا سخت کڑوا تھا اور اس نے اس کا حلق پکڑ لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بارات روانہ ہوئی۔ آگے آگے مشعلوں کا جلوس تھا۔ اس کے پیچھے

دولہا گھوڑے کی باگ تھامے پیدل چل رہا تھا۔ پھر خاموش باراتیوں کا ہجوم، ان کے چہرے

تتے ہوئے تھے اور ان کے کندھوں پر راٹھلیں خاموش تھیں۔ صرف ایک اکیلے ڈھول کی دھما

دھم خاموش رات میں گونج رہی تھی۔ سب سے آخر میں امیر خان نعیم کا بازو تھامے بیساکھی پر

اچھلتا ہوا چل رہا تھا اور آہستہ آہستہ باتیں کرتا جا رہا تھا: ”مقابلے سے پہلے دولہا گھوڑے پر سوار

بھی نہیں ہو سکتا۔ اللہ رحم کرے۔ اللہ رحم کرے۔“

تینگ پتھریلے راستوں پر چکر لگاتے ہوئے جب وہ گاؤں کی مغربی سمت میں نکلے تو یکایک ان کے سامنے ایک وسیع میدان آگیا جو اسی طرح کی مشعلوں سے روشن ہو رہا تھا اور بہت سے لوگ خاموشی سے چل پھر رہے تھے۔ ایک بہت بڑی مشعل کے نیچے ایک چھوٹا سا خیمہ نصب تھا۔ اس سے پرے ایک قطار میں آگ کے الاؤ جل رہے تھے جن پر مسلم دہنے گھمائے جا رہے تھے۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سارے میدان میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کی چربی پکھل کر آگ میں گر رہی تھی اور چرچرا کر جل رہی تھی۔ میدان کے وسط میں ایک اکلوتا ڈھوپچی اسی لے پر ڈھول بجا رہا تھا۔

باراتیوں کو نمودار ہوتے دیکھ کر ان کی حرکت رک گئی اور سب لوگ خیمے کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ دونوں ڈھوپچی ایک دوسرے کو مقابل پا کر جوش میں آگئے اور ان کے ہاتھ مشین کی طرح چلنے لگے میدان کے تین طرف پہاڑیاں تھیں اور آسمان تاریک تھا۔ فضا میں کوئی انسانی آواز نہ تھی اور ہر دم تیز ہوتی جا رہی تھی۔ چند لمحے کے لیے نعیم کو محسوس ہوا کہ یہ کٹائی کے ڈھول کی آواز تھی اور خاموشی سے کام کرتے ہوئے کسانوں کو اکسا رہی تھی۔ کڑے وقتوں میں ڈھول کی آواز کس قدر بے رحم اور پاگل کر دینے والی ہوتی ہے، اس نے سوچا۔

باراتی میدان کے اس کنارے پر رک گئے۔ امیر خان اس کا بازو چھوڑ کر آگے بڑھا اور اچھل کر چلتا ہوا میدان کے وسط میں جا کر کھڑا ہوا۔ سامنے سے اس کا ہم عمر، ایک بھاری جسم والا بڑھا نکلا اور آگے سے ملا۔ چند لمحے ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے بعد دونوں اپنی اپنی جگہ پر لوٹ آئے۔ اب دونوں مجمعے خاموشی سے آمنے سامنے کھڑے تھے اور مشعلوں کی روشنی ان کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ پھر خیمے کا پردہ ہلا اور گول چہرے اور میاں نے قد کی ایک لڑکی سیاہ ریشم کا بھاری لباس پہنے، سر پر تیز سرخ رنگ کا رومال باندھے نکلی اور آکر مشعل کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ سیاہ لباس اور سرخ رومال میں اس کی بے حد سفید رنگت چمک رہی تھی اور اس کا جسم فریبی کی طرف مائل تھا۔ امیر خان کے قریب سے اسکا بیٹا باراتیوں کے مجمعے سے الگ ہوا اور جھے ہوئے قدموں سے جا کر لڑکی سے تیس قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ نوجوان دولہا کو سامنے پا کر لڑکی نے جلد جلد چند بار اپنی سیاہ آنکھیں جھپکیں، پھر نظریں جھکالیں۔ ایک بہت لمبے قد کا پٹھان چار ماہ کے پلے ہوئے کانٹے کے پچھڑے کو اٹھائے ہوئے لایا۔ اور اسے لڑکی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ لڑکی خاموش کھڑی پچھڑے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر پچھڑے کی پشت پر رکھا اور رکھے رہی۔ اس کا چہرہ رنگ بدل رہا تھا۔ دفعتاً اس نے جھجک کر چاروں طرف دیکھا اور جھجک کر پچھڑے کی کمر کے گرد بازو ڈالے۔ پچھڑے کا پیٹ اس کے بازوؤں کے حلقے سے باہر تھا۔ پھر اس نے اس کی ٹانگوں کے گرد بازو ڈال کر اسے اٹھانا چاہا لیکن چار ماہ کا چوپایہ اس کے لئے بوجھل ثابت ہوا۔ وہ سیدھی کھڑی ہو گئی اور دوبارہ جھجک کر چاروں طرف

دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی وحشت تھی۔ ڈھول کی دھمک تیز تر ہو گئی۔ لڑکی نے ایک گھٹنا زمین پر ٹیکا اور سر نیہوڑا کر پچھڑے کے نیچے سے دوسری طرف نکالا، اس طرح کہ پچھڑے کا پیٹ اس کی گردن کی پشت پر آ گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے چوپائے کی اگلی اور پچھلی ٹانگیں پکڑیں اور اسے گردن اور شانوں پر لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں داب رکھا تھا اور اس کا چہرہ میر بہوٹی ہو رہا تھا۔ اس کے لباس میں ہلکی سی لرزش تھی۔

ایک غیر متزلزل ارادے کے ساتھ نوجوان نے رائفل پشت پر سے اتاری اور پچھڑے کے سر پر نظریں جمائے آہستہ آہستہ اسے کندھے تک لے گیا۔ کئی لمحوں تک وہ شست باندھے کھڑا رہا۔ نعیم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ شست باندھے ہوئے وہ ایک پتھر کا مجسمہ نظر آ رہا تھا جس میں ذرا بھی جنبش نہ تھی۔ لیکن اس نے لبلہی کو نہ چھوا۔ میدان میں موجود ہر شخص کے اعصاب کچھے ہوئے تھے اور فضا میں کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ ڈھول کی تال انتہائی تیزی کو جا پہنچی تھی۔ اچانک اس نے رائفل نیچی کی، اس کا دستہ زمین پر ٹکایا اور اگلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا۔ امیر خان کے منہ سے ایک کالی نکلی اور اس نے انتہائی غیض کی حالت میں بیساکھی زمین پر ماری۔ نوجوان نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی اور غصہ تھا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا، رائفل اٹھا کر شست باندھی اور گولی چلا دی۔ فائر کی خشک، پٹانے دار آواز دور تک پہاڑیوں میں گونجتی چلی گئی۔ پچھڑا لڑکی کے شانوں پر تڑپ رہا تھا اور وہ انتہائی کوشش کے ساتھ اس کی ٹانگوں کو بازوؤں میں جکڑے اسے قابو میں کیے ہوئے تھی۔ اب سر سے پاؤں تک اس کے سارے لباس کی لرزش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی طرح کپکپاتی ہوئی ٹانگوں پر اس نے چلنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ، پیر جما جما کر، مرتے ہوئے، جدوجہد کرتے ہوئے چوپائے کو جکڑے ہوئے، اٹھائے ہوئے، آدھے رستے تک پہنچتے پہنچتے وہ تھک کر رک گئی۔ اس کے چہرے سے سرخی غائب ہونے لگی۔ لیکن جلد ہی ٹانگیں چلاتے ہوئے پچھڑے کی گردن لٹک گئی اور وہ اس کے شانوں پر بے حس ہو گیا۔ اس کے سر میں سے خون، جو اب تک پتلی سی دھار کی شکل میں بہ رہا تھا، قطرہ قطرہ کر کے ٹپکنے لگا۔ لڑکی نے پھر چلنا شروع کیا۔

دولہا کے سامنے پہنچ کر اس نے آہستہ سے پچھڑے کو زمین پر رکھا اور اس کے نیچے سے سر نکال کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ زرد اور پُر جلال تھا۔ ماتھوں پر پسینے کے قطرے لیے دونوں بے خوف نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکتے ہوئے آمنے سامنے کھڑے رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو فتح کر لیا تھا۔

مسرت کے پر جوش نعروں، رائفل کے ان گنت فائروں اور آسمان پر بارود کی چمک کے درمیان نعیم جھلا کر منہ میں بولا :

”بیچاری لڑکی۔“ امیر خان نے غصے سے جواب دیا، ”اگر نشانہ خطا ہو جاتا یا ادھر ادھر لگ

جاتا تو میرے لڑکے کو وہیں ڈھیر کر دیتے ، کافر!“
 ”لا حول ولا قوۃ۔۔۔۔۔“ نعیم نے دہرایا۔

ملاح کے بعد دعوت شروع ہوئی۔ آگ کے الاؤ کے گرد دونوں قبیلے زمین پر بیٹھ گئے۔
 رائفل کے اکا دکا فائروں اور نضیریوں کی آواز چاروں طرف پہاڑوں میں گونج رہی تھی۔ ڈھول
 خاموش تھا، کڑا وقت گزر چکا تھا۔ بھاری جسم والا بڈھا، جو لڑکی کا باپ تھا، تین آدمیوں کی مدد
 سے تھال میں بھنا ہوا مسلم دنبہ اٹھائے ہوئے لایا اور امیر خان کے سامنے رکھ دیا۔ امیر خان نے
 تھال میں سے چمکتی ہوئی چھری اٹھا کر نعیم کی طرف بڑھا دی۔

”میرا مہمان میری طرف سے پہل کرے گا۔“ اس نے کہا۔ دوسرا بڈھا خوشدلی سے ہنسا۔

نعیم نے جھجکتے ہوئے، چھری کی نوک بھنے ہوئے سرخ، چکنے دنبے پر لگائی۔ گوشت گل
 چکا تھا لیکن ہڈی سخت تھی۔ وہ لال ہو ہو کر اور دل میں کوس کوس کر اس کی ٹانگ کاٹنے کی
 کوشش کر رہا تھا کہ امیر خان باتیں کرتے کرتے رک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”ارر۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔ اس نے نعیم کا ہاتھ پکڑ کر چھری خوشبودار جانور کے
 پیٹ سے لگائی۔ نعیم نے ایک جھٹکے سے ٹانگے لگا ہوا پیٹ چیر دیا۔ لونگ، دار چینی اور الائچی
 میں پکے ہوئے چاولوں کی مقوی، اشتہا آور خوشبو کا جھونکا آیا اور بھوکے مہمانوں کے دماغوں
 کو تر کر گیا، سفید، کنواری چربی میں تر تراتے ہوئے سرخ چاول طشت میں گرنے لگے۔ امیر
 خان چھری پکڑ کر ماہر فن کی طرح خستہ گوشت کو ہڈیوں سے علیحدہ کرنے لگا۔ جب وہ اس سے
 فارغ ہوا تو سب انگلیاں چاولوں میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگے۔ امیر خان مزے لے لے کر چاول کھا
 رہا تھا اور اپنے تئے عزیز کو اپنی اور نعیم کی پہلی ملاقات کا قصہ سنا رہا تھا جب اس کے سر پر
 کرخت، باؤلی ہنسی کی آواز گونجی۔

”ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔“ یہ ایک لمبے قد کا دبلا پتلا بڈھا تھا جس کی سرخ داڑھی بے تحاشا
 پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دنبے کی ایک ٹانگ چباتا ہوا مسلسل ہنس رہا تھا۔ کھانے اور ہنسنے کے مشترکہ
 فعل سے اس کی باپچھوں میں رال بہہ رہی تھی اور گوشت کے ریزے اس کی داڑھی میں اٹکے
 ہوئے تھے۔

”ابے او بڈھے۔ بڈھے دولہا کے جوان باپ، او۔“ وہ چبائی ہوئی لمبی ہڈی امیر خان کی
 ناک میں ٹھونس کر بولا۔ امیر خان، جو کسی دوسرے موقع پر اس کو بیساکھی کے ساتھ پیٹتا،
 پیچھے ہٹتا ہوا خوشدلی سے ہنسا۔ بڈھانٹے کے زیر اثر تھا۔ ”ارر ہا ہا ہا جوان دولہا کے بڈھے
 باپ، جب تیرے لڑکے کا ملاح ہو چکا تو میں نے پوچھا؛ ”دنبہ کھاؤ گے؟“ بولا: ”نہیں۔“ ارر
 ہی ہی ہی۔ بولا: ”نہیں۔“ میں نے کہا: ”چاول؟“ کہنے لگا: ”نہیں۔“ میں نے کہا: ”ارے

او بیوقوف باپ کے بیٹے ، قہوہ تو پی لے لے - " ہی ہی ہی ہا ہا ہا - پھر وہ دلہن کو اڑا کر لے گیا -
اڑا کر لے گیا - ہا ہا ہا - لے گیا لے گیا - "

امیر خان اور اس کا نیا رشتہ دار خوش اخلاقی سے ہنسے - لمبا بڑھا آسمان کی طرف منہ اٹھا کر
قمقمے لگاتا اور ہڈی کو سر کے گرد گھماتا ہوا آگے نکل گیا - جب وہ ان کی آواز کی حد سے باہر چلا
گیا تو دونوں نے اس کو برا بھلا کہا اور ناکارہ نشئی کے نام سے یاد کیا -

کھانا ختم کر کے وہ قہوہ پینے لگے - قہوہ کیسیلا اور خوشبودار تھا لیکن اس میں بھنے ہوئے
گوشت کو ہضم کرنے کی بے پناہ قوت تھی - آلاؤ میں دیر تک جلنے والی چکنی لکڑیاں ڈالی جا
رہی تھیں تاکہ شادی کی آگ تمام رات روشن رہے - جب قہوے کا دوسرا دور شروع ہوا تو دو
نوجوان اٹھ کر الاؤ کے گرد رقص کرنے لگے - انہوں نے شوخ رنگوں کے لمبے گھیر دار کرتے اور
شلواریں پہن رکھی تھیں اور ان کی کمروں سے کس کر پٹکے بندھے ہوئے تھے جن سے تنگی تلواریں
لٹک رہی تھیں - وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھینک کر اور پھلانگیں لگا لگا کر رقص کر رہے تھے -
چند چکروں کے بعد وہ سر کو ایک تیز اور مختصر جھٹکا دیتے جس سے ان کے لمبے سیاہ بال آنکھوں
پر آگرتے - پھر وہ دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجاتے اور گول دائرے میں لہرا رہے تھے -
نفیریوں کی نازک اور سرور انگیز موسیقی کی دھن پر ان کا رقص تیز تر ہوتا جا رہا تھا - آگ کی
روشنی میں ان کے چہرے دھک رہے تھے - یہ قبائلیوں کا بے ہنگم ناچ تھا - بے پناہ اور
لولے کا ناچ، جس سے ایک وحشیانہ ، بے باگ قوت اور جذبے کا اظہار ہوتا تھا -

رقص کی انتہائی تیزی میں آ کر دونوں نے کمر سے تلواریں کھینچ لیں - چمکدار دھات
آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی اور ہوا میں ان کی تیز کاٹ سے سائیں سائیں کی آواز پیدا ہونے لگی -
فضا میں وحشیانہ تاثر بڑھتا جا رہا تھا - یہ تنگی طاقت اور خوشی کا، بنیادی انسانی خواہش کا رقص
تھا - انتہائی تیزی سے چاروں طرف ہوا میں بجلی کی طرح کوندتی ہوئی تلواریں گھماتے ہوئے ، غیر
انسانی آواز میں لمبی لمبی چیخیں مارتے ہوئے ، غیض و غضب کی حالت میں ایک دوسرے کو
لٹکارتے اور مقابلے کی دعوت دیتے ہوئے اچانک ان کی تلواریں ٹکرائیں اور وہ لڑنے لگے -

اب یہ رقص نہ تھا، لڑائی تھی - دائرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آوازوں کا شور ایک
دم تھم گیا - یہ نظارہ ان کے لیے نیا نہ تھا - نوجوان خون کے جوش میں اکثر، بلاوجہ طور پر، ایسا
ہو جاتا تھا - بوڑھوں کے اشاروں پر چند ادھیڑ عمر کے مضبوط پٹھانوں نے اٹھ کر ناچنے والوں کو
گھیرے میں لے لیا - وہ اپنی پوری قوت اور فن کے ساتھ ، دانت پیس پیس کر ایک دوسرے
پر ضرب لگانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے نشے کے شعلے نکل رہے تھے -
گھیرے والوں نے جب موقع دیکھا تو دونوں کی کمروں میں ہاتھ ڈال کر جدا جدا کر کے لے گئے اور
ان کے ہاتھوں سے تلواریں پھینک لیں - دور تک وہ دونوں پلٹ پلٹ کر ، اچھل اچھل کر ایک

دوسرے پر جھپٹنے کی کوشش کرتے رہے۔
پھر دونوں قبیلے گلے ملے اور تحائف تقسیم ہوئے۔ آدھی رات کے بعد دونوں قبیلے جدا ہو کر ڈھول، سفیروں اور فائروں کے شور میں اپنے اپنے گاؤں کو لوٹ گئے۔

حجرے میں پہنچ کر نعیم تھکاوٹ اور ادھ بکے گوشت کے خمار میں جلد ہی سو گیا۔ صبح میں ابھی بہت دیر تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ مکان کے اندر مدہم سی روشنی ہو رہی تھی اور انسانی آوازوں اور گھوڑوں کے ہنہانے کا ملا جلا شور اٹھ رہا تھا۔ امیر خان کی چارپائی خالی تھی۔ نعیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ایک سایہ مکان میں سے اچھلتا ہوا برآمد ہوا۔ اندھیرے میں نعیم نے امیر خان کو پہچان لیا۔ وہ چپکے سے آگر بستر پر لیٹ گیا۔

”کیا بات ہے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”وزیر خان۔ اسے یونٹ سے بلاوا آیا ہے۔“ امیر خان نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

”ابھی؟“

”ہاں۔“

”کیوں؟“

امیر خان خاموش رہا۔ نعیم کو فوج کی ملازمت کی پرانی، تکلیف دہ یاد آئی اور اس نے دل میں کالی دی۔

”چلا گیا؟“

”پتا نہیں۔ میں چھوڑ کر گیا ہوں۔ شادی کی رات میں اس کا جانا پسند نہیں کرتا۔“ اپنے دکھ کو چھپانے کے لیے امیر خان نے سختی سے جواب دیا۔

نعیم پر پھر خمار چھانے لگا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب پتھریلی ڈھلانوں پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز پیدا ہوئی اور دور تک چلی گی تو اس کے دل میں جانے والے کے لیے افسوس پیدا ہوا۔ وہ آنکھوں سے چھت کو تکیے جا رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد امیر خان نے بستر پر بازو پھیلا کر پریشان آواز میں دو دفعہ پکارا :
”نعیم۔ نعیم!“ وہ اندر سے ہل چکا تھا۔ نعیم پر نیند طاری تھی۔

بہت سفید رنگت اور براؤن بالوں والا ایک شخص، جس نے ہاتھ کے کاتے ہوئے کھدر کا لباس پہن رکھا تھا، بازار کے عین وسط میں چبوترے پر کھڑا کھدر کی ایک سفید پٹی کو سر کے گرد گھما رہا تھا۔

”ہمک۔ ہمک۔ ہمک“ اسکے ارد گرد سے آوازیں اٹھیں۔

چبوترہ ایک سٹیج کی شکل کا تھا جو لکڑی کے کربٹوں اور بکسوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا اور ٹاٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس پر کھڑا ہوا شخص ایسے لوگوں میں سے تھا۔ جن کی عمر کا اندازہ آسانی

سے نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر بھی وہ نوجوانوں میں شمار نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کا چہرہ قدرے لمبو ترا اور نقش باریک تھے۔ قریب سے دیکھنے پر اس کی جلد بیشمار باریک باریک تلوں سے بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بادامی تھا۔

ایک دفعہ بولتے بولتے اس نے کھدر کی پٹی تیزی سے سر کے گرد گھمائی اور نمک کا نعرہ لگایا۔ اس کے گرد کھڑے ہزاروں کے مجمعے میں سے شور بلند ہوا۔ یہ نمک خاصیت میں روشن پور والے نمک سے بہتر اور قابل خورد تھا۔ لیکن شاید زندگی میں ایک دفعہ، اتنے اچھے، اتنے معمولی نمک کو دیکھ کر کسی کے دل میں اسے کھانے کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ وہ مقدس ہاتھوں کا تحفہ تھا۔

رنگوں کے شیدائی وہ لوگ شادی کے بھڑکیلے کپڑے پہنے سڑکوں پر اور گلیوں میں ایک ہی سمت میں رواں تھے، جدھر وہ کھدر پوش چبوترے پر کھڑا تھا۔ نوجوانوں کی آنکھیں سرمئی اور سوڑھے کڑوے درخت کی چھال سے عنابی ہو رہے تھے اور بوڑھوں نے داڑھیوں پر مکھن مل رکھا تھا۔ اونچی، تیکھی ناک، سفید رنگت اور عقابی نظروں والے ان مردوں نے، جو کڑی تربیتوں میں سے گزر کر آ رہے تھے، آج آخری اعلان سن کر اپنے اپنے کاروبار بند کر دیے تھے اور اس وقت قانون شکنی کا قدیم، جبلی جذبہ دلوں میں لیے، راستوں پر ادھر ادھر تھوکتے اور نسوار کی ڈبیوں کے شیشوں میں دیکھ کر داڑھیاں سنوارتے ہوئے قانون شکنی کے منظر کی طرف لوٹ رہے تھے۔

مرکز کے گرد پولیس کی بھاری تعداد تھی۔ جلسے میں جانے والے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے غرور اور نفرت سے ان کی طرف دیکھتے اور اونچی، کرخت آوازوں میں قہقہے لگا رہے تھے۔ پولیس والے ان کی نظروں سے بچنے کے لیے اوپر اوپر دیکھ رہے تھے۔

جب آخری بار کھدر پوش نے پٹی کو تیزی سے گھمایا اور لڑھیوں پر چاروں طرف گھوما تو ہجوم کا دبا دبا شور دفعتاً پھٹ پڑا اور سینکڑوں راشٹلیں ہوا میں اچھالی گئیں جن کی دھات نے دھوپ میں خیرہ کن چمک پیدا کی۔ یہ کایک ایک دوسرا کھدر پوش نوجوان، جو غیر معمولی لمبے قد اور ڈیل ڈول کا آدمی تھا، کود کر چبوترے پر آچڑھا۔ اس نے دونوں بازو ہوا میں پھیلائے اور پھر کی کی طرح پاؤں پر گھومنے لگا۔

”ایک فائر نہ ہو۔ ایک بھی فائر۔“ وہ چلایا۔

جب وہ رکا تو اس کی آنکھوں سے ملامت ٹپک رہی تھی اور ہونٹ کچھ کہنے کے لیے میتابی سے کانپ رہے تھے۔ وہ اسی طرح بازو پھیلائے مجمع کو دیکھتا ہوا کھڑا رہا۔ راشٹلیں جہاں تھیں وہیں پر رک گئیں اور ہزاروں انسانوں کے مجمع پر سکوت چھا گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ بازو نیچے گرا دیے۔

”کیا ہے؟ کیا مطلب ہے؟“ وہ چیخا، ”انہیں گھر رکھ آؤ۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟“

انہیں دیکھو۔“ اس نے ہاتھ لمبا کر کے پولیس کی طرف اشارہ کیا، ”اُن سے لڑنا چاہتے ہو؟“ وہ تمہارے بھائی ہیں۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا، میں؟ ایک بھی جان ضائع نہ ہو۔۔ ایک بھی جان۔“ اتہائی غصے میں رک رک کر بات مکمل کرنے کے بعد وہ ملامت بار نظروں سے دیکھتا ہوا چبوترے سے اتر گیا۔ کھسیائے ہوئے مجمع میں دبے غصے کی دھیمی، ہموار آوازیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئیں۔

دوسرے کھدر پوش نے پٹی میں باندھی ہوئی نمک کی ڈلی کو ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔
”کل شراب کی دکانوں پر پکٹنگ ہوگی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔ مجمع آہستہ آہستہ منتشر ہونا شروع ہوا۔

اس رات پشاور شہر میں نمک بنانے والے بہت سے والنٹیروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ نعیم اس وقت امیر خان کے گاؤں میں سو رہا تھا۔ اگلی صبح جب وہ شہر آ رہا تھا تو اسے پکڑ لیا گیا۔ پولیس کی سیاہ و سن بازار قصہ خوانی میں کابلی تھانہ کے سامنے آکر رکی۔ تھوڑی دیر کے بعد نعیم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ حوالات میں بیٹھا تھا۔

دوپہر سے پہلے قصہ خوانی بازار شہریوں سے کچا کچھ بھر گیا۔ وہ سوتے ہوئے اٹھ کر چلے آئے تھے۔ ان کی داڑھیاں بکھری ہوئی اور گرد آلود تھیں اور کپڑے میلے کھیلے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نیند اور دماغوں میں غصہ بھرا ہوا تھا کیونکہ وہ اپنی بندوقیں پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اس وقت اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہے تھے۔ آج بھی وہ بازار کے فرش پر ادھر ادھر تھوک رہے تھے اور ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے تھانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

تھانے کے گرد دور دور تک پولیس کا پہرہ تھا۔ وہ زیادہ تر پٹھان تھے اور پچھلے دن کی طرح آج بھی ان کے ساتھ آنکھیں ملانے سے احتراز کر رہے تھے، لیکن مستعدی سے اپنی جگہوں پر کھڑے سنگینوں اور آہنی زنجیروں کی مدد سے ہجوم کو روکے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر اچھلتے کودتے اور لڑکھڑاتے ہوئے ہجوم میں سے دبی دبی غراہٹ ابھرتی جو ایک مستقل غصیلی چنگھاڑ کی آواز اختیار کر لیتی، کہیں کہیں سے اکا دکا آوازیں آتیں: ”چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔“ پھر خاموشی چھا جاتی۔ بہت آہستہ آہستہ پولیس کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ کھلے موسم کے باوجود بے شمار انسانی جسموں کی رگڑ سے دن میں گرمی پیدا ہو گئی تھی۔ سورج ابھی نصف النہار پر نہ پہنچا تھا۔

پھر بھاری مشینوں کی دھیمی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایک طرف سے چند آمرڈ کالہس بازار میں داخل ہوئیں۔ ان کی بتیوں پر سیاہ غلاف پڑے ہوئے تھے۔ اور زندگی کا کوئی نشان باقی نہ چھوڑا گیا تھا۔ سیاہ لوہے کے وہ مہیب، اندھے جانور پوری رفتار سے ہجوم کے ساتھ ٹکرائے اور سست رفتار پٹھانوں کو کچلتے ہوئے آگے بھل گئے۔ دہشت زدہ شہری بازار چھوڑ کر گندے

پانی کی نالیوں میں اور دکانوں کے تختوں کے نیچے کھسنے لگے۔ جو اس پر بھی بیچ گئے وہ بند دکانوں کے تالے توڑ کر اندر چھپ گئے۔ پل کے پل میں بازار بے قابو شہریوں کے مجمع سے خالی ہو گیا۔ بکتر بند گاڑیوں نے تھانے کے سامنے رک کر پوزیشن لے لی۔ ان کے درمیان سڑک خالی تھی اور چند کچلے ہوئے انسانی جسم دور دور پڑے تھے۔ وہ پٹیوں پر سے، ٹانگوں پر سے اور سینوں پر سے، جہاں جہاں سے بکتر بند گاڑیوں کے پیہے گزرے تھے، تین تین فٹ زمین پر لیپ ہو چکے تھے اور ان کی سفید آنکھیں اور زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ انا فنا موت ان کے چہروں پر حیرانی کا تاثر چھوڑ گئی تھی۔

”مرچکا ہے!“ کالی پگڑی والے پٹھان نے سر نالی میں نیچا کرتے ہوئے کہا۔ وہ جسم بہت سی ٹکابوں کا مرکز تھا۔ گاڑی اسے کے پیٹ پر سے گزرتی چلی گئی تھی اور باہر پڑی ہوئی ریزہ ریزہ انتڑیوں کے ڈھیر میں سے دودھیارنگ کا سیال بہ رہا تھا۔ جس میں خون کی دھاریاں تھیں اور ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے جان تھا لیکن آہستہ آہستہ ہل رہا تھا اور حلق سے ایک مردہ کراہ نکل رہی تھی۔ دکان کے تختے کے نیچے نالی میں چھپے ہوئے چند پٹھان کان لگا کر اس کی آواز سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

”نہیں ہل رہا ہے۔“ دوسرے نے کہا۔

”مرچکا ہے۔“ پہلا درشتی سے بولا، ”تم نے ذبح کیا ہوا گوشت دیکھا ہے جو پھر کتا ہے؟“

”آواز سن رہے ہو؟“

پہلا سنی ان سنی کر کے تاسف سے سر ہلانے لگا۔ ”مرچکا ہے۔ کتے کی طرح۔ کتے کی طرح۔“

”گولی مار دوں؟“ دوسرے نے کہا، ”میرے پاس پستول ہے۔“

پہلے نے پریشان ٹکابوں سے سامنے دیکھا۔ پھر دوسرے نے دیکھا۔ کچھ دیر تک دونوں نال میں سے آنکھیں نکالے سامنے سے گزرتے ہوئے فوجیوں کو دیکھتے رہے۔

”خود بخود مر جائے گا۔“ پہلے نے سر ہلاتے ہوئے کہا

”ہاں۔ خود بخود مر جائے گا۔“ کچھ دیر کے بعد دوسرے نے دہرایا۔

سامنے فوجیوں کے دستے گزر رہے تھے۔ وہ مختلف جگہوں پر رک کر پوزیشن لے رہے تھے۔ پولیس والے اب پیچھے ہٹ کر تھانے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ بازار خالی تھا، لیکن ان دیکھی قوت سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ جیسے منہ بند کیتلی، جس میں پانی آہستہ شور کے ساتھ ابلتا ہے۔

دفعتاً مغربی سرے پر ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ ایک بکتر بند گاڑی کا پٹرول جل اٹھا۔ پھر اس میں پڑا ہوا میگنیزیم پھٹنے لگا۔ یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے، گاڑی کی چھت پھٹ

کئی ، اس میں بیٹھے ہوئے سپاہیوں کے ٹکڑے دور دور تک اڑ گئے اور سیاہ دھوئیں کے بادل آسمان کو اٹھنے لگے ۔ بارود اور جلتے ہوئے انسانی گوشت کی بو بازار میں پھیل گئی ۔

گاڑی کے نیچے ایک پٹھان کا سر نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ باہر آنے لگا ۔ اس کا چہرہ موت کی افیت سے بگڑ چکا تھا لیکن وہ اندھا دھند زمین پر بازو چلاتا ہوا سرک رہا تھا ۔ کافی دیر کے بعد وہ باہر آیا ۔ کمر سے نیچے اس کا دھڑ غائب تھا ۔ اڑ چکا تھا ۔

”الہی ۔ ابھی تک زندہ ہے ۔“ کسی نے خوف زدہ آواز میں کہا ۔

نالیوں میں ، تختوں کے نیچے اور دکانوں دروازوں کے پیچھے چھپے ہوئے پٹھانوں نے اس طرف سے نظریں پھیر لیں ۔

بارود کے دھماکوں سے شہریوں میں کھلبلی مچ گئی ۔ دھکم پیل میں ایک تنگے سر کا نوجوان پٹھان جس کے پٹے آنکھوں پر بکھرے ہوئے تھے، باہر اچھل پڑا۔ اس نے واپس نالی میں جانا چاہا لیکن وہاں ایک چوہے کی جگہ بھی نہ تھی ۔ جھکے جھکے اسے بازار پار کیا اور تختے کے نیچے گھسنا چاہا ۔ اس طرف سے اسے ایک زوردار دھکا پڑا اور ساتھ ہی کسی نے کرخت آواز میں خدا کی قسم کھا کر کالی دی ۔ وہ پلٹ آیا ۔ بازار کے درمیان ایک لمبے انگریز فوجی نے دانت پیس کر پہلو سے ریوالور نوچا اور ایک فٹ کے فاصلے پر گولی چلا دی ۔ گولی اس کی گردن میں لگی ۔ گردن کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر وہ جھکا حتیٰ کہ وہ اس کے گھٹنے اور ماتھا زمین پر لگ گئے اور انگلیوں کے درمیان سے خون باہر آنے لگا ۔ کئی لوگ اچھل کر پناہ گاہوں میں سے نکل پڑے ۔

”فائر ۔“ ایک آنکھ والے کیپٹن وڈ نے چیخ کر حکم دیا ۔

فوجی دستے کی پہلی قطار بے حرکت کھڑی رہی ۔ کانا کیپٹن ایک لحظے کو متعجب ہوا، پھر اس نے آنکھیں سکیڑیں ۔ ”گرہوالی رائفلز رجمنٹ ، کمپنی نمبر ۔ فائر ۔ فائر ۔“ وہ غصے سے لڑا اٹھا ۔ گرہوالی رائفلز کا دستہ اسی طرح کھڑا تھا ۔ چند لحظے تک افسر اور ماتحت ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے ۔ پھر قطار کے آخر پر ایک سپاہی نے منہ کھولا ۔ وہ بھاری سانولے چہرے والا شخص تھا جس نے ٹوپی آنکھوں پر گھینچ رکھی تھی ۔ اس نے لب ہلائے بغیر ، سامنے دیکھتے ہوئے غیر جذباتی آواز میں کہا :

”وہ نہتے ہیں ۔“

”میں حکم دیتا ہوں گولی چلاؤ ۔“ کیپٹن وڈ پاکلوں کی طرح چیخا، ”فائر“

گرہوالی دستے کے ہتھیار منجمد تھے، ان کے چہرے بے رنگ پتھر کے بنے ہوئے تھے ان کے ہونٹ سفید اور بچنے ہوئے تھے اور ایک سپاہی کے دل میں نہتے ، بے بس ہجوم پر حملہ کرنے سے جو متفر ہوتا ہے ان کے چہروں پر رقم تھا ۔ انگریز افسر نے اس آن لکھی عبارت کو صاف طور پر پڑھا ۔

انتہائی کوشش سے اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ پھر اس نے نظریں اٹھائیں اور دبی ہوئی، گہری آواز میں بولا: ”جنہوں نے حکم عدولی کی ہے باہر آ جائیں۔“

قطار میں سے چودہ سپاہی ایک قدم آگے نکل آئے۔ ایک سرے پر بھاری سانولے چہرے والا سپاہی اور دوسرے پر لمبے دبلے پتلے جسم والا خوبصورت وزیر خان تھا۔

”انہیں گرفتار کر لو۔“ کیپٹن نے حکم دیا۔ پچھلے دستے نے بڑھ کر ان کے ہتھیار لے لیے اور رائفلوں کے آگے لگا کر انہیں باہر لے آئے۔ قیدیوں کے چہروں پر رنگ جھلک آیا تھا اور وہ قدم ملائے بغیر، لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے۔

”فائر۔ فائر۔ فائر“

پچھلے دستے آگے آئے اور گولی چلنی شروع ہو گئی۔ اندھا دھند فائرنگ میں نالیوں اور تختوں کے نیچے چھپے ہوئے شہری چوہوں کی طرح نکل کر بھاگے اور ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے بازار مرتے ہوئے، کپکپاتے ہوئے اور زمین پر ایڑیاں مارتے ہوئے انسانوں سے اٹ گیا۔

حوالات کے دروازے کی سلاخوں میں سے نعیم نے بازار کے اس حصے میں، جو اسے دکھائی دے رہا تھا، بھاگتے اور گرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ جذبے کی انتہا پر پہنچ کر چند لمحے جو تعطل کے آتے ہیں ان میں اس نے سوچا:

”ان کی فصلیں تیار کھڑی ہیں۔“

(۲۸)

شاتتی نگر شہر سے باہر ایک چھوٹی سی صاف ستھری بستی تھی جیسی ہر ایک مل کے ساتھ ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے، الگ الگ بنے ہوئے پکی اینٹوں کے مکان جن پر چونے کی سفیدی کی گئی تھی۔ میچ میچ میں بغیر سفیدی کیے ہوئے مکان بھی تھے۔ جو بارش کے موقع پر دھل کر گہرے سرخ ہو جاتے اور تازہ پکی ہوئی مٹی کی خوشبو چھوڑنے لگتے۔ اسی موسم میں سفیدی والے مکان پر بارش کی سیاہ لکیریں پڑ جاتیں جو بد نما لگتیں اور دوبارہ سفیدی کرنی پڑتی۔

پانی کے نل مکانوں میں سے نکل کر دیواروں کے ساتھ ساتھ چلے گئے تھے اور آگے جا کر زمین میں دھنس جاتے تھے۔ دیواریں اونچی تھیں اور گلی میں گزرتا ہوا لمبے سے لمبا آدمی بھی صحن میں چلتی پھرتی عورتوں اور بچوں اور الگنی پر پھیلے ہوئے کپڑوں کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ سڑکیں چوڑی اور سیدھی تھیں اور ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر کاٹتی تھیں۔ دو ایک جگہ چوراہوں پر فوارے نصب کیے گئے تھے جن کے چاروں طرف سیمنٹ کے گہرے ٹینک بنے تھے۔ لیکن ابھی

پانی نہ چلا تھا اور ان میں کوڑا کرکٹ، آموں کی گٹھلیاں، کاغذ کے پرزے، ٹوٹے پھوٹے کھلونے اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی بیکار چیزیں بھری رہتی تھیں۔ شام کے وقت بستی کے بچے ان کی سیڑھیوں پر ایک دوسرے کی قمیضیں پکڑ کر آگے پیچھے بھاگتے اور منہ سے گاڑی کے انجن کی آواز نکالتے جاتے۔ جب وہ تھک جاتے تو سب سے اوپر کی سیڑھی پر چڑھ کر بیٹھ جاتے اور چھوٹی چھوٹی بیکار چیزیں، جن سے وہ تنگ آچکے ہوتے، نیچے پھینکتے رہتے۔ کبھی کبھی کوئی لڑکا کتے کا پلا پکڑ کر لے آتا اور سب مل کر اس کی کمر میں رسی باندھ کر نیچے فوارے میں لٹکا دیتے اور اس کی چیخوں کا مزہ لیتے۔ ان کی مائیں اور بہنیں دروازوں سے سر نکال کر دیکھتیں اور انہیں اس کام سے باز رہنے کو کہتیں۔

آس پاس دور دور تک کوئی درخت یا سایہ نہ تھا اور سلسلہ کوہ کی مدھم لکیر، جو عموماً حد منظر پر دکھائی دیتی ہے، ندارد تھی۔ چنانچہ سورج زمین پر سے طلوع ہوتا اور یکایک دھوپ کھلے دروازوں میں سے گزر کر صحنوں اور برآمدوں میں پھیل جاتی اور مرغیاں اور دوسرے پالتو پرندے دیواروں پر سے کود کود کر صحن میں پھرنے اور اپنے مکار اور مضحکہ خیز طریقے پر کیرے مکوڑوں کے تعاقب میں دوڑنے لگتے۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرے دھوپ کے سیلاب سے بھر جاتے اور اندر رکھی ہوئی گھریلو استعمال کی چیزوں پر گرد کے ذرات چکنے اور صاف کیے جانے کی یاد دہانی کرانے لگتے۔

گلیاں، جو عموماً صاف ستھری رہتیں، پختہ تھیں اور دونوں کناروں پر ڈھکی ہوئی گندے پانی کی نالیاں بہتی تھیں۔ سڑکوں کی مانند یہ بھی سیدھی تھیں اور ایک دوسرے کو عموداً کاٹتی تھیں۔ بستی کو اگر بلندی سے دیکھا جاتا تو یوں لگتا جیسے اقلیدس کے بڑے بڑے آلوں سے سیدھی لکیروں، دائروں، چوکوروں اور تکونوں کا خاکہ بنا دیا گیا ہو۔ اس میں گاؤں کی گندگی، گھملاہٹ، بے ڈھنگا پن اور ہم گیری نہ تھی۔ کہیں کہیں مکانوں کے آگے سبزہ اگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن پانی کے ناقص انتظام کی وجہ سے زیادہ تر کوششیں ناکام ثابت ہوئی تھیں۔

پھر بھی یہ بستی ہندوستان کی بہترین صنعتی بستیوں میں سے تھی اور گاہے گاہے حکومت کے ذمہ دار ارکان نچلے طبقے کی خوشحالی کا نقشہ دیکھنے کے لیے وہاں لائے جاتے تھے۔ اس سے پرے کپڑے کی مل تھی جو ابھی نامکمل تھی اور تیزی کے ساتھ مکمل کی جا رہی تھی۔ مل کے دوسری طرف ایک اور نسبتاً اور مختصر، بستی تھی، اس طرح کہ مل درمیان میں آجاتی تھی، اور دونوں بستیوں کے رہنے والے اپنے اپنے گھروں میں سے ایک دوسرے کے گھروں کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ صرف اس وقت جب سب لوگ مل میں کام کرنے جاتے وہ ایک دوسرے کی بستی کو دیکھ سکتے۔

چھوٹی بستی بڑے مکانوں پر مشتمل تھی اور سبزہ اگانے کی کوششیں زیادہ منظم طور پر عمل میں لائی گئی تھیں۔ چنانچہ اکثر مکانوں کے آگے چھوٹی چھوٹی باڑیں، اکا دکا موسمی پھول، گلے اور کھدرے کھدرے گھاس کے قطعے دکھائی دیتے تھے۔ مکانات جدید طرز پر بنے ہوئے تھے اور بغیر سفیدی کے تھے جس سے مکینوں کی سادگی اور عمدہ مذاق کا پتا چلتا تھا۔ چند ایک برآمدوں کے ستونوں پر میلین چڑھنا شروع ہو گئی تھیں۔

مل سے سیمنٹ کی پختہ سڑک شروع ہوتی تھی۔ جس پر ہر وقت موٹر کے ٹائیروں کے نشان پڑے رہتے تھے۔ جہاں پر سڑک ختم ہوتی تھی وہاں سے یہ بستی شروع ہوتی تھی۔ سب سے پہلے نصف دائرے میں بنے ہوئے پندرہ بیس کمرے آتے تھے۔ ہر ایک کمرے سے ملحقہ ایک ایک غسلخانہ تھا جس میں جدید طرز کا سامان مہیا کیا گیا تھا۔ ان کمروں کے سامنے ٹینس کھیلنے کا پختہ کورٹ تھا جس میں ہر وقت جالی لٹکی رہتی تھی۔ یہاں پر نوجوان، غیر شادی شدہ، تعلم یافتہ افسر رہتے تھے۔ اگلے مکانوں میں بڑے افسروں کی رہائش تھی، جو ادھیڑ عمر اور بڑھے عیال دار لوگ تھے۔

ہر ایک گھر کے آگے بہت سی خالی جگہ باغ کے لیے مخصوص کی گئی تھی جس پر ایک آدھ مالی دن بھر کام کرتا رہتا تھا۔ وہ عموماً ایک چھوٹے قد کا، مخنی سا بوڑھا کسان ہوتا جو خاموشی اور اداسی کے ساتھ رڑ کے لمبے لمبے پائپ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھتا اور گھاس کو پانی دیتا رہتا۔ جھک کر اور پاؤں پر بیٹھ کر کام کرتے رہنے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں ٹیڑھی اور کمزور ہو چکی ہوتیں اور کھریا ہاتھ میں پکڑے وہ سبزہ اگانے کی اتھک کوشش میں مصروف رہتا۔ باہر کے پھانک سے لے کر برآمدے تک لمبی ڈرائیو تھی جس پر بحری پچھا کر رولر سے زمین ہموار کی گئی تھی۔ گھر کے بچے اکثر کھیلتے ہوئے نظر آتے۔ وہ سفید رنگت اور سیاہ آنکھوں والے گول مٹول بچے ہوتے جو گرم موسموں میں صرف جانگے پہنے پانی کی ٹونٹیوں کے گرد کھیلتے اور جاڑوں میں شوخ رنگ اونی بنیائیں اور پتلونیں پہنے برآمدے کے فرش پر لکڑی کے گھوڑے اور موٹرس دوڑاتے پھرتے۔ وہ نیچے والی بستی میں کبھی نہ جاتے۔

ان گھروں کے پچھواڑے عام کوٹھیوں کے پچھواڑوں کی طرح تھے۔ اونچی نیچی باڑیں، سی پر پھیلے ہوئے چھوٹے بڑے کپڑے، گھڑونچی پر مٹی کے گھڑے اور لوہے کے گلاس اور لوٹے، مرغیاں اور ان کے ڈرے، پودینے اور ٹائریکیاریاں۔ دن کے دوران گھر کی مالکاؤں اور ملاؤں میں بہت کم امتیاز کیا جاسکتا سوائے شام کے وقت کے جب گھر کی عورتیں لباس تبدیل کر کے مردوں کے ہمراہ سامنے والے حصے میں شہلتیں اور کبھی کبھار مالی سے پوچھ کچھ کر لیتیں۔

وہاں تین مختلف قسموں کے لوگ رہتے تھے۔ بڑی بستی میں ہاتھ سے کام کرنے والے کاریگر اور چھوٹے موٹے کاموں میں ان کی مدد کرنے اور کام سیکھنے والے لوگ تھے، یہ زیادہ تر

وہ لوگ تھے جو درحقیقت کسان تھے اور خشک سالی و مزارعہ گیری سے تنگ آکر شہر میں محنت کرنے کے لیے آگئے تھے۔ ان میں بہت کم ایسے تھے جن کا آبائی پیشہ لوہاریا ترکھان کا تھا۔ باقی سب زمین کے بیٹے تھے اور زندگی کے چکر میں ایک بالکل انوکھی دنیا میں نکلے تھے اور اپنے آپ کو وہاں کا باشندہ بنانے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔

وہ سخت محنت کش مرد تھے اور دن رات میں دو وقت کھاتے تھے۔ ان کی غذا میں زیادہ مقدار اناجوں کی ہوتی جن سے وہ کام کرنے کے لیے حرارت اور قوت حاصل کرتے۔ چنے ان کی خوراک میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے جن کو ان کی عورتیں کئی مختلف طریقوں پر پکاتیں۔ گوشت کی کمی انڈے پوری کر دیتے جو تقریباً ہر گھر میں پالتو مرغیوں اور بطخوں سے حاصل کیے جاتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، چونکہ ہر کام کرنے کے دن ان کا بہت سا پسینہ نکل جاتا اس لیے وہ ہر دم نکھرے ستھرے رہتے۔ ان کی عورتیں اور بچے دن رات میں تین دفعہ کھاتے۔ یہ ان کی جسمانی صحت کی حالت تھی جسے قائم رکھنے کے لیے وہ پیسے کما لیتے تھے۔

لیکن زندگی جسمانی صحت کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، اور اس کے لیے خوش و خرم رہنا نہایت ضروری بات ہے۔ اسی بات کے لیے وہ تنگ و دو کر رہے تھے، بغیر جانے بوجھے ہوئے! روح کی وہ نکھراہٹ اور تروتازگی جو انسانی زندگی میں قوت اور سکون پیدا کرتی ہے، جو محنت کرنے والوں کو اطمینان بخشتی ہے، روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی، غیر اہم چیزیں جو خوشی دیتی ہیں، جو نہایت اہم ہیں، روز روز کے مقابلے، لڑائی جھگڑے، کبھی کبھی کے میلے، تہوار، دوست دشمن، ہولی، دیوالی، عاشورہ، عید، میل، شکار گپوں میں بے کار وقت خرچ کرنے کی طمانیت، گیت بانسری، مویشیوں کی منڈیاں، درخت جو موسموں کے ساتھ رنگ بدلتے اور ہوا میں جھومتی نالیاں جن میں پانی ہلکے شور کے ساتھ بہتا، یہ سب بے زبان، جاندار چیزیں، جو کسان کی زندگی میں رچ بس کر اس کا ایک حصہ بن جاتی ہیں، پیچھے رہ گئی تھیں اب سیدھے سیدھے اکیبے کھڑے مکان تھے جن کی اپنی حد بندی تھی؛ واضح اور متعین عمودی لکیریں، اور متوازی لکیریں جو علیحدگی کو ظاہر کرتی تھیں۔ درختوں سے محروم، بدرنگ فضا میں دھوپ چلچلاتی اور صاف ستھرے مکان اجاڑ معلوم ہوتے جن کی اپنی اپنی چھتیں تھیں، اپنے اپنے صحن تھے، اپنی اپنی زندگیاں تھیں، جب وہ راستے میں ملتے تو کسانوں کے اکھڑ دوستانہ لہجے میں ایک دوسرے کا حال پوچھتے، پر دلوں کی ہمسایگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے اپنے خول بنا گھروں میں واپس آ جاتے، اپنی اپنی منفرد دینا میں مستقل بدلتی ہوئی زندگی کی اذیت کے زیر اثر رہنے کے لیے۔ گاؤں کی وہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہوئی چھتیں اور حدیں، جہاں ہر کسی کو اپنی اپنی جائداد پر فخر ہوتا تھا پر جو لامحدود تھی، جس میں لا تعلق نہ تھی۔ ساجھے کے صحن اور ساجھے کی دیواریں، منڈیرویل، جن پہ ہر کوئی بیٹھ سکتا تھا اور جن کی ہر کوئی مرمت کر

احساس کمتری کے ہمراہ جا سکتے تھے ، ماتحت طبقے کے جلسے جلوسوں اور شادی میاہوں میں شدید احساس برتری کے ساتھ شریک ہوتے تھے ، برج کھیلتے تھے ، ڈریس سوٹ پہنتے تھے اور اپنی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے ۔

ایک درمیانہ اور سب سے زیادہ دلچسپ گروہ نوجوان افسروں کا تھا ۔ ان میں زیادہ تر غیر شادی شدہ تھے اور نئے نئے درس گاہوں سے نکل کر آرہے تھے ۔ سب کے سب بیحد چست ، مستعد اور صحت مند نوجوان تھے ۔ ان میں اکثریت ایسے نوجوانوں کی تھی جو نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے ، ایسے گھرانے جن کا کوئی پس منظر ، کوئی روایات نہیں ہوتیں ؛ جو فقط زندہ رہنے اور اپنے کنبوں کو پالنے کی جدوجہد ہی میں زندگیاں گزار دیتے ہیں ۔ ان نوجوانوں کی روحانی حالت خستہ تھی لیکن ان کے پاس چند خواب تھے جن کو پورا کرنے کی خاطر وہ ہم تن مصروف رہتے تھے ۔ ان میں سے چند ایک کو محکمہ صنعت کی طرف سے کچھ عرصے کے لیے یورپ بھی بھیجا جا چکا تھا اور ان کے خیالات خاصے ترقی یافتہ تھے ۔ یہ خوش لباس لوگ تھے اور ان کے کمروں میں صفائی کا عنصر نمایاں تھا ، ہر ایک شے موزوں جگہ پر دھری تھی اور باقاعدہ صفائی کی وجہ سے چمک رہی تھی ۔ ڈریسنگ ٹیبل اور کتابوں کی میز سب سے نمایاں جگہ پر تھیں جن پر کمرے میں داخل ہونے والے کی نظر سب سے پہلے پڑتی تھی ۔ بستر اور میز کا لیمپ کم نمایاں جگہ پر ، جوتے ایک کونے میں نصف پوشیدہ ، جن کو روز کا آنے والا یا دیر تک بیٹھا رہنے والا دیکھ سکتا تھا ۔ کپڑے کہیں منظر نہ آتے تھے ، جو یا تو بستر کے نیچے ٹرنک میں بند تھے یا الماریوں اور غسل خانوں میں ٹنگے ہوئے تھے ۔

کتابوں کے گرد پوش مضبوط اور خوش نما تھے اور ہر روز جھاڑ پونچھ کر رکھے جاتے تھے ۔ انہیں بے حد ترتیب کے ساتھ سائز وار سجایا گیا تھا ۔ ڈریسنگ ٹیبل کا قد آدم آئینہ اس زاویے پر موڑا گیا تھا کہ کتابوں کی قطاریں اس میں سے دکھائی دیں ۔ کتابوں کی اندرونی حالت خستہ تھی کیونکہ انہیں پڑھنے کے لیے کوئی وقت نہ تھا ، کوئی خواہش نہ تھی ۔ بعض کتابوں کو اندر سے دیکھ چاٹ چکی تھی اور وہ کھوکھلی اور ہلکی ہو گئی تھیں ۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ان نوجوانوں اور ان کی کتابوں کے وجود میں دردناک حد تک مشابہت تھی ۔

یہ بات نہیں کہ ان کے پاس فالتو وقت نہ تھا ۔ لیکن ان کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی ہو رہی تھی ۔ وہ اپنے ماضی کے گھٹیا پن سے خوف زدہ تھے اور کسی صورت بھی اپنے آپ کو اس سے منسلک رکھنا نہ چاہتے تھے ۔ عمر میں پہلی مرتبہ انہوں نے معاشی آزادی حاصل کی تھی ۔ معاشی سہولت کے ساتھ انہیں جسمانی طمانیت میسر آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی تجسس اور اضطراب ختم ہو گیا تھا ۔ ان کی روحیں آسان ہو رہی تھیں ۔ زندگی کا راستہ سیدھا اور بے خطر تھا جس پر ان کو بڑھے جانا تھا ، بے سمجھ سرگرمی کے ساتھ ۔ ان کی نظر میں یہ وہ لوگ تھے جو

اپنی پوزیشن کے اہل تھے اور زندگی میں کامیاب رہے تھے۔ ان کی تقلید میں یہ نوجوان ان کی عملی کامیابی، ان کا احساس کمتری و برتری، ان کا بازاری پن اور خود غرضی اور ان کی دانائی حاصل کر رہے تھے۔ یہ اپنے وجود کی اس سطح پر مکمل طور پر خوش تھے۔ جہاں زندگی کے مشکل تر مراحل میں سے گزرے بغیر منزل تک پہنچا جاسکتا تھا۔ یہ خوش باش لوگ تھے۔

ان کی مجلسی زندگی میں یکسر تبدیلی آچکی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر، جنہوں نے ابتدائی عمر میں یا درسگاہوں میں ادنیٰ عادات اور تربیت پائی تھی، اب تہذیب یافتہ ہوتے جا رہے تھے۔ تہذیب اور اخلاق کا ان کے پاس ایک بالکل نیا تصور تھا جو کہ ان کے لیے بیحد خوش کن تھا۔ ایک چھوٹے سے کلب میں وہ اکثر شاموں کو اکٹھے ہوتے، تاش کھیلتے اور گپیں مارا کرتے۔ وہاں پر وہ کبھی کسی ملکی، سیاسی یا معاشرتی مسئلے پر بہت زیادہ سنجیدگی یا جوش کے ساتھ بحث کرتے ہوئے نہ سنے گئے تھے۔ ضبط و اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا یا غیر ضروری طور پر گرجوشی کا اظہار کرنا ادنیٰ تربیت کو ظاہر کرتا تھا، چنانچہ سخت ناگوار تھا۔ وہ یہ کبھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ غیر تہذیب یافتہ کہلائیں، چاہے اس کی قیمت ان کو نفرتوں اور لمبی لمبی شخصی کدورتوں کی شکل میں ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ وہ ایک بہتر زندگی میں داخل ہو رہے تھے جہاں خارجی زندگی بے فکر اور آسان تھی، راستہ بے خطر اور پر آسائش تھا۔ لیکن شخصی زندگی میں قدم قدم پر دھچکے اور دل شکن انکشافات تھے، ضبط اور کبر نفس تھا۔ اس نے ان نوجوانوں کو مغرور اور زود رنج بنا دیا تھا۔ وہ ایک ایسے نئے چمکدار جوتے کی طرح تھے پہلے ہی روز کسی حادثے کی وجہ سے جس کے ٹانگے ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور پہننے والے کو ہمیشہ اسے احتیاط اور میانہ روی سے استعمال کرنا پڑتا ہے۔

ملک کے حالات یا عوامی جذبات سے کسی کو دلچسپی نہ تھی، کوئی خواہش نہ تھی۔ ان کا فالتو وقت زیادہ تر باتیں کرنے میں گزرتا ہلکی۔ پر اخلاق، خوش کن باتیں، افواہیں، پُر مذاق گپیں جن سے خود اطمینانی کا احساس پیدا ہوتا، لڑکیوں کی باتیں جو نہایت غیر شخصی اور ہلکے طنزیہ انداز میں کی جاتیں۔ ذاتی باتیں کوئی نہ کرتا اور ذاتیات میں دلچسپی کوئی نہ لیتا۔ اگر کوئی ذاتی مسئلہ پیش کرنا بھی چاہتا تو اس خیال سے رک جاتا کہ کہیں سننے والوں کی طبیعت پر بار نہ گزرے۔ ماحول میں ان کا ایک ہلکا پھلکا، بے تاثر وجود تھا، جیسے بجلی کے وہ کھمبے جن پر ابھی تار نہ لگانے گئے ہوں ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان اکا دکا چمکتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں، خشک اور بے جان!

عملی زندگی میں اور زیادہ تصادم تھا۔ کاریگروں اور مزدوروں کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ انہیں برتری حاصل تھی چنانچہ ان سے الگ تھلگ رہنا ضروری تھا۔ افسروں کی طرف سے ان کی بہت کم حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، کبھی کبھار رسمی دعوتوں میں گھروں پر مدعو کر لیے گئے اور

بس - (ان کے لیے مسرور ترین دن ہوتا جس روز وہ کسی افسر کے ساتھ چند منٹ کے لیے ذاتی نوعیت کی گفتگو کرنے کا موقع نکال لیتے -) اس طرح وہ ایک دردناک علیحدگی میں جا پڑتے تھے - لیکن یہ علیحدگی ان کے لیے اذیت ناک نہ تھی بلکہ ان کی خود پسند اور زود رنج طبع کی خوراک بن گئی تھی - آپس میں بھی ان کے تعلقات بڑے دلچسپ تھے - جن کو وہ اپنے سے زیادہ قابل اور ہوشیار سمجھتے ان کے ساتھ دوستی کرنے سے کتراتے اور حاسدانہ احترام کے ساتھ ان سے ملتے - زیادہ تر ان سے بے تکلف ہوتے جن کو اپنے سے کمتر، بے ضرر اور بیوقوف سمجھتے ایک بے روح مادی زندگی کے قواعد نے انہیں عورتوں سے زیادہ حاسد بنا دیا تھا - یوں ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ ان کا برتاؤ بیحد پُر اخلاق تھا -

تیز سفید دھوپ تھی جس سے آنکھیں دکھنے لگتی ہیں اور زمین بے رنگ اور کمزور ہو جاتی ہے اور کوئے پانی کے نلوں پر بیٹھے رہتے ہیں، بیٹھے رہتے ہیں، حتیٰ کہ لوگ ان کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور موسم کی شدت میں پرندے اور انسان کے قدرتی عناد کا احساس نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے - یہ مٹی کا موسم تھا، تنگے بے رنگ کھیتوں کا موسم -

طویل میدان کو پار کر کے علی نو تعمیر کمرے میں داخل ہوا - کڑی دھوپ میں سے گزر کر آنے کے بعد خشک دیواریں اور تازہ پلستر کی بو اسے خوشگوار معلوم ہوئی - اس نے لمبا پر سکون سانس لیا اور ہوا کی نمی کو حلق میں محسوس کیا - کمرے کے وسط میں کھڑے کھڑے اس نے خوشی اور سکون کے ساتھ بے مدعا چاروں طرف دیکھا - اس کے معدے کی جلن اب کم ہو گئی تھی اور وہ آسانی کے ساتھ اپنے وزن کو سنبھالے ہوئے کھڑا تھا - کمرے کی دیواروں پر نرم روشنی تھی جو آنکھوں کو اچھی لگتی تھی - فرش پر جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی اینٹیں، گھلا ہوا پلستر، لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے پڑے تھے - دو ایک جگہ ترکھانوں کے اوزار اور لکڑی کا سامان بکھرا تھا - کمرے میں سوائے علی اور ایک دوسرے شخص کے، جو کونے میں بیٹھا کھا رہا تھا، اور کوئی نہ تھا - اس نے کمرہ پار کر کے اوزار فرش پر رکھے اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی - نو اور دھوپ کے سیلاب کے ساتھ کھڑکی کے راستے باہر کا سارا منظر کمرے میں آ گیا - طویل اور چٹیل میدان، اور اسے تیز تیز پار کرتے ہوئے اکا دکا مزدور اور کاریگر جن کے سروں اور کندھوں پر سورج چمک رہا تھا - پرے فیکٹری کی عمارت جس کے برآمدوں میں بیٹھے وہ کھانا کھا رہے تھے اور پسینہ پونچھ رہے تھے سارا کام ایک دم تھم گیا تھا - یہ کھانے کا اور خاموشی کا وقفہ تھا -

”اسے بند کر دو -“ دوسرے شخص نے بے تعلق لیکن قطعی لہجے میں کہا -

علی نے کھڑکی بند کر دی - باہر کا نظارہ واپس چلا گیا - وہ ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ڈھانپ کر فرش پر بیٹھ گیا - بند آنکھوں کے سناٹے میں دیکھتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے اس نے اپنے آپ کو محفوظ اور آسودہ محسوس کیا - پھر اس نے ہاتھ ہٹائے اور آنکھیں جھپکنے لگا -

وہ اس کی طرف آدھی پشت موڑ کر بیٹھا ہوا کاہلی سے کھا رہا تھا۔ پشت سیاہ اور چوڑی تھی اور گوشت کی کمی کے باعث کندھوں کی مضبوط ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کا جبراً بہت لمبا اور بھاری تھا اور جگالی کرتے ہوئے میل کی طرح ہل رہا تھا۔ علی خاموشی سے بیٹھا اس غیر انسانی جبرے کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے دیکھتے ہوئے علی کو قوت کا احساس ہوا۔ سخت خوراک ٹوٹ کر، پس کر، ذرات میں تبدیل ہو کر لعاب بن کر گلے سے اتر رہی تھی اور جبراً کاہلی سے، لیکن مشینی باقاعدگی اور قوت کے ساتھ چل رہا تھا۔

کھانا ختم کر کے وہ مڑا۔ ”لو۔“ اس نے بچی ہوئی روٹی علی کی طرف بڑھائی۔

”مجھے بھوک نہیں۔“ علی نے کہا۔ وہ تعجب سے ہنسا اور روٹی کا ٹکڑا کتے کے آگے

پھینک دیا۔

”آدمی کا حق پہلے ہے۔ خیر۔“ وہ کھانے کی پوٹلی باندھتا ہوا بولا ”کیوں؟“ علی نے

پوچھا۔

اس نے سر اٹھایا اور ایک سادہ، احمقانہ ہنسی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ علی نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا لیکن اس کا بے تکلف ہمدردی کا رویہ اس کے جی کو اچھا لگا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ پوٹلی کے ساتھ ہونٹ صاف کر رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا مضبوط چہرے اور سادہ آنکھوں والا شخص تھا۔ اس کے سیاہ پٹھے دار جسم سے مشقت کی آفتوں کا اظہار ہوتا تھا۔ علی دیوار سے ٹیک لگا کر کمرے میں دیکھنے لگا۔ وہ دل میں سن محسوس کر رہا تھا اور خوش تھا۔

”میں ہر روز نئے بنے ہوئے کمروں میں آجاتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کیوں؟“

”گرمی سے بچنے کے لیے۔“

”آہ۔ آہا۔“ ادھیڑ عمر شخص کے ہونٹوں سے مختصر اور بے اختیار، ابلتی ہوئی ہنسی

نکلے، ”عجب بات ہے۔ عجب!“

علی اس کو دیکھتا رہا۔

”آہا۔“ وہ پھر ہنسا، ”جب کمرے بننے بند ہو جائیں گے پھر؟“

”پھر؟“ علی سوچنے لگا، ”پھر تو جاڑے آجائیں گے۔“

اس کے منہ سے پھر وہی مختصر، ابلتی ہوئی ہنسی پیدا ہوئی۔ ایسی ہنسی پکی عمر کے جاہل

محنت کش لوگوں کے لیے غیر معمولی بات تھی۔ ”یہ اچھے دل کا آدمی ہے۔“ علی نے سوچا۔

”بڑی عجب بات ہے۔ بڑی عجب۔“ اس نے دہرایا۔

”کیا؟“

”اس پلے کو میں روز روٹی دیتا ہوں۔ پر ایک روز میں چلا جاؤں گا تو پھر؟“
 ”کہاں؟“
 ”گھر۔“

”گھر؟“ علی نے حیرانگی سے دھرایا۔ پھر اس نے دیوار کے ساتھ سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں اور زیر لب بڑ بڑایا، ”میں گھر نہیں گیا۔ اس بار۔“
 پلٹا اگر اس کا پاؤں چاٹنے لگا تھا۔ اس نے آنکھیں بند رکھیں اور یاد کیا کہ اس دفعہ فصل کے موقع پر اس کو چھٹی نہ ملی تھی اور گھر پر کوئی مرد نہ تھا اور اسے اطلاع ملی تھی کہ کاٹنے والوں نے اس کی ماؤں کو بہت کم حصہ دیا تھا۔ اس کے معدے میں پھر ہلچل اٹھی۔
 ادھیڑ عمر کا شخص غور سے اس نوجوان آدمی کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑے ہوئے تھے اور رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں مگر جس کے چہرے پر ابھی تک نوجوانی کا بانگن تھا۔ اس نے آہستہ سے علی کو کندھے پر چھوا۔
 ”تم بیمار ہو؟“

”میں؟ نہیں۔“ علی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔
 ”میں نے بہت سے کسانوں کو بیمار دیکھا ہے، آج کل۔“
 ”میں کسان نہیں ہوں۔“ علی نے کہا۔

”کسان بیمار نہیں ہوتا۔ اسے بیماری راس نہیں آتی۔ جب وہ بیمار ہوتا ہے تو مر جاتا ہے۔ پر پتا نہیں،“ اس نے فکر مندی سے ہاتھ پھیلانے، ”اتنی زیادہ مردنی شکل سے تو تم کسان ہی دکھائی دیتے ہو۔“
 ”میں مستری ہوں۔“

وہ بے یقینی سے ہنسا۔ ”پھر بھی۔ پھر بھی، تمہاری عمر میں یہ تردد۔“
 علی باہر دیکھنے لگا۔ دھوپ کی سفید چادر میدان میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر لیا۔

”تم سورج میں نہیں دیکھ سکتے؟“ دوسرے شخص نے پوچھا۔

”تم کہاں کام کر رہے ہو؟“ علی نے پوچھا۔

”چکھمی دروازے پر۔“

”کیا کر رہے ہو؟“

”کھود رہے ہیں۔ بجلی کے لیے۔“

”تمہارا جسم کھودنے کے لیے اچھا ہے۔“ علی نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے

کہا۔

اس نے منہ میں ہنس کر کوئی جواب نہ دیا لیکن علی باہر دھوپ میں ، اور اندر کمرے میں ، لکڑی اور اینٹوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا ۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے شخص نے ٹانگیں سمیٹیں اور میلچہ کندھے پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا ۔

”پھر بھی ، اس عمر میں یہ تردد ۔ خوراک زیادہ کر دو ، خوراک ۔“ اس نے میلچے کے دستے کے سرے پر پوٹلی باندھی اور باہر نکل گیا ۔

اس کی پشت چوڑی تھی اور اس میں ہلکا سا خم تھا ۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے چل رہا تھا اور سیلچ کے سرے پر خالی پوٹلی ہل رہی تھی ۔ کتنا کچھ دور تک اس کے پیچھے پیچھے گیا ، پھر واپس آگیا ۔ جب میدان کے سرے پر وہ مڑ کر اوجھل ہو گیا تو علی ، جو خالی خالی نظروں سے اسے تک رہا تھا ، اچانک بے چین ہو گیا ۔ وہ اب پورے طور پر اس کے ذہن میں آگیا تھا ۔ جھکی ہوئی چوڑی پشت پر اس کی سادہ خوش کن مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی ۔ اُس کا جی چاہا کہ پھر اُس کو دیکھے ۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا جو اُو کے زور سے کھل گئی تھی ۔ وہ اب بھی جا رہا تھا ، اسی بھاری ، تھکی ہوئی چال کے ساتھ ۔ سیلچ کا سرا اور خالی پوٹلی سرے اوپر نکلے ہوئے تھے ۔ علی دیر تک متلاشی نظروں سے دیکھتا رہا لیکن اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اور سورج اس کے کندھوں پر چمک رہا تھا ۔ دور سے اس کی دھیمی ، مستقل چال کا نظارہ دیکھنے والے میں تھکن پیدا کرتا تھا ۔ علی کھڑکی سے ہٹ آیا ۔ وہ اس قدر اکیلا تھا ۔ تنہا ۔ یہ حیران کن خیال پہلی دفعہ اس کے دل میں پیدا ہوا ۔

اب میدان بہت سے لوگوں سے بھر گیا تھا جو مختلف سمتوں میں آ جا رہے تھے ۔ ان میں سے کسی کو کام کی جلدی نہ تھی ۔ وہ محض سورج کی سختی کی وجہ سے تیز تیز چل رہے تھے ۔ جب وہ ٹھنڈے کمروں اور سایہ دار جگہوں میں اپنے اپنے کام پر پہنچتے تو بے مدعا خلا میں گھورتے ، اوزاروں کو بے دلی سے اٹھاتے اور رکھتے اور کام شروع کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جو کاہلی اور ستانے کی خواہش جسم پر قبضہ پالتی ہے اس کے زیر اثر وہ تھوڑی دیر کے لیے بیکار ہو جاتے ۔

کمرے میں اور کمرے کے باہر خاموشی اور خلا کا سحر ٹوٹ چکا تھا ۔ علی کے چاروں طرف لوگ گھوم رہے تھے اور اونچی سست آوازوں میں باتیں کر رہے تھے ۔ کھڑکی کے قریب کھڑے کھڑے اس نے باری باری سب کو دیکھا ۔ واضح طور پر سب کی موجودگی کو الگ الگ محسوس کیا ، خود ان کے وجود سے بے تعلق رہا ۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ خود باہر کے نظارے میں شامل تھا اور کھڑکی کے باہر کھڑا کمرے میں دیکھ رہا تھا ۔ یہ حیران کن محسوسات کا دن تھا ۔ وجود اور احساسات کا یہ عالم اس کی سمجھ سے بالاتر تھا ۔

”بند کر دو ۔ اسے بند کر دو ۔“ چند آوازیں آئیں ۔ علی نے جھک کر اوزار اٹھائے اور

باہر نکل گیا۔ پیچھے کمرے میں کسی نے کالی دی اور پٹاخ سے کھڑکی بند کر دی۔ میدان میں سورج کی چمک کے ساتھ ساتھ خواب کا وہ عالم تیزی سے گزر گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے معدے کی مخصوص جلن بڑھنی شروع ہوئی۔ وہ اس بڑے ہال میں داخل ہوا جہاں وہ کام کر رہے تھے۔ ہال خشک اور تپا ہوا تھا اور بے کواڑ کھڑکیوں سے دھوپ اندر آرہی تھی۔ لمبائی کے رخ چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر تھکوں کی موٹریں نصب کی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے چبوترے کے پاس رک کر ادھ کسے کابلے کو دیکھنے لگا جس کو وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کے آگے اور پیچھے تمام لوگ کام شروع کر چکے تھے۔ دھات کے ٹکرانے اور ایک ساتھ مل کر زور لگاتے ہوئے خلاصیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ چبوترے پر بیٹھ کر کابلہ کسے لگا۔ چابی گھماتے گھماتے اس نے کسے ہوئے کابلوں کو گنا۔ صرف پندرہ تھے۔ یہ اس کا اس وقت تک کام تھا۔ شام سے پہلے پہلے اسے چالیس کابلے کسنا تھے۔ وہ تیزی سے چابی گھماتے لگا۔ فٹرنے دور سے علی کو کام کرتے ہوئے دیکھا اور موٹے موٹے کھردرے ہاتھ لٹکا کر چلتا ہوا اس کے سر پر اکھڑا ہوا۔

”کتنے ہوئے؟“

علی اس کرخت آواز سے مانوس تھا۔ ”پندرہ۔ استاد۔“ اس نے کہا۔

”بس؟ پندرہ؟“ فٹرنے چیتا۔

”پندرہ۔“ علی نے ڈھٹائی سے دھرایا۔

”آ۔ آ۔“ فٹرنے مایوسی سے ہاتھ پھیلائے۔ اس کا مصنوعی غصہ غائب ہو چکا تھا۔

”تو لوہار کا لونڈا ہے، ہیں؟ لعنت ہے۔ تو اپنے باپ پر حرف بد لیا ہے۔ تجھ سے تو یہ چار کا لونڈا اچھا ہے جس نے اپنے خاندان کا نام اونچا کیا ہے۔“ وہ اگلے چبوترے کے پاس سے گزرتے ہوئے چار لونڈے کی پسلیوں میں انگوٹھا چھو کر بولا۔ لڑکا، جو نو عمر اور تازہ وارد تھا، سرخ ہو گیا اور دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

علی مشین کی سی تیزی اور باقاعدگی سے کابلے کستا رہا اور آہستہ آہستہ اس کے سینے کی سوزش بڑھتی گئی۔ جب بتیس کابلے ہو گئے تو اس نے سر اٹھایا۔ چار موٹریں چھوڑ کر ایک لونڈا فٹرنے کی ٹانگوں سے چمٹا ہوا تھا۔ اس وقت وہ استاد کی پتلون اتارنے کی فکر میں تھا جو کہ ان سب کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے اس کی ٹانگوں پر ہاتھ رکھ کر اصرار کرتے جاتے اور فٹرنے، سب کچھ جاتے بوجھتے ہوئے، آگے آگے چلنے کی کوشش کرتا رہتا۔ اس طرح وہ اس کی پتلون نیچے گرانے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس وقت وہ لڑکا بہانے خوری سے مسکین سی شکل بنائے منتیں کر رہا تھا اور استاد اس سے ٹانگیں چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پتلون لونڈے کے ہاتھوں میں آگئی جسے وہ نیچے گرا کر سرپٹ بھاگا۔ فٹرنے اونچی آواز

میں کالیاں دینے اور پتلون کسنے لگا۔ سب اپنے اپنے منہ قمیضوں میں چھپا کر ہنسنے لگے علی کو اپنی ہنسی کی آواز سینے کی دیواروں کے ساتھ بجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جب فٹر چکر لگاتا ہوا وہاں سے گزرا تو وہ چابی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں چائے پینے جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اے۔ ابھی تو آئے ہو؟“

”میں نے کچھ نہیں کھایا۔“

فٹر نے شاید پہلی دفعہ اسے غور سے دیکھا اور چونک پڑا۔ ”علی۔“ اس نے آہستہ سے

اسے کندھے پر چھوا، ”کیا بات ہے؟“

”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”تم رات کو سوتے نہیں؟“

”مجھے بھوک لگی ہے۔“ علی نے دہرایا۔

”جاؤ۔“ اس نے دوبارہ اضطراب سے علی کے کندھے کو چھوا، ”آرام کرو۔ جاؤ۔“

باہر نکلتے ہی اس کی بھوک غائب ہو گئی۔ میدان میں دھوپ کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا اور اندر سے اٹھنے والے شور کے باوجود باہر گرما کی دوپہر کا سناٹا تھا اور جمود قائم تھا۔ لوہے کے پائپوں اور بند مشینری کے کرہٹوں کے پاس سے گزر کر وہ کینٹین کی سیرھیاں چڑھا۔

”ایک چائے دو۔“ اس نے کنکریٹ کے کونٹر پر جھک کر کہا۔

”بیٹھ جاؤ علی۔ باہر گرمی پڑ رہی ہے۔“ کینٹین والے ادھیڑ عمر کمزور شخص نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بیچ پر بیٹھ گیا۔

”کیسا چل رہا ہے؟“

”ٹھیک چل رہا ہے۔“ علی نے چائے کی سرکی لی۔

”اتنے سال ہو گئے۔“ کینٹین والے نے مایوسی سے کہا، ”کب تک چلے گا؟“

”کیا؟“

”فیکٹری بن ہی نہیں پاتی۔“

گرمی سے گھبرائی ہوئی چند چڑیاں کمرے میں چکر لگا رہی تھیں۔ وہ پھر بولا:

”تمہارے کوئی بچہ ہے؟“

علی نے شفقی میں سر ہلایا۔

”کے سال ہوئے؟“

”پتا نہیں۔“

”پتا نہیں؟“ ادھیڑ عمر کا کمزور شخص منہ کھول کر ہنسا علی نے سرخ سرخ آنکھیں نکال کر

اسے دیکھا اور چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اتار کر باہر نکل آیا۔
 ”یہ گنوار لوگ جو بھوکے مرتے ہوئے کام کی تلاش میں آتے ہیں۔“ کینٹین والے نے
 علی کے پیچھے دیکھتے ہوئے ایک اور گاہک سے کہنا شروع کیا۔

لوہے کے پائپوں اور مشینری کے کرہٹوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے کان میں
 دور سے خلاصیوں کے گروہ کی دھیمی آوازیں آنی شروع ہوئیں: ہٹی سا۔ ہٹی سا۔۔۔ بے دلی
 سے قدم رکھتا ہوا وہ اپنے چبوترے کے پاس آکھڑا ہوا۔ زیادہ تر لوگ کام چھوڑ کر چبوتروں
 کے پیچھے چھپ کر بیٹھے ہوئے گپیں مار رہے تھے۔ استاد دوسری لائن کے فٹر کے پاس بیٹھا
 چھوٹا سا جیبی حقہ پی رہا تھا۔ چند ایک محض آواز پیدا کرنے کو دھات سے دھات ٹکرا رہے تھے
 اور باتیں کرتے جا رہے تھے۔ خلاصیوں کا گروہ ایک بھاری موٹر کورسے سے باندھ کر اندر لا رہا
 تھا۔ ہٹی سا۔ ہٹی سا۔ بولی دینے والے کی آواز خواب آلود تھی۔

پھر خلاصیوں کی آوازیں اچانک تیز ہو گئیں۔ دونوں فٹر گھبرا کر اٹھے اور حقہ جیب میں ڈال
 کر قطاروں کے بیچ دوڑنے لگے۔ مزدور اور کاریگر اپنے اپنے اوزاروں کی طرف لپکے۔ کام کا
 شور ایک دم بڑھ گیا۔ دروازے میں سے سرخ چہرے والا بڈھا انگریز چیف انجینئر داخل ہوا۔
 وہ ہر وقت اک بگولہ رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹھگنا فورمین تھا۔ چھوٹا سا گنجا سر سانپ کی
 طرح تیزی سے چاروں طرف گھما کر چلتا ہوا وہ اندر آیا، ”ہے۔ ہے“ کر کے فٹروں کو پاس بلایا
 اور ہال کے وسط میں رک کر کام کا جائزہ لینے لگا۔ پھر فورمین کو مخاطب کر کے اس نے فٹروں
 کے سروں کے اوپر بازو چلائے اور نامکمل کام کی طرف اشارہ کر کے پانچ منٹ تک تیز خشک آواز
 میں چیختا اور غصے سے ناچتا رہا۔ موٹروں کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک لڑکے کے
 چوتڑوں پر بوٹ کی ٹھوک ماری اور چیخا: ”ہے جالڈی کرو۔“ لڑکے نے چبوترے کا سہارا لے
 کر آہستہ سے کالی دی۔ علی بازو لٹکائے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ کھڑا رہا حتیٰ کہ بڈھا انگریز اسی طرح
 چیختا ہوا اس کے پاس سے گزر گیا۔ اس نے خاموشی سے دانت پیسے۔

کچھ دیر تک کام تیزی سے ہوتا رہا۔ پھر نوجوان انجینئر مجید داخل ہوا۔ اس کا قد لمبا
 اور رنگ سانولا تھا۔ انگریزی لہجے میں ”ہے۔ ہے“ کر کے اس نے فٹروں کو بلایا، چند منٹ
 تک بازوؤں کو تیزی سے ہوا میں حرکت دیتا اور چیختا رہا پھر کہنیاں باہر نکال کر چلتا ہوا نکل گیا۔
 اس کے لبوں پر ہلکی سی اطمینان بخش، فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ کچھ دیر کے بعد دونوں فٹر پھر
 حقہ پی رہے تھے اور لونڈے چبوتروں کے پیچھے چھپے گپیں مار رہے تھے۔

اوزاروں کو وہیں چھوڑ کر علی باہر نکل آیا۔ معدے کی جلن کی جگہ اب ایک دھیمی،
 مستقل، شدید بے دلی اور بدمزگی نے لے لی تھی۔ ایک ایسی کیفیت جو آسانی سے سہاری نہ
 جاسکنے کے علاوہ آسانی سے بیان بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ میدان کو پار کرتے ہوئے اسے ایک

عجیب و غریب خیال آیا : کہ جیسے وہ اکھڑے ہوئے نوجوان درختوں کے سائے میں سستا رہا ہے اور درخت روز بروز خشک ہوتے جا رہے ہیں ۔

دھوپ میں سر جھکا کر وہ اکیلا چلتا رہا ۔ دوپہر زرد پڑ چکی تھی ۔ لیکن آسمان ابھی گرم اور مٹیلا تھا ۔ چیلیں اوپر چلی گئی تھیں اور دور سے ان کی چیخوں کی آواز دوپہر کے آخری سناٹے کو سنسان تر بنا رہی تھی ۔ کوے ، جو درختوں اور دیواروں کے پرند ہیں ، سائے میں پانی کی ٹونٹیوں کے گرد چوکس بیٹھے تھے جب کہ علی کڑی ، مستقل چال سے ان کے قریب سے گزرتا رہا ۔ کہیں کہیں بچے ، جن کے والدین مصروف اور لاپرواہ تھے ، کووں کی طرح دیواروں کے سائے میں بیٹھے آہستہ آہستہ کھیل رہے تھے ۔ کبھی کبھی کوئی بچہ اس اکیلے جاتے ہوئے شخص کو پہچان کر اٹھکی سے اشارہ کرتا : ”وہ علی ہے“ اور پھر کھیلنے لگتا ۔

دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے عائشہ سو رہی تھی ۔ اس کے کمال اور چھاتیاں پسینے سے تر تھیں اور ذرا سے کھلے ہوئے منہ میں سے خراٹوں کی آواز آرہی تھی ۔ علی دروازے میں کھڑا آشنا ، لاتعلق نظروں سے اس کو دیکھتا رہا ۔ پھر اس نے زور سے دروازہ بند کیا ۔ عائشہ جاگ اٹھی ۔

”آج تم دوپہر کو نہیں آئے؟“ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی ۔ وہ چھریرے بدن کی لمبی سی لڑکی تھی جس کا رنگ گندمی اور جلد صحت مند تھی ۔ ”میں میٹھی انتظار کرتی رہی ، پھر پتا نہیں کب سو گئی ۔ بڑی گرمی لگ رہی تھی ، تم نے کھانا کھا لیا؟ سب تو آئے تھے ۔ آج تم کو بڑا کام تھا؟ میں نے رحیم سے پوچھا تو اس نے کہا کہ اس نے تمہیں ادھر آتے دیکھا تھا ۔ پھر تم کہاں چلے گئے؟ ایک مرغی کو کالو اٹھا کر لے گیا تھا ۔ کالو کا بچہ ۔ بلا تم اسے مار کیوں نہیں دیتے؟ پتا ہے ان گرمیوں میں ہم نے ایک بلا مارا تھا ۔ گاؤں میں جب روشن آغا کے کتے ۔“

”مجھے کھانا دو ۔“ علی نے جھلا کر کہا ۔

وہ باتیں کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی ۔ ”تم نہا لو تو اچھا ہے ۔ کھا کر نہاؤ گے تو گرم سرد ہو جاؤ گے ۔ کھانا تو میں نے تیار کر دیا تھا ۔ جب ایک پہر دن ۔“ آہستہ آہستہ اس کی آواز بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گئی ۔ علی خالی نظروں سے دیواروں کو دیکھتا ہوا چارپائی پر بیٹھا رہا ۔ جب وہ کھانا لے آئی تو اس نے پاؤں اوپر کھینچ کر ٹانگیں سمیٹیں اور کھانے لگا ۔

”مکھیاں ٹڈی کی طرح آتی ہیں ۔“ عائشہ اڑاتے ہوئے بولی : ”ٹڈی یہاں کبھی نہیں دیکھی ۔ شادی سے پہلے سال جب میں روشن پور آئی تھی تو کتنی ٹڈی آئی تھی ۔ گاؤں کی ساری لڑکیاں ٹڈی پکڑنے کو نکل آئی تھیں اور سارے مرد فصلوں میں گھس کر شور مچا رہے تھے اور ہمیں دیکھ کر تم کھیت سے نکل آئے تھے اور تم نے مجھ سے کہا تھا : ”ٹڈی مت کھانا ۔ عورتوں کے

لیے اچھی نہیں ہوتی۔ بس مرد کے لیے اچھی ہوتی ہے۔“ اس وقت میں راول کی مانگ تھی۔ اس نے ہمیں باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ راول آج کل کہاں ہے؟ آج بارش آئے گی۔ آسمان تپ رہا ہے۔ اور چیلوں کی آواز تم نے سنی ہے؟ پانی مانگ رہی ہیں۔ دور اوپر۔ وہ دیکھو آج کریلے اچھے نہیں ہیں؟ آج پودینہ نہیں تھا۔ رحیم کے بیٹے کے پیٹ میں مروڑ اٹھا تھا وہ سارا توڑ کر لے گئے۔ تم نے ہی کہا تھا رحیم کے گھر سے جو کچھ مانگیں دے دیا کرو۔ آج مکھیاں بھی زیادہ ہیں۔ سویرے کچھ لوگ آئے تھے۔ جو مسجد کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے۔ میں نے اندر سے کنڈی لگا کر مگر کر لیا۔ (علی نے کھانا کھاتے ہوئے دل میں اسے گندی سی کالی دی۔) دیر تک وہ دروازہ توڑتے رہے، پھر چلے گئے۔ ہم کوئی مسجد میں جاتے ہیں جو چندہ دیں۔ کالو کے پیچھے میں بھاگی تھی مگر وہ تیز نکلا۔ میں کتنا تیز بھاگتی تھی تمہیں یاد ہے؟ میرا جی گاؤں جانے کو کرتا ہے یہاں پر چڑیاں نہیں ہوتی۔ ایس؟“

علی کو بھوک نہ تھی مگر کھائے جا رہا تھا۔ ہر ایک نوالے کو چبا کر، باریک لعاب بنا کر ٹھل رہا تھا۔ جب اس نے پانی پی کر برتن عائشہ کو پکڑائے تو بھی وہ باتیں کر رہی تھی۔ وہ ایک بے تمیز کسان لڑکی تھی جس کی زندگی کی واحد خواہش اپنے مرد کو خوش کرنا تھی، اس قوی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اسے باتیں کرنے کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔ جب وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو علی چارپائی پر لیٹا چھت کو تک رہا تھا۔ وہ پھر باتیں کرنے لگی۔

”دروازہ بند کر دے۔ یہ روشنی۔“ علی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔

بولتے بولتے اس نے دروازہ بند کیا۔

”بک بک بند کر۔ ادھر آ۔“ علی نے کہا۔

وہ گنوار عورتوں کی طرح آگر اس کے پاس بے سدھ لیٹ گئی۔ علی اس کی لمبی، گول ران پر ہاتھ رکھے لیٹا رہا، لیٹا رہا، انتظار کرتا رہا، پھر یکایک اندھیرے میں ہنسا اور اس پر جھک گیا۔ ہنسی کی آواز مصنوعی اور کھوکھلی تھی۔

بعد میں وہ دیر تک بے دم لیٹا ہوا چھت کو گھورتا رہا اور غنودگی آہستہ آہستہ اس پر طاری ہوتی گئی۔ اس کے اعصاب پُر سکون تھے لیکن روح کی سوزش، دب جانے کے باوجود، قائم تھی۔ آج کا دن تیز جلن کا دن تھا۔ ایسے دن لمبے لمبے وقفوں پر آیا کرتے تھے۔

(۲۹)

”اے لڑکو، لڑکیاں ہیں۔“ فخر احمد نے دروازے میں رک کر کہا۔ پھر وہ مڑا اور ایک آنکھ بھینچ کر مسکرایا۔

”کچھ لڑکیاں ہیں۔“ اس نے دوبارہ کہا۔

سارے ”سپیننگ روم“ میں ایک خاموش اضطراب پھیل گیا۔ میز پر چہروں پر رنگ آگیا اور مشتاق نظریں دروازے پر لگ گئیں۔ باہر فیکٹری کی فضا ہمیشہ کی طرح بے موسم اور گرد آلود تھی۔ ایک مزدور اوزار بجاتا ہوا تیز تیز میدان پار کر رہا تھا۔ اندر قطار در قطار چلتے ہوئے تنکوں پر کھڑے ہوئے مزدوروں میں یہ خبر آہستہ آہستہ پھیلنے لگی۔

فضل نے ہمت کر کے اپنا تنکلا چھوڑا اور دروازے میں جا کر سر باہر نکالا۔ فیکٹری کی گرد آلود فضا صاف ہو گئی تھی اور اس میں موسم کے رنگ نکھر آئے تھے۔ شوخ رنگوں کے اونی لبادے اور شالیں اوڑھے طالب علم لڑکیوں کا گروہ لپروائی سے چلتا ہوا ”سپیننگ روم“ کی طرف آرہا تھا۔ سرما کی تیز ہوا میں ان کے لبادے اڑ رہے تھے اور سر پر بندھے ہوئے رنگین رومالوں میں سے نکلی ہوئی کھنٹے سیاہ بالوں کی لٹیں ان کے ماتھوں پر پھڑپھڑا رہی تھیں۔ وہ سب نو عمر، صحت مند لڑکیاں تھیں اور کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ چند لمحے تک وہ دونوں میں کھڑے خوشگوار تحیر کے ساتھ انہیں دیکھتے رہے، پھر جلدی سے ہٹ آئے۔ واپسی پر فضل علی کے پاس رکا۔ اس کے ایک زور دار دھپ سے علی اچھل کر سیدھا ہو گیا۔

”کیا ہے؟“ اس نے کالی دے کر کہا۔

”لڑکیاں آئی ہیں۔“

”ہنہہ۔“

فضل مکاری سے ہنستا اور اس کے کندھے پر ہاتھ مارتا ہوا آگے چلا گیا۔ علی نے دوبارہ

کالی دی۔

ان کے ساتھ ایک نوجوان انجینئر، جس نے لباس میں غیر معمولی اہتمام کر رکھا تھا، بے حد اخلاق کے ساتھ آگے آگے چل رہا تھا۔ گروپ کے آخر میں دو لڑکیاں نوجوان کی چال ڈھال کی نقل اتار رہی تھیں۔

”یہ تنکے ہیں۔ یہاں کپڑا بنا جاتا ہے۔“

”چرنے؟“

”ہاں۔ مشینی چرنے۔“ انجینئر نے فخر سے مسکرا کر کہا۔

”چرخہ۔“ شرارتی لڑکیوں میں سے ایک نے انجینئر کی طرف اشارہ کر کے اپنی ساتھی سے

کہا۔

”مشینی چرخہ۔“ دوسری نے زیر لب دھرایا اور ہونٹ دبا کر ہنسی۔

”یہ کیا ہے اے اے۔“

”ارررر آ آ۔“ انجینئر نے بھیت کر بڑی لڑکی کی شال تنکے میں سے چھڑالی۔ وہ لڑکی،

جو گروپ کی لیڈر معلوم ہوتی تھی اور سنجیدگی سے انجینئر کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی سب چیز دیکھتی رہی تھی ، اب حواس باختہ کھڑی پھٹی ہوئی شال کو ہاتھ میں مروڑ رہی تھی ۔

”محرک مشینری ۔“ انجینئر تنبیہاً ہاتھ ہوا میں ہلا کر پکارا ”محرک مشینری کے نزدیک کوئی مت جائے ۔ یہ انتہائی خطرناک ہے ۔ اور اپنے اپنے لبادوں کو ڈھیلا مت چھوڑیے ، یہ انتہائی خطرناک ہے ۔ اور ۔ یہ انتہائی خطرناک ہے ، بہر حال ۔“

”اف اللہ ، کتنا شور ہے ۔“ ایک لڑکی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔

”چرنے کے نزدیک مت جاؤ ۔“ پہلی شرارتی لڑکی نے کہا ۔

”چرنے کو ہاتھ مت لگاؤ ۔“ دوسری شرارتی لڑکی نے کہا ۔

مشینری کے شور میں ان کی آواز زیادہ دور تک نہ جا سکی ۔ دو رویہ متحیر اور سادہ ، جھجک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مزدوروں کے میچ میچ یہ خوبصورت مجمع آگے بڑھتا گیا ۔

”اے ۔“ ایک مزدور کے پاس رک کر انجینئر مصنوعی غصے سے چلایا ۔ ”تکلا ادھر نہیں ادھر

ہے ۔“

مزدور کھیانا ہو کر مشین کو گھورنے لگا ۔

”چرخہ ادھر نہیں ادھر ہے ۔“ دونوں شرارتی لڑکیوں نے کہا ۔ مستقل باتیں کرتا اور نکٹائی

کو چھوٹا ہوا نوجوان انجینئر گروہ کے آگے آگے باہر نکل گیا ۔

مزدوروں میں آہستہ آہستہ اضطراب پھیلنے لگا ۔ پہلے وہ اپنی اپنی جگہوں پر پیر کھیٹتے

رہے ، پھر دروازے کی طرف بڑھنا شروع ہوئے ۔ پہلے فٹر ، پھر نائب فٹر ، پھر تنکوں والے ،

چھوٹے سے دروازے پر دس بارہ سر اٹھے ہو گئے اور ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے ۔ اب سارا تحیر

مٹ چکا تھا اور مسرور قوتیں بیدار ہو رہی تھیں ۔ وہ وحشیانہ طور پر ہنس رہے تھے ، بے دھڑک

کالیاں دے رہے تھے اور ایک دوسرے کی بغلوں میں سر دے کر اچھالنے کی کوشش کر رہے

تھے ۔ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی لڑکیوں کا گروہ آہستہ آہستہ میدان پار کر رہا تھا ۔ تیز سرد ہوا میں ان

کے چہرے سرخ ہو رہے تھے اور انہوں نے اپنے لبادے کس کر لپیٹ رکھے تھے جن میں سے

ان کے صحت مند جسموں کا ایک ایک عضو متحرک دکھائی دے رہا تھا ۔ روٹی کے کمرے ، صفائی

کے کمرے اور کھڈیوں کے کمرے کے دروازے انسانی سروں سے کچھا کچھ بھرے ہوئے تھے ۔

چھوٹا سا گنجا فورمین عقبی دروازے سے داخل ہوا اور بہت سی مشینوں کو خالی پا کر سب

پا ہو گیا ، بھاگتا ہوا دوسرے دروازے پر پہنچا اور پچھلے دو مزدوروں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر

اچھلا ۔

”کیا ہے ۔ کیا ہے ۔ کیا ہو رہا ہے ؟“ وہ گرجا ۔

پہلے دو مزدور تیزی سے اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچ گئے ۔ اگلے دونوں کی پشت پر ہاتھ

رکھ کر فورمین نے دوبارہ اونچی چھلانگ لگائی اور زمین پر آ رہا۔

”سُورو، یہ کیا ہو رہا ہے۔ مشینوں کو کیوں چھوڑا، ہیں؟ یہ کیا تماشاً ہو رہا ہے، ہیں؟“
مزدور کھسیا کر وہاں سے کھسکنے لگے۔ فورمین ان کے درمیان اچھلتا رہا۔ جب فٹر اس کی
منظر پچا کر گزرنے لگا تو اس نے اسے کالر سے پکڑ لیا اور اٹھکی ہلا ہلا کر ملامت کرنے لگا۔ فٹر
احمقوں کی طرح ہنستا رہا۔

جب فورمین چلا گیا تو مشینوں پر کھڑے ہوئے انسانوں کی شوخی پھر اوپر آگئی۔
”سیدھا ان کے پیچھے جا رہا ہے۔ گنجا سُور۔“ ایک مزدور نے کہا۔ علی نے اس کی ہاں
میں ہاں ملائی۔

”جاؤ۔ اپنی جگہ پر جاؤ۔“ فٹر ان کے قریب آکر چیخا، ”اب ان کو پکا کر کھانا چاہتے
ہو؟“

دونوں بزدلی سے ہنستے ہوئے واپس آگئے۔ فٹر جا کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔
”اے ناچتے ہوئے دیکھا تھا۔ گنچے مسخرے کو؟“
”ہاں۔“ علی ہنسا، ”میرے کندھے تک بھی نہ پہنچتا تھا“
”گنچے بونے کو؟“ فضل نے ٹھٹھا مار کر پوچھا، ”وہ اور اس کا باپ اوپر تلے کھڑے ہو
جائیں تو پار کر جاؤں۔“

”چپ رہ شیخی خورے۔“ پہلا مزدور جل کر بولا۔
”ہیں؟“ فضل لکارا، ”تم کھڑے گھوڑے کو پار کر سکتے ہو؟“
”ہنہہ۔“ دوسرے نے حقارت سے کہا۔ ”نہ ہو گا گھوڑا نہ تم کرو گے پار۔“
”تو۔ آجاؤ۔“ فضل نے چاروں طرف دیواروں پر اونچی اونچی نظریں کھمائیں۔ ”اس
پر۔ اس پر۔“ اس نے ایک اونچی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔
”آجاؤ۔“

دونوں نے ہنستے اور کالیاں دیتے ہوئے لنگوٹ کسنے شروع کر دیے۔ ساتھ ساتھ وہ
دورازے سے باہر بھی دیکھتے جا رہے تھے۔ میدان کے دوسرے سرے والے ہال کی کھڑکیوں میں
سے طالب علموں کے سر منظر آ رہے تھے۔
”چلو۔“ ایک نے کہا۔

”پہلے تم جاؤ۔“ دوسرے نے جواب دیا۔
فضل نے ایک چھچھلتی ہوئی ہکا باہر کی طرف دوڑائی اور تیزی سے بھاگا۔ جب دیوار چند
قدم پر رہ گئی تو اس نے رفتار تیز کر دی اور دیوار پر پاؤں مار کر اچھلا اور کھڑکی پر ہاتھ ٹکا دیے۔
اب وہ بازوؤں کے سہارے لٹک رہا تھا۔

”شباباش -“ کھڑکی کے قریب کی مشین والا ران پر مکا مار کر چلایا۔
 فضل بازوؤں کے زور پر آہستہ آہستہ اٹھنا شروع ہوا۔ ذرا سا اٹھ کر رکا اور نیچے آگیا۔
 چند سیکنڈ کے بعد اٹھا اور ناکام رہا۔ اس دفعہ وہ پہلے سے زیادہ اٹھ گیا تھا اور زیادہ دیر تک رکا
 رہا تھا۔ نیچے کھڑے ہوئے مزدور جوش سے چلائے۔ تیسری دفعہ اس نے دانت پیس کر زور
 لگایا اور اس کی ٹھوڑی کھڑکی کے زینے تک پہنچ گئی۔ وہ کا رہا، رکا رہا۔ اس کے دانت ننگے
 ہو کر ایک دوسرے پر جھے ہوئے تھے اور کندھے بری طرح کپکپا رہے تھے۔ اس نے گھٹنے اور
 پاؤں چلائے لیکن دیوار سیدھی اور ہموار تھی اور اس پر کوئی سہارا نہ تھا۔ ایک آخری کوشش
 میں اس نے ہاتھ اٹھا کر سلاخوں کو پکڑنا چاہا مگر دوسرا ہاتھ بوجھ کو نہ سنبھال سکا اور پھسل گیا۔
 اس کی ٹھوڑی کھڑکی کے پتھر سے ٹکرائی اور وہ دھڑام سے نیچے آگرا۔ نیچے والے مجمع میں سے
 مایوسی کی کراہ بلند ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھا اور لنگڑاتا ہوا دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔
 اس کا انتظار کیے بغیر دوسرا مزدور پوری قوت سے بھاگا اور دیوار پر پاؤں سلاخوں پر جمالیے۔ لیکن
 اس کے بازو کمزور تھے۔ دو ایک بار خفیف سا اوپر اٹھنے کے بعد اس نے ہاتھ چھوڑ دیے اور بلی
 کی طرح پاؤں پر گرا۔ مزدور، جواب کھڑکی کے نیچے اکھٹے ہو گئے تھے، ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ ناکام
 چھلانگی نے ڈھٹائی سے انہیں گالی دی اور بلا وجہ ہنسنے لگا۔

فٹر جو مجمع کے سر پر آگیا تھا، پہلے تو بھنایا، پھر مزدوروں کا جوش و خروش دیکھ کر ٹھنڈا
 پڑ گیا اور ان میں دلچسپی لینے لگا۔ دو تین اور جوان پھلانگنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔
 ”ایک ایک کر کے۔ ایک ایک کر کے۔“ فٹر پکارا، ”مشینوں کو خالی مت چھوڑو۔ جو
 چھلانگ لگائے گا اس کی مشین کا دوسرا دھیان رکھے گا۔ ایک ایک۔“

ایک ایک کر کے سب جوانوں نے چھلانگ لگانی شروع کی۔ کافی دیر تک وہ زور آزمائی
 کرتے رہے مگر دیوار سرد اور اٹوٹ تھی۔ اس نے سارے نوجوانوں کے غرور کو مجروح کر دیا۔
 دانت پیس پیس کر، پٹھے کھینچ کھینچ کر اور رگیں پھلا پھلا کر انہوں نے اپنی ساری قوتیں صرف
 کر دیں۔ ایک مسخرہ مزدور دیر تک جو سلاخوں سے لٹکا رہا تو اس کے ہاتھ وہیں پر جکڑے گئے
 اور اس کو نیم بیہوشی کی حالت میں سیڑھی کی مدد سے نیچے اتارا گیا۔ اس کے بعد سب نے ایک
 دوسرے کو کالیاں دیتے ہوئے یہ کھیل بند کر دیا۔

ایک گھنٹے کے بعد حالات معمول پر آگئے۔ سب مزدور اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے
 مشینوں کی یکساں، ییزار کر دینے والی آواز کو سن رہے تھے۔ باہر فیکٹری کی فضا بے موسم اور
 گرد آلود تھی اور ہوا کا زور ٹوٹ چکا تھا۔

(۳۰)

اوپر کی منزل سے جو چوبی زینہ برآمدے میں اترتا تھا مسلسل استعمال کی وجہ سے گھس چکا تھا مگر اس کی لکڑی سیاہ ، ٹھوس اور عمدہ تھی ۔ نجھی نے برآمدے میں اترتے ہی ناک اٹھا کر سونگھا ۔ ہوا میں بارش اور گیلے پتوں کی مہک تھی ۔ اس نے خوشی سے کپڑوں پر ہاتھ پھیرا اور پاتھے اٹھا کر احتیاط سے چلنے لگی ۔ برآمدے کا فرش گیلا اور پھسلواں تھا ۔ اندر سے خالہ نے اسے دیکھا اور پکاری ۔

”بی بی ۔ تنگے پاؤں ں ں ۔“

اس نے چوٹوں کی طرح گردن کندھوں میں چھپالی اور دیوار کی اوٹ میں ہو کر چلنے لگی ۔ برآمدہ خالی اور طویل تھا اور بھیگی ہوئی چڑیاں میلوں میں بیٹھی پر جھٹک رہی تھیں ۔ اس نے پاتھے چھوڑ دیے ۔ ڈھیلے ڈھالے پاجامے میں اس کے پاؤں اور پاتھے گیلے ہونے لگے ۔ برآمدے کے وسط میں چند لحظے کو رک کر اس نے بے مدعا ، اطمینان کے ساتھ آس پاس کی بے رنگی اور میزار کر دینے والے موسم کو دیکھا ۔ پھر اس نے پاتھے اٹھالیے ۔ اس کے پاؤں زردی مائل اور دبے تھے ۔ چلتے چلتے اس نے ایک پاؤں پلٹ کر دیکھا ۔ تلوا گلہابی اور دھلا ہوا تھا اور اس میں فرش کی نمدار ، خوشگوار ٹھنڈک جذب ہو رہی تھی ۔ برآمدے کے موڑ تک پہنچتے پہنچتے اس نے پھر پاتھے چھوڑ دیے اور باہیں ہلاقی ہوئی لپروائی سے چلنے لگی ۔ اگلے بازو میں بہت سی اوٹ پشانگ چیزیں بکھری پڑی تھیں ۔ وہ پنگ پونگ کی میز کے کونے پر بیٹھ کر ٹانگیں ہلانے لگی ۔ دوسرے کونے میں عمران دیوار سے ٹیک لگائے اکڑوں بیٹھا تھا ۔ اس نے ایک سرسری ، سست نگاہ اپنی نو عمر پھوپھی پر ڈالی اور باہر دیکھنے لگا ۔

وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھی پاؤں ہلاقی رہی ، پھر مڑ کر شگفتگی سے بولی : ”ہلو ماسٹر

ڈل ۔“

عمران نے ٹھہری ہوئی ، کابل نظروں سے ، جن سے حماقت اور لاعلمی کا اظہار ہوتا تھا ، اسے دیکھا ۔

”موسم نے سارا مزا خراب کر دیا ۔“ وہ پھر بولی ۔

”ہاں ۔“ عمران نے سر ہلایا ۔ وہ ایک سست دماغ اور بھیگی بھیگی اداس آنکھوں والا نوجوان لڑکا تھا جس کے چہرے پر کوئی تاثر شاذ ہی پیدا ہوتا تھا ۔ نجھی میزاری کے باوجود اسی طرح بیٹھی شگفتگی سے ٹانگیں ہلاقی اور فرش پر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھتی رہی ۔ بارش لگا تار ہو رہی تھی ۔ ایک بھٹکی ہوئی زرد تتلی برآمدے میں سے گزری ۔

”زرد گلاب کی پنکھڑی ۔“ وہ بولی ، ”تم نے وہ منظم سنی ہے جو میں نے جاڑوں میں

لکھی تھی؟“

عمران نے اپنی لاعلم نظروں سے دیکھا۔ ”جاڑوں میں؟ اوہ۔ ہاں، جاڑوں میں۔“
 ”ساری چڑیاں بھیگ گئی ہیں۔ ستلیاں غائب ہو گئی ہیں۔ برسات آگئی ہے۔“ وہ گاتی
 ہوئی بولی۔

”ستلیاں جاڑوں میں ہوتی ہیں۔“ عمران نے بے حد اہم لہجے میں، جیسے کہ وہ ہر معمولی
 بات کو ادا کیا کرتا تھا، کہا۔

”جب دن میں باہر بیٹھتے ہیں اور دھوپ میں ایسی چمک ہوتی ہے اور ہر طرف ستلیاں اڑتی
 پھرتی ہیں رنگ برنگ اور شہد کی مکھیاں رنگ برنگ۔ رنگ برنگ، اور تار، ہے نہیں؟
 اوہ۔“ اس نے مٹھیاں کس کر چھاتی میں بھینچ لیں اور آنکھیں میچ کر ہنسی، ”ہے نہیں؟“
 ”میں نے پرویز بھائی کو سنائی تھی، زرد گلاب کی پنکھڑی۔“ اس نے پاؤں پھیلا کر بارش
 کی پھوار کو محسوس کیا اور گنگنائی، ”گلاب جو خزاں کی بارش میں پھولتا ہے۔“
 ”پہا ابھی تک نہیں آئے۔“ نوجوان لڑکے نے بچوں کی طرح بھیگی بھیگی اداس آنکھیں
 اٹھا کر کہا۔

”پرویز بھائی کبھی نہیں آتے۔“ پچھلی بار بھی ادھی رات کو پہنچے تھے۔ آج بھی نہیں
 آئے۔“

”انہوں نے تحفہ تو دیا ہی تھا۔“

”تحفوں کا کیا ہے۔“ وہ رنج سے چیخ کر بولی۔

عمران شدر بیٹھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کو جمع ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ پاؤں
 لٹکائے، دونوں ہاتھ گود میں رکھے خاموش بیٹھی بارش کے شور کو سنتی رہی۔ آس پاس گہرا
 سکوت تھا۔ بے رنگ، بارش آلود سہ پہر کا سکوت جس میں گیلی چڑیاں برآمدے کی میل میں
 چھپی سست، مختصر آوازوں میں باتیں کر رہی تھیں اور بادل بہت نیچے جھک آئے تھے اور
 یوکلپٹس کی چوٹیوں میں پھر رہے تھے۔ یہ موسم برسات کی پہلی بارش تھی جس نے آج نجھی
 کی سالگرہ کا ستیاناس کر دیا تھا۔

عمران اپنے کونے پر بیٹھا کاحلی سے پنگ پونگ کی جالی کو کھولتا اور لپیٹتا رہا۔ کبھی کبھی
 وہ سہمی ہوئی نظر نجھی پر بھی ڈال لیتا جو ایک بڑے سے سروالی دہلی پتلی اور سیدھے سادے،
 قدرے ہموار جسم کی لڑکی تھی۔ وہ ایسے لوگوں میں سے تھی جن کی صحت کا اندازہ لگانے میں
 ہمیشہ مشکل پیش آتی ہے، جو ہر روز مزاج کے مطابق رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کا قد چھوٹا
 تھا مگر جسم کے تنگ چوکھٹے کی وجہ سے پست قد نہ لگتی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی خصوصی
 جاذبیت نہ تھی۔ صرف اس کے نسبتاً بڑے سائز کے سر نے اس میں مستقل کم عمری کی دلکشی

پیدا کر دی تھی۔ اور پھر اس کی آنکھیں تھیں، سیاہ اور مایع اور بڑی بڑی اور گہری اور بیحد روشن۔ اس کی ساری شخصیت میں صرف آنکھیں تھیں جو دیکھنے والے کو متاثر اور مبہوت کرتی تھیں۔ نازک جسم اور پھیکے چہرے پر وہ اس قدر ذہین اور جاندار آنکھیں تھیں۔ اور اس کے بال تھے جو سیدھے اور سیاہ تھے اور اس کی آنکھوں سے میل کھاتے ہوئے۔ اس کی غیر معمولی حساس طبیعت نے اسے گھر بھر کے لیے درد سربنار کھا تھا۔ اس وقت وہ برآمدے میں بیٹھی جلد جلد آنکھیں جھپکتی ہوئی دور دور تک گرتی ہوئی بارش کو دیکھ رہی تھی۔ بادلوں کے نیچے آنے سے دن کی روشنی کھٹتی جا رہی تھی۔

”ہلو ماسٹر ڈل۔“ خاموش بیٹھے بیٹھے اس نے دوبارہ مڑ کر شگفتگی سے کہا۔
 ”ہلو۔“ عمران نے رکھائی سے جواب دیا۔ وہ پھر اپنی مخصوص بے خیالی میں جا چکی تھی۔ اس کی یہ اوٹ پٹانگ ذہنی غیر حاضری عمران کو پریشان کر دیتی تھی۔
 پھر وہ ٹانگیں اوپر سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ ”میں بارش دیکھنے کے لیے آئی ہوں۔ بارش اتنی دور دور تک ہو رہی ہے۔ ایسا عجیب لگتا ہے۔“
 لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ماسٹر یہ بارش جو ہے، یہ تم کو یزار کرتی ہے کہ۔ تم کو ہی لگتی ہے؟ بتاؤ۔“
 ”مجھے،“ وہ تیز تیز جالی لپٹنے لگا، ”یزار نہیں کرتی۔“
 ”اچھا؟“ نجمی نے آنکھیں پھیلا کر کہا، پھر دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کانوں پر رکھ کر دبائیں۔ ”اوہ خدایا۔ پتا نہیں۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلتا، بس ایسا عجیب لگتا ہے۔ ہاؤ سلی۔“
 تھوڑی دیر کے بعد اس نے دونوں ہاتھ گود میں رکھ لیے اور آنکھیں کھول کر دھیرے دھیرے کہنے لگی: ”یہ مجھے یزار بھی کرتی ہے اور میں اس کو دیکھنے کے لیے بھی آتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں۔“
 لیکن عمران نے محسوس کیا کہ وہ وہاں پر نہ تھی، وہ اسے دیکھ بھی نہ رہی تھی، وہ اس پر نظریں جمائے کچھ بھی نہ دیکھ رہی تھی۔ بارش کا شور بڑھ گیا اور میلوں میں بھیگتی ہوئی چڑیاں گھبرا کر اڑنے لگیں۔

”بارش تیز ہو گئی ہے۔“ عمران نے اہم لہجے میں اطلاع دی۔ وہ چونک پڑی۔ ”بارش کی آواز کو تم سن رہے ہو؟“
 لڑکے نے گومگو کی حالت میں سر ہلایا۔

”اوہ سویٹ۔“ نجمی نے مٹھیاں ہوا میں چلائیں، ”اسی ڈیڑھ اس قدر بس ارر۔ بالکل بیہوش کر دینے والی آواز ہے۔ بارش کی نا؟ (اس نے پوچھا) ہاں۔ جیسے میوزک۔ رات کے وقت میں ایک دم بج اٹھے۔ مکمل میوزک۔ آرکسٹرا۔ یار قص کی تال جیسے ایک دم تیز ہو جائے، گھنگرو، یا پھر۔ ارے نہیں بھئی۔“ اس نے ہاتھ جھٹک کر گود میں رکھ لیے اور خلا

میں دیکھنے لگی لڑکے نے اطمینان کا سانس لیا اور چالی میز پر رکھ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہ پھر بول اٹھی: ”ارے ہاں جیسے میوزک بچتے بچتے ایک دم ٹھم جائے۔ یا ناچتے ناچتے کوئی ایک دم رک جائے۔ ایک دم تو پھر جو شور پیدا ہوتا ہے کانوں میں تیز، بالکل بے ہوش کر دینے والا پیدا ہوتا ہے ناسارے میں؟ تمہیں پتا ہے؟ یعنی گھنگر و جب ایک دم ٹھم جائیں تو اس کے بعد۔“ اس نے آنکھیں پھیلا کر سمجھانے کی کوشش کی۔

دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

”ہائے سویٹ ایسی ڈیئر میوزک کلاس میں اتنی دفعہ میں نے محسوس کیا، اور آج ابھی اس وقت مجھے یاد آیا ہے کہ یہ بالکل ویسا ہے پر ماسٹر یہ کہاں سے آتا ہے، بتاؤ یہ بارش تو تمہیں پتا ہے کہاں گرتی ہے۔ راستوں پر، چھتوں پر، درختوں پر، پتوں پر۔“ اس نے ہاتھ پھیلایا، ”ساری بے آواز جگہوں پر۔ پھر یہ میوزک کہاں سے آتا ہے بتاؤ۔“

لڑکا اپنی جگہ پر کسمسا کر خاموش رہا۔

”تم نے سنا ہے تو ضرور پتا ہو گا۔ ایسی بتاؤ نا۔“

وہ عادی، میزبان نظروں سے بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اچانک نجھی نے کانوں کو دونوں ہاتھوں میں ڈھانپ لیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”تمہیں کچھ پتا نہیں۔ وہ چیختی، ”کچھ بھی نہیں ڈل ڈل ماسٹر۔“

وہ پھر پلٹ کر بیٹھ گئی۔ بارش کا شور آہستہ آہستہ کم ہو گیا اور بادلوں کے اٹھ جانے سے اجالا بڑھنے لگا۔ جب وہ میٹھی میٹھی اکتا گئی تو میز سے اتر کر برآمدے کی سیڑھیوں تک گئی اور بارش میں ہاتھ پھیلا کر کھڑی رہی۔ بارش بدستور کبھی تیزی کبھی آہستگی سے ہوتی رہی۔ برآمدے کے کونے سے ایک مہری گھاگرا اٹھائے تیز تیز چلتی نمودار ہوئی اور پاس آکر چائے کے لیے بولی۔

”ہم یہیں پر چائے پیس گے۔“ عمران نے کہا۔

”ہاں، ہم یہیں پر چائے پیس گے۔“ نجھی نے خوشی سے کہا۔

”آج لیلیٰ بڑا عمدہ ناچی تھی۔“ عمران نے کہا۔

”اوہ ونڈر فل ایسی، اس سے اچھی رادھا تو وہ ڈرامے میں بھی نہیں بنی تھی۔“ وہ کھسک کر اس کی قریب ہو بیٹھی۔ ”اور اس کی بہن نے ماسک کیا شاندار بنائے تھے۔ ارے کچھ بھی پتا نہیں چلتا تھا او وہ سینٹ زیویئرز میں ہے۔“

”تم نے میرے گھوڑے کی ٹانگ توڑ دی۔“ عمران نے منہ لٹکا کر نیچے دیکھا جہاں اس کا تین ٹانگوں والا گھوڑا اوندھا پڑا بارش میں بھیگ رہا تھا۔

”مجھے اتنا افسوس ہے ایسی ڈیئر پر میں کیا کرتی، تم خود ہی میرے اوپر چڑھ آئے تھے۔“

ریس میں کوئی گھوڑا اپنی لین بھی چھوڑتا ہے؟ میرے گھوڑے نے دولتی لکائی تمہارے گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔“

”گھوڑے نے لکائی یا تم نے لکائی!“ لڑکا جل کر بولا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی: ”لیکن مجھے افسوس ہے

اسی۔ ہم ایسے عزیز العزیز ترین دوست ہیں آپس میں، تمہیں؟“

دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ آمنے سامنے بیٹھے، میز کی ہموار چمکدار سطح پر چائے کے

قطرے ٹپکاتے ہوئی وہ خوشی سے دن بھر کی باتیں کرتے رہے۔

”فرحت کیوں نہیں آئی؟“

”اے انفلوائنزا ہو گیا ہے۔ ریاض نے ہمیں بتایا۔ اے دیکھنے کو ہم کل صبح جا رہے

ہیں۔“

”ہاں۔ کل صبح۔“

”پچھلی بار جو ہم نے مبارکباد کا گیت گایا تھا۔“

”یہ تمہاری انگلش ٹیچر گریگسن مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔“

”ارے آہستہ بولو بھئی۔“ نجمی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا، ”عذرا آپا کی بڑی پکی

دوست ہے۔ لیکن اسی، یہ ذرا اچھی بات نہیں۔ تمہیں اس سے بات تو کرنی چاہیے کم از کم،

وہ اتنی سویٹ ہے اچھا تو اسی لیے مبارکباد کے گیت میں تم بلے کی طرح منہ پھلا کر بیٹھے رہے۔“

”پپا بھی کہتے تھے وہ سویٹ ہے۔“ وہ پھولے ہوئے منہ سے بولا۔

”وہ تو ہٹی۔“ نجمی نے سٹپٹا کر کہا، ”گیت نوری نے بھی اچھا گایا تھا۔“

”تم اس کے ساتھ لڑی کیوں تھیں؟“

”ارے نہیں بات کر رہی تھی۔“

”ارے واہ، تم تو گرج گرج کر بحث کر رہی تھیں۔“

”میں نے پوچھا تھا آنکھیں بند کر کے جھولا جھولنے سے جو تارے نظر آتے ہیں ان کا

رنگ کیسا ہوتا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کو نہیں آتے نظر۔“

”اے خواب میں نظر آتے ہوں گے۔“ عمران ہنسا۔

”ارے ہائے اسی کل میں نے خواب دیکھا۔“ وہ اس پر نظریں جمائے جمائے بے خیالی

میں چلی گئی اور رک رک کر بولنے لگی، ”خواب دیکھا کہ جنگل ہے اور میں گھوڑے پر سوار جا رہی

ہوں جا رہی ہوں اور جنگل گہرا ہوتا جا رہا ہے گہرا ہوتا جا رہا ہے، پھر گھوڑا بھاگ گیا۔ میں؟ پھر

گھوڑا مجھے گرا کر کہیں بھاگ گیا۔ میں نے اٹھ کر اسے آواز دی: ’پونی۔ پونی ڈیئر۔ پونی

پونی۔‘ حتیٰ کہ ڈر کے مارے میری آواز بیٹھ گئی اور پونی نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر میں چلنے لگی

بیچ راستے سے ہٹ کر ، کنارے کنارے ، درختوں کے نیچے نیچے ، میرے اوپر کہرے سے بھرے ہوئے درخت تھے اور جب کوئی پتا میرے بالوں پر گرتا تو میں چونک پڑتی ۔ پھر پتوں کی بارش ہونے لگی ، ہر طرف اور دیکھتے دیکھتے راستہ پتوں میں غائب ہو گیا ۔ میں بھاگنے لگی ، بہت تیز ۔ پتے زرد اور خشک تھے اور میرے پاؤں کے نیچے ان کی ٹوٹنے کی آواز آرہی تھی ۔ میں بھاگتی گئی اور گھوڑے کے ملنے کی دعائیں مانگتی رہی ، کہ ایک کھلی جگہ آگئی ۔ یہ ایک جھیل تھی جو خشک ہو چکی تھی ۔ تہہ میں تھوڑا سا پانی تھا جس پر کہرہ جما ہوا تھا ۔ وہاں پر کوئی بھی نہ تھا ، سوائے ایک پرندے کے جو جھیل کے کنارے ایک ٹانگ پر کھڑا تھا ۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کے قریب جا کر کچھ پوچھا ۔ اس تھے سے آبی پرندے نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور منہ کھول کر قہقہہ لگایا (عمران کھلکھلا کر ہنسا ۔ وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر بولتی رہی) پھر اس نے سر سے مجھے آگے جانے کا اشارہ کیا ۔ میں نے دیکھا آگے پہاڑیاں تھیں جن پر برف گر رہی تھی ۔ گر رہی تھی یا گر چکی تھی ، یاد نہیں رہا ، لیکن وہ برف پوش تھیں ۔ میں پھر بھاگنے لگی ۔ اب میں خوفزدہ نہ تھی ۔ میں خوشی سے بھاگ رہی تھی ۔ خوشی سے ۔ بہت تیز ۔ ”وہ ٹھٹک کر رک گئی ، ”کیسا ہے یہ کہ ۔ بتاؤ ۔“

”اچھا ہے ۔“ عمران نے خوشدلی سے کہا ۔ وہ ایک دم سرخ ہو گئی ۔

”کیوں کر ہے ؟ کیوں ہے ؟“ اس نے تقریباً چیخ کر کہا ۔

”کیوں ؟“ لڑکے نے سہم کر دھرایا ، ”پتا نہیں ۔ خوابوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا ۔“

”اوہ ۔“ انتہائی رنجیدہ ہو کر وہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی ۔ اس کا گھٹنا لگنے سے پیالی اوندھی ہو گئی اور اس میں بچی ہوئی چائے میز پر پھیل گئی ۔ آنسوؤں کو روکنے کے لیے وہ تیز تیز آنکھیں جھپکنے اور پاؤں ہلانے لگی ۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا :

”تم خواب نہیں دیکھتے ؟“

”نہیں ۔ کبھی کبھی ۔“

”کیا ۔“

”کیا ؟“ لڑکے نے دھرایا ، ”کچھ نہیں یہی کہ ۔ جیسے آج دیکھوں کہ ہم نے برآمدے میں

چائے پی ۔“

وہ کانوں تک سرخ ہو گئی ۔ عمران نے جالی اٹھائی اور اسے کھولنے اور لپیٹنے لگا ۔ بے حد گیلی ہوا ان کے چہروں سے ٹکرا رہی تھی ۔ میل پر سے بارش کے قطرے سیرھیوں پر گر رہے تھے ۔ اب شام پڑ رہی تھی ۔

”تم نے اپنا کام ختم کر لیا ؟“ دیر کے بعد نجمی نے مڑ کر پوچھا ۔

”کیا ؟“

نجھی نے برآمدے کے فرش کی طرف دیکھا۔ عمران جھنجھلا کر اٹھا اور اس کے سامنے سے گزر کر بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگا۔ لکڑی کے گھوڑے، ماسک، ریل گاڑی بمعہ لائن، کریکر، کاغذ کی ٹوپیاں، غبارے، اور اسی طرح کا کتنا ہی الم غلم۔ وہ رنجیدہ نظروں سے میٹھی دیکھتی رہی۔

”باقی تم اٹھاؤ گی۔“ آدھی چیزوں کا ڈھیر لگاتے ہوئے وہ پھولے ہوئے منہ سے بولا۔

”یہ میرا کام نہیں۔“

”مجھے نہیں پتا۔“

”میں خالہ سے کہوں گی۔ کہ تم نے اپنا کام نہیں کیا۔“

”میں بھی کہوں گا۔“

”کیا؟“

”کہ تم نے پھر میز پر چائے گرائی ہے۔“ اس نے دونوں بازوؤں میں چیزیں بھرتے

ہوئے کہا۔

”تم۔ میری شکایت کرو گے؟“ وہ رنج سے چیخی۔

لڑکے نے یزاری سے اس کی طرف دیکھا اور چیزیں سنبھال کر چل پڑا۔ ”میں تمہاری پروا نہیں کرتا۔“ اس نے کہا۔ وہ اسے برآمدے میں غائب ہوتے دیکھتی رہی، پھر کود کر اتری اور پانچے اٹھا کر برآمدوں میں بھاگنے لگی۔ عذرا کے کمرے میں روشنی نہ جلی تھی۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی اور پلنگ پر خاموش میٹھی تھی۔ نجھی نے قالین پر گر کر اس کی گود میں منہ چھپا لیا۔

”عذرا آپا“ وہ سسک کر بولی، ”میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“

”کیا ہے بی بی۔ کس کے ساتھ؟“ عذرا نے تشویش سے پوچھا۔

”ماسٹر ڈل۔“

”تو کون کہتا ہے آپ اس کے ساتھ رہیں بیٹیا۔ کیا کہتا ہے؟“

”وہ کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ خواب میں وہ چائے پیتا ہے اور۔“

عذرا ہنسی۔ ”تو ٹھیک ہے۔ آپ الگ رہیں وہ الگ رہے گا۔“

نجھی نے اس کی گود میں سے منہ اٹھایا اور غصے سے بولی: ”ڈل۔ ماسٹر۔“

”ڈل ماسٹر نہیں کہتے بیٹیا، عمران کہتے ہیں۔ وہ آپ سے بڑا ہے۔“ عذرا نے اس کے

بال سنوارے، آنکھیں خشک کیں اور جھک کر اس کی پیشانی کو چوما۔ ”اب آپ جا کر جوتے

پہنیں۔“

وہ بارش آلود دن ختم ہو رہا تھا اور عذرا اکیلی دریچے میں کھڑی دور تک گرتی ہوئی ش

اور جھلملاتی ہوئی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ رات کے ساتھ مخصوص ہیں۔“ اس نے برقی روشنیوں کو دیکھ کر سوچا۔

بھورے رنگ کی گھنی لٹ اس کے ماتھے پر پھڑپھڑائے جا رہی تھی۔ اس نے کاہلی سے اسے بالوں میں اڑسا اور دوبارہ اس کے گرنے کا انتظار کرنے لگی۔

”یہ رات کے ساتھ جلتی ہیں۔“ اس نے دوبارہ سوچا۔

لیکن یہ کوئی سوچ نہ تھی۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے بیکار خیالوں میں سے ایک تھا جو خالی الذہن انسان کے دماغ میں آپ سے آپ چلے آتے ہیں۔ وہ اپنی کاہلی اور بے خیالی پر جھنجھلا گئی۔

لیکن وہ اکیلی تھی اور اندھیرا اس کے چاروں طرف پھیل چکا تھا اور بارش صبح سے ہو رہی تھی دور دور، جھلملاتی ہوئی روشنیوں پر اور اس سے پرے اندھیرے کھیتوں اور میدانوں اور درختوں پر، لگاتار۔

”جب یہ نہیں تھیں بارش جب بھی ہو رہی تھی۔“ اس نے پھر سوچا اور دل میں خیال کی نارسائی اور بے تکے پن پر جھنجھلائی۔

مسلل بارش نے اس کے حواس کو کند کر دیا تھا اور وہ بیزار ہو چکی تھی۔ نمدار ہوا اس کے سرد، بے جان چہرے سے ٹکرا رہی تھی اور اسٹول پر پاؤں لٹکائے، دریچے کے پتھر پر دونوں کہنیاں رکھ کر بیٹھی وہ اتنی بے حس اور کاہل ہو گئی تھی کہ اٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ اس نے گیلے، منجمد چہرے کو چھونا چاہا مگر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ نہ کر سکی۔ پھر اس نے اوپر کا ہونٹ پھیلا کر سانس کو محسوس کیا۔ سانس گرم تھا اور وہ خوش ہوئی۔ اس بے نام خوشی اور مصنوعی طمانیت کے ساتھ بیٹھی وہ لٹ کے گرنے کا انتظار کرنے لگی جو لاپرواہی سے بالوں میں الجھائی گئی تھی۔

چھوٹے چھوٹے، بیکار، لایعنی خیال آپ سے آپ آتے اور جاتے رہے۔ اندھیرے میں اس کا وجود اور احساس دونوں معدوم ہو گئے۔

”سارے وقت بارش ہو رہی ہے۔“ اس نے دل میں کہا۔

رات کی مخصوص، دھیمی اور مسلسل بارش سارے ہی وقت ہو رہی تھی۔ دریچے کے چھجے پر، یو کلپٹس کے پتوں پر، نیچے باغ کے راستوں پر، ترپ ترپ، ترپ۔ اس کی خاموش آوازوں کی موسیقی سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ایک کر کے بند ہوتے ہوئے درپچوں پر، بجھتے ہوئے شیشوں پر، ایک ایک کر کے سوتے ہوئے مردوں عورتوں کے کانوں پر بج رہی تھی۔ رات کا سہ، جو بھاری اور محفوظ سہ تھا، جانداروں کے لیے آرام کا سہ تھا۔ لیکن ہوا، جو دن بھر سے گیلی اور مضطرب تھی، چلے جا رہی تھی۔ بالآخر یہ رات غیر آباد

نہ تھی۔ بند درپچوں کے باہر ہوتی ہوئی بارش خواب آلود اور پراسرار تھی۔

”بارش سارے وقت ہوگی۔“ اس نے دل میں دھرایا۔

لٹ ابھی تک نہ گری تھی اور وہ جھنجھلا رہی تھی، ذہن کی نارسائی اور انتظار کی کوفت پر۔ اس نے دوبارہ ہونٹ پھیلا کر سونگھا۔ صرف ایک سانس تھا جسے وہ محسوس کر رہی تھی، گرم اور جاری انسانی سانس! باقی سب چیزوں کو، بارش کو، اور چہرے کی گیلی بیجان جلد کو اور خوشبو دار درخت کے پتوں کو اور اندھیرے میں بازوؤں کی مدھم لکیروں کو اور دور جھلملاتی ہوئی گیلی اور اکلوتی روشنیوں کو اس نے فرض کر لیا تھا۔

”پھر؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں دل میں کہا۔

سڑک کے پار دوسرے مکان کے شیشوں پر روشنی گل ہو گئی۔ کسی نے درپچہ کھول کر خاموشی سے باہر جھانکا۔ کوئی سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ بھی اس نے فرض کر لیا۔ (کہ سبھی لوگ تو سوتے ہیں۔)

”پھر اس نے میزاری سے دل میں دھرایا۔

برآمدے میں کسی نوکر کے گزرنے کی چاپ سنائی دی۔ ”بٹیا سو رہی ہیں۔“ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا اور گزر گئے۔ باغ کی باڑ کے پیچھے ایک میل گاڑی بھیکتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اس کے نیچے لائین لٹک رہی تھی اور گیلی سڑک پر اس کا دھندلا عکس دور تک چلا گیا تھا۔ پھونس کی چھت کے نیچے بیٹھے ہوئے چند کسان موٹی اداس آوازوں میں باتیں کر رہے تھے اور میلوں کو چلا رہے تھے۔

لیکن اس دوسرے مکان کے شیشوں پر روشنی گل ہو گئی تھی اور ان کے پیچھے رات کا اولین بوسہ لیا جا رہا تھا، یا شاید لیا جا چکا تھا، کیونکہ وہ دو تھے اور جب کمرہ ابھی روشن تھا تو ان کے سائے شیشوں پر لرز رہے تھے اور وہ ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے باتیں کر رہے تھے، بے آواز باتیں، جن کو صرف وہی جانتے تھے۔ پھر جب مرد نے سگریٹ دریچے میں مسلا اور روشنی گل کر دی تو کسی نے پل کے پل کو درپچہ کھول کر باہر جھانکا، کسی نے مختصر سا قبہہ لکایا اور درپچہ بند کر دیا۔ اب کمرہ گرم اور تاریک تھا اور باہر بارش ہو رہی تھی۔ اور اب کمرہ گرم اور تاریک تھا اور سڑک پر رات کے اکا دکا مسافر بھیکتے ہوئے گزر رہے تھے، اور اب کمرہ گرم اور تاریک تھا، اور اب کمرہ۔

”لاحول ولا قوۃ۔“ اس نے پہلی دفعہ شعوری طور پر سوچا اور اسٹول سے اتر آئی۔ کمرہ

پار کر کے اس نے بتی جلانا چاہی لیکن دیوار پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی۔ ایک بہت پرانا خوف تھا جس نے اسے باز رکھا، لمحوں کے بہاؤ کو، وقت کے طلسم کو توڑ دینے کا خوف اور لمحوں کے بہاؤ میں ایک دن اور گزر گیا۔ ایک سال اور۔ ابھی جب دن رخصت نہیں ہوا تھا تو بہت سے

بچے کسی کی سالگرہ منا رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے وہ محل کے پچھوڑے گھاس پر نہ جاسکے تھے اور گھوڑ دوڑ کے مقابلے منعقد کر رہے تھے۔ پچھوڑے کی طرف سبزے پر کیا عمدہ پارٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ اللہ کیا یادگار زمانہ تھا۔ وہ لوگ اب کہاں گئے؟ وہ لوگ، ”آہستہ برگ گل بفشاں بر مزار ما“، کوئی بیحد دلکش انداز میں جھک کر کہہ رہا ہے ارے یہ تو ایک بہت پرانا، بہت بھولا ہوا منظر ہے۔ ہشت۔ اور گھوڑ دوڑ کے مقابلے کر رہے ہیں۔ کوئی ریس کے دوران بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ جوڑ رہا ہے، کوئی جب پیچھے رہ جاتا ہے تو گھوڑے کو بغل میں دبا کر بھاگ اٹھتا ہے۔ پھر وہ اپنی ہمجولی کو سینگ کرنے لگے کہ وہ انہیں اپنی سالگرہ کی منظم سنائے۔ ارے یہ تو نجی ہے، یہ پیاری سی عجیب و غریب لڑکی جو منظم سنا رہی ہے۔ پھر رادھا ناچی، اور ماسک ڈانس ہوا۔

”فرحت کی صحت کے متعلق کوئی تازہ بلٹن شایع ہوا؟“ وہ ریاض سے پوچھ رہے ہیں۔

”سینٹ جوزف کی کیبنٹ میں کیک چرانے کا ”پورٹ فولیو“ ریاض کے پاس ہے۔“ وہ ریاض کو تنگ کر رہے ہیں، ریاض جو گول مٹول سیدھا سادا لڑکا ہے۔ گریگن انہیں سختی سے منع کر رہی ہے۔ گریگن جو مشن میں چلی گئی ہے ”اوہ، شریف خاتون، تو گویا آپ راہبہ بن گئیں! تھ تھ تھ۔“ اب کیک پر موم بتیاں جل رہی ہیں اور سب مل کر مبارکباد کا گیت گا رہے ہیں، گریگن جسے لیڈ کر رہی ہے:

”چودھواں سال جو ختم ہوا۔ اس کے بعد پندرہواں آئے گا، اور پھر سولہواں اور ہم پھر پھر کائیں گے: ”پچھلا سال جو ختم ہوا۔“ چودھواں سال جو۔۔۔“

سالگرہ کا یہ انوکھا گیت ایلس گریگن کے وطن آئرلینڈ کا ہے۔ ایلس جو ایک بہت پرانی، بہت پیاری ساتھی ہے۔ لیکن اب وہ کچھ نہیں بتاتی، بات بھی نہیں کرتی۔ اب وہ اس قدر کینے پن پر اتر آئی ہے کہ ملتی بھی ہے تو اجنبیوں کی طرح۔ بس بچوں میں مگن رہتی ہے اور بالوں کو سفید رومال میں کس کر باندھتی ہے اور ہر روز گرجا کے پیانو پر بیٹھ کر گاتی ہے اور اپنی آواز میں ڈوب جانا چاہتی ہے۔ دھوکے باز لڑکی، تو نے دل کا چین پالیا ہے؟ میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں۔

”ہلو عذرا۔“ وہ اپنے کینے پن کے سرد نا آشنا لہجے میں کہتی ہے۔

”ہلو۔“ میرے حلق میں کچھ اٹک جاتا ہے۔ جیسے میں نے کبھی اسے ”ایلی“ کے نام سے نہیں پکارا، جیسے کبھی اس نے روشن محل کے توشہ خانے کے فرش پر بیٹھ کر پکوان تیار نہیں کیے، جیسے کبھی اس نے فوارے پر، ہینپل کی جڑ پر، باغ کے کونے کونے میں بیٹھ کر پہروں ارشد سے باتیں نہیں کیں۔ ”کیا ہم نے کبھی سوچا تھا؟“ میں پوچھنا چاہتی ہوں، ”یہ سب جو بیٹا۔“ خدایا وہ کچھ بھی نہیں بتاتی۔ اس کے باوجود وہ اس قدر عزیز دوست ہے۔ دن

رخصت ہو گیا اور روشن محل میں لوگ اب سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ رات کا کھانا کب کا ختم ہو چکا۔ اب وہ درمیانی کمرے میں بیٹھے قہوہ پی رہے ہوں گے یا پی چکے ہوں گے اور اسے کوئی بلانے نہیں آیا۔ اسے کوئی بلانے نہیں آئے گا کہ یہ اس کا حکم ہے۔

”لمحوں کے بہاؤ کو میں روک سکتی ہوں؟“ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

بارش تھوڑی دیر کے لیے رک گئی تھی۔ وہ بجلی کے بٹن پر سے ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آئی۔ نیم روشن گیلریاں طویل اور خالی تھیں۔ روشن آغا کے سوا سب کے رہائشی کمرے دوسری منزل پر تھے۔ اونچے، تنگ محرابی دروازے بند تھے اور منقش شیشوں پر روشنیاں جل رہی تھیں۔

روشنیاں بجھ رہی تھیں۔ یہ ممی کا کمرہ ہے جس میں ابھی ابھی روشنی گل کی گئی ہے۔ میری ماں، جس کا میری زندگی سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ بس جیسے یہ بند کمرہ ہے اور میں اس کے آگے سے گزر رہی ہوں۔ اور ممی اندر اکیلی رہ رہی ہیں، تنہا اور محفوظ، بے حد شان و شوکت کے ساتھ لیکن میں عذرا ہوں ممی، میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ خدا را بتلائیے۔ گیلری خاموش اور اندھیری ہے اور میں اکیلی یہاں سے گزر جاتی ہوں۔ یہ نجھی کا کمرہ ہے۔ میری پیاری بہن جس کو اس گھر میں صرف میں سمجھتی ہوں اور اسی لیے اس سے محبت کرتی ہوں۔

وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ نجھی کبیلوں میں لپٹی، دیوار سے ٹیک لگائے بستر پر بیٹھی تھی۔

”عذرا آیا۔۔۔ روشن آغا کھانے پر آپ کو پوچھ رہے تھے۔“

”مجھے وہ منظم سناؤ“ اس نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا، ”جو آج سب کو سنا رہی تھیں۔“

”ایک شہزادہ اور اس کا دوست مینڈھا، عذرا آیا؟“ اس نے آنکھیں جھپکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں بھئی اکیلا شہزادہ۔“

”نہیں عذرا آیا اس کا دوست مینڈھا بھی۔“ نجھی نے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر

رکھ کر سمجھانے کی کوشش کی۔

”ارے نہیں بھئی“ عذرا نے شپٹا کر کہا، ”اکیلے شہزادے کی منظم سناؤ۔“

”اکیلا؟“ وہ آنکھیں جھپکنے لگی۔

”اچھا کل سنیں گے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے نجھی کو لٹایا، کٹن ٹھیک کیے اور

جھک کر اس کی پیشانی کو چوما۔ ”شب بخیر بی بی، اب آپ سو جاؤ۔“

بتی بچھا کر وہ باہر نکل آئی۔ گیلری اسی طرح طویل اور خالی تھی۔ دوسرے سرے پر

ایک مہری نے سائے کی طرح لپک کر گیلری پارکی اور زینے پر غائب ہو گئی۔ بارش پھر شروع ہو چکی تھی۔

یہ پرویز کا کمرہ ہے۔ اور اس کی بیوی کا، اس دوسری، اجنبی عورت کا جو مجھے نہیں جانتی۔ بس جیسے ہم روشن محل میں سو رہے ہیں اور سڑک پر سے کوئی مسافر بھیگتا ہوا گزر جائے۔ لیکن پھر بھی یہ اس کا کمرہ ہے اور اس میں اس کا سامان رکھا ہے جس پر گرد جم رہی ہے اور جسے اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں کھول سکتا۔ اور پرویز، میرا بھائی، جو میرا دوست بھی تھا اس کے ساتھ چلتا ہوا دور نکل گیا ہے، اور میں۔ وہیں پر آگئی ہوں جہاں سے چلی تھی۔ کاش میرا بھائی مجھ سے، میری دنیا سے صلح کر لینے پر آمادہ ہو سکتا، کاش۔ لیکن میں اس کی پروا نہیں کرتی کیونکہ اب میں اپنے کمرے کے سامنے آگئی ہوں۔ بالآخر یہ میرا کمرہ ہے۔ اس جگہ میں بچپن سے رہتی آئی ہوں۔ یہاں میں نے کیسے کیسے خواب دیکھے ہیں۔ مجھے اس کمرے سے نفرت ہے۔ اس کے دریچے کے شیشوں پر یوکلینٹس کے پتوں کا عکس پڑتا ہے جو مجھے ناپسند ہے۔ بارش جب تیز ہو جاتی ہے تو بے پناہ شور اندر آتا ہے کیونکہ یہ گیلری کے اختتام پر ہے۔ یہ بھی مجھے ناپسند ہے۔ اس کمرے میں میں نے کیا کیا سوچا ہے، کیسے کیسے پروگرام بنائے ہیں۔ ان تیس سالوں میں جو مجھے یاد ہیں کتنے ہی مسرت کے، کتنے ہی دکھ کے لمحے گزرے ہیں۔ اس لمحوں کے بہاؤ کو میں کبھی بھول سکتی ہوں؟ اور اس کمرے کو، جس کی کارنس پر کتنے ہی پھول سوکھ گئے اور کتنے ہی تازہ پھول ان کی جگہ رکھے گئے، پھول جو صرف میری خاطر، اس کمرے کی خاطر اکائے گئے، اور کتنے ہی۔۔۔ ارے یہ خاموشی کیوں ایک دم ہو گئی سارے میں! میرے ساز، میرے سازوں پر مٹی جم رہی ہے اور برآمدوں میں اتنی ویرانی سمٹ آئی ہے۔ میں ان کو یہاں لاکر رکھوں گی تاکہ وہ دھل جائیں اور یہ خاموشی ٹوٹ جائے۔

اس نے سارے سازوں کے غلاف اتارے اور ایک ایک کر کے انہیں باہر لے آئی۔ طویل، اندھیری گیلری میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تان پورہ، ستار، واٹن، طلبہ ہارمونیم۔ کوئی ایک دیوار کے ساتھ، کوئی دوسری دیوار کے ساتھ، کوئی دروازے کے پاس، کوئی ریلنگ کے ساتھ۔ پھر دیر تک وہ ان کے درمیان پھرتی اور احتیاط سے ان پر انگلیاں دھرتی رہی۔ انہیں خاموش اور بے اثر پا کر اسے خوشی ہوئی۔ اندھیرے میں بھدی، سیاہ شکلیں، وہ دیوار کے سائے میں سوئے ہوئے فقیروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

جب وہ بہت تھک گئی تو جا کر لکھنے کی میز پر بیٹھ گئی۔

”اب؟ اب میں خط لکھوں گی۔“ لیمپ جلاتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کس کو؟ کیا فرق پڑتا ہے۔“ سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اس نے لکھنا شروع کیا:

”پیاری شیریں!

عذرا کے دروازے میں وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ کھلے دریچے میں سے ہوا اور بارش اندر آ رہی تھی۔

”بی بی پاگل ہوئی ہو۔“ انہوں نے تیزی سے جا کر درپچہ بند کیا، کبیل اٹھا کر عذرا کے شانوں پر ڈالا اور قالین کو دیکھا جو آدھے سے زیادہ بھیگ چکا تھا۔ ”اتنا پانی پڑ رہا ہے اور آپ بیٹھی بھیگ رہی ہیں۔ اتنی رات گئے۔“ عذرا کرسی سے اٹھی اور کبیل کو شانوں پر ٹھیک کر کے پھر بیٹھ گئی۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے اعصابی لہجے میں کہا پھر خالہ کو عجیب نظروں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ گھبرا گئی۔

”بیٹھ جائیے۔“ اس نے پریشان تر لہجے میں کہا اور کاغذات الٹنے پلٹنے لگی۔ خالہ نے اس کے چہرے پر بہت کچھ پڑھ لیا۔ ”عذرا تم ایک بچے کی طرح ہو جو چوری کرتا ہوا پکڑا جاتا ہے۔ حالانکہ تم نہ بچہ ہو نہ تم نے چوری کی ہے۔“ خالہ نے پرسکوت آواز میں کہا۔ ”ایسا کیوں ہے؟“

عذرا صرف خاموش، زخم خوردہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ خالہ نے میز کا کونہ مضبوطی سے پکڑ لیا اور کھڑی رہیں۔ لمبی بیماری نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ سفید بالوں کی لٹیں ان کے کانوں پر بے ترتیبی سے لٹک رہی تھیں اور میز کا سہارا لیے کھڑی وہ میکسی اور کسمپرسی کی تصویر نظر آتی تھیں۔ بارش دریچے کے شیشوں پر سرما رہی تھی۔ دفعتاً وہ بہت دکھ سے بولیں: ”تمہاری عمر ڈھل رہی ہے۔ اور تم ابھی نادان ہو۔“

عذرا نے دہل کر انہیں دیکھا۔ اس کا رنگ سنولا گیا اور ڈھلتے ہوئے چہرے کی لکیریں کانپنے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آپ۔ اپنے کمرے میں جائیں۔ آپ یہاں کیوں آئی ہیں۔“

خالہ بڑھاپے کے باوجود جذبے کی شدت سے کانپنے لگیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ ایک دوسرے کے مقابل آن کھڑی ہوئی تھیں، اس مقام پر جہاں وہ محض دو عورتیں تھیں، ایک دوسرے کے لیے حقارت اور ترحم کے جذبات لیے ہوئے!

چند لمحوں تک وہ گستاخی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر عذرا کی میسران الم ناک نظروں کے سامنے خالہ ٹوٹ گئیں۔ میز کا کونہ پکڑے پکڑے وہ فرش پر بیٹھ گئیں اور رونے لگیں۔ عذرا کرسی پر بیٹھ کر کاغذوں کو دیکھنے لگی۔ دریچے کی درزوں میں سے پانی اندر آ رہا تھا۔ خالہ کی بلی ان کی قمیض کے دامن سے کھیل رہی تھی۔

جب خالہ نے آنکھوں پر سے ہاتھ اٹھایا تو اپنے آپ کو اسی طرح تنہا بیٹھی ہوئے پایا۔ عذرا کرسی پر ساکت بیٹھی تھی، قریب قریب بے تاثر اور سنگین! دفعتاً اس وقت خالہ کو اپنے اور عذرا کے، اپنے اور اس دوسری عورت کے درمیانی فاصلے کا احساس ہوا، بعد جو ان کے درمیان

پیدا ہو گیا تھا۔

”تم۔ کیا تم چاہتی ہو کہ روشن آغا اس غم میں ہلاک ہو جائیں اور۔“ خالہ نے کہا، ”اور میں یہاں سے چلی جاؤں؟“

”خالہ۔“ عذرا نے تقریباً چیخ کر کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ خالہ نے دہشت سے دیکھا کہ وہ دوسری عورت ان سے زیادہ جوان، زیادہ مضبوط اور زیادہ سرد تھی۔ اس کی کچلتی ہوئی سرد نظروں کے سامنے خالہ لوٹنے پر مجبور ہو گئیں۔ ایک نامعلوم ندامت کے مارے انہوں نے جھک کر بلی کو اٹھایا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ جب وہ باہر آ رہی تھیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ عذرا کی زندگی سے بعید تر ہوتی جا رہی ہیں۔ بالآخر وہ ان سے الگ، ایک بالکل دوسری عورت تھی۔

جب وہ اکیلی رہ گئی تو بستر پر جا لیٹی۔ اس کے دماغ میں مکمل سناٹا تھا۔ گھبراہٹ کے باوجود اس کا چہرہ سنگین تھا، ایک ایسا گونگا بے تاثر چہرہ جس کا بوجھ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لیٹے لیٹے اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں ہوا کی شدید کمی تھی۔ اس نے اٹھ کر درپچہ کھول دیا اور کھڑے کھڑے اس کا چہرہ بھیگ گیا۔ وہ دوبارہ بستر پر لوٹ آئی۔ اب تھوڑے تھوڑے وقفوں پر سناٹا اس کے دماغ میں داخل ہونے لگا۔ لیکن ہوا پھر بھی نہ تھی، ہوا کی ایک رفق اس کے پھیپھڑوں میں نہ تھی۔ ایک دم بہت زیادہ گھبرا کر اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کیے۔ اس کے حلق میں سے گرمی نکل رہی تھی اور زبان اکڑ گئی تھی۔ اس نے زبان کو تالو پر پھیرا۔ ہر سانس کے لیے اسے مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ مایوس ہو کر اس نے چیخنا چاہا لیکن آواز کہیں دور رہ گئی تھی۔ اب اس کے کانوں میں شور مچ رہا تھا۔ کانوں میں اور دماغ میں اور ساری دنیا میں۔ اس کے پھیپھڑے بند ہو رہے تھے یہ کیا ہے؟ یہ کون سا وقت ہے؟ اس نے کوشش کر کے سوچا اور مشکل مشکل سانس لیتی رہی۔ اس نے رونے کی ایک بے سود کوشش کی۔ صرف سانس کو جاری رکھنا اس وقت کا، اس لمحے کا اہم ترین کام تھا۔ سانس جو زندگی کا آخری نشان ہے۔ اسے جانکنی کا خیال آیا اور بہت زیادہ دہشت زدہ ہو کر اس نے سانس لینا جاری رکھا۔ لیکن اس کوشش میں اس کے سر میں سے پسینہ نکلنے لگا۔ سر میں سے اور پیشانی اور گردن اور چھاتی میں سے اور کمر اور ٹانگوں میں سے۔ وہ پسینے میں بھیگ گئی۔ انتہائی تکلیف کی حالت میں اس نے سر اور کندھوں کو دائیں بائیں ہلانا اور کراہنا شروع کیا۔

دیر تک وہ ادھ مے سانپ کی طرح بستر پر تلملاتی رہی۔ جب تکلیف ختم ہوئی تو اس کے چہرے پر راکھ کے رنگ کی لکیریں گہری ہو چکی تھیں اور اس کے اندر کوئی شے، سرکش اور زور آور، ٹوٹ چکی تھی۔

بارش تھوڑی دیر کے لیے رک گئی تھی اور کمرے میں گیلے قالین کی بو پھیل رہی تھی۔

(۳۱)

سردیوں کا موسم گزر رہا تھا جب علی کو نعیم کے رہا ہو کر گاؤں پہنچنے کی اطلاع ملی۔ اسی رات کو اپنی بیوی سے مشورہ کرنے کے بعد وہ گاؤں کے لیے روانہ ہو پڑا۔ وہ اب وہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ گاؤں واپس جا کر کھیتی باڑی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ماں ایک سال ہوا مرچکی تھی اور زمینوں پر بڑی ماں (نعیم کی ماں) کا قبضہ تھا۔ چنانچہ اسے نعیم کی واپسی تک رکنا پڑا تھا۔

نعیم اور عذرا کا بڑا مکان برسوں سے بند پڑا تھا۔ اس کا باغ ویران ہو چکا تھا اور راستے گلے سڑے پتوں اور آندھی سے ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں سے ڈھکے پڑے تھے۔ گھاس میں جا بجا بوڑھے پرندوں کی لاشیں پڑی ہوئی ملتی تھیں۔ ایک بوڑھا رکھوالا رہ گیا تھا جو دن بھر دھوپ میں بیٹھا حقہ پیتا اور قناعت سے اپنے اردگرد کی مرقی ہوئی دنیا کو دیکھتا اور منظر انداز کرتا رہتا تھا۔ اس روز بھی اس نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے دیوار کے ساتھ ساتھ گزرتے ہوئے علی کو دیکھا اور پہچان کر دھیان ہٹا لیا۔ وہ نعیم کا پرانا نوکر تھا لیکن علی کو پسند نہ کرتا تھا۔ علی نے آم اور امرود کے بہترین درختوں کو دیکھا جو ضائع ہو چکے تھے اور اس کے دل میں افسوس پیدا ہوا۔ اوپر کی منزل کی کھڑکیوں کے چند شیشے بھی ٹوٹ چکے تھے۔ گاؤں کے چاروں طرف تیزی سے پکتی ہوئی فصل کھڑی تھی۔ علی نے لمبا راستہ پکڑا جو مختلف کھیتوں کا چکر کاٹ کر گاؤں میں داخل ہوتا تھا۔ کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے وہ دونوں ہاتھ فصل پر پھیرتا رہا، یوں جیسے کہ وہ گائے کا نومولود پچھڑا ہو۔

مویشیوں کے احاطے میں علی کی بوڑھی بھینس اسے دیکھ کر خوشی سے ڈکرانے لگی۔ علی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جگالی کا جھاگ اس کے منہ سے صاف کرتے ہوئے سوچا: ”جانور نہیں بھولتے۔“

اندر نعیم اپنی ماں کے پاس بیٹھا کھا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر گرمجوشی سے اپنے بھائی کے ساتھ گلے ملا۔

”میں خود آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔“ اس نے کہا اور اسے اپنے پاس بٹھا کر مکھن اور روٹی کھانے کو دی جسے علی غیر معمولی اشتہا کے ساتھ کھانے لگا۔ بوڑھی اسے دیکھ کر ہمدردی سے رونے لگی۔

مگر جب دوبارہ نعیم نے اسے دیکھا تو اسے صدمہ ہوا۔

”تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔“ اس نے پوچھا۔
 علی نے جھینپ کر اسے دیکھا اور بولا: ”تم بھی تو بوڑھے دکھائی دے رہے ہو۔“
 ”بوڑھے تو سب ہو جاتے ہیں، پر جوان آدمی۔ وہاں کھانے کو نہیں ملتا؟“
 ”خالص نہیں ملتا۔“ علی نے مختصر کہا۔

کھانے کے بعد وہ باہر نکل آئے۔ دیر تک وہ مویشیوں کے درمیان پھرتے اور باتیں کرتے رہے۔ نعیم کے کہنے پر رکھوالا علی کو ہر ایک مویشی کی پچھلی پانچ سالہ زندگی کے حالات، جن میں اس کی بیماریوں، اس کی خوراک اور اس کا کام شامل تھا، مختصراً بتاتا جا رہا تھا۔ ان سے فارغ ہو کر وہ کھیتوں کو نکل گئے۔ ایک پہر تک وہ فصلوں میں گھومتے رہے۔ راستے میں ان کو کئی پرانے دوست ملے جنہوں نے رک کر دونوں بھائیوں کی خیریت پوچھی اور انہیں پھر سے اکٹھا دیکھنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ نعیم نے عمداً اپنے بڑے گھر کی طرف جانے سے گریز کیا گو علی نے دو ایک دفعہ دبی زبان سے خواہش ظاہر کی کہ انہیں وہاں جا کر کم از کم پھلدار درختوں کی حالت کو دیکھ آنا چاہیے۔

واپسی پر نعیم نے پوچھا: ”عائشہ کیسی ہے؟“
 ”ٹھیک ہے۔“ علی نے بتایا۔

سہ پہر کے وقت علی سو گیا۔ جب اٹھا تو شام پڑ رہی تھی اور نعیم کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی ماں نے دونوں کے آگے بھنے ہوئے پرند اور گوبھی کے سالن کا کھانا لا کر رکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کھانا شروع کرتے نعیم بولا:
 ”میں نے کہا نا کہ میں خود آنے والا تھا۔“
 علی سالن کی پلیٹ کو آہستہ آہستہ گھمانے لگا۔
 ”چھٹی لے کر آئے ہو؟“

علی پھر خاموش رہا۔

”بولتے کیوں نہیں؟“

”میں وہاں نہیں رہنا چاہتا۔ میں گھر آنا چاہتا ہوں۔“ علی نے کہا۔

نعیم نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی روٹی برتن میں رکھ دی۔ ”لیکن۔ ہاں میں سمجھتا ہوں۔“
 پر ابھی کچھ دیر تک تو تمہیں وہیں پر رہنا پڑے گا۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ ہمیں مزدوروں میں کام کرنا ہے مزدوروں کی جماعت اس وقت ہندوستان کی بہت بڑی طاقت ہے۔
 تمہیں پتا ہے؟“

علی کے ہاتھ، جو شوربے کی پلیٹ کو گھما رہے تھے، رک گئے۔

”تو اب - میں بھی؟“ وہ غصے سے بولا، ”تم نے ہمیشہ میرے ساتھ دشمنی کی ہے۔ تم نے یہاں سے مجھے نکالا، اب مجھے جیل بھیجنا چاہتے ہو؟ تم خود جا کر جو مرضی ہو کرو۔“

نعیم اٹھ کھڑا ہوا اور پشت پر ہاتھ باندھ کر کمرے میں چکر لگانے لگا۔ ایک لوہے کا برتن اس کے پاؤں کی ٹھوک سے اڑ کر شور مچاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کی ماں آگ جلانا چھوڑ کر دم بخود بیٹھی تھی۔ دھواں چولہے میں سے نکل نکل کر کمرے میں بھر گیا تھا اور آنکھوں کو لگ رہا تھا۔

ایک بار علی کے سر پر رک کر اس نے کہا: ”لیکن تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔ خود اپنی خاطر - احمق۔“ اور جواب نہ پا کر چل پڑا علی نے قیض کے دامن سے آنکھیں پونچھیں اور دبی زبان سے دھوئیں کو کالی دی۔

یکلخت نعیم غصے سے بولا: ”پھر تم یہاں نہیں آسکتے۔ ادھر کا رخ بھی نہیں کر سکتے۔“

”میں وہاں بھی نہیں رہ سکتا۔ میں تنگ آچکا ہوں۔“

”جاؤ۔“ نعیم گرجا، ”جہنم میں جاؤ یا کہاں پر ابھی نکل جاؤ۔ جاؤ۔“

”جاتا ہوں۔“ علی آدھے قد سے اٹھ کر پھر بیٹھ گیا۔

”ابھی نکل جاؤ۔“ نعیم پھر گرجا۔

”جاتا ہوں جاتا ہوں۔ کھانا تو کھانے دو۔“

”بھاگ جاؤ سؤر۔ جہاں مرضی ہو جاؤ۔“ اس نے دروازے کی طرف بازو لمبا کر کے کہا۔

”اچھا۔ اچھا۔“ علی نے انتہائی غصے میں کہا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

روانگی کی تیزی میں اس نے اپنی بوڑھی بھینس کی لگاوٹ کو بھی نہ دیکھا جس نے اسے دیکھ کر کان کھڑے کر لیے تھے۔ گاؤں کو ایک نیلگوں دیہاتی کہہ نے لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ جوہڑ کے کنارے رک کر پانی میں چمکتے ہوئے تاروں اور درختوں کے عکس کو دیکھنے لگا۔ غصے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ایک زبردست رنج تھا جس نے اس کے دل کو مردہ پرندے کی طرح کر دیا تھا، خاموش اور نا طاقت۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں پر اس نے چند پتھر اٹھا کر پانی میں پھینکے۔ پھر وہ قدموں کی آواز پر چونک پڑا۔ اندھیرے میں ایک ہیولا کمزور چال سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”علی۔“ شام کے سناٹے میں نعیم کی آواز آئی جس میں نرمی تھی۔

”سورنی کا جنا۔ سوتیلا۔“ اس نے دانت پیس کر کہا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

گھر پہنچ کر جب اس نے کھانا کھایا اور عائشہ کو ہر دم بک بک کرتے رہنے پر پیشا تو اس کے دل پر موت کا سایہ گہرا ہو گیا۔ صبح سویرے کام پر جاتے ہوئے اسے عجیب احساس ہوا۔

وہی گلیاں ، مکان ، نل ، وہی فیکٹری ، مشینیں ، دیواریں ، وہی جگہ ، وہی منظر ، وہی لوگ جن سے وہ ہر روز ملتا تھا ، ہر چیز ، ہر شے اس قدر حوصلہ شکن طور پر یکساں اور ساکن اور غیر مبدل ۔ دفعتاً اس جگہ کی تنگی اور خوفناک حد بندی کا احساس بوجھ بن کر اس کے دل پر بیٹھنے لگا ۔ وہ فیکٹری کے دروازے سے لوٹ آیا ۔

(۳۲)

وہ کئی گھنٹے تک ریل کے سٹیشن پر آتے جاتے مسافروں ، ریل گاڑیوں اور گڈ مڈ ہوتی ہوئی لائنوں کو دیکھتا پھرا ۔ آخر تنگ آکر شمال کی طرف جانے والی ایک ریل گاڑی میں سوار ہو گیا ۔ سارا راستہ وہ ڈبے میں بیٹھا رہا ۔ راستے میں کئی بار لوگوں نے کسان جان کر اسے نشست سے نیچے دھکیل دیا اور خواہ مخواہ جھگڑا کرنے لگے ، اور دور کے مسافر اسے بھگواڑا سمجھ کر حقارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں باتیں کرتے رہے لیکن وہ خاموش بیٹھا اپنے دل میں تازہ تازہ حاصل کردہ آزادی کے خوف کو پالتا رہا یہاں تک کہ ، قریب تیس گھنٹے کے سفر کے بعد ، ایک بڑے سے ڈھکے ہوئے سٹیشن پر پہنچ کر گاڑی خالی ہونا شروع ہوئی ۔ ٹکٹ دیکھنے کوئی نہ آیا ۔ اس نے جوتا پہنا اور باہر نکل آیا ۔ یہ لاہور کا سٹیشن تھا ۔ وہ حیران رہ گیا ۔ دیر تک وہ بیچ پر بیٹھا آتے جاتے مسافروں کو دیکھتا رہا ۔ پھر بھوک محسوس کر کے اٹھا اور چائے کے ٹھیلے والے کے پاس پہنچا ۔

”یہاں کیسے آئے ہو ؟“ چائے والے نے پوچھا ۔
 ”ویسے ہی ۔“ علی نے چائے کی پیالی خالی کر کے اسے پکڑاتے ہوئے کہا ۔
 ”نوکری کی تلاش میں ؟“

”ہاں ۔“

”مل جائے گی ۔ مل جائے گی ۔“ چائے والے نے تشفی کے لہجے میں کہا ، ”جب تک تم میرے پاس رک سکتے ہو ۔ میں بھی دلی سے نوکری کی تلاش میں آیا تھا ، یہاں آکر کام شروع کر دیا ۔ پھر یہیں پر جھونپڑا ڈال لیا ۔ میری ماں اور میں ہوں ۔ بس پنجاب روزگار کے لیے اچھا ہے ۔ جب تک کام نہ ملے جب تک جو مرضی آئے دے دینا ۔ جب کام مل جائے گا جب جو مرضی آئے کرنا ، الگ ہو جانا یا جو مرضی آئے ۔ کیا کہا کہ کہاں کے رہنے والے ہو اہس ؟“
 تھوڑی دیر کے بعد وہ چائے والے کی تجویز پر شہر دیکھنے کی غرض سے چل پڑا ۔ یہ شہر اسے اچھا لگا ۔ یہاں کے لوگ موٹے تازے تھے اور دیہاتیوں کی طرح اونچی کرخت آوازوں میں باتیں کرتے تھے ۔ وہ عمر میں پہلی مرتبہ اتنے بڑے شہر میں آیا تھا ۔ رستے میں کئی جگہ پر وہ

دلچسپی کی چھوٹی موٹی چیزوں کے پاس رکا۔ ایک کیمرے والا سڑک کے کنارے ایک دیہاتی کی تصویر اتار رہا تھا۔ ایک جگہ سرکس لگا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک گنے کھاتے ہوئے ہاتھی کے پاس کھڑا رہا۔ پھر ایک میل گاڑی گزری جسے ایک کسان اور اس کی بیوی ہانک رہے تھے اور لاپرواہی سے سڑک کے بیچوں بیچ چلے جا رہے تھے۔ علی نے ہاتھ بڑھا کر ایک میل کا سر تھپتھپایا۔

ایک بازار میں داخل ہوتے ہوئے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہاں پر لوگوں کے اجتماع میں وہ بد نظمی اور لاپرواہی نہ تھی جو منظم شہری زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ کاروبار معطل تھا اور لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کھڑے ہر اس آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے درمیان پولیس کی ایک غیر معمولی تعداد نظر آرہی تھی۔ ایک دکان پر ایک آوارہ میل کھڑا کپڑے کے تھان کو چبا رہا تھا۔ لوگوں کے چہروں سے رونق غائب تھی۔ بظاہر وہ پر امن طریقے سے کھڑے تھے مگر ایسا ہراساں اور چپ چاپ امن جس سے بد امنی کا خدشہ پیدا ہوتا تھا۔ علی جلد جلد ان کے درمیان سے گزر گیا۔ صرف میل کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ دیکھ کر کہ وہ خصی جانور تھا اسے رنج ہوا اور اس نے ان لوگوں کو، جو اس حرکت کے ذمہ دار تھے، دل میں گالی دی۔ وہ ہمیشہ سے ان خود غرض لوگوں کے خلاف تھا جو زیادہ کام لینے کی خاطر میلوں کو خصی کروا دیتے تھے۔

اگلے بازار میں بھی اسے اس آفت سے پھٹکارا نہ ملا۔ یہ بازار تو گویا ساری چیز کا مرکز تھا۔ لوگ وہاں باقاعدہ جلوس کی شکل میں دونوں طرف جمع تھے۔ ان کے بیچوں بیچ چند باوردی لوگ، جو رضا کار معلوم ہوتے تھے، ہاتھوں میں معمولی ہتھیار مثلاً لٹھی، میلچہ، بلم یا تلوار لیے سیدھی قطاروں میں کھڑے تھے۔ ایک شخص خاکی وردی میں ملبوس ہاتھ میں میلچہ اٹھائے ان قطاروں کے سرے پر یوں کھڑا تھا جیسے ابھی ابھی تقریر کر چکا ہے۔ ہجوم سے دبے دبے نعروں کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ علی نے خطرہ محسوس کر کے وہاں سے گزر جانا چاہا۔ جب وہ ہجوم میں سے گزر رہا تھا تو چند پولیس کی لاریاں آگے رکیں اور ان میں سے چند انگریز افسر اور مسلح گورے سپاہی کود کود کر برآمد ہوئے۔ اس کے دیکھتے دیکھتے ایک انگریز افسر نے آگے بڑھ کر سرے والے میلچہ بردار سے کوئی بات کی۔ اس نے جواب میں انگریز افسر کے منہ پر زور دار طمانچہ مارا۔ انگریز نے پیچھے کود کر ریوالور نکالا اور ایک فٹ کے فاصلے سے گولی چلا دی۔ گولی اسے آنکھوں کے درمیان لگی اور وہ گر پڑا۔ لیکن اس سے پہلے کہ افسر سنبھلتا عقب سے کسی نے اس کے پہلو میں بلم چھبوا دی۔ وہ ریوالور پھینک کر بلم کے دستے پر جھک گیا۔ پیچھے سے دوسرا انگریز افسر جو بھاگا آ رہا تھا رک گیا اور ریوالور ہوا میں لہرا کر چلایا: ”فائر۔ فائر۔“

مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ چشم زدن میں بازار گولیوں کے خشک دھماکوں اور بارود کی بو سے بھر گیا۔ منظم رضا کار، جن میں بھگدڑ نسبتاً کم تھی، کود کود کر اور چکر کھا کھا کر گر رہے تھے۔ علی کھڑا کھڑا رہ گیا۔ پھر بھاگتے ہوئے ہجوم کے دھکوں کے ساتھ وہ بھی بھاگنے لگا۔

پھر ایک زخمی سے ٹھوکر لگنے پر دور تک لڑھکتا ہوا چلا گیا ، بھر چلا کر اسے کوسا اور چھلانگ لگا کر ایک زینے پر چڑھ گیا اور بے تحاشا دروازہ پیٹنے لگا ۔ پل کے پل کو مڑ کر اس نے تیزی سے گزرتی ہوئی زرد ، خوفزدہ شکلوں اور موت کا ناچ ناچتے ہوئے لوگوں کو دیکھا ، پھر اونچی روتی ہوئی آواز سنور کے ساتھ ساتھ دروازہ پیٹنے لگا ۔ دروازہ کھل گیا ۔ علی کے دھکے سے دروازہ کھولنے والی عورت لڑکھڑا کر زینے پر جا پڑی ۔

وہ ایک معمولی شکل و صورت کی عورت تھی جس کی جوانی ڈھل رہی تھی ۔ علی گھبراہٹ میں کافی دیر تک چٹخنی بند کرنے کی کوشش کرتا اور منہ میں بڑبڑاتا رہا ۔ اچانک عورت نے بڑے لاپرواہ انداز میں کالی دی اور اس کا ہاتھ جھٹک کر چٹخنی بند کر دی ۔

”چلو ۔“ اس نے اسی میزار لہجے میں کہا اور علی کو آستین سے پکڑ کر زینے میں دھکیل

دیا ۔

آگے پیچھے سیرھیاں چڑھتے ہوئے دونوں اوپر آگئے ۔ چھوٹے سے کمرے میں پہنچتے ہی علی چارپائی پر بیٹھ گیا ۔ عورت کھڑکی کی درز میں سے نیچے کا نظارہ کرنے لگی ۔ انسانی چہنجوں اور گولیوں کے چلنے کی آوازیں لگاتار آ رہی تھیں ۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ ہاتھ پشت پر باندھ کر کمرے میں چکر لگانے لگتی ۔ اس کا چہرہ زرد مگر بے خوف تھا ۔

”چوہوں کی طرح مر رہے ہیں ۔“ ایک دفعہ رک کر اس نے زیر لب کہا اور حقارت سے علی کو دیکھا ۔ اس کے چلنے کے انداز سے بے حیائی اور مردانہ پن ظاہر تھا ۔ علی خاموش بیٹھا حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس کے ساتھ اسے دیکھتا رہا آہستہ آہستہ گولیوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں ۔ کبھی کبھی دور و نزدیک سے ایک آدھ فائر ہوتا اور پھر سناٹا چھا جاتا ، سناٹا جو زخمیوں کی کراہوں کی وجہ سے شدید ہوتا جا رہا تھا ۔ عورت مڑی اور باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ تمسخر کچھ حقارت سے بولی :

”تم وہاں پر مرے پڑے ہوتے ۔ اب لو کی طرح مست بیٹھے ہو ۔ اگر دیکھو ، آؤ ۔“

علی حققت سے ہنستا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ یکلخت عورت نے دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹایا اور کھڑکی بند کر دی ۔ نیچے کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا ۔ پھر ایک دم بہت سے ہاتھ دروازے پر پڑنے لگے ۔ عورت ، علی کو بازو سے پکڑ کر کھسیٹتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی اور پچھلی طرف کی کھلی میں اترنے والے تاریک زینے میں غائب ہو گئی ۔ آدھے رستے میں رک کر اس نے دیوار میں سے ایک تختہ ہٹایا اور علی کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر اس میں دھکیل

دیا ۔

”جاؤ ۔ اندر جاؤ ۔ چلو ۔“

جب وہ اندر گھس کر بیٹھ گیا تو عورت نے تختہ اپنی جگہ پر برابر کیا اور واپس آ کر زینے

کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ پھر اس نے جا کر بازار والا دروازہ کھول دیا۔ پولیس اور فوج کے سپاہی راشٹلوں کے دستے بجاتے اوپر چڑھ آئے۔

”کہاں ہے؟“ ایک پنجابی سپاہی نے پوچھا۔
”کون؟“

”تیری ماں کا یار۔“

”یہاں کوئی نہیں ہے۔“

ایک سکھ سپاہی نے ڈنڈا گھما کر عورت کے چوتڑوں پر مارا اس نے بلبلا کر کالی دی۔
”بتا کہاں گیا؟“

”یہاں بس میں رہتی ہوں۔ مجھے پتا نہیں۔“ عورت چوتڑ ملتے ہوئے بولی۔

”بتا۔“ پنجابی سپاہی خوفناک کالیاں بکتا ہوا جھپٹا اور اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا

دوسری دیوار تک لے گیا۔ عورت ہوا میں ہاتھ چلانے لگی۔

”بتا رنڈی۔“ سپاہی نے اس کے بال بازو پر لپیٹتے ہوئے کہا۔ عورت نے چیخ مار کر

ناخن سپاہی کی ران میں کاڑ دیے۔ سپاہی نے ٹانگیں جھاڑ کر فوجی بوٹوں کی ایک زور دار ٹھوکر عورت کی کمر میں ماری، ”بول۔ رنڈی۔“

عورت نے تڑپ کر سر اٹھایا اور کالیوں کی بوچھاڑ اس کے منہ سے نکلی: ”ہاں میں رنڈی

ہوں۔ میں ہوں ٹھیک ہے۔ یہاں ہر کوئی آسکتا ہے۔ مجھے پتا نہیں یہاں کون کون ہے۔
یہاں کوئی نہیں ہے۔“

گورا سپاہی برا سا منہ بنا کر پیچھے ہٹ آیا پھر اس کے پیچھے پیچھے آدھے سپاہی دوسرے

کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں وہ الماریاں اور صندوق کھول کھول کر دیکھتے رہے۔ پھر چارپائیوں

کے نیچے، کھڑکیوں کے باہر اور چھت بجا بجا کر دیکھنے کے بعد زینے کا دروازہ کھول کر اندھیرے

میں اتر گئے۔ نیچے پہنچ کر انہوں نے گلی کا دروازہ کھول کر دیکھا، اسے بند کیا اور لوٹ آئے۔

جب وہ پہلے کمرے میں پہنچے تو سپاہی عورت کے بالوں کو سانپ کی طرح بازو پر لپیٹے اس

کی چھاتیاں مروڑ رہا تھا۔ عورت کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید تھا۔

”تئیں ہائے؟“ گورے نے اکتا کر پوچھا۔

”نہیں اے۔۔۔۔۔“

اس کی کلائی میں عورت نے دانت کاڑ دیے تھے۔ سپاہی نے دونوں ہاتھ چھڑائے اور

پیچھے کود کر پوری قوت سے اس کے شانوں کے درمیان بوٹ کی ٹھوکر ماری۔ اس کی کلائی سے

خون بہ رہا تھا۔ پھر انہوں نے مارنا شروع کیا۔

جب تک وہ اپنے پاؤں پر قائم رہی وہ گھونسوں، بوٹوں اور راشٹلوں کی ضربوں سے اسے

ایک سے دوسری دیوار کی طرف اچھالتے رہے۔ جب وہ فرش پر ڈھیر ہو گئی تو انہوں نے اس کا لباس پھاڑ ڈالا اور پیٹھ اور چھاتی پر ڈنڈے مارنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد تھک کر انہوں نے پیٹنا بند کر دیا اور اس مردہ ڈھیر کے ارد گرد خاموش کھڑے ہو کر خالی خالی نظروں سے کمرے میں دیکھنے لگے۔ وہ یکلخت یشیمان ہو گئے تھے اور اس بے جان انسانی جسم کو، جس سے انہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوا تھا دیکھنے سے احتراز کر رہے تھے۔

”بیکار ہے۔“ آخر گورے سپاہی نے بیحد اکتا کر کہا اور سیر ڑھیوں کی جانب لپکا۔ اس کے پیچھے پیچھے سب اتر گئے۔

جب علی کو دیوار سے کان لکائے بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی اور کوئی آواز نہ آئی تو اس نے احتیاط سے تختہ ہٹایا اور سیر ڑھیوں پر کود گیا۔ مکان میں گہرا سناٹا تھا۔ اوپر والے دروازے میں ایک بلی کھڑی تھی جو اسے دیکھتے ہی بھاگ گئی۔ پہلا کمرہ خالی تھا۔ دوسرے کمرے کے فرش پر اس کا تنگا جسم بے حس و حرکت پڑا تھا اور ٹانگیں بے شرمی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ششدر کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر بھاگ بھاگ کر دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے لگا۔ تنگے جسم پر ضربوں کے نشان تھے علی نے اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھایا لیکن وہ لڑھک گئی۔ کافی دیر تک وہ اسے ہوش میں لانے کی بیسود کوششیں کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ خود بخود ہوش میں آگئی۔

سب سے پہلی نظر اس نے اپنے آپ پر ڈالی اور جسم کو بازوؤں میں چھپا لیا۔ علی نے بستر پر سے چادر کھینچ کر اسے اڑھا دی۔ وہ خاموشی سے چادر لپیٹتی اور ارد گرد دیکھتی رہی۔ پھر اس نے خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیر کر علی کی طرف دیکھا۔ علی نے بھونڈے پن سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دفعتاً وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اس کے آنسو پونچھتا اور پیار سے سارے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر اس نے اس کے کالوں اور آنکھوں کو چوما۔

تھوڑی دیر کے بعد علی نے احتیاط سے بازوؤں میں بھر کر اس کو اٹھایا اور لے جا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ بازو پر سر رکھے وہ دیوار کو دیکھتی دیکھتی نقاہت کے مارے اونگھنے لگی۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو علی دیوار کے ساتھ بیٹھا اسے تنگے جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اب میں ٹھیک ہوں۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔

”تم لیٹی رہو۔“

”اچھا ہوا تم نہیں آئے۔ وہ تمہیں قتل کر دیتے۔“

علی چارپائی کے پائے پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکا۔ ”تم سمجھتی ہو میں بزدل ہوں؟“

”اوہ، نہیں۔“ وہ ہنسی۔

”گاؤں میں لوگ کہتے تھے کہ شہر میں رہ رہ کر میں بزدل ہو گیا ہوں۔“ علی نے اداسی

سے کہا۔

”ارے نہیں پگلے۔“ وہ پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر ہنسی، ”تم نے کھانا نہیں کھایا۔“

”نہیں نہیں۔ تم بیٹھی رہو۔“

”اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے کہا اور چادر لپیٹتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جب وہ اس کمرے سے برآمد ہوئی تو اس نے سفید ریشم کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا منہ دھلا ہوا اور بال سنورے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے مسکراتی ہوئی جا کر سبزیاں نکالنے لگی۔

”میں آگ جلاؤں؟“ علی نے پوچھا۔

”تم بیٹھی رہو۔ میں سب کام کر لوں گی۔“

وہ کمرے میں پھرنے لگا۔ بازار والی کھڑکی ذرا سی کھلی تھی۔ باہر موت کا سناٹا تھا اور چند آوارہ کتے ادھر ادھر پڑی ہوئی لاشوں کو سونگھ رہے تھے۔ وہ وہاں سے ہٹ آیا۔ الماری میں پچی کھچی سبزیاں اور کچھ باسی اشیائے خوردنی پڑی تھیں۔ اس نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا جو چولہے کے آگے سمٹی سمٹائی بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ وہ اسے بڑی پیاری لگی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”زہرہ۔ زہرہ میگم۔“

”اچھا اچھا۔“ وہ خوشی سے سر ہلا کر بولا، ”میرا نام علی ہے۔“

دونوں نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد علی چارپائی پر لیٹ گیا۔

”یہاں آ جاؤ۔“

وہ اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھی۔

”تم بڑی مضبوط ہو۔“ علی نے اس کا جسم ٹٹولتے ہوئے کہا، ”ضربوں نے تمہیں کوئی

نقصان نہیں پہنچایا۔“

”ہاں۔“ وہ ہنسی، ”مضبوط تو تم بھی ہو، صرف ذرا بزدل ہو۔“

”کیس؟“ علی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچنا چاہا۔

”ارر۔“ وہ کڑی نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی سمٹ کر پرے ہو بیٹھی۔

علی کھسیانہ ہو کر اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ”تمہارا لباس بڑا شاندار ہے۔“

”تم کاؤں میں رہتے ہو؟“ عورت نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”ہم بھی کاؤں میں رہتے تھے۔“

”اچھا؟ کہاں؟“

”ہمارا گاؤں امرتسر کے قریب تھا۔“

”اب کہاں گیا؟“

”اب بھی ہے۔ لیکن میں وہاں نہیں جاتی۔“

”کیوں؟“

”جب میرا باپ مر گیا تو ہم نے گاؤں چھوڑ دیا۔“

”تمہاری زمین بھی تھی؟“

”پتا نہیں۔ تب میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے ذرا ذرا یاد ہے بس اتنا کہ میں بھینس کی پونچھ پکڑ کر جوہڑ میں تیرا کرتی تھی۔ اور ایک دفعہ جب میرا باپ گرد سے اٹا ہوا شہر سے لوٹا اور مجھے گھوڑے کی رسی پکڑا کر گھر کے اندر چلا گیا تو گھوڑا میرے آدھے بال کھا گیا اور میں ساری رات روتی رہی تھی۔ اور میرا باپ تھا جو بڑا جوان، بڑا نرم دل اور بڑا خوبصورت تھا۔ اس کے بعد میں نے کوئی خوبصورت آدمی نہیں دیکھا۔“ علی کو اس کی آواز ڈوبتی ہوئی معلوم ہوئی، ”تمہیں بھی بہت بچپن کی کوئی بات یاد آتی ہے؟“

”ہاں،“ وہ ہنسا، ”ارر۔ سب سے پہلی بات یہ یاد آتی ہے کہ میرے باپ کے پاس تین دودھ دینے والی بھینسیں تھیں اور سویرے سویرے جب میری ماں مکھن نکال لیتی تھی تو ہمسایوں کے بچے اپنے اپنے برتن لے کر لسی لینے آیا کرتے اور دروازے میں کھڑے ہو کر دانت نکوسا کرتے تھے۔ میری ماں ایک ایک کو بلا کر چھاپھ دیتی تھی۔ ان میں زیادہ تر لڑکیاں ہوتی تھیں اور جب وہ بھرے ہوئے برتن اٹھائے مویشیوں والے احاطے میں سے گزرتیں تو میں بلا وجہ ان کو مارا اور ان کی چوٹیاں کھینچا کرتا تھا۔“

”کینے۔“ وہ چلائی۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

انتہائی اعصابی کوفت کے بعد پیٹ بھر کھانے اور تھوڑے سے سکون نے علی پر غنودگی طاری کر دی اور وہ عورت کی گود میں ہاتھ رکھے رکھے سو گیا۔ وہ محبت سے اسے دیکھتی اور لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔ پھر اس نے آہستگی سے علی کا ہاتھ بستر پر رکھا اور کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر ایک لمبی انگڑائی لی۔ انگڑائی کے درمیان وہ چونک کر رک گئی اور بائیں لٹکا کر پریشانی سے چاروں طرف دیکھنے لگی، یوں جیسے مہربان دوستوں میں بیٹھ کر قہقہے لگاتے لگاتے ذہن پر سے کسی ناخوشگوار خیال کا سایہ گزر جائے۔

جب علی اٹھا تو وہ ایک بچے سے کھیل رہی تھی۔

”یہ کون ہے؟“

”میری سہیلی کا بچہ ہے۔“

”تمہارا کوئی بچہ نہیں؟“

”یہ سب کا بچہ ہے۔“

”سب کا؟“

بچہ صحت مند اور چلبلا تھا۔ علی نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ کر عورت کے کندھوں پر جا چڑھا۔

”اب گھوڑا بنو۔ مجھے بلایا کیوں تھا۔ اب گھوڑا بنو۔“ بچے نے رٹ لکائی وہ ہنستے ہنستے دھری ہوئی جا رہی تھی۔

”یہ دیکھو۔ تمہارا گھوڑا یہ بنے گا۔“ عورت نے علی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ کون ہے؟“ بچے نے پوچھا۔

”بوجھو۔“

”ابا ابا۔“ وہ تالیاں بجاتا ہوا چلانے لگا۔

علی کو بچے پر بیحد پیار آیا۔ وہ چارپائی سے اتر کر فرش پر گھوڑا بن گیا۔

”آؤ۔ آؤ۔“

بچہ ڈرتے ڈرتے جا کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اب وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ سارے کمرے میں چل رہا تھا اور عورت ہنستے ہنستے یہ بہوٹی بنتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اچھلنے اور گھوڑے کی بولی بولنے لگتا تو بچہ خوشی سے تالیاں بجاتا۔ آخر کار عورت نے کھینچ کر اسے علی کی پیٹھ سے اتارا اور گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ وہ باتیں کرنے لگے۔ گاؤں کی باتیں، شہر کی باتیں۔ علی نے اسے اپنے کام کے متعلق بتایا کہ بازار کے آخر پر زمین کا ایک قطعہ تھا جو مسجد (شہید گنج) کے لیے وقف تھا اور جس پر سکھ اپنا حق جتا کر گوردوارہ بنانا چاہتے تھے۔ اس طرح وہ جو مدت سے جھگڑے کا سبب بنا ہوا تھا آج صبح کے سانچے پر ختم ہوا۔ پھر انہوں نے گھر باہر کی باتیں کیں۔ معمولی معمولی ذاتی باتیں جو ایک ہی گھر کے افراد یا قریبی دوست آپس میں کرتے ہیں۔ باتوں کے دوران دو ایک مرتبہ علی نے اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا لیکن اس نے سرد مہری سے اسے روک دیا باتیں کرتے کرتے شام پڑ گئی۔ بچہ ان کے پاس سے اٹھ کر جا چکا تھا۔

اس وقت دوسرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ عورت دروازے میں کھڑی ہو کر دستک دینے والے سے، جو کواڑ کی اوٹ میں تھا، باتیں کرنے لگی، دیر تک سرگوشیوں میں تو تو میں میں کرتے رہنے کے بعد وہ اونچی آواز میں کالی دے کر بولی: ”اس آفت کے وقت میں بھی۔“ اور دروازہ بند کر کے علی کے پاس آکھڑی ہوئی۔

”اب تم جاؤ۔“

علی حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

اس نے ندامت سے کپڑے جھاڑے اور ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولی : ”اب تم جاؤ۔ کل پھر آنا۔“

”کہاں؟ کہاں جاؤں؟“

”کہیں بھی جاؤ۔ چلو اٹھو۔“ اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور سیر دھیاں اترنے لگی۔

”آدھے رستے میں علی نے اسے روکا : ”لیکن۔ پچھلی طرف سے نکالو ادھر پولیس ہے۔“

”اس وقت اندھیرا ہے۔ کوئی نہیں دیکھے گا۔ چلو۔“

آخری سیڑھی پر رک کر اس نے دونوں ہاتھ علی کے کندھوں پر رکھ دیے اور دھیرے سے بولی : ”کل پھر آنا۔“

”میرا یہاں کوئی نہیں۔ مجھے یہیں رہنے دو۔“

”اوں ہنک۔“

”میں تمہارے ساتھ نہیں سوؤں گا۔“ علی نے منت کی ، ”فکر نہ کرو۔“

”نہیں اب تم کل آنا۔ پھر پرسوں آنا۔ پھر ہر روز آیا کرنا، پھر۔۔۔“ وہ ہنسی۔

اندھیرے میں اس کے گہرے ، جذباتی قہقہے کی آواز علی کو بھلی معلوم ہوئی۔

”اب جاؤ۔“ اس نے دروازہ کھول کر علی کو باہر دھکیل دیا۔

وہ اندھیرے میں کھڑا اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

”جاؤ۔“

”تو ٹھیک ہے۔ اب میں نہیں آؤں گا۔“

”نہیں بھئی ضرور آنا۔ تمہاری منت کرتی ہوں۔“

”کتیا“ ، علی نے کہا ، ”اب تھوکنے بھی نہیں آؤں گا۔“

کئی لمحوں تک وہ اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر

عورت کی پھری ہوئی آواز آئی ، جس میں وہی پہلے والی عربیانی اور لہروائی تھی :

”حرامی۔ تم اس وقت چوہے کی طرح مرے پڑے ہوتے۔ وہاں۔“ اس نے گالی دے

کر دروازہ بند کر دیا۔

علی نے انتہائی غصے میں دو تین لاتیں بند دروازے پر جمائیں اور سانپ کی طرح پھنکارا :

”رنڈی۔“

بازار میں سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آہٹ پیدا ہوئی۔ وہ کود کر ایک دکان کے نیچے

گھس گیا۔ اس وقت اس نے دہل کر دیکھا کہ وہ ایک مرے ہوئے آدمی پر بیٹھا تھا۔ سپاہی

خاموشی سے گزر گئے۔

باہر نکل کر وہ کچھ دیر کانپتی ہوئی ٹانگوں پر وہیں کھڑا رہا۔ اس کا دل سن ہو چکا تھا۔

(۳۳)

سردیوں کے آغاز میں نعیم پر فالج کا حملہ ہوا۔ حملہ زیادہ شدید نہ تھا۔ گاؤں کے حکیم نے یقین دلایا کہ کوئی بات نہیں، سردیوں میں گھوڑے بھی اکثر جڑ جایا کرتے ہیں اور دو ایک گیدڑ پکا کر کھانے پر بھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ چارپائی سے جا لگا۔

دو ہفتے بعد یہ خبر عذرا نے منشی کی زبانی سنی جو لگان کے سلسلے میں روشن محل گیا ہوا تھا۔ دن بھر وہ کمرے میں پڑی رہی، سہ پہر کے وقت باغ میں اتر آئی۔ خزاں کی زرد ہوائیں چل رہی تھیں اور روشوں پر گرے ہوئے پتے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ برگد کی جڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور خشک پتوں کی ڈھیری بنانے لگی۔ کبھی کبھی دفعتاً بے چین ہو کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔ پھر اس کنفیوژن سے گھبرا کر اٹھی اور اگلے درخت کی جڑ پر جا بیٹھی۔ وہاں بھی وہ آسانی کے ساتھ توازن قائم رکھے بیٹھی پتوں کو ہوا میں اڑاتی رہی۔ اس نے موسم کے شدید حسن کو بھی محسوس نہ کیا۔

اگلے روز وہ روشن پور پہنچی۔ گاؤں اسی طرح پرانا اور گرد آلود تھا۔ وہی دیواریں اور درخت اور گلیاں، وہی کھیت جن میں اکا دکا کسان ہل جوت رہے تھے۔ یہ بیانی کا موسم ہے، اس نے ذہن پر زور دے کر سوچا۔ اس برسوں پرانے، خوابیدہ منظر کو دیکھ کر وہ بے طرح اداس ہو گئی۔ اپنے گھر میں داخل ہو کر اس نے بوڑھے رکھوالے کا حال پوچھا۔ بڑھا چالیوں کے چٹھے کو ٹٹولتا ہوا اس کی غیر متوقع آمد پر خوشی اور رنج کے ملے جلے جذبات کے مارے رونے لگا۔ نوکروں کو مکان کھولنے کا حکم دے کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھی۔ مکان میں سے دروازوں کھڑکیوں کے کھلنے اور جھاڑنے پھٹکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فرنیچر کھسیٹا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ شیشہ ٹوٹتا اور نوکروں کے باتیں کرنے کی آوازیں آتیں۔ یہ موسم خزاں کا ایک شفاف دن تھا اور باورچی خانے میں دھوپ بھری ہوئی تھی۔ عذرا کھڑکی میں کھڑی گرد و غبار کے اس چھوٹے سے بادل کو دیکھتی رہی جو کمروں میں سے نکل کر دھوپ میں آ گیا تھا، وہ کوئی فیصلہ نہ کر پارہی تھی، اب جب کہ وہ یہاں پہنچ چکی تھی یہاں سے باہر قدم رکھتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

”اب؟“ اجاڑ باغ کے ٹوٹے پھوٹے راستوں پر چلتے ہوئے اس نے ہزاروں بار دل میں سوال کیا۔ وہی ٹولیدگی، وہی بے اطمینانی ہر جگہ اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

جب اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو وہ چوروں کی طرح نعیم کے گھر میں داخل ہوئی۔

موشیوں کے احاطے میں نعیم کی ماں لکڑی کی بالٹی میں دودھ دودھ کر اندر لے جا رہی تھی۔ اور کچی منڈیر پر شام کا ستارہ جھلملا رہا تھا۔ وہ اس گھر میں پہلی بار داخل ہو رہی تھی۔ وہ یہاں کبھی نہ آئی تھی۔ اس نے نعیم کی ماں کو صرف ایک بار دور سے دیکھا تھا۔ یہ گھر اس کے خوابوں کے جزیرے پر کہیں بھی واقع نہ تھا۔ یہاں آنے کے بارے میں اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔ آج اجنبیوں کی طرح اس گھر میں قدم دھرتے ہوئے اس کے دل میں علیحدگی، اس قدیم یہگانگی کا احساس تک پیدا نہ ہوا، کہ لاشعوری قوتیں اس قدر طاقت ور ہوتی ہیں۔ بے آواز قدموں سے احاطہ پار کر کے اس نے اندر جھانکا۔ کھاتے پیتے کسانوں کے گھروں کی طرح ایک مکان تھا باورچی خانے میں بڑھیا کام کر رہی تھی۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے سے گزرتی تو اس کا سایہ صحن میں پڑتا۔ کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا، اور چارپائی پر لیٹے ہوئے مرد کی ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔

”نعیم۔“ عذرا نے کپکپا کر سوچا۔ وہ انگور کی میل کے نیچے اندھیرے میں دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی جیسے نادار لوگ خوراک کی امید میں سرشام متمول کسانوں کے دروازوں پر چپ چاپ آکھڑے ہوتے ہیں۔

پھر اس نے بلی کی طرح چل کر صحن پار کیا۔ نعیم چہرے کے آگے کتاب رکھے لیمپ کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ آہٹ سن کر بچوں کی طرح بولا:

”ماں مجھے بھوک لگی ہے۔ مالش پھر کراؤں گا۔“

کوئی جواب نہ پا کر اس نے کتاب ہٹائی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور کتاب نیچے گر پڑی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کہنی کے بل صرف آدھا اٹھ سکا۔ اُس کا ماتھا آدھے سر تک جا چکا تھا اور کنپٹیوں پر سفید بالوں کے کچھے لٹک رہے تھے۔ جسم فرہی کی طرف مائل تھا۔ عذرا دروازے کو تھامے کھڑی رہی۔ اس نے دیکھا کہ نعیم کی آنکھوں میں بے پناہ مظلومیت تھی۔ اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ اس کی چارپائی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

”عذرا۔“ آخر کار نعیم بڑبڑایا اور دھم سے تکیے پر گر پڑا۔ کچھ دیر تک وہ سیدھا لیٹا آنکھ جھپکے بغیر خلا میں دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اس نے کروٹ بدلی اور بازو عذرا کی گردن میں ڈال کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ محبوب آنکھوں میں میکران مظلومیت کی جھلک اور ایک لمحے کے لمس نے برسوں کے غرور کو حقیر بنا دیا تھا۔

نعیم نے اسے ماتھے پر چوما اور آنکھوں پر اور کالوں پر اور ہونٹوں پر ایک لفظ کہے بغیر وہ بیتابی اور گرمجوشی سے اسے ساری جگہوں پر چومتا رہا حتیٰ کہ آنسوؤں کا ٹمکین مزا اسے اپنی زبان پر محسوس ہوا۔

”تم بیمار ہو۔“ اس نے دکھ سے پوچھا۔

”اب ٹھیک ہوں۔“ اُس نے کہا اور اسے چھاتیوں کے اوپر چوما جہاں سے کلا کھلا ہوا

تھا۔ ایک عمر گزر جانے پر بھی اس کے سینے کی جلد مضبوط اور صحت مند تھی۔ عذرا نے اس کے بالوں میں اٹھکیاں ڈال کر پہلی بار اسے چوما اور جذبے کی شدت سے دوبارہ رونے لگی۔
”مت روؤ۔“ نعیم نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دہرایا۔

بمشکل اپنے آپ پر قابو پا کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ نعیم کی ماں ہاتھ میں سرخ رنگ کے تیل کا برتن لیے دروازے میں کھڑی حیرت سے اجنبی، جوان عورت کو دیکھ رہی تھی۔ پھر یہ کایک اس نے اسے پہچان لیا اور سادہ، پُر معنی ہنسی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ احتیاط سے آگر چارپائی پر بیٹھ گئی اور بیٹے کی ٹانگ پر مالش کرنے لگی۔ اس کی آمد کو کسی نے محسوس نہ کیا۔

”تم پھر جیل گئے تھے؟“ عذرا نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”کتنی دیر؟“

”بہت دیر۔“ وہ محویت سے اسے دیکھتا رہا، ”کئی سال۔“

”تمہارے بال گر رہے ہیں۔“

”ہاں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

عذرا ہولے سے ہنسی۔ نعیم بھی اس کے ساتھ ہنسا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ رہا تھا۔ وہ محض اس برسوں کی کم شدہ محبوب آواز کو سننے میں محو تھا جو آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی، اسے واپس مل رہی تھی، جیسے آدھی رات کے ملاحوں کا گیت جو ابھی قریب آتا ہے اور ابھی دور چلا جاتا ہے اور کہیں نظر نہیں آتا لیکن مسافروں کی ہمت بڑھاتا ہے اور طوفانی راتوں میں انہیں زندگی کی محنت اور خوشی کا یقین دلاتا ہے۔

پھر عذرا نے نعیم کی ماں کو دیکھا اور گہری طرح جھینپ گئی۔

”میں تیل ملتی ہوں۔“

”نہیں۔“ نعیم نے اسے پکڑے رکھا، ”تم باتیں کرو۔“

”باتیں بھی کریں گے۔“ وہ ہنسی اور اٹھ کر پائنٹی بیٹھ گئی۔

”اچھا اچھا۔“ نعیم کی ماں بے فن، معنی خیز انداز میں ہنستی ہوئی باہر نکل گئی، پھر صحن

میں سے لوٹی اور آگر دروازہ بند کر دیا۔ اُس کا سفید سر تیزی سے ہل رہا تھا۔

عذرا اس کی پنڈلی پر تیل ملتی اور ہولے ہولے باتیں کرتی رہی۔ اپنی باتیں، اس کی

باتیں، اس کی بائیں ٹانگ کی باتیں جس پر فالج کا اثر تھا۔ نعیم گہری محویت سے سنتا اور اس

کے کہنے پر اپنے جسم کے نیم مردہ حصے کو ہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ اس سحر میں

سے نکل آیا۔

کمرے کے وسط میں بجھتی ہوئی آگ کا آخری شعلہ کمزوری سے بھڑک رہا تھا۔
 ”اور لکڑیاں ڈال دو۔“ اس نے کہا۔

عذرا نے اٹھ کر خشک لکڑی ہگ پر پھینکی۔ لکڑی نے دھواں چھوڑا اور بھڑاک سے جل اٹھی۔ عذرا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ کمرے میں لکڑی کے جلنے اور مالش کے تیل کی ملی جلی بو پھیل رہی تھی اور دیوار پر عذرا کا سایہ ناچ رہا تھا۔
 ”چچا مر گئے۔“ نعیم نے بھاری آواز میں کہا۔

”ایس۔ چچا؟“

”ہاں۔“

دونوں خاموش ہو گئے۔

”میں جیل میں تھا جب مجھے اطلاع ملی۔ وہ میرے جیل جانے پر سخت خفا تھے۔ کئی بار میں نے پیغام بھیجا کہ آگر مل جائیں لیکن نہ آئے۔ انہوں نے کہا: ”نعیم سے جا کر کہہ دو میرا اس کا کوئی تعلق نہیں رہا، میں اس کے بغیر آسانی سے رہ سکتا ہوں۔“ مجھے اس بات کا دکھ ہوا۔ اس کے بعد میں نے کوئی پیغام نہ بھیجا۔ پھر وہ بیمار پڑ گئے۔ مجھے لوگوں نے آگر بتایا کہ ان کا علاج ہوتا رہا، شدید تکلیف کے باوجود وہ بیماری کو صبر سے برداشت کرتے رہے۔ انہوں نے کسی کا نام نہ لیا، کسی سے ملنے کی خواہش ظاہر نہ کی۔ پھر ایک روز اچانک انہوں نے ملازم کو اپنے پاس بلایا اور بولے: ”تم سمجھتے ہو مجھے کسی شے کی حاجت نہیں رہی؟ تم غلط سمجھتے ہو۔ کل ہم الموڑے جا رہے ہیں۔“ پھر انہوں نے تاسف سے کہا: ”مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ موت ہمارے بس میں نہیں ہے۔ زندگی میں اتنی کم مہلت ملتی ہے اور ہم اتنی غلطیاں کرتے ہیں۔ نعیم بھی اور میں بھی۔ عمر بھر ہم ایک دوسرے سے بچوں کا سا سلوک کرتے رہے ہیں۔ ضدی اور جاہل بچوں کا سا۔“

”لیکن اس رات وہ مر گئے۔“ نعیم نے سر اٹھایا، ”سنو۔ اس کے چند روز بعد میں نے خواب دیکھا کہ میں دریا کے کنارے کنارے جا رہا ہوں اور میں چلتا گیا چلتا گیا کہ ایک جگہ پر وہ دریا کی سطح پر ابھرے اور بولے: ”آگے جاؤ۔“ میں پھر چلنے لگا۔ وہ ڈبکی لگا کر غائب ہو گئے۔ پھر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر وہ پانی میں سے باہر نکلتے اور مجھے آگے جانے کا اشارہ کرتے رہے۔ پھر دریا ختم ہو گیا اور وہاں وہ ریت پر کھڑے تھے۔ دھوپ بڑی چمکیلی تھی اور ان کے سفید بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ اپنا دلپسند سفید سوٹ پہنے ہوئے چھڑی ہاتھ میں لیے جیسے میرا انتظار کر رہے تھے۔ کہنے لگے: ”میں اکیلا چل رہا تھا۔ اچھا ہوا تم آگے۔ ہم ریت پر چلنے لگے اور ہمیں راستے میں آبی پرندوں کے غول کے غول ملے جو اڑتے ہوئے سمندر کی جانب جا رہے تھے۔ چلتے چلتے ہم ایک مکان میں داخل ہوئے۔ وہ جگہ، گوکہ میں کبھی وہاں نہیں گیا

ہوں ، مجھے بیحد مانوس معلوم ہوئی ۔ ہم سیرھیاں چڑھنے لگے اور چڑھتے گئے چڑھتے گئے حتیٰ کہ میں ہانپنے لگا ۔ وہ بیشمار تھیں ۔ آخر میں ایک زینہ آیا اور ایک لوہے کا جینگلا جو مکان کے گردا گرد چلا گیا تھا ۔ وہاں ریلنگ کے سہارے ایک مفلس اور شکستہ حال شخص بیٹھا تھا ۔ اس نے خاموشی سے ہماری طرف دیکھا ۔ چچا نے اپنی چاندی کی چھڑی میرے ہاتھ میں پکڑائی اور کہنے لگا : ”اے دے دو ۔“ اس نے چھڑی میرے ہاتھ سے لے لی اور اس کے اداس چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ پھیل گئی ۔ وہ خاموشی اور احسانندی سے ہمیں دیکھ کر ہنستا رہا پھر چھڑی کے سہارے اٹھا اور ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا ۔ اسے سنتے ہوئے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا ۔ اب تک یاد ہے کہ میرے دل کی بے چینی اچانک ختم ہو گئی تھی ۔ چچا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ہم واپس لوٹے ۔ میرے دل میں مکمل اطمینان تھا ، اور خوشی جو اطمینان سے پیدا ہوتی ہے ۔ لیکن سیرھیاں اترتے اترتے وہ کہیں غائب ہو گئے ۔ میں نے پروا نہ کی اور اکیلا اترتا رہا ۔ پھر ایک جگہ رک کر جھروکے سے باہر دیکھنے لگا ۔ بہار ہر طرف زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی ۔ ریت پر اور سمندر پر اور آسمان پر زرد ، بہت زرد ۔“ اس نے بولتے بولتے عذرا کا ہاتھ دبایا ۔ ”اور سنو ، اب جو میں بتانے والا ہوں بیحد عجیب ہے ۔ اس وقت جھروکے سے باہر دیکھتے ہوئے میرے دل میں عجیب سی اداسی پیدا ہوئی ، بڑی گہری اور خاموش غمناک اداسی ۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس سے میری پہلی خوشی اور طمانیت کو کوئی زک نہ پہنچی ۔

میرے دل میں وہ بیمار کر دینے والی بے چینی پیدا نہ ہوئی ۔ یہ کوئی اندوہناک جذبہ نہ تھا بلکہ ایک دھیما اور چھا جانے والا غم تھا ، جیسے میں ۔ جیسے ۔ پتا نہیں ۔ لیکن آج تک میں نے خواب میں کوئی جذبہ اتنی شدت سے محسوس نہیں کیا ۔ تب مجھے احساس ہوا کہ چچا سے مجھے کتنی گہری محبت تھی ، کہ ان سے میں اپنے باپ کی نسبت کہیں زیادہ وابستہ تھا ، کہ زندگی میں اطمینان حاصل کر لینے کے بعد ہمارے لیے کچھ بھی نہیں رہ جاتا سوائے غم کے ۔ ۔ ۔ تمہیں علم ہے عذرا کہ چچا دنیا میں کس قدر تنہا تھے ، کس قدر محنتی ، کس قدر دکھی اور کس قدر نیک تھے ۔ انہوں نے اتنے پیار سے مجھے پالا ۔ زندگی میں اتنی لمبی تنہائی کا دکھ اٹھایا ۔ ۔ ۔ ”ایک سانس بولتے رہنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور ماتھے کی رگ ابھر آئی تھی ۔ عذرا نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں بڑی عجیب و غریب تھیں ۔

”خالہ بھی فوت ہو گئیں ۔“ اس نے چپکے سے کہا ۔

”ہاں ۔ سنا تھا ۔“

”ایسا ہوا نعیم کہ ، اوہ ۔ ۔ اس رات میں دیر تک جاگتی رہی تھی ۔ میری ذہنی حالت کچھ اچھی نہ تھی ۔ آدھی رات گزر جانے پر وہ میرے کمرے میں آئیں اور مجھے دیر تک جاگنے اور پارش میں بیٹھے رہنے پر ملامت کرنے لگیں ۔ مجھے غصہ آ گیا ۔ میں نے انہیں واپس چلے

جانے کو کہا۔ اس بات کا انہیں بہت رنج ہوا۔ وہ رونے لگیں، پھر اپنی بلی کو اٹھا کر باہر نکل گئیں۔ صبح جب ہم جاگے تو وہ مرچکی تھیں۔ آج تین سال سے اوپر ہو گئے۔“

نعیم کے چہرے پر تکدر کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ کافی دیر کی کشمکش کے بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور آہستہ سے بولا: ”لیکن اب وہ مرچکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف کرے۔“

عذرا نے محسوس کیا کہ خالہ کے متعلق نعیم کے دل میں کوئی شدید غلط فہمی موجود تھی۔ پھر اس نے چپکے سے دل میں کہا: ”کیا فرق پڑتا ہے۔“

آگ پھر بجھ رہی تھی۔ عذرا نے اٹھ کر چند خشک لکڑیاں آگ پر ڈالیں اور دروازہ کھول دیا۔ جب سارا دھواں نکل گیا اور کمرہ تازہ، خشک ہوا سے بھر گیا تو اس نے دروازہ بند کر دیا اور دونوں ہاتھ نعیم کے سینے پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی اور حرارت آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور دو ایک جلتی ہوئی چکنی لکڑیاں سوں سوں کی آواز پیدا کرنے لگیں۔

”تم مجھے یاد کرتے تھے؟“

”بہت۔“ نعیم نے سپاٹ لہجے میں کہا، ”تمہارے بغیر دنیا کی مشکل ترین شے جو آئی وہ رات تھی۔ جیل میں بھی، باہر بھی۔ دن بھر تو میں کام میں مصروف رہتا لیکن رات کے وقت جب میں اکیلا اور تھکا ہوا ہوتا تو نیند کہیں غائب ہو جاتی۔ اُس وقت بڑی خطرناک باتیں میرے ذہن میں آتیں اور مجھے خیال ہوتا کہ دل و دماغ کے تمام عارضے مجھ کو لاحق ہو گئے ہیں۔ میری آنکھوں میں سے آگ نکلنے لگتی اور جسم پرانے بیماروں کی طرح گھلنے لگتا۔ ایسی ہزاروں راتیں میں نے گزاری ہیں۔ کئی بار یہ سوچ کر میں خوفزدہ ہو جاتا تھا کہ تمہارے بغیر شاید میں مر جاؤں گا۔“ وہ ہنسا۔

عذرا نے بیتابی سے اس کا گلا کھول کر بھیڑکی طرح منہ اس کے سینے پر رکھا۔ ”تم استیاء یاد کرتے ہو گے۔ میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔“ وہ دوبارہ رونے لگی۔

”چپ رہو۔“ نعیم غرایا۔

اُس نے نعیم کے کندھے پر رگڑ کر آنکھیں خشک کیں۔ ”دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ یہ سب کچھ گزرا ہے۔ تم نے یہ سب جھیلا ہے۔ تم نے مجھے یاد رکھا ہے۔ تمہاری آنکھیں بوڑھی ہو گئی ہیں۔ مجھے معاف کر دو۔“

وہ رنج سے مسکرایا۔

عذرا پھر بولی: ”پر اس کے باوجود تمہاری آنکھیں خوبصورت رہی ہیں۔ یہ ایسا عجب لگتا ہے نعیم، تمہاری آنکھیں۔ بوڑھی اور نرم و نازک۔“

”یہ اس لیے ہے،“ نعیم نے بیتابی سے کہنا شروع کیا، ”کہ جب میں اس بے پایاں رنج

میں گھرا ہوا تھا تو مجھے پتا چلا کہ دنیا میں اتنی اچھی اچھی چیزیں بھی ہیں۔ بڑی بڑی مسرتوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی ہیں جن کو ہم اپنی مصروفیتوں میں بھول جاتے ہیں لیکن جو رنج میں ہمارے کام آتی ہیں۔ جو ہر دم ہمارے آس پاس رہتی ہیں، اتنی قریب کہ ہم ہاتھ بڑھا کر انہیں پکڑ سکتے ہیں۔ پرانی پرانی باتیں۔ مثلاً وہ ذہن سے مٹتا ہوا بعید چہرہ جو اس بوڑھی عورت کا تھا جس نے بچپن میں میری نگہداشت کی تھی۔ اور پہاڑ کی ڈھلان پر ہمارا گھر تھا جس کی ٹین کی چھت پر بارش شور مچاتی تھی اور لکڑی کے برآمدے میں بلی نے بچے دے رکھے تھے۔ اور میرا پرانا جوتا جو ایک دفعہ میں نے چلتی گاڑی میں سے باہر پھینک دیا تھا اور پھر اس کے کرم خوردہ خشک چمڑے پر آخری منظر ڈالنے کے لیے بیتاب ہو کر کھڑکی میں سے جھانکنے لگا تھا۔

اور جنگلی کبوتر جو ہمارے گھر میں رہا کرتے تھے، اور وہ بوڑھا قلاش آدمی جس کو میں نے اپنی پرانی اونی جرابیں دے دی تھیں اور جب وہ شکرے کے الفاظ بڑبڑا رہا تھا تو رال بہہ کر اس کی داڑھی پر اٹک گئی تھی اور دھوپ میں چمکنے لگی تھی۔ اور راستے کے کنارے اُگا ہوا وہ اکلوتا پھول جس کے پاس سے گزر جانے کے بعد میں دور سے واپس لوٹا تھا، جسے ہاتھ لگاتے ہی ساری پتیاں خاموشی سے جھڑ گئی تھیں۔ یہ اور کتنی ہی ایسی باتیں۔ دنیا میں اتنی حسین جگہیں ہیں۔ دارجلنگ میں میں نے طلوع سحر کا منظر دیکھا تھا۔ جب ٹائیگر ہل پر سے سورج نکلتا ہے۔۔۔“

”ارے ہاں استنا بڑا توے کا تو، میں نے دیکھا ہے۔“ عذرا نے کہا، ”تم نے بھی دیکھا ہے؟“

”نارنجی رنگ کا کبھی زرد رنگ کا کبھی سرخ رنگ کا چمھاتا ہوا استنا بڑا، ایسی شان، ایسے وقار کے ساتھ کہ انسان کے دل میں اُمنگ پیدا ہوتی ہے اور کوئی حسرت باقی نہیں رہتی۔“ وہ رکا، ”اور پھر میدان جنگ کی وہ رات تھی۔ وہ پرستان کی رات ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہے جب مسلسل برف باری کے بعد چاند نکل آیا تھا اور ہم خندقوں میں بیٹھے تھے۔ برف تمام رات ترپالوں پر گرتی رہی تھی جو ہم نے اپنے پجاؤ کے لیے خندقوں پر پھیلا رکھی تھیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی ایک اٹھ کر باہر دیکھتا اور دوسرے اس سے پوچھتے: ’برف باری رک گئی؟‘ اور وہ مایوسی سے سر ہلاتا ہوا آگ کے قریب آکر بیٹھ جاتا جو ہم نے اکڑ کر مر جانے کے ڈر سے جلا رکھی تھی۔ حتیٰ کہ سب ایک ایک کر کے سو گئے پر میں ترپال اٹھا کر خندق کی دیوار کے ساتھ کھڑا رہا۔ برف تھے تھے پھوہوں میں گر رہی تھی اور بادلوں میں چھپے ہوئے چاند کا مدہم اُجالا اور سناتا رات میں پھیلا ہوا تھا اور برف نے دشمن انسانوں کے اس وسیع سمندر کو ڈھک دیا کہ دفعتاً چاند نکل آیا۔ برف باری تھم گئی۔ دشمن کے مورچوں میں کوئی گٹار بجانے لگا اور میں نے دیکھا کہ رات اس قدر سفید، اس قدر حسین تھی۔ دائیں بازو کا سارا جنگل برف پوش تھا اور

اوپنی نیچی زمین پر اور دور دور پہاڑیوں پر چاروں طرف برف تھی اور وہ اس قدر پُر امن اور آسمانی رات تھی کہ جنگ کا شبہ تک نہ گزرتا تھا۔ ساز کی آواز سن کر مجھے خیال آیا کہ وہاں پر بھی ایک شخص جاگ رہا ہے اور میری طرح بچپن کی باتیں، اپنا گھر اور اپنا گاؤں یاد کر رہا ہے اور مجھ سے بدظن اور پوشیدہ ہونے کے باوجود اس وقت جنگ کا خیال اس کے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ یہ اس قدر سحر آلود منظر تھا کہ زمانہ حال کا حصہ ہونے کی بجائے بھولا بسرا واقعہ معلوم ہوتا تھا۔ میرے دل پر وہ رات نقش ہو کر رہ گئی اور گو کہ اس وقت میں غلیظ اور تھکا ماندہ اور مصیبت زدہ تھا اور میرے بالوں میں کیڑے تھے اور گو کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں ساری دنیا سے بدظن ہو گیا تھا لیکن اس سہمی معصوم اور حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ سنائے میں ساز کے ایک ہی تار کے مسلسل بجنے کی آواز آرہی تھی جیسے وہ بار بار اپنے بچپن کو یاد کر رہا ہے اور گاؤں کی برف کو یاد کر رہا ہے۔ ”اُس نے کھینچ کر عذرا کو اپنے ساتھ لکا لیا، ”اور ایک وہ نظارہ تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ کہ چچاریت پر کھڑے ہیں۔ اُن کا مرغوب سفید لباس زیب تن ہے، موسم اس قدر صاف اور شان دار ہے، آسمان کا رنگ گہرا نیلا ہے، آبی پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہیں، چچا کے برف کی طرح سفید بال ہوا میں اڑا رہے ہیں اور وہاں پر میرے انتظار میں کھڑے ہوئے وہ اتنے حلیم الطبع، اتنے خوبصورت نظر آرہے ہیں۔ یہ میری زندگی کا دلفریب ترین منظر ہے۔ اور۔۔۔ اور دنیا میں کیا کچھ نہیں ہے۔ بہار کا موسم ہے اور خزاں کی سہ پہریں ہیں اور شہد کی مکھیوں کے چھتے ہیں اور میرا گھر ہے جہاں میری ماں ساری دنیا میں صرف میرا انتظار کرتی ہے۔ اور تم ہو تمہاری آواز ہے، جو تمہاری غیر موجودگی میں میرے کانوں میں محفوظ رہی ہے تمہاری آواز کا یہ جادو جو زندگی اور زندگی کی ساری طوفان خیزیوں کا احساس پیدا کرتا ہے۔ قریب آؤ عذرا۔ میرے ساتھ لگ کر میری باتیں سنو۔ میرے دوست ہیں۔ تمہیں پتا ہے اُن میں سے کئی ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں اور بڑھانکتے ہیں اور جب میں گہری توجہ کے ساتھ ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہوں تو سارا وقت مجھے علم ہوتا ہے کہ وہ شیخی کر رہے ہیں، اور دوسرے ہیں جو شرابی ہیں اور اپنے بیوی بچوں کی پروا نہیں کرتے اور دوسرے ہیں جو اس سے بھی برے ہیں۔ اگر کوئی دنیا کا اخلاقی جائزہ لینے نکلے تو اُن کی برائیوں کی فہرست بنا ڈالے، لیکن اُنہوں نے میرے ساتھ ہمدردی کی ہے اور مجھے پیارے ہیں۔ دنیا کے سارے اچھے لوگ تو ہمارے دوست نہیں ہو سکتے نا۔“

عذرا جو اس کے ساتھ لگی محویت سے سنتی رہی تھی سر اٹھا کر بولی: ”ایک بات بتاؤں نعیم۔ جب میں دلی میں تھی تو سوچتی تھی کہ یہاں کیسے آؤں گی؟ وہ سب کچھ جو گزرا ایسا خوفناک تھا۔ حتیٰ کہ آج صبح میں یہاں پہنچی ہب بھی، بلکہ انگور کی میل کے نیچے کھڑی جب میں تمہارے پاؤں دیکھ رہی تھی اس وقت بھی میری سمجھ ممبر کچھ نہ آ رہا تھا۔ پر اب۔۔۔ میں

یہاں بیٹھی ہوں تو محسوس کرتی ہوں کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ وہ بچوں کی سی ضد اور خوف جس نے اتنا عرصہ ہمیں روکے رکھا کچھ بھی نہ تھا۔ یہ ایسی معمولی، آسان اور قدرتی بات تھی۔ یہ ساری بات۔ یہاں آنا۔ ہا۔

”عذرا ہم کچھ بھی نہیں۔ ہم بہت چھوٹے چھوٹے اور معمولی لوگ ہیں۔ قدرت کے ہاتھوں میں ہماری زندگیاں بے بس اور کمزور ہیں۔ صرف ہماری مشقت انہیں مضبوط بناتی ہے۔ اور ہماری قوت برداشت انہیں مضبوط بناتی ہے اور ہماری دوستی اور رفاقت انہیں مضبوط بناتی ہے اور محبت۔۔۔ اس کے بغیر ہم کمزور اور نادار ہیں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”تم نے بہت سوچنا شروع کر دیا ہے۔“ عذرا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

خزاں کی خنک رات آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور نعیم کی ماں کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ وہ بار بار صحن پار کر کے دروازے تک جاتی، درزوں میں سے جھانک کر دیکھتی اور اطمینان سے سر ہلاتی ہوئی واپس آجاتی، حتیٰ کہ اس کا بیٹا اور بہو اسی طرح باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ وہ دیر تک جاگتی رہی۔

چند روز کے بعد عذرا سے دلی لے آئی اور روشن محل میں اس کا باقاعدہ علاج ہونے لگا۔ عذرا نے ٹھیک کہا تھا۔ نعیم نے واقعی سوچنا شروع کر دیا تھا، گو اس میں اس کی شعوری کوشش کا دخل کم ہی تھا۔ یہ زیادہ تر اس کی بیماری اور طبعی حرکت کے رک جانے کا قدرتی نتیجہ تھا۔ اس نے کبھی اتنی بے عمل زندگی نہ گزاری تھی، جیل کے طویل سالوں میں بھی نہیں۔ جسمانی معذوری اور دل کی غمخواری کے باعث اس کے پاس زندگی کا ایک راضی بہ رضا نظریہ تھا۔ اس نے کبھی سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ زندگی میں واقعات اتنی تیزی سے اور اس قدر بے اختیاری طور پر رونما ہوئے تھے اور انہوں نے اس طرح اسے آگے آگے چلایا تھا کہ نظریہ قائم کرنے کی اس کو مہلت ہی نہ ملی تھی۔ لاشعوری طور پر اس نے زندگی کے خارجی اثرات کو، اتفاقات اور حادثات کو قدرت کی برتر طاقتیں تسلیم کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔ ذہنی بیچارگی کے اس عالم کو اس نے محسوس ہی نہ کیا تھا۔ اس نے تو ذہن کے باہر رہ کر عمر گزاری اور دنیا دیکھی تھی اور یہ عمل اسے خاصا دلچسپ اور سہل لگا تھا۔ سوچ سے وہ ہمیشہ گھبراتا رہا تھا۔ وہ اس زندگی کا، جس کے آگے آگے وہ بھاگا جا رہا تھا۔ گو یہ مادی، بلکہ جبلی زندگی، جو وہ بسر کر رہا تھا، اسے کچھ راس نہ آئی تھی۔ اس نے اسے عظیم جسمانی اور دلی روک دیے تھے، اور شدید غمخواری نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا، لیکن اتنی ستم گیری کے بعد نامعلوم کا خوف اتہا کو پہنچ چکا تھا اور وہ کسی بھی صورت کوئی نیا راستہ تلاش کرنے کی ہمت اپنے میں نہ پاتا تھا۔ چند ایک بار واقعات کی زد میں آکر جو وہ سوچنے پر مجبور ہوا تھا تو

اس نے ایک عجیب سی ذہنی کوفت محسوس کی تھی جس نے اس کے لاشعور میں سوچ کا اور تغیر و تبدل کا خوف بٹھا دیا تھا۔ ایک سخت کوشش جسم کے سہارے، اپنی لاعلمی میں وہ یہی سمجھے کیا کہ یہ زندگی جو وہ بسر کر رہا تھا اصل آرام دہ اور پرسکون زندگی تھی اور یہ کہ کبھی کبھار آفتیں تو آیا ہی کرتی ہیں۔ اور اصل آفت وہ ہے جو ذہن و روح پر آتی ہے اور جس سے دل کا سکون غائب ہو جاتا ہے اور ڈر کے مارے آدمی نیند میں اٹھ بیٹھتا ہے۔

لیکن جس طرح چلتے ہوئے انجن کے دفعتاً روک دیے جانے پر زائد بھاپ کے اخراج کے لیے ”سیفٹی والو“ کھل جاتا ہے اسی طرح چارپائی کے ساتھ لگ جانے سے اس کے ذہن کی کھڑکی، جو نامعلوم پر کھلتی تھی، وا ہو گئی۔ پہلے اس نے کھڑکی کے اندھیرے میں دیکھنے سے احتراز کیا، پھر جب کوئی چارہ نہ ملا تو سٹپٹا کر آنکھیں ملائیں۔ جیسے ایک بچے کو لا کر اندھیرے میں چھوڑ دیا جائے تو آنکھیں بند کر کے رونے لگتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ چپ ہو جاتا ہے اور ہچکچاتا ہوا آنکھیں کھولتا ہے۔ بند کر لیتا ہے کھولتا ہے، بند کر لیتا ہے، آخر جب اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے تو مٹی میں ہاتھ مار کر کھیلنے لگتا ہے۔ پھر جب اس کو اپنی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے تو اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دوستی کے انداز میں ہاتھ بڑھا کر چلنے لگتا ہے۔ اسی طرح سوچنے کے عمل نے نعیم کے ذہن پر کام کیا تھا۔ جب اس نے پہلی بار اعتماد کے ساتھ اس کے اندر جھانکا تو یہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا کہ اس کا ذہن کنواری زمین کی طرح تھا، اُن غیر آباد جزیروں کی طرح تھا جہاں صرف خود رو پھول اور پودے اُگتے ہیں، اُن اجنبی سمندروں کی طرح تھا جن میں کبھی جہاز رانی نہ کی گئی تھی۔ جب وہ پورے یقین کے ساتھ سوچنے لگا تو ذہنی کوفت کے ساتھ ساتھ اسے اطمینان بھی نصیب ہوا۔ اندھیرے میں جگہ جگہ روشنیاں پھوٹنے لگیں۔ اس اُجالے میں اس نے بہت سی چھوٹی چھوٹی خوش کن باتیں دیکھیں۔ اس کی حالت بلی کے اُس نومولود بچے کی مانند تھی جو کئی روز تک آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے اُجالے کو جذب کرتا رہتا ہے اور جب اس کی آنکھیں کھلتی ہیں تو بہت خوش ہوتا ہے۔

اس کے باوجود چند ہٹیلی شکلیں تھیں جو اس کھڑکی کے اندھیرے اُجالے میں دور دور بکھری ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی وہ خوفناک حد تک قریب آجاتی۔ ایک وہ ڈھلکی ہوئی مونچھوں والا غلیظ، ستا ہوا مردہ چہرہ تھا جس پر مدہم چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک وہ بوڑھے میل کی طرح جھول کر چلتا ہوا ہیولا تھا جو تاریک قبرستان میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جب کہ خوبانی کے سفید شگوفے ان کے سروں پر گر رہے تھے اور اسے عجیب سا احساس ہوا تھا کہ وہ مرے ہوئے آدمی کے ساتھ چل رہا ہے۔ ایک اس غیر ملکی کا چہرہ تھا جس کی سادہ، بے فن آنکھیں تھیں، جو ایک چھوٹے سے جرمن گاؤں میں لکڑی کا کام کرتا تھا اور جس نے اپنی معصومیت میں اس پر دوستی اور رفاقت کا احسان عظیم کیا تھا اور اسے احساس ہوا تھا کہ اگر وہ اجنبی سب کچھ جانتا ہوتا

تو بھی یہی کرتا کہ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ اور ایک عذرا تھی جس کے لیے محبت کا جذبہ قریب قریب ناپید تھا لیکن جس نے اسے احساس شکست بخشا تھا۔ یہ عذرا کا نیا روپ تھا۔

(۳۴)

اپنے ہفتہ وار سرسری معائنے کے بعد ڈاکٹر انصاری نے حسب معمول ”شیٹھو سکوپ“ میگ میں رکھا اور شیٹھ کے جگ میں سے پانی اُنڈیلنے لگے۔ دو گھونٹ پانی پینے کے بعد گذشتہ ہفتے کی طبی رپورٹ دینے کی بجائے وہ گلاس کو ہاتھ میں پھراتے رہے۔ پھر گہری نظروں سے نعیم کو دیکھ کر بولے:

”تمہیں مذہب پر یقین ہے؟“
 نعیم کے چہرے پر ہلکا سا تغیر بکھر گیا۔ وہ اُداسی سے ہنسا۔
 ”یہ آپ نے کیوں پوچھا؟“

گلاس کو ہاتھوں میں پھراتے ہوئے وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئے اور بولے: ”مذہب آج بھی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے اس دور میں بھی مذہب اعلیٰ ترین قوت ہے۔ ایک ڈاکٹر کی زبان سے یہ سن کر تمہیں تعجب ہو گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ روحانی طمانیت ’بلڈ پریشر‘ کو معمول پر لانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔“
 نعیم دوبارہ بے چینی سے ہنسا۔

”بیماری ایک ناگہانی آفت ہے۔ یہ کبھی منصوبہ بنا کر نہیں آتی اور نہ کسی منصوبہ بندی کے ساتھ اس کا مقابلہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہوتا۔ جیسے لیکا ایکٹی یہ آتی ہے اسی طرح لیکا ایکٹی اپنی قوتِ مدافعت کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ یہ قوت کسی بیرونی ادارے یا ڈاکٹر یا ہسپتال سے نہیں آتی، ہمارے اور آپ کے اندر موجود ہوتی ہے۔ ہم میں سے بعض اس سے آشنا ہوتے ہیں اور بعض نا آشنا۔ آج تک کوئی آلہ جراحی یا کوئی دوا ایسی ایجاد نہیں کی گئی جس میں عبادت سے بڑھ کر Healing Power ہو۔“
 مذہب۔۔۔

”آپ کی مراد کون سے مذہب سے ہے؟“ نعیم نے بات کاٹ کر پوچھا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ ڈاکٹر انصاری ہاتھ ہلا کر بولے، ”گو ہمارے ماں باپ کا مذہب ہمیں عزیز ہوتا ہے اور ہم میں سے اکثر سندھی سے اس کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں اور دوسرے کے متعلق سوچنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن مذہب کسی کے لیے برائی

کا باعث نہیں بنتا۔ مذہب ایک بھی اور دوسرا بھی اور تیسرا بھی سب ہماری راہنمائی کرتے ہیں۔ ایک کے ماں باپ کا مذہب اور دوسرے کے ماں باپ کا مذہب دونوں اُن کی بھلائی کے لیے بنائے گئے ہیں اور ان کے بچوں کی بھلائی کے لیے، اور یہی قدر مشترک سارے مذہبوں میں موجود ہے۔ بہتری کی طرف جانے کا ایک ہی راستہ ہے جو سارے دینوں میں موجود ہے۔ عبادت۔ جو روح کی راہنمائی کرتی ہے۔ جو انسان کی سب سے بڑی ایجاد، سب سے بڑی قوت ہے۔ میں کیا مسیحائی کر سکتا ہوں۔ میری قلمی اس وقت کھلتی ہے جب میں بیمار پڑتا ہوں۔ اس وقت اگر تم مجھے دیکھ لو تو مجھ پر لعنت بھیجو۔۔۔۔۔“

نعیم لیٹا لیٹا کسمسایا۔ ”مذہب پر ایمان لانے کے لیے، ڈاکٹر صاحب، میں ذرا بوڑھا نہیں ہو چکا ہوں؟“ اس نے اپنے مخاطب کو، جو بیچ میں بولنا چاہتا تھا، ہاتھ سے چپ رہنے کا اشارہ کیا، ”جو کچھ میں نے کھویا ہے اُسے حاصل کر سکتا ہوں؟“

”تم اس طور پر نہیں سوچ سکتے۔ تم نے کیا کھویا؟ اس بیماری پر تم یقیناً قابو پا سکتے ہو۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ نعیم نے ایک پھسلتی ہوئی نگاہ اپنے بازو پر ڈالی۔ ڈاکٹر اس کے سوال کی نوعیت کو محسوس کر کے ایک لحظے کو دل میں کانپ گیا۔ لیکن نعیم نے گہرا سانس چھوڑ کر سر ہلایا۔

”ساری عمر۔! زندگی میں میں نے کیا پایا ہے؟ ساری عمر۔ میں نئے سرے سے زندگی بسر کر سکتا ہوں؟“

”یقیناً۔ صرف تم یہ نہیں کر سکتے کہ ۱۹۱۰ء میں واپس چلے جاؤ یا دنیا میں جو واقعات پیش آئے اُن کو بدل دو۔ لیکن تم اس سال، بلکہ اس دن اور اس لمحے کو نیا لمحہ بنا سکتے ہو۔ ایک نئے انسان۔“

”دنیا کے واقعات؟ ہنہ۔ میں اپنی زندگی کے واقعات کی بات کرتا ہوں۔“

ڈاکٹر انصاری نے بے چین سے پہلو بدلا اور ہاتھ کو خفیف سی جنبش دی۔ ”تم وقت کو بہر طور تسخیر نہیں کر سکتے۔ یہ ایک مابعد الطبیعیاتی عمل ہے۔ مذہب جادو یا ایسی کوئی چیز نہیں۔ یہ تو ایک سیدھی صاف اور مثبت قوت ہے جو ہمیشہ آگے کی طرف بڑھاتی ہے، بناتی اور سنوارتی ہے، بگاڑنے یا خفی کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں، تم اپنی زندگی کو آج ہی سے ایک نئے ڈھب سے شروع کر سکتے ہو۔ اگر تم ماضی کو بھلا دینے پر اپنے آپ کو آمادہ کر سکو تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے تم ابھی پیدا ہوئے ہو۔ تمہارا دل، دماغ اور تخیل جوان ہو سکتے ہیں اور زندگی۔۔۔۔۔“

”تو پھر مذہب کی کیا ضرورت ہے؟“ نعیم نے چڑ کر پوچھا۔

”مذہب؟ افوہ۔۔۔ نیا انسان بننے کے لیے ایک نظریے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مذہب ہمیں وہ

منظریہ مہیا کرتا ہے۔ ٹھہرو، مجھے بتاؤ۔ اب تمہارے پاس کیا ہے؟“ وہ رکے، ”تاسف اور احساسِ جرم اور پیشمانی؟ اس اثاثے کے بل پر تم کیا کر سکتے ہو، کہاں تک جا سکتے ہو؟ اس بیماری ہی کا مقابلہ کر سکتے ہو؟ تم اپنی گذشتہ زندگی کے متعلق سوچتے ہو اور اسے تلف کرنے کی فکر میں ہو حالانکہ یہ تمہارے بس سے باہر ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے جو تم اپنا ذہن کھو دو۔ تم یہ سب جانتے ہو اور مافوق الفطرت باتیں سوچتے ہو اور خطرناک حد تک تخیل پرست ہوتے جا رہے ہو۔ تم قطعی لا حاصل طور پر، آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ختم کر رہے ہو، اپنے وجود کو بے مصرف بنا رہے ہو، اپنے لیے اور دوسروں کے لیے۔ اس وقت تمہیں ایک مثبت نظریے کی ضرورت ہے، ایسی قوت جو تمہیں اتنی تیزی سے آگے کی طرف چلائے کہ تمام پیشمانی اور احساسِ زیاں اور سارے غیر ضروری جذبات پیچھے رہ جائیں، جو تمہیں گزرے ہوئے وقت سے آزاد کر دے، جو تمہارے مصیبت زدہ ذہن کو جھٹک دے۔ میں جانتا ہوں، تمہارے دماغ پر تمہاری سوچ کا بوجھ ہے جو تمہیں ختم کر رہا ہے اور تمہارے دل میں کسک ہے جو نقصانِ عظیم کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح تم زیادہ دور تک نہیں جا سکتے۔“

”اپنے آپ کو دھوکا ہی دینا ہے، ڈاکٹر“، نعیم نے بیحد اکتا کر کہا، ”تو مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں۔ اگر اپنے آپ کو یہی کچھ بتلانا ہے کہ دیکھو بھائی اب تک جو کچھ ہوا اُسے تو بھول جاؤ اور نئے سرے سے پروگرام شروع کرو۔ زندگی صحت مند نظریے کی مدد سے ہی خوشگوار بن سکتی ہے چنانچہ سب سے پہلے تو نظریہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔“ تو جناب اس میں مذہب کہاں سے آگیا۔ یہ تو ہم محض تخیل کے بل پر یا تھوڑے سے فلسفے کی مدد سے بھی کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ۔ چند مادی فوائد کے لیے مذہب کو استعمال کرنا تو میرے خیال میں۔۔۔“

ڈاکٹر انصاری خاموش بیٹھے سرخ ہوتے رہے مگر بولنے سے پہلے انہوں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ ”میں مذہب کی اس زاویے سے تشریح کر رہا تھا جس زاویے سے تم نے اُسے دیکھا۔ یہ مذہب کی ہم گیری ہے کہ ہم اس سے مادی فوائد بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ورنہ مذہب تو ہمیں اُس دنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کا تصور بھی محال ہے۔ یوں مادی فوائد سے کوئی مذہب کسی کو متع نہیں کرتا۔ لیکن اگر آپ اسے محض روحانی رہنمائی کی خاطر استعمال کرنا چاہیں تو آپ کی خوش بختی ہے۔ مذہب کا سب سے بڑا آلہ عبادت ہے۔ عبادت، جو انسان کی شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک جذبہ بن جاتی ہے، جو انسان کو اپنے اندر جھانکنے کی استطاعت بخشتی ہے۔ آج تک جس کسی نے اپنے آپ کو جانا اور پہچانا ہے اس کی بساط عبادت نے اس میں پیدا کی ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر چلتا ہوا آدمی ساری دنیا میں گھوم گھام کر پھر اپنے آپ تک پہنچتا ہے۔ وہ خفیہ اور تنگ راستہ جو انسان کی اپنی ذات پر اگر ختم ہوتا ہے اور پھر اندر اتر

جاتا ہے اور جب آدمی ڈرتا ہوا جھجھکتا ہوا اپنی ذات میں داخل ہوتا ہے تو راستہ روشن اور کشادہ ہوتا جاتا ہے اور اس مقدس روشنی تک پہنچنے کا جذبہ ، جو راستے کے اختتام پر نظر آتی ہے ، اسے پالینے کی دیوانی خواہش انسان کو آگے چلاتی جاتی ہے اور اسے ایک مقصد عطا کرتی ہے اور جب وہ مقصد شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو انسان اپنی ذات میں کم ہو جاتا ہے ۔ پہلے شعور کے پردے اٹھتے ہیں ، پھر آہستہ آہستہ لاشعور کے در وا ہوتے ہیں اور جب وہ آفاقی سطح پر پہنچ جاتا ہے تو ماوراء میں دیکھنے اور اُسے جانتے لگتا ہے ۔ پھر وہ سلیمانی ٹوپنی پہن کر بازاروں میں پھرتا ہے ، دنیا کے ہنگاموں میں منزل منزل گھومتا ہے اور لوگ صرف ایک گننام اور قناعت پسند آدمی کو جانتے ہیں ، کیونکہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اور کوئی نہیں دیکھتا اور جو کچھ وہ جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا ۔ اس طرح چپکے چپکے وہ زندگی کی بنیادی سچائی اور اصلیت کی کھوج میں لگا رہتا ہے اور اسی کھوج میں اسے سکون مل جاتا ہے ۔ سکون ، جو دنیا کی تمام آفتوں کے مقابلے میں ڈھال ہے ۔

”تخیل اور فلسفہ کے متعلق تم کیا کہہ رہے تھے ؟ تم تخیل کی بنیاد کس پر رکھتے ہو ؟ تخیل کو تم بغیر کسی وجہ کے عمل میں نہیں لاسکتے ۔ ذہن کو اور خیالات کو مرنے سے بچانے کے لیے تمہارے پاس کوئی وجہ ، کوئی دلیل ہونی چاہیئے اور تبھی اس کے جواز کے طور پر تم سوچ سکتے ہو اور اپنے دماغ کو تباہی سے بچا سکتے ہو ۔ خیالات کی بنیاد تم Nothingness پر نہیں رکھ سکتے ۔ ایسا اگر کبھی کرو گے تو کسی خاص سمت میں بڑھنے کی بجائے تمہارے خیالات تیزی سے ادھر ادھر بکھر جائیں گے اور دماغ کو پاش پاش کر دیں گے ۔ سمت جو خیالات کو ملتی ہے اسی تلاش سے آتی ہے ۔ جو آدمی اپنے وجود کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے جاری کرتا ہے ۔ اس کے بغیر تخیل بیکار ہے ۔ یہی حال فلسفے کا ہے ۔ فلسفیوں کو آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ مادے کی اصل ماہیت کیا ہے ، اور اس کا کوئی اپنا ، الگ وجود بھی ہے یا محض ہمارے دماغ کی اختراع ہے ۔ دنیا کے تمام فلسفیوں میں سے اگر خدا کے تصور کو نکال لیا جائے ، یا اس قوت کو ، جو کہ کائنات اور انسانی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے ، تو یہ سب کے سب ایک دوسرے کی نفی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور سوچنے والے کو پاگل کر دیتے ہیں ۔“

آواز کو قابو میں رکھنے کی کوشش میں اُن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے ۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے بولنا چاہا جیسے اپنی بات کو جاری رکھنا چاہتے ہوں ، پھر اس ارادے کو ملتوی کر دیا اور گلاس میں بچے ہوئے پانی کو گلے میں انڈیل کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے ۔ نعیم آرام سے لیٹا ڈاکٹر کو دیکھے جا رہا تھا کہ وہ اندر سے ہل چکا تھا ۔ عذرانے بے دھیانی سے سب کچھ سنا تھا لیکن اب جو بھاری پُراسرار فضا کمرے پر طاری ہو گئی تھی اسے منتشر کرنے کے خدشے سے ہلتے ہوئے ڈر رہی تھی ۔

وہ بے چینی سے آنکھیں ادھر ادھر گھماتی ہوئی دونوں مردوں کو دیکھ رہی تھی اور ان کے جذبات کی ہلچل سے خوفزدہ تھی۔

ڈاکٹر انصاری اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے اور ہاتھ بڑھا کر یو کلپٹس کے پتوں کو آہستہ سے چھوا۔ ”یہ صبح دیکھ رہے ہو؟“ وہ باہر دیکھتے ہوئے خوشی سے بولے، ”اللہ تعالیٰ کی دنیا پر ہر ایک صبح بیحد دلکشی اور انوکھے پن کے ساتھ طلوع ہوتی ہے۔“

انہوں نے مسکرا کر نعیم کو دیکھا، پھر قریب آکر آہستہ سے اس کا کندھا تھپتھپایا اور بیگ اٹھا کر باہر نکل گئے۔ برآمدے میں وہ شفقت سے عذرا کے، جو ان کے پیچھے پیچھے نکل آئی تھی، کندھے پر جھک کر بولے: ”اُسے اکیلا چھوڑ دو۔“

اندر وہ ایک بے زبان، صابر بچے کی طرح بظاہر سکون سے لیٹا تھا، اس کے ہوشوں پر ابھی تک وہ اداس، الوداعی مسکراہٹ تھی جو ڈاکٹر کو جاتے ہوئے دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اس کی بڑی بڑی، کاہلی سے حرکت کرتی ہوئی متلاشی آنکھوں میں سے دھیمہ، سلگتا ہوا، مستقل کرب عیاں تھا۔ دھوپ ہر روز کی طرح اس کے بستر کو چھونے کے بعد اب واپس جا رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوا کا جھونکا آتا تو یو کلپٹس کی بو اس کی ناک میں داخل ہوتی جس سے وہ تنگ آچکا تھا۔ شاخ پر ایک تھی سی بے آواز چڑیا آگر بیٹھ گئی تھی۔ بالآخر یہ خدائے لامقام کی ایک خوبصورت اور انوکھی صبح تھی جو ہر روز کی طرح دنیا پر طلوع ہوئی تھی۔ اس صبح کی تلاش میں ہم کہیں نہیں جا سکتے؟ کیا ہم یہیں اپنے چھوٹے چھوٹے حقیر گھروں میں بیٹھ کر باہر طلوع ہوتے ہوئے دن کو دیکھتے رہیں گے؟ کیا ہم اسے کبھی نہیں چھو سکتے۔ کیوں؟ کیوں؟

رہبری کے لیے یہ ایک بے نظیر شے ہے۔ یا جیسے ایک عقلمند دوست مفید مشورہ دیتا ہے۔ یا کیا اس کی جگہ اس سے بھی اہم ہے؟ اچھا رکو، پہلے یہ بتاؤ کہ مذہب کے بغیر ہم کیا نہیں کر سکتے؟ کھانا کھا سکتے ہیں، سو سکتے ہیں، ہل چلا سکتے ہیں، پھول اُگا سکتے ہیں، سفر کر سکتے ہیں، ارر۔ یہ تو بکواس ہے۔ اچھا تو لو، مذہب کے بغیر بارش بھی ہوتی ہے، سیلاب بھی آتے ہیں، وبا بھی پھیلتی ہے، یہ بھی فضول ہے، البتہ شادی نہیں کر سکتے، مردے کو نہیں دفن سکتے اور۔ کچھ بھی ہو بھائی، کچھ بھی ہو، دو باتیں تو نہیں ہو سکتیں۔ ایک ساتھ تو بہر حال نہیں ہو سکتیں۔ یعنی ایک بات سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی، یہ تو قطعی ناممکن ہے۔ یا آپ خدا پرست ہو سکتے ہیں یا دہریے ہو سکتے ہیں یا گنوار ہو سکتے ہیں پر سب ایک ساتھ تو نہیں ہو سکتے۔ ایک بات سچ ہے اور دوسری بات جھوٹ، صفا جھوٹ۔ لیکن سچ۔ سچ کیا ہے؟ کچھ تو ہے جس کا پتا نہیں چلتا، کچھ، کچھ نہ کچھ! لعنت ہے۔ کیوں میں نے اتنی دیر تلک احمقوں کی طرح کچھ سوچا ہی نہیں؟ کبھی سوچ ہی نہیں آئی، حد ہے بھٹی، کیسے کیسے نالائق لوگ بھرے پڑے ہیں دنیا میں، یعنی سچ کو جاتے کے لیے لوگوں نے عمریں گنوا دیں اور میں کیا کچھ دیر کے لیے

اطمینان سے لیٹ کر سوچ بھی نہ سکتا تھا؟ سخت افسوس کی بات ہے۔ اب مجھے اور ڈاکٹر کو ہی لے لیجیے۔ مجھے روحانیت کی کوئی سوجھ بوجھ ہی نہیں اور وہ ہوا کثرت مذہبی آدمی۔ ہم دونوں کا اسلوب خیال، نقطہ نظر اور زندگی بسر کرنے کا نمونہ ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات قائم کیے رہے۔ بظاہر ایک ہی سمت میں بڑھتے رہے، صحت اور کامیابی کی طرف، سوائے آج کے۔ تو۔۔ وہ کیا ہے جو اس مخالفانہ رویے کے باوجود محض دو انسانوں کی حیثیت میں ہمیں ایک دوسرے کا اعتماد حاصل کرنے کی توفیق دیتا ہے؟ جو ہمیں محض سوجھ بوجھ کی بنا پر یہ سمجھنے کی طاقت دیتا ہے کہ یہ دوسرا شخص بھی اتنا ہی سادہ دل اور محبت اور دوستی کا اہل ہے جتنے کہ ہم ہیں۔ کیا یہ خدا ہے؟

مگر سوال یہ ہے بھائی کہ فائدہ کیا ہوا۔ جب تک ہمیں اس کا علم نہ تھا کیا ہو گیا تھا؟ ڈاکٹر اور مریض یا میاں اور بیوی کے تعلقات میں خدا کہاں آتا ہے۔ اس سہانی صبح کے حسن کو محسوس کرنے اور اس کے تعریف کرنے میں کسی اور چیز کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کیوں خواہ مخواہ ساتھی انسانوں کی قدرتی زندگیوں کے نیچے دیکھنے کی کوشش کریں جب کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں؟ کیوں؟ عذرا ابھی تک کیا کر رہی ہے؟ میں اس سے بات کروں گا۔ وہ نیچے والے برآمدے میں ڈاکٹر سے بحث کر رہی ہوگی۔ وہ یقیناً کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر کو قائل کر لے گی۔ وہ بیحد عقلمند ہے۔ وہ اپنے بے بس مگر پُر انداز میں اپنا نظریہ اس کی رائے پر مثبت کر دے گی۔ اس کا نظریہ؟ اس کا نظریہ ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟ جو کچھ میں نے کھویا ہے۔ جو کچھ میں نے۔۔۔ ابھی ابھی جھمی ہلکے پھلکے قدموں سے چلتی ہوئی گزری ہے۔ کاش یہی کچھ دیر رک کر مجھ سے بات کرے۔ لیکن وہ تو مجھے یوں دیکھتی ہے جیسے مونٹ ایورسٹ کو دیکھتے ہیں، یا بدھ کے مندر کو (وہ ہنسا)۔ ابھی ابھی جو گاڑی سڑک پر سے گزری ہے میں بتا سکتا ہوں کہ رائے بہادر کیدار ناتھ کی اوپل ہے۔ اسی طرح بغیر دیکھے ہوئے میں سب کی گاڑیاں الگ الگ بتا سکتا ہوں۔ کہ یہ ٹھاکر بلبیر سنگھ کی فورڈ ہے اور یہ ڈاج ہے اور یہ فلاں ہے اور یہ فلاں۔ یہاں پر لیٹے لیٹے میں ان کے انجنوں سے اسی طرح واقف ہو چکا ہوں جیسے گھوڑا اپنے تانگے سے ہو جاتا ہے۔ میں ان سے تنگ آچکا ہوں۔ صرف میں ایسی چمکدار شفاف صبحوں کو پسند کرتا ہوں، اور تمہے بے آواز پرندوں کو جو کچھ دیر بیٹھ کر اڑ جاتے ہیں۔ لیکن سچ بالآخر سچ ہے اور اس کے بغیر۔ مجھے کچھ ایسا خیال ہوتا۔۔۔ کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ باوجود ان سب چیزوں کے۔۔۔

لیکن سچ کی تلاش میں جو وقت ہم ضائع کرتے ہیں، جو قوت اور دلچسپی ہم کھوتے ہیں اس کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟ آج اگر میں مان لوں کہ کائنات کے تمام ظواہر کو چلانے والی ایک برتر ہستی ہے جو سب کی خالق بھی ہے تو کیا فرق پڑے گا؟ یہ بھی مان لیا کہ مذہب ہی

ایک رستہ ہے جس کے ذریعے ہم اس ہستی کو محسوس اور تسلیم کرتے ہیں ، پھر ؟ پھر کیا ہے ، کچھ بھی نہیں ۔ میں اسی طرح لیٹا ہوا ہوں اور ایک مکھی مجھے تنگ کر رہی ہے ۔ ابھی عذرا آئے گی اور پاس بیٹھ کر محبت سے مجھے دیکھے گی یا کتاب پڑھنے لگے لگی اور مجھے جانے کیوں ندامت سی ہوگی ۔ اور ڈاکٹر ہر روز آئے گا اور اس وقت تک جب تک کہ پھر باتیں کرنے کی خواہش اس پر غلبہ نہیں پالیتی دوا دے کر چلا جایا کرے گا اور اس کا نظریہ اور میرا نظریہ کہیں بیچ میں نہ آئے گا ۔ میں ہل بھی نہیں سکتا ۔ میں یو کلپٹس کے پتوں کی بو سے بھی نجات حاصل نہیں کر سکتا جس سے میں تنگ آچکا ہوں ۔ پھر کیا فائدہ ! کیا یہ ایسا ہے کہ خدا واقعی ہے اور مجھ سے ناراض ہے کہ اب تک میں نا سمجھ رہا ۔ ہنہہ ۔ میں تو نا سمجھ ہی پیدا ہوا تھا ۔ میری تو سمجھ میں آتا ہے کہ مذہب کے راستے پر چل کر ہم پہلے نظریہ بنا لیتے ہیں ، پھر عقیدہ آپ سے آپ آجاتا ہے ، سچ پر آئے چاہے جھوٹ پر ۔ (وہ دوبارہ ہنسا)

کھڑکی میں چند چڑیاں شور مچا رہی تھیں ۔ نعیم نے کاہلی سے سیدھے ہاتھ کی مدد سے انہیں اڑایا اور اداسی سے باہر دیکھتا رہا ۔ طبعی لحاظ سے وہ مسکین تھا ، روحانی طور پر پر نخوت ! خدائے لامقام کی اس نکھری ہوئی خوشگوار صبح کو دیر تک اس کا ذہن اس تکلیف دہ جستجو میں کھویا رہا اور اس کے سر پر مصیبت اور دکھ کے سائے منڈلاتے رہے ۔

(۳۵)

اُس صبح کو سب سے پہلی آواز جو نجھی نے سنی راج ہنس کے جوڑے کی تھی جو برآمدے کے آگے سے گزر رہا تھا ۔ وہ آنکھیں بند کیے کیے بستر میں کسمائی ۔ رات بھر بادل گرجتا رہا تھا اور بارش دریچے کے شیشوں پر برستی رہی تھی ۔ گہری غنودگی کی حالت میں اُس نے رات بھر کی بے آرامی کے متعلق سوچا اور دوبارہ سونے کی کوشش کی ۔ لیکن دونوں پروقار اور کم گو راج ہنس آج خلاف معمول بولے جا رہے تھے ۔ وہ اُسی طرح نیند اور نقاہت بھرا سر نرم تکیوں پر رکھے راج ہنسون کی بولی اور اُس سے پرے شروع ہوتے ہوئے دن کی دھیمی ، خوابناک آوازوں کو سنتی رہی ۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے لیے وہ گہری نیند میں جاتی اور چھوٹے بڑے اوٹ پٹانگ خواب دیکھتی رہی ۔ چائے کی پیالی تپائی پر رکھی رکھی سرد ہو گئی ۔

آخر جب دھوپ شیشوں میں سے چھن کر اُس کے منہ پر پڑنے لگی تو وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی ، بیٹھے بیٹھے نقاہت سے دو جمائیاں لیں اور اٹھ کر دریچے کے پٹ کھول دیے ۔ انگڑائی کے لیے اٹھے ہوئے اس کے بازو ہوا میں ہی رک گئے اور وہ ٹھنک کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی ۔ سامنے بیحد خوبصورت دن تھا ۔ زمین اور آسمان جیسے ابھی ابھی دھو کر پھیلانے لگے

تھے۔ فضا میں کوئی غبار، کوئی دھند نہ تھی، بادل کا ہلکا سا سایہ بھی نہ تھا۔ آسمان گہرا نیلا اور زمین سرسبز تھی اور فضا میں دھوپ کے رنگ تھے۔ سبزے پر سے نمی کی بھاپ آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھی۔ درختوں کے پتوں پر رکا ہوا بارش کا پانی ہوا کے ساتھ قطرہ قطرہ گر رہا تھا۔ چکمدار دھوپ سارے دن میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور درختوں کے میچ میچ پرندے ایک دوسرے کے تعاقب میں اڑ رہے تھے۔ پرندے ہر قسم کے تھے اور ایک ساتھ بول رہے تھے اور پتا نہیں چلتا تھا کہ کون کون سی آواز کس کس کی تھی۔ مگر آوازوں کا وہ سیلاب سننے والے پر یکبارگی ایک بیحد واضح تاثر چھوڑتا تھا، مسرت کا تاثر، کہ وہ مسرور تھے اور خوشی میں بول رہے تھے۔ دھوپ لحظہ بہ لحظہ تیز تر ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور زمین کے مختلف رنگ ابھر رہے تھے: گیلے سرخ راستے، نیلگوں سڑک، مٹیالی پگڈنڈیاں، ایک سرخ گھوڑا اور اس کی رنگین گاڑی، براؤں سپینیل کتا جو مسخروں کی طرح تانبے کے پیچھے بھاگ رہا تھا، اور سینکڑوں رنگوں کی تتلیاں جو مسرور شرایبور کی مانند لڑکھڑاتی ہوئی اڑ رہی تھیں۔ اور چمکتا ہوا سفید آنکھوں کو چندھیا دینے والا راج ہنسوں کا جوڑا جو شہانہ وقار سے چلا جا رہا تھا، جن کے پروں پر پانی کے قطرے رکے ہوئے تھے جن میں دھوپ کے رنگ جھلملا رہے تھے۔ نجمی نے اس چکمدار روشن دن کے حسن کو دم بخود ہو کر دیکھا اور دو چار لمبے لمبے سانس لیے۔

”یہ ایسا دن ہے۔ یہ ایسا دن ہے۔“ اس نے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ”میں دیکھ سکتی ہوں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا اور میز پر سے برش اور رنگ اُٹھ کر بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

یہ نجمی تھی جو حال ہی میں انٹر کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی اور آج کل بقول عمران کے عیش کر رہی تھی۔ لیکن عمران کی ذہنی سطح سے ذرا اوپر اُٹھ کر دیکھا جاتا تو نجمی ایسے لوگوں میں سے تھی جن کے لیے عیش کا لفظ بے معنی اور گھٹیا ہوتا ہے۔ وہ احساس کی اوپری سطح پر زندہ تھی۔ عمران اور اس کی طرح کے دوسرے لوگوں کے لیے اُس کے دل میں محض ایک دائمی، خاموش حقارت کا جذبہ تھا۔ وہ ان سب کو ایسے لوگوں میں شمار کرتی تھی جو مستقل زندگی کی پختلی سطح پر کینے پن کے سکون اور قناعت کے ساتھ رہے چلے جاتے ہیں۔ جو چھوٹی بڑی آسائشوں کے حصول کی خاطر لاتعداد اندیشے دل میں اکٹھا کر لیتے ہیں اور اسے کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ جو ذہن اور روح سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اور بالآخر فقط عمومی پن کے سوا کسی چیز کے قابل نہیں رہتے۔ جو دائمی، گمنام عمومیت کو زندگی کی تمام کاوشوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

وہ خود مختلف طور پر سوچتی اور محسوس کرتی تھی۔ اب وہ چند سال پہلے کی چھوٹی سی لڑکی نہ تھی جو اپنے ارد گرد کی تقریباً ہر جاندار اور بے جان شے کو محسوس کر کے حیرت زدہ ہو جایا کرتی تھی اور جس کی متغیر طبیعت کے ہاتھوں سارے گھر والے نالاں تھے۔ اب بھی کبھی کبھی کوئی

دلفریب منظر یا انوکھا واقعہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وہی کنواری ، اچھوتی حیرت جھلکنے لگتی تھی لیکن یہ محض اس کا احساس تھا جس میں سے کہ اب لاعلمی اور صدمے کا تاثر خارج ہو چکا تھا ۔ اُس کا اتہائی حساس ذہن بار بار جھٹکے کھا کھا کر اب ٹھیر چکا تھا اور آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا ۔ اب اُس نے اپنے آس پاس کی ہر جاندار اور بے جان شے کے ردِ عمل کو دیکھ کر اور جان کر قبول کر لیا تھا اور محض اسی کی بنا پر اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگی تھی ۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ اور کم گو تھی ۔

اور تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ یہ سب جانتی تھی ۔ یہ اس قدر واضح طور پر اس کے علم میں تھا کہ وہ ان سب سے مختلف ہے ، کہ اس کی زندگی اُن سب کی زندگیوں سے الگ ہے ، کہ اُس کی دنیا اُن کی دنیاؤں سے مختلف سطح پر آباد ہے ۔ اور یہ سب کچھ اُس نے اتنی مایوسی ، اتنی دل شکنی کے بعد جانا تھا ۔ وہ ساری دوستیاں جو اُس نے لگائیں اور ختم ہو گئیں ، وہ تمام اچھے اور پیارے لوگ جنہوں نے اُسے سخت مایوس کیا ، جو اس قدر معمولی اور نالائق نکلے اور اُسے چھوڑ گئے ۔ اس کے ذہن کے آس پاس دور دور تک انسانی آبادی ، کسی ہمسایگی کا نشان تک نہ تھا ۔ گو وہ اب بھی ان سب سے بغیر کسی تعصب کے ملتی جلتی تھی کہ فی الحقیقت وہ کسی طاقتور منفی جذبے کی اہل نہ تھی ، لیکن وہ جانتی تھی کہ اُن کے ساتھ کبھی نہ رہ سکتی تھی ، کہ وہ دو مختلف اکائیاں تھیں جو مختلف سطح پر تخلیق کی گئی تھیں ۔ اپنی غیر آباد ذہنی بلندی پر سے وہ اُن کو حسرت ، پیار ، شفقت اور حقارت سے دیکھتی ہوئی شدید احساسِ تنہائی کے ساتھ رہ رہی تھی ۔ اُس کو تنہا اور خاموش دیکھ کر اُداسی کا نہیں ، بزرگی کا احساس ہوتا تھا ، اور اس کے بعد اس کا بڑا ساسر ، نو عمر آنکھیں اور نازک خوبصورت جسم دیکھ کر ہنسی آتی تھی ۔ روشن آغا اس سے ویسی ہی محبت کرتے تھی جیسی عذرا سے ، اس کی ماں اس سے اتنا ہی دور تھی جتنا اپنے دوسرے بچوں سے ۔ گھر بھر میں بس عذرا ہی ایک تھی جس سے وہ مکمل ذہنی اطمینان اور فطری پن کے ساتھ ملتی تھی کیونکہ اس نے کبھی اُس سے اُن تمام غیر معمولی صفات کی اُمید نہ رکھی تھی جن کی وہ دوسرے سب لوگوں سے متوقع تھی ۔ وہ اُس کے لیے شفقت اور مہربانی کا ایسا دریا تھی جو گدلا اور کٹا پھٹا ہونے کے باوجود ماہی گیروں ، مچھلیوں اور لاکھوں فصلوں کی زندگی کا سبب بنتا ہے ۔ کبھی کبھی جب اچانک اُس کا جی مر جانے کو چاہتا تو وہ عذرا کی گود میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگتی تھی ۔

کالج میں وہ تاریخ اور معاشیات کے علاوہ موسیقی اور آرٹ پڑھتی تھی ۔ تصویر کشی ایک جذبے کی طرح اُس کے ساتھ لگی ہوئی تھی ۔ روشن محل میں ہر تیسرے مہینے وہ کمرہ تبدیل کرتی تھی ۔ بیٹھے بیٹھے اچانک ایک روز اسے خیال آتا کہ اب وہ اس کمرے میں نہیں رہ سکتی ، کہ وہ اس منظر سے تنگ آچکی ہے ، اور بغیر کوئی چیز چھوٹے وہ صرف اپنے کینوس اٹھا کر برآمدے میں

محل آتی اور روشن محل کا سارا عملہ اُس کے لیے نیا کمرہ سجانے میں مصروف ہو جاتا۔
 اُس خوبصورت صبح کو وہ برآمدے کے کونے میں سٹول پر بیٹھی بیچہ انہماک سے منظر
 کشی میں مصروف تھی کہ اُس کی اکلوتی عزیز دوست نے بھاگتی ہوئی آکر سیرھیوں پر بیٹھ گئی۔
 ”اوہ۔۔۔ ہا، کس قدر گرمی ہے۔“ اُس نے دوپٹے کے پلو سے ہوا کرتے ہوئے کہا
 اور اپنے کپڑے سے لت پت جوتے اتارنے لگی۔

”اوہو ہو۔۔۔ کیا جس ہو رہا ہے۔“ اُس نے دوبارہ کنکھیوں سے نجمی کو دیکھا جو تصویر
 میں غرق تھی۔ ”فوہ۔۔۔ فوہ۔۔۔“
 نجمی نے کوئی دھیان نہ دیا۔

”اللہ تو بہ کیا چکر میں ہیں یہ لڑکیاں۔“ فے جل کر بولی، ”ارر کماری نجمی میگم چٹوپا
 دھیائے صاحب، اگر آپ نے میری طرف توجہ نہ دی تو میں جوتے لے کر اوپر آجاؤں گی اور
 آپ کے آرٹ میں حرج واقع۔۔۔“

نجمی بوکھلا گئی۔ ”ارر اوہ۔۔۔ ارے ہائے فے تم کب سے۔“

”ٹھیک ٹھیک تو یاد نہیں کم و بیش بیس سال سے ہوں۔“

نجمی بے خیالی سے اُسے دیکھتی رہی۔

”اور اس وقت کچھ موسم کے بارے میں عرض کر رہی تھی۔“

”اوہ ہاؤ سلی فے ڈیئر۔“ نجمی نے کہا، ”اچھا معاف کر دو۔ تم نے کوئی منظم لکھی؟“

”اس گرمی میں؟“

نجمی کھلکھلا کر ہنس پڑی: ”گرمی پر ہی لکھ دو، ایسا خوبصورت دن ہے۔“

”اچھا تو سنو۔۔۔“

”اررر جوتا جوتا۔۔۔“ نجمی چلائی۔ فے نے جلدی سے جا کر ایک جوتا، جو پاؤں میں ہی

رہ گیا تھا، اتار دیا۔

”سنو۔“ پھر اُس کے پاس فرش پر بیٹھ کر اُس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا:

”ہوا، جو درختوں کی سانس تھی، گذشتہ رات کی بارش میں گھل گئی۔ اب درخت قبرستان

کے کتبوں کی طرح ساکت کھڑے ہیں۔ اور میں اپنی سانسوں سے انہیں زندہ کرنے کی کوشش

کر رہی ہوں۔ میں اپنی تمام سانسوں سے ایک پتا بھی نہیں ہلا سکتی کیونکہ میں دل شکستہ ہوں

اور میری زندگی کا زور ٹوٹ چکا ہے۔“

”سچ سچ چوپ کرو۔“ نجمی بے اختیار ہنستے ہوئے بولی، یہ تو صفا نثر ہے۔“

”یہ تو خیالات ہیں۔“ فے گرم ہو کر بولی، ”اور کیا ابھی سے شاعری ہو گئی؟ یہ نقاشی

تھوڑائی ہے کہ ایزل اور برش لیے اور تصویر بنا کے رکھ دی۔ شاعری کی بڑی منزلیں ہیں کماری

جی -

”اچھا بھائی مانا کہ تم بڑی منزل میں ہو -“ نجمی نے کہا، ”یہ تصویر دیکھو -“
 فے نے آنکھیں سکیر کر، ہاتھ کا سایہ کر کے کئی بار مسخر سے اوپر نیچے دیکھا اور کندھے
 اچکا کر بولی: ”معمولی ہے -“
 ”سامنے والا منظر ہے“ نجمی نے بتایا -

”اچھا؟“ فے نے بیحد اچھے سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا -
 ”بھئی مسخرہ پن مت کرو -“ نجمی نے سنجیدگی سے کہا، ”آج سورے سورے مجھے ایسا
 لگا کہ یہ دنیا کا حسین ترین دن ہے جو طلوع ہوا ہے - پتا نہیں فے پہلے بھی دن ایسے ہی نکلتا
 ہو گا لیکن آج رات بھر بارش کا شور سن سن کر میں ایسے دن کی توقع نہیں کر رہی تھی - سورے
 سورے راج ہنسون نے بول بول کر مجھے جکا دیا اور جب میں نے کھڑکی کھولی تو کیا بتاؤں فے ڈیئر
 کہ درختوں پر سارے پرندے بول رہے تھے اور ان کی آوازیں اور سامنے کا سارا منظر میری
 آنکھوں میں کھب گیا - پتا ہے برمن جی کہتے ہیں کہ اگر آپ آنکھیں بند کر کے منظر کی ایک ایک
 چیز کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہوں تو جان لیں کہ وہ تصویر بنانے کے قابل ہے - اور فے ڈیئر مانو
 کہ جب میں نے آنکھیں بند کیں تو سبزے پر سے بھاپ کو اٹھتے ہوئے دیکھا، اور پتوں پر رکے
 ہوئے قطروں کو ہوا کے ساتھ نیچے گرتے ہوئے اور پرندوں کو ایک دوسرے کے پیچھے اڑتے
 ہوئے اور - ہائے فے اب بھی حالانکہ صبح گزر چکی ہے - اب بھی -“

”اچھا؟“ فے نے سچ مچ حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا، ”تب تو جلدی سے اسے بنا
 ڈالو -“

”ہاں، اور منظم لکھو - یہ تخلیق کا دن ہے -“

”مجھے بھوک لگی ہے -“ فے نے منہ لٹکا کر کہا -

گیلی بھری پر قدموں کی آواز سن کر وہ چونک پڑیں - عمران ڈریسنگ گون پہنے جمائیاں
 لے رہا تھا اور اس کے ساتھ خالد حسب معمول فے کو تنگ کرنے کے منصوبے بناتا ہوا چلا آ رہا
 تھا:

”مجھے جاپانی ناموں سے عشق ہے -“ وہ کہہ رہا تھا، ”مثلاً فے کی ماشا یا فے می گوشا یا
 فے - - ارے باپ رے یہاں تو فے اور نجمی تشریف رکھتی ہیں - صبح بخیر بیبیو، ہم آپ
 کے آرام میں محل تو نہیں ہوئے؟“

فے نے جھکڑے سے ڈرتے ہوئے بڑے اخلاق سے سلام کا جواب دیا -
 ”خیر کوئی حرج نہیں - میں اسی کو یہی بتا رہا تھا“، خالد نے کہا، ”کہ مجھے جاپانی ناموں
 سے بیحد عقیدت ہے - اور جاپانی شاعری سے -“

”یہاں کوئی جاپانی شاعری نہیں کرتا۔“
 ”کئی اصحاب کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ۔“
 ”میں قطعی جاپانی شاعری نہیں کرتی۔“ فے نے کہا۔
 ”آپ یقیناً کرتی ہیں۔“
 وہ شپٹا گئی۔ ”ارے ہائے نجھی میں کب جاپانی شاعری کرتی ہوں؟“
 ”بھئی خالد اب فے کو تنگ مت کرو۔“ نجھی نے کہا۔

”لیکن یہ حقیقت ہے نجھی کہ مجھے جاپانی شاعری سے عشق ہے۔ مثلاً وہی والی منظم جو خزاں کے بارے میں فے نے لکھی تھی ایک دم جاپانی تھی۔“
 ”کب جاپانی تھی۔“ فے جوش میں آکر بولی، ”وہ تو برمن جی کی بھی رائے ہے کہ بیحد اور بیچنل تھی۔“

”جاپانی شاعری بھی اور بیچنل ہے، بلکہ اورینٹل ہے۔“ خالد نے کہا۔
 ”بس یہی پتا ہے آپ کو؟“ فے نے ہاتھ نچا کر کہا، ”چینی شاعری اورینٹل ہے۔ اور چینی سے زیادہ ہندوستانی۔“

”نہیں فے ڈیئر ہندوستانی سے زیادہ چینی۔“ نجھی نے کہا۔ ”ہیں؟ یعنی ہندوستانی شاعری۔“ وہ لڑائی پر آمادہ تھی۔
 ”بھئی میرا مطلب ہے کہ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے چینی شاعری زیادہ قدیم ہے۔ ویسے خیال تمہاری منظم کا بھی اورینٹل ہو سکتا ہے۔“
 ”وہ تو ہئی۔“ فے نے بحث کرتے ہوئے کہا، ”بہر حال جاپانی شاعری قطعی اورینٹل نہیں بلکہ بکواس ہے۔“

”ارے رے دیکھو بھئی فے، تمہاری منظم اورینٹل تھی چاہے کوئی نٹل تھی،“ خالد نے اٹھکی اٹھا کر کہا، ”پر جاپانی شاعری کے متعلق کچھ کہا تو لڑائی ہو جائے گی۔“
 ”تو ہو جائے لڑائی۔“

”تھ تھ تھ یعنی کس قدر ان لیڈی لائک رویہ ہے آپکا فہمیدہ میکم، تھ تھ تھ تھ ہے بھئی۔“

”درست ہے بالکل۔ آپ کو شاعری کا کیا پتا۔“
 جامیاں لیتے لیتے اکتا کر عمران نے پوچھا: ”آپ ناشتے پر نہیں آئیں بی بی۔ چہا پوچھ رہے تھے۔“

”ارے کیا بتاؤں اسی یہ تصویر سویرے سے میرے اوپر سوار ہے۔ کچھ بھی نہیں کیا۔“

روشن آغا بھی تھے؟“

”ہاں۔“

آخر جب لڑائی شدت اختیار کر گئی تو نجفی اور عمران نے ڈپٹ کر خالد سے چپ رہنے کو کہا۔

”آپ بیچ میں مت آئیں۔ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔“ خالد نے کہا۔

”کوئی ذاتی معاملہ کسی کا نہیں ہے۔“ فے چیخ کر بولی، ”صریحاً مسخرہ پن ہے۔“

لے دے کر دونوں میں صلح صفائی کروائی گئی۔ دوپہر کے کھانے تک وہ چاروں برآمدے کی سیرھیوں پر بیٹھے کابلی سے باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی خالد کوئی لطیفہ سنا کر اُن کو ہنسا دیتا یا فے کو منانے کی کوشش میں سنجیدہ اور دردناک لہجے میں اس کی کوئی منظم گنگنا لگتا۔ کھانے کی میز پر پرویز نے فے کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر پوچھا: ”آج پھر فہمیدہ میگم اور خالد میں لڑائی ہوگئی۔“ وہ ہمیشہ فے کا پورا نام لیا کرتا تھا۔

”ہاں پپا۔“ عمران نے پلیٹ میں چاول اکٹھے کرتے ہوئے کہا۔

خالد بوکھلا گیا: ”نہیں انکل میں تو کہہ رہا تھا کہ جاپانی شاعری میں قنوطیت ذرا بھی نہیں ہے اس لیے مجھے پسند ہے، اور فے کی شاعری میں اس قدر۔۔۔“

”پھر تم ایسی دردناک آواز میں اس کی منظم کیوں گا رہے تھے؟“ نجفی نے جلدی سے کہا۔

وہ اور زیادہ بوکھلا گیا: ”ارر میرا مطلب ہے کہ فے کی شاعری میں بھی نہیں ہے۔ یعنی مجھے پسند ہے۔“ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

کھانے کے بعد جانے کیسے مذہب اور کلچر پر بحث چل نکلی جو کہ خالد کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس کا پرانا نظریہ تھا کہ مذہب اور کلچر کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں، جس نظریے سے کہ باقی سب کو اختلاف رائے تھا۔ فے، جو اس کی مخالفت کا ٹھیکہ لیے بیٹھی تھی، بڑھ چڑھ کر بحث میں حصہ لے رہی تھی:

”خالد نے محض کتابیں پڑھ کر اپنے نظریات بنا لیے ہیں حالانکہ یہ ایسا موضوع ہے جس کے لیے قوموں بلکہ طبقات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔“

”جھگڑو نہیں بھئی۔“ پرویز نے سوچ سوچ کر کہنا شروع کیا، ”آپ دونوں کا ذاتی اختلاف ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے خالد کہ قوموں کی تہذیب اُن کے مذاہب سے براہ راست اثر لیتی ہے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی تہذیبیں بڑے بڑے مذاہب پر قائم ہیں۔ یورپ میں دیکھو۔۔۔“

”جی ہاں یورپ کو ہی لے لیجیے،“ خالد نے بات کاٹ کر کہا، ”یورپ کے عیسائی کیا اسی

طرح رہتے ہیں جیسے ہندوستان یا چین کے؟ یہاں پر زیادہ تر عیسائی کلیاں صاف کرتے ہیں۔ کیا ان کی تہذیب وہی ہے جو انگلستان کے بادشاہ کی ہے؟“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ کی تہذیب کا دار و مدار محض طبقاتی تقسیم پر ہے۔“ نے کہا۔

”محض طبقاتی تقسیم پر نہیں ہے، لیکن تہذیب کی تشکیل میں کسی جماعت کے معاشی حالات اور وسائل کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

”یہ درست ہے۔“ عذرا نے، جو نعیم کے ساتھ کھانا کھا کر ان کے پاس آ بیٹھی تھی، کہا، ”ہر ایک معاشرے کا قیام سوسائٹی پر ہوتا ہے، کہ وہاں کے لوگ کیسے آپس میں ملتے ہیں اور کب ملتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مذہب ایک دائمی شے ہے اور تہذیب جو ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہے اس پر قائم نہیں کی جا سکتی۔“

نجھی نے پرویز کی حمایت میں بولنا چاہا لیکن عذرا کے خیال سے سر کو خفیہ سی غیر یقینی جنبش دے کر رہ گئی۔ اس پر فے تیز ہو کر بولی: ”کیا آپ مذہب کو ایک مکمل ضابطہ حیات نہیں مانتے؟ بتائیے جب اول اول انسانوں کی گروہ بندی ہوئی تھی تو مذہب کیا بنا پر نہیں ہوئی تھی؟ اور پھر آپ تہذیب اور تمدن اور سب چیز کو ملا جلا کر سراسر کنفیوژن پھیلا رہے ہیں۔ آپ کے پاس کوئی واضح تصور ہی نہیں ہے۔ کلچر بالکل دوسری بات ہے۔“

”جی نہیں“، خالد نے کہا، ”نوع انسانی کی گروہ بندی علاقائی حدود کی بنا پر ہوئی تھی۔“

”وہ تو جب تھی لوگ غاروں میں رہا کرتے تھے۔ جب تہذیب کی روشنی پھیلی تو منظم گروہ بندی محض مذہب کی بنیاد پر ہوئی، جب علاقائی حدود بندی کا تصور ختم ہو گیا، جب دو مختلف گاؤں میں رہنے والے دو شخص بھائی بھائی تھے محض اس وجہ سے کہ ایک مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔“

”یہی تو فرق ہے بھئی کہ آپ کے پاس کلچر کا بڑا غلط تصور ہے۔“ عذرا نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا، ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دو آدمی، جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، جب ملیں تو ایک دوسرے کے رہن سہن کے طریقے کو پسند نہ کریں، یا ایک دوسرے کی خوراک اور پوشاک کو اہمیت نہ دیں، یا ایک دوسرے کی موسیقی کو محض خوش خلقی کی بنا پر برداشت کریں۔“

”اور یہ سراسر علاقائی حدود پر منحصر ہے۔“ خالد نے کہا، ”ہندوستان ہی کو لیجیے۔ شمال کے لوگ بلند و بالا اور گورے چٹے ہیں، ان کی سوسائٹی میں بہادری اور جوانمردی کا بول بالا ہے، ان کے مشاغل شہسواری اور نشانہ بازی ہیں اور خوراک گوشت ہے۔ جوں جوں آپ جنوب کی طرف آتے ہیں لوگوں کے قد چھوٹے اور جلد سانولی ہوتی جاتی ہے، ان کی خوراک مچھوں کا سالن اور سبزیاں ہوتی ہیں اور وہ مزاج کے تیز، بزدل اور ذہین ہوتے جاتے ہیں۔ شمال مغربی صوبوں

کا ایک مسلمان بیٹی کے مسلمان کے گھر جا کر اپنے آپ کو اجنبی پاتا ہے۔ کیوں؟ انگلستان کو دیکھیں۔ انہوں نے ریاست کو مذہب سے الگ کر دیا ہے، کیوں؟ کہ ریاست میں ان کا کلچر ہے۔“

”وہ مادہ پرستی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔“

”چارہ کیوں نہیں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔“

پرویز نے بولنا چاہا لیکن اس کی آواز تین چار آوازوں میں دب کر رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اور اس کی بیوی اگتا کر اٹھ گئے۔ عذرا نے جب دیکھا کہ بحث و حث کوئی کرنا نہیں چاہتا، سب دھاندلی کر رہے ہیں تو وہ بھی اٹھ کر نعیم کے پاس چلی گئی۔ اس کے بعد جو بحث کا ستیا ناس ہوا اور جو غدر مچا تو کسی کو ہوش نہ رہا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور کیا کہہ رہا ہے اور خوش خلقی کس بلا کا نام ہے۔ ایک دوسرے پر کند ذہنی اور مسخرے پن کے الزامات لگانے کے بعد جو باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو کلچر سے معاشیات اور فلسفہ اور تاریخ اور آرٹ اور موسیقی اور فلمی گانے اور فلمیں اور ایکٹریسیں اور ان کی ذاتی زندگی کے واقعات پر جا کر ختم ہوا۔ جب سہ پہر کی چائے کے لیے سب اکٹھے ہوئے تو باتیں کر کر کے تھک چکے تھے۔ خاموشی سے اُونگھتے ہوئے انہوں نے چائے ختم کی۔ پھر خالد اور عمران اٹھ کر باہر جانے کی تیاری کرنے لگے اور نجی اور فنی نامکمل تصویر کی طرف بڑھیں۔

”فنی تم کو گھر جانا ہو تو ہم اُسی طرف جا رہے ہیں۔“ خالد نے سیرھیاں اُترتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں بھئی شکریہ۔ میں بعد میں جاؤں گی۔“ فنی نے اخلاق سے جواب دیا۔

”آج آپ سارے دن کے لیے روشن محل میں مدعو ہیں؟“

فنی نے سنی ان سنی کر دی۔ دونوں لڑکے بحری کی گیلی سڑک پر گیٹ کی طرف بڑھے۔

”خالد اس فال میں ہم دارجلنگ جا رہے ہیں۔“ نجی نے برآمدے میں سے چلا کر بتایا۔

”کیوں اسی۔۔۔“

”اماں گولی مارو یار فال کو۔۔۔“ عمران نے جھلا کر کہا۔

”مبارک ہو۔“ خالد گیٹ پر سے ہاتھ ہلا کر چلایا، ”اب کہاں چلیں؟“

”بلیرڈ۔“

دونوں لمبے لمبے قدم رکھتے یونیورسٹی کلب کی طرف چلے گئے۔

جب فنی اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تو وہ ابھی تصویر بنا رہی تھی۔ کینوس پر کام کرتے کرتے دفعتاً اس کو پرانے جانے پہچانے احساس تہائی نے گھیر لیا۔ اس نے سوچا کہ

صبح سے لے کر شام تک وہ اجنبی لوگوں میں گھری رہی تھی ، کہ وہ بیکار اُن کے ساتھ سرکھپاتی رہی تھی ، وہ اُن میں سے نہیں تھی ۔ اس نے برش ایک طرف رکھ کر مشرق کی سمت دیکھا جہاں پر رات شروع ہو رہی تھی ۔ پھر اس نے اتہائی مایوسی سے تصویر کو دیکھا اور اس کا جی چلایا کہ زور زور سے روئے ۔ سارے دن میں اس نے محض چند لکیریں کھینچی تھیں ۔ روشن محل کے تمام نوکر ایک ایک دفعہ آکر اس کو دیکھ گئے ۔ وہ دیر تک لوہے کی ریلنگ پر جھکی رہی اور اتہائی اور یاس کے سائے اس کے ارد گرد پھیلتے گئے ۔

(۳۶)

وہ ایک غیر معمولی گرم شام تھی جب وہ سب گھاس پر کرسیاں بچھائے تاش کھیل رہے تھے ۔ برج کا محور پرویز تھا جو دو ماہ کی تعطیل پر تھا ۔ جس روز اس کی بیوی اسے کلب نہ جانے دیتی وہ روشن محل میں ہر ایک برج کھیلنے والے کو اکٹھا کر کے رات تک کھیلتا رہتا ۔ صرف برج ہی ایک ایسی سازش تھی جس میں وہ اپنے سے کم عمر والوں کو شامل کرتا ، روشن آغا سے چھپا کر ہارے ہوئے کھلاڑیوں سے پیسے وصول کرتا اور پھر انہیں کلب لے جا کر آس کریم کھلاتا یا پکچرز لے جاتا ۔

دن کی آخری زرد دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر پڑ رہی تھی جب خالد نے کھیلتے کھیلتے تھک کر انگریزی لی اور اٹھ کھڑا ہوا ۔ ریاض جو اس کے پیچھے بیٹھا تھا لپک کر اس کی جگہ پر جا بیٹھا ۔

”حساب چکا کے جاؤ میاں ۔“ پرویز نے کہا ، ”لیلیٰ ذرا سکور بورڈ دکھانا ۔“

”جا کب رہا ہوں اٹکل ۔“ خالد نے اکتا کر کہا اور میز پر سے شربت کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا ۔ ایک سانس میں شربت ختم کر کے اس نے ہاتھ کی پشت سے منہ پونچھا اور سبزے میں سے اٹھتے ہوئے گرم ، مرطوب بخارات کو ٹانگوں پر محسوس کیا ۔ وہاں کھڑے کھڑے خالی گلاس کو اٹھکی سے گھماتے ہوئے دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ نجمی وہاں نہیں تھی ۔

نجمی ! نجمی !! اس نے مڑ کر سب پر نظر ڈالی اور سبزے کے کنارے کنارے چلنے لگا ۔ وہ روشن محل کے پچھواڑے یو کلپٹس کے چھوٹے سے مصنوعی جنگل میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی ، خالد کو دیکھ کر چونک پڑی ۔

”غروب آفتاب دیکھا جا رہا ہے ؟“ خالد نے کہا ۔

اس نے ایک لمحہ خالد کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا اور مسکرا پڑی ۔

”شام کا انتظار کر رہی ہوں ۔ بعض دفعہ گرمیوں کی شامیں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں ۔“

وہ خاموش رہا ۔

”کھیل ختم ہو گیا؟“

”نہیں۔“

”تم آج مستقل ہارے۔“ وہ ہنسی۔

”ہاں۔“

اس نے تردد سے خالد کے خاموش، پُر اشتیاق چہرے کو دیکھا۔ ”بیٹھو۔“ وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر اٹھکیاں بجانے لگا۔ اس کو اس قدر خاموش پا کر وہ دفعتاً پریشان ہو گئی۔

”کس قدر گرمی ہے۔“ اس نے سکارف سے پیشانی کا پسینہ جذب کرتے ہوئے کہا، ”تم پہاڑ پر کیوں نہیں گئے خالد؟“

”آپ لوگ جو نہیں گئے۔“

”ارے ہاں چند برس ہوئے ایک فال میں میں روشن آغا کے ساتھ دارجلنگ سے گزری تھی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں خالد کہ وہاں پر خزاں کا موسم کیسا دلکش ہوتا ہے۔ اس قدر رنگین۔ میں نے دیکھا کہ سینکڑوں قسم کے درخت ہیں اور ہر ایک درخت پر مختلف رنگ کے پتے ہیں، کہیں سرخ کہیں زرد اور کہیں ہرے۔ ایک جھنڈ میں تو آگ لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پتوں کا رنگ فرمزی تھا اور ان پر شام کی دھوپ پڑ رہی تھی اور وہ متواتر گر رہے تھے اور زمین پتوں میں چھپی ہوئی تھی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے رنگ تبدیل ہوتے گئے۔ رنگ ہی رنگ۔ میں تصویریں بنانا چاہتی تھی لیکن ہم شیلانگ جا رہے تھے جہاں روشن آغا کو ایک کانفرنس میں شرکت کرنا تھی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ ہم کئی سال تک جا ہی نہ سکے۔ اب کے روشن آغا نے کہا کہ یا آپ گرمیوں میں مسوری جائیے یا فال میں دارجلنگ، سارا وقت آپ دلی سے باہر نہیں رہ سکتیں۔ اب سوچتی ہوں کہ غلطی کی، یہاں گرمی میں مر رہے ہیں۔“

وہ خاموش بیٹھا پتھر پر اٹھکیاں بجاتا رہا۔

”ارے تم منہ پھلائے کیوں بیٹھے ہو؟“ نجمی نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

خالد نے ایک لمبا سوالیہ ”ہوں؟“ کیا۔

”سگریٹ کے لیے پیسے نہیں ہیں؟“

”ہیں۔“ اس نے غرا کر کہا اور سگریٹ نکال کر جلانے لگا۔ نجمی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس نے پھر اپنا اٹھکیوں والا رویہ جاری رکھنا چاہا مگر نجمی کو ابرو اٹھانے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر گھبرا گیا۔

”اوہ۔ نہیں تو۔ میں۔“ اس نے کوشش کر کے اپنے آپ پر قابو پایا، ”میں سمجھا ب آپ مصوری پر ایک لیکچر دیں گی۔“

نجمی کے ابرو کانپے۔ ”میں تو خود اس موضوع سے احتراز کرتی ہوں جس کے متعلق لوگ کچھ نہ جانتے ہوں۔“

خالد اسی طرح بیٹھا خاموش پُراشتیاق چہرے سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ خاموش ہو گئی تھی اور رنجیدہ جذبات اس کے دل کو زخمی کر رہے تھے۔ شام کی گرم مرطوب ہوا ان کے سروں پر ٹھہری ہوئی تھی جس میں گیلی مٹی اور یو کلپٹس کے پتوں کی بو تھی۔

آخر اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور جھک کر بیٹھ گیا۔ ”یہ سچ ہے نجمی کہ میں مصوری کے متعلق کچھ نہیں جانتا لیکن۔ میں محض تمہاری وجہ سے پہاڑ پر نہیں گیا۔“

”میری وجہ سے؟“ نجمی نے سانس روک کر پوچھا۔

”ہاں۔ تم جو نہیں گئیں۔“ اس نے اسی اداس۔ قطعی لہجے میں کہا۔

نجمی آنکھیں پھیلائے اسے دیکھتی رہی۔ خالد کی آنکھوں میں بے پایاں نرمی اور اداسی دیکھ کر ایک لحظے کے لیے اس کے دل میں نو عمری کے جذبات مچلے جنہوں نے اسے پریشان کر دیا۔ نو عمر، کنوارے جذبات جو محبت کرنے والے انسان کے خلوص اور سچائی کا یقین دلاتے ہیں، جو محبت کے خالص تصوراتی جذبے کو پہلی دفعہ اپنے سامنے پا کر ٹھٹک جاتے ہیں اور روئیں روئیں میں بے ساختگی پیدا کر دیتے ہیں۔ نجمی نے گھبرا کر نظریں اس پر سے ہٹالیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ خالد اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”کیا یہ کافی نہیں ہے نجمی؟“ اس نے جذبات سے اُبلتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ”بیٹھ جاؤ۔ تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔“

اس کے قریب زمین پر بیٹھ کر وہ پتوں کو مٹھی میں لے کر مسلنے لگا۔

”تم۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ نجمی نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اگلے لمحے

وہ دل میں سوال کے کینے پن پر ہنسی۔

”میں شاعری نہیں کر سکتا نجمی، تصویریں نہیں بنا سکتا، لیکن میں تم سے محبت کرتا

ہوں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟“

”محبت؟“ نجمی نے ٹھٹک کر دہرایا۔ مغرب کی سرخی، جہاں سورج غروب ہو چکا تھا،

ان کے چہروں پر پڑ رہی تھی اور وہ طوفان میں گھرے ہوئے دو پرندوں کی مانند پاس پاس بیٹھے

تھے۔ بڑی دیر کے بعد ہوا کا ایک جھونکا کہیں سے آیا اور ان کے سروں پر ٹھہری ہوئی بھاری

ہوا کو اڑا کر لے گیا۔ ایک گلہری دونوں اگلے پنچے اٹھائے غور سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

یو کلپٹس کا ایک پتا اس کے سر پر گرا اور وہ چھلانگ لگا کر بھاگ گئی۔

نجمی نے ایک لمبا سانس لیا اور سادگی سے ہنسی۔ اس کی بے راز ہنسی اور پرانی بے تکلف

آنکھیں دیکھ کر خالد کا دل سرد پڑ گیا۔

”تم محبت کو کیا سمجھتے ہو؟“ آخر اس نے پوچھا۔

”میں کچھ نہیں سمجھتا۔ مجھے کچھ علم نہیں، نجھی، صرف اتنا پتا ہے کہ تم مجھے بے چین کر دیتی ہو۔ تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ میں۔ کہ جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا یا کیا۔“

”تو اس کا علاج ہے کہ دیکھنا ہی بند کر دو۔“

”دیکھنا ہی؟“ خالد نے سانس روک کر پوچھا۔

”ارے ہائے خالد۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”کیا ہو گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے؟“ وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے چیخا،

”تمہیں پتا نہیں؟ تم کچھ محسوس نہیں کرتیں؟ تم اتنی لاعلم ہو؟ اتنی۔۔۔ میں۔ ہوا تیزی سے درختوں میں چلنے لگی: سائیں۔۔۔ سائیں! سائیں!

دفعاً وہ اپنی آواز اور جذبے کی شدت سے خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے اس کے کندھے چھوڑ دیے اور ششدر دیکھنے لگا۔ نجھی پشت اور دونوں بازو درخت سے چمٹائے پنجنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ ہوا کا جھونکا بھی آیا تو چیخ مار کر رونے لگے گی۔

”اوہ نو۔۔۔ نو۔“ خالد بیحد غیر حاضر اور خشک آواز میں پکارا۔

ہوا پھر درختوں میں رک گئی تھی اور یو کلیپٹس کے جنگل پر شام آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ رات کا ایک سیاہ، خاموش پرندہ آکر درخت پر بیٹھ گیا۔ ایک گلہری دوڑتی ہوئی نیچے اتری۔ نجھی آواز پیدا کیے بغیر درخت کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

”جاؤ۔“ وہ بھرائی ہوئی دہشت زدہ آواز میں بولی۔

خالد۔۔۔ اب تم جاؤ۔“ اس نے پُر سکون آواز میں کہا۔

”میں کبھی اتنا بے قابو نہیں ہوا۔ تم جانتی ہو نجھی۔“

وہ خاموش بیٹھی اندھیرے میں چلتی ہوئی ہوا کے ہلکے شور کو سنتی رہی۔ ایک لمحے کو اسے خیال ہوا کہ وہ پہلی دفعہ اس جنگل میں آئی ہے، لیکن وہ آرام سے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے بیٹھی رہی کیونکہ وہ ایک طوفان خیز جذبے میں سے گزری تھی اور اس کے دل میں شدید اداسی تھی، اور تنہائی اور بے چینی! اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس سیاہ کبڑے ہیولے پر اسے ترس آنے لگا اور اس نے وہ سب کچھ کہہ دینا چاہا جو کہ اس نے محسوس کیا تھا۔

”تم محبت کا ذکر کر رہے تھے خالد۔ میں تمہیں بتاؤں کہ محبت کے بارے، میں کیا محسوس کرتی ہوں۔“ وہ رکی، ”میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک ایسی شے ہے جو اکثر انسانوں کو دھوکا دیتی ہے۔ اکثر انسان محبت کا مطلب سمجھ لیتے ہیں، بہت کم درحقیقت اسے پاتے ہیں، محبت ہمارے سمجھدار ہو جانے کے ساتھ ہی ساتھ نہیں آجاتی، یہ کسی وقت بھی آسکتی ہے اور ایک جذبے کی صورت میں آتی ہے۔ ہم لوگوں سے ملتے ہیں اور ملتے رہتے ہیں اور کئی ایک کو پسند بھی

کرتے ہیں مگر یہ محبت نہیں ہوتی - محض ہمارا دماغ ، جو محبت کے نام سے واقف ہے اور اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے ، اس کمزور سی کشش کا باعث ہوتا ہے - جب وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں تو ہم بھول جاتے ہیں - ہم ہر کسی سے محبت کرنے کے اہل نہیں ہیں - محبت جو سادگی اور سچائی کا جذبہ ہے جب آتا ہے تو ہمیں ذہن کی دنیا سے اُپر لے جاتا ہے - یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو ہم کسی ذہنی یا جسمانی قوت کی مدد سے حاصل نہیں کر سکتے ، جو روح کی تمام تر قوتیں لے کر آتا ہے ، جس میں سے مذہبی راہنما گزرتے ہیں - یہ ہمارے مخلص ترین جذبوں میں سے ہے - میں - - - جذبے کا انتظار کرتی ہوں - "اپنی آواز کے علاوہ اس نے صاف طور پر اپنے سر پر ہوا کے ہلکے شور کو سنا اور خاموش ہو گئی - ان کے گرد گھپ اندھیرا تھا اور سیاہ ، گرم ہوائیں کبھی آہستگی کبھی تیزی سے چل رہی تھیں - روشن محل کی روشنیاں دیر ہوئی جل چکی تھیں اور اندر چلتے پھرتے لوگوں کا عکس شیشوں پر پڑ رہا تھا ، بوڑھا مالی رٹ کا پائپ اٹھائے سائے کی طرح جنگل کے کنارے کنارے گزر گیا -

"تم پچاس برس تک جذبے کا انتظار کرتی رہو گی ؟" خالد نے کہا -

"بیوقوف مت بنو ، میں سچی بات کرتی ہوں - ہم اس کے اہل نہیں ہیں - اس قدر سچائی ، اس قدر خلوص کے ہم اہل نہیں ہیں - میں تمہیں بتاؤں خالد میری کئی ایک دوست ہیں جو اس طمانیت سے زندگی بسر کر رہی ہیں جیسے سچ مچ خوش ہیں - انہوں نے خوبصورت تندرست نوجوانوں کو دیکھا اور ان سے شادیاں کر لیں - اب وہ اگر تصویریں بنانے کے لیے بیٹھتی ہیں تو وہ الگ بیٹھ کر تمباکو پیتے ہیں اور دل میں اپنی بیوی کو کوستے ہیں - وہ اگر پیانو پر بیٹھتی ہیں تو وہ خوابگاہ کا دروازہ بند کر کے سو جاتے ہیں یا اوولٹین کے لیے چلاتے ہیں - وہ اپنی نظم سناتی ہیں تو وہ اُلوؤں کی طرح منہ دیکھتے ہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر ہنستے ہیں - وہ اصل زندگی کو آہستہ آہستہ بھول جاتی ہیں اور پھر کمتر راحتوں کے لیے اپنے خاوندوں کی طرف راغب ہوتی ہیں - وہ ان سے محبت کرتی ہیں کیونکہ وہ انہیں عمدہ عمدہ لباس خرید کر دیتے ہیں یا دور دراز مقامات پر تفریح کے لیے لے جاتے ہیں یا ہر سال نئی کار خریدتے ہیں یا ہل اسٹیشنوں پر مکانات تعمیر کرتے ہیں - ان کی زندگی کی سب سے بڑی مسرتیں وہ آسائشیں ہیں جو ان کے شوہر ان کے لیے خرید سکتے ہیں اور جن کی وہ اُن سے توقع رکھتی ہیں - وہ خوش ہیں کہ اُن کے بچے ہیں اور ایک شخص ہے جو اُن کے بچوں کا باپ ہے اور اُن کا ایک مکمل ، مطمئن خاندان ہے - وہ خوش ہیں کیونکہ وہ جانتی ہی نہیں کہ کسی اور کے ساتھ وہ اس سے کہیں بہتر طریقے پر زندگی گزار سکتی تھیں - وہ اُن بلیوں اور خرگوشوں اور دوسرے پالتو جانوروں کی طرح ہیں جو ہر اُس شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں جو اُن کو کھانا کھلاتا اور نہلاتا ہے - تم نے دیکھا محبت کیسے دھوکا دیتی ہے - " اُس نے اپنی آواز کے لفظوں کو اندھیرے میں غائب ہوتے ہوئے سنا -

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُس شخص سے جس سے ہم محبت کر سکیں ہم کبھی ملیں ہی نہیں۔“ خالد نے مایوس کن لہجے میں کہا۔

”نہیں، یہ محض بے صبری کے خیالات ہیں۔ بے صبری اور بے یقینی کے۔ ایک نہ انسان ضرور آتا ہے، ہمیشہ، ہر جگہ، جو ہمیں محبت کی سچائی کا یقین دلاتا ہے۔ جس کو دیکھتے ہی ہم پہچان لیتے ہیں کہ یہ وہی ہے، جس کو پہچان کر ہم دل میں کہتے ہیں: ”مجھے پتا تھا تم آؤ گے۔ مجھے تمہارا انتظار تھا، دیکھو، یہ میں ہوں۔ مجھے جانتے ہو؟“ اور ہمیں دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں پرانی شناسائی کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہنستا ہے اور اُس کی ہنسی ہمیں زندگی کی معصومیت کا یقین دلاتی ہے، وہ کبھی نہیں کہتا کہ وہ محبت کرتا ہے لیکن اپنی آنکھوں میں محبت کے دیوٹ لیے پھرتا ہے، ہمارے آگے، ہمارے پیچھے، ہمیشہ ہمیشہ! وہ ہمارے لیے دنیا کا سب سے مہربان اور نرم دل انسان ہوتا ہے۔ اُس کے جسم سے ہمیں محبت کی بو آتی ہے۔ محبت جو ہمیں زندگی کی نیکی اور اچھائی کا یقین دلاتی ہے، جو اُس وقت جب ہم طوفانوں سے گھرے ہوتے ہیں ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا میں کوئی دوسرا محض ہمارے لیے زندہ ہے، جو ہمارے زندہ رہنے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ کم از کم زندگی میں ایک دفعہ محبت ہمیں دھوکا نہیں دیتی، کم از کم ایک دفعہ وہ ہمیں زندہ رہنے کا جذبہ عطا کرتی ہے۔“ خود اعتمادی کی مسرت سے سرشار ہو کر اُس نے مٹھیاں ہوا میں ہلائیں۔ عمیق اندھیرے میں اُسے احساس ہوا کہ وہ وہاں اکیلی بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی ہے۔

پھر خشک پتوں کے چرچرانے کی آواز آئی اور خالد اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔ چلو چلیں۔“

وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ پتھروں پر اُن کے قدموں کی آواز سن کر رات کا پرندہ پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔

”ستارے بھی نہیں نکلے۔“ تاریکی سے گھبرا کر وہ اپنے آپ سے بولی۔

”جانے کس احمق نے کہا تھا ہم اتنی رات تک وہاں بیٹھے رہیں۔“ خالد پتھروں کو پھلانگتے ہوئے غرایا۔

”خالد۔۔۔“ اُس کے پیچھے پیچھے پتھر پھلانگتے ہوئے وہ ہلکے سے پریشان لہجے میں بولی،

”میں نے ایسی حماقت کی باتیں کی ہیں۔ میں نا؟“

جواب میں خالد نے صرف گلے سے ناراض بلے کی سی آواز نکالی۔

برآمدے کے پاس نجی نے اسے کھانے کی دعوت دینا چاہی لیکن وہ الوداع کہے بغیر، سر جھکائے، ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ٹھونے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کے سست، مستقل قدموں کے نیچے بحری کی چرچراہٹ دور ہوتی گئی۔ وہ سیرھیوں پر کھڑی پیار اور رنج سے اُسے

گیٹ سے باہر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اندر وہ سب کھانے کی میز کے گرد جمع اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سیرھیاں چڑھ رہی تھی تو اُس نے دیکھا کہ عذرا نعیم کو سہارا دے کر آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی اُس کے کمرے کی طرف لے جا رہی تھی۔ ”اب روز بروز وہ اچھے ہو رہے ہیں۔“ اُس نے خوشی سے سوچا، پھر اُس نے کئی دن سے اُس کو دیکھنے کے لیے نہ جاسکنے پر اپنے آپ کو ملامت کی اور فیصلہ کیا کہ صبح سویرے وہ اُس کی خیریت پوچھنے جائے گی۔

روشن آغا کے بعد شاید نعیم ہی ایک ایسا شخص تھا جس سے وہ اس درجہ مرعوب، کسی حد تک خوفزدہ تھی۔ اُس کے بارے میں اُس کا فیصلہ تھا کہ وہ کبھی اُس کے قریب نہ ہو سکتی تھی، کہ وہ بیحد مختلف قسم کا، پراسرار انسان تھا۔ لیکن اس اسرار نے نجی کے دل میں اُس کے لیے عقیدت اور احترام پیدا کر دیا تھا۔ وہ اُس کے لیے پرکشش اور رنگین ماضی لیے، خوبصورت اور ذہین، کسی حد تک لاوارث عزیز تھا۔ عجیب بات تھی کہ آج تک نجی نے نعیم کے بارے میں عذرا کے واسطے سے کبھی نہ سوچا تھا۔ عذرا کی اپنی الگ، بیحد مختلف، تنہا شخصیت تھی۔

تیز ہوا کے ساتھ بارش کے پہلے قطرے اُس کے ماتھے پر گرے اور وہ تیزی سے سیرھیاں چڑھنے لگی۔ اندر پرویز کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ باہر خالد کے ساتھ گپیں مار رہی تھی۔ ”گپیں یا گپ بازی۔ تفصیل کے ساتھ بتاؤ۔“ لیلیٰ نے کاٹھا لہرا کر کہا۔

”خالد۔ خالد۔“ کئی لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔ خالد کو بلانے کے لیے کئی آدمی دوڑائے گئے لیکن وہ نہ ملا۔ پھر اُس کی خود سری اور نالائقی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے انہوں نے کھانا شروع کیا۔

(۳۷)

وہ ایک غیر معمولی گرم شام تھی جب وہ نعیم کو لے کر سبزے پر اتر آئی اور آہستہ آہستہ اسے چلانے لگی۔ برابر کے لان میں وہ سب تاش کے کھیل سے اکتا کر اب کاہلی سے ٹانگیں میزوں پر رکھے گپیں مار رہے تھے اور بیچ بیچ میں زور زور سے ہنسنے جاتے تھے۔ ہوا تھم گئی تھی اور ان کے ارد گرد گھاس کی گرم، مرطوب خوشبو رکی ہوئی تھی۔

”کئی بار کہا ہے نچلی منزل میں آجائیں۔ ہر بار سیرھیاں طے کرنا پڑتی ہیں۔“ نعیم نے ہانپتے ہوئے جھک کر عذرا کا سہارا لیا۔

”اب تم جلد اچھے ہو جاؤ گے۔“ عذرا نے کہا۔

لان کے وسط میں رک کر نعیم نے پسینہ خشک کیا اور ہاتھ اٹھا کر پرویز کو جواب دیا جو

کرسی پر لیٹا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ عذرا نے منہ پھیر لیا۔
 ”پرویز خوش اخلاق ہوتا جا رہا ہے۔“ اُس نے حقارت سے کہا۔
 اب وہ سب اُن کی طرف متوجہ ہو کر زور زور سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ نعیم نے چھڑی والا
 ہاتھ اٹھا کر سب کو جواب دیا۔ ”نہیں عذرا، اچھے لوگ ہیں۔“ اُس نے کہا۔
 وہ خاموشی سے اُس کو سہارا دیے چلتی رہی۔
 ”پرویز کل میرے پاس بیٹھا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا جنگ پھر چھڑ گئی ہے۔ ہندوستان پر
 مصیبت آئے گی۔“

”کب آیا تھا؟ پار سال؟“ عذرا نے طنز سے پوچھا۔
 ”بیوقوف مت بنو۔ جنگ چھڑے ہوئے ایک ہفتہ ہوا ہے۔ مجھے پوچھنے آیا تھا۔“
 ”میرے سامنے کیوں نہیں آتا۔“ عذرا نے غرا کر کہا، ”وہ عورت۔۔ اُس کی بیوی!“
 نعیم نے اُس بازو سے، جو عذرا کے شانوں پر تھا، اُسے اپنے ساتھ لگا لیا اور مڑ کر چلنے
 لگا۔ عذرا نے ذلت کے آنسو چھپانے کے لیے اُس کے مصنوعی بازو کو ہاتھوں میں لے کر دبایا،
 یہاں تک کہ اُسے ڈر محسوس ہونے لگا کہ وہ ٹوٹ جائے گا۔

”ڈاکٹر نے کہا ہے سیرھیاں چڑھنے کی ورزش تمہارے لیے مفید ہے۔“
 نعیم نے بیحد اکتا کر ایک لمبا سا ’اوہ‘ کیا۔ ”ڈاکٹر ڈاکٹر ڈاکٹر۔ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت
 نہیں۔“ اُس نے رک کر عذرا کو پیار اور اداسی سے دیکھا، ”مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے۔“
 ”پتا نہیں نعیم، پر یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے مجھے۔ ایک دفعہ جب تم نہیں تھے تو میں
 نے کمرہ تبدیل کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب اُنہوں نے میرا سامان باہر نکالا تو مجھے یوں لگا جیسے
 میں باہر جا رہی ہوں۔ اس گھر سے باہر، ہمیشہ کی جلاوطنی پہ یا کہاں۔ مجھے عجیب سا غریب الوطنی
 کا احساس ہوا۔ اپنے سامان کو باہر پڑا دیکھ کر میرا جی چلا کہ چیخ چیخ کر روؤں۔ میں آخری بار
 خالی کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے قدموں کی چاپ سنی جو دیواروں میں سے آ رہی تھی جہاں سے
 ساری تصویریں اُتار لی گئی تھیں۔ اور آتشدان تنگا تھا، سرد اور ٹھوس اور بے حس، میں نے
 اُسے چھوا۔۔ اور دسپچہ! صرف دسپچہ تھا جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا۔ پتا ہے نعیم، کمرہ
 خالی ہو چکا تھا، اجنبی اور ویران، لیکن دریچے میں یوکلپٹس کے پتے جھوم رہے تھے، سبز اور
 خوشبودار، جن کے ساتھ میں ہمیشہ سے رہتی آئی تھی، جن سے میں اتنی اچھی طرح واقف تھی،
 جن کو میں نے غصے میں اگر نوچا بھی تھا اور پیار سے تھپکا بھی تھا، وہ بے جان نہیں تھے۔“
 اُس نے بے یقینی سے نعیم کی طرف دیکھا، ”وہ بے جان نہیں تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر
 اُنہیں چھوا اور مجھے پرانی دوستی اور اپنائیت کا احساس ہوا۔ وہ زور زور سے ہلنے لگے۔ میں
 نے فیصلہ کیا کہ کوئی مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتا، میں یہیں رہوں گی، ہمیشہ ہمیشہ۔۔ ہم

یہیں رہیں گے نعیم ، ایس ؟“

”ہاں ہاں“ ، وہ ہنسا ، ”ہم یہیں رہیں گے ، گو میں یو کلپٹس کی بو سے تنگ آچکا ہوں۔“

ہوا اچانک تیزی سے چلنے لگی اور فوارے کی پھوار سے بچنے کے لیے وہ وہاں سے ہٹ آئے۔ دوسرے لان میں وہ سب شور مچا مچا کر اڑے ہوئے تاش کے پتوں کو اکٹھا کر رہے تھے۔ دن ختم ہو چکا تھا اور آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔

”آج پھر بارش آئے گی۔“ نعیم نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ، ”بارش کے لیے ہمارا کمرہ اچھا نہیں ہے۔“

”بارشوں سے تنگ آکر ہی میں نے بدلنے کا ارادہ کیا تھا“

دن کی کھٹتی ہوئی روشنی میں سبزے کی کنارے کنارے چلتے ہوئے عذرا کی نظر اپنے ہاتھ پر پڑی جس سے وہ نعیم کو سہارا دیے ہوئے تھی۔ اُس کے ہاتھ پر بیٹھمار جھریاں پڑ چکی تھیں اور جلد جگہ جگہ سے اکٹھی ہو کر لٹکنے لگی تھی۔ دفعتاً بیحد خوفزدہ ہو کر اُس نے سوچا کہ وہ بوڑھی ہو رہی ہے۔ اُس نے مشکوک نظروں سے اپنے خاوند کو دیکھا۔ نعیم کا تندرست ہاتھ اُسی طرح مضبوط اور پھولا ہوا تھا۔ اس کا جسم بیمار تھا لیکن اس کی آنکھوں میں جوانی تھی اور بلا کی کشش تھی اور وہ اُسی طرح سر اُونچا اُٹھا کر چلتا تھا۔ اس نے عذرا کی اجنبی نظروں کو محسوس کر کے آہستہ سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ لیکن اس بد بخت لمحے میں عذرا کے دل پر سے ایک بے نام حسد کا سایہ گزر گیا۔ اُس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ نعیم لڑکھڑا کر سنبھلا۔ سہارے کے لیے اُس نے دو ایک بار ہوا میں ہاتھ پھیلایا۔ عذرا اُس سے الگ دونوں بازو لٹکائے دم بخود کھڑی رہی۔

آخر وہ چھڑی کے سہارے اُچھل کر اُس کے قریب آیا۔ ”کیا بات ہے عذرا ؟“ عذرا نے ، جو خوفزدہ نظروں سے اندھیرے میں دیکھ رہی تھی ، چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے بڑے سے ، اداس ، متفکر چہرے کو دیکھتے ہوئے دفعتاً اُسے اُس محبوب انسان کی بے پناہ میکسی کا احساس ہوا۔ ایک بیدرد ترحم نے اُس کے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکی اور رونے لگی۔

”میں سوچ رہی تھی۔“ اُس نے رنج سے بیتاب ہو کر کہا۔

”مت سوچو۔ مت سوچو۔“ نعیم نے جلدی سے اُسے بازو میں سمیٹ لیا ، ”سوچ ہمیں

ختم کر دیتی ہے ، ہم سوچے بغیر بھی رہ سکتے ہیں۔“

پھر وہ ایک ساتھ اُس کا سہارا لیے اور اسے بازو میں سمیٹے چلنے لگا۔ اُس کی پیشانی پر

ابھی تک تیوری تھی۔

”میں سوچ رہی تھی وہ کس قدر خوش ہو رہے ہیں۔“ دیر کے بعد عذرا نے زہریلے جذبات کا رخ موڑا، نعیم نے سر اٹھا کر سامنے والے گروہ کو دیکھا، وہ اب ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے اندر کی طرف جا رہے تھے۔

”چلو ہم بھی وہاں چلیں۔“ نعیم نے ہنس کر کہا۔

عذرا نے دہل کر اس کی طرف دیکھا۔ ”نہیں۔ نہیں۔“ اس نے بے خیالی سے سر ہلایا، ”وہ اس قدر کینے ہیں، پرویز اور اس کی بیوی اور اس کا لڑکا اور نجمی اور سب۔ سب۔“ اس نے چیخ کر کہا اور نعیم کی بغل میں منہ چھپا کر سسکی لی۔

”مت سوچو۔۔۔ مت سوچو۔“ نعیم نے ناراضگی سے دہرایا۔

”تم نہیں سمجھتے، وہ ہمیں اپنے آپ میں سے نہیں جانتے۔ وہ جب تمہیں دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ تم پر ترس کھا رہے ہیں، کہ وہ کسی بات پر پچھتا رہے ہیں۔ وہ ہمیں ناپسند کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہے وہ کس قدر احتیاط کے ساتھ، کس قدر اخلاق سے تمہاری خیریت پوچھتے ہیں۔ کیسے کینے پن کے احساس برتری کے ساتھ، غیر معمولی نرمی کے ساتھ، جیسے ان کو سکھایا گیا ہے۔“ اس نے وحشت سے نعیم کی طرف دیکھا، ”جیسے ہم سب کو سکھایا گیا تھا۔ چھوٹے موٹے زمیندار، سرکاری اہل کار، منشی مزارعے۔ بابا ہم اس کا گھوڑا بنائیں گے،۔ نہیں بی بی پہلے ان کو بابا بولو پھر یہ گھوڑا بنیں گے،۔ ہی ہی رانی بی بی، آئیے ہم آپ کا گھوڑا بنیں۔“ یہ ہماری تربیت تھی۔ وہ اپنی تربیت کو نہیں بھول سکتے۔ میں بھول گئی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ محبت میں آن کر ہماری تربیت کے وہ سارے سال کچھ بھی نہیں رہ جاتے، لیکن وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ وہ محض اپنے اپنے غرور کو سنبھالے زندگی گزار رہے ہیں اور مجھے ان ساری چیزوں کی یاد دلاتے ہیں جو تکلیف دہ ہیں۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ نعیم، میں اپنے گھر میں کیسی جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہوں۔ تمہیں پتا ہے؟“ وہ رو کر بولی۔

”پاکل ہوئی ہو؟“ نعیم نے صرف اتنا کہا، ”پاکل ہوئی ہو؟“ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود کسی لاشعوری خوف کے اثر سے عذرا نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا اور اسے نعیم کے ہاتھ میں چھپانے کی کوشش کی۔ ایک بے وجہ رنج نے اس کی آنکھوں کو دھندلا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔

”میں روؤں گی نہیں، فکر مت کرو۔ میں رو سکتی ہی نہیں، صرف رونے کی نقل کر سکتی ہوں۔“ نعیم مجھے خیال ہوتا ہے کہ رونے کے لیے جوانی چاہیے اور دل میں زور ہونا چاہیے اور سچائی! ایک بوڑھا ہوا پشیمان شخص محض اذیت سہتا ہے، مظلومیت اور خاموشی کے ساتھ۔ بالآخر زندگی میں اس قدر کڑی پشیمانی ہے۔“ اس نے سپٹ آواز میں کہا۔ نعیم کچھ

کہے بغیر اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

کھٹے کی باڑ کے پیچھے سڑک پر سے خانہ بدوشوں کا ایک کارواں گزر رہا تھا۔ ان کی میل گاڑیاں اور ان کے اونٹ اور ان کی عورتیں اور مرد سست رفتاری اور آزادی سے اندھیرے میں سفر طے کر رہے تھے۔ کہیں کہیں مدھم لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔ ایک نو عمر لڑکا اونٹ کی پشت پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ بارش سے پہلے کی تیز ہوا میں بے فن بانسری کی آواز کبھی دور چلی جاتی کبھی پاس آ جاتی اور موسیقی کا اثر پیدا کرتی۔ ”ہوانے اسے فنکار بنا دیا ہے۔“ بہت سے گڈ مڈ خیالات کے درمیان نعیم نے سوچا، ”ہوانے اور آزادی نے۔۔۔ اور اس میں شامل میلوں کے قدموں کی آواز، اور میل گاڑیوں کے پہیوں کی اور اکا دکا مردوں اور عورتوں کی باتوں کی آواز ہے، اور اس میں شامل رات ہے۔۔۔۔ اس کے ذہن میں وہ مخصوص کنفیوژن تھا جو کسی تیز احساس کا پیش خیمہ ہوتا ہے، جس سے پیشتر ہزاروں چھوٹے چھوٹے بے تکی خیالات تیزی سے آئے چلے جاتے ہیں۔“ رات جو ہمارے اور تمہارے درمیان آزادی اور سفر اور ہزیمت لے کر آتی ہے۔ کتنے فاصلے لے کر آتی ہے۔“ اس نے سوچا اور ماتھے پر بارش کے پہلے قطرے محسوس کر کے برآمدے کی طرف مڑا۔ ”تم سورج کی تپش سے بچنے کی لیے رات کو سفر کرتے ہو اور پھر بارش آ جاتی ہے۔ خدا حافظ! تمہارا گھر کہاں ہے؟ اب تم اپنے لیے بارش کا ایک گھر بناؤ۔“ اس نے سوچا کہ شاید اب وہ ہنسے گا، لیکن دراصل وہ بیحد سنجیدہ اور اداس تھا، ”یہ کون ہے؟ یہ اندھیرے میں سیڑھیوں پر کون کھڑا ہے؟“

”پہ کون ہے؟“ اس نے بے خیالی سے اونچی آواز میں پوچھا۔

”بجھی۔۔۔“ عذرا حقارت سے بولی، ”جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے،“

برآمدے میں سے گزرتے ہوئے عذرا رک گئی۔ روشن آغا اپنی سٹڈی میں بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان کا چہرہ زرد تھا اور جسم بوڑھا ہو چکا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں وہ بے حس و حرکت کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔

”نعیم، بابا دنیا کے بہترین انسانوں میں سے ہیں۔“ وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے نعیم کو دیکھتی ہوئی بولی، ”وہ دنیا کی تمام اچھی باتوں کے اہل ہیں۔ میں صرف ان سے محبت کرتی ہوں۔“

نعیم چل پڑا۔ ”وہ واحد شخص ہے جس سے مجھے نفرت ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟“ اس نے سوچا۔

اگلے کمرے میں وہ سب کھانے کی میز پر بیٹھے تھے اور نجھی ہاتھ ہلا ہلا کر کوئی بات سن رہی تھی۔

”اور نجھی بیحد نفیس لڑکی ہے۔“ بید کی آرام کرسی میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔

باہر بارش شروع ہو چکی تھی مگر کمرے میں دن بھر کی گرم ہوا رکی ہوئی تھی۔ جب عذرا نے کھڑکی کھولی تو بارش کی نمدار ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہوئی۔ وہ نعیم کی طرف پیٹھ کیے کھڑکی میں کھڑی رہی۔ نچلی منزل میں اُن کے ہنسنے اور پلیٹوں اور چمچوں کے بجنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اکتا کر کھڑکی میں سے ہٹ آئی۔ چلتے چلتے رک کر اس نے نعیم کا اور اپنا بستر ٹھیک کیا اور دوائی کی بوتلوں اور گلاسوں کو ترتیب سے رکھا۔ باہر طوفان تیز ہوتا جا رہا تھا۔ بجلی کی کڑک سے سہم کر جب وہ کھڑکی بند کرنے کے لیے بڑھی تو اس نے دیکھا کہ یہ عجیب قسم کا طوفان تھا جس کے ساتھ ہوا کا نام و نشان نہ تھا اور بارش پتھروں کے سے وزنی پن کے ساتھ سیدھی گر رہی تھی۔ اس نے دہل کر کھڑکی بند کر دی۔ بجلی کے خوفناک دھماکے کے ساتھ شیشوں کے کڑکڑانے کی آواز آئی۔ وہ بستر کی چادر کو پھر سے پھیلانے لگی۔

”تم اُن کو یہ کام کیوں نہیں کرنے دیتیں۔“ نعیم نے روشن محل کے اتنے سارے نوکروں کے متعلق سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ ہمارے نوکر نہیں ہیں۔“ عذرا نے مختصر کہا اور سرہانے کو اٹھا کر پھر سے رکھا اور دوائیوں والی میز کو کھسکایا اور قالین کے کونے کو پاؤں سے پہلے اُلٹا پھر سیدھا کیا اور ٹھٹک کر نعیم کو دیکھا اور دیکھتی رہی۔ اس طویل، سست رفتار لمحے میں اس کی پریشانی خفیف سی ندامت میں تبدیل ہو گئی۔

”یعنی ہم تو چلے ہی جائیں گے۔۔۔ ان سے ہمارا تعلق کیا۔۔۔ کیوں؟“ اس نے کہا۔ اس کوشش میں ناکام رہ کر وہ پھر پریشان ہو گئی اور پہلے سے زیادہ بے تکے پن کے ساتھ کمرے میں پھرنے لگی۔

”ہم کب جائیں گے۔ اگلے مہینے؟ شاید تم ٹھیک ہو جاؤ۔“ اس نے اعصابی لہجے میں جلد جلد کہا۔

اب وہ سب آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے اوپر آرہے تھے۔ بادل کی گرج کے ساتھ اُن کی آواز دب جاتی اور پھر آنے لگتی۔ وہ پُر شکم اور مسرور گھریلو انسانوں کی آوازیں تھیں جو زندگی سے مکمل طور پر مطمئن اور محفوظ تھے۔ اُنہیں طوفانی رات کی کوئی خبر نہ تھی۔ ان کی بات چیت میں گہری، بے تکلف اپنائیت تھی جو قطعی طور پر رچے چھے ہوئے مانوس گھریلو تعلقات سے پیدا ہوتی ہے۔ ان میں کوئی کچھاؤ، کوئی رکھ رکھاؤ نہ تھا۔ بجلی کی کڑک کے ساتھ ساتھ وہ ہنس رہے تھے۔ دفعتاً نعیم کو اپنے اور عذرا کے غیر فطری، تکلیف دہ تعلق کا احساس ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ اُن دونوں کے آس پاس ایک بے نام، بے وجہ خوف رہینگ رہا تھا جس نے ان کی زندگیوں کو کمزور اور ناتواں بنا دیا تھا، کہ وہ دو ایک دوسرے سے الگ، تنہا اور بے حقیقت وجود تھے جو ایک مکمل، صحت مند جسم سے ٹوٹ کر جدا ہو چکے تھے اور آہستہ آہستہ م

رہے تھے ، دنیا کی تمام برائیوں کو ایک ایک کر کے جمع کر رہے تھے ۔

اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ۔

”کھڑکی کھول دو ۔“ اس نے بھاری ، خشک گلے سے کہا ۔

عذرا وہیں کھڑی شیشوں پر مسلسل چمکتی ہوئی بجلی کو دیکھتی رہی ۔ نعیم نے اُسے تیز چیرتی ہوئی نظروں سے دیکھا جنہیں ترحم اور بے بسی نے آہستہ آہستہ نرم بنا دیا ۔ گیلری میں سے ہنسنے کی آواز آئی ۔ یہ لاپروا ، بے تکلف ہنسی تھی جس میں آوارگی اور ساری دنیا کے لیے حقارت کا تاثر تھا ۔ یہ ایک قابلِ نفرت ہنسی تھی ۔

”تم نے سنا ۔ وہ ہمیشہ اسی طرح ہنستی ہے ۔ وہ عورت ۔ ۔ ۔“ عذرا نے کہا ۔

پرویز اور اس کی بیوی کی آواز آہستہ آہستہ دور چلی گئی ۔ وہ ابھی تک ہنس رہے تھے ۔ نجمی نے رات کا تنہا سا بلب کمرے میں جلتا ہوا دیکھا اور دبے پاؤں دروازے کے آگے سے گزر گئی ۔

”آؤ ۔ ۔ ۔ یہاں آؤ ۔“ نعیم نے تیزی سے کہا ۔ عذرا نے دیکھا کہ وہ بیحد گھبرا گیا ہے ۔ وہ جا کر کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی ۔ نعیم نے اس کی کمرے کے گرد بازو ڈال کر اپنی طرف کھینچا ۔

”تم ٹھیک ہو ؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں ۔ کیا ، کیا بات ہے ؟“

”کچھ نہیں ،“ نعیم نے لمبا سانس لے کر دوسری طرف دیکھا ، ”میں نے سوچا شاید تم اس سے خوفزدہ ہو ۔“

”خوفزدہ ۔ ۔ ۔“ عذرا پھنکاری ، ”اس سے ۔ ۔ ۔ اس سے ۔“

”نہیں عذرا ۔ ۔“ ، وہ اس کی چھاتی پر سر رگڑ کر پکارا ، ”تم بس یہاں بیٹھی رہو ۔ خاموش ۔ کچھ مت کہو ، کچھ مت سوچو ۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں ۔ خوشی سے ۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے ۔ میں کمزور محسوس کر رہا ہوں ، یہاں ۔ ۔ ۔“ اس نے سینے کی طرف اشارہ کیا ۔

”نعیم ہاں میں یہاں بیٹھی ہوں ۔“ عذرا نے پریشان ہو کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا ،

”میں خاموشی سے بیٹھی ہوں ۔ ہم یہاں سے چلے ۔ ۔“

”اوہ نہیں نہیں ،“ نعیم نے اس کی کمرے سے ہاتھ نکال کر ماتھے پر رکھ لیا ، ”نہیں نہیں ۔ تم نہیں سمجھتیں ۔ تم خاموش رہو ۔ ہم یہیں رہیں گے ۔ وہ ہمارے دوست ہیں ، رشتہ دار ہیں ، ہمدرد ہیں ۔ میں مرنا نہیں چاہتا ، کام کرنا چاہتا ہوں ۔ میں سرکاری ملازمت کر لوں گا یا جو تم کہو گی کروں گا ۔ جو روشن آغا کہیں گے کروں گا ۔ یہ ہمارا گھر ہے ۔ میں تنگ آچکا ہوں ۔“

عذرا گھبرا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اس پریشانی کی دھند میں سے باہر نکل آئی۔ اس نے کئی بار دل میں نعیم کے الفاظ دہرائے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار نعیم کے منہ سے موافقت کی باتیں سن کر وہ بھونچکی رہ گئی کیونکہ وہ خود نعیم کے ساتھ چلنے کی کوشش میں اُن خیالات کو دفن کر چکی تھی، بھول چکی تھی، معاف کر چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے، کیا کرے۔

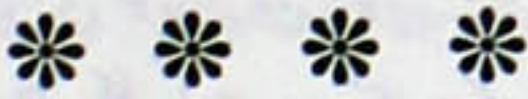
”اچھا؟ اچھا؟“ نعیم کے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے زیر لب دہرایا۔ برسوں کی مدفون، زنگ آلود خواہشات زندہ ہو رہی تھیں اور نعیم کے الفاظ اس کے ذہن میں شور مچا رہے تھے۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی کہ اب وہ کیا کرنے والی ہے، قہقہہ لگا کر ہنسنے والی ہے یا چیخ چیخ کر رونے والی ہے۔ وہ دونوں باتیں ایک سی آسانی اور خوشی کے ساتھ کر سکتی تھی۔ لیکن جذبات کے تھلکے میں اس نے یہ بھی سوچا کہ ان باتوں کے لیے اب وہ بوڑھی ہو چکی تھی۔ کہیں قریب ہی خوفناک دھماکے کے ساتھ بجلی گری۔ نعیم چونک کر اُٹھ بیٹھا، لیکن عذرا کے خوابوں اور خواہشوں کے جزیرے میں موسم بیکار اور خاموش اور سمندر پر سکون تھا۔ اس نے کچھ بھی نہ کیا، محض نعیم کو کھو دینے کے ڈر سے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے بیٹھی رہی۔ جس تیزی کے ساتھ اس کے نقطہ نظر میں تبدیلی واقع ہوئی وہ حیرت انگیز تھی۔

”میں نے تمہارے لیے کیا کیا ہے۔ تمہیں اپنے بہن بھائیوں کا، ماں باپ کا، سارے گھر کا دشمن بنا دیا ہے۔ اوہ۔۔۔“ اس نے عذرا کا ہاتھ مضبوطی اور رنج سے دبایا، ”میں نے تمہارے دل میں نفرت اور خوف کا بیج بویا ہے۔ میں نے تمہیں ذلیل کیا ہے، سب کے سامنے۔ میں نے تمہیں ایک ہزیمت خورہ زندگی دی ہے۔ تم ایک عظیم عورت ہو۔ میں نے تمہیں تباہ کر دیا ہے، محبت کے بدلے میں، اب خود تباہ ہو رہا ہوں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم نے کہا تھا بالآخر زندگی میں اس قدر کڑی پشیمانی ہے۔ عذرا میں تنگ آچکا ہوں۔ میں باہر جانا چاہتا ہوں، کام کرنا چاہتا ہوں، کوئی بھی، کچھ بھی۔ کیا فرق پڑتا ہے جب میں مر رہا ہوں۔ میں اب لیٹ نہیں سکتا، اوہ۔۔۔“ اس نے اپنا گلہ بند ہوتا ہوا محسوس کیا۔ وہ زور سے کھانسا اور دیر تک کھانستا رہا۔ پرانے ناتواں مریض کی طرح اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ ”عذرا ڈاکٹر کو مت آنے دو۔ میں اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا۔ میں اور نہیں لیٹ سکتا۔ قریب آؤ۔۔۔ میں کمزور۔۔۔ اوہ۔۔۔ عذرا میں رونا نہیں چاہتا۔۔۔“

بالآخر وہ کچھ بھی نہ کر سکا اور برسوں کی جسمانی اور روحانی اذیت سے ٹوٹ کر رونے لگا، ایک مغرور اور لاجار بڑھے کی طرح جو رو نہیں سکتا لیکن زندگی کی انتہائی بے بسی پر پہنچ کر آنسو بھونڈے پن سے، بند ہوتے ہوئے حلق میں سے نکلتی ہوئی مختصر جھٹکے دار آواز کے ہمراہ آنے لگتے ہیں اور چہرے کی ہیئت انتہائی مسخرے پن کا نمونہ پیش کرتی ہے جسے دیکھ کر چھوٹی عمر

کے نادان لوگ ہنسنے لگتے ہیں ۔

عذرا نے اطمینان کے ساتھ اُسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا ۔ دیر کے بعد جب نعیم اشتہا کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا وہ آہستہ سے مسکرائی ۔ اُس رات وہ لپٹ کر اُس کے ساتھ سوئی رہی اور اپنی گرم ، خشک ہتھیلیاں اُس کے نیم مردہ جسم پر پھیرتی رہی اور باہر کے طوفان سے اتنی ہی بے خبر رہی جتنے کہ دوسرے لوگ ، حالانکہ وہ بے حد طوفانی رات تھی ۔



(۳)

بٹوارہ

﴿وَإِذَا قِيلَ لَنَا تَقْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ﴾

اور جب ان کو کہیے ملک میں فساد نہ ڈالو ، تو کہیں کہ ہمارا کام تو سنوار ہے (القرآن)

(۳۸)

منالال سیمنٹ فیکٹری میں دوپہر کا گھنٹہ ہوا تو وہ سب کھانے کی پوٹلیاں کھول کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ان کو ایک جگہ پر جمع ہو کر کھانے کی اجازت نہ تھی کیونکہ فیکٹری چوبیس گھنٹے چلتی تھی اور مزدور اور کاریگر آٹھ آٹھ گھنٹے کی تین شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو آٹھ گھنٹے مسلسل کام کرنا پڑتا تھا۔ جہاں تک کھانے کا تعلق تھا قانون میں کوئی ایسی شق نہ تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ یہ لوگ کھانے کی اہلیت بھی رکھتے تھے۔ یہ 'فیکٹری ایکٹ' تھا جس کے بنانے والے، کہ جاتے تھے کہ مشینری کے بغیر دنیا بھر کے آدمی مل کر بھی سیمنٹ نہیں بنا سکتے، مشینری کی اہمیت کا خوب علم رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب 'ایکٹ' مرتب کیا جا رہا تھا تو ایک آدھ مرتبہ کھانے کا ذکر آنے پر کسی طرف سے مذاقا کہا گیا کہ ہر قسم کے کھانے کا ذکر ہماری مذہبی اور آسمانی کتابوں میں بہت پہلے ہی آچکا ہے البتہ سیمنٹ کی اہمیت کو وہاں پر خوفناک حد تک نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

چنانچہ 'فیکٹری ایکٹ' میں کھانے کا عدم ذکر!

لیکن کھانے پر چونکہ عام لوگوں کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے اس لیے جب افسروں کے لیے دوپہر کے وقفے کا گھنٹہ بچتا تو وہ لوگ بھی مشینوں پر نظر رکھے ہوئے، اپنے اپنے کام پر چوکس بیٹھے جلدی جلدی کھانا کھا لیا کرتے اور ان کے فورمیں، کہ خود بھی کھانا کھاتے تھے، ان کی ان چھوٹی موٹی کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیا کرتے۔ وہ سب اپنا کھانا ساتھ لے کر آتے اور کام پر پہنچ کر اپنی پوٹلیوں کو تختوں پر یا مشینوں کے غیر محرک پرزوں پر رکھ دیتے۔ اس طرح کھانے کے وقفے تک وہ پوٹلی مشین کا ایک ساکن حصہ بن جاتی لیکن اس کے اندر کوئی پرزہ، دوسرے پوشیدہ پرزوں کی طرح، مستقل چلتا رہتا اور اپنے ساتھ ایک انسان کو بھی مستقل چلائے رکھتا۔ اسے ترو تازہ رکھتا اور دوسرے پرزوں سے اس کی توجہ ہٹائے رکھتا۔ کھانے کے بعد وہ اس چھوٹے سے کپڑے کو جھاڑتے، اس میں رچی ہوئی پرانی، سیاہ چکنائی سے اپنے خشک چہروں اور گردنوں کو چکنا کرتے اور اور کس کر سروں پر باندھ لیتے۔ پھر وہ دیوار کے سہارے بیٹھ کر ایک ایک سگریٹ پیتے اور مشینری کی بھاری، نیند آور، مستقل تال کے نیچے جاگتے رہنے کی کوشش کرتے ہوئے چھٹی کے وقت کا انتظار کرتے رہتے۔ دوسرے پرزوں سے انہیں کبھی بھی دلچسپی نہ ہوتی تھی۔

اس کے باوجود کبھی کبھی وہ اپنی جگہ سے کھسکنے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس سلسلے میں رفع حاجت کا بہانہ سب سے زیادہ کامیاب رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ دن میں کئی کئی بار بیماری کا بہانہ کر کے جاتے اور ٹین کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی ٹٹیوں میں دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر

سگریٹ پیتے ، اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے اور اکیلے ہوتے تو دیوار پر فورمیں کے خلاف بری بری باتیں لکھتے اور نفرت سے لب سکیڑ کر مسکراتے ۔ پھر سگریٹ کو غلاظت میں پھینک کر انتہائی سست رفتاری کے ساتھ واپس اپنی جگہ تک آتے ۔ ایسے میں اگر کوئی فورمیں انہیں دیکھ لیتا تو گالیوں سے بھرپور زبان میں انہیں کام پر پہنچنے کی تلقین کرتا ۔ جو اب میں وہ ڈھٹائی سے ہنستے اور زیر لب گالیاں بڑبڑاتے ہوئے چال کو ہلکا سا تیز کر دیتے ۔ مشینری نے انہیں بالکل نکما کر دیا تھا ۔

باتیں کرنے کا انہیں یوں بھی موقع کم ہی ملتا ۔ مشینوں کا شور اتنا زیادہ تھا کہ جب کبھی وہ خاموش بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے تو ساتھ والے سے بات کرنے کے لیے انہیں پوری آواز سے چیخنا پڑتا ۔ چنانچہ دو ایک باتوں میں ہی ان کے گلے کی تسکین ہو جاتی ۔ وہ ان گونگے ، کند ذہن اور سدا تھکے ماندے گدھوں کی طرح تھے جنہیں چلانے کے لیے قدم قدم پر ڈنڈے مارنے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔

وہ ماہ مئی کا ایک بیحد گرم دن تھا اور باہر لو چل رہی تھی ۔ اندر وہ اپنی اپنی پوٹلیاں کھولے کھانے میں مصروف تھے ۔ صرف علی حسب معمول خاموش بیٹھا خالی خالی نظروں سے مشین کو تکے جا رہا تھا ۔ اس کی بیوی بیمار رہتے رہتے اب چارپائی سے جا لگی تھی اور وہ دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتا تھا ۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے اس کی آنکھ ذرا سیرے کھل جاتی تو وہ جلد جلد روٹی پکا کر کھا لیتا ۔ لیکن وہ شروع شروع کی بات تھی ۔ اب وہ اس سارے جھمیٹے سے اتنا بیزار اور لاپرواہ ہو گیا تھا کہ سونے جاگنے ، کھانے پینے اور کام پر جانے سے بہت کم دلچسپی اس کو رہ گئی تھی اور وہ بھوکا رہنے کا عادی ہو چکا تھا ۔ علی الصبح جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ وہ خاموشی سے بستر پر پڑا عائشہ کی گہری سانسوں ، منہ اندھیرے کے پرندوں اور صبح سویرے کی خواب آلود آوازوں کو سنتا رہتا ۔ پھر وقت مقررہ پڑ اٹھ کر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتا ۔ چند گھونٹ پیتا اور عائشہ پر ایک آخری نظر ڈال کر کام پر چلا جاتا ۔ شام کو آکر آگ جلاتا اور پانی میں سبزیاں اباتتا، گیہوں یا مکئی کی موٹی موٹی روٹیاں پکاتا اور پہلے عائشہ کو کھلاتا ، پھر خود کھاتا ، عائشہ زیادہ تر اہلی ہوئی سبزی کھاتی ۔ کبھی کبھار وہ چاول اور گوشت بھی کھاتے ۔ خاموشی سے کھانا کھا کر وہ اپنی جگہ پر لیٹ جاتے اور تھوڑی دیر کے بعد آوارہ بلیاں آکر جھوٹے برتن چاٹنے لگتیں ۔ باتیں کرنے کی ہفتوں نوبت نہ آتی ۔

ہر تین ماہ کے بعد جب اس کے پاس کچھ پیسے جمع ہو جاتے تو وہ ڈاکٹر کو لے کر آتا جو اس کی بیوی کے لیے کئی قسم کی دوائیاں تجویز کر کے چلا جاتا ۔ ان میں جتنی وہ خرید کر لا سکتا لے آتا اور باقاعدگی سے عائشہ کو پلانے لگتا ۔ صرف ایک باقاعدگی اور ایک قانون جو اس کی زندگی میں رہ گیا تھا عائشہ کی دوا کا تھا ۔ جتنا وقت وہ اس کے پاس رہتا ایک ڈاکٹر کی سی سختی کے ساتھ

وقت پر دوا پلاتا رہتا ، بغیر کسی جذبے کے ، جیسے مشین کو تیل دیتے ہیں ۔ بیوی کے ساتھ اس کی وفاداری ، بھوکے پیٹ کام کرنے کی اہلیت اور دوسرے دنیاوی کاموں سے اس کے استغنا کو دیکھ کر اس کے ساتھی اسے 'علی سائیں' یا محض 'سائیں' کے نام سے پکارنے لگے تھے ۔

اس کے باوجود یہ دوپہر کا وقت اس کے لیے مشکل ترین ہوتا ۔ پہلے پہل اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی اسے کھانے کی دعوت دے دیتا اور وہ کچھ نہ کچھ کھا لیا کرتا ، لیکن کوئی کسی کو کب تک کھلا سکتا تھا ۔ اب اس کو کوئی بھی نہ پوچھتا ۔ سب جانتے تھے کہ یہ اس کا معمول بن چکا تھا اور اس کے علاوہ ان میں سے ہر ایک اپنے دل میں مطمئن تھا کہ اپنی دوستی کی حد تک وہ کافی عرصے تک اس کو کھلا چکا تھا ۔ یہ بات نہ تھی کہ علی سخت بھوک محسوس کیا کرتا ، بلکہ اس کے برعکس اس کی کھانے کی خواہش ہی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی ، لیکن وہ محسوس کرتا تھا کہ دوپہر کے وقت جب وہ سب اپنے اپنے کھانے کی پوٹلیاں اپنے سامنے رکھ کر بیٹھتے تو کم از کم ایک دفعہ ضرور اس کی طرف دیکھ لیتے اور کھانے کے دوران برابر نظریں چراچرا کر اس کی جانب دیکھتے جاتے تھے (گو اس میں زیادہ تر اس کا تصور شامل تھا) ۔ اس سارے دوران میں وہ خالی خالی نظریں مشین پر جمائے بیٹھا رہتا تھا ۔

صرف ایک بٹن تھا جو باقاعدگی کے ساتھ دوستی نبھائے جا رہا تھا ۔ وہ ایک بیحد خوش مزاج نوجوان آدمی تھا جو ابھی کام سیکھ رہا تھا اور اپنی ماں کے ساتھ اکیلا ایک کوٹھری میں رہتا تھا ۔ اس کی ماں ساتھ والی کپڑے کی مل میں کام کرتی تھی ۔ کسی نے کبھی اس کو نگلین نہ دیکھا تھا ۔ وہ ہمیشہ ہنستا اور ہنساتا رہتا ۔ اپنے ساتھیوں میں وہ "کماری" کے نام سے مشہور تھا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے بازو پر اس نے ایک حسین عورت کی شبیہ کھدوا رکھی تھی اور جب وہ اپنی کلائی اور اٹھکیوں کو گھماتا پھراتا تو بازو کے پٹھوں کی مختلف حرکات کے باعث دیکھنے والوں کو کھدی ہوئی عورت ناچتی ہوئی نظر آنے لگتی ۔ ہر پہلے آدمی کی خواہش پر وہ اسے نچانے لگتا کیونکہ اس پر اس کا کچھ بھی خرچ نہ ہوتا تھا ۔ صرف اپنی ماں کے سامنے وہ کبھی بازو تکانا نہ کیا کرتا ۔

وہ بارہ مہینے جو کی روٹی لے کر آتا جس کو وہ کچے کچے پیروں کے ساتھ جنہیں وہ راستے میں اگی ہوئی کھلی پیروں سے پتھر مار مار کر گراتا ، کھایا کرتا ۔ پیروں کی خاطر اس کو منہ اندھیرے گھر سے چلنا پڑتا تھا ۔ کسی نے اس کو کبھی کچھ اور کھاتے ہوئے نہ دیکھا تھا ۔ حالانکہ اس کا کہنا تھا کہ دیوالی کے موقع پر گھر میں وہ چاول اور گوشت اور گیہوں کی روٹی کھایا کرتے تھے ۔ وہ باقاعدگی سے ہر دوسرے تیسرے دن علی کو یہ دیا کرتا اور کبھی کبھار روٹی کا ایک ٹکڑا بھی دے دیتا ۔ علی بغیر شکریہ ادا کیے اس سے کھانے کی چیزیں قبول کر لیا کرتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بٹن اپنی ضرورت سے زیادہ یہ لے کر آتا تھا اور روٹی وہ اس کو صرف اسی حالت میں دیتا جب کہ وہ

خود سیر ہو چکتا ، لیکن یہ وضع داری اور دوستی سب دیکھنے والوں کی باتیں تھیں ۔ ان دونوں کے درمیان ایسی کوئی بات نہ تھی ۔ وہ ان دو گنوار بھائیوں کی طرح تھے جو ایک مدت تک ساتھ ساتھ رہنے کے بعد اس عمر کو پہنچ جاتے ہیں جب ان میں بغیر شکرے کے ایک دوسرے کی خوشی سے بظاہر کوئی سروکار نہیں ہوتا ۔ یا پھر ان دو بوڑھے جانوروں کی طرح جو ایک جنگل میں تنہا رہتے ہیں اور جن کے دل میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی ، ترحم اور غیر شعوری رفاقت کے جذبے کے سوا کچھ نہیں ہوتا ۔ جو ایک دوسرے کی کمی کو محسوس بھی کرتے ہیں اور مستقل نظر انداز بھی کرتے رہتے ہیں ۔

ادھر کچھ روز سے ، جب سے مزدور یونین نے ہسپتال کا نوٹس دیا تھا ، علی پر بہت لوگوں کی نظر کرم تھی ۔ ہر کوئی دوپہر کے وقت اسے کھانے کی دعوت دیتا اور اس کے انکار کرنے پر اطمینان کا سانس لیتا ، کیونکہ دل سے کوئی بھی نہ چاہتا تھا کہ وہ ان کی درخواست پر عمل کرے ۔ علی کو بھی علم تھا کہ نوٹس چونکہ بھوک ہسپتال کا تھا چنانچہ یونین کی نظر میں وہ چوٹی کا آدمی تھا ۔ لیکن اسے اس سے دلچسپی نہ تھی ۔ اسے اپنی بیوی سے محبت تھی اور وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا ۔

وہ نوٹس کا آخری دن تھا ۔ اس دن بھی علی نے بشن سے چند یر لیے اور سب کی طرف پیٹھ کر کے کھانے لگا ۔ وہ ایک ایک یر کو آہستہ آہستہ چبا چبا کر کھا رہا تھا جب رحیم دوسری دفعہ اس کے پاس آیا ۔

”کچھ روٹی بچ گئی ہے ۔ کھا لو ۔“ اس نے روٹی بڑھاتے ہوئے کہا ۔
 علی نے خالی خالی نظریں اس پر جمائیں اور یر کی گٹھلی کو بار بار چبانے لگا ۔
 ”یہاں بیٹھو ۔“ آخر اس نے کہا ، ”میں ذرا دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں ۔“
 رحیم نے خوشی سے اس کی جگہ بیٹھنا منظور کر لیا اور وہ اٹھ کر باہر نکل آیا ۔ باہر لو چل رہی تھی ۔

کچھ دیر تک وہ دروازے پر رکا ، آنکھیں سکیڑے ، دھوپ کی سفید ، جلتی ہوئی چادر کو دیکھتا رہا جو میدان میں بچھی تھی ۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ میدان پار کیا اور ’ورکشاپ‘ کے سامنے جا رکا ۔ اندر خرا دیے اور ترکھان اور پیمنٹر اور سارے ’ہیلپرز‘ (Helpers) کھانا ختم کر کے دائرے میں کھڑے سگریٹ پی رہے تھے ۔ آنے والا طوفان سب کے اعصاب پر سوار تھا لیکن صبح سے کسی نے اس کا ذکر نہ کیا تھا ۔ چند مہینوں سے وہ اس سے متعلق تمام سرگرمی ان کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی لیکن آج جب کہ وقت سر پر آن پہنچا تھا وہ اس سے کترا رہے تھے ۔ اسے بھلانے کے لیے ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہے تھے اور بلا وجہ زور زور سے ہنس رہے تھے ۔ علی کو دیکھ کر بیک وقت ہسپتال سب کے ذہن میں وہ شدید خیال ابھر آیا ۔ وہ فیکٹری بھر

میں بھوک ہڑتال کے لیے موزوں ترین شخص تھا ، اور بہت غریب ۔ اس کے باوجود کسی کو اس کی ہڑتال میں بیٹھنے کے متعلق یقین نہ تھا ، کسی کو کسی کے متعلق یقین نہ تھا ۔ یہ اس فیکٹری کی پہلی ہڑتال تھی ۔

علی ان کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ ہیڈ فٹرنے علی کی طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی :

”تم نہیں جانتے سائیں ، پر یہ سب جانتے ہیں ۔ یہ یہاں کام کرتے ہیں ۔ یہ سارا اس گنجے کا قصور تھا (اسنے فورمین کی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا) سراسر ۔ اس کے گوروں کی ماں ۔ کہتا ہے گوروں سے کام سیکھ کر آیا ہے ۔ کیوں اوئے بولتے کیوں نہیں ؟“

”سراسر استاد سراسر ۔“ ایک فٹرنے ہاتھ پھیلا کر یقین دلایا ، ”یہ تو سب ماتے ہیں ۔ بیچارا کریم ۔ کیا جی دار مرد تھا ۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ باتیں کرتا رہا ۔ ہائے ۔“

”اور آخر دم تک کہتا رہا کہ اس کو کچھ بھی نہیں ہوا :“ ایک خرا دیے نے کہا ۔

”اس وقت اللہ گواہ ہے میں نے گنجے کو ایک طرف لے جا کر کان میں کہا کہ یہ کانٹھ جو وہ دے رہا ہے پکی نہیں ۔ ایک ٹن سے زیادہ وزن کے لیے یہ کانٹھ کام دے ہی نہیں سکتی ۔ پر اس نے اس کان سے سنا اس سے اڑا دیا ، اور تڑاخ ۔ سب نے تو دیکھا ہی کہ کیا ہوا ۔ اب ؟“

اس کی بھی ٹانگ توڑ دینی چاہیے ۔“ کسی نے تجویز کیا ۔ سب ہنسنے لگے ۔

”سور ۔“ ہیڈ فٹر غرایا ، ”اس کو جیل میں پھینکا جا سکتا تھا ۔ لیکن افسر ؟ جس کو چاہیں بچا لیں ، جس کو چاہیں بھوکا مار دس ۔ کون سنتا ہے !“

”الیکٹرک شاپ“ سے چند الیکٹریشن نکل کر آکھڑے ہوئے اور سگریٹ پینے لگے ۔ اب ہیڈ فٹر اپنا اور گنجے فورمین کا مقابلہ کر رہا تھا اور کام میں اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ فورمین کے خلاف تو سب خوشی سے سنتے رہے لیکن اب ان کی دلچسپی ختم ہو گئی کیونکہ ان میں زیادہ تر کاریگر تھے اور ہیڈ فٹر کی برتری ماتے پر تیار نہ تھے ۔ چنانچہ سب آپس میں باتیں کرنے لگے جس سے ہیڈ فٹر مشتعل ہو گیا اور چلا چلا کر بولنے لگا ۔ کچھ دیر کے بعد اگر کوئی وہاں سے گزرتا تو دیکھتا کہ مقرر اور سامعین میں کلا پھاڑنے کا مقابلہ ہو رہا ہے ۔ جلد ہی دوپہر کے وقفے کے خاتمے کا بھونپو ہوا اور وہ وہاں سے ستر بتر ہونے لگے ۔ علی کو جاتے ہوئے دیکھ کر ہیڈ فٹرنے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا :

”سائیں تم دل سے غریب ہو مگر اب زیادہ عرصے غریب نہیں رہ سکتے ۔ بیٹھو کے ؟ (ہڑتال میں)“

”پتا نہیں ۔“ علی نے کندھے اچکا کر کہا اور باہر نکل آیا ۔ باہر ابھی تک لو چل رہی تھی ۔ اس نے اس مہیب عمارت پر ، جہاں وہ کام کرتا تھا ، ایک نظر ڈالی اور دو ۔ ری طرف چل

پڑا۔ ایک اور کھلی جگہ پار کرنے کے بعد وہ 'موٹر ورکشاپ' میں نکل آیا۔ وہاں پر چند مکینک ایک ٹرک کے کھلے ہوئے انجن پر جھکے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے گریس اور تیل لگے چہروں پر سے سیاہ پسینے کے قطرے انجن میں ٹپک رہے تھے اور وہ بلاوجہ انجن میں ہاتھ مار رہے تھے۔ دو فٹر انجن کے نیچے سیدھے لیٹے گا رہے تھے اور اوپر والوں سے باتیں کر رہے تھے۔ مشین ان کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ ڈال رہی تھی۔ اوپر والوں نے خاموشی سے سر اٹھا کر علی کو دیکھا۔ اس کو محسوس ہوا کہ وہ لوگ، جو محض اس انجن کی وجہ سے وہاں پر موجود تھے، دراصل اس سے اس قدر مختلف تھے۔ کہ ان کو اس سرد، بد صورت بگڑی ہوئی مشین سے کوئی سروکار نہ تھا اور وہ ایک دوسرے کے لیے بے حقیقت تھے اور اس کے باوجود وہ محض اس مشین کی خاطر جمع تھے۔ اپنے خیال کے بے تکی پن پر وہ دل میں ہنسا اور تھکی ہوئی، کڑی، مستقل چال سے وہاں سے گزر گیا۔ آگے ریل کی پٹریاں تھیں جن پر مال گاڑی کے چند خالی ڈبے ادھر ادھر کھڑے تھے۔ ایک ڈبے کے سائے میں رک کر چند منٹ تک اس پر انگلیاں بجانے کے بعد وہ آگے چل پڑا۔ "لوڈنگ پلیٹ فارم" پر لمبی مال گاڑی کھڑی تھی اور اس میں چنچتے چلاتے ہوئے مزدور بوریاں لاد رہے تھے۔ اس کے پیچھے بوریاں بھرنے کی مشینوں کی عمارت تھی اور سیمنٹ کی دھواں دھار گرد میں لپٹے ہوئے تھے جو گرمی میں اضافہ کر رہی تھی۔ عمارت کے عقب میں علی کے دو ہمسائے بجلی کی زمین دوز لان کی، مرمت کرنے کی خاطر، کھدائی کر رہے تھے۔ جب علی ان کے پاس رکا تو وہ کمر تک گہرے، تازہ کھدے ہوئے گڑھے میں کھڑے، کہنیاں زمین پر ٹکائے ایک دوسرے کی کلائی موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک زور لگانے کے بعد انہوں نے ہاتھ چھوڑ دیے۔ یونس علی کو دیکھ کر ہنسا:

"کہتا ہے چھوٹے سر والے مرد کو عورتیں پسند نہیں کرتیں۔ اس میں مردی کم ہوتی ہے۔ میں نے کہا آؤ تمہیں مردی دکھاؤں، مردوں کے یہ طریقے ہیں۔" اس نے پنچہ پھیلایا، "تمہارے سر پر تو دو من بال اور من پگڑی ہے، اور جوئیں الگ۔" اس نے کرم سنگھ کی پگڑی میں اٹکی چھبوتے ہوئے کہا۔ علی منہ کھول کر ہنسا اور آگے چل پڑا۔ ذرا دور پر چند بجلی والے سائے میں بیٹھے کھدائی ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ آگے کوٹلے کا گودام تھا جہاں کوئلہ مال گاڑیوں پر سے اتارا جا رہا تھا۔ سیاہ کالے مزدور اور گدھے کوئلہ ڈھور رہے تھے۔ علی نے ایک نو عمر لڑکے کو دیکھا جو ایک موٹی سی مولی کھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گدھے کو ہانک رہا تھا۔ ہر چند قدم پر جب اس کا گدھا رک جاتا تو وہ ایک ہاتھ سے اس کی پونچھ اٹھاتا اور مولی منہ سے نکال کر اس کی دم کے نیچے دے دیتا۔ گدھا اچھل کر چلنے لگتا۔ آلے وہ نالی تھی جس کے ذریعے فیکٹری کا فالتو پانی باہر جاتا تھا۔ نالی کے کنارے کنارے کوئلہ ڈھونے والے وہ مزدور، جنہوں نے ابھی ابھی چھٹی کی تھی، تک دھڑنگ نہا رہے تھے۔ ان کے جسم کوٹلے کے بنے

ہوئے دکھائی دے رہے تھے ، اور وہ سفید سفید آنکھیں اور دانت نکالے باتیں کر رہے تھے ، ہنس رہے تھے ، کھڑے ہو کر پیشاب کر رہے تھے اور بے شرمی سے بڑے بڑے بالوں میں اٹھکیاں ڈالے کھا رہے تھے ۔ علی نے ہوا میں کالی دی اور نظر چرا کر وہاں سے گزر گیا ۔

(۳۹)

چار بجے دن والی شفٹ ختم ہوئی تو سب مزدور کام چھوڑ کر باہر نکل آئے ۔ اگلی شفٹ والوں کو دروازے پر ہی روک لیا گیا ۔ مشینیں بہر حال چلتی رہیں ، فورمینوں اور سپروائزروں کے سہارے جنہوں نے بھاگ دوڑ کے کام سنبھال لیا تھا ۔ یا چند ایک مزدور تھے جو ٹو ڈی بن کر منتظمین کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئے تھے ۔

گیٹ کے باہر لکڑی کے دو کرسٹوں پر چڑھ کر یونین کے پریزیڈنٹ نے ، جو شہر کا ایک معمولی وکیل تھا ، تقریر شروع کی :

”محنت کشو آخر وہ وقت آن پہنچا ہے جب اپنی محنتوں کا پورا پورا صلہ حاصل کرنے کے لیے تمہیں قربانی دینی ہوگی ۔ آج تمہاری اپنی محنت ، تمہاری مشقت تمہارا خون مانگتی ہے ۔ آج تک تم نے اپنی محنت کو اپنا پسینہ دیا ہے ، آج تک تمہارے پٹھوں سے نچڑے ہوئے ہزاروں قطرے اس زمین میں جذب ہوتے رہے ہیں ، آج اگر یہ زمین بول سکتی تو تمہارے نام پر اور تمہاری محنت کی سیرابی پر آفرین بھیجتی ، لیکن محنت کے ان سارے سالوں میں نہ زمین بولی اور نہ ہمارے مالک سیراب ہوئے ، اور اس کے باوجود یہ مہیب عارتیں اور یہ بھاری مشینری ہزاروں مزدوروں اور ہزاروں گدھوں نے دیکھتے دیکھتے کھڑی کر دی ۔ مزدوروں اور گدھوں کا پسینہ ایک جگہ گرا اور ہمارے مالکوں نے سمجھا کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور آج تک یہی سمجھتے آ رہے ہیں ۔ آج تک ، میرے مزدور ہم وطنو ! اس زمین کی طرح جس میں تم رہتے ہو ، جس میں تم سوتے جاگتے اور کام کرتے ہو ، جس کی مٹی سے تم اٹھے ہو اور جس کی خوشبو سے تم اتنی اچھی طرح واقف ہو ، آج تک اس زمین کی طرح تم بے زبان اور مصیبت زدہ رہے اور اپنے بہترین ساتھی گدھے کی طرح بدھو رہے اور اس کے باوجود تم نے بڑے بڑے کام کیے ۔ تم نے ہزاروں من وزنی لوہے کی مشینری کہاں سے کہاں پہنچا دی اور ایک نیا شہر آباد کیا ۔ ادھر سے تم نے خشک ییکار پتھر ڈالے اور ادھر سے سیمنٹ نکالا ۔ تم نے بنجر ، بے پھل پتھر میں سے سونا پیدا کیا ۔ پھر ۔ ۔ “ وہ رخ پھیر کر دوسرے گروہ سے مخاطب ہوا ۔ ” تم نے ادھر سے محنت کش کسانوں کی اکائی ہوئی کپاس ڈالی اور ادھر سے کپڑا نکالا ۔ وہ خوبصورت ملائم اور مضبوط کپڑا جس نے منڈیوں میں بہار لگا دی ہے ، جس نے مالکوں کے جسموں کو خوشنما بنا دیا ہے ۔ اور

تمہارے بچے آج تک گلیوں میں تنگے پھرتے ہیں اور تمہاری بیویوں نے برسوں سے نیا لباس نہیں دیکھا۔ کیا تمہارے بغیر یہ سب کچھ کیا جاسکتا تھا؟ کیا اپنی ساری دولت کے باوجود وہ کپاس کے ایک تار کو بھی کپڑے میں تبدیل کر سکتے تھے؟ اگر کپاس کے ایک ڈھیر کو روپیوں کے ایک ڈھیر کے ساتھ ملا دیا جائے تو صرف اس کا وزن بڑھ جاتا ہے، اور کچھ نہیں بنتا۔۔۔“

مجمع میں سے کوئی ہنسا جس پر مقرر نے غضبناک ٹکاپوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کہاں سے آئے ہو؟ اپنی زمینیں اور مکان اور مویشی چھوڑ کر یہاں جمع ہوئے ہو، تم نے اپنے پسینے، اپنی مشقت اور اپنی کاریگری کی بنا پر ایک دوسرے کو جانا اور ایک دوسرے کے درد کو پہچانا ہے۔ کس لیے؟ اس لیے کہ تمہارے ساتھ اور تمہارے باربردار جانوروں کے ساتھ ایک سا سلوک کیا جائے؟ نہیں۔ آج وہ لازوال وقت آگیا ہے جب برسوں کی اندھی اور گونگی محنت کے بعد بالآخر تم نے محسوس کیا ہے کہ تم انسان ہو کہ تم زمین پر بسنے والی ساری جاندار مخلوق میں سے برتر ہو، کہ تم بہتر سلوک کے مستحق ہو، تم سوچتے اور سمجھتے ہو، تمہیں گیہوں اور چنے کی روٹی کا فرق معلوم ہے، تمہارے جسم نرم اور سخت کپڑے کو الگ الگ محسوس کرتے ہیں۔ کہ تمہاری آنکھیں صفائی اور گندگی میں تیز کرنے کی اہل ہیں، کہ تم خوشبوؤں اور خوبصورت چیزوں کو پسند کرتے ہو، کہ تم میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جو تمہیں جانوروں سے الگ اور افضل بناتی ہیں۔ لیکن اس قدیم حقیقت اور نئی آکاسی کو ان تک پہنچانے کے لیے تمہارے خون کی ضرورت ہے کیونکہ اب تمہارا پسینہ ختم ہو چکا ہے، ان مردہ انسانی روحوں کو حرکت میں لانے کے لیے تمہارا خون درکار ہے، اور جب یہ بھی ختم ہو گیا تو ہتھاری ہڈیوں پر اس آکاسی کو قائم رکھا جائے گا۔۔۔“

مزدوروں کے مجمع میں سے بلبلاہٹ اٹھی جو آہستہ آہستہ نعروں میں تبدیل ہو گئی۔ پھر انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی قومی اور مذہبی قسم کے نعرے لگائے جن کا موضوع سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس موقع پر کپڑے کی مل سے عورتوں کا جلوس آکر ان کے قریب رک گیا۔ یہ سب مزدور عورتیں تھیں جو کپاس سے بنولہ الگ کرنے کا کام کرتی تھیں۔ ان کی رہنمائی ایک گندمی رنگ کی ڈھلتی ہوئی عمر والی عورت کر رہی تھی جو نزدیک سے دیکھنے پر تقریباً خوبصورت نظر آتی تھی۔ انہوں نے سونٹیوں پر رنگ برنگے کپڑوں کے ٹکڑے ٹانگ کر جھنڈے بنا رکھے تھے جن سے کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ جب وہ نعرے لگاتی لگاتی ان کے قریب آکر رک گئیں تو مزدوروں میں نمایاں طور پر جوش پھیلنے لگا۔ ایک چھوٹا سا کمزور مزدور، جس کو کم لوگ فیکٹری میں جانتے تھے، چھلانگ لگا کر کریٹ پر چڑھا۔ پریزیڈنٹ کچھ دیر تک سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا پھر نیچے کود گیا۔ لوگوں نے اس نوجوان کے کمزور جسم میں سے نکلتی ہوئی طاقتور آواز کو حیرت سے سنا:

”بھائیو! ہم غریب اور ان پڑھ لوگ ہیں لیکن ہم کام کرتے ہیں اور حق حلال کی روزی کھاتے ہیں۔ ہم میں سے زیادہ تر کند ذہن بھی ہوں گے لیکن ہم کاہل الوجود نہیں ہیں۔ پچھلے برس ہم نے پانچ لاکھ گز کپڑا بنا ہے، کیا ہمیں ایک کی بجائے دو ڈانگریاں نہیں دی جاسکتیں؟ سب جاتے ہیں کہ چھ ماہ میں ایک ڈانگری کا تار تار الگ ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دولت کے ساتھ عقل بھی آجاتی ہے، کیا وہ نہیں جاتے کہ چھ مہینے میں ڈانگری کا پھٹ جانا ہماری محنت کی نشانی ہے۔ وہ ہمارے تنگ جسموں کو کیوں ناپسند نہیں کرتے؟ وہ لوگ جو خوبصورت گھروں میں رہتے ہیں اور خوبصورت تصویریں دیواروں پر لٹکاتے ہیں، ہمارے سیاہ بد نما جسموں کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پچھلے سال میں ہم نے ساتھ ہزار ٹن سیمنٹ بنایا ہے جس سے کمپنی کو دس لاکھ روپے کا فائدہ ہوا ہے، کیا ہماری مزدوری آٹھ آنے روز کے حساب سے بھی نہیں بڑھائی جاسکتی؟ ہم لاکھوں میں دیتے اور صرف سینکڑوں میں اپنا حق مانگتے ہیں۔ ہمیں رہنے کے لیے مکان چاہیے، ہمارے مکانوں میں پانی ہونا چاہیے کیونکہ پانی کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے، صحن میں ایک آدھ پیڑ ہونا چاہیے جس کی چھاؤں میں ہم بیٹھ سکیں۔ ہمارے بیوی بچوں کو سستے داموں کپڑا ملنا چاہیے تاکہ وہ صاف ستھرے رہ سکیں۔ کیا انہیں علم نہیں کہ ہم میلے کپڑوں کو اسی طرح ناپسند کرتے ہیں جیسے وہ کرتے ہیں؟ ہماری تنخواہوں میں اضافہ ہونا چاہیے تاکہ ہم ذرا زیادہ آسانی کے ساتھ رہ سکیں۔ ہمارے گھروں میں بجلی لگنی چاہیے۔ کارخانے میں ہم دن بھر بجلی پیدا کرتے رہتے ہیں اور جب گھروں کو لوٹتے ہیں تو ہماری دیواریں اندھیرے میں کھڑی ہوتی ہیں اور تیل کا دھواں آنکھوں میں بھر جاتا ہے۔ کیسی شرم کی بات ہے۔ ہمیں اور ہمارے بچوں کو مل کے دوا خانے سے مفت مشورہ اور دوا ملنی چاہیے۔ ہماری چھٹیوں میں اضافہ ہونا چاہیے۔ مشینوں کو بھی تیل کی ضرورت ہوتی ہے، کیا ہمیں آرام کی ضرورت نہیں؟ کیا ہم اس تھوڑی سی سہولت کے حقدار نہیں ہیں؟ کیا یہ بہت زیادہ ہے؟ ہم نے اٹھائیس دن تک نوٹس کے جواب کا انتظار کیا ہے، اب اس کی گنجائش نہیں رہی۔ آج تک ہم نے مالکوں کے پیٹ کے لیے محنت کی ہے، آج ہم اپنے بچوں کے پیٹ کے لیے کام شروع کرتے ہیں۔“

ہر طرف سے نعرے بلند ہونے لگے۔

”وہ۔۔۔ وہ“ بشن نے علی کا بازو کھینچتے ہوئے کہا، ”میری ماں ہے۔“

علی نے کچھ نہ سنا۔ وہ خلا میں اس جگہ کو گھور رہا تھا جہاں سے کمزور نوجوان چھلانگ لگا کر غائب ہو چکا تھا۔ یونین پریزیڈنٹ کی تیار شدہ بلند آہنگ تقریر کے مقابلے میں اس نوجوان کے سیدھے سادے الفاظ تیر کی طرح اس کے دل کو لگے تھے۔ جب وہ بول رہا تھا تو علی نے محسوس کیا تھا کہ پریزیڈنٹ کی تقریر کے مقابلے میں، جو کہ اس کے عالم فاضل دماغ سے نکلی تھی، یہ الفاظ سیدھے اس نوجوان کے دل سے سیدھے اس کی زندگی سے نکل کر چلے آ رہے

تھے ، کہ یہ نوجوان مزدور ان کا بھائی تھا اور سب کچھ جانتا تھا ۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی نعرے لگانے والوں میں شامل ہو گیا ۔

پھر جانے کیسے ہوا کہ آناً فاناً علی نے اپنے آپ کو فیکٹری کی حدود کے اندر پایا ۔ اسے اتنا یاد رہا کہ مالکان کے چند نمائندے آئے اور گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے مزدوروں کو ورغلانے لگے اور وہ کہ پہلے ہی ڈھمکل یقین تھا ان کے آگے لگ کر اندر چلا گیا ۔ جلسے والوں کو جب پتا چلا تو گیٹ بند ہو چکا تھا ۔ وہ سب پلٹ کر گیٹ پر جمع ہو گئے اور غضبناک آوازوں سے انہیں واپس بلانے لگے ۔ چند ایک نے ”ٹوڈی ۔ ٹوڈی“ کی آوازیں بھی لگائیں ۔ بشن ، جو اندر چلا آیا تھا ، علی کے پاس سے نکل بھاگا اور دیکھتے دیکھتے لپک کر گیٹ پر جا چڑھا اور باہر کود گیا ۔ باہر والے مزدوروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا ۔ باقیوں کو اندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر وہ کالیاں دینے لگے ۔ علی نے عورتوں کے جلوس والی لیڈر کو دیکھا جو گیٹ کی سلاخوں میں سے ناک نکالے اس کا منہ چڑا رہی تھی اور ”ٹوڈی ٹوڈی“ کی رٹ لگائے ہوئے تھی ۔ علی نے اونچی آواز سے کالی دی اور مکا ہوا میں لہرایا ۔ وہ اس عورت کو جانتا تھا ۔ وہ شیلما ماتھر نام کی ہندو عورت تھی اور اب ایک مسلمان کے ساتھ رہتی تھی جس نے اس کا نام بانو رکھ دیا تھا ۔

رات ہونے تک کئی بار اس نے گھر جانے کی اجازت چاہی لیکن اسے بتایا گیا کہ جو لوگ اندر آچکے تھے اب ہسپتال ختم ہونے تک باہر نہیں جاسکتے تھے اور ان کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کا بندوبست اندر ہی کر دیا گیا تھا ۔ اس کے علاوہ اس کو یقین دلایا گیا کہ وہ ، جو ہسپتال میں شامل نہیں تھے ، مالکان کی منظر میں اونچی حیثیت رکھتے تھے چنانچہ ان کے گھر والوں کی دیکھ بھال کا ذمہ مالکان کے سر تھا اور اس کا خاطر خواہ انتظام کر دیا گیا تھا ۔ لیکن عائشہ بیمار تھی ۔ اور وہ اس کے پاس جانا چاہتا تھا کیونکہ دو روز پہلے وہ ڈاکٹر سے اس کی دوائی لے کر آیا تھا جو وہ خود بخود کبھی نہ پیتی تھی اور علاوہ اور سب باتوں کے اسے اپنی بیوی سے محبت تھی ۔ دو ایک بار اس نے آپ سے آپ باہر جانے کی کوشش کی لیکن گیٹ بند تھا اور اس پر پولیس کے سپاہی تعینات کیے گئے تھے جنہوں نے اسے واپس بھیج دیا ۔ اب رات پڑ رہی تھی اور وہ مایوس ہو چکا تھا اور اپنی کم عقلی پر پکھتا رہا تھا ۔ اس کے برعکس اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ اگر اس وقت وہ باہر رہ جاتا تو اسے زبردستی پکڑ کر بھوک ہسپتال کرنے والوں کی ٹولی میں بٹھا دیا جاتا اور وہ دو ایک روز میں ہی مر جاتا ۔ فیکٹری کو بہر حال ہڑتالیوں کی ہمت پست کرنے کی خاطر چلتے رہنا تھا ۔

اب رات پڑ چکی تھی اور کل سترہ آدمی فیکٹری کو چلا رہے تھے تین انجینئر ، پانچ فورمین ، چار سپروائزر ، دو فٹر اور تین مزدور ۔ انجینئر اور فورمین تو مزدور یونین میں شامل نہ تھے ۔ چنانچہ بڑے صاف ضمیر کے ساتھ کام کر رہے تھے کہ یہ ان کی ڈیوٹی تھی ۔ باقی سپروائزر اور فٹر اور مزدور ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی مرضی سے یونین کا ساتھ چھوڑ کر فیکٹری میں کام کرنے

کو چنا تھا۔

علی کی ڈیوٹی مل ہاؤس میں تھی۔ یہاں پر دو ملیں تھیں۔ ایک مل میں پتھر پیسا جاتا تھا۔ دوسری مل مشین وہی پسا ہوا پتھر جلائے جانے کے بعد جب 'کلنکر' بنتا تھا تو پیس کر سیمنٹ بنایا جاتا تھا۔ دونوں ملیں صرف پینے کا کام کرتی تھیں۔ جلانے کے لیے ایک الگ پلانٹ تھا جو 'کلن' کہلاتا تھا۔ مل ہاؤس میں عموماً پانچ آدمی ایک وقت میں کام کرتے تھے، مگر اس وقت صرف دو آدمی تھے: ایک فورمین تھا جو بھاگ دوڑ کر ملوں کو چلا رہا تھا اور علی تھا جو ان کے بیئرنگ (Bearing) کا تیل وغیرہ دیکھ رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے پمپوں کو، جن کے ذریعے پسا ہوا مال اگلی منزل تک پمپ کیا جاتا تھا، چلا رہا تھا۔ کام برائے نام ہی تھا کیونکہ تقریباً ساری مشینری خود بخود چلنے والی تھی، صرف نگرانی کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ فورمین کے پاس چند ایک دوسرے پلانٹوں کا چھوٹا موٹا کام بھی تھا۔ علی اس کام سے بخوبی واقف تھا اور آسانی سے پھر انجام دے رہا تھا۔

ایک گھنٹے سے اس کا فورمین غائب تھا اور وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات آدھی کے قریب ہو چلی تھی لیکن لو ابھی تک چلنی بند نہ ہوئی تھی اور پسینہ پانی کی طرح نکل رہا تھا۔ ملیں مستقل چل رہی تھیں اور ان کی گڑگڑاہٹ، جو پہلے پہل آنے والے کے دل میں جوش اور بدن میں چستی پیدا کرتی ہے، وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بھاری نیند اور اداس اور کڑی یکسانیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جاگنے کی کوشش میں وہ سر اٹھا کر بجلی کی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

اس کے سامنے دور و نزدیک اکا دکا جانے پہچانے لوگ مصنوعی جوش اور پھرتی کے ساتھ ادھر ادھر گزر رہے تھے۔ ان سب کے چہرے زیادہ دیر تک کام کرتے رہنے کی وجہ سے تھماتے ہوئے تھے اور وہ اونچی اعصابی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ برسوں کی پرانی جانی پہچانی فیکٹری آج ایک عجیب و غریب انوکھی دنیا میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک نوجوان انجینئر کرسن کو چلا رہا تھا۔ کرسن۔۔ جس کو عموماً علی کا ایک ساتھی چلایا کرتا تھا جس کو وہ اکثر وسل مار مار کر ملوں میں مال ڈالنے کی ہدایات دیا کرتا تھا، یہ دیکھ کر عجیب سی طمانیت محسوس کر رہا تھا، سی طمانیت کے احساس کو مکمل کرنے کے لیے علی اب تک تین بار جا کر منہ میں اٹکیاں ڈال کر سیٹیاں بجا بجا کر اور بازو ہوا میں لہرا لہرا کر اس کو ملوں میں مال ڈالنے کی ہدایات دے چکا تھا۔ ایک بار کرسن کے شیشے میں سے انجینئر کا غضب ناک چہرہ دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا اور بھاگتا ہوا اپنی جگہ پر آ کر ہنسی کے مارے دہرا ہوا گیا۔ ایک انجینئر اور دو فورمین کلن (بھٹی) کو چلا رہے تھے۔ کوئلہ، جو کہ کلن میں جلایا جاتا تھا۔ کہیں سے باہر نکل نکل کر اڑ رہا تھا اور تینوں کلن چلانے والے سر سے پاؤں تک کالے ہو رہے تھے۔ دو گھنٹے ہوئے اسی کلن کے پلیٹ

فارم پر جمع ہو کر ان سب نے رات کا کھانا کھایا تھا جو کینٹین سے پک کر آیا تھا اور سوچی کے تربتر حلوے اور بھنے ہوئے گوشت پر مشتمل تھا۔ اس کھانے میں سارے سپروائزر، فورمین، انجینئر اور علی کے علاوہ چیف انجینئر اور مل کا مالک بھی آکر شامل ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے پرانے دوستوں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ دو چار لقمے لینے کے بعد مل کے مالک نے بے تکلفی سے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا: ”شلباش نوجوان، تم ہیٹڈ فٹر کی آسامی کے قابل ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟“ زندگی میں پہلی بار علی سے مل کے مالک نے بات کی تھی۔ اس کے سارے بدن میں عجیب سی سنسنی دور گئی اور اگلے چند گھنٹوں کے لیے وہ اپنی بیوی کو قطعی طور پر بھول گیا۔ اس کے بعد مالک نے دبلے پتلے مذقوق چہرے والے سپروائزر سلیم سے اس کا نام پوچھا اور اسے بتایا کہ اس نے آج سب سے زیادہ کام کیا تھا اور یہ کہ اسے تو جنرل فورمین ہونا چاہیے تھا۔ مالک کی طرف سے اتنا صاف اشارہ ترقی ملنے کے سلسلے میں کافی سے زیادہ تھا۔ خوش آئند خیالات کے اچانک رش کی وجہ سے سلیم شرما کر ہنسا اور جلدی جلدی حلوہ کھانے لگا اور جنرل فورمین کا منہ لٹک گیا اور اس کی زبان پر پڑا ہوا حلوہ سب کو نظر آنے لگا جس پر انگریز انجینئر نے نظریں پھیر کر برا سا منہ بنایا۔ اس کے بعد جلد ہی مالک اور چیف انجینئر نے بڑی اپنائیت کے ساتھ انہیں بتایا کہ وہ یونین کے لیڈروں کے ساتھ گفت و شنید کر رہے ہیں اور امید ہے کہ جلد ہی کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔ جاتے جاتے مالک نے رک کر پچاسویں بار دہرایا: ”دھواں ٹکلتا رہے۔ شلباش، دھواں بند نہ ہو۔“

ان کے جانے کے بعد باقیوں نے آپس میں بالکل پرانے ساتھیوں کی طرح باتیں کیں، ایک دوسرے کو کام کے متعلق ہدایات دیں اور اپنی جگہ واپس جانے سے پریشتر ہنسی مذاق بھی کیا۔ جب وہ مل ہاؤس کی طرف واپس آ رہا تھا تو علی کا دل ان سب فورمینوں اور انجینئروں کی طرف سے، جن سے وہ ہمیشہ نفرت کرتا آیا تھا، مکمل طور پر صاف ہو چکا تھا اور مل کے مالک کے لیے تو اس کے دل میں ایسے محبت کے جذبات موجزن تھے کہ اگر موقع ہوتا تو وہ بے سوچے سمجھے اس پر فدا ہو جاتا۔ اپنی جگہ پر پہنچ کر اس نے ساری ملوں کا چکر لگایا اور دل میں ہر تالیوں کو کوستا اور ان کی ناکامی کی دعائیں مانگتا رہا۔

لیکن اب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور وہ اس سارے قصے سے اکتاتا جا رہا تھا۔ سامنے وہی سماں تھا: پھرتی سے آتے جاتے ہوئے اکا دکا لوگ، جو ایک پلانٹ سے دوسرے پلانٹ کو جا رہے تھے؛ بیچ بیچ میں پولیس کے سپاہی، جو منہ اٹھائے گشت کر رہے تھے؛ تیزی سے کار پر گزرتا ہوا چیف انجینئر؛ وہ لوگ، جنہوں نے کبھی یہ چھوٹے چھوٹے (مگر بہت اہم) باتھ سے کرنے والے کام نہ کیے تھے، اب کر رہے تھے، بالکل اسی طرح جیسے وہ کر رہا تھا، کرتا آیا تھا۔ وہ لوگ جو کبھی راتوں کو فیکٹری میں نہ آئے تھے، جو اتنے بعید، اتنے اونچے،

اتنے عظیم منظر آتے تھے اب اس کے ساتھ مل جل کر کام کر رہے تھے ، گپیں مار رہے تھے ، کھانا کھا رہے تھے ، اس کی سیٹی کی آواز پر چونک اٹھتے تھے اور اس کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے ۔ شروع رات میں یہ سب باتیں اسے بڑی سنسنی خیز معلوم ہوئی تھیں ۔ یہ بالکل نیا تجربہ تھا ۔ فیکٹری پر ایک بیحد انوکھا ، عجیب و غریب ، تہانگہ خیز سماں طاری تھا ، جیسے میلوں پر جانے والی رات ہوا کرتا ہے ، مصنوعی ، فی الوقتی خوشی اور جوش و خروش کا ، مل جل کر اٹھنے بیٹھنے کا ، شادی میاہوں والی راتوں کا ، ایک عظیم اور وسیع بھائی چارے کا (گو وہ کل تیرہ آدمی تھے) ۔ شروع میں جن مشینوں کے درمیان اکیلے پھرتے ہوئے اسے عظیم ملکیت ، خود مختاری اور قوت کا احساس ہوا تھا رات کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انہیں دیو ہیکل گرگڑاتی ہوئی مشینوں کے درمیان کھڑے کھڑے اسی شدت کے ساتھ وہ احساس خوفناک کھوکھلی تنہائی اور بے چینی میں تبدیل ہو گیا ۔ چلتی ہوئی مشینوں اور انسانوں کی باہمی رفاقت کی عجیب کہانی ہے ۔ جب وہ پہلے پہل ان کے درمیان پہنچتا ہے تو اس کی ساری قوتیں کہیں دب جاتی ہیں سوائے قوت سماعت کے جو اکیلی ان کی مہیب گرگڑاہٹ کو جذب کرتی ہے اور انسان کی اپنی آواز کو کہیں دور گم کر دیتی ہے ۔ اس چیلنج کو قبول کر کے انسان جبلی طور پر مشینوں کے مقابلے میں اپنی برتری کو ثابت کرنے کے لیے (یا کم از کم ان کی برابری کرنے کے لیے) جوش و خروش سے کام شروع کر دیتا ہے ۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اسے مشینوں کی مادی برتری کا احساس ہونے لگتا ہے ، ان کی مادی برتری کا اور ان کی سرد بے حسی کا اور ان کی پاگل کر دینے والی یکسانیت کا اور ان کی پابندی وقت کا اور ان کی انسان دشمنی اور ان کی پیداواری قوت کا اور ان کی لا تعلقی کا اور ان کی گینگلی کا ، اور ان سارے انکشافات میں سے مشینیں ایک برتر دشمن کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں ۔ اس نئی یاسیت میں سے ایک نیا احساس تنہائی جنم لیتا ہے اور انسان کی اپنی اندرونی گم شدہ آواز ابھرنا شروع ہوتی ہے اور اٹھتی اٹھتی اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ ساری مشینوں کی آواز کو دبا دیتی ہے اور انسان کو یکلخت خوفزدہ کر دیتی ہے ۔

دروازے کے ساتھ کھڑے کھڑے علی نے آنکھیں بند کر کے سوچا کہ اس ساری دنیا میں اس کا کوئی پرسان حال نہیں رہا ، کہ وہ دور دور تک بھلا دیا گیا ہے ۔

”سب ٹھیک ہے؟“

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ۔ ”سب ٹھیک ہے ۔“ اس نے میکانکی طور پر

دہرایا ۔

”شباباش ۔“ فورمین نے کہا ۔

”استاد میں ذرا ۔ تھوڑی دیر کے لیے کنٹین چائے پی آؤں؟“

فورمین نے اسے بخوشی جانے کی اجازت دے دی ۔ مل ہاؤس سے نکل کر وہ چار سو فٹ

اسے اٹھا کر نیچے لایا گیا اور چیف انجینئر مستقل کالیاں بڑھاتا ہوا اپنی کار میں ڈال کر فیکٹری کی ڈسپنسری کی طرف لے گیا اس کی جگہ ایک فورمین نے لے لی اور چند منٹ کے اندر اندر کام ختم کر کے کلن چلا دیا گیا۔ مالک نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ان تینوں کے کندھوں پر خوشی کے دھپ رسید کیے اور انہیں مبارکباد دیتا اور ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

کلن کے Pier کی اوٹ میں کھڑے کھڑے علی نے سلیم کو، جب وہ اسے کار میں لاد رہے تھے، صاف طور پر مرتے ہوئے دیکھا اور کینٹین کی طرف چل پڑا۔ کینٹین میں وہ دیر تک آگے رکھی ہوئی چائے کو پینے کا ارادہ کرتا رہا، پھر اسے اسی طرح چھوڑ کر چلا آیا۔ گیٹ کی جانب سے ہسپتالیوں کے ہلکے ہلکے نعروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مٹی کا آسمان صاف اور روشن تھا اور چمنی کا دھواں چاند کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس نے چیف انجینئر کی کار کو آکر رکتے، فیکٹری کے مالک کو نکل کر کلن پلیٹ فارم پر چڑھتے، کلن چلا تے ہوئے فورمینوں اور انجینئروں سے دو منٹ تک باتیں کرتے اور پھر اس کی پیٹھ ٹھونک کر قہقہہ لگاتے اور جاتے ہوئے دیکھا اور وہیں کھڑا رہا۔ سامنے کلن کی موٹر تھی جس کو بطریق احسن ٹھیک کر دیا گیا تھا اور جو اب بخوبی چل رہی تھی۔ اسے ٹھیک کرنے والے فورمین فخر سے اکڑ اکڑ کر مالک سے باتیں کر رہے تھے اور مالک ان کی کامیابی پر طمانیت سے مسکرا رہا تھا۔ اور دھویں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باقی سارے فورمین اور انجینئر بھی دھویں کی طرف دیکھ رہے تھے اور اپنی مجموعی کامیابی پر مکمل طور پر خوش تھے۔ گیٹ کے باہر ہسپتالی بھی دھویں کی طرف دیکھ رہے تھے اور مایوسی سے نعرے لگا رہے تھے۔ صرف سلیم وہاں نہیں تھا۔ اسے بھلا دیا گیا تھا۔ وہ جو مدقوق ہونے کے باوجود بڑا عمدہ کاریگر تھا۔

دفعاً وہاں کھڑے کھڑے علی کے گنوار ذہن نے عجیب و غریب طریقے سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ایسا خیالی منظر دیکھا جو اس طرح کے غیر تربیت یافتہ ذہن عمر بھر میں ایک آدھ مرتبہ ہی دیکھتے ہیں۔ اس منظر میں یہ سب کچھ شامل تھا: بخیر و خوبی چلتی ہوئی بجلی کی موٹر، بڑی خاموشی اور صفائی کے ساتھ گھومتی ہوئی کلن، شور مچا کر چلتی ہوئی مشین، چاند کے سامنے سے گزرتا ہوا چمنی کا دھواں، بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھتا اور فتح مندی کے قہقہے لگاتا ہوا سیاہ فام آدمی، غیر زبان میں کوسنے دیتا ہوا سفید فام آدمی، فخر سے اکڑ اکڑ کر باتیں کرتے اور سفید سفید دانت نکال کر ہنستے ہوئے کئی آدمی۔۔۔ سرد، ٹھوس، لائق اور لا تعلق مشینیں؛ سرد، ٹھوس، لائق اور لا تعلق انسان۔۔۔ اسے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کہاں تھا؟ وہ خود؟ اس نے سوچا، ”میں اس میں کہاں آتا ہوں؟“ اس نے بلند آواز میں کہا۔ وہ آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ باہر

سے شور اٹھا۔ پھر یکلخت گیٹ کھل گیا اور ہڑتالی نعرے لگاتے ہوئے اندر داخل ہونا شروع ہوئے۔ جلوس کے آگے آگے فیکٹری کا مالک، چیف انجینئر اور یونین کا پریزیڈنٹ چل رہے تھے۔ تینوں کے گلوں میں ہار پڑے ہوئے تھے اور مزدور تینوں کا نام لے لے کر زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ علی اپنی مخصوص تھکی ہوئی، مستقل چال سے اُن کے پاس سے گزرتا گیا۔ جلوس کے وسط میں کسی نے طعن بھرے لہجے میں کہا: ”سائیں ٹوڈی“۔ ایک نفرت آلود قہقہہ بلند ہوا۔ جلوس کے آخر میں کسی نے رک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا:

”سائیں تم دل سے غریب ہو پر اب زیادہ دیر تک غریب نہیں رہ سکتے۔ ہماری چند شرائط مان لی گئی ہیں۔ ہمارے ساتھ آؤ۔ ہم جاتے ہیں وہ تمہیں کھینچ کر اندر لے گئے تھے۔ تمہارا کوئی قصور نہ تھا۔“ اس نے اجنبی، لاعلم نظروں سے مخاطب کو دیکھ کر زیر لب کہا: ”میں اس میں کہاں آتا ہوں؟“ اور آگے چل پڑا۔

اپنے گھر کے دروازے پر اس نے مڑ کر ایک تھکی ہوئی نگاہ فیکٹری پر ڈالی۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ چکے تھے۔ چمنی کا دھواں روشن آسمان پر لمبی سفید لکیر بناتا ہوا مغرب کی سمت جا رہا تھا۔ آخر مٹی کی رات گرم اور پرسکوت تھی۔

(۴۰)

عام سطح پر زندگی جس تیزی اور شدت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتی ہے اسی تیزی اور شدت کے ساتھ مایوس بھی کرتی ہے۔ زندگی ایک عظیم اور مسلسل حرص ہے اور ہر چھوٹی بڑی حرص کی طرح انسانوں پر خوفناک پابندیاں عائد کرتی ہے، اور پھر یک دم اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جس آسانی اور تیزی سے اس کی طرف مائل ہوتے ہیں اسی آسانی کے ساتھ اسے برا بھلا کہنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض لوگ اپنی کوشش سے ایک بیکار تجربے میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی کوشش سے ہی، مایوس ہو کر یا محض اکتا کر، باہر نکل آتے ہیں (محض ایک دوسرے بیکار تجربے میں داخل ہونے کے لیے) اور بعض، جن کی بہت بڑی اکثریت ہے، خاموش رضامندی کے ساتھ روز بروز، لمحہ بہ لمحہ رہے چلے جاتے ہیں، اور کبھی کبھار جب شدید ذہنی اور روحانی کرب کی وجہ سے ٹھٹک جاتے ہیں تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مختلف قسم کے تجربات کی بدولت انہوں نے اپنی عقل و دانش میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ ہم میں سے بہت کم کبھی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ گونگی رضامندی کا رویہ ایک بیماری ہے جس نے ہم سب کو اپنی پیٹ میں لے رکھا ہے اور کہ اس بیماری کا نام ہے ”کاہلیت“ دوسرے لفظوں میں اسے صاف صاف انسانی بے عقلی

بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہمارے دوسرے لاجاصل جذبوں کی طرح دنیاوی عقل و دانش بھی بیحد تھکا دینے والی شے ہے۔

روشن محل کا مشرقی حصہ ، جس میں کمرہ نشست ، خواب گاہ اور ایک سٹڈی شامل تھی ۔ نعیم اور عذرا کی تحویل میں تھا ۔ روشن محل کے نوکر چاکر ہی ان کی خدمت پر مامور تھے ۔ پارلیمنٹ ہاؤس سے آنے کے بعد نعیم زیادہ تر وقت سٹڈی میں گزارتا ۔ عذرا اس کے پروگرام میں کبھی محل نہ ہوتی تھی ۔ پچھلے چند برس سے وہ انتہائی سکون اور قناعت کے ساتھ زندہ تھی اور نعیم کے علاوہ روشن محل اور اپنے ارد گرد زندگی کی ہر بات میں بیحد انہماک اور دلچسپی کے ساتھ حصہ لے رہی تھی ۔ اس دوران میں اُسے دیکھنے پر آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا تھا کہ درمیانی عمر کی ہی خصوصیت ، صحت مند عورت اپنے طبقے کی خاص الخاص نمائندہ تھی اور زندگی میں اس نے محبت ، نیکی اور مہربانی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا ۔ اس قدر حیرت انگیز صلاحیت اس میں وقت کے صدموں کو برداشت اور منظر انداز کر دینے کی تھی ۔

نعیم وزارت تعلیم میں انڈر پارلیمنٹری سیکرٹری تھا ۔ اس عہدے پر وہ کیونکر مامور ہوا تھا ، ٹھیک طور پر اس کا کسی کو علم نہ تھا ۔ بہر حال یہ سب جانتے تھے کہ اس میں روشن آغا کے ذاتی سیاسی رسوخ کا بڑا حصہ تھا ۔ دفتری کام کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا چنانچہ شروع شروع میں کافی محنت سے اسے کام سیکھنا پڑا یہاں تک کہ آہستہ آہستہ وہ اس قابل ہو گیا کہ دن بھر کا کام وقت مقررہ کے اندر ختم کر لیتا ۔ اس سے بہر حال اسے کوئی طمانیت حاصل نہ ہوئی اور اس کام میں وہ اپنے لیے کوئی دلچسپی پیدا نہ کر سکا ۔ سب سے زیادہ احساس ناکامی اسے یہ تھا کہ باوجود ہزار کوشش کے اپنی شخصیت میں وہ بھاری بھر کم پن ، قناعت ، شائستگی ، مکاری ، خود غرضی اور بے غرضی کا ملا جلا انداز پیدا نہ کر سکا جو عموماً پہلے اور دوسرے درجے کے سرکاری اہلکاروں میں پایا جاتا ہے ۔ اب آ کے پہلی مرتبہ شدت کے ساتھ اسے احساس ہوا تھا کہ اول اور آخر وہ کسان تھا اور کسان کا بیٹا تھا اور اپنے کاؤں اور زمینوں کی طرف لوٹ جانے کی خواہش نے اس کے اندر مستقل خلش کی صورت اختیار کر لی تھی ۔ نئی شخصیت کو اپنانے کی کوشش میں اس نے اپنی قدرتی شخصیت بھی کھو دی تھی اور عجیب مضحکہ خیز کردار بن کر رہ گیا تھا ۔ اس کا چہرہ سادہ لوح دیہاتیوں کی طرح بے تاثر اور صحت مند تھا اور آنکھوں سے سوائے بے کسی اور حماقت کے کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا جیسے عام مویشیوں کی آنکھیں ہوتی ہیں ۔ اس زمانے میں تیزی سے سفید ہوتے ہوئے سر اور سیدھے ، مضبوط جسم والے اس شخص کا عمدہ لباس ، غیر متوازن چال ڈھال ، حماقت زدہ چہرہ اور کام کرنے کا گومکا ، بے اثر رویہ دیکھنے والے کے دل میں ترجم کے جذبات پیدا کرتا تھا۔ یوں اس کی حالت کچھ ایسی قابلِ رحم نہ تھی ۔

گھر میں سوائے مطالعے کے اسے کوئی کام نہ تھا۔ عمر بھر کا باغبانی کا شوق آہستہ آہستہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔ گو عذرا اب بھی اسی جوش و خروش سے اسے اپنے لکائے ہوئے پودے دکھاتی، اور کیاریوں جو اس نے تیار کی ہوتیں، اور وہ اس کے ساتھ اسی بے کسی اور وفاداری کے ساتھ پھرتا جس طرح دفتر میں کام کیا کرتا تھا، لیکن سارے دن میں اصل فراغت اور آسودگی وہ اس وقت محسوس کرتا جب اپنے مطالعے کے کمرے میں بند ہو کر کتابیں ٹٹولنا شروع کرتا۔ اس کی لائبریری اردو اور انگریزی زبان کی کئی سو کتابوں پر مشتمل تھی جس کے بنانے میں اس سے زیادہ عذرا نے دلچسپی لی تھی۔ خود عذرا کو پڑھنے کی نہ فرصت تھی (کہ روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں وہ اس درجہ غرق رہتی تھی) نہ دلچسپی، لیکن نعیم کی خاطر اس نے اپنے مقررہ وظیفے کی مدد سے، جو اسے روشن آغا کی طرف سے ملتا تھا، ہر قسم کی کتابیں فراہم کی تھیں، لمبی بیماری کے دوران نعیم کو جو بہت زیادہ سونے کی عادت پڑ چکی تھی اس سے چھٹکارا پانے میں اسے کافی دقت ہوئی۔ اب وہ بہت کم سوتا تھا۔ سیر شام کمرے میں بند ہو کر جو وہ پڑھنا اور تمباکو پیینا شروع کرتا تو رات کا کھانا بھی اکثر وہیں کھاتا اور آدھی رات گزرنے پر سونے کے لیے جاتا۔ اس کو اپنے قریب لیٹتا ہوا محسوس کر کے بہت تھوڑی دیر کے لیے عذرا کی آنکھ کھلتی اور ایک خفیف سی باسی خوشی کی لہر اس کے بدن میں دوڑ جاتی لیکن جلد ہی وہ سو جاتی کیونکہ جس شخص سے اُسے گہری محبت تھی اس کی طرف سے اب وہ مطمئن اور لہروا ہوتی جا رہی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ رات کے اس سے اس کی نیند اڑ جاتی اور پھر وہ سو نہ سکتی۔ تھوڑی دیر تک تاریکی میں انتظار کرتے رہنے کے بعد وہ ایک سبکی لے کر اس کے ساتھ لیٹ جاتی اور دیر تک جاگتی رہتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سویرے جب عذرا اٹھتی تو نعیم کو مطالعے کی کرسی پر سویا ہوا پاتی۔ جگانے سے پیشتر وہ دیر تک دروازے میں کھڑی محبت، آزر دگی اور ہلکے سے غصے اور نفرت کے ساتھ اسے دیکھتی رہتی۔ لیکن نعیم کے لیے جو ڈاکٹر کی طرف سے صبح سویرے لمبی سیر اور خاص قسم کی ورزش کی ہدایات تھیں ان پر وہ سختی سے عمل کرتی۔

علی الصبح سیر پر جانے والوں کو سڑک کے کنارے کنارے نعیم چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ لنگڑا کر چلتا ہوا ملتا۔ اس کا بازو تھامے ساتھ ساتھ اس کی بیوی چل رہی ہوتی اور نیچی آواز میں کوئی بات کرتی جاتی۔ پھر جب روشن محل والوں کے جاگنے کا وقت ہوتا تو اکثر جو منظر سب سے پہلے دیکھتے وہ نعیم کا ہوتا جو عذرا کی مدد سے مختلف قسم کی ورزشیں بھونڈے پن کے ساتھ کر رہا ہوتا۔ سوائے نجمی کے یہ منظر ان میں سے کسی کے لیے کچھ زیادہ خوش کن نہ تھا۔ ان میں سے بعض نے تو اب اراداً صبح سویرے مشرقی لان کی طرف دیکھنے سے گریز کرنا شروع کر دیا تھا۔

مطالعے کا شوق نعیم کو ان دنوں ہوا جب وہ بیمار تھا اور کرنے کو اس کے پاس کچھ نہ تھا۔

سب سے پہلے اس نے مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ قرآن کے علاوہ اس نے بائبل اور گیتا بھی پڑھی۔ پھر وہ تاریخ کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ تبدیلی کسی طے شدہ پروگرام کے تحت نہ ہوئی بلکہ بالکل لاشعوری طور پر عمل میں آئی۔ ایک روز لیٹے لیٹے یونہی اس کا جی چاہا کہ تاریخ کی کوئی کتاب پڑھے۔ ساتھ ہی اس نے سوچا کہ وہ جو مذہب کا مطالعہ اتنے روز سے کر رہا تھا اس سے اس کو کیا حاصل ہوا تھا۔ اس کا ذہن اور روح جس دگھ میں مبتلا تھے اس میں ذرہ برابر کمی تو واقع نہ ہوئی تھی اور اتنا سارا وقت اس نے محض بوڑھا ہونے میں ضائع کر دیا تھا۔ نقصان عظیم کا احساس، جو مستقل اس کے ساتھ لگا ہوا تھا، شدید ہو گیا اور اس نے پچھلی تمام کتابوں کو یکسر محو کر دیا، اسی طرح تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ ایک موضوع سے مایوس ہو کر دوسرے کی طرف جاتا رہا اور پوری طرح سے کچھ بھی نہ پڑھ سکا۔ ہندوستان اور باقی دنیا کی تاریخ پڑھنے کے بعد اسے سائنس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس میں اُسے حساب، طبیعیات اور سائنس کی تازہ ترین ایجادات نے بہت متاثر کیا۔ کچھ عرصے تک وہ انتہائی انہماک سے آسان زبان میں لکھی ہوئی انگریزی کی کتابیں پڑھتا رہا۔ لیکن سائنس کا مضمون دلچسپ اور حیرت انگیز ہونے کے باوجود اسے کھوکھلا سا لگا۔ جتنا زیادہ وہ اسے پڑھتا گیا اتنا ہی زیادہ الجھتا گیا۔ سائنس کے مطالعے نے اس میں احساس کمتری پیدا کیا اور ہر نئی چیز پڑھنے پر اسے لگتا کہ جیسے اب تک وہ کچھ بھی نہ تھا اور محض اس ایک شے کے جاتے پر اب وہ سب کچھ جان گیا ہے۔ اسکے دوسرے دن ہی وہ نئے سرے سے خلا میں بھٹکنا شروع کر دیتا۔ ہر نئے باب کے ساتھ اس کی بے چینی اور ذہنی اور روحانی ناداری کا احساس بڑھتا گیا اور ساتھ ہی سائنس کے مضمون سے اس کی گہری میزاری میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے باوجود کتنے ہی عرصے تک وہ اسے ترک کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہ کر سکا کیونکہ اس مضمون میں ایک وقتی دلچسپی اور آن بان کا احساس تھا جس سے وہ نجات حاصل نہ کر سکا۔ پھر انسان، نہ چاہنے کے باوجود، کئی ایک چیزوں میں اُن کی خالصتاً خوش کن خصوصیات کے باعث پھنس کر رہ جاتا ہے۔ آخر ایک روز، غیر شعوری طور پر، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، بیحد اکتا کر اس نے اس مضمون کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ اس کے کافی عرصے بعد اس نے ایک روز سوچا کہ جو کچھ اس نے کیا، یا ہوا، عین مناسب تھا، کیونکہ اسے کسی بات کا بھی جواب نہ مل سکا تھا، کہ جو سوالات اور الجھنیں اس کے دل و دماغ کو گھیرے ہوئے تھیں ان کا جواب وہاں پر تھا ہی نہیں، کہ سائنس کسی بنیادی سوال کا جواب نہیں دیتی، کہ اس تمام عرصے میں جو ایک دھیمی اور مسلسل آواز ضدی لہجے میں پکارتی رہی تھی؛ کیوں؟ کیوں؟ اس کا جواب وہاں نہیں تھا۔ کسی حد تک اس کا جواب اسے فلسفے میں مل گیا جس کی طرف اب اس نے رجوع کیا تھا یا کم از کم اس نے یہ سمجھا کہ فلسفہ اس کا جواب ہے۔ فلسفے کی دنیا نے اسے تیزی سے مسحور کیا اور وہ ابتدائی آسان فلسفہ پڑھتے پڑھتے حقیقی دقیق جدید فلسفے تک آ پہنچا۔ فلسفہ

سائنس کی طرح دلچسپ اور حیرت انگیز نہ تھا لیکن یہ گہرا ، دیرپا اور سکون بخش موضوع تھا ۔ سائنس کے مطالعے کے دوران اسمیں جو عجلت کا انداز پیدا ہو گیا تھا اب جاتا رہا تھا ۔ فلسفے کا ایک صفحہ پڑھ کر اسے کوئی خواہش باقی نہ رہتی اور اس کی طبیعت کی اداسی اور ٹھہراؤ کو تقویت پہنچتی ۔ سائنس کے طلسم میں جو جکڑے جانے کا احساس تھا اس سے اب وہ آزاد ہو گیا تھا ۔ بعض دفعہ وہ کتاب کھول کر ایک سطر پڑھتا اور آنکھیں بند کر کے تمباکو پینے لگتا وقتی طور پر اسے گہری طمانیت کا احساس ہوتا اور اس کے دل میں کچھ بھی کرنے کی خواہش باقی نہ رہتی ۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ آنکھیں کھولتا اور بند کر لیتا اور اسے محسوس ہوتا کہ زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے ، کوئی کام ، کوئی جذبہ ، کوئی مصروفیت ، کوئی انتظار ، کچھ بھی نہیں ۔ صرف ’وہ‘ ہے اور اس کا تمباکو کا پائپ ہے اور لمبی آرام وہ کرسی ہے اور کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں ہیں اور گہری آسودگی ، عمیق امن کا احساس ہے ۔ بالآخر اس جگہ ، اس کمرے میں ہر چیز کا خاتمہ ہے اور آزادی ہے اور وہ خوشی سے ساری عمر بتا سکتا ہے ۔ کبھی کبھی وہ چھڑی کے سہارے چلتا ہوا نشست کے کمرے میں جا کر عذرا کے سامنے ، جو میٹھی موزے بن رہی ہوتی ، دیوار کی طرح کھڑا ہو جاتا ۔ عذرا کو محسوس ہوتا کہ وہ اس کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے کہ وہ کوئی احمق ہو ، یا کوئی بیجان شے ہو جیسے میز یا کرسی ، یا شاید کہیں بھی نہیں دیکھ رہا بلکہ سوتے میں چل رہا ہے ۔ ۔ ۔ کافی دیر کے بعد وہ چند بار آہستہ آہستہ دہراتا : ”تم جانتی ہو ؟ تم جانتی ہو ؟“ اس کا لہجہ حیرت ناک طور پر اداس ، سرد اور پرسکون ہوتا ۔ عذرا، جو اس کے ساتھ رہنے کی عادی ہو چکی تھی ، معمولی انداز میں ہنستی اور کوئی بات کرنے لگتی جس پر وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا یا اس کی بات ادھوری چھوڑ کر واپس چلا جاتا ۔

آہستہ آہستہ فلسفے کا اثر بھی زائل ہو گیا جیسے کہ تمام دنیاوی علوم کا اثر انسان کی زندگی میں جلد یا بدیر کبھی نہ کبھی ضرور زائل ہو جاتا ہے ۔ اب وہ آہستہ آہستہ ورق گردانی کرتا اور خاموشی سے ، بغیر جانے ہوئے ، دل و دماغ کے خالی ہو جانے کا ماتم کرتا رہتا ۔ لیکن تمباکو کے دھوئیں اور کتابوں سے بھرے ہوئے اس کمرے سے ٹکلنا اب اس کے لیے بہت دشوار ہو چکا تھا ۔ یہاں آن کر اس کو محسوس ہوتا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی ۔ ان کتابوں کی ، لیمپ کی میز اور کرسی کی ، تمباکو کے ڈبے کی ، کسی بھی شے کی نہیں ۔ یہاں پر وہ اپنے حقیقی تنگے وجود میں آ جاتا اور اپنے آس پاس کی ہر شے کے ساتھ پرانے سادہ دل دوستوں کی طرح ملتا جن کے ساتھ آپ مکمل بے نیاز اور بے راز طور پر رہ سکتے ہیں ۔ یہ چھوٹا سا کمرہ اس کے لیے ہر قسم کی آزادی کی ، ہر چیز کے خاتمے کی ایک نئی علامت بن چکا تھا ۔

یہی وجہ تھی کہ گھر سے باہر وہ ہمیشہ کسی نہ کسی سہارے کی تلاش میں رہتا ۔ مگر چونکہ وہ ایک بوڑھے ہوتے ہوئے ، اکتائے ہوئے آدمی کی طرح روحانی طور پر منکسر لیکن ذہنی طور پر پُر

تکبر تھا اس لیے بہت کم لوگوں سے مرعوب ہوتا ، اور جو لوگ اسے مرعوب کرتے ایک حاسدانہ جذبے کے زیر اثر وہ شاذ و نادر ہی ان کے قریب ہو سکتا ۔ ان دنوں اس تنہا صورت انسان پر ابتلا کا یہ دور آیا تھا۔

صرف پارلیمنٹری سیکرٹری انیس الرحمان ایک ایسا شخص تھا دفتر بھر میں جس کے ساتھ نعیم کو دلچسپی تھی ۔ وہ عمر میں نعیم سے چند برس ، بڑا چھوٹے قد کا تنومند آدمی تھا ۔ اس کے کال اگر اتنے پھولے ہوئے ، گردن اتنی موٹی اور بال ماتھے پر بہت نیچے تک آگے ہوئے نہ ہوتے تو خوبصورت کہلایا جا سکتا تھا ۔ پچاس برس کے لگ بھگ ہونے کے باوجود اس کے بال بجم سیاہ اور کھردرے تھے اور تیز ذہین آنکھیں گوشت کی فروانی کی وجہ سے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جن پر وہ سنہرے فریم کا نازک سا چشمہ لگائے رکھتا تھا ۔ وہ جنگلی بھینسے کی سی پھرتی اور قوت کے ساتھ چلتا پھرتا تھا اور جب جوش میں ہوتا تو اس کے بازوؤں اور گردن کے بال کھڑے ہو جایا کرتے ۔ کسی نے اسے کبھی سست یا بیکار بیٹھے ہوئے نہ دیکھا تھا ۔ دفتر کا کام وہ پلک جھپکنے میں ختم کر لیتا اور پھر دوستوں کو خط لکھتا یا فون پر اپنی بیوی سے باتیں کرتا رہتا ۔

جب کوئی کام نہ ہوتا تو اٹھ کر دفتر میں چکر لگانے لگتا اور ہر ایک سے ایک ساتھ باتیں کرتا ۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کو کسی سے شخصی دلچسپی نہ تھی ۔ وہ کسی کی خیریت دریافت کرتا یا کسی سے ہمدردی کی باتیں کرتا تو محض اپنے آپ کو مصروف رکھنے یا فالتو وقت کو صرف کرنے کی خاطر کرتا ۔ ضروری نہیں کہ یہ بات صحیح ہو لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے دوسروں کو ایسا خیال ہوتا تھا ۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے اس سے ڈرتے ضرور تھے ، شائد حاسدانہ عزت بھی کرتے تھے ، پر محبت نہ کر سکتے تھے ۔ اس کا سب کو علم تھا ۔ اس کے باوجود ، نمایاں طور پر کوشش کیے بغیر وہ شخص جس حلقے میں گھومتا ، جس محفل میں موجود ہوتا سب پر غلبہ کیے رہتا ۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے پاس ہر بات کا ، ہر واقعے کا نہایت دانشمندانہ اور صحیح جواب موجود تھا ۔ اس کے انداز کے غیر شخصی پن کے باوجود ایک عجیب طرح کی گرمی اور مٹھاس تھی جو لوگوں کو اس سے ڈرنے ، اس کی عزت کرنے اور اس سے مرعوب ہونے پر مجبور کرتی تھی ۔ جب وہ باتیں کر رہا ہوتا تو اس کی تیز آنکھوں اور ہاتھوں کی جنبش سے ایک سحر سا پیدا ہو جاتا جو وقتی طور پر بہت طاقتور ہوتا ۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جن کے جانے کے بعد دیر تک آپ ان کے متعلق سوچتے رہتے ہیں ، مگر وہ جتنا عرصہ موجود رہتا آپ اس کے سحر میں مبتلا رہتے تھے اور اس کے مقابلے میں اپنی کم تر حیثیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے ۔

دو ایک بار نعیم اس کے گھر پر بھی گیا جہاں اس کی بیوی اس کی پہلی بیویوں کے دو بچوں کی نگہداشت کرتی تھی ۔ بلقیس بشکل پچیس برس کی صحتمند اور خوش مزاج لڑکی تھی اور اس کی

تیسری بیوی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی نعیم کو علم ہو گیا کہ وہ معمولی پڑھی لکھی خوش شکل تھی اور بہت سلیقے سے گھر اور بچوں کو صاف ستھرا رکھتی تھی۔ زندگی کی طرف اس کا ایک صحتمند، عامیانہ رویہ تھا۔ وہ بہر حال ایسی عورت نہ تھی جس سے نعیم متاثر ہو سکتا چنانچہ اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ بلقیس نے بھی اس سفید بالوں والے، ادھ گنچے اور چھڑی کے سہارے لنگڑا کر چلتے ہوئے بغیر دلچسپ آدمی کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔

(۴۱)

شروع جاڑوں کے دن تھے جب نعیم، انیس الرحمان اور اس کے گھر والوں کے ساتھ مچھلی کے شکار کو گیا۔ انیس الرحمان باقاعدگی کے ساتھ ہر دوسرے ہفتے بیوی بچوں کو لے کر شہر سے بیس میل دور مچھلی کے شکار کو جاتا جہاں دریا کے کنارے اس کی ایک مختصر سی کوٹھی اور ایک موٹر بوٹ تھی۔ آموں کے باغ میں کھڑی ہوئی وہ چھوٹی سی مغربی وضع کی کوٹھی ٹھنڈی اور پرسکون تھی۔ یہاں پہنچ کر نعیم کے دل میں ہلکی سی بے چینی پیدا ہوئی، وہ بے نام سی کسک جو کھوئے ہوئے سکون کی نشان دہی کرتی ہے اور جس کے مٹے ہوئے نقوش کبھی کبھار دل پر ابھر کر انسانی تلاش کی علامت بن جاتے ہیں۔ اس کا کاؤں اور بڑے بڑے کھنے پیڑوں والا باغ اور نمدار سیاہ زمین جس کی ٹھنڈک میں متلاشی آنکھوں اور تھکے ہوئے دلوں کے سارے جذبے پھلتے پھولتے اور پرورش پاتے ہیں، جیسے پھول اور پودے اور سرسبز گھاس، اور جہاں پر ہر انتظار اور ہر تلاش ختم ہو جاتی ہے۔۔۔ ہفتے کی شام کو جب وہ وہاں پہنچے تو کھانا کھانے سے پیشتر انیس الرحمان نعیم کو کوٹھی دکھانے کی غرض سے باہر لے گیا۔ آموں کے پیڑوں کے علاوہ گھاس کے ایک قطعے میں، جو بیٹھنے کے لیے مخصوص تھا، سرو کا درخت اکیلا کھڑا تھا جس کے نیچے کوٹھی کے رکھوالے کا گھر تھا۔ درخت کے ساتھ انیس الرحمان کا گھوڑا بندھا تھا جو انہیں دیکھ کر ہنہنایا۔ نعیم نے پسندیدگی سے اصیل النسل جانور کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اس کی تعریف کی۔ واپس آتے ہوئے وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا: ”مجھے یقین تھا یہاں اگر مجھے خوشی ہو گی، اسی لیے۔۔۔ میں اسی لیے۔“ اس نے چونک کر انیس کی طرف دیکھا، پھر ہاتھ اٹھا کر ہتھیلی پر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا، ”اکیلا ہی آیا۔“

انیس الرحمان اپنے تندہی کے انداز میں ہنسا جس سے اس کی نازک سنہری سینک ناک سے اوپر اٹھ گئی۔ ”یہاں آکر مجھے سکون ملتا ہے۔ میں جب پہلی بار لارنس کے ساتھ یہاں آیا تو اسی روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک نہ ایک روز میں اس جگہ کو ضرور خریدوں گا۔ مجھے علم تھا تم یہاں اگر خوش ہو گے۔ تم شہر کے باسی نہیں ہو۔ میں جانتا ہوں۔“

”ہاں۔“ نعیم نے کہا۔

صبح سویرے وہ اور اس کا میزبان مچھلی کے شکار کا سامان اٹھا کر دریا کی سمت روانہ ہوئے۔ خزاں کا موسم تھا اور صبح کی ہوا میں شیشم کے درختوں کے خشک پتے کھڑکھڑا کر رہے تھے۔ رستے میں انہیں ساتھ والے گاؤں کے کچھ لوگ صبح کی سیر اور رفع حاجت کے لیے جاتے ہوئے ملے۔ آگے چند جھونپڑیاں آئیں جن میں قحط زدہ بنگالی کنبے، جو روٹی کی تلاش میں وطن سے ہجرت کر آئے تھے، پناہ گزین تھے۔ اکا دکا کسان میلوں کی جوڑیاں لیے ہل چلانے کے واسطے جا رہے تھے۔ دونوں شکاری مقررہ جگہ پر پہنچ کر رک گئے۔ اس جگہ شیشم کے درختوں کا بہت بڑا جھنڈ تھا اور نیچے دریا کے کنارے کے پتھر زرد اور قرمزی رنگ کے پتوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے شانوں پر سے تھیلے اتار کر نیچے رکھے اور ڈوریاں اور چھڑیاں تیار کرنے لگے۔

”مچھلی کا شکار تمہارے لیے بہت موزوں ہے۔“ انیس الرحمان نے کہا اور اس کو اس جگہ کی خصوصیات بتانے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس جگہ پر دزخت اس طور سے اُگے تھے کہ سارا دن ان پر دھوپ نہ پڑ سکتی تھی، اور کنارے کے مخصوص کٹاؤ کی وجہ سے اس جگہ دریا ایک چھوٹے سے تالاب کی شکل اختیار کر گیا تھا جس میں مچھلیاں کثرت سے ملتی تھیں۔ پھر جب انہوں نے چھڑیاں اور ڈوریاں تیار کر لیں تو وہ دیر تک نعیم کو ڈوری پھینکنے اور کھینچنے کا صحیح طریقہ سمجھاتا اور مشق کراتا۔ جب سورج ایک نیزہ پر آگیا تو وہ اپنی اپنی ڈوریاں پھینک کر سکون سے بیٹھ چکے تھے اور انیس، نعیم کو ایک فالتو کنڈی پر لیکڑا پھنسا کر صحیح Bait لگانے کا طریقہ بتا رہا تھا۔ جب یہ موضوع بھی ختم ہو گیا تو وہ نیچی آواز میں جو کہ مچھلیوں تک نہ پہنچ سکتی تھی، اسے اس دریا میں پائی جانے والی مختلف اقسام کی مچھلیوں کی بابت بتانے لگا۔

اب دریا کی سطح پر دھوپ ان کے قریب آ رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی چمکیلی مچھلی ہوا میں چھوٹی سی چھلانگ لگا کر غائب ہو جاتی۔ دریائی ہوا کے زور سے شیشم کے پتے ان کے سروں پر اور آس پاس ساری جگہوں پر گر رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہوا، دریا کے بہنے کا اور آبی پرندوں کی آوازوں کا شور تھا۔ دونوں مردوں کی ڈوریوں کے ناڑ پانی کی سطح پر ڈول رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی شرارتی مچھلی راستہ گزرتی ہوئی کنڈی پر منہ مار جاتی۔ بڑی مچھلی ابھی تک کوئی نہ لگی تھی۔

نعیم نے پائپ ہونٹوں سے جدا کیا اور سطح آب پر سے منظر اٹھا کر پہلی بار بات کی :

”تم نے انہیں دیکھا۔ وہاں۔“ اس نے سر سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

انیس نے غور سے اسے دیکھا اور کندھے اچکا کر بولا : ”اوہ۔۔۔۔۔ بنگال۔ تمہیں پتا ہی

ہے۔ بنگال۔“

نعیم پھر سطح آب پر دیکھ رہا تھا۔ انیس ایڑیاں اٹھا کر اپنے بیوی بچوں کی راہ دیکھنے لگا جو

ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ پھر وہ نعیم کو دوسری ڈوری کا خیال رکھنے کے لیے کہہ کر کنارے کنارے چلتا ہوا دور تک چلا گیا :

جب وہ واپس آیا تو نعیم اسی طرح بیٹھا تھا اور ایک کوا کیکڑوں کے ڈبے میں چونچ مار رہا تھا۔ انیس کو اپنے قریب کھڑا پا کر منظر اٹھائے بغیر وہ بولا :

”انیس مصیبتیں کیوں نازل ہوتی ہیں؟“

انیس اداسی سے مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

”انسانوں پر ظلم کیوں ہوتے ہیں؟“ نعیم تیزی سے بول اٹھا، ”انصاف کیوں نہیں ہوتا؟“

انصاف کدھر گیا؟“

چند لمحے تک ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ نظریں پھیر لیں۔ نعیم کا ناڑ غائب ہو چکا تھا۔ اس نے ڈوری کھینچ کر باہر نکالا۔ یہ ایک فٹ لمبی پتلی سی راکھ کے رنگ کی مچھلی تھی۔ نعیم کو ایک ہاتھ کی مدد سے کنڈی سے مچھلی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر انیس الرحمان نے ڈوری اس کے ہاتھ سے لے لی اور آہستہ سے مچھلی کو الگ کر دیا، پھر کنڈی پر نیا کیکڑا لگا کر اسے پانی میں پھینکتے ہوئے وہ لا تعلق انداز میں بنگال کے قحط کی باتیں کرنے لگا۔

نعیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کیا : ”مصیبتیں کیوں نازل ہوتی ہیں؟“ اس نے ضدی لہجے میں کہا۔ ایک لمحہ رکنے کے بعد انیس الرحمان تیزی سے، انہماک سے، جذبے سے بولنے لگا :

”میں بھی اسی طرح سوچتا ہوں۔ اسی طرح۔ ایک وقت تھا جب میرا خیال تھا کہ مصیبتیں برے آدمیوں کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں اور ایک سادہ سے اصول کے مطابق گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ مگر اصول؟ اصول کیا چیز ہیں؟ مجھے پتا چلا کہ وہ عقلمندی کی باتیں جو میں نے لڑکپن اور جوانی میں سیکھیں، وہ سارے زریں اقوال۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر ہمیں بندھے ٹکے اصولوں کے مطابق ہی زندگی بسر کرنا ہے تو پھر خدا ہیچ میں کہاں آتا ہے؟ پھر اس میں ”وہ“ کہاں آتا ہے۔۔۔“ وہ رکا، ”نعیم تم وہاں نہیں تھے۔ تم نے صرف ان کو دیکھا ہے جو زندہ ہیں، ان کو نہیں دیکھا جو مر رہے ہیں۔ میں ابھی وہاں سے لوٹا ہوں۔ تمہیں پتا ہے وہاں کیا ہو رہا ہے! جوان اور بوڑھے اور بچے، چھوٹے اور بڑے، بھیک مانگ رہے ہیں۔ اچھے اور برے سب بھکاری ہو گئے ہیں۔ ہر کوئی خوراک کے لیے زندہ ہے یا خوراک کے لیے مر رہا ہے۔ مٹھی بھر چاولوں کے لیے یا چاولوں کے پانی کے لیے۔ وہ اتنے سے چاولوں کے باعث یا مر رہے ہیں یا امیر ہو رہے ہیں۔ یہ وہ وقت آیا ہے جب شدید انسانی کیفیات زندگی میں داخل ہو کر عام حالت کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر تمہارے پاس کچھ نہیں ہے تو بھیک مانگو گے،

اگر کچھ ہے تو اسے بیچ کر امیر بن جاو گے۔ زندگی بہر حال تھوڑے سے اناج پر منحصر ہو کر رہ گئی ہے۔ اب یہاں سے ایک سادہ سا اصول بنا لینا نہایت آسان ہے۔ کہ ”زندگی مختلف اور متضاد حالات کے پیش نظر بیحد عزیز اور بامعنی اور پھر بیحد سستی اور بے معنی ہو سکتی ہے۔“ اللہ اللہ خیر سلا۔ آپ نے اصول بنا لیا اور مطمئن ہو گئے۔ پر میں نہیں۔ میں پوچھتا ہوں انصاف کہاں گیا؟ انصاف، جو ہم نے صدیوں کے الٹ پھیر سے سیکھا ہے۔ جنگوں اور وباؤں اور قحطوں اور زلزلوں اور دوسری آسمانی بلاؤں کے بعد سیکھا ہے۔ کیا آپ اس سے کوئی خاص اصول وضع کر سکتے ہیں؟ کوئی ضابطہ؟ کوئی پیٹرن؟ یا گزشتہ زمانوں سے حاصل کیے ہوئے تمام انسانی علم، تمام انسانی دکھ کا کوئی پیٹرن؟ ہمیں آج اس بات کا علم ہے کہ یہ لمبی چوڑی اور انتہائی متضاد اور منتشر آفتیں تھیں جو ہم پر اور ہمارے آباؤ اجداد پر نازل ہوئیں۔ ہم نے ان سے سوائے زریں اقوال کے کیا حاصل کیا ہے۔ سنہری اصول، ”وہ طنز سے ہنسا،“ جو انسانی مشاہدے کی ایک بیحد سطحی کاوش ہیں، کسی چیز سے بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ دودھ کے کلاسوں سے، یا ٹوٹی پھوٹی موٹر گاڑیوں سے یا آدمی اور بھینس کی باہم لڑائی سے بھی۔۔۔ مثلاً یہ کہ ”اے انسانو، بھینسوں سے مت لڑو۔“۔ دوسرے لفظوں میں سنہری اصول انتہائی متضاد واقعات سے بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں، لیکن کیا ہم تضاد سے انصاف حاصل کر سکتے ہیں؟ یا انصاف کی کوئی صورت ہی؟ جب کہ اصول جو کہ ایک سطحی اور بے بس مشاہدے کا نتیجہ ہیں، متضاد اور منتشر ہونے کے باوجود، ایک ہی عنوان کے تحت ترتیب دیے جا سکتے ہیں، انصاف کے ساتھ ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اثر براہ راست اور گہرا ہے۔ اصول ایک بے بسی کا علم ہیں جن کا ہماری زندگیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک کتاب کی طرح۔۔۔ آپ کے اختیار میں ہے کہ پڑھ کر اس سے مستفید ہوں، یا اسے اٹھا کر شروع سے آخر تک پڑھیں اور بھول جائیں، یا پھر اسے ہاتھ تک نہ لگائیں اور میز پر محض گرد کے نیچے دبنے اور گلنے سرنے کے لیے چھوڑ دیں۔۔۔ انصاف کے ساتھ بھی آپ ایسا برتاؤ کر سکتے ہیں؟

نہیں۔ یہ میرے یا آپ کے انتخاب کی بات نہیں ہے، یہ میری یا آپ کی مرضی پر منحصر نہیں ہے۔ انصاف دوسری آسمانی آفتوں کی طرح ہم پر عائد کیا جاتا ہے اور ہمارا مقدر بن جاتا ہے۔ یہ تمام انسانی تاریخ، تمام انسانی دکھ پر حاوی ہے۔ پھر کیوں، میں پوچھتا ہوں کیوں، جب کہ آسمانی انصاف کا کوئی ”پیٹرن“ نہیں ہے تو کیوں ہم انسانوں کے انصاف کی تائید کریں؟ جنگوں اور قحطوں اور وباؤں میں انصاف کہاں تھا؟ ہم کیسے انسانوں کی ”زندگیوں“ پر حکومت کرنے کے لیے اصول وضع کر سکتے ہیں جب کہ انسانوں کے ”مقدر“ کے لیے کوئی اصول نہیں ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ چند بے روح، مردہ دل، یاسیت پرست اور بیمار پڑھے لکھے لوگوں کا ایک گروہ دوسرے انسانوں کی زندگیوں کا فیصلہ کرنے بیٹھ جائے جب کہ وہ خود اپنے مستقبل اور اپنے انجام

کے متعلق بے خبر اور بے بس ہیں اور ان قوتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتے جن کے ہاتھ میں ان کا خاتمہ ہے۔ تم نے ان لوگوں کی بے بسی دیکھی ہے۔ جب وہ جنگ یا قحط کے دوران اپنے قانون چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک شخص کو بھی مرنے سے، ختم ہونے سے نہیں بچا سکتے مگر اپنی بدنامی و شوکت کے ساتھ، چہروں پر مصنوعی سکون طاری کیے۔ کاغذوں اور دفتر کی میزوں کے ساتھ اپنا پیشہ جاری رکھتے ہیں۔ جب وہ معصوم انسانوں کو موت سے نہیں بچا سکتے تو اپنے قلم، کاغذ اور دفتر کے فرنیچر کو بچانے کی جان توڑ کوشش کرنے لگتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ نالائق ہیں؟ نہیں۔ اس سارے وقت میں انہیں مستقل اپنے کام کی بے اثر اور نفرت انگیز نوعیت کا علم رہتا ہے۔ وہ نالائق نہیں ہیں، نااہل ہیں۔ صاف صاف نااہل۔۔۔ “وہ چشمہ اتار کر شیشے صاف کرنے لگا۔ بلقیس اس دوران میں اس کے قریب آکھڑی ہوئی تھی۔ انیس عجیب سی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے اس طرح اپنی طرف تکتے ہوئے پا کر وہ خاموشی سے مڑ کر اس طرف کو چلی گئی جدھر اس کے دونوں بچے پایاب پانی میں کھڑے ممل کا دوپٹہ ڈبو ڈبو کر مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ جب دوبارہ چشمہ چڑھا کر وہ بولا تو اس کی آواز گہری اور اداس تھی :

”یا شاید نااہل بھی نہیں ہیں، صرف احمق ہیں۔ احمق۔ کیونکہ پھر میں نے انہی آدمیوں کو مضحکہ خیز طور پر مرتے ہوئے دیکھا۔ وباؤں میں اور۔۔۔ وہ اپنے انصاف کے قوانین۔۔۔ میں پر چھوڑ کر بے بس، بے کس لوگوں کی طرح مر گئے، اس قوت کے زیر اثر جو ان کے انصاف کے قوانین کی کوئی پروا نہیں کرتی۔ اس کا اپنا انصاف ہے۔ یہ وہی بے معنی موت تھی جو ہر کسی کو آتی ہے۔ وہی بے کسی کی موت جو کتے کو آتی ہے۔ قوانین دو بار مرتے ہیں۔ بہتر موت ان کے لیے وہ ہے جب وہ غلط ثابت ہوتے ہیں اور بدل دیے جاتے ہیں، ہر زمانے میں۔ اور بہتر موت ان کے لیے وہ ہوتی ہے جب کہ وہ ابھی لاگو ہوتے ہیں اور ان کی نفی کی جاتی ہے، زلزلوں و وباؤں جنگوں کی مدد سے۔ جب آفتیں نازل ہو کر مکمل طور پر ان کی نفی کرتی اور تمام انسانی زندگی کو ابدی طور پر بے معنی ثابت کرتی ہیں۔ وبا کے بعد اگر ایک شہر میں سو یا دو سو آدمی بچ جاتے ہیں تو کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ زندگی کی نشانی ہے؟ یہ موت ہے۔ ایک انسان کی موت سب کی موت ہے کیونکہ زندگی یکساں ہے اور موت بہر حال وجود تمہاری یا میری یا میرے بچوں کی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میں تمہیں قتل کرتا ہوں تو پھانسی پر چڑھوں گا، نہیں کرتا تو قحط میں مروں گا یا جنگ میں یا کسی گلی یا ہسپتال میں ہی مر جاؤں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے؟“

نعیم نے بے خود ہو کر نفی میں سر ہلایا۔ انیس الرحمان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی پلمک پیدا ہوئی اور وہ نعیم کی طرف جھک کر بولا: ”یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ اگر کوئی فرق نہیں

پڑتا تو انصاف کہاں گیا؟ یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ تم نے انصاف کے متعلق پوچھا تھا نا۔ یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ یہی تو۔۔۔“

وہ شور سن کر رک گیا۔ بلقیس اور بچوں نے، جو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے تھے، کپڑے کی مدد سے ایک خاصی بڑی مچھلی پکڑ لی تھی۔ بلقیس پونچھ کی طرف سے ہڑپتی ہوئی مچھلی کو پکڑے کھڑی تھی اور بچے تالیاں بجا رہے تھے۔ اس نے جب دونوں مردوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسی اور مچھلی انہیں دکھا کر تالیاں بجانے لگی۔ انیس الرحمان اٹھا اور نعیم کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے کستی کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ انیس کی ڈوری کے ساتھ مچھلی لگی لیکن وہاں اب کوئی نہ تھا۔ بلقیس کمر پر ہاتھ رکھے غصے سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

کستی میں بیٹھ کر انیس نے انجن چلایا اور رخ بہاؤ کی مخالف سمت کا کر لیا۔ انجن کی آواز سے دریا میں بیٹھے ہوئے پتلی پتلی ٹانگوں والے ہلکے پھلکے سفید پرندے مچھلیوں کا ناشتہ چھوڑ کر اڑے اور آبی آوازوں میں شور مچانے لگے۔ پانی بارشوں کی وجہ سے گدلا ہو رہا تھا اور اس پر دھوپ پھیل چکی تھی۔ سطح آب کو کاٹتے اور چھینٹے اڑاتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ چند دوسری کستیوں کے قریب سے گزرے جن میں سیاہ بدن مچھیرے کھڑے خاموشی سے جال پھینک رہے تھے۔ دور سے کستی کے انجن کی آواز سن کے انہیں پہچان کر جھک کر سلام کرنے لگے جسے اس نے نہ دیکھا، صرف نعیم نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ ان کی مچھلیاں بھاگ گئی تھیں مگر وہ مرعوب ہو چکے تھے۔ ساہا سال کی افتاد نے اسی صورت میں انہیں زندہ رہنے کے اہل بنا دیا تھا۔

چند میل اوپر جا کر اس نے انجن بند کر دیا اور کستی دھارے کے ساتھ بہنے کے لیے چھوڑ دی۔ پھر وہ اٹھ کر نعیم کے قریب آ بیٹھا۔

”دراصل ”وہ“ کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ صرف ہمارے یہاں پر ہے۔“ اس نے چاروں اٹھکیوں سے اپنے سر کو ٹھونکا۔ ”یہاں۔ اور یہاں پر اور کچھ بھی نہیں ہے۔ حالانکہ یہاں عقل کو ہونا چاہیے۔“

نعیم حیرت اور افسردگی سے اسے دیکھتا رہا۔

”جاتے ہو ہم نے خدا کو کیوں ایجاد کیا ہے؟ اپنے آرام کی خاطر۔ کیونکہ ہم سوچنا نہیں چاہتے، اور سچائی کی تلاش میں سوچنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے، کیونکہ ہم اسی طرح پیدا ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ جاتے ہو کیا ہے۔ ہم احمق ہیں۔ احمق۔ دنیا بھر کی کتابیں پڑھ کے تم سمجھتے ہو کہ عالم بن گئے ہو۔ ٹھیک ہے کہ تم نے افلاطون کے برابر علم حاصل کیا اور جاہل نہیں رہے۔ لیکن کیا یہ کافی ہے؟ دنیا کے زیادہ تر عالموں نے کتابیں پڑھتے اور لکھتے ہوئے زندگیاں

کزاریں۔ ان میں اور اس طوطے میں جو ”میاں مٹھو“ میاں مٹھو کہہ کر زندگی بسر کرتا ہے کوئی فرق نہیں کیونکہ عام طوطوں میں وہ بھی عالم طوطا ہوتا ہے۔ مجھے طوطوں کے متعلق زیادہ علم نہیں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ کچھ لوگ آئیں گے، آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، جو ان سب لوگوں کا بیزاری اور حقارت کے ساتھ ذکر کریں گے اور اپنے زمانے کے لوگوں کو محض سوچنے کی تلقین کریں گے، محض سمجھنے کی۔ تم کچھ بھی نہیں ”سمجھ“ سکتے اس لیے کہ تم عالم ہو، کہ تم جاہل نہیں ہو، کہ تم احمق ہو۔ ہم میں ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہی ہے۔ تم بھی اور میں بھی۔“ وہ اٹھ کر انجن کے پاس گیا اور جھک کر اسے سٹارٹ کرنے لگا۔ پھر گیٹر میں ڈالے بغیر اسے چلتا رہنے دیا۔ ایک آبی پرندہ پتھر کی طرح پانی کی سطح پر گرا اور پھلی دبوچ کر اس طرح بھاگا جیسے کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہو۔

”اس کی آواز سن رہے ہو؟“ انیس نے انجن کی طرف اشارہ کر کے کہا، ”کیا تمہیں کسی اور شخص کی ضرورت ہے جو آکر یہ بتائے کہ انجن چل رہا ہے۔ یا اس کستی کے پیندے میں چھید ہو جائے اور پانی اندر آنے لگے تو کیا تم بیٹھ کر انتظار کرتے رہو گے کہ کوئی دوسرا تمہیں آ کر بتائے کہ تم ڈوب رہے ہو؟“ وہ رکا، ”نہیں؟ ٹھیک، تو پھر ”اس“ کی کیا ضرورت ہے؟“ ”اس“ نے جو مدرسہ جاری کیا ہے مذہب، اس سے کیا حاصل؟ دنیا کے تمام مذہب محبت کا پرچار کرتے ہیں۔ ہنہ! پر ہوتا کیا ہے۔ جو نہی آپ ایک مذہب کو اپنا لیتے ہیں آپ کے دل میں نفرت کا، تعصب کا بیج بویا جاتا ہے، دوسرے مذہب کے خلاف، دوسرے تمام مذہب کے خلاف، ان تمام ان گنت فرقوں کے خلاف جن میں آپ شامل نہیں ہیں۔ محبت کے تمام پرچار کے باوجود اس وقت خود بخود ہماری عقل سلب ہو جاتی ہے اور ہم دنیا کے سب سے مطمئن انسان بن جاتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے زندگی کی بنیادی ضرورت کے متعلق سوچنا چھوڑ کر ہم اتنی تسکین حاصل کرتے ہیں جتنی مالکونس راگ سن کر بھی نہیں کرتے۔ مگر اطمینان کہاں ہے؟ اسے کون جانتا ہے؟ ذہن انسانی کے سب سے بڑے کرب آلود سوال کا جواب ہم اپنے بڑے بوڑھوں سے حاصل کر لیتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ وہ ہم سب سے زیادہ عمر رسیدہ ہیں؟ ہاں، محض اس لیے! ”محض“ اس لیے!! ہم بڑے بوڑھوں کو اپنا راہنما بنا لیتے ہیں اور اس کے نقش قدم پر چلتے ہیں، محض اس لیے کہ وہ بڑے بوڑھے ہیں، یا اس لیے کہ وہ ہمیں عقل کے استعمال سے نجات دلاتے ہیں۔ ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہ کیا ہیں۔ وہ ہم سے بڑے احمق ہیں کیونکہ انہوں نے زندگی بھر حماقت کی ہے اور اس کا علم رکھتے ہیں اور اسے ماتے پر تیار نہیں ہیں، کیونکہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور بڑھاپا ہمیں مایوس کر دیتا ہے اور مایوس انسان پر تعصب اور نادار ہوتا ہے۔ میں نے موت کی آمد کو محسوس کیا ہے، اور میں سچ کہتا ہوں نعیم، اپنے آپ کو موت کی طرف پابجولاں بڑھتے ہوئے پا کر انسان اپنے آپ کو از حد احمق اور بدھو محسوس کرتا

ہے کیونکہ موت اس کی شکست ہے اور اس سے پیشتر وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے۔

وہ جانتا ہے لیکن تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ اس نے مایوسی سے سر ہلایا، ”کیا صرف محبت کافی نہیں ہے، نعیم؟ اس گروہ بندی کے بغیر، صرف محبت، جو ایک آفاقی جذبہ ہے، کیا ہماری روح کو اس کے علاوہ کسی اور شے کی بھی ضرورت ہے؟ نہیں۔ ہم جو سینکڑوں برسوں سے ایک دوسرے کے مذہب کو کوستے آئے ہیں، ایک دوسرے کے خداؤں کو نالائق کہتے آئے ہیں اور اسی سانس میں محبت کا پرچار کرتے رہے ہیں، کیا یہ ہماری کم عقلی ہے؟ نہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ بوڑھے اور ناکارہ اور بے اثر ہو چکے ہیں لیکن اپنی غلطیوں کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں، کیونکہ ہم نے ایک زندگی گزارا ہے اور اس کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے، اور جب اسے اسی طرح اپنے بچوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں تو ہماری آخری شکست میں بھی تسکین کی اچھی خاصی صورت نکل آتی ہے۔“ وہ پھر خاموشی سے جال پھینکتے ہوئے ملاحوں کے قریب سے گزر رہے تھے۔ چند لمحے تک رکنے کے بعد انیس الرحمان نے پھر اپنے مخصوص انداز میں تیزی اور جوش کے ساتھ بولنا شروع کر دیا: ”تمہیں پتا ہے جب سے منظم مذہب کی بنیاد پڑی ہے اسے کتنی بار ناجائز طور پر استعمال کیا گیا ہے؟ مذہب ہماری عقل کے راستے سے دل تک پہنچتا ہے اور وہاں اپنا قبضہ جما لیتا ہے۔ اسے کتنی آسانی کے ساتھ بھڑکایا جا سکتا ہے۔ آج تک کتنی جنگیں مذہب کے نام پر ہوئی ہیں، کتنے قحط پڑے ہیں؟ کیا صرف اس لیے کہ مذہب ہمیں محبت کرنا سکھاتا ہے۔

ہنہ!“ وہ نعیم کی طرف جھکا، ”ایک شے ہے عقل سلیم۔ کیا اسے بھی بھڑکایا جا سکتا ہے؟ کیا ہم ایسی سوسائٹی نہیں بنا سکتے جس کی بنیاد عقل سلیم پر رکھی گئی ہو، جس میں ہم اپنے ہر اچھے برے فعل کے لیے سوچیں اور فیصلہ کریں اور اس کے ذمہ دار ہوں؟ اچھائی اور برائی، غلط اور صحیح کا ایک عالمی معیار ہے جو انسانی عقل کے مطابق ایک سا ہے۔ ایک فعل، ایک قدم، ایک بات اگر اچھی ہے تو وہ مشرق اور مغرب اور شمال اور جنوب میں ہر جگہ اچھی اور درست ہے کیونکہ عقل سلیم نے اس کا فیصلہ کیا ہے اور عقل سلیم ہم سب میں ایک سی ہے۔ ضرورت مند کی مدد کرنا درست ہے، میرے لیے اور تمہارے لیے اور سب کے لیے، تم اس سے انکار کر سکتے ہو؟ میرے مذہب میں ہمسائے سے محبت کرنا درست ہے، میرے ہمسائے کے مذہب میں ایسا کرنا غلط ہے۔ لیکن میری اور تمہاری اور میرے ہمسائے کی عقل سلیم کے مطابق یہ درست ہے اور بالکل درست ہے۔ جب ہر کوئی اپنے اپنے لیے سوچے گا تو درست درست ہو گا اور غلط غلط۔ ”ہم سب“، اور ”ہم سب“ یہ جانتے ہیں کہ باغبانی کرنا درست ہے

اور کاہلی اور آرام طلبی نادرست - کیا صحیح فعل کے لیے ہمیں کسی اور شے کی ضرورت ہے ؟ کیا ہم سب کے لیے میٹھا میٹھا اور کڑوا ، کڑوا نہیں ہے ؟ ہے تو کیوں ؟ اس لیے کہ ہماری حس پر کوئی بندش نہیں ہے - جب ہماری عقل صحیح سالم ہوگی اور اسے کام میں لایا جائے گا تو ایک فعل کی نوعیت ہم سب کے لیے یکساں ہوگی ، اس میں کوئی تضاد نہ ہو گا اور اس سے کبھی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جاسکے گا - اس پر کوئی جنگ نہ ہوگی - آج ہماری سوسائٹی میں یہی خلا کافی ہے کہ ہم سوچنے سے معذور ہیں - جب ہر کوئی اپنے لیے سوچے گا تو مجلس بھرپور ہوگی ، تب کوئی حماقت باقی نہ رہے گی ، کوئی شکست باقی نہ رہے گی ، تب - - - " وہ الفاظ کی تلاش میں ہار کر خاموش ہو گیا -

"لیکن اس سے - - - فائدہ کیا ہوگا ؟" نعیم نے بغور سنتے ہوئے سوال کیا -

انیس الرحمان کی آنکھوں میں قدیم ، قدرتی ذہانت کی چمک عود کر آئی : "یہی تو ہماری شکست ہے عزیز دوست - برسوں ، بلکہ صدیوں کی ناکارہ تربیت نے ہمارے اندر نفع و نقصان کا ایک تباہ کن احساس پیدا کر دیا ہے اور اس سے بھی زیادہ خوفناک بات یہ ہے کہ یہ احساس انجانے طور پر ہمارے خدا کے ساتھ اور قدرت اور قسمت کے ساتھ وابستہ ہے - مجھے تم سے اس سوال کی توقع تھی - میں بھی یہی سوال کرتا ہوں - میں تم میں سے ہی ہوں - فرق صرف اتنا ہے کہ میں جواب دینے کی کوشش بھی کرتا ہوں - سنو - صحیح فعل اپنا فائدہ آپ ہے - صحیح اقدام سے ہم ماضی اور مستقبل دونوں کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں اور اس آزادی سے ہمیں وہ طمانیت ملتی ہے جو بڑے سے بڑے فائدہ سے بھی حاصل نہیں ہوتی - اور سب سے خوشگوار بات یہ ہے کہ ہم انصاف کی توقع سے بھی رہائی پالیتے ہیں - انصاف ہمارے یہاں پر ہے " ، اس نے پھر دو اٹھکیوں سے سر کو ٹھونکا ، "اور ہمارا خدا بھی یہاں پر سے اور سب کچھ یہیں پر ہے اور یہی کچھ ہے - اس کے باہر کچھ بھی نہیں ہے - صحیح فیصلہ - صحیح قدم - صرف اسی فعل میں ہماری نجات ہے - یہ لمحہ جس میں ہم زندہ ہیں ، اس سے ہم تسکین حاصل کرتے ہیں اور مکمل آزادی سے زندہ ہیں ، مستقبل ، انصاف ، فائدہ ، نقصان ، یہ سب ایک طویل انتظار میں شامل ہیں جو ہم پہ ایک عظیم اور لا حاصل خوف طاری کر کے ہمیں احمق اور ناکارہ بنا دیتا ہے - جب کوئی انتظار نہیں رہتا کوئی شکست بھی نہیں رہتی - کوئی بھی -

دونوں کافی دیر تک غیر یقینی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے - پھر انیس نے انجن کو گیئر میں ڈالا اور کنارے کی طرف رخ کر لیا -

جب وہ خاموشی سے پتھروں پر چلتے ہوئے اس جگہ پر پہنچے جہاں سے اٹھ کر گئے تھے تو دونوں بچے بھاگ کر انیس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے اور بلقیس جلدی جلدی اسے بتانے لگی کہ کس طرح ان کے جانے کے بعد دونوں کنڈیوں کو ایک ساتھ پھلیاں لگ گئی تھیں اور نوکر کو آواز دیتے

چپے چپے سے واقف اور کوٹھی کے کمروں سے مانوس ہو چکا تھا۔ دیواروں پر لٹکی ہوئی قدیم انگلستان کی تصویریں جن میں رنگ برنگے کپڑے پہنے گھڑ سوار درجنوں شکاری کتوں کے ہمراہ لومڑ کے شکار کو جاتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ اور قدیم گرجا گھر اور ہندوستانی راجاؤں کی تصویریں، جو اپنے انگریز مہمانوں کے ہمراہ ہاتھی پر سوار ہو کر شیر کے شکار کو جا رہے تھے۔ اور الماریوں میں رکھی ہوئی شیر، لومڑ اور پمچھلی کے شکار کے متعلق بیسیوں کتابیں جنہیں اب کوئی نہ پڑھتا تھا اور آتشدان پر رکھے ہوئے پتھر اور چینی کے پرانے محسمے اور ایک تانبے کا مہاتما بدھ۔۔۔ ان تمام چیزوں کے درمیان وہ پرانے باسیوں کی طرح پھرتا تھا اور انیس الرحمان کا گھوڑا اسے دیکھ کر خوشی سے ہنہناتا تھا۔ ان تمام برسوں میں روحانی طور پر وہ شاید انیس الرحمان سے اتنا ہی دور رہا تھا جتنا پہلے روز تھا لیکن اس دوران میں آہستہ آہستہ انیس اس کے لیے ایک قسم کا مادی سہارا بن چکا تھا جو عمر کے اس دور میں تھوڑی بہت طمانیت کا باعث ضرور تھا۔ وہ اس کے لیے عقل، عقل اصل اور عقل محض کی علامت بن چکا تھا جس کے ساتھ نعیم اپنی مایوسی میں بے طرح چمٹا ہوا تھا۔ اس سے مرعوب اور کسی حد تک خوفزدہ ہو کر چپ رہنا اس درجہ نعیم کی عادت میں داخل ہو چکا تھا کہ اب اس نے اس کی باتوں کو دھیان سے سننا بھی چھوڑ دیا تھا۔ روحانی ابتری کے اس دور میں اسے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ جہاں ڈرنے اور مرعوب ہونے کی اہلیت ہو وہاں محبت کرنے کی اہلیت نہیں رہتی، سچائی کو جانتے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ وہ اب محض اس علامت کے سہارے پر رہ رہا تھا جس کا کہ انیس الرحمان حامل تھا۔

انیس الرحمان میں ان چند برسوں نے بنیادی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اس میں ایک دم بڑھاپے کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے بال زیادہ تر سفید ہو چکے تھے اور اس کی مخصوص اعصابی قوت، جس نے اتنا عرصہ اسے جوان بنائے رکھا تھا، تیزی سے زوال پذیر تھی۔ اب اس نے باتیں کرنا کم کر دی تھیں اور زیادہ سے زیادہ وقت اپنے گھر والوں سے الگ اس کوٹھی میں اکیلا بسر کرنے لگا تھا۔ پہلے اس کے بیوی بچے ہر دوسرے ہفتے باقاعدگی کے ساتھ اس کے ہمراہ آیا کرتے، پھر مہینے دو مہینے کے وقفے پڑنے لگے، اب کئی کئی مہینے گزر جاتے اور وہ اکیلا یا صرف نعیم کی معیت میں آکر پڑا رہتا۔ اس کے باوجود دفتر میں اور گھر کے اندر اس کی کارگزاری میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ اسی مشین کی سی پھرتی اور باقاعدگی کے ساتھ دفتر کا کام کرتا اور گھر کی صفائی، بچوں کی تعلیم و تربیت اور بیوی کی ضروریات کے سلسلے میں اسی احتیاط اور شد و مد سے حصہ لیتا۔ اس کی زندگی میں جو مایوسانہ رنگ آگیا تھا اسے کبھی نعیم نے شدت سے محسوس نہ کیا تھا کیونکہ اس کے نظریات اس کے لیے مضبوط عادت بن چکے تھے جن کے ساتھ چمٹا رہنا اس کے لیے آسان اور قدرتی عمل تھا۔ یہ اس کی روزمرہ زندگی سے اسی طرح ظاہر ہوتا تھا جیسے کولہو کے گرد مستقل گھومتے رہنے کے نظریے سے سیلوں کی عقیدت ظاہر ہوتی

ہے ، جو کہ فی الحقیقت محض ایک عادت ہے ۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ نعیم نے اپنی اور اس کی طبیعتوں کے تضاد کو کبھی محسوس نہ کیا تھا ۔ وہ اپنی روح کی انکساری اور ذہن کے تکبر کے مقابلے میں انیس الرحمان کے ذہن اور روح دونوں کی رعونت کو کبھی نہ پہچان سکا تھا ۔ حتیٰ کہ ایک بار جب انیس نے بیٹھے بیٹھے چونک کر کہا تھا :

”نعیم ، زندگی ہمیں کس میدردی سے ضائع کر دیتی ہے !“ تو بھی نعیم کی سوچ حرکت میں نہ آسکتی اور اس نے اسے محض انیس کی دانائی کی ایک بات کے طور پر لیا تھا ۔ کہ وہ عادات ، جن سے ہم زندگی کی تشکیل کرتے ہیں ، اور علامتیں ، جن سے اسے قائم رکھنے کی سعی کرتے ہیں ، اس قدر پر فریب اور بے حقیقت ہوتی ہیں ۔

جب بادلوں کی آمد کے ساتھ ہوا تیز ہو گئی اور کھڑکیوں کے پردے اڑنے لگے تو انیس نے حقے کی نئی ایک طرف رکھ دی ۔

”ہم باتیں کرتے ہیں اور باتیں اور باتیں حتیٰ کہ ایک روز بیٹھے بیٹھے ہٹھائے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ اس قدر بیسود ہے اور یہ احساس بڑا خوفناک ہوتا ہے ۔ تمہیں کبھی ہوا ہے ؟ ۔ اس کے باوجود ہم چلتے جاتے ہیں ، منزل سے منزل کی طرف ، چہرے سے چہرے کی طرف ، بات سے بات کی طرف ، حتیٰ کہ ہم تھک جاتے ہیں اور اداس ہو جاتے ہیں اور ہمارے دل سے امن غائب ہو جاتا ہے ۔ پھر خاموش جنگلوں کی آرزو پیدا ہوتی ہے ۔ تمہیں پتا ہے دل میں کسی آرزو کا پیدا ہونا سکون کے کھو جانے کی نشانی ہے ؟ آرزو جو کبھی نہ کبھی حسرت بن جاتی ہے ۔ خاموش جنگل اور ساتھی کے طور پر ایک گھوڑا یا کتا ، اور چمکدار موسم ، اور خیال آرائی ، تاکہ ہم چلے جائیں چلے جائیں اور بڑی بڑی عظیم مقدس باتوں کے بارے میں سوچیں ۔ اس وقت ان بے شمار چھوٹی چھوٹی غیر ضروری باتوں کے لیے ہمارے دل میں نفرت پیدا ہوتی ہے جن میں ہم عمر بھر مصروف رہے اور ہم عظیم فکر کے لیے تڑپتے ہیں جو کبھی ہمارے ذہن میں پیدا نہ ہوئی ۔ ایک وقت آتا ہے جب ماضی کی چھوٹی سے چھوٹی بات ہمیں اداس کر دیتی ہے ۔ کوئی چہرہ ، کوئی نام ، کوئی لفظ ، کوئی نظر ، کوئی پرانی دُھن جو ہم نے کسی غیر آباد گلی میں سے گزرتے ہوئے دور سے سنی تھی ۔ ہم اس بچے کی طرح محسوس کرتے ہیں جو ہر وقت رونے کے لیے تیار رہتا ہے ۔

”دراصل ہم تھک چکے ہوتے ہیں ، اس مستقل عجلت سے جو ہماری زندگی میں راہ پا جاتی ہے ، جو مسلسل ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر مجبور کرتی ہے ، ان جگہوں پر لے جاتی ہے جہاں جا کر ہم کبھی خوش نہیں ہوتے ۔ دراصل ہم محض اکتا چکے ہوتے ہیں ، عمر بھر سے جو ہم نے جہالت میں بسر کی ، وہ گئے گزرے زمانے جو ہم نے ضائع کر دیے ، ہمارے خوف ، ہمارے جذبے ، ہماری اپنی جوانی اور بڑھاپا جو ہم نے بچوں کی طرح گزارا ، یا احمقوں کی طرح ، اس وقت سڑک پر جاتی ہوئی ایک بس بھی ہمیں سارا وقت یاد دلا دیتی ہے ، کہ ہم ایک گاڑی کی طرح

سرگرداں رہے جو اپنی لائتوں پر چلے جاتی ہے ، چلے جاتی ہے ، لائتیں جو اسے لیے جاتی ہیں ، پوچھے بغیر ، جانے بغیر ، پہچانے بغیر ، ہمیں ہانکا جاتا ہے ، ہم ہنکے جاتے ہیں ۔ اپنی خوراک ، اپنی باتوں اور اپنے جذبوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ۔ ہماری کتابیں ، ڈگریاں ، بہترین درزیوں کے ہاں کے سلے ہوئے سوٹ جن کا ذکر کرنے سے ہم کبھی نہیں چوکتے ، خوشنما رنگوں کی ٹائیاں ، ٹوپیاں اور خوشبوئیں جو ہم نے اعلیٰ درجے کی دکانوں سے خریدیں ، سب کو کندھے پر لادے ، اپنی ساری امارت کو اٹھائے ، ہر قسم کے خیال کو قبول کرتے ہوئے ۔ ۔ ۔ خیال جو پڑاؤ سے پڑاؤ تک غائب ہو جاتا ہے ۔ ۔ ۔ کھاتے ، کھاتے اور کھاتے ہوئے ، اور باتیں کرتے ہوئے ۔ باتیں ؟ ان جگہوں کی جو ہم نے دیکھیں ، ان چیزوں کی جو ہماری ملکیت ہیں ، ہماری رائیں اور قیاس آرائیاں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا ، جو کسی کے لیے اہمیت نہیں رکھتیں ، ہمارے اپنے لیے بھی نہیں ۔ اس کے باوجود انہیں اخلاق اور توجہ کے ساتھ سنا جاتا ہے اور جواب میں کچھ کہا جاتا ہے اسے ہم توجہ اور اخلاق کے ساتھ نوٹ کرتے ہیں ، انہیں اہمیت دیے بغیر ، ان کی پروا کیے بغیر ، تمہیں پتا ہے دنیا میں ہم کتنی نرمی ، کتنے اخلاق ، کتنی مکاری سے ایک دوسرے کے ساتھ پیش آتے ہیں ۔ ہم دنیا بھر کا سفر کرتے ہیں اور رائیں کیا ہوتی ہیں ؟ یہی کہ روضہ تاج محل خوبصورت عمارت ہے اور چین کے مجلسی حالات بہتر ہو رہے ہیں یا نہیں ہو رہے ، اور دنیا میں اچھے شاعر پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں ۔ ہم انہیں بار بار دہراتے ہیں حتیٰ کہ اپنی تقریر میں ماہر ہو جاتے ہیں ، ٹورسٹ گائیڈ کی طرح ، پھر ہم اس کا استعمال شروع کرتے ہیں ۔ ہر ایک کے پاس اپنا اپنا سکہ بند طریقہ ہے ، برسوں کے تجربے اور مشق کے بعد اپنا ہوا (ذریعہ ، غیر شخصی سرسری پن ، یا محتاط شخصی اور منہمک رویہ ۔ ہم بہر حال ہر منزل پر ، ہر طریقے سے اپنے آس پاس کے لوگوں کو ہم خیال بنانے کی ، دوسرے لفظوں میں انہیں مرعوب کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں ، ان کی کوئی پروا کیے بغیر ، اور مستقل یہ جاتے ہوئے کہ ہماری ذرہ برابر پروا ان کو نہیں ہے ۔ ہم اپنی زندگی کے خلا کو چھوٹی موٹی باتوں سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ، گفتگو جو تسکین بخش بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ گمراہ کن ۔ اور پھر وہ وقت آتا ہے ، وہ جب ہم تھک جاتے ہیں اور تپتے رہ جاتے ہیں اور بس کا تیل ختم ہو جاتا ہے او ہمارا سارا بوجھ سڑک کے کنارے بکھر جاتا ہے ، کچھ مردہ کچھ نیم مردہ ، اور دفعتاً حقیقت ہمارے سامنے آ جاتی ہے ، کہ یہ سب اس قدر بے سود تھا ، سب ! کہ بالآخر ہم وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں سکون نہیں ہے اور ہم واپس نہیں جاسکتے ، کہ جہاں پر محض نقصانِ عظیم کا احساس ہے ، کہ ہم پرانی بس کی طرح بد صورت اور بے کار ہیں اور ان چاہے ، ان جانے سڑک کے کنارے کھڑے ہیں ۔ بختاور ہیں تو توڑ پھوڑ کر دوبارہ ڈھالے جائیں گے ، بد بخت ہیں تو محض منظر انداز کر دیے جائیں گے ۔

”اب ہم پریشان ہیں ، تنہائی کے خوف سے ہراساں ہیں ، تنہا ہیں ، بیحد تنہا ہیں ۔ کیوں ؟ کیا ہم صرف اس دن کے لیے اتنی مدت سے رہتے آ رہے تھے ؟ ہمارا نصب العین ، ہمارے الفاظ ، احساسات ، جذبات ، وہ کام برسہا برس کی مشق سے جن میں ہم نے مہارت حاصل کی ، دور دراز کے سفر ، دوست ، فہم جو ہم نے تقریر اور میل جول کے ذریعے تیز کیا ، ہماری ہر دلچیزی جو ہمارے اردگرد اور ساتھ ساتھ چلتی تھی ، سب ختم ہو گیا ؟ کیوں ؟ کیوں اب ہم سوچنے سے قاصر ہیں کہ کبھی سوچ ہی نہیں پائے ۔ اب ہم جاتے ہیں ، جیسا کہ ہم کئی اور باتیں جاتے ہیں ، کہ ہم نے جس چیز کی تلاش کی اسے پایا اور جس کے لیے اب حیران و پریشان کھڑے ہیں اس کی تلاش ہی میں کبھی نہ نکلے ، صاف سیدھی بات ہے ۔ ۔ چنانچہ اب تم چین کی بنسری بجاؤ اور قناعت سے بیٹھ کر خاتمہ بالخیر کا انتظار کرو ، انتظار کرو اور نچلے بیٹھو ، نچلے بیٹھو کہ یہی اصل مقام ہے ۔ ۔ پر چین کی بنسری بجائے نہیں بجتی اور ہم انتظار نہیں کر سکتے ہم جاتے ہیں کہ جتنے بھی انہماک اور لاپرواہی اور صبر کے ساتھ انتظار کریں جب موت آئے گی تو ہمیں پریشان کر دے گی ، جیسے کہ یہ ہر کسی کو کر دیتی ہے ۔ باوجود ساری باتوں کے ، جب یہ آتی ہے تو خوف زدہ کر دیتی ہے ۔ زندگی میں پہلی بار ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ایک چمکیلی خوشگوار صبح کو میں اپنے پائیں باغ میں کھڑا خرگوشوں اور مرغیوں کو ناشتہ کھلا رہا ہوں ، پرانا کڑوا تباکو پی رہا ہوں اور اپنے پوتے پوتیوں کو سبزے پر کھیلتے کودتے ہوئے دیکھ رہا ہوں ۔ میری طبیعت میں ٹھہراؤ اور ربودگی آچکی ہے اور میں سنبھل سنبھل کر اطمینان سے چلتا پھرتا ہوں ۔ نوجوان آدمی کام پر جاتے ہوئے پاس سے گزرتے ہیں اور جھک کر سلام کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ”قابلِ عزت بزرگ ۔ سلیقے سے بسر کی ہوئی زندگی “ وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں ۔ پھر سامنے سے ایک اور چلا آتا ہے ۔ ایک سفید سر والا دانا شخص ، چھڑی کے سہارے اپنے آپ کو سنبھالے ، وقار اور اطمینان کے ساتھ چلتا ہوا ۔ نوجوان آدمی جھک کر سلام کرتے ہیں اور پہلی بات آپس میں دہراتے ہیں ۔ وہ اخلاق سے مسکرا کر جواب دیتا ہے اور میرے سامنے آکر چند منٹ کے لیے رک جاتا ہے ۔ ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں اور موسم کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی صحت کے متعلق پوچھ گچھ کرتے ہیں ، پھر خاموش ہو جاتے ہیں ۔ اب کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے ۔ ساری باتیں اتنی غیر ضروری معلوم ہوتی ہیں ۔ خرگوشوں کا ناشتہ اور چمکدار موسم اور دو خوشنما ، سبے سجائے بڈھے ، خالی الذہن اور مطمئن ، ایک دوسرے کے ڈھونگ کو جاتے ہوئے اور چھپائے ہوئے ، بلا وجہ نادام اور خوش مزاج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر وہ بات کرنے کے انداز میں کھنکارتا ہے اور محض ہاتھ سے سلام کر کے چلا جاتا ہے ۔ میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا لیکن میں جانتا ہوں اور ذہن کی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا ہوں ۔ نہایت سلیقے سے خالی کی ہوئی ایک زندگی ، بے وجہ ، بے جواز ، جانتا ہوں کہ وہ

بھی مجھے دیکھ رہا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جانتے ہیں پر کبھی تسلیم نہیں کرتے۔ اس طرح ہم بھگتتے ہیں۔ اس طرح۔۔۔۔۔“

باہر بارش تیزی سے شروع ہو چکی تھی اور ہوا کے زور سے اندر آ رہی تھی۔ نعیم اٹھا اور ایک ایک کر کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے لگا۔ اس نے اب چھڑی کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور چال کی لغزش سے تقریباً آزاد ہو چکا تھا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر بال گھنے اور برف کی طرح سفید تھے اور اس کے کالوں کی کھال لٹکتی جا رہی تھی۔ آخری کھڑی بند کرنے سے پہلے وہ کئی لمحے تک باہر باغ کی تاریکی میں دیکھتا رہا جہاں بار بار بجلی چمک رہی تھی۔

”آج بہت سارے کچے آم گریں گے۔“ اس نے کہا۔

بجلی کی چمک بیحد صاف تھی اور اس میں سارا باغ، طوفان میں جھولتے ہوئے درخت اور بارش کے قطرے ایک لمحے کے لیے جاگ اٹھتے تھے۔ ساربانوں کا ایک چھوٹا سا خاندان ابھی ابھی کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ انہوں نے برآمدے کے ستونوں سے اپنے اونٹ باندھ دیے تھے اور اب کونے میں دبک کر آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے ان کے سروں پر پرندے، جو درختوں پر سے جان پچا کر بھاگ آئے تھے، چوں چوں کر رہے تھے۔ نعیم کو ایک بہت پرانی بات، جو ایک مرتبہ اس کے ذہن میں سے گزری تھی، یاد آئی اور وہ آہستہ سے مسکرایا۔ ”تم سورج کی تپش سے بچنے کے لیے راتوں کو سفر کرتے ہو اور پھر بارش آ جاتی ہے۔ خدا حافظ، رات کے آباد کارو! تمہارا گھر کہاں ہے؟ اب تم اپنے لیے بارش کا ایک گھر بناؤ۔“ وہ دوبارہ مسکرایا۔ ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی درزوں میں داخل ہو رہی تھی اور بارش کے قطرے شیشوں پر سر مار رہے تھے۔

”رات کے باشندو، اب تم اپنے لیے۔“ اس نے دہرایا۔

دیوار پر نشاۃ ثانیہ کی یادگار رنگین میڈوا جو بڑی دیر سے ایک کیل کے سہارے جھول رہی تھی کھٹاک سے گری اور ٹوٹ گئی۔ شیشوں پر بارش زیادہ زور سے ہونے لگی۔ انیس الرحمان نے پھر بولنا شروع کر دیا:

”وہ عظیم شخصیتیں جو جنم نہ لے سکیں۔ جنہیں گھر باہر کے، روز مرہ کے چھوٹے بڑے کام کرنے پڑے، جن کا وقت اسی طرح ضائع ہو گیا۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ ضابطہ جو ہم نے اپنے اوپر عائد کر لیا ہے اور جس کے تحت ہم زندگی بسر کرتے ہیں کس کام کا ہے۔ حصول مسرت کا یہ معیار جو ہم نے قائم کیا ہے یا جو قائم کیا کر لیا، ہمیں ملا ہے کس حد تک صحیح ہے۔ ہم جو اتنا دکھ سہتے ہیں، اتنی محنت کرتے ہیں، اتنے جھوٹ بولتے ہیں، اتنی چاہتیں اتنی حسرتیں دل میں دبائے رکھتے ہیں، اتنی طاقتور خواہشیں پوری نہیں کر سکتے کہ دل و دماغ لگی روکی ہو جاتے ہیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے ان لوگوں سے نہیں مل سکتے جن سے بہت ملنا چاہتے ہیں، دوستی کرنا چاہتے ہیں یا ہمدردی کی توقع رکھتے ہیں، یا ایسے لوگوں کو نہیں

مل پاتے جن کو ہم نہیں جانتے لیکن جن سے مل لیتے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان جگہوں پر نہیں جاسکتے جن کا صرف نام سن رکھا ہے، جو کچھ سوچتے ہیں کہہ نہیں سکتے، جو کہتے ہیں کہ نہیں سکتے، قطعی طور پر برے آدمی سے قطع تعلق اور اچھے آدمی سے دوستی نہیں کر سکتے، غرضیکہ کسی ڈھنگ سے بھی زندگی کو بہتر طور پر بسر نہیں کر سکتے حالانکہ ہم میں سے کتنے ہی ہیں جو وہ سب کرنا چاہتے ہیں جو نہیں کر سکتے اور وہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتے جو کر رہے ہیں، تو چاہنے اور کرنے میں یہ تضاد، یہ بعد کیوں ہے؟ اور اس سے کیا حاصل ہے اور یہ مصنوعی ہے ایک حقیقی؟ کیا یہ سب کچھ جو ہم بھگتتے ہیں محض اس لیے ہے کہ ہم اپنے گھر کو، یا اپنے خاندان کو، جو چند افراد پر مشتمل ہوتا ہے، یکجا رکھنا چاہتے ہیں، یا اپنی جائیداد کو، جس میں کھانا پکانے کے برتن، کپڑے اور چند آسائش کی اشیا ہوتی ہیں، فبضے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم اپنی شخصیت کو محض اس لیے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ بنیادی ضرورتوں کو پورا کر سکیں، اپنی علیحدگی، اپنی انفرادیت کو محض اس لیے ضائع کر دیتے ہیں کہ کمتر انسانی جذبوں کی تسکین کر سکیں۔ کیا ہمیں ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق معلوم ہے؟ کیا ہم مسرت کا مطلب جانتے ہیں، علم اور جہالت میں کیا ہم تمیز کر سکتے ہیں؟ کیا محض اس لیے اس قدیم، انسان کش ضابطے کو برقرار رکھے ہوئے ہیں کہ اس سے شخصی غرور کو جلا ملتی ہے؟ کہ ہم اپنے حقیر گھروں اور خاندانوں میں ایک کھوکھلی، مغرور اور محتاط زندگی بسر کرتے رہیں۔۔۔ یا وہ نوجوان، جو ابھی زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں، ایک ایسے ہی مستقبل کی امید میں عمر بھر خود اپنے ظلم سہتے رہیں۔ اپنے مکان کو گرنے سے بچانے اور کنبے کو خوراک مہیا کرنے کی خاطر روزانہ زندگی کے چھوٹے موٹے کام کرتے رہیں اور خوشی کے بجائے غرور اور تنفر حاصل کریں۔ اور پھر ہم میں سے چند ایک ان کاموں میں کمال حاصل کر لیں اور نمایاں مقام پر پہنچیں اور حاسدانہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں اور اس طرح زیادہ مغرور اور زیادہ ناخوش ہو جائیں اور اپنے ساتھی لوگوں میں گھلنے ملنے کی بجائے انہیں مرعوب کرنے کی طرف مائل ہوں اور بدلے میں ان سے حقارت حاصل کریں۔ عوامی زندگی کے یہ نمایاں لوگ، سیاست دان اور تعلیمی اداروں کے سربراہ اور بڑی عدالتوں کے منصف، انکی زندگی بھر کی کمائی کیا ہے؟ حقارت اور عمومیت۔ عمومیت اور حقارت! کیا وہ بس ان دو چیزوں کے لیے ایک اتہائی مردہ دل اور پر کوفت زندگی بسر کرتے ہیں؟

”اگر ہم ایک اونچی چٹان پر اکیلے بیٹھ کر سوچیں تو ہمیں پتا چلے گا کہ خوشی تو ایک معمولی شے ہے۔ اور اسے حاصل کرنا تو بڑا آسان ہے، یعنی آپ اسے محض چٹان پر چڑھ کر بھی حاصل کر سکتے ہیں جب کہ آپ تنہا ہیں اور آپ کے ساتھ آپ کی ساری شخصیت ہے ساری انفرادیت ہے، آپ کی عظمت اور نیکی اور عقل ہے اور آپ ہر لحاظ سے مکمل ہیں اور خوش قسمت ہیں اور آپ کو بھوک نہیں لگ رہی چنانچہ آپ ابھی کچھ دیر اور یہاں رک سکتے ہیں اور زندگی کے عظیم

مقدس مسائل پر ، محبت اور موت پر غور کر سکتے ہیں اور دیانت داری سے اپنی رائے وضع کر سکتے ہیں ۔ اس وقت آپ کے پاس وہ بیش بہا آزادی کا احساس ہوتا ہے جس کے لیے ، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے ، کہ ہم پیدا کیے گئے ہیں ، اور ہم سوچتے ہیں کہ تھوڑی دیر میں نیچے جائیں گے اور فلاں فلاں کام کریں گے یا نہیں کریں گے کہ ان کا کرنا نہ کرنا ہمارے اختیار میں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر خوفناک بات یہ ہے کہ جب ہم نیچے جاتے ہیں تو ایک ایک کر کے ساری چیزیں ساتھ چھوڑ جاتی ہیں اور آخر میں ہمای وہی پرانی ، کمزور ، گمنام شخصیت رہ جاتی ہے جس کے سامنے روزانہ معمول کے ایسے کام ہوتے ہیں جو ہر حالت میں کرنا ہوتے ہیں اور جو اپنے معمولی پن کے باوجود ہمارے اختیار سے باہر ہوتے ہیں ۔ اس طرح ہم آناً فاناً عمومیت کے اس سمندر میں گم ہو جاتے ہیں جو کچھ دیر قبل ہم نے قائم کیا تھا ، اور ایک دوسری قسم کی مسرت ، جو تقابل اور کبر نفس سے پھوٹتی ہے ، ہم پر قبضہ کر لیتی ہے ۔ یہ زندگی کی سفاکی کا ایک منظر ہے کہ ہم جانے بوجھے اور محسوس کیے بغیر ، تیزی کے ساتھ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف سفر کرتے ہیں ۔

”تو کیا طمانیت اور عقل و دانش کی یہ قربانی جو دی جاتی ہے حق بجانب ہے ؟ وہ بے پناہ جرم و ستم جو ہم جھیلتے ہیں ۔ کیا ہماری زندگی ، ساری زندگی اس قابل ہے کہ اس کے لیے اتنی دل شکنی قبول کی جائے ۔ بتاؤ ۔ کیا ساری انسانی زندگی کی کوئی وجہ ہے ؟ ۔ ۔ ۔“

وہ دیر تک یونہی باتیں کرتا رہا اور بارش رات بھر درہچوں اور روشندانوں کے شیشوں پر سر مارتی رہی ۔

(۴۳)

اس اتوار کو انیس اور نعیم شہر لوٹ آئے ۔ نعیم کو روشن محل کے پرانے دروازے پر اتارتے وقت انیس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور اس کی طرف جھک کر ہنسا ۔ نعیم نے اس کی آنکھوں کی قدیم حیوانیت اور تند ہنسی کو ہلکی سی بے چینی کے ساتھ محسوس کیا ، لیکن اب وہ اس کی طبیعت کے میلان سے تقریباً واقف ہو چکا تھا ۔ اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور اندھیرے میں دور تک اس کی گاڑی کو بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا ۔ شام پڑ چکی تھی ۔ گیٹ کے اندر داخل ہو کر نعیم نے دیکھا کہ بڑے لان میں نجی کے اجباب کا ہجوم میزوں کرسیوں اور سبزے پر بیٹھا تھا ۔ یوکلپٹس کی شاخوں میں سبز رنگ کا بلب جل ہرا تھا اور سبزے پر حسب معمول کئی جگہ پر ایک ساتھ باتیں ہو رہی تھیں ۔ ایک طرف دو لڑکیاں تیز روشنیاں جلائے ییڈمنٹن کھیل رہی تھیں ۔ لان کے کونے میں رکھوالے نے گرے ہوئے پتوں

کو اکٹھا کر کے جو ڈھیر لگایا تھا رات کی بارش میں بھیگ گیا تھا اور اس پر چڑھا بادامی رنگ کا ایک چھوٹا سا سفیس کتا بیٹھا تھا۔ اس وقت وہاں سے گزرتے ہوئے برمن جی کی نگاہ اس تنہائی پسند کتے پر پڑی اور وہ جھک کر اس سے باتیں کرنے لگے۔ خلیق جانور شائستگی اور اکتاہٹ سے منہ اٹھا کر ان کی باتیں سننے لگا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے نعیم کو کسی نے نہ دیکھا اور وہ خالد، فے، برمن جی اور کیپٹن مسعود کو پہچانتا ہوا اپنے کمروں کے طرف چلا گیا۔ اس کے برآمدوں میں کسی نے روشنی نہ جلائی تھی۔ چند لمحوں تک بجلی کے بٹن پر ہاتھ رکھے کھڑے رہنے کے بعد وہ اندھیرے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے سامنے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نوجوان لوگ تھے، زندگی اور حسن سے بھرپور، سارے وقتوں، سارے جذبوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے کے اہل، اس نے بیٹھے بیٹھے سوچا، امید اور انتظار کے حامل، اندیشوں سے پاک۔۔۔ ابھی اندیشے آئیں گے، کہ ان کا بھی وقت مقرر ہے۔ اس نے بھنجنجھلا کر خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ پھر اسے وہ مردہ پرندے یاد آئے جو اس نے انیس کے باغ میں دیکھے تھے جو رات کے طوفان میں مرے تھے جنہیں رکھوالے نے جھونپڑے کے پچھواڑے میں اکٹھا کر دیا تھا۔ اس نے اس خیال کو بھی ذہن سے سے نکال دیا۔ موسم میں برسات کا مخصوص جس تھا اور سامنے وہ سب آم کھا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ باتیں! صرف نجمی خاموشی سے اپنا کینوس سنبھال رہی تھی۔

نجمی! نجمی!! اس نے چپکے سے دہرایا۔ دفعتاً سناٹا چاروں طرف پھیل گیا اور قضا میں خاموشی گونجنے لگی اور بے آواز خیالی پرندے ادھر سے ادھر آنے جانے لگے۔ ادھر سے ادھر۔ اس نے سربالا کے ادھ بنے پورٹریٹ کو لیزل پر سے اتارا اور لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر وہ میز سے اتر کر خالد اور فے کے پاس گھاس پر بیٹھ گئی جو پچھلے دو گھنٹے سے الجھ رہے تھے۔ دنیا بھر کی شاعری زیر بحث تھی۔

”ایلیٹ۔ ایلیٹ۔ ایلیٹ۔“ فے نے برا سامنہ بنا کر کہا، ”دیوانہ تشبیہ بھار۔ وہ تو عقاد کچھ کچھ ڈھنگ کا ہے شاعر واع کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اس کا وہ دوست، کیا نام ہے اس کا بھلا سا۔“

”پاؤنڈ؟ ایڈرا پاؤنڈ؟“

”ہاں وہ۔ ارے بھئی واہ، کیا ایک سے ایک بڑھیا آدمیوں کو شاعر بنا رکھا ہے اللہ میاں نے۔ جنے بیٹھے بیٹھے کیا لکھتے رہتے ہیں۔“

”شاید ایک دوسرے کو خط لکھتے ہیں۔“ نجمی نے تجویز پیش کی۔ ”ارے ہاں، اور بعد میں ان کی ذاتی خط و کتابت کو شائع کر دیا جاتا ہے اور شاعری سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔ اجی اللہ کیا دقیق سببلمزم ہے اعلیٰ درجے کی ان دونوں حضرات کی جس پر خالد صاحب سر دھنتے ہیں۔“

فے اور نجمی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

”یہ تو نتیجہ نکلتا ہے سنجیدہ موضوعات پر لڑکیوں کے ساتھ بحث کرنے کا،“ خالد نے

کہا، ”پھبتی پہ اتر آتی ہیں۔ یہ تو اوقات ہے۔“

”دراصل خالد کو شاعری واعری کا کیا پتا فے ڈیئر۔“ نجمی نے رازدارانہ طور پر کہا، ”یہ

شرارت ساری سپاہی شاعر کی ہے۔ وہ جس شاعر کو گرو مانتا ہے خالد صاحب بھی کمالِ سعادت

مندی سے اس کے چیلے بن جاتے ہیں۔“

”بھئی واہ، کیا روحانیت ہے۔ سپاہی شاعری کہتا ہے“ فے نے بات جاری رکھی۔

لیکن نجمی نے دیکھا کہ سپاہی شاعر ان سے دور سبزے کے کنارے کنارے۔۔۔ اکیلا

چل رہا تھا، اپنے مغرور سر کو اونچا کیے، اوپر اوپر دیکھتے ہوئے، اپنے اس مخصوص انداز میں جس

کے وجہ سے وہ اس سے اتنا جلتی تھی۔ پھر اس نے اپنے ارد گرد بیٹھے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے

خوش باش لوگوں پر نگاہ ڈالی اور اسے کسی شے کا تکلیف دہ احساس ہوا، کسی ایسی چیز کا جو آج

ہی ان کے درمیان پیدا ہوئی تھی، کہ وہ درحقیقت خوش نہیں تھے کہ وہ گہری مانوسیت اور

گھلاوٹ جو پرانے دوستوں میں ہوتی ہے ان کے درمیان سے اٹھ چکی تھی اور اس کی جگہ دبی دبی

بے اعتمادی تھی، اندیشہ تھا، کہ وہ اس پر خطر احساس کو، جو آپ سے آپ پیدا ہو گیا تھا،

چھپانے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے اور جان بوجھ کر چہروں پر شگفتگی پیدا کیے بیٹھے تھے۔

دفعاً وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے آپ کو بیحد غیر محفوظ خیال کیا اور گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کی طرف بڑھتے ہوئے نجمی نے سوچا: باوجود اس کے، جنے کیسی۔۔۔ دلکشی ہے

اس شعر میں!

”ہلو کپتان صاحب۔۔۔“ اس نے کہا۔

”ہوں؟“ وہ چونک پڑا۔

”ہلو۔“ نجمی نے مری ہوئی آواز میں دہرایا۔

”اوہ۔۔۔ ہلو۔“ اس نے جھینپ کر کہا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

”ٹیلیفون کا انتظار کر رہا تھا۔“

”روز ٹیلیفون کا انتظار کرتے ہیں؟“ نجمی نے اکتا کر سوال کیا۔

”ہوں؟ ہاں۔ مجھے یونٹ چھوڑنے کا حکم نہیں ہے۔ لیکن میں یہاں آ جاتا ہوں اور

انتظار کرتا رہتا ہوں انہی دنوں میں شاید فساد ہو جائے، حالت کا تمہیں پتا ہی ہے۔ میرے

اردلی کو معلوم ہے۔ نمبر۔“

برسات کی گرم، مرطوب ہوا ان کے بال اڑاتی رہی۔

”اس کے باوجود یہاں سبزہ خشک ہے، اور خاموش! یہاں پر سکون ہے۔“ اس نے

آہستہ سے کہا -
سکون سکون سکون - سکون کہاں پر ہے ؟ نجمی نے آزرگی سے سوچا - پھر اس نے
شکفتگی پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھی : کچھ نئے شعر ہوئے ؟

وہ خاموش رہا -
”کچھ بھی نہیں ؟“ اس نے بشاشت سے پوچھا - ”کوئی اوٹ پٹانگ نظم ؟ یا بیت یا
دوہایا - - -“

وہ خاموش ہو گئی - اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بھی نہیں سن رہا ، شاید کچھ بھی نہیں
دیکھ رہا - محض آنکھیں کھولے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے - اس نے رنج کے مارے منہ
پھیر لیا -

”میں ناشتہ کرتا ہوں ، پریڈ دیکھتا ہوں ، دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں ، سو جاتا ہوں - سہ پہر
کی چائے پیتا ہوں ، اخبار پڑھتا ہوں - یہاں آجاتا ہوں اور ٹیلیفون کا انتظار کرتا ہوں - میں
ان سب سے واقف ہوں - پچھلی بہت سی زندگی ایسا ہوتا آیا ہے - کل بھی ٹھیک ایسا ہی ہو
کا اور پرسوں اور اترسوں - - - میں ان سب سے اچھی طرح واقف ہوں - آپ لوگ ایلٹ
کی بات کر رہے تھے ؟“

”میں نے اپنی زندگی کافی کے چمچوں سے ماپ کر رکھی ہے -“
ہا ہا - تم میرے دل کی بات کیسی آسانی سے جان لیتی ہو -
”برمن جی کہہ رہے تھے کہ وہ جو بڑے آرٹسٹوں میں سچائی کو جاننے کی جبلی قوت ہوتی
ہے نا مجھ میں بدرجہ اتم موجود ہے -“ نجمی نے رازدارانہ لہجے میں کہا -
”برمن جی ؟“ مسعود بے خیالی سے ہاتھ اٹھا کر اس کی پشت پر دیکھنے لگا - ”یہ میں
ہوں - میں حقیقت ہوں -“ وہ زبرد لب گنگنایا - پھر چلتا چلتا رک گیا -
تم تصویروں میں دلچسپی کیوں لیتی ہو ؟“ اس نے تقریباً درشتی سے پوچھا -
”کیوں لیتی ہوں ؟“

”ہاں ، انسانوں سے زیادہ - بتاؤ انسانوں سے زیادہ کیوں لیتی ہو - - - تم تصویروں
میں دلچسپی ایسے ؟“

وہ سراسیمگی سے اسے دیکھتی رہی - وہ ذرا نرم پڑ گیا -
”دنیا میں اور کچھ بھی نہیں ہے جیسے - کیوں - کچھ ہے ؟“
”مثلاً - -“

”مثلاً میں -“ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اس کے سامنے جاکھڑا ہوا - وہ اس کے لمبے
تڑنگے سائے میں چھپ گئی -

”تم؟“

”ہاں میں - اور میں ایک حقیقت ہوں - میں کوئی کہانی یا رومانس نہیں ہوں - تم نے کبھی میری موجودگی کو محسوس کیا ہے؟ تم نے کبھی سوچا کہ میں یہاں محض تمہارے لیے آتا ہوں - اور ٹیلیفون کا انتظار کرتا رہتا ہوں - تم جو تصویریں بناتی رہتی ہو - اور - - اس نے غصے سے ہاتھ ہلایا -

چند طویل لمحے سکتے میں گزر گئے -

”اوہ -“ پھر نجمی نے گہرا سانس چھوڑا، ”بس یہ بات ہے؟ اتنی بار بتا چکے ہو، پھر پھر کیا ضرورت؟“

”تو پھر؟“ وہ ضدی لہجے میں بولا -

”ارے بھئی کوئی اور بات کرو -“ نجمی نے اکتا کر کندھے ڈھیلے چھوڑ دیے، تم تو اتنے دلچسپ آدمی ہو سکتے ہو اگر چاہو تو - - مسعود!“

اس نے جیبوں سے ہاتھ نکال کر پیچھے باندھ لیے اور اس کے ساتھ چلنے لگا - برآمدے تک جا کر وہ پلٹ آئے - مسعود تیز، لیکن معمولی لہجے میں، جس میں ہلکا سا تاسف کا رنگ تھا، باتیں کرنے لگا -

”یہ سب بکو اس ہے نجمی - یہ سارا آرٹ اور ادب تمہاری دنیا میں فیشن کے طور استعمال ہوتا ہے - نہ تم آرٹسٹ ہو نہ میں شاعر ہوں - تمہارا وہ بڑھا استاد بھی محض پیشہ ور کاریگر ہے جو ایسے گھرانوں میں ڈرائنگ کے اصول پڑھا کر روزی کماتا ہے - ہم سب چھوٹے چھوٹے معمولی آدمی ہیں جو کچھ بھی نہیں کر سکتے - لطیف جذبات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - اور محبت؟ ہنہ، ہم محض اپنے آپ کو سنبھالنے احتیاط سے زندگی بسر کر رہے ہیں - محض - - -“

نجمی نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا، اس وقت، نہ چاہنے کے باوجود، اس کے دل میں مسعود کے خلاف پرانا تعصب بیدار ہوا - کہ وہ ان میں سے نہیں تھا، کہ سارے لوگوں، ساری چیزوں کے بارے میں اس کا رویہ، اس کی ساری تربیت قطعی مختلف تھی - کہ وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتا تھا -

”میرا جی چاہتا ہے نجمی کہ ایک کتاب لکھوں جس میں کردار اپنی بات چیت کے دوران پرانے آرٹسٹوں، پرانے ادیبوں کا تذکرہ کریں، جیسے، جیسے - مثلاً دوستو و سکی کے کردار گوگول کا ذکر کرتے ہیں یا - لیکن ہم کن کا ذکر کریں گے؟“ اس نے غور سے ہتھیلی میں دیکھتے ہوئے کہا، ”ہمارے پاس کیا ہے؟“

”چلو وہاں چلیں -“ نجمی نے کہا - پھر وہ اسے سبزے کے کنارے ٹہلتا ہوا چھوڑ کر باقی سب لوگوں کے پاس لوٹ آئی -

برمن جی نے اس کا کینوس لپیٹ کر اپنی جگہ واپس رکھ دیا۔ ”سر نہیں آئی۔“ انہوں نے آہستہ سے سوال کیا۔

یہ سوال سب کے سروں پر ایک دم پھٹ پڑا اور وہ خاموش ہو گئے۔ انہیں خیال ہوا کہ وہ اس وقت کا سر شام سے انتظار کر رہے تھے کہ جب وہ اپنی لا تعلق اور بشاشت قائم رکھنے کی ساری کوشش چھوڑ کر اطمینان سے بیٹھ جائیں گے۔ چند ایک نے گہری طمانیت محسوس کی، چند ایک بے چین ہو گئے۔ مسعود آکر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”آپ جانتے ہی ہیں حالات خراب ہو رہے ہیں۔ بٹوارہ ہونے والا ہے۔ شاید فساد بھی ہو جائے۔“ اس نے معمولی انداز میں برمن جی سے کہا۔

وہ شدر کھڑے سب کا منہ دیکھتے رہے۔

دو اور سٹنگز میں مکمل ہو جاتی۔ ”نجی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

”بلاسٹرز کا تو مسوری میں انتظار ہو رہا تھا۔“ دوسرے کونے سے فرحت نے، جو ابھی ابھی پہاڑ سے لوٹی تھی، بات کرنے کی کوشش کی۔

لیکن سب خاموش تھے۔ دھماکے سے پھٹنے والی خاموشی کے درمیان ہر ایک اپنے آپ کو بیحد مضحکہ خیز محسوس کر رہا تھا۔ جب کوئی خاموشی کو توڑنے کی کوشش میں کوئی غیر ضروری سی بات کرتا تو سب چپ چاپ اس کی طرف دیکھنے لگتے، جو کہ عام طور پر ان کے درمیان سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

”آپ بھی تو ہندو ہیں۔“ مسعود نے کہا۔

”میں۔۔۔ آں؟“ برمن جی بوکھلا گئے۔ بھر آہستہ آہستہ ان کے عمر رسیدہ چہرے پر اداسی پھیل گئی۔ ہاتھ ہوا میں اٹھا کر وہ آہستہ آہستہ بولے: ”میں اگر تمہارے گھرانے میں پیدا ہوا ہوتا تو یقین کرو کہ اسی جوش و خروش، تعصب اور ایمان کے ساتھ تمہارے مذہب کی پیروی کرتا اور اس خاطر مرنے مارنے پر تیار ہو جاتا۔ تم بتاؤ، اگر میرے گھر میں پیدا ہوئے ہوتے تو کیا میرے ماں باپ کے مذہب کے لیے وہ سب کچھ نہ کرتے جو اب اپنے مذہب کے لیے کر رہے ہو۔ ہمارے مذہب کی بنیاد کیا ہے؟ اتفاق؟“

”ہنہہ ہنہہ۔“ مسعود صرف طنز سے ہنسا۔

وہ پھر خاموش ہو گئے۔ صرف ہوا درختوں میں چل رہی تھی اور سبز بلب آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ طشتریوں میں آم کی قاشیں پڑی تھیں۔ کسی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر جانے کی اجازت ہی لیتا۔ کبھی کبھی کوئی ایک کہیں سے بے سرو پاسی بات کر دیتا، اور بس۔

پھر اچانک مسعود اپنے تیز، معمولی لہجے میں بولنے لگا:

”دکھ اہم نہیں ہیں۔ زندگی میں ہم جو بھگتے ہیں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اہم

صرف یہ ہے کہ ہم اپنے 'آئڈیلز' کے لیے لڑتے ہیں یا نہیں، اور کتنی دیر تک۔ ہم "ڈس الوژمنٹ" کو کتنی دیر تک ٹال سکتے ہیں؟۔۔۔۔۔ تکلیفیں ہم میں کوئی تبدیلی نہیں لاتیں، وہ گزر جاتی ہیں، وہ نہ ہمیں بہتر انسان بناتی ہیں نہ بدتر۔ کیونکہ جب ہم خوش ہوتے ہیں تو گزشتہ دکھوں کو بھول جاتے ہیں۔ اس وقت ہم محض خوش ہوتے ہیں۔ اس لمحے میں صرف ایک جذبہ ہمارے پاس ہوتا ہے، مسرت کا، اور ہم پوری فتح مندی، پوری لاپرواہی کے ساتھ زندہ ہوتے ہیں۔ خیالات۔ 'یہ' ہے جو کہ اہم ہے، کہ تم، کیا 'سوچتے' ہو، صرف یہی تم کو اور سوسائٹی کو تبدیل کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ تکلیفیں تم نے اتنی برداشت کیں، ٹھیک۔ پھر؟ وہ تو میں نے بھی کیں جناب، آپ نے کون سا تیر مارا۔ یہ تو کوئی ایسی مشترکہ قدر نہ ہوئی جس کی بنا پر تعلقات استوار کیے جاسکیں۔ ہمارا آپس کا رشتہ تو 'خیال' پر ہے، کہ ہم 'سوچ' کیا رہے ہیں؟ کس چیز کی تلاش میں ہیں؟ کیا ڈھونڈ رہے ہیں یا۔۔۔۔۔ اوہ شاید خیالات بھی اہم نہیں ہیں۔

"میرے نزدیک سوچ کی مقدار کی بجائے غم کی مقدار پر کسی بشر کی وقعت کا اندازہ کیا جانا چاہیے۔" اس کے خاموش ہو جانے پر برمن جی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تم۔ تم کیا جانتے ہو؟ ڈرائنگ ماسٹر۔" مسعود نے اسی تیز، معمولی لہجے میں کہا جس سے کسی رنجش کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ غصے اور رنج کے مارے نجی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"لیکن دکھ، ٹھہرو، ان کے بارے میں شاید میں کچھ بتا سکتا ہوں۔" مسعود نے کہا، "دکھ ہمارے ماضی میں ہے اور مستقبل میں ہے۔ نہیں، بلکہ موت ہے۔ ہمارا ماضی اور مستقبل مردہ ہے۔ اور جب ہم موت کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں تو اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں موت کے منہ میں چلے جانا ایک بات ہے اور موت میں مبتلا ہو جانا بالکل دوسری بات ہے اور یہ ہے جو تکلیف دہ ہے۔ وہ لمحہ جو گزر گیا زمانہ ماضی ہے، جو آنے والا ہے مستقبل میں شامل ہے۔ یہ دونوں ہمارے وجود کے حصے ہیں اور مردہ ہیں۔ جب ہم ان کو حال کے گزرتے ہوئے لمحے میں کھینچ کر لانا چاہتے ہیں تو موت کو زندگی پر مسلط کرنا چاہتے ہیں موت کبھی ساری زندگی پر مسلط نہیں کی جا سکتی، لیکن ان کی باہمی شرکت سے ایک نیم مردنی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو زندگی پر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ابتلائے مرگ کا عمل شروع ہوتا ہے۔ ہم سب ماضی اور مستقبل میں رہ رہے ہیں۔ حال میں کوئی رہنا نہیں چاہتا۔ ہم ایک عظیم موت میں مبتلا ہیں جو ذہن اور روح کی موت ہے۔ مکمل، ثابت و سالم موت تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ ہم تکلیف اس لیے سہتے ہیں کہ ہر وقت اپنے مردہ حصے کو زندہ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور وہ، جو کہ درحقیقت زندہ ہے، اس کی پروا نہیں کرتے کیونکہ جو زندہ ہے وہ صرف حال کا گزرتا ہوا لمحہ ہے۔ ہم زندہ ہیں یہاں پر موجود ہیں محض اس واسطے سے کہ ہم باتیں کر رہے ہیں، کھا رہے

ہیں ، سو رہے ہیں یا کام کر رہے ہیں ، مکمل طور پر حال کے گزرتے ہوئے لمحے میں کھوئے ہوئے، مجذوب ! بعض کے لیے یہ اہم نہیں ہے اور بہت سوں کو اس کا علم ہی نہیں ہے ۔ ہم اس قدر غیر یقینی طور پر دنیا میں رہتے ہیں کہ اپنے لیے دکھوں کا ایک عظیم سبب پیدا کر لیتے ہیں ۔ ہم میں سے بہت سوں کے نزدیک ہم زندہ ہیں اس واسطے سے کہ ہمارا ماضی ہے اور مستقبل ہے ، محض اس واسطے ! ہم آگے اور پیچھے دیکھتے ہیں پر سامنے نہیں دیکھتے ۔ لیکن جو زندہ ہے ، جو حقیقی ہے وہ صرف ہمارے سامنے ہے ، اور بس ! ہمارا ماضی اور مستقبل ایک بہت بڑا وسوسہ ہے جو مردہ ، ہمارا غیر حقیقی وجود ہے ، اور غیر وجود سے وجود کی طرف آنے میں جو محنت درکار ہوتی ہے وہ ہمارے لیے ایک عظیم اور لا حاصل دکھ کا باعث بنتی ہے ۔ ہم اکتا چکے ہیں ، بے چین ہیں ، ذہنی اور روحانی ابتری کی حالت میں ہیں ۔ محض اس لیے کہ ہم زندہ ہیں ۔ ساری بات یہ ہے ۔

”ٹھیک ہے ۔ موت بہر حال موجود ہے ۔ میں جانتا ہوں ۔ لیکن یہ اہم نہیں ہے ۔ مکمل ، ثابت و سالم موت ایک بیحد قدرتی اور آسان عمل ہے اور اسی طرح آتی ہے جیسے نیند یا محبت یا بھوک ۔ صرف ایک منقسم موت تکلیف دہ ہے ۔ منقسم لمحہ ! حال کا مکمل لمحہ مکمل زندگی اور مکمل موت پر محیط ہے ۔ یہ زندہ ہے اور تم اس کے ساتھ زندہ ہو ، یہ مرتا ہے اور تم اس کے ساتھ مر جاتے ہو ۔ اگلا لمحہ پیدا ہوتا ہے اور تم اس کے ساتھ نئے سرے سے پیدا ہو جاتے ، نئی زندگی میں ، نئی موت کے لیے ۔ ہر نئے لمحے کی پیدائش پر تم زندگی کے پر امید اور روشن نو مولود ہو ۔ اس لیے کہ تم آگے اور پیچھے نہیں دیکھتے صرف سامنے دیکھتے ہو ۔ تمہیں کچھ یاد نہیں ہے ۔۔۔۔ دنیا نے تمہارے ساتھ کتنی بد عہدی کی ، لوگوں نے تمہیں کتنا سراہا ، کتنی دور اندیشی کتنی خود غرضی سے کام لیا ۔۔۔۔ تمہارے پاس کوئی فہرست نہیں ہے ۔

تم کچھ یاد نہیں رکھتے ، کچھ فراموش نہیں کرتے ۔ محض یہاں موجود ہو ، زندگی کی ساری مسرت ، سارے درد کو جاتے ہوئے زندہ ہو ۔ یہ لمحہ ، تم اور میں ۔ دوسرا لمحہ ، دوسرے ’تم‘ اور دوسرا ’میں‘ ۔ اور پھر موت آتی ہے ۔ لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہیں ، اب یہ محض ایک اور لمحہ ہے جس کا سامنا کرنے کے لیے تمہارے پاس وہی پرانا رویہ ہے جو ہمیشہ سے تمہارے پاس تھا ۔ انتظار ، انتظار کے دھڑکے کے سوا ۔ ادراک ، ادراک کی افیت کے سوا ۔ تم نے بے شمار بار اس کا سامنا کیا ہے ۔ تم اس کو پہلے سے ہی جانتے ہو ۔ تم اسے گزر جانے دیتے ہو ، پیچھے کوئی نشان ، کوئی یادداشت چھوڑے بغیر ۔ ایک مکمل تجربہ ۔ غیر منقسم لمحہ ۔ مکمل موت ۔ مکمل محبت ۔۔۔ اگلا لمحہ ؟ تمہارے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ آتا ہے یا نہیں ۔ کبھی نہ تھی ۔ یہ اصل زندگی ہے ، سنا تم نے ، کیا تمہارے دکھ کا دوسرا نام حماقت ہے ؟ بتاؤ ۔۔۔۔

”تمہیں پتا ہے انسانوں کے درمیان کتنی میزاری ، کتنی کلبیت ہے ۔ کتنا درد ، ابتری ، زندگی کے خالی اور لا حاصل ہونے کا احساس ! ہم چھوٹے چھوٹے لوگ ہیں لیکن ہمارے اتنے بڑے بڑے غرور ہیں ۔ بڑی بڑی خود پرستیاں اور خوش فہمیاں ہیں ۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ اگر ہم ایک پل کو اپنے تکبر کو پرے رکھ دیں تو کتنی محبت کر سکتے ہیں ۔ میں اپنی چھوٹی سی بے مقصد زندگی اسی فراغت اور دور اندیشی کے ساتھ گزار دوں گا جس طرح دینا میں اور کروڑوں انسان روزانہ پر قناعت اور بے فائدہ زندگیاں گزار رہے ہیں ، اسی میکانگی ، بے معنی طور پر جیسے کہ مکھی یا مچھر گزارتا ہے ۔ اس کا کیا مطلب ہے ؟ بتاؤ ۔“ وہ اٹھ کر برمن جی کے سامنے جا کھڑا ہوا، ”بتاؤ ۔ اس ڈھونگ کا کیا مطلب ہے ۔ آخر کیا مطلب ہے ؟ بتاؤ ۔۔“

”میں بتاؤں ؟ سنو ۔ ہم اپنی اپنی شخصی کوٹھریوں میں رہتے ہیں جن کے دروازوں کی درزبند اور روشن دانوں اور کھڑکیوں کے سوراخ ہم نے احتیاط سے بند کر دیے ہیں اور ان میں محصور ہو کر اپنی عقل، اپنے ایمان، اپنے تعصب ، اپنی خود پرستی اور اپنی اہمیت کی حفاظت کرتے ہیں اور خوش ہیں کہ ان قلعوں کو کوئی توڑ نہیں سکتا ۔ لیکن ۔۔۔ تم جانتے ہی ہو کہ دیواروں کی کیا وقعت ہے ۔ ہم بھیروں کے گلے کی طرح ایک مشترکہ حماقت میں بندھے ہوئے ہیں ۔ مشترکہ بد بختی میں ۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اس لیے کہ میں ”سوچتا“ ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔ میں سارے لوگوں سے محبت نہیں کرتا اس لیے کہ میں ’سوچتا‘ ہوں کہ سارے لوگوں سے محبت نہیں کر سکتا ۔ نتیجہ: میں کسی سے محبت نہیں کرتا ۔ میں اپنے نظریات ، اپنی عادات و خصائل سے، کبر نفس سے، اپنے ضدی پن سے، اپنی ساری تربیت سے، اپنے آپ سے محبت کرتا ہوں ۔ تم ۔“ وہ کرسی میں بیٹھی ہوئی حیرت زدہ نجی کے سامنے جا کھڑا ہوا، ”تم ایک خوبصورت لڑکی ہو ۔ تم ایک شاندار اور دلکش شئے ہو ہر دفعہ جب میں تمہارے ایسی کسی لڑکی کو دیکھتا ہوں مجھ پہ ایک مہیب حرص غلبہ پالیتی ہے ، حاصل کرنے کی قبضے میں کرنے کی ، Invest کرنے کی، جیسے نفع بخش کاروبار میں روپیہ لگایا جاتا ہے ، طمانیت کی نہایت سطحی خوشی حاصل کرنے کی حرص ۔ اور اسی لمحے ، جاتی ہو ، تم میرے لیے ’تم‘ نہیں رہتیں ، پھر تم فلاں بنت فلاں نہیں رہتیں ، پھر تم کیا بن جاتی ہو ؟ کچھ بھی نہیں ۔ پھر کچھ بھی نہیں رہتا، صرف میں رہ جاتا ہوں اور میری پرانی حرص ، میری خود پرستی ، میرا گھمنڈ ، میری ضد رہ جاتی ہے ۔ پھر وہی رہ جاتا ہے جو ہمیشہ سے تھا: میں اور میرے مختلف جذبے ۔ اب تم اہم نہیں ہو ، کچھ بھی نہیں ہو ، زیادہ سے زیادہ ایک بد صورت لڑکی ہو جس سے میں نفرت کرتا ہوں اب نفرت اوپر آجاتی ہے اور حیوانی جذبے ۔ اب محبت کہیں نہیں ہے صرف مری گزشتہ اور آنے والی زندگی کا عکس ہے جو میرے سامنے ہے، تم نہیں ہو ۔ دفعتاً ۔۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک گزشتہ دھیمی اور لمبی تیاری کے بعد ۔۔۔ میں محبت کرنے کی تمام اہلیت کھو دیتا ہوں ۔

در حقیقت میں کہیں رہتا ہی نہیں ہوں۔ جو رہ جاتا ہے وہ صرف یہ ہے: میرا سارا پس منظر اور میری خواہشوں اور تمناؤں کی فہرست۔ ہر ایک حرص کے گزر جانے پر میری ضد، میری خواہشیں مضبوط تر ہو جاتی ہیں۔ اب وہ وقت آتا ہے جب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب میں کسی لڑکی سے، وہ کوئی سی بھی ہو، شادی کر لوں گا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ صرف اغراض و مقاصد رہ جائیں گے۔ اب 'میں' اور 'تم' اہم نہیں ہیں۔ جو اہم ہے وہ یہ ہے: روزگار مہیا کرنا، اور نیا فرنیچر اور فالتو وقت میں سوشل کام۔ دعوتوں پر جانا اور بدلے میں دوستوں کو مدعو کرنا، غرضیکہ شادی کے نتائج کو خالصتاً مادی فوائد کی شکل میں حاصل کرنے کی توقع کرنا۔

جاڑے کی طویل شامیں ایک دوسرے کی معیت میں پڑھتے ہوئے یا موسیقی سنتے ہوئے گزارنے، اور نئے لباس خریدنے، باورچی خانے کی نگہداشت کرنے اور سالگرہوں پر ایک دوسرے کو تحفے دینے کی نہایت معمولی خوشیوں کو اب ہم ایک مجوزہ پروگرام کے تحت میٹھے لگتے ہیں، جیسے روپیہ پیسہ یا دوسری جائداد اکٹھی کی جاتی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ جو ہم بچوں میں اتنے انہماک سے دلچسپی لے رہے ہیں یہ بھی ایک گم شدہ شخصیت کے نقصان کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے، محبت میں ہماری ناکامی کے سبب سے ہے، ہماری ”ڈس الوژن منٹ“ ہے۔ ہم ایک سطحیت کو طمانیت میں، اپنے احمق پن کو قناعت میں اور اپنی روحانی ناداری کو تن آسان زندگی کی گونا گوں مسرتوں میں غرق کرنے کی بے طرح کوشش کر رہے ہیں، بے طرح۔ سنا تم نے نجمہ میکم، پھر ایسا ہوتا ہے۔“ اس نے ایک لمبا سانس لیا اور کندھے اچکا کر کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر وہ تیز، زہریلے طنز کے ساتھ ہنسا۔ اب ہماری زندگی منظم ہے۔ اس کے بعد سے ہم ایک نظام کی پیروی کرنے لگتے ہیں، اس نظام کی خاطر زندہ رہتے ہیں۔ گھر کا نظام۔۔۔ دن بھر کے چار کھانے اور ان کے اوقات، بچوں کے لیے کھانے کی میز کا سلیقہ، سونے اور جاگنے کے اوقات۔۔۔ گھر کا نظام۔ اور سوسائٹی کا نظام اور ملک کا نظام اور مذہب کا نظام۔ یہ ہمارے لیے النحد ضروری ہے۔ چنانچہ جب ناظم اعلیٰ پکارتا ہے: ”آؤ، ادھر آؤ یہ ملک ہے۔ یہ سوسائٹی ہے، یہ ایک عظیم تر شے ہے“ تو ہم اس سے ایک عظیم روحانی تقویت حاصل کرتے ہیں اور اپنی سطحیت کے کچل دینے والے احساس سے بچ نکلنے کا بہترین راستہ۔ پھر ”نظام“ اہم ہو جاتا ہے، سوسائٹی کو اور تعزیرات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے، تم کو اور مجھ کو نہیں۔ پھر سوسائٹی ”مجھ“ کو اور ”تم“ کو بناتی ہے، میں یا تم سوسائٹی کو نہیں بناتے۔ ہم خود اپنی فراغت کے لیے اپنی شخصیت کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتے ہیں۔ اور پتا ہے اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟ خود غرضی! میرا منہ کیا دیکھتے ہو۔ اب تم اتنے کند ذہن ہو چکے ہو کہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟ جب انسان، مرد اور عورت، اپنی انفرادیت کو کھو دیتے

میں تو پھر جماعت اوپر آجاتی ہے۔ اور سوسائٹی۔ اور ہم سب جاتے ہیں کہ سوسائٹی میں اس وقت سب سے بڑی طاقت لوگ نہیں ہیں، اغراض و مقاصد ہیں۔ اس نظام کے بنانے میں سب چیزیں مدد کرتی ہیں۔ ہمارے اصول ہماری ڈس الوژن منٹ، ہماری سطحیت اور ازلی حماقت کا احساس، سب! جاتے ہو اس وقت انسانوں کی سوسائٹی میں سب سے جاندار قوت امارت یا غربت یا قومیت یا مذہب یا کمیونزم نہیں ہے، خود غرضی ہے، منظم و منور خود غرضی۔ مستقبل انسانی کو ہم اپنا آپ محض چند مخصوص قوموں یا جماعتوں یا نسلوں یا سوشل ورکر گروپوں کی صورت میں پیش کر دیں گے جن میں تمیز کرنے کے لیے ان پر مختلف قومیتوں یا مذہبوں کے عنوان لگے ہوں گے۔ اب وہ وقت آیا ہے کہ ہمارے لیے اس دہشتناک جنگل میں اپنی حفاظت کی خاطر جتھے اور غول بنانا ناگزیر ہو گیا ہے۔ ہم واپس جا رہے ہیں۔ اس طرف۔۔۔۔۔ اس نے بازو اشارہ کیا۔ سب نے اچانک مشرق کی سمت میں دیکھا جہاں اندھیرا تھا اور شہر کی روشنیاں تھیں۔ ”ایک غول دوسرے غول پر جھپٹ رہا ہے، یا جھپٹنے والا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف ہم واپس جا رہے ہیں۔ اس طرف۔۔۔۔۔“ اس نے دوبارہ موہوم سا اشارہ کیا جس سے کسی سمت کا تعین نہ کیا جاسکتا تھا۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔ صرف بادامی رنگ کا کتا پتوں کے ڈھیر پر سے انگڑائی لے کر اٹھا اور گھاس پر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا ان کے قریب آکر جمائیاں لینے اور مسخروں کی طرح برساقی پتنگوں کا پیچھا کرنے لگا۔ ان کے چاروں طرف رات کی پر اسرار خاموش آوازیں پھیل رہی تھیں۔ ہوا درختوں میں اسی طرح مدھم اور مسلسل چلے جا رہی تھی۔

”آج جو کہیں بھی نہیں ہے ہمارا ضمیر یا مذہب یا احساس ذمہ داری نہیں، ہماری شخصیت ہے۔ ہم جو کھو چکے ہیں ضائع کر چکے ہیں ہماری انفرادیت ہے۔۔۔ آج فرد کہیں نہیں ہے، محض غول ہیں۔ تم جاتے ہو آج جو خوفناک احساس تنہائی ہم سب پہ طاری ہے کس لیے ہے؟ تم جاتے ہو، خوب جاتے ہو۔۔۔۔۔“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ تم کو ٹھہری میں رہنے والوں اور غول بنانے والوں کو ایک ساتھ نا پسند کرتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں تم محض زہر اگل رہے ہو۔“ برمن جی نے اکتا کر کہا۔

”دونوں احساس تنہائی کے شکار ہیں، کھو چکے ہیں۔ گمشدہ ہیں۔ جو گمشدہ نہیں ہیں وہ کھڑکیاں اور روشن دان کھول دیتے ہیں تاکہ روشنی اور ہوا اندر آسکے۔ اور کھڑکی میں سے جھک کر راہ چلتوں کو سلام کرتے ہیں اور ان کے سلام کا جواب دیتے ہیں اور جب بلائے جاتے ہیں تو دروازے کھول کر باہر نکل آتے ہیں۔ وہ لوگوں کی باتیں سمجھتے ہیں اس لیے بے خوف ہیں اور آزادی سے گھومنے پھرنے کے بعد واپس چلے جاتے ہیں۔۔۔۔۔“ مسعود نے کہا۔

لیکن برمن جی کے بات کرنے سے کافی سحر ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ اٹھ رہے تھے اور جلد

جلد خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو رہے تھے۔ آخر میں صرف نے، خالد، نجمی اور مسعود رہ گئے۔ نجمی اٹھ کر سبزے پر احتیاط سے چلتی ہوئی پتوں کے ڈھیر کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اس پر پاؤں پھیرنے لگی۔ وہ مسعود کی بے ربط اور بظاہر بے معنی تقریر سے مرعوب نہ ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس کے ذہن میں مسعود کی گھٹیا تربیت اور اس کے طبقے کا احساس تیز ہو گیا تھا۔ اب وہ وہاں کھڑی اسے یکسر بھلا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے سوچا کہ وہ اس شخص سے مل کر کبھی بہت زیاد خوش نہیں ہوئی، نجانے کیسے وہ ان کے حلقے میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے ناگواری کے ساتھ چند ماہ پہلے کی وہ شام یاد کی جب وہ پہلی بار سُر کی بڑی بہن اندر کے ساتھ روشن محل آیا تھا اور گو اس کے پس منظر کے متعلق کسی کو علم نہ تھا اور گو یہ معمول کے مطابق نہ تھا پھر بھی اس کی سنجیدگی اور صاف ستھرے مذاق کو دیکھ کر اسے اس خاص الحاح حلقے میں قبول کر لیا گیا تھا۔ وہ سردیوں کی بارش آلود شام تھی اور اندر نے اپنی سریلی آواز میں بھجن سنائے تھے: میں تو گردہ آگے ناچوں گی۔۔۔۔ اور، اے میں تو پریم دیوانی۔۔۔۔ اور نجمی نے پیانو پر اس کا ساتھ دیا تھا۔ اندر بالا۔ جانے اب کہاں ہے۔۔۔ اپنے شوہر کے ساتھ جنوبی ہندوستان میں کسی جگہ۔ اتنے اچھے اچھے دوست چلے جاتے ہیں۔ کیوں؟

اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی پشت پر کھڑا ہے اور وہ دفعتاً خوفزدہ ہو گئی۔ تیزی سے چند خیالات اس کے ذہن میں سے گزرے۔ جانے کس قسم کا آدمی ہے۔ اب کیا کرے گا۔ مجھے قتل کر دے گا؟ خدایا، یہ کبجنت لوگ۔۔۔۔۔ اے اپنے آپ پر بیحد غصہ آیا لیکن وہ کھڑی رہی۔ صرف اس کا پاؤں رک گیا اور پتوں کے ڈھیر پر پڑا آہستہ آہستہ کپکپانے لگا۔ ذرا بدلے ہوئے انداز میں مسعود بولنے لگا: ”نجمی تم میرے لیے انتہائی پرکشش ہو۔ مگر جانتی ہو یہ کشش محض اس وجہ سے ہی نہیں کہ تم ایک خوبصورت لڑکی ہو، اس لیے بھی ہے کہ تم روشن محل میں پیدا ہوئی ہو۔“ وہ رکا، ”میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ہمارا ایک ایسا گھر ہوتا، قدیم وضع کا، ”لبے لبے ستونوں اور ہال کمروں والا، روغنی تصویریں جن میں نفیس داڑھیوں والے بڑھے مرصع لباس پہنے تلوار لگائے وائسرائے یا گورنر کے ہمراہ کھڑے ہوتے ہیں، اور قدیم فرنیچر اور برسوں پرانے ہیپل، برگد اور سفیدے کے درخت، دیرینہ جاہ وحشت کے نشانات جو اس گھر میں پیدا ہونے والے ہر بچے میں شروع دن سے اعلیٰ اور نفیس قسم کا احساس برتری پیدا کر دیتے ہیں۔ تین پشتوں سے سینہ بہ سینہ چلتا ہوا احساس برتری۔ میرے آباؤ اجداد؟ ہنہ۔ کہاں سے آئے، کون تھے، کہاں گئے، کچھ پتا نہیں۔ آج میں اپنے لیے ایک مکان بنا سکتا ہوں مگر دو قامت کہنہ سال دیودار اور برآمدوں پر لدی ہوئی سیلیں اور روغنی تصویریں، یہ سب جو تمہارے طبقے کے نشانات ہیں کہاں سے آئیں گے؟ اوں ہوں۔“ اس

نے نفی میں سر ہلایا، ”میں ان باتوں سے پہلے والا نہیں جناب۔ میں تو ایسے گھر میں پیدا ہونا چاہتا تھا، تیسری نسل ہونا چاہتا تھا۔ میں وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا جو تم نے ورثے میں پایا ہے۔ تمہاری نفاست، تمہارا دماغ، تمہارا اخلاق، تمہاری تعلیم اور تربیت، ارستو کریسی کی تمام مرکب نعمتیں، سب۔۔۔۔۔ میں تم سے حسد کرتا ہوں۔ میرے دل میں تمہارے لیے دھیمی، سلگتی ہوئی رقابت ہے، اور بس۔ آخر میں اپنے ماضی سے بچ کر کہاں جا سکتا ہوں۔“

ٹھنڈے دل سے سوچا جاتا تو مسعود کی باتوں پر شاید کسی کو غصہ نہ آتا۔ لیکن نجھی کے پاس اس کے لیے محض حقارت تھی، وہ جذبہ جو انسان کے دل میں ایک چھوٹے سے جانور کو اپنے مقابلے پر کھڑا ہوتے دیکھ کر پیدا ہوتا ہے، جس میں غصہ، حقارت، خوف، سب ہی کچھ ہوتا ہے۔

وہ مڑی اور سیدھا اس کے چہرے پر دیکھ کر بولی: ”مسعود تم اب۔۔۔ اب جاؤ۔۔۔ ابھی۔۔۔“

وہ چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے نجھی کو دیکھتا رہا جو اب اس کی طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف، تقریباً بے نام اداس مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے کندھے اچکائے اور الوداع کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کا بادامی رنگ کا کتا چھوٹے چھوٹے مستعد اور وفادار قدم رکھتا ہوا ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔

نجھی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر فے اور خالد، جنہوں نے حیرت کے ساتھ یہ سب دیکھا تھا، سبزے پر سے اٹھے اور بے تکی، ہشاش بشاش چہرے اس کی طرف موڑ دیے۔ پھر جلدی سے الوداع کہہ کر وہ بھی رخصت ہوئے۔

جب وہ اکیلی میز پر بیٹھی آہستہ آہستہ پاؤں ہلا رہی تھی تو کسی نے جلدی سے آکر اطلاع دی کہ مسعود میاں کا فون آیا ہے۔

”وہ جا چکے ہیں۔“ اس نے میکانکی انداز میں کہا۔

پھر اس نے دھل کر مشرق کی طرف دیکھا جہاں اندھیرا تھا اور شہر کی روشنیاں تھیں اور رات کی پر اسرار آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

(۶۶)

نعیم اٹھ کر سیڑھیوں کے اوپر اُکھڑا ہوا۔ اس کے ماتھے اور آنکھوں پر روشنی پڑ رہی تھی اور نچلا چہرہ سائے میں تھا۔ خون کے دباؤ کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس یہ گہرے انہماک

کی لکیریں تھیں۔ نجمی اس کی طرف پشت کیے، دونوں ہاتھ گود میں رکھے بے ترتیب کرسیوں میزوں بیڈ منٹن کے ریگٹوں اخباروں شربت کے گلاسوں اور آم کی قاشوں اور جھلکوں کے درمیان اکیلی میز پر بیٹھی تھی۔ اس کے بڑے سے سر اور تنگ، نازک پشت میں کوئی حرکت نہ تھی۔ ہوا ٹھم چکی تھی اور رات میں غیر معمولی بے چینی اور دور کا ہلکا ہلکا شور تھا۔ نعیم نے ستون پر سے ہاتھ اٹھایا اور سیرھیاں اتر کر آہستہ آہستہ لان کی طرف بڑھا۔

نوکروں کے جھرمٹ میں رہنے کی عادی نجمی نے اسے اپنے پیچھے چلتے ہوئے سنا اور منظر انداز کر دیا۔ نعیم بکھرے ہوئے سلمان کے درمیان چلتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس وقت نجمی اسے دیکھ کر چونک پڑی۔ وہ ذرا سی پشت موڑے، کرسی کے بازو کا سہارا لیے اسی انہماک سے سبزے پر دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح نجمی کو دور کی خوشی کا احساس ہوا۔ اس کا یہ رشتے کا بھائی، جسے وہ مدت سے جانتی تھی اور چاہنے کے باوجود جس کے بہت زیادہ نزدیک وہ کبھی نہ ہو سکی تھی، اس کے لیے ایک پر اسرار پرکشش دوری کا حامل تھا۔ اس سے جب بھی وہ ملی اسے محسوس ہوا کہ اپنے نرمی اور خوش خلقی کے رویے کے باوجود وہ ایک بالکل الگ، بیگانہ ہستی تھی جس کے ساتھ بے تکلفی کی نوبت کبھی نہ آسکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ واحد شخص تھا جس کے بارے میں وہ ہمیشہ اپنے قدرتی طبقاتی تاثرات سے آزاد ہو کر سوچتی تھی۔ اس بات کا بھی اسے علم تھا، کہ اس ادھیڑ عمر خوبصورت شخص سے، جو اسکا نزدیکی رشتہ دار تھا، مل کر وہ ہمیشہ خوش ہوتی تھی اور اس کو خوش کرنے کی بھی ناقابلِ بیان خواہش محسوس کرتی تھی۔

نعیم نے جھک کر لپٹا ہوا کینوس اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔

”سر کا پورٹریٹ ہے۔“ وہ چھلانگ لگا کر میز سے اتری اور بچوں کی طرح تیز تیز آنکھیں اس کی طرح اٹھا کر بولی، ”آپ سر کو جانتے ہیں نعیم بھائی؟ سربالا۔“

”سربالا؟ ہاں۔“

”وہ آج نہیں آئی۔“ نجمی نے اداس ہو کر کہا۔

”وہ آج نہیں آئی۔ اچھا؟“ نعیم نے دہرایا۔ پھر وہ بلاوجہ آہستہ سے ہنسا اور کرسی پر بیٹھ گیا نجمی اس کے سامنے میز پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور شکایتی لہجے میں بولی:

”اتنی بار کہا آپ کا پورٹریٹ بنائیں گے، سننگ ہی نہیں دیتے۔“

”پورٹریٹ؟ ہاں دس دس گے۔ دس گے۔ آپ کے دوست سارے چلے گئے؟“

”سارے چلے گئے۔“ نجمی نے دہرایا، ”مچھلی کا شکار؟“

”خوب رہا۔ خوب۔“ وہ ہنسا، ”ہمیشہ پوچھتی ہو۔“

”اور آپ ہمیشہ لے کر نہیں جاتے۔ اتنی بار کہا ہمیں بھی کبھی لے جائیں۔“

”آپ اپنی چھڑی اور ڈوری تو منگواتی نہیں۔“

”ارے مچھلی پکڑنے کون جا رہا ہے نعیم بھائی۔ آپ تو یاد ہی نہیں رکھتے۔ آپ کا پورٹریٹ بنائیں گے دریا کے کنارے پر اور۔۔۔۔۔ ارے اتنا عمدہ رہے گا بھئی وہ جہاں دوسرے کنارے پہ چھوٹا سا جنگل ہے نہیں۔؟ وہیں پہ اس کنارے آپ دریا میں ڈوری پھینک کر ایک بڑے سے پتھر پر چڑھ کر اپنے خیال میں بیٹھے ہوں گے جیسے بیٹھا کرتے ہیں اور کندھے پر ایک کوا بیٹھا ہو گا۔ اور۔۔۔۔۔ اتنا کیریٹر ہے آپ کے چہرے پر، پتا ہے آپ کو؟“

نعیم خاموشی سے ہنسا۔

”پھر وعدہ کیجیے اب کی بار ہمیں اور عذرا آپا کو لے کے جائیں گے۔“

”ہاں، ضرور لے جائیں گے۔“

اسے ایک عجیب انہماک سے اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر نجھی گھبرا کر چپ ہو گئی۔ وہ اس کی انوکھی طبیعت سے مرعوب بھی تھی اور خائف بھی، لیکن اس طرح سے وہ بہت کم اسے دیکھا کرتا تھا۔ دور کی آوازیں اٹھ رہی تھیں اور گر رہی تھیں۔ کہیں پر شاید آگ لگا دی گئی تھی جس کی نارنجی روشنی آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی۔ برآمدے کا ٹیلیفون زور زور سے بجنا شروع ہو گیا۔

”عذرا نہیں۔ صرف تم۔“ نعیم نے کہا۔

”عذرا آپا نہیں؟“

نعیم نے کوئی جواب نہ دیا، صرف اسے دیکھتا رہا۔ ٹیلیفون تھوڑے تھوڑے وقفے پر مسلسل بجے جا رہا تھا۔ سارے نوکر کوٹھی کے پچھواڑے خوفزدہ بھیروں کی طرح جمع ہو کر شہر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ صرف ایک مہری برآمدے میں سہمی ہوئی ٹیلیفون کو اور نجھی کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ یہ آگ قطعی طور پر اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ پل بھر میں نجھی پسینے میں بھیگ گئی۔

”انیس ٹھیک کہتا ہے۔ وہاں پر جا کر مجھے سکون ملتا ہے۔ اور سکون۔۔۔۔۔ مجھے تم سے مل کر بھی ملتا ہے۔“ وہ اسی انہماک سے بول رہا تھا، ”تم مجھ سے کبھی نہیں ملتیں، بات نہیں کرتیں۔ کیوں؟“

”اوہ۔۔۔۔۔ اچھا؟ نہیں نعیم بھائی۔“ وہ کوشش کر کے ہنسی، ”لیکن عذرا

آپا۔۔۔۔۔“

نعیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ”تمہیں پتا ہے میری کیسی کوفت کی زندگی ہے؟ اس سے بچنے کے لیے میں ہر جگہ مارا مارا پھرتا ہوں۔ میری بیوی۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ ایک مدت گزر گئی، مجھے کچھ نہیں دے سکی۔ اور تم۔۔۔۔۔ اتنی ذہین ہو۔ تمہارا دماغ۔۔۔۔۔ میں اس کے ساتھ حیوانوں کی طرح رہتا ہوں۔ اور تم،“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی

ٹھوڑی اور کمال اور ہوشوں کو چھوا ، ”تمہارا ذہن ۔۔۔ میں نے ہمیشہ تمہارے ایسی لڑکی کی
تمنا ۔۔۔۔“

نجمی ، جوششدر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی ، میز پر سے ذرا سی اٹھی ، پھر دونوں ہاتھوں میں
منہ چھپا کر رونے لگی ۔

نعیم حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اس بلاخیز ، طوفانی جذبے میں سے نکل آیا ۔ آہستہ ہستہ
وہ کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا ۔ صدے اور دہشت کے ایک شفاف لمحے نے سارے واقعے کی
نوعیت اس پر عیاں کر دی ۔ اسی لمحے میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ
دے گا ۔ تقریباً بھاگتا ہوا ، میزوں کرسیوں سے ٹکراتا وہ اپنے کمروں کی طرف بڑھا ۔ نجمی نے پانی
کے جگ کے گر کر ٹوٹنے کی آواز سنی اور ہاتھ ہٹا کر جھلملاتی آنکھوں سے اس لنگڑا کر چلتی ہوئی
شبیبہ کو ، جو زندگی کی ناقابل تسخیر علامت تھی ، غائب ہوتے ہوئے دیکھا ۔

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی ۔ عذرا حسب معمول نعیم سے اس کے اتوار کے شکار
کے متعلق پوچھ پانچھ کر اور اس کی خاموشی سے تنگ آکر سوچکی تھی لیکن اس کا ایک بازو ابھی
تک نعیم کی چھاتی پر بے سدھ پڑا تھا ۔ نعیم بازو سر کے نیچے رکھے بے خواب آنکھوں سے
اندھیرے میں چھت پر اور ادھر ادھر دیکھ رہا تھا ۔ گرمی اور جس کی وجہ سے اس کا جسم پسینے
سے تر تھا لیکن اس کے دل میں ہر جذبہ سرد ہو چکا تھا اور ذہن خالی تھا ۔ صرف ایک ہلکی سی
کسلمندی رہ گئی تھی جو اس کی روح سے منسلک تھی ۔ اس نے کئی بار چوڑے ، آرام دہ بستر پر
اپنے آپ کو پھیلا کر سونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا ۔ کھلی کھڑکی میں یو کلپٹس کے پتے سیاہ
پتھروں کی طرح ساکن تھے اور ان کے پیچھے مٹیالہ بیجان سا چاند ابھی ابھی اوپر آیا تھا ۔ شہر کی
جانب سے آوازیں مسلسل آ رہی تھیں ، کبھی دور ، کبھی نزدیک ۔ وہ دہرتک بے حس و حرکت
لیٹا ان کے زیر و بم کو محسوس کرتا رہا حتیٰ کہ اس کا بازو سر کے نیچے رکھا رکھا سو گیا ۔ کمرے میں
صرف پنکھے کے چلنے اور عذرا کے خراٹوں کی ہلکی ہلکی مانوس آواز تھی ۔ رات کی کمزور روشنی میں
اس نے اپنے سینے پر پڑے ہوئے عذرا کے ہاتھ کو دیکھا جس کی انگلیاں نیند میں آپ سے آپ
ہل رہی تھیں ۔ کیسی سکون کی نیند ہے تمہاری ، اس نے دل میں کہا ۔ اور اس کے اندر حسد کا
تیز احساس پیدا ہوا ۔ لیکن اس کے دل میں اب اتنا زور نہیں رہا تھا کہ اس طاقتور جذبے کو
سہار سکا ۔ اندھیرے میں بے حس و حرکت تکلیف سے ہوتے ہوئے اب ایک عجیب سرد مہری
اس کے دل میں پیدا ہوئی ۔ اس نے سر موڑ کر دیکھا ۔ گوشت پوست کا یہ ڈھونگ ، یہ کیا
ہے؟ یہ عورت ، کیا سمجھتی ہے ، کیا سوچتی ہے ، کتنی بے حس اور لاپرواہ ہے ۔ اسے مجھ سے کیا
غرض ہے ، کیا تعلق ہے؟ اتنا پھسپھسا رشتہ اتنی مدت سے قائم ہے! دفعتاً اس نے اس عورت
سے ، جو برج صدی سے اس کی بیوی تھی ، شدید بیزاری اور لاتعلقی محسوس کی ۔ اس کے بازو کے

بھٹکے سے ہٹا کر وہ اٹھا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ چاند اوپر آگیا تھا اور رات میں جان پڑ رہی تھی۔ آگ کی روشنی اب سارے آسمان پر پھیل چکی تھی اور دور کی موسیقی کی طرح آوازیں کبھی مدھم کبھی تیز آ رہی تھیں۔

عذرا کی آنکھ کھلی اور اپنے آپ کو اکیلے پا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر آنکھیں مل کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور نعیم کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

”نعیم،“ اس نے سہم کر کہا، ”شہر میں شاید فساد ہو گیا۔ گیٹ پر چوکیدار۔۔۔۔۔“

نعیم نے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر یکساں، سپاٹ آواز میں بولا:

”نکل جاؤ یہاں سے۔“

عذرا کی آنکھوں کے آگے سے اندھیرے کا ایک ریلا تیزی سے گزر گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی پرانی خوبیدار ہوئی، لیکن اب عمر کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ وہ چکرا کر سٹول پر بیٹھ گئی۔ نعیم نے پلنگ پر سے ڈریسنگ گاؤن اٹھایا اور اسے پہنتا ہوا باہر نکل گیا۔

گیٹ پر چوکیداروں نے اسے باہر نکلتے ہوئے حیرت سے دیکھا۔ سڑک لمبی اور سنسان تھی اور بجلی کے کھمبوں پر روشنیاں سستی اور یکسانیت سے جل رہی تھیں۔ جب کبھی وہ کھمبے کے نیچے سے گزرتا تو دو چار برساتی پتنگے اس کے بالوں پر گرتے، یا کسی کوٹھی کا کتا اس پر بھونکتا۔ اس کے علاوہ اسے اپنی تنہا مسافت میں کوئی نہ ملا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا گیا حتیٰ کہ سڑک داہنی طرف مڑ کر شہر کی حدود میں داخل ہو گئی۔

وہ ایک بازار میں سے گزر رہا تھا جہاں اندھیرا تھا اور تمام دکانیں بند تھیں دکانوں کے تختوں پر جگہ جگہ چارپائیاں بچھی تھیں جن پر سے سوتے ہوئے لوگ اٹھ کر جانے کہاں جا چکے تھے۔ کئی ایک چارپائیوں پر آوارہ کتے چڑھ کر بیٹھے اونگھ رہے تھے یا مکر وہ آوازوں میں رو رہے تھے۔ پھر ایک چھوٹی سی گلی آئی جسے پار کرنے پر دوسرا بازار شروع ہوا جس میں بجلی کے کھمبوں پر روشنیاں تھیں اور پتنگے تھے۔ چارپائیاں اسی طرح خالی پڑی تھیں اور کتے اسے دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگے تھے۔ یہ بازار بہت گندا تھا اور کھانے پینے کی اشیاء بکھری پڑی تھیں۔ بازار کے وسط میں نعیم کا پاؤں کسی پھل کے پھلکے پر سے پھسلا اور وہ پیٹھ کے بل زمین پر آ رہا۔ اس نے اٹھ کر ایک سلیپر، جو اتر گیا تھا، پہنا اور پھر چل پڑا۔ اس کے بعد ایک اور اسی قسم کا بازار آیا جس میں آم اور خربوزوں کے پھلکے اور کتوں سے بچتا بچاتا وہ گزرتا رہا۔ کتے آوارہ اور کاہل تھے اور صرف بھونکنے یا رونے پر مصر تھے۔ کتے کا ایک پلا سامنے سے گزرتا ہوا اس کی ٹانگوں میں الجھ گیا اور وہ گرتے گرتے پھا۔ پلے نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا لیکن اس کی ماں، جو ایک خالی چارپائی پر نیم دراز تھی، قناعت سے پڑی روتی رہی۔ اسی طرح اس نے کئی اندھیری اور نیم اندھیری بدبودار کلیاں پار کیں۔ کوئی انسان اس کو نظر نہ آیا۔ صرف ملی جلی آوازوں کا

شور اور آگ کی لہک قریب آتی گئی۔ آخری گلی میں استاشور تھا کہ اس نے محسوس کیا جیسے وہ اس کے درمیان کھڑا ہے۔ گلی سنسان تھی اور وہ اکیلا وہاں کھڑا تھا۔ دونوں جانب اونچے اونچے مکان اندھیرے میں پتھریلی بے حسی کے ساتھ کھڑے تھے اور ان کے دروازے اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند تھے۔ چلتے چلتے نعیم کا پاؤں بجھل کر گلی کے درمیان بہتی ہوئی نالی میں جا پڑا اور گندے پانی کے چھینٹے اڑ کر اسکے پاجامے پر پھیل گئے۔ اس نے جھک کر سلیپر نالی میں سے نکالا اور اسے پہنتے ہوئے ایک لمحے کو اس نے اس جگہ پر اپنے آپ کو بیحد اجنبی اور تنہا اور مضحکہ خیز محسوس کیا۔ لیکن جلتی ہوئی لکڑی کی بواب اس کی ناک میں داخل ہو رہی تھی اور دھواں گلی میں پھیل رہا تھا۔ گلی کا موڑ مڑنے پر اچانک وہ اس ساری تڑپھلاہٹ کے درمیان پہنچ گیا۔

گلی ساری ایک کھلا سا احاطہ تھا جیسا کہ پرانے محلوں میں کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا ہے۔ نعیم کے عین سامنے تین چار اونچے اونچے مکان دھڑا دھڑا جل رہے تھے۔ ہوا کی کمی کی وجہ سے دھواں وہیں پر بھر گیا تھا اور چاروں طرف لوگ، جو تماشہ دیکھنے کے لیے اپنے اپنے مکانوں کے دروازوں پر اکٹھے ہو ہو گئے تھے۔ آنسو بھری آنکھوں کو بار بار پونچھ رہے تھے اور ناک صاف کر رہے تھے۔ آگ بجھانے کی کوشش کوئی نہ کر رہا تھا۔۔۔ صرف ایک فائر بریگیڈ کا انجن، جو اندر نہ آسکتا تھا، باہر سڑک پر کھڑا تھا اور چند فائر میں اس کے پتلے سے پائپ کے ذریعے سے، جو اتنی بڑی آگ کے لیے نہایت ناکافی تھا، پانی پھینک رہے تھے۔ جلتے ہوئے مکانوں کے آس پاس کے گھروں میں سے سامان نکالا جا رہا تھا۔ اور ڈرے ہوئے جسموں اور شدید خطرے کی وجہ سے خالی چہروں والے لوگ چیخ چیخ کر اندر باہر بھاگ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر پسینے کی لیکرس چل رہی تھیں اور وہ آگ میں چمک رہے تھے۔ مخالف سمت میں گلی کے فرش پر چند کنبے اپنے مختصر سامان کے اوپر بیٹھے تھے اور مکمل طور پر خالی الذہن دکھائی دے رہے تھے۔ یہ شاید وہ لوگ تھے جو جلتے ہوئے مکانوں میں سے جان بچا کر نکلے تھے اور جن کی عورتیں اور بچے رو رہے تھے اور مرد سراسیمہ کھڑے تھے۔ ایک جوان مرد، جو چیخ چیخ کر اپنے کنبے کو چپ رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔ آخر برداشت نہ کر سکا اور کود کود کر اپنی بیوی اور بچوں کو پھینک لگا۔ وہیں کھڑے کھڑے نعیم نے اس سارے منظر کے شدید الم اور مضحکے کو محسوس کیا اور چل پڑا۔ اس سارے ہجوم میں کسی نے بھی اس اکلوتے، جسم چرا کر نکلتے ہوئے انسان کی افتاد کو نہ پہچانا کہ اجتماعی انسانی افتاد اس قدر جاذب نگاہ ہوتی ہے۔

فائر انجن کے پاس پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ بلوائیوں کا ایک گروہ ایک اندھیری گلی میں سے نمودار ہو کر آنا فنا دوسری اندھیری گلی میں غائب ہو گیا۔ انہوں نے لنگوٹ اور منڈا سے باندھ رکھے تھے اور پسینے میں نہائے ہوئے سیاہ جسم آگ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ چند پولیس کے سپاہی ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ ایک ثانیہ! لیکن اس ایک ثانیے میں نعیم

اس گروہ میں ایک بیحد مانوس اور عزیز چہرہ پہچان لیا۔ بلوائیوں کے گروہ میں سے ہونے کے باوجود وہ چہرہ نعیم کے لیے محض ایک ڈر کر بھاگتے ہوئے بچے کا تھا۔ اس کے سرد مہر دل میں اس کے لیے ایسی کبھییر محبت کی لہر اٹھی جو باپ کے دل میں گمشدہ بچے کے لیے پیدا ہوتی ہے اور پہلی دفعہ اس نے اس سارے منظر میں اپنے آپ کو جذباتی طور پر شریک محسوس کیا۔

”وہ یہاں ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

وہ سرک پار کر رہا تھا جب ایک سپاہی نے بازو سے پکڑ کر اسے روکا۔

”کون ہو تم؟“ پھر بازو کی غیر معمولی سختی کو محسوس کر کے اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ”یہ کیا

ہے؟“

نعیم نے جلد جلد آستین چڑھا کر تہکا بازو آگے بڑھا دیا۔ سپاہی نے ٹارچ کی روشنی میں حیرت سے اسے اپنے ڈنڈے کی مدد سے ٹھونک بجا کر دیکھا۔ پھر اس کے لبوں پر ایک نفرت انگیز تمسخر کی مسکراہٹ نمودار ہوئی :

”کون ہو تم؟“

”میں؟“

”تو کیا میں؟“ سپاہی نے کڑک کر کہا :

”نعیم احمد خان۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“

”میں؟ کہیں نہیں۔“

”میں میں میں۔۔۔۔۔ حرامزہ۔۔۔ بیٹھ جاؤ وہاں پر۔“

نعیم سرک کے کنارے ایک دکان کے تختے پر بیٹھ گیا۔ سپاہی ادھر ادھر گھوم کر اندھیری گلیوں میں جھانکتا رہا۔ پھر ایک گلی میں سے دو اور سپاہی نمودار ہوئے۔ تینوں نے جلد جلد آپس میں باتیں کیں اور اسی گلی میں غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک انتظار کرنے کے بعد نعیم اٹھ کر چل پڑا۔

کئی سنسان بازار اور گلیاں عبور کرنے کے بعد وہ ایک کھلی سرک پر ٹھکل آیا۔ یہ سرک کوئینز روڈ کی طرح سیدھی اور خالی تھی اور دونوں طرف روشنیاں اکتاہٹ کے ساتھ جل رہی تھیں۔ اس سرک پر پھر پتنگے اس کے بالوں پر گرنے اور اکادکا رکھولا کتے اس پر بھونکنے شروع ہوئے۔ تھوڑی دور جا کر وہ ایک کوٹھی میں داخل ہوا۔ پورچ میں ایک مدھم سی بتی جل رہی تھی۔ آس پاس کوئی کتا یا چوکیدار نہ تھا۔ اس عجلت سے برآمدے میں چڑھ کر اس نے کھنٹی کے بٹن پر اٹھکی رکھی اور ایک منٹ تک اسے دبائے رکھا۔ ایک بوڑھا ملازم کوٹھی کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ کچھ دیر تک وہ حیرت سے منہ کھولے نعیم کو دیکھتا رہا، پھر اٹے پاؤں بھاگتا ہوا غائب

ہو گیا۔

”روشن محل کے نعیم میاں۔۔۔“ اس نے پھولے ہوئے سانس سے ایک ماما کو اطلاع

دی۔

تھوڑی دیر کے بعد اندر بتی جلی اور انیس نے دروازہ کھولا۔

”نعیم۔“ اس نے سر سے لے کر پاؤں تک دو تین بار اسے دیکھا پھر بازو سے پکڑ کر اندر

کھینچ لیا۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“

”گھر سے۔“

بازو سے پکڑے پکڑے راستے کے کمروں کی بتیاں جلاتا ہوا وہ اسے اپنی سٹڈی میں لے

گیا۔

”کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ نعیم نے معمولی لہجے میں کہا۔

چند لمحوں تک اسے غور سے دیکھتے رہنے کے بعد انیس کال پھلا کر جھلاہٹ اور طنز سے

ہنسا: ”تین بجے ہیں۔“

جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ماما کو چلمچی میں گرم پانی لانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر

میں پانی لے کر آگئی اور اس کے پاؤں دھونے لگی۔ اس وقت نعیم نے دیکھا کہ اس کے پاؤں

میں صرف ایک سلیپر تھا۔ اتنی دیر میں انیس نے ایک صاف پاجامہ اور سلیپر لا کر رکھ دیے۔

جب ماما چلی گئی تو نعیم تولیے سے پاؤں خشک کرنے لگا۔

”شہر میں فساد ہو رہا ہے۔“ انیس نے کہا۔

”ہاں۔“ نعیم نے جواب دیا۔ پھر انیس کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ جھینپ کر ہنسا،

”نیند نہیں آرہی تھی، میں یہاں چلا آیا۔ شکریہ۔“

”چائے پیو گے؟“

”نہیں انیس۔“ نعیم نے کہا، ”مجھے۔۔۔ بالکل نیند نہیں آرہی تھی۔“

”تو نیند آور دو کھالی ہوتی۔“

”اوہ نہیں۔۔۔۔۔ انیس۔ تم نہیں سمجھتے۔“ اس نے کرسی کی پشت پر سر رکھ کر

آنکھیں بند کر لیں۔ کئی لمحوں تک وہ اسی طرح پڑا تیز تیز سانس لیتا رہا۔ پھر سانس ہلکا ہوتا ہوتا

بالکل غائب ہو گیا۔ دفعتاً انیس کو ایک عجیب بے چینی نے گھیر لیا۔ نعیم کی آنکھیں اندر دھنس

گئی تھیں اور اس کے ماتھے پر چند پتنگے آرام سے چل پھر رہے تھے۔ اس کے بڑے سے بے

رنگ اور تھکے ہوئے چہرے کو دیکھا کر انیس کو محسوس ہوا کہ یہ ایک مرے ہوئے آدمی کا چہرہ

تھا۔ اس نے اس کے قدیم اندرونی دکھ کو صاف طور پر اس کے بے حس چہرے پر دیکھا اور اسے خیال ہوا کہ یہ صدیوں کا تنہا، مصیبت زدہ انسان آج اس کے گھر میں آکر مر گیا ہے۔ وہ گھبرا کر جلد جلد فساد کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ نعیم نے آنکھیں کھولیں اور آگے جھک کر بیٹھ گیا۔

”نہیں انیس میں۔۔۔۔۔ تکلیف میں ہوں۔ میری بات سنو۔ میں اس لڑکی کے ساتھ سویا اور پھر اسے چھوڑ کر چلا آیا۔ طویل عرصہ گزر گیا ہے، وہ آج بھی میرے دل پر ہے۔ آج بھی۔“

”کون؟ کب؟“

”ایک لڑکی تھی۔ بہت پہلے۔“

”کون سی ایسی بات ہے۔“ کچھ دیر کے بعد انیس نے کہا۔ ”عمر میں کئی بار انسان کو محبت ہو جاتی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ چند مذہبی رسوم۔۔۔۔۔“

”نہیں، یہ بات نہیں، محبت میں سب کچھ آ جاتا ہے، رسوم اور رواج اور سب۔ میں ان باتوں میں یقین نہیں رکھتا۔ لیکن محبت کہاں تھی۔ میں محبت کے بغیر اس کے ساتھ سو گیا، حیوانیت کی خاطر، اپنی بد بختی اور افتادہ کا بدلہ لینے کی خاطر۔ کمزور اور معصوم لڑکی۔ میں نے اسے تباہ کر دیا، محبت کے بغیر۔ اور اس کے بعد سے وہ میرے دل پر ہے۔ میں کسی بھی عورت سے محبت نہیں کر سکا، اپنی بیوی سے بھی نہیں۔ اتنی مدت ہوئی میں کبھی دل میں امن لے کر اس کے ساتھ نہیں سو سکا۔ یہ سب اسی کی وجہ سے ہے۔ وہ ہمیشہ میرے دل پر سوار رہی۔۔۔۔۔ اور میرے دل پر وہ بھی سوار رہا۔۔۔۔۔“ نعیم نے سستی سے آنکھیں اٹھا کر انیس کی طرف دیکھا۔

”وہ شخص جسے میں نے قتل کیا۔“

”قتل؟“

”نہیں میں نے اسے کوئی ضرب نہیں لگائی۔ صرف میں نے اسے قتل کر دیا۔ میدان جنگ میں وہ ایک بہادر اور خوش بخت شخص تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کی باتیں کیں اور میں نے اپنی بد بختی میں خواہش کی کہ وہ مارا جائے۔ میں بارود لا رہا تھا کہ میں نے انہیں دیکھا۔ بندوقیں سیدھی کیے ان کی سیاہ لمبی قطار بڑھتی آ رہی تھی۔ خندق میں سے اس نے پوچھا: ”نعیم تم زخمی ہو؟“ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دلیر آدمی تھا۔ مجھے پچانے کے لیے باہر نکل آیا اور انہوں نے اسے پھلانی کر دیا۔ میں وہاں سے بھاگ آیا۔“ وہ دیر تک رکا رہا۔ ”لیکن اس کا ڈھلکی ہوئی مونچھوں والا زرد چہرہ چاند کی روشنی میں ابھی تک وہیں پڑا ہے۔ وہ کبھی میرے سامنے سے نہیں ہٹا۔ کبھی نہیں۔ اس کے بعد ایک مدت گزر گئی ہے۔ میں کسی شخص سے قدرتی

تعلقات قائم نہیں کر سکا۔ کوئی دوست نہیں بنا سکا۔ میں ہمیشہ لوگوں کی موجودگی میں بے چینی محسوس کرتا رہا، کبھی کسی پر اعتماد نہیں کر سکا۔ بتاؤ انیس میں کب تک زندگی کے جرائم کو ساتھ لیے لیے پھرتا رہوں گا۔ یا میں محض تمہارے سامنے ان کا اعتراف کر کے سرخرو ہو سکتا ہوں؟ بتاؤ۔۔۔

انیس خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پہلی دفعہ وہ اس شخص کے لیے گہری ہمدردی اور رنج محسوس کر رہا تھا۔ شاید پہلی بار اس پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ یہ شخص، جسے وہ اتنے عرصے تک احمق سمجھتا رہا تھا، آخر اتنا احمق نہ تھا۔ کہ وہ بہت کچھ جانتا تھا مگر صرف سزا بھگت رہا تھا، کہ اس میں اتنا ضمیر، اتنی ذہانت موجود تھی کہ ایک طویل عرصے تک بے زبانی اور مظلومیت کے ساتھ ایک مسلسل موت کی اذیت برداشت کر رہا تھا۔

”میں اپنے ضمیر کے ستم اٹھاتا رہا ہوں۔“ وہ کہہ رہا تھا، ”میں اسے ختم نہیں کر سکا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم قابل رشک ہو۔ تم نے اسے ختم کر دیا ہے۔ مگر کیسے؟ کیسے؟ خدارا بتاؤ۔۔۔“

”پچھتاوے۔۔۔۔۔ ہمارے سب سے لاحقہ جذبے ہیں۔“ انیس الرحمان نے کہا لیکن یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو بیحد کمینہ اور احمق محسوس کیا۔

”اور آج میں نے علی کو بھی دیکھا ہے۔“ نعیم بولا، ”میرا بھائی جسے میں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ یہیں پر ہے۔ وہ میرا خون ہے پر میں نہیں جانتا کہاں پر ہے۔ اور میں ایک دفعہ ایک دوست سے باتیں کی تھیں جو مرچکا تھا۔ کیا دیکھتے ہو، یہ سچ ہے۔ میں نے صاف طور پر، جیسے تم میرے سامنے بیٹھے ہو، دیکھا کہ وہ شخص مرچکا ہے۔ اور وہ میرا دوست تھا اور مجھ سے ہمکلام تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد کسی نے مجھے بتایا کہ وہ میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ لیکن موت تو ایک ہی ہوتی ہے اور میں نے اسے دیکھا ہے۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس کی موت کا ذمہ دار میں ہوں۔“

”خیال ہوتا ہے خیال ہوتا ہے۔“ انیس خفا ہو کر بولا، ”تمہاری سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ اوٹ پٹانگ خیال دوڑاتے رہتے ہو۔ مت سوچو۔“

”اور آج شام نجمی کو میں نے دیکھا۔“ نعیم اسی طرح دیر تک باتیں کرتا رہا۔ انیس نے پھر اسے نہیں ٹوکا، بولنے دیا۔ وہ دینا میں مستقل چھوٹے بڑے دکھ سہتا ہوا قدیم شریف انسان تھا، جس کے دل پر سے، سارے وجود پر سے ایک عظیم بوجھ آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا بوجھ، جسے وہ بے زبان، بار بردار جانور کی طرح ایک مدت تک اٹھائے اٹھائے پھرا تھا۔

آخر کار وہ تھک کر چپ ہو گیا اور کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر اونگھنے لگا۔ تھوڑی دیر

کے بعد وہ وہیں پڑا پڑا سو گیا۔ باہر ایک نیا دن طلوع ہو رہا تھا۔
 اس روز کوئی وجہ بتائے بغیر وہ عذرا کو لے کر ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو گیا۔
 روشن محل کے ملازم کئی روز تک اس کا سلمان وہاں پہنچاتے رہے۔
 پارلیمنٹ ہاؤس میں عجیب گہما گہمی تھی۔ ہند کی مکمل آزادی کے لیے آخری گفت و شنید
 ہو رہی تھی۔ لارڈ مونٹ بیٹن اٹھارہ اٹھارہ کھنٹے پارلیمنٹ میں اور گورنر جنرل ہاؤس میں کانفرس
 بلاتے رہتے تھے اور ملک بھر سے سول نافرمانی کی تحریک کی وحشتناک خبریں وصول ہوتی رہتی
 تھیں۔ ملک کی دونوں بڑی پارٹیوں، کانگریس اور اور مسلم لیگ، کے لیڈر دلی میں جمع تھے
 اور وائسرائے مونٹ بیٹن سے ملنے میں مصروف تھے۔ ہر طرف عجیب افراتفری کا عالم تھا۔
 ملک کے مستقبل کے متعلق ہر کوئی اپنی سی پیش گوئی کر رہا تھا۔ لیکن ہر کوئی اپنی اپنی جگہ
 مکمل بے یقینی اور بے اعتمادی کی حالت میں تھا۔ روزانہ زندگی کا ہر کاروبار معطل ہو چکا تھا۔
 ملک کے بٹوارے کی خبریں گرم تھیں اور لوگ ایک جاں گسل درمیانی وقفے سے گزر رہے تھے۔
 چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر ابتری کا وہ دور تھا کہ پہلے کبھی نہ آیا تھا۔

وزارت داخلہ کے پارلیمنٹری سیکرٹری کے دفتر میں بھی ایک خاموش ہنگامہ تھا جس میں
 سب شریک تھے۔ اسٹنٹ سیکرٹری، آفس اسٹنٹ کلرک، چپراسی اور تمام چھوٹے بڑے اہلکار
 انیس کی سربراہی میں اپنے کام میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ کانفرس روم کی طرف اور
 پارلیمنٹ کی عمارت کے باہر مظاہرہ کرنے والے ہجوم کی طرف بھی متوجہ تھے۔ صرف نعیم تھا جو
 بیچارہ پھر رہا تھا۔ دفتر آتے ہی اس نے کام میں مصروف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن تھوڑی
 ہی دیر میں اسے سخت نیند آنے لگی اور وہ قلم رکھ کر کرسی پر ہی سو گیا۔ چند منٹ کے بعد
 جب وہ جاگا تو حیرت انگیز طور پر پُر سکون تھا اور ہر چیز اجنبی اجنبی اور خوشگوار لگ رہی تھی۔ وہ
 باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے آگے جا کھڑا ہوا۔ باہر ایک نہایت چمکدار اور گرم صبح تھی اور دھوپ
 چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ پارلیمنٹ کی عمارت جہاں ختم ہوتی تھی ایک کھلا سا صاف ستھرا میدان
 تھا جس میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ سایہ دار درخت لگے تھے۔ اس سے پرے چوڑی سڑک
 تھی جس پر پولیس کا پہرہ تھا۔ پھر ایک لمبا چوڑا ریلٹا پھیلتا ہوا ہجوم تھا جو نعرے لگا رہا تھا اور
 پولیس کے پہرے کو توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کا ہلکا ہلکا شور تقریباً شہد کی
 مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح نعیم تک پہنچ رہا تھا۔ وہ آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑکی
 میں کھڑا اس گرد کے بادل کو دیکھتا رہا جو ہزاروں پاؤں پٹکتے اور کودتے ہوئے لوگوں میں سے اٹھ
 اٹھ کر ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ اس وقت وہاں کھڑے کھڑے نعیم نے محسوس کیا کہ وہ ان
 سب سے الگ تھلگ، اوپر کہیں، تنہا کھڑا ہے۔ اس شور مچاتے ہوئے ہجوم اور مشین کی طرح
 کام کرتے ہوئے اہلکاروں سے اوپر، اس تنہا مقام پر جہاں وہ کھڑا ہے، فضا خاموش اور خوبصورت

ہے اور روشنی سارے میں پھیلی ہوئی ہے اور زندگی صاف، نیلے آسمان کی طرح پر امن اور وسیع ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے مسرور سانس لیے اور انیس الرحمان کی موجودگی کو جو اس دوران میں اگر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا، قطعی محسوس نہ کیا، جب اس نے آنکھیں کھولیں تو انیس باہر دیکھتا ہوا بڑبڑاتا رہا تھا :

”غول - غول - شور مچاتے ہوئے، اچھلتے کودتے دھکیلتے ہوئے، بے ترتیب اور غلیظ -“ ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی، ”سُوروں کے گلے کی طرح -“ نعیم بے خیالی سے اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ دوبارہ جا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تو نعیم برآمدوں میں ٹہلتا ہوا کانفرنس روم کی طرف نکل آیا۔ اس وقت وہ تمام اس کے سامنے سے گزر کر اندر داخل ہوئے : نہرو، راج گوپال اچاریہ، پٹیل، کرپلانی، جنح، لیاقت، بلدیو سنگھ۔ ایک ایک کر کے سب۔ پھر دروازے بند کر دیے گئے۔ وہ ٹہلتا ہوا واپس کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ پھر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

دور، ہجوم میں اسے دوبارہ وہ گمشدہ، عزیز چہرہ نظر آیا۔

”علی! علی!! گرم دھات کی طرح پگھل کر اس نے دھرایا اور آپ سے آپ اس کا تندرست بازو اس سمت میں اٹھ گیا۔ وہ پسینے اور گرد میں اٹا ہوا، بازو بلند کر کے اچھلتا ہوا سیاہ محبوب جسم ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ نعیم کا بازو آپ سے آپ نیچے گر گیا اور حیران پریشان ٹھاپیں ہزاروں انسانی سروں اور بازوؤں کے اوپر ابھرنے لگیں۔ اب؟

اب اسکے سامنے علی نہ تھا، ہجوم بھی نہ تھا۔ اس کے سامنے اس کی کم شدہ جوانی تھی، اس کی ساری گزشتہ جدوجہد تھی، اس کی زندگی تھی۔ وہ تمام ارادے، امنگیں، ولولے، ساری جدوجہد محض اس دن کے لیے کی گئی تھی۔ اس نے سوچا: ”کہ آخر کار ہم بھلا دیے جائیں، کہ ایک طویل اور تکلیف دہ زندگی بسر کرنے کے بعد بوڑھے اور صرف بوڑھے ہونے کے لیے اس قدر اکیلے رہ جائیں؟ یہ کیا ہے؟ میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ ساری زندگی، سارے دکھ کے معنی تلاش کرتا ہوا میں کہاں آپہنچا ہوں؟ محض یہاں“۔۔۔ اس وقت اس جوش سے چلاتے ہوئے ضدی اور گستاخ اور گرد آلود ہجوم کو دیکھ کر وزنی اور کند احساس کا ایک ریلا آیا، اور جیسے سمندر کی تہہ میں بیٹھا ہوا پتھر گہرے طوفان میں اک دم اٹھ آتا ہے، نعیم کے دل میں بھاری اور کند درد پیدا ہوا۔ بچھڑ جانے کا، پیچھے رہ جانے کا، بھٹک جانے کا، ضائع ہو جانے کا! چند منٹ کے لیے وہ بالکل خالی الذہن ہو گیا۔

پھر اس خلا میں سے اس کا موجودہ دکھ ابھرا۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اس نے تصور کیا اور صاف طور پر دیکھا کہ انیس اپنی تمام تر حیوانی قوت کے ساتھ اٹھ رہا ہے، بیٹھا رہا ہے، مڑ رہا ہے،

طرف دیکھا لیکن وہ بھی اس کی آزادی کے معنی سے بے خبر ہے۔
آپ سے آپ مسکراتا ہوا وہ مختلف سڑکوں پر چلتا رہا۔ پھر ایک جگہ دور سے روشن محل کی عمارت منظر پڑنے پر رک گیا۔

”نجمی آج میں نے رہائی پالی ہے۔ اس شے سے جس نے مجھے تمہارا گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ تمہیں پتا چلتا تو ضرور خوش ہوتیں۔ تم میری بیٹی ہو۔“ اس نے زیر لب کہا۔
پھر اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔

چند روز کے بعد فسادات زور پکڑ گئے اور لوگ شہر چھوڑنے لگے۔ ریل گاڑیاں کم پڑ گئیں۔ تو جان بچا کر بھاگنے والوں کے قافلوں کے قافلے پیدل چل پڑے۔ ملک کے تمام حصوں سے فسادات اور لوگوں کے بھاگنے کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ گوا بھی تک ایسی گفت و شنید کا کوئی آخری فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن ملک کے بٹوارے کے متعلق ایک عام یقین پھیل رہا تھا۔ وہ جسے اب تک ملک کی عام آبادی نے محض خیال آرائی سمجھ رکھا تھا حقیقت بنتی ہوئی منظر آئی تو لوگ دفعتاً خالی الذہن ہو گئے۔ فسادات کی حیوانیت سر پر سوار ہوئی تو بالکل بوکھلا گئے اور گھر بار چھوڑ چھاڑ، منزل کا تعین کیے بغیر بھاگ اٹھے۔

روشن محل کے وسیع ہال میں کنبے کے سبھی افراد جمع تھے، سوائے نعیم کے۔ عذرا جو ابھی ابھی آئی تھی، بظاہر سکون کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسے کے ساتھ لگی زرد رو نجمی سہمی ہوئی سیدھی بیٹھی تھی۔ آگے دو کرسیوں پر پرویز کی بیوی اور لڑکا آمنے سامنے تھے۔ دوسرے بڑے صوفے میں روشن آغا اور ان کی بیوی دھنسے ہوئے تھے۔ صرف پرویز ہاتھ پشت پر باندھے، سر جھکائے، کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ کمرے کی فضا پر عجب گھٹن اور اداسی طاری تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔

پرویز دو کھنٹے سے متواتر بول بول کر اب خاموش ہو چکا تھا۔ صبح سے وہ روشن آغا کو سب کے ساتھ پاکستان جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے دلی سے لاہور جانے والے ہوائی جہاز پر سب کی سیٹیں بک کرائی تھیں اور سلمان، روشن آغا کو خبر کیے بغیر، باندھا جا چکا تھا۔
”یہ میرا گھر ہے۔ اس کی بنیاد میرے بزرگوں نے رکھی تھی۔ اور یہیں ہم سب پیدا ہوئے۔ کوئی کیا کہے گا؟“ وہ سارا وقت صرف یہی کہتے رہے اور پرویز کے اور دوسرے گھر والوں کے تمام دلائل بیکار ثابت ہوئے۔

اب سب بیکار تھا۔ کبھی کبھی پرویز ناامیدی کے عالم میں چلا اٹھتا: ”روشن پور یہاں بیٹھ کے آپ کہتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ روشن پور کے لوگ ابھی تک آپ کے وفادار ہیں؟ آج آپ روشن پور میں داخل نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے منشی کو اور ہمارے سب کارندوں کو قتل کر دیا ہے۔ آج ہمیں وہاں کوئی نہیں جانتا۔“

”پاکل پن کی باتیں مت کرو۔“ وہ جواب دیتے۔۔

آخر پرویز جیبوں میں ہاتھ ڈال کر، ٹانگیں پھیلا کر ان کے درمیان اکھڑا ہوا: ”تو پھر ہم سب جا رہے ہیں۔“ اس نے دھیمے، قطعی لہجے میں کہا۔

روشن آغا نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو نظریں چرائے خاموشی سے میٹھی رہی۔ پھر انہوں نے سوالیہ نظروں سے عذرا کو دیکھا۔

”نعیم نے عمر بھر بھلا کسی کی بات مانی ہے؟“ پرویز غصے سے بولا، ”عذرا ہمارے ساتھ چل رہی ہے۔ وہ جائے نہ جائے۔“

روشن آغا نے دوبارہ اپنی بیوی کو دیکھا۔ سیکھت بیحد اکتا کر انہوں نے کہا: ”تو پھر شوق سے جائیے“ اور منہ پھیر کر بیٹھ گئے۔ پرویز تھوڑی دیر گھبراہٹ میں چکر لگانے کے بعد ٹوپی اور برساتی اٹھا کر بغیر کچھ کہے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

سہ پہر کے وقت وہ سب ایئر پورٹ کو روزانہ ہوئے۔ روشن آغا اپنے کمرے کے دروازے پر سب روتے ہوئے گھر والوں کو الوداع کرنے کے لیے آئے۔ جاتے جاتے سب نے ان سے وعدہ کیا کہ حالت بہتر ہونے پر واپس آجائیں گے اور اگر خدانخواستہ خدانخواستہ حالت خراب ہوگئے تو روشن آغا یقیناً ان سے آن ملیں گے۔

شام تک روشن محل کے تمام نوکر غائب ہو گئے۔ چوکیدار اور خاکروب تک۔ صرف روشن آغا کا ملازم خصوصی، حسین، وفاداری سے ان کے بند دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہا۔ رات سے پہلے پہلے روشن محل کو آگ لگا دی گئی۔ بارش رک گئی تھی اور بلوائیوں کے تین گروہ یکے بعد دیگرے جانے کہاں سے وارد ہوئے اور نہایت خاموشی سے اس مہیب، دو منزلہ عمارت کا مشرقی حصہ جلنے لگا۔ نعیم اور عذرا کے جانے کے بعد یہ حصہ خالی پڑا تھا۔ روشن آغا اور حسین پچھلے دروازوں سے جان بچا کر بھاگے۔ جاتے جاتے انہوں نے بلوائیوں کی جھلک دیکھی۔ وہ لمبے تڑنگے سکھ کسان اور چھوٹی ذاتوں کے کالے کالے لوگ تھے جو ان کا سلمان نکال کر لان میں جمع کر رہے تھے اور اسے آگ لگا کر بھتوں کی طرح شور مچا رہے تھے۔

کئی ایک کوٹھیاں جل رہی تھیں۔ پرانے، وسیع اور جانے پہچانے گھر جن میں عمر بھر آنا جانا رہا تھا۔ اور ان کے باسی، پرانے وقتوں کے نجیب الطرفین تعلقہ دار اور سرکاری افسر جو ایسے اچھے دوست تھے۔ سڑک پر جانے سے احتراز کرتے ہوئے روشن آغا اور حسین مکانوں کے پیچھے پیچھے کھیتوں اور غیر آباد زمینوں میں سے بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے۔ رات پڑ چکی تھی۔ گڑھوں میں بارش کا پانی رکا ہوا تھا وقفے وقفے پر وہ دونوں تاریکی میں تیز تیز چلتے ہوئے ایک دم پھسل کر کسی گڑھے میں گر پڑتے۔ حسین اپنے آقا کو کمر سے پکڑ کر باہر نکالتا اور وہ

اپنے خاص انداز میں کوسے ہوئے پھر بھاگنے لگتے۔ دونوں سر سے پاؤں تک کپڑے آلود تھے۔ ایک جگہ پر تھک کر روشن آغا رک گئے اور ہانپنے لگے۔ دائیں جانب ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی جس میں روشنیاں جل رہی تھیں اور پردے سکون کے ساتھ پھڑپھڑا رہے تھے۔

”حسین،“ روشن آغا نے اداسی سے پوچھا، ”تم کبھی ایسی راتوں میں باہر سے گزرے ہو جب کہ اندر لوگ اپنے پردوں کے پیچھے اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہوں۔“

”ہاں سرکار۔۔۔“

”بیشک بیشک۔ پر کیسا عجیب لگتا ہے۔“

وہ پھر چل پڑے۔ حسین آگے نکلتے ہوئے بولا: ”مجھے آگے جانے دیں حضور۔ گڑھوں کا پتا چلتا رہے گا۔ آپ بچ جائیں گے۔“

لیکن اندھیرے اور عجلت کے باعث وہ ایک دوسرے کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ دے سکے اور جب حسین تاریکی میں ہاتھ پھیلا کر کسی پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں گرتا تو پیشتر اس کے کہ اس کے منہ سے آواز نکلتی روشن آغا اسی انداز میں، اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے ہوا میں ہاتھ چلاتے ہوئے، دھڑام سے اس کے اوپر گر پڑتے۔ انہیں عجیب سا احساس ہوا۔

آخر ٹھوکریں کھاتے ہوئے وہ ہوائی اڈے کو جانے والی سڑک پر نکل آئے۔ سڑک پکی تھی اور ذرا فاصلے پر ایک چھوٹا سا پل تھا جس کے نیچے برساتی نالہ شور مچاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اس سے پرے ایئرپورٹ کی عمارت کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ روشن آغا نڈھال ہو کر پل پر بیٹھ گئے۔ بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ وہ وہیں پر بیٹھے رہے اور بارش ان کے جسموں سے گڑھوں کا کپڑا دھوتی رہی۔

”حسین۔۔۔ ہم اتنے اچھے دوست ہو سکتے تھے۔“ اچانک روشن آغا نے کہا۔

”کیس؟ ہی ہی ہی۔۔۔ میں آپ کا خادم سرکار۔۔۔“

یہ سب بیکار ہے۔ ”انہوں نے ہاتھ کی ہلکی سی جنبش سے کہا، ”کوئی کچھ بھی نہیں ہے۔ آج جہاں پر تم ہو وہیں پر میں۔۔۔ تم نے دیکھا؟ یہ زندگی کی آخری سطح ہے۔ آخری اور یقینی۔۔۔“

پھر ان کی منظر اندھیرے میں چمکتی ہوئی کلائی کی گھڑی پر پڑی۔ نوبے تھے۔ جہاز چھوٹنے میں ابھی دو گھنٹے ہیں۔ انہوں نے سوچا، وہ کچھ دیر ابھی اور سستا سکتے ہیں۔ اور زندگی کے اس مضحکہ پر غور کر سکتے ہیں، اور یہ بارش کتنی سکون بخش ہے

(۴۵)

جب وہ دلی سے چلے تو پچاس مردوں عورتوں بچوں اور چند میل گاڑیوں کا مختصر سا صاف ستھرا

قافلہ تھا۔ تین روز کی مسافت کے بعد وہ قافلہ ڈیڑھ ہزار انسانوں اور اتنے ہی جانوروں کے ایک لمبے چوڑے جلوس کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اور ابھی وہ انبالے سے دس میل دور تھے۔ اس جلوس کی تشکیل میں کسی تجویز یا ترتیب کا لحاظ نہ رکھا گیا تھا۔ اگر ڈھنگ سے چلایا جاتا تو وہ دو فرلانگ مربع میں بہ آسانی سما سکتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ جو لوگ درمیان میں چل رہے تھے۔ انہیں دور دور تک قافلے کی حدود کا پتا نہیں تھا۔ اگر ہوائی جہاز پر چڑھ کر دیکھا جاتا تو ایک بڑا سا گھججورا، ہزاروں چھوٹی بڑی ٹانگوں والا، زمین پر چلتا ہوا دکھائی دیتا۔

وہ پچاس، جو ابتدا میں ساتھ چلے تھے، ابھی تک یکجا تھے۔ وہ قافلے کے عین درمیان میں چل رہے تھے اور یہی ایک ترتیب تھی جو قائم رہ سکی تھی۔ یعنی قافلے کا حجم، ان کو مرکز قرار دے کر، چاروں طرف بڑھنا شروع ہوا تھا اور ایک سا بڑھتا چلا گیا تھا جیسے گھججورے کا پچہ تیزی کے ساتھ جوان ہو جائے، یا ساحلی سمندروں پر جب کوئی کچھوا مر کر تیرنے لگے تو جیسے جھاگ اس کے چاروں طرف اکٹھا ہونا شروع ہو جائے۔ گو ان کی دوستی چند روزہ تھی پھر بھی ان میں ایک عجیب غیر معروف قسم کا احساس رفاقت پیدا ہو چلا تھا، جیسے چند ناواقف ٹورسٹ کسی شہر میں جا نکلیں اور وہاں بغاوت شروع ہو جائے۔ پھر دوسروں کے مقابلے میں انہیں احساس برتری کچھ یوں بھی تھا کہ ایک تو وہ تعداد میں کم اور خوش پوش تھے، دوسرے ان کی آپس کی شناسائی کی مدت نسبتاً کئی گھنٹے زیادہ تھی، اس لحاظ سے یہ جماعت اس غریب الوطن قافلے کی گویا ارسٹو کریسی تھی۔ دلی پولیس کے چند سپاہی، جوان کے ساتھ ہوئے تھے، زیادہ تر ان کے ساتھ ہی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ یہ بات بھی انہیں دوسروں سے ممیز کرتی تھی، گو ان کی زیادہ تر باتیں اسی قسم کی ہوتیں کہ مثلاً نئے آنے والوں کی فوج گندی اور بدبودار تھی اور کہ وہ اپنے ہمراہ گھوڑوں اور بیلوں کے علاوہ گدھے، خچر، کتے، بلیاں اور مرغیاں تک لے آئے تھے۔ اس موضوع کے پچاسوں افراد کے سر شرم سے جھک جاتے جیسے کہ اس کی ذمہ داری براہ راست ان پر آتی تھی۔

جنھوں نے کبھی تھکے ماندے، بے گھرا در دہشت زدہ لوگوں کے درمیان سفر کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایسے قافلوں میں سب سے بڑی وبا افواہوں کی ہوتی ہے۔ ایک سے ایک بے بنیاد افواہ منٹوں میں قافلے کے ایک سرے سے دوسرے تک پھیلتی جا رہی تھی اور نئی سے نئی پھیلتی تھی، یعنی کہ کسی افواہ کی عمر چند گھنٹے سے زیادہ کی نہ ہوتی تھی۔ لوگ اتنے خالی الذہن ہو چکے تھے کہ محض چلتے جانے اور افواہیں پھیلانے کے سوا لگتا تھا کہ ان کو کوئی کام ہی نہ تھا۔ یہ نہیں کہ وہ جان بوجھ کر افواہیں پھیلاتے تھے یا یہ کہ ان کے درمیان کوئی کنبہ افواہیں پھیلانے کے ماہروں کا موجود تھا، بلکہ یوں ہوتا کہ بات پچیت کے دوران کسی کے منہ سے نکلا ہوا کوئی لفظ کسی دوسرے کے سر پر سارے وقتوں کی تھکن، بھوک پیاس اور دہشت بن کر سوار ہو جاتا

اور قافلے کی تمام تر بے ترتیبی کے باوجود برقی روکی طرح آنا نانا ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیل جاتا۔ زیادہ افواہیں دو قسم کی تھیں اور دونوں انتہائی متضاد قسم کی تھیں۔ یا تو وہ انتہائی دہشت پسند تھیں، مثلاً یہ کہ اگلے پڑاؤ پر قافلے پر حملہ ہو گا، یا انتہائی پر امید کہ اگلے شہر میں حکومت نے ان کے لیے نئے لباس اور تازہ کھانے مہیا کرنے کا انتظام کر رکھا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہی دو قسم کی افواہیں بار بار الفاظ کا مختلف جامہ پہن کر لہروں کی طرح آ رہی تھیں اور کسی کے پاس اتنی فرصت نہ تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے رک کر اس شدید مضحکہ خیز صورت حال کو محسوس کر سکتا۔ لوگ افواہوں میں باتیں کرتے، عام روزمرہ کی کوئی بات نہ کرتا۔ تازہ ترین خبر یہ تھی کہ انبالے کے سٹیشن پر ان کے لیے ایک خالی ریل گاڑی تیار کھڑی تھی جس کے ساتھ ایک بہت بڑا باورچی خانہ لگا ہوا تھا اور پولیس کی بھاری جمعیت ان کی حفاظت کے لیے موجود تھی۔

ان پچاس میں نعیم بھی تھا۔ اس نے تین روز سے کسی سے بات نہ کی تھی۔ اس کا بڑھی ہوئی داڑھی والا چہرہ غلیظ اور لباس گندہ ہو چکا تھا۔ ایک موقع پر رات کے اندھیرے میں جب قافلے میں بلاوجہ بھگدڑ مچی تو اس کا ایک جوتا گم ہو گیا تھا۔ دوسرا اس نے خود اتار کر پھینک دیا۔ اس کی جیبیں خالی تھیں اور کوئی سامان ساتھ نہ تھا۔ اپنے آپ میں مگن چلتا ہوا کبھی کبھی وہ خود بخود مسکرانے لگتا، پھر سنجیدہ ہو جاتا، پھر پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھتا اور چلتا جاتا۔ اس نے ایک دفعہ بھی یہ یاد کرنے کی کوشش نہ کی تھی کہ عذرا سے اس کی کیا باتیں ہوئیں، کن حالات میں وہ اس سے جدا ہوا اور کیوں کر گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کر باہر نکل آیا اور اس قافلے میں شریک ہوا تھا۔ سب کچھ آپ سے آپ ہوتا چلا آیا تھا۔ کبھی کبھار اسے صرف اتنا محسوس ہوتا کہ وہ ایک ان دیکھی، ان جانی منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا جہاں پہنچنے سے پہلے۔۔۔۔۔ یا جہاں پہنچنے پر، یا پہنچنے کے بعد،۔۔۔۔۔ ایک بہت بڑی قوت، خوبصورت اور جاندار اور لازوال اس میں پیدا ہوگی، پتا نہیں کیسی اور کیوں کر، لیکن اس کے نتیجے کے طور پر وہ اڑنے لگے گا۔ یا ہوا میں تحلیل ہو جائے گا یا زمین کے اندر چلا جائے گا یا جانے کیا، پر کچھ نہ کچھ ضرور ایسا ہوگا جو زبردست اور معرکہ خیز ہوگا۔ اس عظیم قوت کی ہلکی ہلکی لہریں وہ ابھی سے اپنے اندر پھوٹتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ اور اس سرشاری میں ان سب کے ساتھ چل رہے تھا، بھاگ رہا تھا، رک رہا تھا اور کھا رہا تھا۔ اپنے گرد ونواح سے اس کی بے خبری اور لاپرواہی اور اس کی بے سرو سامانی اور عجیب و غریب ہیئت دیکھ کر چند عورتیں، جو ایسے موقعوں پر خصوصاً تو ہم پرست ہو جاتی ہیں، مجذوب سمجھ کر اس کی نگہداشت کر رہی تھیں۔ وہ کچھ نہ کچھ کھانے کو اسے دیتی رہتیں اور مستقبل کے متعلق بے سرو پاسوات کرتی جاتیں جن کا جواب دیے بغیر اور شکریہ ادا کیے بغیر وہ ان سے خوراک قبول کرتا اور بھاگتا جا رہا تھا۔ عورتیں خاموشی کو معنی

خیز سمجھ کر اور بھی مرعوب ہو گئی تھیں اور ہر وقت اس پر بھاہ رکھنے لگی تھیں۔ مردوں میں سے زیادہ تر نے اسے محض منجبوط الحواس سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ انبالہ پہنچنے سے پہلے پہلے انہیں طوفان خیز بارش نے آیا۔

بارش کی تیز بوچھاڑ سہتے ہوئے وہ متواتر پانچ گھنٹے تک انبالہ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اور باہر سڑک پر کھڑے رہے۔ اس دوران میں دو گاڑیاں دلی کی جانب سے آئیں اور رُکے بغیر سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر گئیں۔ ان کی تنگی ڈھلوان چھتوں پر بھی اتنے ہی لوگ بیٹھے تھے جتنے کہ ان کے اندر، اور تیز ہوا میں اڑنے اور گیلی چھت پر سے پھسلنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے عجیب و غریب ہیئت میں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ نعیم کو یاد آیا کہ جب وہ بچپن میں سفر کیا کرتا تھا تو شیڈ میں کھڑی یا پانی لیتی ہوئی کسی خالی گاڑی کی چھت پر نیلی وردی والے آدمی کو خطرناک انداز میں چلتے تعجب سے دیکھا کرتا تھا اور اُسے سرکس کے کرتب سیکھا ہوا کوئی آدمی خیال کیا کرتا تھا۔ آج وہ ہزاروں سیدھے سادے لوگوں کو کرتب دکھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ ”اور ایسے خراب موسم میں۔۔۔۔۔“ اس نے افسوس کے ساتھ سوچا۔۔۔

آخر جب سٹیشن کے علی کے لوگ انہیں باہر نکلنے کی کوشش میں ناکام ہو کر اندر جا چکے تھے تو طوفانی بارش اور خالی ایک رنگ لائنوں کے نظارے سے یکلخت مایوس ہو کر وہ پلیٹ فارم چھوڑنے لگے۔ باہر نکلتے ہوئے، جیسا کہ معمول ہو چکا تھا، کسی نامعلوم وجہ سے ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس بھاگ دوڑ میں اچانک نعیم اور علی آمنے سامنے آگئے۔

”تم نے کہا: ”نکل جاؤ“، اور میں نکل گیا۔ اپنے باپ کے گھر میں میرے لیے جگہ نہ تھی۔ کیوں نہ تھی؟ محض اس لیے کہ تم مجھ سے پندرہ برس پہلے پیدا ہوئے تھے اور لڑائی میں تم نے بہادری کا تمغہ حاصل کیا تھا اور جاگیرداروں کے گھر بیاباہ کیا تھا اور سرکار کے خلاف جلوس نکالے تھے، محض اس لیے؟ ”اب میں کہاں جاؤں؟“ میں نے سوچا۔ پر میں کیا سوچتا، مجھے سخت بھوک لگی تھی۔ اوہ یہ بارش کجنت سالی جب فصلیں سوکھ رہی ہوتی ہیں تو کہیں دکھائی نہیں دیتی اور آج ماں کی۔۔۔ ہمیں سیراب کر رہی ہے۔۔۔ لو یہ بوری، اس کی ٹوپی بنا کر اوڑھ لو، میری خیر ہے۔ لاؤ میں بنادوں، تمہارا ایک ہاتھ تو کام سے گیا۔ گیلی ہے پر کچھ نہ کچھ بچاؤ تو کرے گی۔ میں سینکڑوں بار پردیس میں بھوکا سویا ہوں لیکن اس رات کی بھوک، اور اپنے گھر پر پردیس کا وہ احساس مجھے آج تک یاد ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن بڑی ماں نے بھنی ہوئی فانتہ اور گو بھی کا شوربہ آگے رکھا تھا اور مجھے زور کی بھوک لگی تھی اور تم نے کہا تھا نکل جاؤ۔ تم کیا جانتے ہو۔ تمہیں اس طرح کھانے کے آگے سے اٹھا کر کبھی گھر سے باہر نہیں نکالا گیا۔ تمہیں کیا پتا ہے۔ تم تو روشن محل میں جا کر جاگیردار بن گئے، ہمارے خدا بن گئے۔ کاش یہ سارے سؤر کچھ دیر کے لیے رک جائیں تو ہم گاڑی کے نیچے گھس کر بارش سے تونچ سکتے ہیں

مگر یہ تو بس بھاگ رہے ہیں جیسے ماں کی بارات میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔ عائشہ تو رستے میں ہی مر جائے گی۔ یقیناً، دیکھو کیسے بندریا کی طرح چارے میں سے منہ نکالے دیکھ رہی ہے۔ یہ اسی طرح پچھلے دس برس سے چپ چاپ دیکھ رہی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ چالتی ہے، بس کام کیے جاتی ہے اور کھلتی جاتی ہے۔ بڑی محنت سے گاڑی پر سائبان کھڑا کیا تھا، کل رات کی بارش میں اڑ گیا۔ اب پانی چارے میں سے رس رس کر اس کے جسم پر اکٹھا ہو رہا ہے۔ یہ کبھی سفر کے خاتمے تک نہیں بچ سکتی۔ لیکن سفر کا خاتمہ؟ ہنہ تمہیں پتا ہے کہاں ہوگا۔ ان سارے برسوں جو تم بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے سسرال والوں کے پاس رہتے رہے، پھر تم نے وائسرائے کی نوکری کر لی اور بڑے آدمی بن گے، تمہیں کبھی خیال آیا کہ دنیا میں کوئی اور بھی ہے جس میں تمہارے باپ کا خون ہے اور وہ کہاں پر ہے، بھوکا ہے یا سیر ہے، اور اس کی بیوی اور بچے، یہ چھوٹی چھوٹی باتیں جن کا بھائیوں میں خیال رکھا جاتا ہے۔ اور کیا تم میری زندگی تو نہیں گزار سکتے تھے۔ تھ تھ تھ۔ یہ بارش اور ہوا کا زور دیکھو، بالکل طوفان ہے۔ تم حیران ہو رہے ہو؟ مجھے سب پتا چلتا رہا۔ میں پردیس میں رہا پر ایک ایک پل کی مجھ کو خبر رہی۔ کہ تم کئی برس بیمار بھی رہے اور روشن محل میں ایک سے ایک بڑا ڈاکٹر آکر تمہارا علاج کرتا رہا۔ پھر تم تندرست ہو گئے اور ہر روز موٹر میں بیٹھ کر وائسرائے کے دفتر کام پر جانے لگے۔ تم کبھی روشن پور نہ گئے۔ لیکن میں بھی بیمار رہا اور میری بیوی بھی اور ہمارا علاج کرنے کے لیے کون تھا۔ جلاوطنی؟

”لیکن تم تو سدا عیش میں رہے۔ جب باپ جیل چلا گیا تو تم چچا کے ساتھ کلکتہ چلے گئے اور انگریزی سکولوں میں پڑھتے رہے اور گرمیوں میں پہاڑ پر جاتے رہے۔ اگر میں تمہاری جگہ پر ہوتا تو کیا جاگیرداروں کی لڑکی کے ساتھ شادی نہ کر سکتا تھا؟ حیرانگی سے کیا دیکھتے ہو۔ مجھے ان سب باتوں کا کسی نہ کسی طرح سے پتا چل ہی گیا۔ پر ایک بات جو میری سمجھ میں نہیں آتی۔۔۔۔ کہ اب وہ سب کیا ہوا؟ وہ محلات، اور بڑے بڑے باروخی لوگ جو تمہارے رشتہ دار تھے اب کہاں گئے؟ ان کا کیا فائدہ ہوا۔ بتاؤ؟ اب تم پھر ہمارے ساتھ اکیلے ٹھوکر س کھا رہے ہو۔ سب نے تمہیں چھوڑ دیا؟ تھ تھ تھ۔۔۔ وہ تمہیں چھوڑ ہی دیتے، جلد یا بدیر، میں جانتا تھا۔ ذرا دیکھو کیا حالت بنا رکھی ہے، فقیروں سے بدتر، پاؤں میں جوتا بھی نہیں تمہارے پاؤں میں ضرور درد ہو رہا ہوگا۔ میری ٹانگوں میں پہلے دو دن سخت درد اٹھا تھا۔ پھر کل رات بارش پڑنے سے سوج گئیں اور درد ختم ہو گیا۔ اب یوں لگتا ہے جیسے لکڑیوں پر چل رہا ہوں۔ یہ دیکھو، چھوٹے کیکر کے تنے کے برابر موٹی ہو رہی ہیں۔ ماں کی۔۔۔ ٹانگیں۔۔۔ پر شکر ہے کہ درد تو ختم ہوا، میری جان لے رہا تھا۔ تم عائشہ کے جوتے پہن لو، ابھی نکال کے دیتا ہوں۔ یہ لو، گھبراؤ نہیں رڑ کے سیدھے تلے والے جوتے ہیں۔ ہم غریب لوگ ہیں ایڑی والے جوتے

نہیں پہن سکتے۔ اور تمہاری بیوی، اس نے بھی تمہیں چھوڑ دیا۔۔۔“
 نعیم کو اس بات کی حیرت نہ تھی کہ علی کو ان کی ساری باتوں کا علم کیسے ہوا۔ اس کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ تو یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی کل کا گنوار کسان لوٹا آج ایک دم بڑا ہو گیا تھا اور بدلی ہوئی آواز میں، بدلے ہوئے لہجے میں، بالکل بدلی ہوئی باتیں کر رہا تھا۔ اپنی حیرت میں اسے یہ خیال نہ رہا کہ وہ اس سے کم و بیش بارہ برس کے عرصے کے بعد مل رہا تھا۔

علی کے لہجے کا زہریلا پن آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ آخر نعیم محض اس کا بھائی تھا جو استنا عرصہ بھٹکنے کے بعد اس خستہ حالت میں لوٹا تھا اور اس کی دیکھ بھال کرنا اس کا فرض تھا۔ کسانوں کی سی صاف دلی کے ساتھ اس نے سب کچھ معاف کر دیا۔ بھلا دیا۔ اور دھیمے ہمدرد اور رنجیدہ لہجے میں نعیم کو بتانے لگا:

”میں پنجاب چلا گیا۔ لاہور میں ان دنوں حالت اچھے نہیں تھے پھر بھی میں دو سال تک وہاں رہا اور کوئی آدمی درجن ورکشاپوں میں کام کیا۔ ان دو برسوں میں چھ مہینے جیل میں کاٹے۔ جہاں میں رہتا تھا وہاں چوری ہو گئی اور انہوں نے شبے میں پکڑ کر مجھے قید کروا دیا۔ چھ مہینے انہوں نے مجھ پر ظلم کیا۔ پہلی بار میری ٹانگیں جیل میں سوجی تھیں جب میں دو دن تک متواتر ایک ہی جگہ پر کھڑا رہا تھا۔ یہ دوسری بار ہے۔ پر لاہور کی لسی مجھے نہیں بھولتی۔ کیا جاڑے کیا گرمی وہاں پر لسی پیتے ہیں اور سارا دن اس کے بعد نہ آپ کو بھوک لگتی ہے نہ پیاس۔ لیکن میرے پاؤں میں چکر تھا۔ عائشہ کو لینے آیا تو پھر لاہور نہ گیا۔ جالندھر میں ایک سیمنٹ فیکٹری تھی وہاں نوکری کی، پھر جنگ چھڑ گئی اب میں فوج میں جانے کے لیے سمرانے لگا۔ ان دنوں پہلی بار عائشہ بولی اور کہنے لگی: باؤلے ہوئے ہو؟ مت جاؤ لڑائی پر مت جاؤ۔ پھر وہ رونے لگی۔ اس کے بعد وہ زیادہ ہی چپ چاپ ہو گئی۔ کبھی روئی بھی نہیں۔ دیکھو کیسے چارے میں سے منہ نکالے بیٹھی ہے اور تکلیف سہ رہی ہے۔ جیسے کائے نے تازہ تازہ پچہ دیا ہو۔ تمہارا خیال ہے اس نے تمہیں پہچانا نہیں؟“ شرط لگاتے ہو؟ اس نے تمہیں سولہ آنے پہنچان لیا ہے پر وہ کبھی نہیں ہنستی، نہیں شرماتی۔ یا اللہ، میری ٹانگیں پھٹ جائیں گی۔ اگر یہ سؤر استنا شور نہ مچائیں تو تم میری ٹانگوں پر بارش کے قطروں کی آواز سن سکتے ہو۔۔۔ ڈھول کی طرح بج رہی ہیں۔۔۔ لیکن میں جنگ میں ہر قیمت پر جانا چاہتا تھا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری شقالی میں میں ایسا کرنا چاہتا تھا تو غلط سمجھتے ہو نہ ہی مجھے اپنی ٹانگوں یا بازوؤں سے کوئی یہ تھا یا تمہارے کی حرص تھی، بس میں بالکل اکتا چکا تھا۔ ان دنوں میں معمولی سی بات پر قتل کر سکتا تھا۔ بس میرے سر میں یہ بات سما گئی تھی کہ جنگ ہی ایک کام ہے جو کہ مرد کے لائق

ہے۔ لیکن ہوا کیا؟ وہ یہیں پر ادھر ادھر ہمیں پریڈ کرواتے رہے اور جنگ کا زمانہ نکلتا گیا۔ جب کلکتے میں رہتے ہوئے ہمیں تین مہینے گزر گئے اور برما کے محاذ پر جانے کا ذکر سنتے سنتے کان پک گئے تو ایک دن میں نے حوالدار میجر سے کہا: ”جس روز تو پیدا ہوا تھا اسی دن تیری ماں کا دودھ پھٹ گیا اور تو بزدل ہو گیا تھا۔ رات بھر میں کواٹر کارڈ میں رہا۔ صبح کرنل کے پیشی ہوئی۔ میں پاگل ہو رہا تھا، اس کو بھی سنائیں۔ کورٹ مارشل ہوا اور میں قید کر دیا گیا۔ شکر ہے گولی سے بچ گیا۔۔۔ جنگ ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ ایک سال تک کلکتے میں ہی مزدوری کرتا رہا پھر وہاں سے یہ مصیبت شروع ہوئی۔ ہڑتالیں، اور جلوس اور دہشت پسندی۔ تم یقین نہیں کرو گے مگر یہ سچ ہے کہ میں ان میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ پر جانے یہ کیسے ہوا۔۔۔۔۔ کیسے ہوا کہ میں آہستہ آہستہ ان کا پکا معتبر آدمی بن گیا۔ ایک قسم کا لیڈر۔ آپ سے آپ ہی یہ سب کچھ ہو گیا۔ میں دلی آ گیا۔ اب بارش تھمتی جا رہی ہے۔ دیکھو ادھر سے بادل پھٹ گئے ہیں۔ تمہیں بوجھ لگ رہا ہے تو بوری اتار کر گاڑی میں رکھ دو۔ اب اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اور اگر چاہو تو جو توں کے لیے عائشہ کا شکریہ ادا کر دو۔ خوش ہو جائے گی۔ ابھی نہیں، بعد میں۔ ایک دفعہ ہڑتالوں کے گروہ کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے سوچا کہ اسی وجہ سے میں اپنے گھر سے، گاؤں سے نکالا گیا اور آج وہی کام کر رہا ہوں۔ آخر کیا فرق پڑا کیا فرق پڑتا ہے، ہیں، نعیم؟۔۔۔۔۔“

علی کی گاڑی پر ہاتھ رکھے ایک لمبے قد کا بڈھا، جس کا پھٹا ہوا لباس اور غلیظ داڑھی تھی، چل رہا تھا۔ نعیم نے کئی بار اس پہ نظر ڈالی اور ہر بار اسے غیر معمولی سا احساس ہوا۔ اس خستہ حالت کے باوجود بڈھے کی آنکھوں میں گہری ذہانت، گہری درد مندی اور گہرے رنج کی جھلک تھی۔ اچانک وہ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔

نعیم تھکن کے مارے بڑے سے درخت کی طرح جھولتا ہوا اس کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ علی نے اس کی آستین کھینچی۔

”چلو چلو۔ پتا نہیں کون ہے۔“

”اسے بٹھا لو۔ یہاں مر جائے گا۔“

”واہ واہ اگر اسی طرح کرنے لگے تو۔۔۔ اب اگر یہ چلنے بھی لگے تو اسے ہاتھ رکھنے کو جگہ

نہ ملے گی۔ دیکھو“

نعیم نے دیکھا۔ کچھ دیر پہلے جس جگہ پر بڈھے کا ہاتھ تھا اسے حاصل کرنے کے لیے کئی ایک بڈھے اور نوجوان ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ گاڑی کے دونوں طرف اسی طرح کے لوگوں کی قطاریں تھیں؟ فاقہ زدہ، نیم مردہ بھیڑیوں کی طرح کے لوگ جو سر جھکائے ڈنڈوں کا سہارا لیے چل رہے تھے۔

محض مر کر یکلخت ان سب کے لیے دردر مندی ، خدا ترسی اور مستقبل کے خوف کی عظیم علامت بن گیا تھا ۔ چند ادھیڑ عمر کسان عورتیں اونچی آواز میں بین کرنے لگیں ۔ ان پر آج پہلی بار موت کی عالمگیر حیثیت کا انکشاف ہوا تھا ، اور غیر شعوری طور پر انہوں نے محسوس کیا تھا کہ اس ایک انسان کی موت ان سب کی موت تھی ، کہ مستقبل کے اندھیرے کی مشترکہ موت میں وہ سب شامل تھے ۔

آخر اسے قبر میں اتار کر کم از کم پانچ ہزار افراد نے اپنے اپنے حصے کی مٹی اس پر ڈالی اور ایسی قبر بنائی کہ ان میں سے آج تک کسی نے اتنی بڑی قبر نہ دیکھی تھی ۔

”زندگی کی ایک عظیم فورم (Form) ہے ۔ یہ جنازہ ۔“ لمبے بڑھے نے مٹی پھینکتے ہوئے کہا ۔ نعیم نے خاموشی سے اسے دیکھا اور اپنے حصے کی مٹی پھینک کر آگے روانہ ہو گیا ۔ میلوں تک انہیں وہ قبر نظر آتی رہی ۔

اسی روز قافلے پر پہلی بار حملہ ہوا ۔ حملہ آور ہندو اور سکھ تھے جو کلہاڑیوں ، بلموں ، تلواروں اور رائفلوں سے مسلح تھے ۔ قافلے والے بہت سے مردہ اور زخمی چھوڑ کر آندھی کی طرح بھاگے ۔ اب وہ موت سے واقف ہو چکے تھے ۔

”تم کیا کہہ رہے تھے ؟“ نعیم نے پوچھا ۔

”جنازے کی بات کر رہا تھا، کہ یہ زندگی کیسی منظم ہے ۔ ہنومت ، میں فلسفہ نہیں بگھار رہا ۔ اس زندگی سے مراد یہ خصوصی زندگی ہے یہ جس میں قواعد و ضوابط ہیں اور ہمسائے کے ساتھ محبت کرنے کے احکام، اور نماز کے اوقات ، رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے طریقے ، نیکی کے بدلے ثواب اور گناہ کے بدلے عذاب ہے ۔ کتنی بڑی تنظیم ہے، تم نے کبھی سوچا ہے ؟ میں بھی کیا پوچھ رہا ہوں ، ہر کوئی تھوڑا ہی سوچتا ہے ۔ پر سنو ، میں نے سوچا ہے ۔ وہ دیکھو اگلی میل گاڑی پر ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے ۔ میں جب بھی ایسے شخص کو دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ ابھی چند منٹ میں یہ اپنے ضمیر کا سارا بوجھ اللہ تعالیٰ کی حوالے کر کے اطمینان سے بیٹھ جائے گا ۔ اس کی زندگی کی ایک مخصوص شکل ، ایک Form ہے جس کے مطابق کہ یہ رہتا ہے ، اور اس کا Content ہے جو کچھ کہ یہ کرتا ہے اور اس کے نیک و بد ہونے کا علم رکھتا ہے ۔ پھر اس کی اجتماعی شکل ہے ۔ نماز جنازہ جس کی عظیم Form ہے او جس کے Content میں تمام انسان شامل ہو جاتے ہیں ۔ اس سارے سلسلے میں ایک رکھ رکھاؤ ہے ، صاف ستھرا پن ہے ، جیسے دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر باورچی خانے کو جھاڑا پونچھا جائے ، برتنوں کو مانجھ کر قرینے سے رکھا جائے اور فرش کو دھو دھلا کر کھلا چھوڑ دیا جائے ۔ اس میں فراغت کا احساس ہے ۔ میری بھی کوئی زندگی رہی ہے ۔ پریشان خیالی ، ابتری ، دھما چوکڑی ، ایک دم دھما چوکڑی From کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اس زمرے میں کچھ تھا بھی تو مجبوری، محض مجبوری اور لا چاری ۔

اور Content ہنہ ، کیا بات کرتے ہو میاں ، کبھی کسی چیز کا تعین ہی نہیں ہو پایا ۔۔ لیکن اب میں تمہیں سب باتوں کے باوجود میں نے کبھی ایسے لوگوں کے لیے ، ایسی زندگی کے لیے رشک و حسد محسوس نہیں کیا ۔ کبھی احساس کمتری مجھ کو نہیں ہوا ۔ ہمیشہ میں نے اس نظام کے لیے اپنے دل میں ایک عجیب سی حقارت محسوس کی ہے ، کہ ہم اپنے ضمیر کو زبردستی دھو دھا کرتے گناہوں کے لئے تازہ دم ہو بیٹھتے ہیں ، ۔۔۔ تم نے دیکھا ہی ہے ۔ شکست اور بے حرمتی ہمیں عین آنکھوں میں آکر لگتی ہے ۔ تم نے تو دیکھا ہی ہے ۔“

”تم کون ہو“

”میں دلی یونیورسٹی میں تاریخ پڑھاتا تھا ۔“

”اس سے پہلے؟“

”ٹائٹا سٹیل مل میں کام کرتا تھا ۔“

”اس سے پہلے؟“

بڑھا گہری نظروں سے نعیم کو دیکھ کر ہنسا : ”آوارہ تھا ، کھوج میں تھا، گمشدہ تھا ۔ جو بھی سمجھ لو ۔“

لیکن نعیم کی آنکھوں کے سامنے صاف طور پر مدتوں پہلے کی ایک دھوئیں سے بھری ہوئی کوٹھری آگئی جس میں ایک جوشیلا نوجوان بیٹھا ضلع کے سارے انگریز افسران کو ہوں سے اڑا دینے کی تجویز کے بارے میں باتیں کر رہا تھا ۔

بڑھے نے نعیم کے چہرے پر اچانک پھیلتی ہوئی پرانی آشنائی کی مسکراہٹ کو نہ دیکھا اور پھر بولنے لگا :

”اس سے پہلے آئیڈیلز تھے اور آوارگی تھی ۔ اگر میں تفصیل سے بیان کروں تو تم کہو گے کہ وہ آوارہ گردی کی زندگی تھی ۔ مگر نہیں ، وہ محض آوارگی تھی ۔ یہ مجھے بہت بعد میں پتا چلا ۔۔۔ آئیڈیل ۔۔۔ اصل اور صحیح آئیڈیل تو مکمل نارمل حالت میں بنتے ہیں ۔ ایسے ذہنوں میں جو پر شکم ہوتے ہیں ، عظیم اور بے ہوس ہوتے ہیں ، جن کے پاس صرف تخیل ہوتا ہے اور بلندی اور مایوسی ہوتی ہے ۔ ایسے انسان جن پر کوئی دباؤ نہیں ہوتا ۔ کوئی ناکامی کوئی زہر نہیں ہوتا، بس زندگی کی روح ہوتی ہے جو جوان اور خوبصورت اور افسردہ ہوتی ہے، جو ان کو آس پاس کی گرتی ہوئی ، لاپار ہوتی ہوئی دنیا سے صرف مایوس کر دیتی ہے ، آرٹسٹ اور شاعر کے پاس اپنے تجربے ہوتے ہیں ، آئیڈیلسٹ کے پاس بنی نوع انسان کی ساری تاریخ ، سارے تجربے اور سارے دکھ ہوتے ہیں ، چنانچہ وہ ان سے بڑا ہوتا ہے ۔ ہم اور تم تو روزمرہ کا حساب رکھنے کے لیے تھے ۔ ہمارے پاس کیا تھا ؟ غم و غصہ اور آئیڈیلز کی بگڑی ہوئی شکل ، کالیاں اور برفروختگی ، مصیبتیں اور دباؤ اور نوجوانی اور خفت اور تنگ نظری اور زندگی کا سارا زہر ، سب کچھ تھا ۔ سنو

ایک بات بیچ میں آگئی۔ آئیڈیل اور سیاست میں فرق ہے۔ سیاست میں ہوس کا مقام بہت اونچا ہے۔ سیاست دان محض اپنی ناک کے آگے سے گزرنے والے نفع و نقصان سے متعلق ہوتا ہے، اس کا ذہن بھدا اور تاریخ سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ آئیڈیل جس شے کی لطیف اور اعلیٰ شکل ہے سیاست میں وہی چیز بھدی اور خام بن کر نمودار ہوتی ہے۔۔۔۔۔ جس طرح ہر شے بالآخر بھدی اور خام بن جاتی ہے۔۔۔۔۔ پھر بھی سیاست کی ہر ترکیب چونکہ سوسائٹی کے لیے نفع کی امید دلاتی ہے اس لیے اس کا وجود لوگوں میں گرمی اور زندگی پیدا کرتا ہے۔ ہمارے پاس نہ آئیڈیل تھے نہ سیاست، صرف بگڑی ہوئی زندگیاں تھیں اور زہریلے دماغ، جس کا نتیجہ اس بگڑی ہوئی تاریخ میں ظاہر ہوا ہے، یہ سب۔۔۔۔۔ اس نے چاروں طرف ہاتھ پھیلایا، ”تم تو دیکھ ہی رہے ہو۔ یہ تاریخ کی کون سی شکل ہے؟ یہ وہ نسل ہے جو ایک ملک کی تاریخ میں عرصے کے بعد پیدا ہوتی رہتی ہے۔ جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا، کوئی خیالات کوئی نصب العین نہیں ہوتا،۔۔۔ جو پیدائیش کے دن سے اداس ہوتی ہے اور ادھر سے ادھر سفر کرتی رہتی ہے۔ ہم ہندوستان کی اس بد قسمت نسل کے بیٹے ہیں۔“

تھوڑی دیر کے بعد جب اس کا پہلا جوش ختم ہو گیا تو وہ دھیمی، اداس لہجے میں اپنے متعلق بتانے لگا:

”میں نے یونیورسٹی میں تاریخ پڑھی۔ لیکن میں اس دنیا میں رہتا تھا جہاں آپ یا تعلقہ دار تھے یا کچھ بھی نہ تھے۔ جو لوگ اعلیٰ دماغ تھے سرکار کی ملازمت میں چلے جاتے تھے اور حکومت برطانیہ انہیں اس طور تربیت دیتی تھی کہ ان کی تمام ذہانت، تمام اچھوتا پن ختم ہو جاتا تھا۔ وہ نہ تعلقہ دار بن سکتے تھے نہ آرٹسٹ، محض سرکاری افسر بن کر رہ جاتے تھے۔ نہ سرکار نہ رعایا، محض معمولی کارندے۔ یہ عجیب مضحکہ خیز طبقہ تھا یہ ان کا خاتمہ تھا۔ آئیڈیل کہاں سے آتے؟ دوسری طرف ہماری دنیا تھی۔ اس میں مشقت کرتے ہوئے مزارع تھے اور چھوٹے چھوٹے خود غرض، خوشامدی اور پیٹو اہلکار تھے۔ قرض تھے اور سود لینے والے مہاجن تھے اور جائدادوں کی قرقیاں تھیں، اور اس سب کے اوپر ان خداؤں کے ساتھ گونگی، کتوں کی سی وفاداری تھی۔ یہاں آئیڈیل بن ہی نہ سکتے تھے، یہاں صرف گرمی ہوئی زندگی تھی اور بے بس برافروختگی تھی، جیسے کتے بھونکتے ہیں۔ تاریخ کی پڑھائی سے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔ محض کنفیوژن پیدا ہوا۔ خوفناک کنفیوژن۔ اگر میں سرکاری ملازمت کرتا تو آج تک اپنی تعلیم کا قرض اتارتا رہتا۔ چنانچہ میں بھاگ گیا۔ لیکن وہ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ سمجھتے ہو؟ ہم تم ہم عمر ہیں، ایک دوسرے کو سب کچھ بتا سکتے ہیں، تم ضرور سمجھ جاؤ گے۔ وہ زمانہ تھا جب اس سب کچھ کے باوجود آدمی اپنے خیالات کے ساتھ نوجوانی کی اولین محبت کرتا ہے، جس کے ختم ہونے کا غم انسان عمر بھر ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے، جس سے دل خالی ہو جاتا ہے اور دماغ ناکارہ۔“

گزر رہے تھے، آخر کار اسے دھوکا دیا جا سکتا تھا ٹالا جا سکتا تھا، دوسرے کے سر تھوپا جا سکتا تھا۔

اس خیال کو یوں بھی تقویت ملتی کہ بعض دفعہ اگلے قافلے کے حملہ آور انہیں بغیر کچھ کہے گزر جانے دیتے۔ وہ مار مار کر اس قدر اکتا چکے ہوتے کہ محض سڑک کے کنارے بیٹھے نئے قافلے کے خاموش، خوفزدہ کوچ سے ہی محفوظ ہوتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ مردوں اور زخمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ لگا دیتے اور نیا قافلہ چپ سادھے، بھاگتا ہوا ان کے قریب سے گزر جاتا۔ کبھی کبھار، ان کی زد سے باہر نکل کر، ایک آدھ پرانا آدی رک کر دور سے چلتے ہوئے انسانی جسموں کا نظارہ کرتا اور اسکے ذہن میں قافلے کی پہلی لاش کی یاد تازہ ہو جاتی۔ زیادہ تر لوگ نئے ساتھیوں اور نئے حملوں کی توقع میں اپنا سفر جاری رکھتے۔

نعیم اس افراتفری میں کئی بار علی سے بچھڑ گیا۔ مگر علی ہر دفعہ اسے تلاش کر لیتا۔ وہ گاڑی کے اوپر ایڑیاں اٹھا کر کھڑا ہو جاتا اور چاروں طرف نظر دوڑاتا، پھر ایک طرف کو نظریں جا کر گاڑی سے اترتا، ہجوم کو چرتا ہوا سیدھا جاتا اور سر جھکا کر چلتے ہوئے نعیم کو بازو سے پکڑ کر برا بھلا کہتا ہوا واپس لے آتا، ”اپنی گاڑی کو مت چھوڑو مت چھوڑو مت چھوڑو تین ہزار بار کہا ہے۔ مگر تم تو بالکل کام سے گئے۔ وہ پکڑ لیں گے اور مار دیں گے اور چلے جائیں گے۔ بس۔ پھر؟“ وہ کہتا۔ لیکن نعیم سارے کاموں سے جا چکا تھا۔ بوڑھا پروفیسر بھی اب اس سے باتیں کرنے کی ناکام کوشش کر کے تھک چکا تھا اور آخر اس نے علی سے کہا تھا ”تمہارا بھائی۔۔۔ اس کے دماغ پر اثر ہے۔ خیال رکھنا پڑے گا۔“ اور علی، جو شروع سے بڑھے پروفیسر کی طرف سے لا پروا تھا، یہ سوچ کر خوش ہوا کہ اب وہ جب چاہے اس سے چٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔

وہ سب کچھ دیکھتا بھالتا کھاتا اور کبھی کبھی اونگھتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کی صورت اپنے دوسرے ہم عمروں سے قطعی مختلف نہ تھی۔ سب کی داڑھیاں اور چہرے غلیظ، لباس پھٹے ہوئے اور پاؤں سو بے ہوئے تھے۔ سب تنگے پاؤں تھے کہ سارے جوتے تنگ ہو چکے تھے۔ سب کی نظریں گونگی اور آوارہ تھیں اور ان سے طویل، بے منزل مسافت کی تکلیف چسکتی تھی، سب کے نزدیک اہم ترین کام چلتے جانا اور اکتھے رہنا تھا، اور نہ ان سب میں گھلا ملا ہوا، کھویا ہوا، محض ایک اور گمنام، بے حیثیت مسافر تھا۔ اس کے سامنے وقفے وقفے پر حملے ہو رہے تھے، لوگ مر رہے تھے، جو مارے جانے سے بچ رہتے وہ تھک کر گر رہے تھے، سلمان کو آگ لگائی جا رہی تھی اور لوگ خوراک کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ سڑک پر اور سڑک کے کنارے لاشوں کا طویل سلسلہ تھا۔ کوئی پلایا کے پتھر کے سہارے بیٹھا اور کوئی درخت کے ساتھ کھڑا کھڑا مر گیا تھا۔ عورتوں کے تنگے مردہ جسم بے شرمی سے پھیلے ہوئے تھے اور جنگلی جانور اور پرندے

ان پر پل رہے تھے۔ جو زندہ تھے وہ مستقل چل رہے تھے۔ اور میاں بیوی، بہن بھائی، اور ماں اور بچے کے رشتے ختم ہو رہے تھے اور وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو دنیا کی تاریخ میں ایسے قافلوں کے ساتھ ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ لیکن یہ سب اہم نہیں تھا، کیونکہ وہ کچھ دیکھنے کے باوجود خاموش اور لاتعلق تھا۔

”تم بولتے کیوں نہیں؟“ آخر جھنجھلا کر علی نے کہا، ”تھ تھ تھ یعنی پانچ روز ہو گئے۔۔۔ پورے پانچ، اور بات تک کرنے نہیں دی اس شخص نے۔ تھ تھ تھ۔۔۔“

”دماغ پر اثر۔۔۔“ پروفیسر نے کہنا چاہا۔

”چپ رہو تم۔ نیچے اترو۔ چلو۔“ علی نے اس کی پشت پر دھپ جا کر گاڑی سے اتار

دیا۔

نعیم نے تیز روشن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور چالکی سے مسکرایا۔ پھر اس نے عائشہ پر نظر ڈالی جو گاڑی میں لیٹی تھی اور چارے کا ڈھیر، جس میں اپنے آپ کو چھپانے کے لیے اس نے گھر بنا رکھا تھا۔ ختم ہو چکا تھا۔ وہ بہر حال اتنی سوکھ چکی تھی کہ کسی نے اسے مارنے یا اغوا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ نعیم آہستہ سے ہنسا۔ پھر وہ تیز تیز چل کر سیلوں کے پاس پہنچا اور ان کی پسلیوں پر، جو باہر نکلی ہوئی تھیں ہاتھ پھیرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگا۔ پروفیسر اور علی کم سم، ترجم خیز تعجب کے ساتھ اسے دیکھتے رہے، پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مایوسی سے سر ہلانے لگے۔

ایک نشہ تھا، ایک بد مستی تھی جس میں سب کچھ ڈوب چکا تھا، غرق ہو چکا تھا، جس کا منبع کسی کے علم میں نہ تھا۔ ایک بیخودی، جو زندگی کی سفاکی کے اس سے سارے منظر کو بہا کر لے گئی تھی، پار کر گئی تھی، جس نے ہر انسانی اور حیوانی جذبے کو، تجربے کو فتح کر کے پیچھے چھوڑ دیا تھا وہ کہاں سے آئی تھی، کیوں کر پیدا ہوئی تھی اور کدھر لے جا رہی تھی، اس سے وہ قطعی نا آشنا تھا۔ صرف ایک غبار تھا، روشن اور لطیف اور بے ہیئت جسے خزاں کی شفاف راتوں کی کہکشاں، یا جاڑوں کی صبحوں کی دھند جو چھوٹی نہیں جاتی مگر کپڑوں میں گھس کر سارے جسم کو گیلا کر دیتی ہے اور خوبصورت اور خنک ہوتی جاتیں ہیں، مرد اور عورتیں گھوڑا گاڑیاں، بچے، روزمرہ کی مانوس شکلیں، مگر دھند، میں سے نکلی ہوئی وہ انوکھی اور خنک اور خوبصورت ہوتی ہیں، خواب کی طرح۔ بس ایسا غبار تھا جو شروع دن سے بلند ہو رہا تھا، جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، جسے اس نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ موت اور بھوک اور بے کسی اور لالچ کے ساتھ ساتھ، جسم کی بڑھتی ہوئی تھکن کے پہلو پہ پہلو۔۔۔ اب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

درد کرتا ہوا جسم جو اس کا خیال تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی اذیت تھی، اور مایوسی کا

منقطہ عروج، جہاں پہنچ کر اب نہ وہ بھاگتے تھے نہ پروا کرتے تھے، حملہ آور ان میں سے چند

ایک کو ہانک کر لے جاتے تھے اور سڑک کے کنارے کھرا کر کے گولی مار دیتے تھے ، سب ختم ہو چکا تھا ۔ کیونکہ جسے اس نے محسوس کیا تھا آخر ان سب سے زیادہ طاقتور اور روشن اور جاندار تھا اور اسے مکمل طور پر لپیٹ میں لیے ہوئے تھا ۔ یہاں بالآخر خاموشی تھی ، اور وجد ۔

قافلے والوں کا کاروبار بہر حال چل رہا تھا ۔ شہر کے باہر وہ پناہ گزین کیمپ میں پہنچ کر رک گئے ۔ یہاں ان کو رات بسر کرنا تھی ۔ کیمپ چند کچی پکی بارکوں اور پھٹے ہوئے خیموں پر مشتمل تھا ۔ بارش کا پانی جگہ جگہ رکا ہوا تھا ۔ پرانے اور نئے پناہ گزینوں نے ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا ۔ پھر وہ بیٹھ گئے اور پتھروں کے چولہوں پر روٹیاں پکانے لگے ۔ جن کے پاس توے نہیں تھے وہ گول گول پتھروں پر آٹا لپیٹ کر آگ پر گرم کرنے لگے ۔ جن کے پاس آٹا نہ تھا وہ بھاری رقیں دے کر پڑوسیوں سے آٹا خریدنے لگے ۔ جن کے پاس پیسے نہ تھے وہ رات کا انتظار کرنے لگے جب اندھیرے میں چوری کی جا سکتی تھی یا گھر کی عورتوں میں سے کسی جوان اور خوش شکل کو تھوڑی دیر کے لیے کسی دوسرے کے حوالے کر کے ، کہ حیوانی جذبے اور ان کے پالنے والے ہر حالت میں زندہ رہتے ہیں ، معاوضے میں اشیائے خوردنی حاصل کی جا سکتی تھی ۔ کچھ لوگ بہر حال اتنے تھک چکے تھے کہ آتے ہی غش کھا کر گر پڑے اور ہوش میں آنے پر گڑبوں میں رکا ہوا پانی پی کر دوبارہ گہری نیند سو گئے اور مکھیاں ان کے منہ پر جمع ہونے لگیں اور جنگلی پرندے انہیں مردہ سمجھ کر چونچیں مارنے لگے ۔ پھر چند ایک ایسے بھی تھے گویا موسم کا جائزہ لیتے ہوں ۔ ان دنوں سارے دن ایک سے تھے ۔ یا بارش ہوتی یا سورج نکل آتا ۔ دھوپ بھورے رنگ کی جھلس دینے والی ہوتی ، آسمان گرد آلود اور بد رنگ ہوتا جس پر ہر وقت فرید مردار خور پرندوں کے غول اڑا کرتے اور فضا میں ایک عجیب قسم کی متلی اور بو پھیلی رہتی ۔

وہ رات اسی مدہوشی میں گزری ۔ ٹوٹی ہوئی چھت والی باریک دیوار سے ٹیک لگائے وہ بیٹھا تھا ۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بارش ہو رہی تھی ۔ پانی کی زد میں جو لوگ آتے ان میں کھلبلی مچ جاتی اور اٹھ اٹھ کر ان لوگوں پر گرنے لگتے جو چھت کے نیچے سو رہے تھے کالیوں اور کوسنوں کا طوفان اٹھتا اور آپ سے آپ ختم ہو جاتا ۔ بارہ فٹ مربع کی کوٹھری میں سو سے زیادہ بد بودار غیظ اسنان بند تھے ۔ نیمم آہستہ آہستہ واپس آ رہا تھا ۔ وہ سیر شام سے آنکھیں کھولے دیوار کے سہارے بیٹھا تھا ۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر اس پر غنودگی طاری ہو جاتی اور عجیب و غریب خواب دکھائی دیتے لیکن اس کی آنکھیں کبھی پورے طور پر بند نہ ہوتیں ، بس غنودگی کی حالت میں آدھی مچ جاتیں ان نیم و آنکھوں می اگر کوئی دیکھتا تو یقیناً خوفزدہ ہو جاتا کیونکہ اُسے وہاں پر ایک مردہ آدمی کی گدلی ، بے حرکت آنکھیں دکھائی دیتیں ، وہ جن میں سے ساری نظر غائب ہو چکی ہوتی ہے ۔ اور خواب ۔ ایسے مختصر ، بے ہیئت خواب جو جاگنے پر یکسر ذہن سے

نکل جاتے لیکن جن کے بعد ایک عجیب قسم کی تازگی اور توانائی سارے وجود میں محسوس ہوتی -
 جاگنے پر وہ ادھر ادھر دیکھتا اور کسی جگہ پر باتیں کرتے ہوئے لوگوں کے چند جملے اس کے کان میں
 پڑتے اور انسانی بدبو سے اس کا دماغ پھٹنے لگتا - اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے حواس دوبارہ
 حاصل کر رہا تھا - جسمانی درد کے بعد ، جو اسے مسلسل چلنے سے ہوا تھا ، اس کا خیال تھا کہ
 کمرے کی بو زندگی کی سب سے بڑی ازیت تھی جو وہ سہ رہا تھا -

صبح کاذب کے وقت وہ پوری طرح آنکھیں کھولے بیٹھا تھا - اس کے قریب چند کسان
 آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے - وہ سننے لگا -

”پھر ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی ایک ایک نیکی باری باری یاد کر کے دھرائی ، اور
 جب ایک اپنی بات ختم کر چکا تو دھانے کا پتھر ایک تہائی ہٹ گیا ، اور دوسرے کی بات ختم
 ہونے پر پتھر دو تہائی ہٹ گیا ، اور جب تیسرے نے اپنی نیکی گنائی تو غار کا منہ صاف کھل گیا ،
 اور وہ بھاگتے ہوئے باہر نکل آئے -“

”تین نہیں چار تھے -“

”نہیں تین تھے -“

”مجھ کو کیا پتا نہیں؟“

”اچھا جھگڑا مت کرو کوئی فرق نہیں پڑتا - مطلب یہ کہ اپنی ایک ایک نیکی یاد کرو -

سب -“

”پہلے تم کرو -“

سب ہنسنے لگے -

”دانت مت نکالو - سنو - میں نے ایک دفعہ - - ایک دفعہ میں نے میری کائے کو

”موکھ“ ہو گیا تھا اور میں رات بھر اسے ٹکور کرتا رہا تھا -“

وہ پھر ہنسنے لگے - ”کائے کی نیکی سے کیا ہوتا ہے ، کوئی اور -“ کسی نے کہا -

”کیوں نہیں ہوتا - بے زبان کے ساتھ نیکی کرنے سے - - نہیں ہوتا کچھ؟“

”دوسرا بولا: ”پارساں کے جاڑے کی بات ہے میں کھلیان پر بیٹھا تھا کہ ایک سوار آیا

اور دروازے پر گر پڑا - اس نے بتایا کہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور اس کے پیٹ

میں تین گولیاں ہیں - میں نے اسکو بھوسے کے ڈھیر میں چھپا دیا اور خون کے نشانوں پر بھی

بھوسہ ڈال دیا اور گھوڑے کو بھگا دیا - پھر پولیس ساری رات مجھے عذاب دیتی رہی پر میرے منہ

سے اس کا بول نہ نکلا - -“

”یہ تو کائے سے بھی بد تر ہے - ہو سکتا ہے وہ قاتل ہو -“ سب پھر ہنسنے -

”مجھے کیا پتا - میں نے تو نیکی کا کام کیا -“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے ، اب تم بتاؤ۔“
تیسرے نے کوئی مختصر سی بات کی منقابت کی وجہ سے جس کی آواز نعیم تک نہ پہنچ
سکی۔

”بس۔ تین کافی ہیں۔“

”نہیں چار۔۔“

”بس بس۔۔ تین۔“

ان کی سادہ بے خطر آوازیں تھیں اور وقت کے اندیشوں کو انہوں نے فتح کر لیا تھا۔
اسی طرح بیٹھے بیٹھے نعیم کے ذہن میں ایک نظم کے مصرعے آنے لگے۔ وہ کچھ اس طرح تھے :
”تنگی شاخوں پر پرندے خوراک کی امید میں بیٹھے ہیں

اور ایک دوسرے کو دلاسا دے رہے ہیں

نیچے ان کے خداؤں کے کارواں اپنی حمد و ثنا کا تے ہوئے گزر رہے ہیں پر پیڑ کہاں ہیں ؟
میں دنیا کے چوراہوں میں بیٹھ کر بھیک مانگتا ہوں۔

اور دنیا میں پیغمبر آنا بند ہو چکے ہیں۔

اب لوگ صرف کہانیاں سنا کر چلے جاتے ہیں۔

پر لوگ کہاں ہیں ؟

اس نے دو تین بار نظم کو زیر لب دہرایا۔ اس نے شاعری بہت کم پڑھی تھی لیکن آج
نظم آپ سے آپ تیار ہو گئی تھی۔ کیونکر ؟ کیونکر ؟ حیرت و استعجاب کے جذبات نے چند
لمحوں تک اسے ششدر کر دیا، بھر بھلکھت اس کے اندر قوت اور توانائی کی ایک لہر پیدا ہوئی جس
نے اس کو میکانکی طور پر اٹھا کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ سوتے اور جاگتے ہوئے جسموں کو پھلانگتا ہوا
وہ باہر نکل گیا۔

ایک تازہ حل چلے ہوئے کھیت کے کنارے کنارے بھاگتا ہوا وہ بھلکھت رک گیا۔ سورج
نکل رہا تھا۔ اولین کرنوں کے ساتھ کبوتروں کی ایک ڈار کھیت میں آگر اتری اور خوراک کی تلاش
میں ادھر ادھر بکھر گئی۔ پھر چڑیوں کی ایک ڈار آئی اور کھیت کے دوسرے کنارے پر اتری۔ صبح
سورج کی آہستہ خرام تازہ ہوا اس کے چہرے سے ٹکراتی گزر رہی تھی سورج آہستہ آہستہ بلند ہو
رہا تھا۔ چند منٹوں میں مشرقی آسمان نے کئی رنگ بدلے۔ پھر زردی مائل گلابی رنگ کی کمزور
دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر پڑی، اور اڑتے ہوئے پرندوں پر، پھر اس کا رنگ سفید اور
سنہری ہوتا گیا اور وہ درختوں کی شاخوں پر پڑی اور بارکوں کی چھتوں اور خیموں کی چوٹیوں پر، پھر
توں پر اور بیدار ہوتے ہوئے انسانوں کے چہروں پر، پھر زمین کے چاک سینے پر اور پیٹ
بھرتے ہوئے کبوتروں پر اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین و آسمان کا وہ گنبد اور اس میں محیط ہر شے

ہے اور فنا ہو جاتا ہے ، اپنی ساری دلکشی کے ساتھ ، اپنی ساری دلکشی کے باوجود ، جیسے انسانی ہستی جو بالآخر مٹ جاتی ہے ۔ مگر اعلیٰ ترین سطح پر خدا انسانی ہستی روح کی تخلیق کرتا ہے اور آسمانوں اور سمندروں اور پہاڑوں کی روح کی طرح وہ لافانی ہوتی ہے اور اس کی دلکشی بھی ، اور پھر یہ حسن کی تخلیق کرتی ہے ۔ ایک اور حسن کی ۔ خدا کی بنائی ہوئی تمام چیزوں میں صرف انسانی روح تخلیق کے عمل کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں ، اور یہ ایک ہی شے ہے ۔۔۔ حسن ! ہی اتنی ہی زبردست اور بے پایاں قوت ہے جتنے اس کے دونوں خالق ، اور بہت بڑی قوت ہے ، محبت اور مذہب اور موت سے بھی بڑی ، زندگی سے بھی بڑی ۔ کیونکہ یہ چیزیں ادنیٰ تخلیق ہیں ، محض وہ قوتیں ہیں جو اعلیٰ تخلیق کی طرف ابھارنے میں مددگار کے طور پر استعمال ہوتی ہیں ۔

”مثلاً زندگی ! میں تم کو بتاتا ہوں ۔ زندگی جو نام ہے ہر قسم کی تکلیف اور راحت میں عمر بسر کرنے کا ، کس طرف کو سفر کرتی ہے؟ دانائی کی طرف ۔ کیا کنفیوشس اور افلاطون کی دانائی کبھی ضائع ہو سکتی ہے ۔ وہ لوگ کبھی دوبارہ زندہ نہ ہوں گے ، مگر جو کچھ انہوں نے دیکھا اور جانا اور محسوس کیا وہ آج ہزاروں سال کے بعد بھی ایک طاقت ور اور جاندار قوت ہے اور جب تک زندگی باقی رہے گی یہ قوت انسانوں کے درمیان زندہ اور محرک رہے گی ۔ کیونکہ یہ زندگی ہے جو ہر ایک کو بسر کرنا ہے اور یہ ایک ہی طرف کو سفر کرتی ہے دانائی حسین ہے کیونکہ تخلیق ہے ، اور تخلیق حسین ہے کیونکہ دانائی ہے ۔ تم دونوں کو جدا نہیں کر سکتے ۔

”اور محبت؟ کیا عہدِ قدیم کے انسانوں کی محبت کی داستانوں کو تم بھلا سکتے ہو؟ دنیا میں سب سے بڑی محبت پیغمبروں نے کی ہے، اور محبت ایک ایسی قوت تھی جس نے انہیں ایک اعلیٰ ترین تخلیق کی طرف ابھارا ۔ لیکن اب پیغمبر آنا بند ہو چکے ہیں ۔ اب محبت صرف فنکار کرتے ہیں ۔ وہ لوگ جنہوں نے موسیقی ایجاد کی ، جنہوں نے شعر لکھے ، جنہوں نے سنگتراشی کی ، وہ جنہوں نے زندہ رہتے ہوئے زندگی کو خیر باد کہا ، وہ جو فراغت اور جسمانی راحت کی زندگی ہوتی ہے جس کے لیے ہر کوئی کاوش کرتا ہے ، جسے چھوڑ کر وہ الگ ہو گئے اور تنہائی میں چپکے چپکے کام کرتے رہے، ختم ہوتے رہے ، غیر فانی ہوتے رہے ۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا ، اور کیوں ہوا؟ سنو یہ وہی محبت تھی جو پیغمبروں نے خدا سے پائی اور جب ہمارے پاس پہنچی تو اس کا رتبہ لگن کا ٹھہرا ، اور لگن کی روشنی میں کچھ لوگوں نے تخلیق کی اور ہمیں زندہ رہنے کا سلیقہ عطا کیا ۔ ہم سب محبت نہیں کر سکتے ، ظاہر ہے ، ظاہر ہے ، لیکن پیغمبروں کے خاتمے سے ہم پر بد قسمتی وارد نہ ہوئی کیونکہ محبت کے چراغ سے چند اور چراغ جلے اور ہر آنے والے عہد میں جلتے رہے اور اس طرح وہ شلحہ قائم رہا اور اس کی روشنی اور حرارت کی مدد سے انہوں نے زندہ رہنے کا ایک عظیم الشان قرینہ ایجاد کیا ، اس کی لو میں انہوں نے زندگی کی کثیف اور غلیظ بے ترتیبی

اور بے ڈھنگے پن میں سے ایک لطیف اور شاندار تنظیم برآمد کی جو ہمیں ورثے میں ملی اور اب ہماری جائداد ہے اور اس پر ہم فخر کرتے ہیں۔ تو دیکھا تم نے۔ اس ساری بات کی تہہ میں محض ایک قوت تھی، جہاں ساری قوتیں جا کر ملتی ہیں، تخلیق کی قوت! محبت تو محض راستہ ہے۔ تم بیٹھے رہو۔ میں تھکا ہوا نہیں ہوں۔ رات بھر آرام کیا ہے۔

”اور مذہب؟ سچ ہے کہ تخلیق کی نہایت اعلیٰ شکل ہے، اور نہایت دلکش۔ یہ واحد مظہر ہے جہاں خدا، انسان اور روح آپس میں یوں مدغم ہو گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں تخلیق در تخلیق اس سرعت کے ساتھ عمل میں آتی ہے کہ ہم حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ یہ وہ حیرت نہیں جو سرکس میں کسی کھلاڑی کا کمال دیکھ کر ہوتی ہے۔ یہ وہ بلاخیز ذاتی تجربہ ہے جو ہمیں۔۔۔ مثلاً کسی تباہ کن زلزلے سے زندہ بچ کر نکل آنے سے ہوتا ہے۔ یا اس سے بھی کچھ بڑا، جیسے یہ یہ اب، یہاں۔۔۔“ وہ چاروں طرف دیکھ کر بڑبڑایا، ”یہ اب۔۔۔ یہ اب۔۔۔ ہاں مذہب، بلند ترین تخیل ہے۔ یہ بے مثال مظہر ہے، جہاں خیال فوراً ہی عمل کے سانچے میں ڈھال دیا جاتا ہے اور پھر وہ، محض اپنے زور پر، ایک پوری زندگی اور اس کی منزل کا تعین کرتا ہے، تمام نوع انسانی کو بنیادوں تک ہلا دیتا ہے لاکھوں انسانوں کی روح میں حرکت اور گرمی پیدا کرتا ہے آج بھی انسانوں کی سوسائٹی میں مذہب سب سے بڑی واحد قوت ہے۔۔۔۔۔ تو اس کا اسرار کیا ہے؟ اس کا راز؟ بتاؤ۔ ہنہ ہنہ ہنہ۔“ وہ چالاک سے مسکرایا، ”ایمان۔ یہ ایمان ہی تخلیق کرتا ہے اور سینہ در سینہ، نسل در نسل، عہد در عہد اسے منتقل کرتا جاتا ہے۔ ہم ایک مذہب کے حق میں اور دوسرے مذہب کے خلاف بہترین دلائل دے سکتے ہیں لیکن ہم ایمان سے یقین نہیں اٹھا سکتے جو کہ سارے مذہب کی روح ہے۔ یہ مشترکہ جائداد ہے۔ یہ لاعلم اور بے بہرہ لوگوں کو زندہ رہنے کا اور مرنے کا غیر متزلزل ارا دہ عطا کرتا ہے، ایک آئیڈیل، ایک خواب! وہ شخص جو اپنے دروازے سے باہر کسی شے کا علم نہیں رکھتا اور جس کی ملکیت میں ایک صحن اور ایک چولہے کے علاوہ کچھ نہیں، ایمان کی ہمراہی میں دفعتاً تمام زندگی۔۔۔ اور۔۔۔ تمام موت۔۔۔ کے معنی سمجھ جاتا ہے تمہیں پتا ہے کہ مذہب ہی ایک ایسا علم ہے جس نے کسی حد تک زندگی اور موت کے اسرار کو سمجھا اور بیان کیا ہے؟ مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس سے آگے دلائل ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے ایمان شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ پوشیدہ رو ہے جو تمام مذہب کی تہ میں رواں ہے۔ ایمان، یہ تجریدی اور تقریباً غیر دلچسپ لفظ، جس میں انسانیت اور خدائیت کے وسیع ترین معنی پوشیدہ ہیں، پر اسرار اور غیر مشروط طور پر بے علم لوگوں کے دلوں میں اتر جاتا ہے اور انہیں اطمینان اور وقار کے ساتھ ہر آفت کا، جس میں موت بھی شامل ہے، سامنا کرنے کا اہل بنا دیتا ہے۔ پھر ہر چیز اس قدر آسان اور قدرتی دکھائی دیتی ہے۔

کوئی آج تک نہیں سمجھ سکا کہ کس طرح کمتر ذہانت رکھنے والے لوگ اس Phenomenon کو قبول کر کے ایک عظیم جرات کی اہلیت اختیار کر لیتے ہیں لیکن تم بتاؤ، تخلیق کے عمل آج تک کون سمجھ سکا ہے۔۔۔ سائنس دان؟ ہنہ! جب انسانی دماغ ”کیسے؟“ کے بعد ”کیوں“ پر غور کرنے لگتا ہے تو سارا علم ختم ہو جاتا ہے۔

”تو دیکھا تم نے، کس طرح منظم مذہب، اپنی عظمت کے باوجود، ایمان کے مقابلے میں دوسرا درجہ اختیار کر لیتا ہے، ایمان، جو مذہب کی تخلیق ہے، اس کا سارا مقصد، سارا حسن ہے۔ ذہین لوگ جو اس حقیقت کو نہیں سمجھ پاتے مذہب سے بد دل ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ میں بھی ان میں شامل تھا، لیکن رات، وہاں ان کے ساتھ۔۔۔۔۔ وہ چند بے علم گنوار دہقان تھے۔۔۔۔۔ ان کے ساتھ بیٹھے بیٹھے دفعتاً مجھے ان کی طاقت، ان کی دانائی اور ان کے وقار کا علم ہوا جب کہ موت ان کے سامنے کھڑی تھی، ان کے درمیان چل پھر رہی تھی۔ زندگی کے اس عظیم جری لمحے میں انہوں نے اسے مکمل طور پر قبول کر لیا تھا، منظر انداز کر دیا تھا۔ یہ تمام بنی نوع انسان کی دانائی اور اس کا وقار تھا۔ یہ اس قدر سادہ اور آسان تھا۔

”تو تم نے دیکھا۔ تم ذہین آدمی ہو۔ میں جانتا ہوں،“ وہ مسکرایا۔ ”تخلیق۔۔۔۔۔ سب سے اوپر ہے۔ سب سے۔ میں نے دیکھا ہے۔ آج۔۔۔“ وہ دوبارہ شرما کر ہنسا، ”آج میں نے ایک منظم، تم جانتے ہو میں شاعر نہیں ہوں۔ پھر بھی آج۔۔۔ لیکن اب میں اسے بھول گیا ہوں۔ خیر چھوڑو اسے، یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ یہ اس قدر سادہ اور آسان ہونے کے باوجود اس قدر مشکل بھی ہو سکتا ہے۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو اپنے تمام علم اور عقل کے باوصف افلاطون یا کوئی پیغمبر ہو سکتا تھا، لیکن اس کے پاس خدا نہیں تھا۔۔۔ چنانچہ وہ دنیا میں پیدا ہونے والی کمترین اجناس میں سے تھا۔“

بوڑھا پروفیسر ہنسا: ”چلو اچھا ہوا۔۔۔ شاعری نے تمہیں زبان تو دے دی۔“
 ”اول تو مردہ بولے ہی ناں، اور بولے تو کفن ہی پھاڑے۔“ علی نے بھی ہنس کر لاہور کا سیکھا ہوا ایک مذاق کیا۔

ان دونوں کو نعیم کی اس پر اسرار چپ کے ٹوٹنے سے نمایاں خوشی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے نعیم کی طبی تقریر کے دوران بوڑھا پروفیسر علی کی طرف جھک کر اس کے کان میں کہہ چکا تھا: ”اب تمہارے بھائی کی حالت پہلے سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ شکر ہے۔“

چلتے چلتے شام ہو گئی مگر نعیم متواتر باتیں کرتا رہا۔ پروفیسر تھکاوٹ کے باعث ایسی خستہ حالت کو پہنچ چکا تھا کہ نعیم کی باتوں سے اسے قطعی دلچسپی نہ رہی تھی۔ پھر بھی جب اس کے خیال میں نعیم زیادہ اوٹ پٹانگ کہنے لگتا۔ نعیم نے ایک بار بھی اسے ہلنے نہ دیا۔ اس پر پروفیسر نہایت خفیہ ہوتا اور چور مچا ہوں سے علی کو دیکھنے لگتا۔ اس کے خیال میں علی، جو کہ

کاڑی کا مالک تھا، یہ سمجھ کر دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس کا بھائی بھوک اور تھکان کی وجہ سے اس غیر حالت کو پہنچا تھا اور وہی تباہی بک رہا تھا جب کہ پروفیسر اس کی جگہ پر غاصبانہ قبضہ کیے بیٹھا تھا۔

آخر جب اندھیرا بڑھا تو پروفیسر، علی نعیم کی آنکھ پچا کر نیچے کود پڑا اور پھر علی کی مدد سے اُس کو اٹھا کر گاڑی میں پھینک دیا۔ پھر جلدی سے علی نے تھوڑی سی گیلی روٹی اس کے ہاتھ میں تھمائی جسے وہ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اشتہا کے ساتھ کھانے لگا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ پہلی دفعہ عائشہ کی طرف متوجہ ہوا:

”تم نے روٹی کھالی ہے؟“

اُس نے سر ہلایا۔

”بولتی کیوں نہیں؟ تم بھی کچھ لو۔“ اس نے بڑھے مسخروں کی طرح ہنستے ہوئے لڑکی کے پیٹ میں گدگدی کی۔ وہ شرما کر مسکرائی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ علی کو اتنے دنوں میں پہلی بار مسکراتی اور سرخ ہوتی ہوئی اپنی بیوی بڑی پیاری لگی۔ وہ خوش ہو کر ہنسا:

”میرے بھائی کی طرف زیادہ توجہ مت دو،“ اس نے اونچی آواز میں کہا۔ ”سنا ہے جوانی میں لڑکیوں پر ظلم ٹھایا کرتا تھا۔“

عائشہ اور بھی سرخ ہو گئی۔

”ہمارے گھر تم کیوں نہیں آتے تھے؟“ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

”تمہارے گھر؟۔۔۔ دراصل مجھے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ گھر میں تم نے مجھے یاد

رکھا تھا؟“

”ہاں۔“

”سب نے؟۔۔۔ یعنی گاؤں میں؟“

”ہاں۔ بہت۔ گھر میں وہ سب تم کو یاد کرتے تھے اور باہر کھیتوں میں تمہارا ذکر ہوتا تھا۔ وہ جو تمہارے دوست تھے بڑے شوق سے بات کرتے تھے، دوسرے کہانیوں کی طرح تمہاری باتیں سنتے تھے۔ علی گاؤں نہیں جاتا تھا پر میں جاتی تھی۔ تمہارے پکے مکان کے باغ کو اجاڑ دیکھ کر جی بیٹھ جاتا تھا۔ جب گاؤں والے تمہیں پوچھتے تھے۔ ان کے خیال میں ہم تم سے ملتے جلتے تھے۔ تم کبھی گاؤں کیوں نہیں آتے تھے؟“

”جی تو چاہتا تھا۔“ وہ سیکھنت ماند پڑ گیا اور روٹی کے گرے ہوئے ریزے چن چن کر منہ

میں ڈالنے اور جبرے چلانے لگا۔ پھر تیزی سے اس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔ ”بہر حال۔“

یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ تم کس طرح رہیں، اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اچھی طرح سے

نہیں رہیں۔ تم ایسی خوبصورت لڑکی تھیں۔ تھ تھ تھ۔۔۔۔۔ پتا ہے تمہارے ساتھ

شادی کرنے کے لیے علی میلوں تک میری گھوڑی کے ساتھ بھاگتا رہا تھا اور تم نے اپنی یہ حالت بنا رکھی ہے۔ بہر حال گھر میں تم نے مجھے یاد رکھا۔ شکریہ۔ میری تو لمبی جلاوطنی تھی۔ ہنہہ، وہ تو ہم سب کی تھی، یہ کیا اہم ہے۔۔۔۔۔“

ویر تک اسی طرح لڑکی کے ساتھ باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ وہیں پر لیٹ کر سو گیا۔ منہ اندھیرے وہ جاگ گیا اور اٹھتے ہی بلا تمہید باتیں کرنے لگا، یوں جیسے کبھی سویا ہی نہ تھا۔ کچھ ویر تک وہ عائشہ سے باتیں کرتا ہوا اسے گدگداتا رہا۔ پھر کم عمر لونڈوں کی طرح چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا اور علی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”یہ امرتسر کے گرد و نواح کا علاقہ ہے۔ میں سن انیس میں یہاں آیا تھا۔ سن انیس۔ ہم سب تھے۔ عذرا بھی ہمراہ تھی۔ عذرا؟ اوہ۔۔۔۔۔ تم وہاں پہنچ کر کیا کرو گے؟“

”امرتسر؟“

”لاہور۔“

”پتا نہیں۔“

”میں نے صرف سٹیشن دیکھا ہے۔ سنا ہے اچھا شہر ہے۔ تم تو تھے۔“

”ہاں۔ جلاوطنی میں سب جگہیں ایک سی ہوتی ہیں۔ تم بھی تو ساتھ ہو، کچھ بتاؤ۔“

علی نے کہا۔

”ہاں، ظاہر ہے۔ مجھے سوچنے دو۔ مگر اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ سنو۔ اب میں تمہیں کسی کارخانے میں نہیں جانے دوں گا۔ وہاں مردہ خراب ہو جاتا ہے آدمی کا۔ اب ہم گاؤں میں چل کر رہیں گے۔“

”کس گاؤں میں؟“

”تمہارے تو سوال ہی ختم نہیں ہوتے۔ کہاں؟ کیوں؟ بھائی کسی بھی گاؤں چلے جائیں گے۔ یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں گے، اور وہ یہ ہے۔ اب ہم کھیتی باڑی کریں گے۔“ وہ رکا۔ ”اور اگر تم سوچ رہے ہو کہ اپنا کام بھول جاؤ گے تو پھر۔۔۔۔۔ کتنا ہی کام ہے۔ ہل، کدال، پھاؤڑا، دراتی، ٹوکا، پھر کنوئیں کا سامان اور جانوروں کی نعل بندی، رسے اور زنجیریں، ناندیں اور مچائیں، پھر گاڑیاں اور ان کا سامان اور گھر باہر کی کھڑکیاں دروازے اور طاق طاقتے، اتنا بہت سا کام ہے جو تم کر سکتے ہو، اپنے گھر میں، اپنے گاؤں میں، اپنا اور دوسروں کا، نہ منت نہ محتاجی، بولو۔۔۔۔۔“

”ہوں۔ مگر زمین۔“

”اگر مگر اگر مگر۔ تم تو ضدی ہو چکے ہو بس۔ سب یہ کار ہے۔ زمین کے قصے کا بھی کچھ نہ کچھ کریں گے۔ مگر اس کے بعد؟۔۔۔۔۔ اول تو یہ کہ سیدھے گاؤں جائیں گے۔“

”دوم یہ کہ سیدھے گاؤں جائیں گے اور سوم یہ کہ سیدھے گاؤں ۔۔۔“ علی نے چڑ کر کہا۔

نعیم بولتا رہا: ”کہ گاؤں کی زندگی صاف، سیدھی اور حقیقی ہوتی ہے۔ اس کے بعد گھر بنانے کا مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں تم نے کچھ سوچا ہے۔ خیر تم سے تو یہ امید بیکار ہے۔ سنو۔ اس سلسلے میں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ چند دن آرام اور بہتر غذا کے بعد کام کرنے کے قابل ہو جائیں گے ہم سب۔ ٹھہرو،“ وہ چلتے چلتے پروفیسر کی طرف جھکا۔

”تمہارا کوئی گھر ہے؟“

”نہیں۔“

”بس ٹھیک ہے۔ ہم تین آدمی ہیں اور کام کرنے والے ہیں۔ ابھی تو ٹانگیں سوج کر بیکار ہو چکی ہیں۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ چند روز تک تو ہم گاڑی پر چھت ڈال کر ہی کام چلا سکتے ہیں بہر حال، پھر مکان کھڑا کرنا شروع کریں گے۔ تمہیں مکان بنانے کا تجربہ نہیں اس لیے ڈر رہے ہو۔ مجھے بھی نہیں، مگر اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ بس محنت درکار ہوتی ہے، اور کچھ نہیں۔ اینٹوں کی ضرورت نہیں۔ پتھر اور گارے سے لوہے کی طرح مضبوط دیواریں بنتی ہیں، اور چھت کے لیے کیکر کی لکڑی مفید ہے، یا نیم کی جس کو دیمک نہیں لگتی۔ یہاں پنجاب میں کیکر اور نیم کے جنگل کے جنگل ہیں۔ یہ سارا ایک ہی علاقہ ہے۔ یہ بٹوارے کا قصہ سب بیکار ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عائشہ چولہے بنا لیتی ہے؟“

”پتا نہیں۔“

”تمہیں کچھ پتا نہیں۔ پر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ضرور بنا لیتی ہو گی۔ ہمیں صرف تین کمروں کی ضرورت ہے۔ پہلے پہل تو ایک ہی دالان سے کام چل سکتا ہے۔ ایک طرف بھوسہ آجائے گا جو سردی کا بھی پچاؤ کرے گا، دوسری دیوار کے ساتھ سب سو سکتے ہیں۔ ہم بوڑھے آدمی ہیں، تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔ تم مزے سے سونا۔ اور باہر جانور ہوں گے جن کے گرد دیوار بھی بنانا ہو گی، مگر یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ چکنی مٹی اور بھوسے سے ساری دنیا دیواریں بناتی ہے۔ کواڑ اور کھڑکیاں اور طاقتے، یہ تمہارا کام ہے۔ روشندان بھی بنا لیتے ہو؟“

”ہاں۔“

”شکر ہے۔ پروفیسر تو کچھ نہیں کر سکتا۔ صرف مٹی ڈھو سکتا ہے۔ اگر اسے پڑھنے پڑھانے کا شوق چڑھا تو کام ختم ہونے کے بعد جانے دین گے، اس سے پہلے نہیں۔ ابھی طے کر لیتے ہیں۔ اور تم اسے گاڑی پر بیٹھنے سے منع نہیں کر سکتے۔ تم کسی کو گاڑی پر بیٹھنے سے منع نہیں کر سکتے۔ سب بیکار ہے، اس کا کوئی مطلب نہیں۔ کام شروع کرنے کے لیے

ہمیں بس یہ چیزیں چاہیں : دو بالٹیاں پانی کے لیے ، دو لکڑی کے تختے ، اور ایک کلہاڑی ، بس اتنی تیز کہ کیکر کو کاٹ لے ۔ ۔ زیادہ تیز ہو تو دھار ٹوٹ جاتی ہے ۔ بس ۔ ” اس نے چٹکی بجائی ۔ ” بس ۔ ” آن کی آن میں ہم تمہیں دیوار کھڑی کر دیں گے ۔ گاؤں کے لوگ سیدھے سادے اور خدا ترس ہوتے ہیں ۔ یہ بھی بھلا بتلانے کی بات ہے ۔ عمر بھر تو ہم لوگ گاؤں میں رہے ۔ تم دیکھ لینا ہر روز کوئی نہ کوئی ، ایک یا دو یا کبھی کبھی چار گاؤں والے ہماری مدد کو آ موجود ہوں گے ، آتے رہیں گے ۔ دیہات میں بڑی خدا ترسی اور اصلیت ہوتی ہے ۔ دنوں میں مکان تیار ہو جائے گا ۔ گائے نہلانے سے لے کر فصل کاٹنے تک وہ برابر ہماری مدد کریں گے ، اور ہم ان کی ۔ انہیں رہنے کا سلیقہ آتا ہے ، یہ ساری بات ہے ۔ ۔ ۔ یہ بھادوں کی دھوپ نامراد کیسی سخت ہوتی ہے ۔ وہ پرندے والا کیا قصہ ہے ، علی ؟“

علی ایک پرانی بات کے حوالے کے لیے پوچھے جانے پر خوش ہوا ۔ ” اس کا نام ارر ۔ ۔ ۔ سر سوتی ہوتا ہے یا کیا ، لاجوتی ۔ وہ گیارہ مہینے دھوپ میں بیٹھتا ہے مگر بھادوں کی دھوپ سہہ نہیں سکتا اور سائے میں چلا جاتا ہے ۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا ۔ ” یہی قصہ تھا نا ؟“

”میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا ۔“ پروفیسر نے کہا ۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ بھادوں کی دھوپ بہر حال کڑی ہوتی ہے ۔ کڑی ؟ کڑی کیا ؟“ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا ۔ ”اوہ ۔ ۔ ! بارشوں سے ایسے مکانوں کو کافی نقصان پہنچتا ہے ۔ ہمیں مستقل کام کرنا ہو گا ۔ چھپر ، گھاس پھونس ، لپائی ، تم جانتے ہی ہو ۔ تالے لکانے کی ضرورت نہیں ، ہمارے پاس فالتو کچھ ہو گا ہی نہیں ، مگر جانوروں کے لیے چھپر چاہیے ، برسات میں بھینگنے سے دودھ سوکھ جاتا ہے اور بری بری بیماریاں لگ جاتی ہیں ۔ اور برسات کے موقع پر ۔ ۔ ۔“

وہ بے مکان بولتا گیا ۔ چھوٹی چھوٹی غیر ضروری باتیں جو اصل زندگی میں اتنی اہم ہوتی ہیں اس نے اتنی تفصیل اور محنت سے بیان کیں کہ علی نے سننا ہی چھوڑ دیا ۔

جب سورج ڈھلنے لگا تو دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ پروفیسر اور علی غائب ہو چکے تھے ۔ وہ اس کا عادی تھا ۔ اچک کر گاڑی پر بیٹھ گیا اور بے دھیانی سے حملہ آوروں کی اس ٹولی کو دیکھنے لگا جو ٹٹول ٹٹول کر جوان عورتوں اور چند مردوں کو ہنکائے لیے جا رہی تھی ۔ نعیم کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا ، صرف آنکھوں کی چمک تھی جو یکلخت ماند پڑ گئی تھی ۔ پھر وہ لاپرواہی سے ان کے سروں کے اوپر اوپر دیکھنے لگا ۔ بھورے رنگ کی گرد آلود فضا میں مخصوص ، مکروہ ، متلی آور بو اور گھٹی گھٹی چیخوں کی آوازیں تھیں ۔ کچھ دیر بعد قریب ہی چند فائروں کی آوازیں آئیں اور پھر خاموشی چھا گئی ۔ بو بدستور قائم رہی ۔

”کھیتی باڑی شروع کرنے کے لیے بھی زیادہ چیزوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ جب پروفیسر اور علی گاڑی کی اوٹ سے نکل آئے تو اس نے کہنا شروع کیا۔

”نہیں پڑے گی نہیں پڑے گی،“ علی جل کر بولا۔ ”ان کے سامنے ٹانگیں پسا کر بیٹھ جاتے ہو۔ یاد رکھو کبھی نہ کبھی وہ تمہیں پکڑ کر لے جائیں گے۔“

”میچ میں مت بولو،“ نعیم نے خشکی سے کہا۔ ”کوئی پکڑ کر نہیں لے جائے گا۔ بس ایک ہل اور دو میل۔ ہل تو تم بنا ہی لو گے۔ دودھ کے لیے جانور بعد میں آ جائیں گے اور پہلی میائی کے لیے میچ ادھار لے لیں گے۔ پنجاب کی زمین بڑی لائق ہے، جتنی محنت کرو اتنا پھل دیتی ہے۔ پنجاب کی زمین کا آخر کسی نے نہیں دیکھا۔ ہاڑی اور ساؤنی کے علاوہ میں تم کو بتاؤں، وہ رازدارانہ طور پر علی کی طرف جھکا، ”سبزیوں میں بڑی کمائی ہے۔ یہاں کے اچھی ذات کے کسان سبزیاں اگانے کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ ارائیوں کا کام ہے جو کہ جاٹوں سے نیچی ذات ہے مگر یہ سب بیکار ہے۔ سبزیوں میں کمائی ہی کمائی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارائیں سبزیاں اگا اگا کر جاٹوں کی ساری زمین خرید لیتے ہیں اور اونچی ذات والے کسان آپس میں لڑتے مرتے اور مقدمے بازی کرتے رہتے ہیں۔ ہم سبزیاں بوئیں گے۔ یہ سب بیکار ہے۔ اونچی ذات، نیچی ذات، ہنہہ۔ آدمی کی ذات کا اور سبزیوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔۔۔“

”سبزیاں؟ کیا سبزیاں؟“ علی نے پوچھا۔

”یہی مٹر، مونگرے، کریلے، کدو، ترٹی وغیرہ۔۔۔“

”اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔“ اب اس نے باقاعدہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔ سبزیاں!

”ہاں سبزیاں۔ اب رہے میل۔ ارررریلوں کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟“

”میل؟“ علی بالکل خالی الذہن تھا، مگر کوشش کر کے اس نے سوچا۔ ”میل بھی کہیں

نہ کہیں سے۔۔۔“

”مجھے پتا تھا تم نے کچھ نہیں سوچا۔ میل ہم پہلی میائی کے لیے ادھار بھی لے لیں

گے۔ بس بات کرنے کا طور آنا چاہیے۔ جب ان کو علم ہو گیا کہ بھلے مانس آدمی ہیں اور میل

لے کر کہیں بھاگیں گے نہیں تو وہ خوشی سے ہفتے دس دن کے لیے دے دس گے۔ مگر

دوسرے کے جانور کو بڑی احتیاط سے برتنا پڑتا ہے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے۔ گھر میں جب کوئی

میل مانگ کر لے جاتا تھا تو ہمارا باپ احمد دین کے لونڈے کو جاسوسی کرنے کے لیے بھیجا کرتا

تھا اور وہ شیطان پہر پہر کی آکر خبر دیتا تھا کہ آج انہوں نے یہ کھانے کو دیا ہے جانوروں کو اور

اتنا دیا ہے اور اتنا کام لیا ہے۔ تم سے کوئی بات چھپی ہوئی تھوڑی ہے۔ تمہارے پاس کچھ

رقم ہے؟“

”کچھ ہے۔ عائشہ کے پاس۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم ایک جوڑی خرید بھی سکتے ہیں۔ فصل کے فصل پیسے چکاتے رہیں گے۔ جب ان کو علم ہو گیا کہ ہم ایماندار اور محنتی آدمی ہیں تو وہ اعتبار کر لیں گے۔ آخر ہم ٹھگ تھوڑے ہی ہیں، سچے کسان ہیں اور کاہلی سے دور بھاگتے ہیں۔ لیکن سبزیوں کے علاوہ اناج بھی اشد ضروری ہے۔ تم اناج کی میائی بھول تو نہیں گئے؟“

”نہیں۔“

”شکر ہے۔ گیہوں کی میائی اگلے مہینے شروع ہو جائے گی۔ یہ بہر حال بارشوں پر منحصر ہے۔ اگر برسات دیر تک چلتی رہے تو میائی پیچھے پڑ جاتی ہے۔ فصل کے تیار ہونے اور اترنے میں میائی کا بڑا اہم مقام ہے۔ کس وقت میں ہو اور کیسی ہو۔ گیلی زمین میں، جب تک مٹی پیر سے چمکتی رہے، کچھ بھی نہیں بونا چاہیے۔ تمہیں اپنے باپ کی باتیں یاد ہیں؟ ضرور ہوں گی۔ مجھے اس کے دیے ہوئے سارے سبق آج تک یاد ہیں؟ گیلی زمین میں مینڈک بھی مر جاتے ہیں، بیج تو بڑی نازک شے ہے، وہ کہا کرتا تھا۔ اور جوار باجرہ بھی بڑا ضروری ہے۔ کسان اگر ترقی کرنا چاہتا ہے تو وہ بارہ مہینے گیہوں نہیں کھا سکتا۔ اور پھر جانور ہیں جن کی گزر اوقات مکئی پر ہوتی ہے۔ مکئی کے سیری گیڈر بہت ہوتے ہیں۔ پچاؤ کے واسطے کیا کرو گے؟“

”کتے رکھ لیں گے۔“

”کتے رکھ لیں گے۔“ نعیم نے غصے سے ہاتھ نچا کر نقل اتاری۔ ”اور جو کتوں کو کھلانا پڑے گا وہ کدھر سے آئے گا۔ تم نے اتنے برس تک کیا کام سیکھا ہے جو گیڈر پھانسنے کا ایک پنجرہ بھی نہیں بنا سکتے۔ ہیں؟ کتے رکھ لیں گے۔“ اس نے دوبارہ نقل اتاری۔ ”تاروں کا ایک پنجرہ بنا لینا، بس۔ گیڈر تو تمہیں پتا ہے ہوتے ہی ہیں۔ اپنے ہاں بھی ہوتے تھے۔ سب جگہ ہوتے ہیں۔ یہ یہاں وہاں اور ادھر ادھر کا قصہ سب بیکار ہے، گیڈر ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اور ساؤنی کی فصلوں میں گنا بڑا بار آور ہوتا ہے۔ جاڑوں کی راتوں کو گرڈ ضرور بنانا، سردی سے محفوظ رکھتا ہے اور طاقت بھی آتی ہے، اور کڑاہ چڑھا ہو تو آتا جاتا ہر کوئی چکھتا ہے اور فیض بڑھتا ہے۔ گرڈ بنانے کا طریقہ تمہیں یاد ہے؟“

”بھنڈی کے ڈٹھل۔۔۔“

”ہاں ہاں بھنڈی کے ڈٹھل میل کو کاٹ کر لٹھے کی طرح سفید گرڈ بناتے ہیں۔ مگر گنے کی حفاظت کرنا بڑا جان جو کھم کا کام ہے۔ ماگھ کی راتوں میں کھیت کا ایک چکر لگاؤ تو ہاتھوں میں خون جم جاتا ہے۔ اور جنگلی سور جو کھیت کے کھیت کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ میں نے ایک بار زخمی سور مارا تھا آمنے سامنے ہو کر بڑا شریف جانور تھا کوئی، پر بھٹی کیا نادانی کی عمر تھی۔۔۔“

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ قافلہ اسی طرح تھکی تھکی مستقل چال سے رواں تھا۔ نعیم دیر تک گاڑی کے ڈنڈے پر جھک کر بیٹھا تیزی سے باتیں کرتا رہا۔ جیسے وقت کے مقابل بھاگ رہا ہو۔ روز مرہ زندگی کی آن گنت باتیں، چھوٹے چھوٹے پروگرام، کتنی ہی باتیں اس نے عجلت اور مستعدی سے علی کے ذہن نشین کرائیں۔ برسات کی ہوا میں گلے سڑے پتوں اور تازہ جلے ہوئے بارود کی بو کہیں سے اڑتی ہوئی آئی۔

پھر اچانک رک کر اس نے لمبا سانس لیا اور پروفیسر کی طرف مڑ کر دھیمے لہجے میں بولا :
سنو۔ میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں، شاید پھر بھول جاؤں۔ زندگی۔۔۔ زندگی کا ست، زندگی کا نچوڑ۔۔۔ قربانی کا جذبہ ہے اور کچھ نہیں ہے۔ یہ میں نے جانا ہے۔ اور کچھ نہیں ہے۔“

پروفیسر تھکے ہوئے اداس انداز میں مسکرایا۔

”نہیں۔ تم ہنس نہیں سکتے۔ میں بڑ نہیں مار رہا۔ میں جانتا ہوں۔ دل پر اتنے مرحلے، اتنی محتاجی آتی ہے، اس کے بعد ہمیں ان باتوں کا علم ہوتا ہے۔“
وہ خاموش ہو گیا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ اسے صرف اتنی آواز سنائی دی :
”اس کے بعد ہمیں ان باتوں کا علم ہوتا ہے۔“

جب وہ دوبارہ بولا تو رات کی تاریکی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ وہ یکلخت علی کی طرف مڑ کر خفگی سے بولا : ”اس کے بعد ہمیں ان باتوں کا علم ہوتا ہے۔ تمہیں کیا علم ہے؟“
”کیا علم ہے کیا علم ہے،“ علی نے چڑ کر کہا۔ ”جاتے کے لیے ہئی کیا۔ اوٹ پٹانگ بولے جاتے ہو۔ خاموش رہو۔ تھک جاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے۔ جاتے کے لیے بہت کچھ نہیں ہے۔ دو ایک باتیں ہیں وہ بھی مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں۔ جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم سطح پر، ہر وقت میں، ہر چیز کی قربانی دے سکتے ہیں تو زندہ ہیں، ورنہ نہیں ہیں۔۔۔ اور تم کسی کو گاڑی پر بیٹھنے سے نہیں روک سکتے۔ اس کا کوئی مطلب نہیں۔“

علی حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بولا :

”اس سے قطع نظر۔۔۔ سنو۔ ایک بات اور بتاتا ہوں۔ عذرا، میری بیوی، ایک عظیم عورت ہے۔ اس کے پاس کوئی اندیشہ، کوئی الجھن، کوئی ریا کاری نہیں۔ وہ جو کچھ چاہتی ہے بلا جھجک اس کے لیے تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ انسان کی ساری شرافت، سارے کرب اور ساری قربانی کے ساتھ خاموشی اور رضامندی سے زندہ ہے۔ خدا انسان کو اپنی شبیہ میں بناتا ہے نا۔ وہ عذرا ہے۔ اب اس کا ذکر نہ کرنا۔“

پھر وہ پروفیسر کی طرف مڑا: ”اور خدا بھی ہے۔“ اس نے کہا۔
 پھر انہوں نے اسے تھوڑی سی گیلی روٹی دی جسے کھا کر وہ سو گیا۔
 وہ بہت گہری نیند سو کر اٹھا۔ اجالا پھیل رہا تھا۔ قافلہ مستقل چلے جا رہا تھا۔ اٹھتے ہی
 اس نے خوش دلی سے عائشہ سے باتیں چھیڑ دیں:
 ”وہاں پہنچ کر تم چند روز میں متدرست ہو جاؤ گی۔ خالص ہوا اور خالص غذا، صحت کے
 لئے اس سے مفید اور کوئی چیز نہیں۔ تمہیں زیادہ کام کرنے کی ضرورت نہیں، سارا کام ہم
 کریں گے۔ تم صرف کھانا پکا دیا کرنا۔ گاؤں والے کہیں گے، یہ نیا خاندان کیسا اچھا اور
 شریف ہے، تین جوان اور محنتی مرد (پروفیسر ہنسا) اور ایک جوان اور خوبصورت لڑکی۔ تم
 چولہے بنا لیتی ہو؟“
 ”ہاں۔“

پھر وہ چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ ”تم رات بھر چلتے رہے ہو۔ علی جوان آدمی ہے چل
 سکتا ہے۔ تم اب آرام کرو۔“ اس نے ایک بازو سے دھکیل کر پروفیسر کو گاڑی پر بٹھا دیا۔
 ”تم گیدڑوں کی بات کر رہے تھے۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ اگر مکئی کے کھیت کے گردا
 گرد تم سنبل کی گھاس بو دو تو کبھی پاس بھی نہ پھٹکیں گے۔ سنبل جاتے ہو کیسی خوشبودار
 شے ہے، پر گیدڑ اس سے کوسوں بھاگتا ہے۔ عجیب بات ہے۔ لیکن گیدڑ گیدڑ ہوتا ہے اور
 اس کی قوتِ شامہ ٹھیک نہیں ہوتی۔۔۔“
 اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ علی اور پروفیسر دونوں غائب ہو چکے تھے۔ گاڑی کی اوٹ
 سے علی کی آواز آئی۔

”باتیں بند کرو۔ ادھر آؤ۔ ادھر آؤ، ادھر، اوٹ میں۔۔۔ وہ اس طرف آ رہے
 ہیں۔ اوہ۔۔۔ کم بخت۔“

اس نے جھنجھلا کر بات جاری رکھی: ”اوہ لیکن یہ اہم نہیں ہے۔ گیدڑوں کو بھگانے کے
 لیے سنبل گھاس مفید ہوتی ہے اور دودھ دینے والے جانوروں کے لیے اس کا چارہ بھی عمدہ بنتا
 ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ اور کٹائی سے پہلے ایک اور بات کا خیال رکھنا۔۔۔“

لیکن اب وقت نہیں رہا تھا۔ وہ سیدھے اس کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے پہنچنے سے
 پہلے اس نے بس ایک کام کیا۔ نہایت صفائی سے اس نے لکڑی کا بازو الگ کیا اور منظر پچا کر
 اسے گاڑی میں پڑی دلائی کے نیچے چھپا دیا۔ ”اس کا خیال رکھنا۔“ وہ کہنے والا تھا، لیکن انہوں
 نے دیسی بنی ہوئی بندوقوں کے دستے مار مار کر اسے آگے لکایا۔

”سور۔۔۔ کتے۔۔۔“ گاڑی کے ڈنڈوں کے ساتھ چمٹ کر چلتے ہوئے علی نے رو کر
 کہا۔ پروفیسر نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ آخری دفعہ انہیں ہجوم میں غائب ہوتی، ہٹوی

نعیم کی پشت نظر آئی جس پر قمیض تار تار ہو کر لٹک رہی تھی۔ وہ سر جھکائے چل رہا تھا اور اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

کچھ دیر بعد کہیں قریب سے چند فائروں کی آواز آئی لیکن کچھ لوگوں نے سنا کچھ نے نہ سنا کیونکہ اب وہ پوری رفتار سے بھاگ رہے تھے۔ حملہ آوروں کا ایک لشکر ان کے تعاقب میں تھا، اور امرتسر کا سٹیشن ایک میل کے فاصلے پر تھا جہاں سے خبر آئی تھی کہ گاڑی لاہور جانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ گاڑیوں والے اب میلوں کو پیٹنا بند کر کے، بوجھ ہلکا کرنے کو، فالتو سامان اٹھا اٹھا کر نیچے پھینک رہے تھے:

مٹی کی صراحیاں، پتیلیں، روغنی پائے، ٹرنک، صندوق، دلائی، لکڑی کا ایک ٹکڑا دیکھی، توا، برتن۔

”میں اتر جاؤں؟“ پروفیسر نے آہستہ سے پوچھا۔

”تم یہیں بیٹھو۔“ علی نے خفگی سے کہا اور ایک ہاتھ سے اسے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے

سامان نیچے پھینکتا رہا۔

سٹیشن پر اس نے عائشہ کو اٹھا کر چلنے کی سعی کی لیکن کمزوری اور بھیر کی وجہ سے گر گیا۔

پھر اٹھا اور بے دھیانی سے اکیلا چل پڑا، دروازے تک جا کر لوٹ آیا اور دوبارہ ادھ موٹی عائشہ کو

اٹھانا چاہا، پھر اسے زمین پر کھسیٹنے لگا، لیکن کھسمان کے رن میں ایک دفعہ پھر اس کا ہاتھ چھوٹ

گیا اور وہ دھکے کھاتا ہوا اندر کی طرف بڑھنے لگا۔

جب گاڑی آہستہ آہستہ چلنی شروع ہوئی تو وہ لپک کر اس پر سوار ہوا۔

اختتامیہ

عالمین پبلیکیشنز پریس لاہور

I am moved by the fancies that are curled
 Around these images and cling;
 The notion of some infinitely gentle
 Infinitely suffering thing.
 Wipe your hand across your mouth, and laugh;
 The worlds revolve like ancient woman
 Gathering fuel in vacant lots.

T.S.ELIOT

علی لاہور کے اسٹیشن پر پڑا تھا۔ سارے پلیٹ فارم بے گھر لوگوں سے اٹے پڑے تھے جو اپنے پھٹے پرانے بستر بچھائے اندر اور باہر ہر جگہ لیٹے تھے، بیٹھے تھے، سو رہے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ جو ہمت والے تھے، پیٹ بھرنے کے لیے مزدوری کرتے، بھیک مانگتے یا چوری کرتے، باقی کبھی کبھار اٹھ کر ریلوے کے نل سے پانی پی لیتے اور سارا وقت پڑے رہتے۔ سب کے چہرے بہر حال بھوکے، غلیظ اور بے تاثر تھے۔ ایک منزل جو منظر میں تھی اس پہ وہ پہنچ چکے تھے، اس سے آگے انہیں کچھ پتا نہ تھا۔ اب اس سارے ازدحام پر خوفناک آکس اور بے اعتنائی طاری ہو چکی تھی۔

دن میں ایک آدھ گاڑی ان کے بھائی بندوں کی ہندوستان سے وارد ہو جاتی اور تقریباً اتنے ہی لوگ ہندوستان جانے کے لیے یہاں سے گاڑیوں پر سوار ہوتے، یا شمال کی طرف سے گاڑیوں میں بھر کر آتے اور واہگے کی سرحد کی طرف نکل جاتے۔ یہ سب آنے اور جانے والے ایک ہی قبیلے کے افراد تھے۔ اس انسانی آبادی پر وہ وقت آیا تھا جب چہروں اور عقیدوں کا فرق مٹ جاتا ہے۔

علی صرف اس وقت اٹھتا جب ہندوستان سے کوئی گاڑی آتی۔ کمزور ٹانگوں پر چلتا ہوا وہ گاڑی کی ساری لمبائی طے کرتا، ہر ایک ڈبے میں گردن ڈال کر، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور دوسرے سرے پر پہنچ کر وہیں بیٹھ جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی خالی ہو جاتی اور بدبودار، بدحال، ہجوم چینیٹا پکارتا ہوا پھٹ پڑتا اور لاوے کی طرح ہر طرف پھیل جاتا۔ ہر دفعہ ایسا ہوتا کہ گاڑی کے سامنے سے گزرتا ہوا علی ہجوم کے دھکے کھا کر گڑ پڑتا اور چند لمحوں میں ان گنت قدموں کے نیچے روندنا جاتا۔ ہر دفعہ وہ چینیٹا چلاتا او کالیاں دیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنی بیکار تلاش کو جاری رکھتا۔ دو روز سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا لیکن یہ سوچنے کی اس میں قوت نہ تھی کہ وہ اب تک کیونکر زندہ تھا اور چل پھر اور لڑ بھڑ رہا تھا۔ جو عام انسانوں میں ہمہ وقت زندگی کی ہزاروں چھوٹی بڑی چیزوں پر متعجب ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے اس میں ختم ہو چکی تھی۔ اس کے پاس اس کا بھی کوئی واضح تصور موجود نہ تھا کہ وہ کس کی تلاش میں تھا اور کس کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ بھی غالباً زندگی کے ارتقاء کی، اس کے تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش محض تھی۔

دوسرے دن وہ آہنی جنگلے سے ٹیک لگائے اونگھتا تھا کہ گرجتی ہوئی ایک گاڑی پلیٹ فارم پر آکر رکی۔ وہ چونک کر اٹھا، مگر اس گاڑی میں سے کوئی نہ اترتا کیونکہ وہ شمال کی طرف سے بھری ہوئی آئی تھی اور ہندوستان جا رہی تھی۔ وہ پھر جنگلے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے اور چند ایک کھلی کھڑکیوں میں سے بچوں کے ایسے زرد اور خوفزدہ

چہرے جھانک رہے تھے۔ گاڑی معمول سے زیادہ عرصے تک رکی رہی، پھر اس کا انجن الگ ہو کر چھک چھک کرتا ہوا تازہ ہونے کے لیے چلا گیا۔ چاروں طرف کشیدگی کا عارضی سناٹا پھیل گیا اور غیر معمولی طور پر بڑھتا گیا۔

پھر باہر ایک شور اٹھا اور واویلا کرتے ہوئے لوگوں کا چھوٹا سا ہجوم سٹیشن میں داخل ہوا۔ سامنے آتے ہی ان بظاہر غیر مسلح لوگوں میں سے ایک نے جیب سے پستول نکال کر ہوا میں دو فائر کیے۔ دوسرے نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین کر کھڑکی کے شیشے سے منہ لگا کر باہر دیکھتے ہوئے ایک زرد رو بچے کا نشانہ لیا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔۔۔ پھر پلیٹ فارم پر سے تمام مردہ اور نیم مردہ لوگ حیرت انگیز جوش اور پھرتی کے ساتھ اٹھ کر گاڑی پر ٹوٹ پڑے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے ٹوٹنے کی آواز اکا دکا ہوتے ہوئے فائروں کی خشک، پٹانے دار آوازوں سے رل مل گئی۔ ان میں شامل مرنے والوں اور بھاگنے والوں کی چیخوں کی آواز اور حملہ آوروں کی ہاہا کار تھی۔ بہت سے لوگ کود کر گاڑی سے نکل بھاگے اور ہر طرف سے گھر گئے، کچھ اندر ہی رہے۔ فضا میں تازہ انسانی خون کی بو پھیل گئی۔ علی کاہلی سے اس سارے منظر کو دیکھتا رہا، پھر اکتا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر جھنگلے پر ٹیک دیا۔ ”ان کے ساتھ والے فوجی کہاں گئے!“ اس نے سوچا۔

پھر اس نے آنکھیں کھول کر داہنی طرف دیکھا۔ یہ ایک عورت کی آواز تھی جو بہت قریب سے آئی تھی۔ واویلا کرتی ہوئی وہ ایک ادھیڑ عمر کی موٹی سی عورت تھی جو اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اچانک رک گئی۔ اس کے ہونٹ برابر چل رہے تھے: ”ظالم۔ قاتل۔ میرے خاوند کو میرے بچے کو مار دیا، مجھے بھی مار دو، مجھے کیوں چھوڑ دیا، کیوں چھوڑ دیا، کیوں۔۔۔“

عورت کی آنکھیں احمقوں کی طرح کوری تھیں اور اس کے چہرے پر بھی، خوف کے علاوہ، شدید حماقت برس رہی تھی۔ کسی حماقت زدہ چہرے کو اپنے سے مخاطب دیکھ کر بعض دفعہ جو بلا وجہ غصہ آ جاتا ہے اس سے علی بھنبھلا گیا۔ پھر دفعتاً ایک قطعی بے وجہ اور غیر ضروری جذبے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا، اس عورت کو مار گرانے، اس کا خون بہانے کی طاقتور، پاگل خواہش نے اسے پلک جھپکنے میں اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

عورت بولتے بولتے رک گئی۔ پھر وہ ایک قدم پیچھے ہٹی اور وقت ضائع کیے بغیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چھاتی پر سے اپنا ململ کا کرتہ دامن تک پھاڑ ڈالا۔ نیچے اس کی جلد صاف گندی رنگ کی تھی اور دو بھاری بھاری پھولے ہوئے تھن منگولوں کی طرح ہیٹ پر لٹک رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مشکل کے ساتھ انہیں اوپر اٹھایا اور آگے بڑھی۔

”مجھے مت مارو۔ خدا کے لیے۔ یہ دیکھو، یہ۔“ اس نے تھن علی کی تھوڑی کے نیچے

ٹھوس دیے۔ ”رحم کرو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔“
 علی نے کراہت سے منہ پھیر لیا۔ دو کھنٹے کے اندر اندر پھر سے امن ہو گیا۔ صرف راستہ
 گزرنے والے لوگ بہت بڑی تعداد میں جمع اندر باہر بکھری ہوئی لاشوں کا نظارہ کر رہے تھے۔
 اس واقعے کے بعد علی کی رہی سہی بھوک بھی غائب ہو گئی۔
 تیسرے دن کسی نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ یہ بانو تھی۔
 ”میں نے تمہیں انبالے کے سٹیشن پر دیکھا تھا،“ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔
 ”تمہارے ساتھ ایک لنگڑا سا بڈھا تھا۔ ہماری گاڑی وہاں سے گزری تھی۔ یہاں کیا کر رہے
 ہو؟“

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔
 ”تم کو گاڑی کہاں سے ملی؟ اور تماری بیوی۔۔۔“ بانو نے متلاشی نظروں سے ارد
 گرد دیکھا۔
 علی نے بھی اس کی ہکاہوں کے تعاقب میں چاروں طرف نظر دوڑائی، پھر نقاہت کے
 مارے آنکھیں بند کر لیں۔
 ”میں ہر روز یہاں آتی ہوں، اپنے لڑکے کی تلاش میں۔۔۔ میں نے پہلے تو تمہیں
 نہیں دیکھا۔“

”تمہارا بیٹا۔ بھی ہے؟“ علی نے آنکھیں کھول کر پہلی دفعہ بات کی۔
 ”ہاں، کمال۔ میرا بچہ۔“

سورج غروب ہو رہا تھا۔ لاشوں کی موجودگی کی وجہ سے ایک خوفناک متلی آور بو پھیلنا
 شروع ہو گئی تھی۔ وہ خاموشی سے بیٹھی علی کو دیکھتی رہی۔ اس وقت اچانک اس کے دل
 میں، ابا، جوں کی طرح جنگلے کے ساتھ آنکھیں موند کر بیٹھے ہوئے اس شخص کے لیے وہ جذبہ پیدا
 ہوا جس کی صرف عورتیں اہل ہوتی ہیں۔

”چلو۔۔۔ میرے ساتھ۔“ اس نے علی کا کندھا ہلایا۔
 وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تمہارا اسباب کہاں ہے؟“
 ”نہیں ہے۔“

وہ خاموشی سے چلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ پھر بانو نے اس کی طرف دیکھا۔
 ”تم چل نہیں سکتے،“ اس نے کہا۔ ”میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔“
 مشکل سے علی کو تانگے کی چمچھلی سیٹ پر سوار کرا کے وہ اس کے برابر بیٹھ گئی اور بتانے

”یہاں مجھے کپڑے کے کارخانے میں کام مل گیا ہے۔ وہیں نور دین بھی مل گیا۔ نور دین کو تم جانتے ہو؟ فٹر جو وہاں ہمارے ساتھ تھا۔ ہم جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ اس نے میری جھونپڑی بنانے میں مدد کی۔ کمال گاڑی میں مجھ سے بچھڑ گیا تھا، مگر وہ ضرور بچ نکلا ہو گا۔ بارہ برس کا ہے پر بڑا ہوشیار ہے، اپنے باپ کی طرح۔ اس کا باپ۔ سؤر۔ تمہاری حالت بالکل بگڑ چکی ہے، اس؟“

تاناگہ اب ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک پر بچکولے کھاتا ہوا جا رہا تھا۔ جھپٹنے کا وقت تھا اور چاروں طرف پھیلا ہوا اپلوں کا دھواں آنکھوں کو لگ رہا تھا۔ علی نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا اور اندھیرے میں اسے پہچانتے کی کوشش کی۔

”میں سویا بھی نہیں۔۔۔“ پھر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر تھوڑی دیر میں گہری نیند سو گیا۔ بانو اسے گرنے سے بچانے کے لیے دونوں بازوؤں میں بچے کی طرح سمیٹے بیٹھی رہی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ تازہ پھونس کی بنی ہوئی نیچی سی چھت والی جھونپڑی میں کھاٹ پر پڑا تھا۔ جھونپڑی صاف ستھری اور تازہ لپی ہوئی تھی اور صبح کی نرم دھوپ دروازے کے راستے اندر آ رہی تھی۔ اس نے دماغ پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی، پھر کہنیوں کے بل اٹھا اور دوبارہ غش کھا گیا۔

دوسری بار جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ ڈھل رہی تھی اور بانو جھونپڑی میں کوئی کام کرتی ہوئی چل پھر رہی تھی۔ اسے ہوش میں پا کر وہ پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”اب تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں نے ابھی ابھی تمہیں دودھ پلایا ہے۔“

”دودھ؟“

”شکر ہے تمہاری جان بچ گئی۔ پہلے تین روز تک کوئی امید نہ تھی۔“

”کیا ہوا تھا؟“ بات کرنے کے لیے اسے جو طاقت صرف کرنا پڑ رہی تھی اس سے اسے

اپنی شقاہت کا اندازہ ہوا۔

”بخار۔“

”کے روز؟“

”آج چھٹا دن ہے۔“

”اتنے دن تم؟۔۔۔“

”ہاں، بانو ہنسی۔“ پہلے تین روز کام پر نہیں گئی۔ اب کام پر بھی جاتی ہوں۔ نور

دین بھی آتا ہے۔ صرف سٹیشن نہیں جاسکی۔ آج میں نے صفائی کی ہے، فرش لپیا ہے۔“

علی نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کی طاقت پھر ختم ہو گئی۔

رفتہ رفتہ اس کی حالت سنبھلنا شروع ہوئی۔ پہلے چند روز وہ صرف اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا، پھر کھاٹ کو پکڑ کر کھڑا ہونے لگا۔ پھر اس نے دیواروں کا سہارا لے کر چلنا شروع کیا۔ بانو اس کا کھانا تیار کر کے کام پر جاتی، شام کو واپس آ کر پھر کھانا بناتی اور جھونپڑی کی صفائی کرتی اور اسے فرش پہ چیزیں بکھیرنے پر بچوں کی طرح جھڑکتی، پھر اسے لٹا کر زمیں پر بیٹھ جاتی اور خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہتی۔ کبھی کبھی نور دین بھی آ جاتا تو وہ باتیں کرنے لگتے۔ بانو ہمیشہ زمین پر سوتی۔

جب وہ پہلی بار بغیر سہارے کے چل کر کوٹھری سے باہر نکلا تو خوشی سے بازو پھیلا کر اس نے ہوا میں لمبا سانس لیا۔ شام پڑ رہی تھی۔ جھونپڑی کی دیوار سے پشت لگا کر ساتھ ساتھ بیٹھے وہ اور بانو دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اب ہر طرف سناٹا بڑھ رہا تھا۔ آس پاس کی جھونپڑیوں میں کہیں کہیں دیے جل رہے تھے۔ ان سے پرے ایک کتا لگاتار بھونک رہا تھا۔ یہ موسم خزاں کی شفاف اور خشک رات تھی۔ چاند کے گرد آسمان سبز رنگ کا تھا اور ہوا لحظہ لحظہ لطیف تر ہوتی جا رہی تھی۔

”مجھے اپنی کہانی سناؤ،“ علی نے کہا۔

بانو اٹھی اور اندر سے ایک موٹا کپڑا لے آئی جسے اس نے علی کی ٹانگوں پر ڈال دیا۔ پھر اس نے آنکھیں سکیڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ رات کے سیاہ اور خاموش پرندے چاند کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ یکساں، اداس آواز میں اس نے اپنی کہانی بیان کی:

”میری سیدھی سادی کہانی ہے۔ تمہیں کیا ملے گا۔ ناگپور کے پاس ایک گاؤں میں، جس کا نام کلیان پور تھا، میں پیدا ہوئی۔ اس نام کا پنجاب میں ایک شہر بھی ہے۔ میرا نام شیلہ تھا۔ ہم گاؤں کے اچھوت تھے۔ مذہب عیسائی۔ انگریز جو سب کے حاکم تھے وہ بھی عیسائی تھے، پتا نہیں ہم اچھوت کیوں تھے۔ یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن ہم ان کے نزدیک بھی نہ جاسکتے تھے۔ انگریزوں کے نہیں گاؤں والوں کے چھوٹے بڑے سب کے نزدیک پس ہم جا ہی نہ سکتے تھے۔ اگر ہم غلطی سے کسی کے ساتھ چھو جاتے تو ہمیں اس کی سزا ملتی۔ لیکن سزا سے بھی ملتی، یہ کہ جب تک وہ نہا دھو نہ لیتا گھر نہ جاسکتا اور جس کو چھو لیتا وہ بھر شٹ ہو جاتا۔ چنانچہ ہماری ناپاکی متعدی بیماری کی طرح تھی۔ مزا اس وقت آتا جب ہم سردیوں کی صبحوں کو لالو کے انتظار میں چھپ کر بیٹھ جاتے اور دبے پاؤں نکل کر اسے چھو لیتے اور شور مچاتے ہوئے بھاگ جاتے۔ وہ گاؤں کا مسلمان دوکاندار تھا اور نرا احمق تھا اور لنگڑا ہونے کی وجہ سے بھاگ نہ سکتا تھا۔ اب سارے گاؤں کو پتا چل جاتا کہ لالو بھر شٹ ہو گیا ہے۔ پھر کیا تھا جناب، اب کوئی ہندو گاہک اس کی دوکان کے پاس بھی نہ پھٹکے گا۔ وہ ہمیں گالیاں دیتا ہوا ندی کی طرف چلا جاتا اور کانپتا ہوا واپس آتا۔ ہم دور کھڑے ہو کر دیکھتے اور خوشی سے

تالیاں بجاتے۔ ہمیں پتا تھا کہ یہ بات مستقل مذاق بن چکی تھی چنانچہ ہمیں اس کی سزا نہ ملے گی۔ کبھی کبھی بھرشت ہو جانے پر لالو خاموشی سے ہاتھ باندھ کر گلی کے درمیان کھڑا ہو جاتا: ”خدا کے لیے شور نہ کرو، کتو۔ آج بڑی سردی ہے، میں مر جاؤں گا۔“ وہ کہتا، پھر دکان کھول کر ہمیں تھوڑا تھوڑا گڑ دیتا۔ ”اب اچھے لوگوں کی طرح چپ چلے جاؤ کتے کے بچو، شلباش۔“ وہ کہتا۔ ہم خاموشی سے چلے آتے۔ اس طرح سے وہ ہماری اوپر کی آمدنی کا مستقل ذریعہ بن گیا۔ ہم گلیوں کی صفائی کا کام کرتے تھے اور گاؤں والوں کی مشترکہ جائداد تھے۔ گھروں کے اندر ہم بس مویشیوں کے احاطے تک جاسکتے تھے، گوبر اٹھانے کے لیے۔ دودھ دینے والے جانوروں کو چھونے کی اجازت نہ تھی۔ ہمارے برتن الگ تھے جن میں ہمیں انانج اور دوسری اجناس دی جاتیں اور ہمارا گھر گاؤں کے باہر جوہڑ کے کنارے تھا۔ آس پاس اور کوئی گھر نہ تھا، کھیتی باڑی کرنے کی ہمیں اجازت نہ تھی۔ جو نہی ہم لوگ ہوش سنبھالتے گلیوں کی صفائی کے کام پر لگا دیے جاتے۔ میں ہوش سنبھالنے سے کچھ پہلے ہی کام پر لگ گئی۔ یہ بڑا عجیب واقعہ ہے۔

”میرا ایک بھائی تھا جو ماں باپ کے ساتھ کام پر جایا کرتا تھا۔ میں بہت چھوٹی تھی۔ مگر میرا یہ بھائی بڑا عجیب تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی بات پر باپ کے ساتھ لڑتا رہتا تھا۔ شاید وہ کام چور تھا۔ ہر روز میرا باپ گھسیٹ کر اسے گھر سے نکالتا اور جھاڑو سے مارتا ہوا کام پر لے جاتا۔ لیکن وہ بڑا ذہین تھا۔ اسے سوتک گنتی فریاد تھی جو میرے ماں باپ میں سے کسی کو نہ آتی تھی اور کھیتی باڑی ہمارا کام نہ تھا پر اسے ہر فصل کے بیجے کاٹنے کے طریقے اور ان کے موسم یاد تھے، اور صرف سات دن کی بوٹی ہوئی فصل کو دور سے دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ کون سی فصل کا کھیت ہے اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں تھیں جن میں وہ گاؤں کے لڑکوں میں سب سے ہوشیار تھا۔ خیر ایک دن کیا ہوا کہ میرے باپ نے اسے خوب پیٹا اور وہ روتا روتا اور کالیاں دیتا ہوا سو گیا۔ رات کا جانے کیا وقت تھا جب اس نے اٹھ کر مجھے کمر پر لادا اور باہر نکل آیا۔ میں بہت نیند میں تھی، جب میری آنکھ کھلی میں نے اپنے آپ کو اسکی پشت پر پایا۔ وہ جوہڑ کے کنارے کتارے چپ چلا جا رہا تھا۔ رات بڑی سنسان تھی اور جوہڑ کے پانی میں ستاروں کا عکس پڑ رہا تھا۔ ایک جگہ پر رک کر اس نے مجھے اتار دیا۔

”اب میں نہاؤں گا۔ اس نے کہا اور کپڑے اتار کر پانی میں کود پڑا۔ دیر تک ڈبکیاں لگانے کے بعد وہ باہر نکل آیا اور تنگ دہرنگ میرے سامنے کھڑا ہو کر بولا: ”اب میں پاک ہوں؟“ بتا۔ ”میری بالکل نا سمجھی کی عمر تھی، جو میری سمجھ میں آیا میں نے کہہ دیا اور میں نے کہا: ”نہیں۔“ وہ خشمگین نظروں سے مجھے گھورتا ہوا دوبارہ خاموشی سے پانی میں اتر گیا اور خوب مٹی مل مل کر نہایا، پھر اس نے باہر نکل کر اپنا سوال دہرایا: ”اب پاک ہوں؟“ بتا۔ ”مجھے پتا تھا

وہ پاک نہیں ہے۔ میرے دوبارہ نہیں کہنے پر اس نے زور کا چاشنا میرے گال پر رسید کیا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا یہاں تک کہ میرے کان سنسنانے لگے اور مجھے لگا جیسے اب میں عمر بھر کے لیے بہری ہو گئی۔ مگر اسوقت خوف کے مارے چیخ بھی میرے حلق سے نہ نکلی۔ اس نے خاموشی سے کپڑے پہنے اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر کے نزدیک پہنچ کر اس نے بڑے آدمیوں کی طرح سینے پر ہاتھ باندھے اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں گنڈکا میں جا کر نہاؤں گا اور پڑھوں گا۔ مگر ایک نہ ایک دن میں ضرور واپس آؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں بہت چھوٹی تھی لیکن اس رات اس نے جو کچھ کہا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں موجود ہے۔ اس رات بڑی سردی اور سناٹا تھا۔

”اب میں اس کی جگہ پر کام کرنے لگی۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے اور کوئی خاص واقعہ نہ ہوا۔ صرف میری ماں ایک سال بیٹھے میں مر گئی۔ اب میں اور میرا باپ دونوں رہتے تھے اور میں سیانی ہو چلی تھی۔ ایک روز گاؤں کے زمیندار نے مجھے اپنے مہمان خانے میں بلایا اور باقی سب لوگوں کو باہر نکال دیا۔ میں نے سوچا ہونہ ہو کوئی کائے بھر شٹ ہو گئی ہے اور اب یہ مجھے جان سے مارنے والا ہے۔ لیکن اس نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور بولا: ”اری پگلی، عورتوں کے ساتھ سونے سے بھی کوئی بھر شٹ ہوتا ہے“ میں اس وقت بارہ برس کی تھی۔ شام کو خوش خوش وہاں سے لوٹ آئی۔

”اب میں اس کے ساتھ رہنے لگی۔ مجھے پتا چلا کہ یہ ایک عام فہم، بلکہ بڑے قاعدے کی بات تھی۔ اور وہ شخص برا آدمی نہ تھا، موٹے جسم کا ستدرست بڈھا تھا اور خوش مزاج تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مزدوری کیے بغیر مجھے اچھا کھانے کو اور پہننے کو مل جاتا تھا اور میں آرام میں تھی۔ صرف کبھی کبھی جب وہ میرے اوپر سوار ہو کر پاگلوں کی طرح کودنے لگتا تو مجھے خطرہ ہوتا کہ اب میں کچل کر مر جاؤں گی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ اس نے مجھے ایک اور شخص کے سپرد کر دیا۔ یہ شخص بھی زمیندار تھا اور عمر میں ذرا کم تھا پر اسے بڑا گندہ پسینہ آتا تھا۔ بھٹی کیا بدبودار شخص تھا۔ اس کے ساتھ لگنے سے میرا بدن بھی خراب ہو جاتا اور مجھے کئی کئی بار نہانا پڑتا۔ اس کے بعد جس آدمی کے پاس میں رہی وہ بڈھا اور بالکل نکما آدمی تھا اور کسی کام کے لائق نہ تھا۔ میں نے تیسرے ہی دن اس کی داڑھی نوچ ڈالی جس پر اس نے مجھے پکڑ کر خوب مارا۔ کافی دنوں تک ایسے ہی چلتا رہا۔

”اسی اشنا میں میرا باپ بڑھاپے سے مر گیا۔ اس کے چند روز بعد دن کہیں سے آن وارد ہوا۔ یہ میرا بھائی تھا۔ اسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی۔ ایک تو میں اکیلی تھی، دوسرے گاؤں کے لوگوں سے بالکل اکتا چکی تھی، اور پھر وہ میرا بھائی تھا۔ جب اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا تو میں خوشی خوشی اس کے ہمراہ جانے کو تیار ہو گئی۔ ایک روز شام کے وقت چپکے سے

ہم نے گاؤں چھوڑ دیا۔ اس وقت جب ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے پرے جا رہے تھے اور پیچھے گاؤں کی دیواریں اندھیرے میں غائب ہوتی جا رہی تھیں تو ایک بار بھی میرے دل میں خیال نہ آیا کہ اب میں کبھی لوٹ کر یہاں نہ آؤں گی۔ کیسی عجیب بات ہے۔ اس گاؤں میں میں پیدا ہوئی تھی اور وہاں میرا گھر تھا۔

”راستے میں من نے بتایا کہ وہ چھ برس تک سکول میں پڑھتا رہا تھا اور اس کے علاوہ بھی اس نے کئی کتابیں پڑھی تھیں جو سکول میں نہیں پڑھائی جاتیں اور یہ کہ اب وہ ایک بیحد اہم کام میں مصروف تھا اور اس کے ساتھ جو لوگ کام کرتے تھے۔ جاتے تھے کہ وہ اچھوت ہے مگر کوئی اعتراض نہ کرتے تھے۔ میں یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ دو روز تک ہم جنوب کی طرف سفر کرتے رہے، اس کے بعد ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ وہاں میں نے اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ عجیب و غریب قسم کے لوگ تھے۔ نوجوان اور خطرناک۔ کافی دنوں کے بعد مجھے پتا چلا کہ یہ دہشت پسندوں کا گروہ تھا جو زیادہ تر ریل گاڑیوں کو بارود سے اڑانے اور ڈاک خانوں کے تار کاٹنے کا کام کرتا تھا۔ یہ معلوم کر کے مجھے بہت افسوس ہوا کیونکہ من میرے لیے چھوٹے موٹے دیوتا کا درجہ رکھتا تھا، پر اب کیا کیا جاسکتا تھا۔ یہ جگہ بہر حال گاؤں سے زیادہ دلچسپ تھی۔

”اب ہماری زندگی خانہ بدوشوں کی طرح تھی۔ چند روز یہاں چند روز وہاں۔ ہم مستقل گاؤں گاؤں گھومتے تھے اور رات کے اندھیرے میں سفر کرتے تھے۔ وہ لوگ دن بھر اپنے ہتھیار صاف کرتے رہتے، رات کے لیے سکیمیں بناتے یا سوئے رہتے۔ وہ بڑے خطرناک طریقے پر بات کرتے اور کبھی کبھی بحث کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے۔ اکثر وہ رات رات بھر باہر رہتے اور سحری کے وقت بھوکے اور بد حال ہو کر لوٹتے۔ پولیس ہر وقت ہمارے پیچھے لگی رہتی اور کبھی کبھی ہمیں نہایت عجلت میں کسی جگہ سے بھاگنا پڑتا۔ مجھ کو وہ کسی بات سے آگاہ نہ کرتے، صرف حکم دیتے۔ میں دل میں ان سے حسد کرنے لگی تھی اور میرا جی کرتا تھا کہ کسی روز میں بھی ان کے ساتھ جا کر وہ سب کچھ کر کے دکھاؤں جو وہ کرتے تھے اور مجھے علم تھا کہ میں وہ سب کر سکتی تھی مگر مجھے کبھی موقع نہ ملا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رات کی مہم کے بعد جب وہ لوٹتے تو ایک آدھ آدمی ان میں سے کم ہوتا۔ مجھ کو وہ کچھ نہ بتاتے مگر مجھے پتا چل جاتا کہ وہ پکڑا گیا ہے یا مارا جا چکا ہے۔ یہ کاروبار ہی ایسا تھا، تم جاتے ہو، زندگی، موت، خطرہ، ان وقتوں میں یہ چیزیں معمول بن گئی تھیں۔ مجھے کبھی پتا نہ چل سکا کہ کن لوگوں کی خاطر یہ گروہ کام کر رہا تھا لیکن ہمیشہ ایسا ہوتا کہ چند روز کے بعد کم ہونے والے کی جگہ کوئی اور آکر لے لیتا اور کوئی محسوس بھی نہ کرتا۔ مجھے من کا بڑا خطرہ رہتا۔

”اسی زمانے میں ایک شخص ہمارے ساتھ آکر رہا۔ وہ بڑا عجیب شخص تھا۔ بہت کم

وہ ان لوگوں کے ساتھ باہر کام پر جاتا ، صرف بیٹھا ہوا بحث کیا کرتا ۔ میری اس کی دوستی ہو گئی ۔ وہ ان سب میں دلکش اور پر امن تھا ۔ وہ پہلا ہی شخص تھا گاؤں چھوڑنے کے بعد میں جس کے ساتھ سوئی اور وہ پہلا شخص تھا جس کے ساتھ مجھے دل سے محبت ہوئی تھی ۔ گو چند روز بعد وہ ہمیں چھوڑ کر بھاگ گیا لیکن مجھے اب تک یاد ہے ۔ پہلا شخص جسے ہم دل سے پیار کرتے ہیں ہم کبھی نہیں بھولتے ، بعد میں آنے والے سب لوگوں میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ ۔ ۔ تم بالکل اس کی طرح چلتے ہو ۔

”اس کے جانے کے چند مہینے کے بعد ایک روز جب میں اکیلی اندھیرے میں بیٹھی تھی اور سب لوگ باہر جا چکے تھے تو اچانک مجھے ایک بڑا خوفناک خیال آیا ، کہ اب میں ہمیشہ کے لیے بچہ بننے کے قابل نہیں رہی ۔ اس رات میں بڑے زور سے ، بڑے دکھ کے ساتھ روتی رہی اور پہلی بار گاؤں کے ان سب لوگوں کو کوسا جن کے ساتھ میں رہ چکی تھی ۔ اس وقت میں پندرہ برس کی تھی ۔ یوں سوچو تو ہنسی آتی ہے ۔

”پھر وہ ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا ۔ ایک روز دن واپس نہ آیا ۔ وہ کبھی واپس نہ آیا ۔ میں تھوڑا سا روئی پھر ٹھیک ہو گئی ۔ کیا ہو سکتا تھا ۔ اس حادثے کے لیے میں بڑے عرصے سے تیار تھی ۔ چند مہینے اسی طرح گزر گئے ۔ میں نے زیادہ مضبوطی سے اپنے آپ کو گروہ کے ساتھ وابستہ کر دیا ۔ پھر ایک شخص ٹھا کر ہمارے ساتھ آکر رہا ۔ اس نے ایک روز مجھ سے کہا : ”تم ہندو ہو جاؤ میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں ۔ کیا فرق پڑتا ہے !“ میں نے کہا ۔ پھر انہوں نے خود ہی کسی طریقے سے ، جو اب مجھے یاد نہیں رہا ، مجھے ہندو کیا اور میری شادی کر دی ۔ مجھے اس سے دلچسپی نہ تھی ، مگر اس بات سے مجھے بڑی عجیب سی خوشی ہوئی کہ عمر میں پہلی بار باقاعدہ میری شادی ہو رہی تھی ۔ کچھ عرصے بعد وہ بھی مارا گیا ۔

”اب گروہ ٹوٹنا شروع ہوا ۔ وہ لوگ اپنی جانوں سے کھیل رہے تھے ۔ میری کون پروا کرتا تھا ۔ کچھ مارے گئے ، کچھ پکڑ لیے گئے حتیٰ کہ ایک روز میں اکیلی رہ گئی ۔ شیلا ٹھا کر میرا نام تھا ۔

اس کے بعد ۔ ۔ ۔ کوئی خاص بات نہ ہوئی ۔ تمہیں پتا ہی ہے ۔ میں وہاں آگئی جہاں تم نے مجھے دیکھا ۔ مگر میں تم سے کئی برس پیشتر وہاں پہنچی اور کپڑے کے کارخانے میں کام شروع کیا ۔ وہیں پر میں لال سے ملی جو کارخانے میں ”ٹائٹم کیپر“ تھا ۔ وہ بڑا مہربان اور نرم دل آدمی تھا ۔ مجھے کارخانے کے کام کی عادت نہ تھی اس لیے میں اکثر دیر سے پہنچتی لیکن وہ کبھی میرا ”ٹائٹم“ نہ کاٹتا اور میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتا ۔ چونکہ میں اکیلی تھی وہ کبھی کبھار میری خیریت پوچھنے کے لیے گھر کی طرف بھی آ نکلتا ۔ رفتہ رفتہ ہم اکٹھے رہنے لگے ۔ وہ بڑے اچھے دل کا آدمی تھا ۔ یہ اس کی مہربانی تھی کہ ایک روز اس نے کہا : ”تم مسلمان ہو جاؤ

اور میرے ساتھ نکاح کر لو۔ اس طرح ٹھیک نہیں۔“ میں نے کہا: ”مجھے کچھ پتا نہیں۔ بس میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے مجھے مسلمان کیا، میرا نام بانو رکھا اور ہمارا نکاح ہو گیا۔ اس کے بعد دو خاص واقعے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ مجھے اس سے واقعی محبت ہو گئی اور میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق سوچنا اور اس کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ دوسرا واقعہ یہ کہ کمال پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش سے کئی مہینے پیشتر جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں خوشی کے مارے بے حال ہو گئی اور میں نے لال کے اور ساری دنیا کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے۔ اس کی پیدائش کے دو سال بعد لال ایک دوسری عورت کے ساتھ جا کر رہنے لگا۔ اب بھی وہ کبھی کبھی میرے پاس آتا تھا اور جب بھی وہ آتا میں خوشی سے اس کے ساتھ رہتی تھی کیونکہ میں نے اس سے مل کر بڑی راحت پائی تھی اور مجھے اس سے بڑی محبت تھی، اور پھر وہ ابھی تک اسی طرح معصوم اور صاف دل تھا، لیکن سوال مہربانی اور نرم دلی کا نہیں، سوال یہ ہے کہ مرد ”ایک“ عورت کے ساتھ رہ سکتا ہے یا کہ نہیں، اور میرا خیال ہے کہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے مجھے بالکل چھوڑ دیا۔ اب میں نے پھر کام شروع کر دیا۔ ہر روز میری اس کی کارخانے کے دروازے پر ملاقات ہوتی اور وہ ہنس کر میرا حال پوچھتا اور میں بھی ہنس کر جواب دیتی، میں الگ رہتی تھی اور خود محنت کر کے کھاتی تھی، میں کیوں ناراض ہوتی۔

”جب تم آئے تو میں اکیلی رہ رہی تھی۔ ایک روز تمہیں پیچھے سے چلتے ہوئے دیکھ کر چونک پڑی۔ تمہاری چال۔۔۔ ہزاروں آدمیوں میں میں اسے پہچان لیتی ہوں۔ پر چھوڑو یہ بیکار قصہ ہے۔ اس کے بعد یونین اور ہڑتالیں اور پتا نہیں کیا کیا ہوا تمہیں تو پتا ہی ہے۔ کئی بار مجھے نکالا گیا مگر میں کسی نہ کسی طرح اسی شہر میں رہی اور کام کرتی رہی۔ پھر یہ ہندو اور مسلمان کا قضیہ چل نکلا۔ مجھے اس سارے قصے سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر چونکہ میرا پچہ تھا اور وہ مسلمان تھا اسے لے کر ادھر آ جانا پڑا۔ رستے میں وہ بھی بچھڑ گیا۔ میری زندگی کی سیدھی سادی کہانی ہے، اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ تم ابھی کمزور ہو اتنی ٹھنڈک میں باہر مت بیٹھو، چلو اب اندر۔۔۔“

اندر جھونپڑی کے وسط میں کھڑے ہو کر علی نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی۔ وہ عورت جو اس سے دس برس بڑی تھی، اس کا شفیق اور بیباک چہرہ تھا اور روشن آنکھیں تھیں اور اس کا جسم ابھی ڈھلا نہیں تھا۔ وہ بلا کی عورت تھی۔

”تم وہاں جاؤ۔“ علی نے چارپائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ بانو نے پس و پیش کرنی چاہی لیکن اس کی بھاری ٹکابوں کے سامنے خاموشی سے جا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ علی سینے پر ہاتھ باندھے خالی خالی نظروں سے دیے کی لو کو دیکھتا رہا، پھر کونے میں سے ایک رسی اٹھا کر

جھونپڑی کے آر پار باندھنے لگا۔ جب باندھ چکا تو ایک موٹا کپڑا اس پر پھیلا دیا جس نے کوٹھری کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

”یہ کیا کرتے ہو؟“ بانو کی آواز آئی۔

علی خاموشی سے زمین پر اپنے لیے چادر بچھاتا رہا۔ پھر اس نے کہا: ”کل سے میں نور دین کے ساتھ رہوں گا۔“

اس رات اسے دیر تک پردے کے دوسری طرف عورت کے آہستہ آہستہ رونے کی آوازیں آتی رہیں۔

(۴۹)

وہ لاہور کے نواحی علاقے کی ایک قدیم، دو منزلہ کوٹھی تھی جس کا ایک حصہ آتشزدگی کی نذر ہو چکا تھا۔ بجلی کا سلسلہ اسی زمانے سے منقطع تھا اور اس کے بڑے بڑے کمروں اور طویل برآمدوں میں سرشام تیل کے لمپوں کی مدھم، اداس روشنی پھیل جاتی تھی۔ اندر دیواروں پر سے تمام تصویریں اتار لی گئی تھیں۔ جب تصویریں ابھی اتاری نہیں گئی تھیں تو وہ چاروں طرف دیواروں پر لگی تھیں اور ان میں قدیم اور معزز چہروں والے رائے بہادر اکیلے اور فیملی گروپوں میں نمایاں جگہ پر بیٹھے، اور انگریز کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے ساتھ غیر نمایاں جگہوں پر کھڑے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ جن تصویروں میں وہ غیر نمایاں تھے انہیں دیواروں پر نمایاں جگہ دی گئی تھی، اس دلچسپ ترتیب کو دیکھ کر اس طبقے کی ساری سماجی زندگی کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ پھر ہندوؤں کے ان گنت دیوتاؤں کی تصویروں کے رنگین پرنٹ تھے جنہیں بڑے سلیقے سے فریم کیا گیا تھا۔ یہ ساری بڑی پرسکون اور بے ضرر تصویریں تھیں جیسی پرانی خاندانی تصویریں ہوتی ہیں۔ یہ پرانے مکینوں کی تصویریں تھیں جنہوں نے گھر بنایا تھا، مگر پھر نئے مکین وارد ہوئے اور انہیں پرانے مکینوں کی تصویریں چھوڑ جانے کی ادا پسند نہ آئی اور انہوں نے ساری تصویریں اتارتے ہوئے بڑے تسخر کے ساتھ سوچا کہ بھائی، مکان بنا لینے سے آپ کوئی سدا کے مکین تھوڑا ہی ہو جاتے ہیں۔ اب آپ تشریف لے جائیے۔

فرنیچر جو پچا کچھارہ گیا تھا اسے چند کمروں میں ترتیب کے ساتھ لگا کر استعمال کے قابل بنا لیا گیا تھا، پھر بھی یہ عمدہ اور قیمتی فرنیچر تھا جس کی بناوٹ میں پرانے وقتوں کی رئیسیت کی جھلک ملتی تھی۔ نشست کے کمرے میں کونے کی تپائی پر ٹیلیفون پڑا تھا جو عرصے سے خاموش تھا مگر کسی نہ کسی امید میں ہر روز جھاڑا پونچھا جاتا تھا۔ کمروں کی آرائش کی طرف اس کے علاوہ اور کوئی توجہ نہ دی گئی تھی۔

جسے اس سارے ہنگامے میں سب سے کم گزند پہنچا تھا کوٹھی کا باغ تھا۔ یہ شہتوت اور جامن کے اونچے اونچے پیڑوں والا وسیع و عریض باغ تھا جو نصف صدی پرانی آبیاری کی یاد دلانا تھا۔ بڑے پیڑوں کے علاوہ بیسیوں چھوٹے بڑے پھلوں اور پھولوں کے پودے تھے جو چاروں طرف نہایت سلیقے اور ترتیب سے اگائے گئے تھے اور کوٹھی کو آرام دہ خنک اور سایہ دار ماحول عطا کرتے تھے۔ سامنے دو وسیع لان تھے جن کی گھاس اعلیٰ قسم کی تھی اور نفاست سے کاٹی گئی تھی۔ اندر کی طرف لان کے کنارے کنارے گلاب کے پودے تھے۔ باہر کی طرف کھٹے کی اونچی باڑ تھی جس میں جگہ جگہ چڑیوں نے گھونسے بنا رکھے تھے جس کے پیچھے سے سڑک گزرتی تھی۔ سڑک پر سے گزرنے والوں اور لان پر بیٹھنے والوں کو ہر وقت کھٹے کے پتوں کی ہلکی ترش خوشبو آتی رہتی۔ چند مہینے کی رکھوالی اور محنت کے بعد، جس میں تینے کنبے کے ہر فرد نے برابر کا حصہ لیا تھا، باغ نکھر آیا اور یہی ایک نظارہ تھا جو اس نئی جگہ پر ان لوگوں کے لیے سب سے زیادہ راحت بخش تھا۔

زمانہ ماضی میں باغبانوں کی ایک فوج تھی جو ہیڈ مالی کی نگرانی میں باغ کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی اور مالک لوگ صرف کنبوں میں بیٹھ کر پڑھتے تھے یا سوتے تھے یا گھاس پر پارٹیاں منعقد کرتے تھے یا محض ٹہلتے تھے۔ یہاں ایک بوڑھا بیکار سامالی ہاتھ لگا تھا اور اس سے زیادہ کی ان میں طاقت بھی نہ تھی۔ اس بات کو انہوں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا چنانچہ خاموشی اور رضامندی کے ساتھ ان میں سے ہر ایک نے اٹھ کر باغ کو سنوارنے میں اپنی سی کوشش کی تھی اور جب گھاس سرسبز آئی اور گلاب کے پودوں پر پھول آنے لگے اور باغ کے رستے سیدھے اور صاف نکل آئے اور درختوں کے سائے گہرے ہو گئے تو انہیں عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ ”مسرت کی کتنی مختلف کیفیتیں ہیں!“ نجمی نے سوچا تھا۔

اسی عام رضامندی اور خاموشی کے ساتھ انہوں نے زندگی کی ہر چیز کو قبول کر لیا تھا۔ نجمی نے ایک کوونٹ میں آرٹ پڑھانا شروع کر دیا تھا، مالی ضروریات کی وجہ سے کم اور اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی خاطر زیادہ، گو اس بات کا اس کے باپ روشن آغا کو علم نہ تھا۔ پرویز صوبائی حکومت میں اعلیٰ افسر تھا اور ایک پرانی اوپل گاڑی پر، جو اس نے سرکار سے پیشگی روپے لے کر خریدی تھی، سکرٹریٹ جایا کرتا تھا۔ (جو کچھ جمع پونجی وہ لوگ ساتھ لے کر چلے تھے سرحد پار کرتے وقت کچھ افسروں نے، جو کہ دونوں حکومتوں میں سے کسی ایک کے تھے، وہیں رکھوالی تھی۔ جہاز آخر کار نہ مل سکا تھا اور انہوں نے گاڑی پر سفر کیا تھا) عرصے سے وہ راج منزل میں بجلی لگوانے کی کوشش کر رہا تھا۔

راج منزل کوٹھی کا نام تھا۔ اس کا سارا جھگڑا تھا۔

غزاں کا موسم ابھی آیا نہیں تھا لیکن زمین و آسمان کے رنگ مدھم پڑنے شروع ہو گئے

تھے۔ دنوں میں وہ شدید اداسی اور ٹھہراؤ آگیا تھا جو پت جھڑ کے خاتمے پر آتا ہے۔ اور رات کو چاند نکلتا تھا۔ رات کی چاندنی سے لطف اندوز ہونے کے لیے آپ سردی کی وجہ سے زیادہ دیر باہر نہیں رک سکتے تھے اور باغ کے راستوں پر ٹہلتے ہوئے جگہ جگہ خشک پتوں کے ڈھیر ملتے تھے جنہیں باغبان دن بھر اکٹھا کرتا رہتا تھا۔ شوخ رنگوں کا اور دل کی بے چینی کا زمانہ ختم ہوا۔ اب یہ گہرے غم اور گہری خوشی کا موسم تھا۔ ابھی کچھ روز میں جاڑے شروع ہوں گے جب یہ تمام جذبے بھی ختم ہو جائیں گے اور صرف سردی اور حرارت کا احساس رہ جائے گا۔

بدلتے ہوئے موسم میں کیسا جادو ہوتا ہے۔ جیسے جوان عورت محبت کرتی ہے۔

پرویز دیر سے سامنے والے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ دفتر سے واپس آ کر اس نے چائے پی تھی اور تھوڑی دیر کے لیے روشن آغا کے کمرے میں گیا تھا۔ اب اندھیرا بڑھ رہا تھا اور ہوا میں خشکی آچلی تھی۔ وہ چلتے چلتے دروازے کے پاس رکا اور اندر سے کوٹ اٹھا کر پھر برآمدے میں نکل آیا۔ اندر روشن آغا بستر مرگ پر تھے۔ آج ساتواں روز تھا۔

لمبا چکر کاٹ کر وہ عمارت کی پچھلی طرف جا نکلا۔ اس برآمدے میں چراغ نہیں جلا تھا۔ ”کئی دن سے صفائی بھی نہیں کی گئی۔“ اس نے کنکروں پر سے گزرتے ہوئے سوچا۔ اس طرف گھاس اور خود رو جھاڑیاں بے تحاشا ہگ رہیں تھیں۔ باغ کے اس حصے کی دیکھ بھال کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی۔ اس چھوٹے سے بے ترتیب جنگل پر سر شام تاکی اتر آتی تھی جو برآمدے تک پھیل جاتی تھی اور کسی کسی رات کو گیدڑ ادھر ادھر سے جمع ہو کر شور مچایا کرتے تھے۔ برآمدے کی ٹوٹی پھوٹی، سیاہ کائی جمی سیرھیاں جو اس جنگل میں اترتی تھیں نجھی کی پسندیدہ جائے نشست تھیں۔

پرویز کو دیکھ کر وہ چونک پڑی: ”بھیا۔۔۔ کچھ ہوا؟“ اس نے پوچھا۔ ”پاگل پن کی باتیں مت کرو۔“ پرویز نے اعصابی لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ آگے کوٹھی کا جلا ہوا حصہ شروع ہوتا تھا۔ وہ وہاں سے ہوتا ہوا پھر سامنے والے حصے میں نکل آیا۔

کچھ دیر کے بعد اس نے اوپر کی منزل میں روشن آغا کے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ عذرا اس کی طرف پشت کیے کھڑی شال درست کر رہی تھی۔ روشن آغا نے کمزور آواز میں کچھ پوچھا۔ ”آئے تھے۔ آپ سو رہے تھے بلبا۔“ عذرا نے کہا، جھک کر چادر درست کی اور باہر نکل آئی۔ ”روشن آغا تمہارا پوچھ رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے کو جا رہی ہوں۔“ اس نے پرویز سے کہا اور اطمینان سے چلتی ہوئی گیلری میں غائب ہو گئی۔

پرویز نے جھجکتے ہوئے اندر قدم رکھا، رکا، پھر باہر نکل کر آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ نیچے آ کر اس نے نجھی کے کمرے سے اس کا کوٹ اٹھایا اور اس کے پاس سیرھیوں پر جا بیٹھا۔

”کوٹ پہن لو۔ سردی ہو رہی ہے۔“

چاند کی روشنی برآمدے کے ایک حصے پر پڑ رہی تھی۔ ان کے سامنے لمبی گھاس تاریکی میں سرسرا رہی تھی۔ پرویز نے کوٹ کا کالر کھڑا کر لیا۔

”روشن آغا کو علم ہو گیا ہے، تمہارے کوکونٹ جانے کا۔ عذرا بتا رہی تھی۔“
 نجمی نے سہم کر اپنے بھائی کو دیکھا۔
 ”نجمی۔“

”ہوں۔“

”روشن آغا تکلیف میں ہیں۔“

”بھیا۔۔“

”ابھی پھر انہوں نے میرے متعلق دریافت کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ ہر وقت انتظار میں ہیں۔ آج سات روز سے وہ جانے کی حالت میں ہیں مگر پورے ہوش حواس میں ہیں اور انتظار کر رہے ہیں۔ آج آخری آرڈیننس جاری ہوا ہے۔ مکانوں کے نام قطعی نہیں بدلے جا سکتے۔ میں انہیں کیا بتاؤں۔ کیا فائدہ ہو گا آخر۔۔ عجیب ضد ہے۔“
 ”بس ان کی خواہش ہے۔“

”عجیب پاگل خواہش ہے۔“ پرویز نے چڑ کر کہا۔ آج تک اپنے باپ کے متعلق اس نے اس لہجے میں بات نہ کی تھی۔

نجمی نے دوبارہ اندھیرے میں اس کی طرف دیکھا۔

”نجمی۔۔۔“

”بھیا۔۔“ (اس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں ایک بیحد پر ہول اور مصنوعی سطح پر ایک دوسرے سے مخاطب تھے)

”آخر اس میں۔۔۔ فائدہ ہے۔ ہم کیوں نہ ان سے کہہ دیں۔“

”کیا؟“

”کہ نام بدل دیا گیا ہے۔“ وہ یکلخت خاموش ہو گیا۔ خاموشی کے اس مختصر وقفے کو دونوں نے جی کڑا کر کے برداشت کیا۔

”پھر؟ لیکن؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اتنا وقت کہاں ہے۔ وہ اسی خبر کے انتظار میں ہیں۔ کسی زبردست خواہش کے پورا ہونے کے انتظار میں انسان کچھ عرصے تک موت کو بھی ٹال سکتا ہے۔ اس کی مثالیں موجود ہیں (نجمی نے لرز کر اسے دیکھا مگر اس نے بات جاری رکھی اور پھر۔۔۔ کب تک یوں چلے گا۔ تمہیں پتا ہے۔۔۔۔“

”عذرا آپا مگر“

”وہ اس وقت وہاں نہیں ہے۔ تم چاہو تو جا کر۔۔۔“
 ”نہیں، نہیں بھیا، آپ۔“ نجمی نے کمزور آواز میں کہا۔ پرویز نے اتہائی بدمزگی سے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اوپر کی منزل میں وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ روشن آغا آنکھیں کھولے سیدھے لیٹے تھے۔ ان کا چہرہ بستر کی چادر کی طرح سفید تھا۔ انہوں نے پرویز کی طرف دیکھا اور رہی سہی جان ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔

پرویز نے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر ان کا مردہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا: ”بابا، عرضداشت منظور ہو کر آگئی ہے۔ یہ اب۔۔۔۔۔ روشن محل ہے۔“

روشن آغا کے بے روح چہرے پر سرخی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے کچھ کہا مگر صرف ہونٹ ہلے، پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پرویز کا خیال ٹھیک نکلا۔ وہ جلدی سے ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے گہری نظروں سے مرتے ہوئے شخص کو دیکھا جو کہ اس کا باپ تھا اور جس کی آخری جدوجہد ختم ہو چکی تھی۔

اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے نجمی نے پرویز کے تیز تیز سیرھیاں اتر کر اپنے کمرے کی طرف جانے کی آواز سنی اور گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جب عذرا لوٹی تو روشن آغا مچکے تھے۔ حسین نے، جو ہر لحظہ ان کی پٹی سے لگ کر بیٹھا رہتا تھا، اسے ساری بات بتائی۔ اس نے دیوانوں کی طرح مردہ جسم کو جھنجھوڑا اور چند بے سود آوازیں دینے کے بعد آندھی کی طرح پرویز کی تلاش میں نکلی۔

پرویز اسے کہیں بھی نہ ملا۔ صرف نجمی ملی جو پچھواڑے کی سیرھیوں پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ واپس جانے سے پہلے عذرا نے صرف اتنا کہا: ”تم۔۔۔۔۔ جو اتنے اعلیٰ دماغ ہو، اتنی کمینگی کے اہل ہو۔“

اب وہ سب نشست کے کمرے میں جمع تھے، سوائے عذرا کے جو لاش کے قریب بیٹھی قرآن مجید پڑھ رہی تھی، اور حسین جو اپنے مالک کی موت پر اونچے سروں میں رو رہا تھا۔ نجمی سکول کے بچوں کو لے کر شہر کے ایک بڑے کلب میں گئی تھی۔ جہاں بے گھر مہاجرین کی مدد کے سلسلے میں انہیں ایک ڈرامہ کرنا تھا۔ سکول کی سٹیج اس تقریب کے لیے بہت چھوٹی تھی۔ اصل پروگرام کے بعد Charity Ball منعقد کیا جانے والا تھا۔ جب وہ وہاں سے لوٹی تو پہلے عمران اور پھر دوسرے لوگوں نے تقریب کے سلسلے میں چند رسمی سوالات کیے جن کا اس نے عجیب اکھڑے اکھڑے لہجے میں جواب دیا۔ یہ دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے اور پرویز اور اس کی بیوی کا انتظار کرنے لگے جو اسی کلب میں مدعو تھے۔

اگلے روز صبح سویرے نجمی لباس تبدیل کر کے سیدھی ناشتے کی میز پر آئی اور بغیر بات

کیے کھانے لگی۔ اس کا چہرہ بہت زرد تھا۔ سب پر غیر معمولی خاموشی طاری رہی۔ پھر آہستہ آہستہ باتیں شروع ہوئیں۔ عمران عذرا کو تھے ہمسایوں کے متعلق بتانے لگا۔ سامنے ان کی ماں بیٹھی تھی۔ ساتھ نجمی، جو اپنے آپ کو مشکل سے سنبھالے ہوئے تھی۔ پرویز ڈریسنگ کاؤن لپیٹا ہوا ابھی آن کر بیٹھا تھا اور عذرا کو چائے بنانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ نجمی نے توس کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا اور ساتھ ہی اُس کی چیخ نکل گئی۔ لقمہ پلیٹ میں آن گرا۔

”ممی۔۔۔ اس نے میری بے عزتی کی ہے۔“ وہ تقریباً رو کر بولی۔

”کس نے۔ کس نے۔ کیا ہوا؟“ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ کرسی پیچھے دھکیل کر معذرت کیے بغیر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

تین روز تک اس کا کھانا کمرے میں جاتا رہا۔ اس کی ماں اسے دیکھنے کو صرف ایک بار گئی۔ اس کے علاوہ گھر کا ہر فرد کئی کئی بار اس کی خیریت دریافت کرنے کو گیا۔ اس نے سب کو یقین دلانا چاہا کہ کوئی قیامت نہیں آگئی، بس ذرا طبیعت اوب گئی ہے، خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ آخر تنگ آکر اس نے سب کو آنے سے منع کر دیا۔ گھر بھر میں بہر حال تشویش پھیلی ہوئی تھی، کیونکہ اس کے کمرے کا لیمپ بھی بہت شام پڑنے پر جلا کرتا تھا۔

ہوا کیا تھا؟ اس نے لیٹے لیٹے سوچا۔ یہی کہ اتنے عرصے بعد وہ ملا اور بڑے اخلاق سے

کھڑا باتیں کرتا رہا، بڑے معمولی، روزمرہ کے انداز میں، ہاتھ میں گلاس تھامے، اسی طرح دلکش اور پراسرار۔ پھر اس نے بڑے ادب سے رخصت لی اور چلا گیا۔

لیکن اس نے جو کہا! اور اس کا وہ کہنے پن کا رویہ!

وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کر کھڑی ہوئی۔ کمرے میں تقریباً گھپ اندھیرا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے بستر پر سے شال اٹھا کر کندھوں پر ڈالی اور ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکا کر باہر باغ کے اندھیرے میں دیکھنے لگی۔

”ہلو نجمی میکم۔“ وہ بے تکلفت کہیں سے نکل کر اس کی طرف آ رہا تھا۔

”مسعود؟ ارے ہلو۔۔۔ تم شہر میں ہو او ہمیں خبر ہی نہیں۔“

”جی ہاں۔ کہیے کیسی گزر رہی ہے؟“

”مزے میں ہیں۔ مگر کم از کم تم ہی مل لیتے۔“

”وہ دراصل۔۔۔ ادھر کچھ عرصے سے کافی مصروفیت رہی،“ وہ ہنسا۔ ”اررر۔۔۔“

”بھئی حد ہو گئی۔“

”کہیے آب و ہوا اس آئی نئی جگہ کی؟“

”ہاں بھئی گزر رہی ہے۔“

”آپ کے سکول کا پروگرام بڑا دلچسپ رہا۔“

اے دھچکا سا لگا ، لیکن بشاشت سے بولی : ”اچھا ؟ شکریہ ۔ تم تو بڑے باخبر آدمی ہونا !“
وہ دوبارہ ہنسا : ”پرویز صاحب نے بتایا تھا ۔“
وہ خاموش رہی ۔

”ان سے ایک آدھ بار یہیں ملاقات ہوئی ۔ بجلی کے محکمے کے ہاتھوں خاصے نالان
تھے ۔“

”ابھی ہم اندھیرے میں ہیں ۔“ نجمی نے خوشدلی سے کہا ۔
”اور ۔۔ وہ آپ کے ہاں ایک تقریب ہوا کرتی تھی ، نجمی میگم ، سنا تھا ۔ پرویز کب
بن رہے ہیں روشن آغا ؟ ہمیں مدعو کرنا مت بھولیے گا ۔“
”ارے نہیں بھئی ۔۔“ آنسو اس کے گلے میں آکر اٹک گئے ۔ وہ خاموش کھڑا گلاس
میں زرد رنگ کا مشروب پیتا رہا ۔ پھر اسنے بڑے ادب سے جھک کر رخصت لی :
”آپ سے تو اب ملاقات ہوتی رہے گی ۔ ابھی ابھی ایک بہت پرانے دوست کی جھلک
دکھائی دی ہے اس مجمعے میں ، پیشتر اس کے کہ وہ پھر غائب ہو جائے ۔۔ گو آپ بھی بڑی
پرانی دوست ہیں ۔ خدا حافظ ۔“

”آپ آپ آپ ۔ لعنت ہو“ نجمی نے دل میں کہا ۔
رقص شروع ہونے پر وہ اپنے کونے میں بڑے مطمئن ، بڑے خوش فہم انداز میں کھڑی
رہی ، جیسے کہ اسے کسی بات کا ، کسی واقعے کا انتظار نہ تھا ۔ سامنے مسعود ایک نوجوان عورت
کے ساتھ ناچ رہا تھا اور ہنس رہا تھا ۔ اور باتیں کر رہا تھا ۔
”اچھا ناچ لیتی ہے ،“ نجمی نے بے دبیانی سے سوچا ۔

پھر وہ ناچتے ہوئے اس کے قریب سے گزرے ۔ معاً مسعود نے ایک مختصر لمحے کے لیے
بڑی بڑی گہرائی ، بڑے طنز سے اس کی طرف دیکھا ، جیسے یہ ساری تیاری اس نے ایک لمحے کے
لیے کی تھی ۔

Bravo ۔۔ اس نے سرکوشی میں کہا اور گزر گیا ۔ نجمی نے دہل کر ادھر ادھر
دیکھا ۔۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس کی وہ پچھلتی ہوئی نگاہ اس کے لیے مخصوص نہ ہو ، اور جو کچھ
اس نے کہا محض اپنی رقص کی ساتھی سے کہا ہو ، اس نے سوچنا چاہا ۔ لیکن وہ کسی کا انتظار کیے
بغیر تیر کی طرح باہر نکل آئی ۔

تین دن ۔ اور یہ مختصر سا منظر اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا ۔ خدایا ۔ اس نے
کھڑکی بند کر دی ۔

اب گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور وہ کرسی پر بیٹھی تھی ۔ ”ستائیس برس ۔“ اس نے دفعتاً
سوچا ۔ ”چند مہینے میں اٹھائیس برس ہو جائیں گے ۔ کیسی عجیب بات ہے ۔ یہ سارا وقت ،

سارا عظیم الشان وقت بیکار میں گزر گیا۔ میری ساری تعلیم، تربیت، زندگی کی اعلیٰ اقدار جن میں یقین کرنا مجھ کو سکھایا گیا، اعلیٰ دماغ، اعلیٰ زندگی، ان ساری باتوں کے باوجود آج میں اس جگہ پر آگئی ہوں جہاں ان سب سے الگ ہو کر اپنے متعلق سوچ رہی ہوں۔ شاید میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ آج سے اٹھائیس برس کے بعد میں کیسی لگوں گی؟ مجھے کیا غرض، کسی کو کیا غرض۔ خزاں کا موسم بھی گزر گیا، ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اب یہاں پر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے اور بہت سی زندگی میرے قریب سے تیزی کے ساتھ گزر گئی ہے۔ سارے گیت پرانے ہو گئے، ساری چیزیں اتنی قدیم، اتنی کہنہ سال ہیں، میرے سمیت۔ لیکن اگر میں سمجھوں کہ میں وقت سے الگ تھلک، ایک مکمل اور خود مختار اکائی کی طرح سے میٹھی رہی تو۔۔۔۔۔ یہ سراسر غلط ہے۔ زندگی میرے اندر سے گزری ہے۔ میرے سر میں سے، میرے سینے میں سے، میرے پیٹ میں سے، میری ٹانگوں میں سے، اور وقت کے نشان میرے اوپر موجود ہیں۔ آثار قدیمہ۔ میرے چہرے پر، چھاتی پر، پیٹ پر، ٹانگوں پر۔ میں نے دیکھا ہے۔ اب میں کیا کرنے والی ہوں؟ کیا؟

اس نے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار کر فرش پر گرا دیے اور اندھیرے میں کرسی کا سہارا لیے کھڑی رہی۔ باہر تاریک گیلری میں سے کوئی گزرا۔ اندر اس نے صرف پاؤں کی چاپ سنی، کسی کی موجودگی کو محسوس نہ کیا۔ وہاں صرف وہ موجود تھی، اپنے سارے احساس، سارے ادراک، ساری عمر کے ساتھ۔ اس نے اندھیرے میں ہاتھ پھیلایا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی حتیٰ کہ اسے سجھائی دینے لگا۔ اس کی ٹانگیں، کمر، چھاتی، بازو، ایک مبہم اور بے شکا، بے ہیئت ہیولا، بے رنگ، بے بو، بے کار۔ ”یہ کرسی بھی زیادہ خوبصورت ہے۔“ اس نے بے تکی پن سے سوچا۔ اب وہ آہستہ آہستہ اپنے سارے جسم پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ پہلے کئی بار اس نے اپنی ٹانگوں پر اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تھا لیکن آج تک کبھی اپنے جسم کو اس حالت میں نہ پایا تھا۔ اسے کراہت ہونے لگی اور گھبرا کر اس نے دونوں بازو لٹکا دیے۔ اب وہ آہستہ آہستہ فرش پر چلنے لگی۔ کمرہ مانوس تھا اور وہ سارے راستوں، ساری چیزوں سے واقف تھی۔ ٹھوکر کھانے بغیر وہ سارے کمرے میں گھومتی اور اپنے آپ کو چلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ڈھیلے ڈھالے پھیلے ہوئے کولہے، بے ڈھنگے پن سے حرکت کرتے ہوئے کولہے، اور ٹانگیں جو خشک سیاہ اور جھری دار کھال والے ہزاروں سال پرانے درختوں کی مانند اندھیرے میں سے آگ رہی تھیں، اور لٹکتی ہوئی چھاتیاں، بکرے کے پھیپھڑے کی طرح کچے کچے خون کی رنگ کی، پلپلی اور پھولی ہوئی اور ہلکی، اور پیٹ، ناریل کے بالوں کا سا، کھردرا اور بدبودار، پھر کولہے، بے ڈھنگے پن اور بے شرمی سے حرکت کرتے ہوئے کولہے، رکو، رک جاو۔۔۔۔۔ آواز شور کے ساتھ کوئی چیخا۔ سیکھنت وہ جہاں کی تہاں سرد پڑ گئی۔ پاگل بصیرت کے اکی لمحے

میں اس نے ساری بات کو محسوس کر لیا تھا ، کہ سارا وجود ، سارا وقت ایسا بدھیئت ، ایسا کریہہ المنظر تھا ۔ وہ کمرے کے وسط میں ٹانگیں پھیلائے آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑی رہی ۔ بڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ ایک خیال اس کے ذہن میں جاگا ۔ ”یہ ہماری ساری میراث ہے ۔ اس بارے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ صرف فخر کر سکتے ہیں ۔“

گیلری میں قدموں کی چاپ قریب آئی اور کسی نے دروازہ کھولا : ”بیٹا ۔ ۔ بیٹا کھانا ۔“

”جاؤ ۔ باہر جاؤ ۔“ وہ پاگلوں کی طرح چیخنی ۔ خادمہ بدحواس ہو کر اٹھے پاؤں بھاگ گئی ۔ کچھ دیر تک سن رہنے کے بعد اس نے کپڑے پہنے اور لیمپ جلا کر آہستہ سے سنگار میز کے سٹول پر بیٹھ گئی ۔ وہ کپکپا رہی تھی ۔ اس نے دیکھا کہ اس کے بال جو کافی عرصے سے گر رہے تھے ، بہت ہلکے ہو چکے تھے اور آنکھوں کے نیچے تھلیاں بن گئی تھیں اور رخساروں کے ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور جلد کا رنگ خاکستری ہو گیا تھا ۔ افسوس یا نقصان عظیم کے کسی جذبے کے بغیر وہ وہاں بیٹھی شیشے میں دیکھتی رہی ۔ ”تمہارا رویہ کچھ غلط نہیں تھا ،“ اس نے دل میں کہا ۔ ”تمہیں الزام نہیں دیا جاسکتا ۔ تم پر بہر حال خدا کی لعنت ہو ۔ مسعود!“

جب وہ وہاں سے اٹھی تو حیرت انگیز طور پر پرسکون تھی ۔ وہ سیدھی پرویز کے کمرے میں گئی جس نے اسے پاس بٹھا کر حال پوچھا اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا ۔

”بھیا ۔ آپ کلب نہیں گئے؟“

”کل جاؤں گا ۔“

”بھیا ۔ ۔“

”کہئے بیٹا ۔ ۔“

”ہم بھی آپ کے ساتھ جائیں گے ۔“

”اچھا بیٹا ۔ ۔ ۔“

وہ کلب کے ہال کمرے میں بیٹھی ایک انگریز عورت سے باتیں کرتی رہی ۔ اس عورت کا خاوند بول کا بڑا عہدیدار تھا اور وہ لوگ مستقل طور پر پاکستان میں بسنے کا ارادہ کر رہے تھے ۔ اس نے نجمی کو مشورہ دیا کہ یہاں پر وقت ضائع کرنے کی بجائے اس کو انگلستان جا کر پڑھنا اور یورپ کا دورہ کرنا چاہیے کہ دنیا کا سارا آرٹ یورپ میں تھا ۔ نجمی بڑی پرسکون مطمئن آواز میں اس سے باتیں کرتی رہی ، انتظار کرتی رہی ، جب پرویز اٹھ کر اس کی طرف آیا : ”بیٹا نو بج رہے ہیں ۔ چلیے گا نہیں؟“

”ابھی ہمارا جی جانے کو نہیں کرتا ہے بھیا ۔“

”اچھا تو میں سلیم الرحمان کے ساتھ جاتا ہوں ، آپ جلد آجائے گا ۔ مسز میکفرسن ،

میں اپنی بہن کو آپ کی معیت میں چھوڑے جاتا ہوں ۔ شب بخیر ۔ ۔ ۔“

اس کا یہ پرانا ، دلکش انداز - اور آنکھیں ، سیاہ - پراسرار - ذہین اور اوپر اٹھا ہوا خوبصورت مغرور سر ، اور کھڑی ناک ، کلاسیکل - اور اس کی آواز ، اتنی نرم ، اتنی پرسکون - کلاسیکل تہذیب ، دماغ - اس میں کوئی عشوہ ادائی ، کوئی عشوہ نمائی نہیں - مسعود نے سوچا ، خدایا ، یہ کیسی بلا کی پرکشش عورت ہے -

”ہوں - تو یاد ہے تمہیں؟“ اس نے کہا -

نجی کے قدم تیز ہو گئے اور عرصے کا رکا ہوا غصہ اسکے دماغ کو چڑھل - وہ بالکل بھول گئی کہ یہ ساری تپاری اس نے محض اس وقت کے لیے کی تھی -

”رکو نجی ، سنو ، مجھے تم سے بات کرنی ہے ، از حد ضروری - بھئی حد ہے - - -“
وہ اور تیز ہو گئی مسعود نے دوبارہ اسے روکنے کی کوشش کی : ”ٹھہرو ، ایک لحظہ - مجھے افسوس ہے ، مگر سنو ، میں تمہارے گھر آ سکتا ہوں؟ - - تم بڑی خوبصورت لڑکی - -“
”بھئی واہ - - - کمال ہے -“ اس نے خفگی سے کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا -

وہ دروازے پر جھکا رہا : ”تم جو کہو لیکن میں ضرور آؤں گا - تمہیں میری بات سننا پڑے گی - میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں - میں - - -“

وہ انجن سٹارٹ کرتے ہوئے سخت جھلا گئی - ساری گزشتہ خفت ، شرمندگی ، شکست اور کمینگی بیکلخت غصے کی تند لہر بن کر اٹھی اور اس پر چھا گئی -
”شب بخیر - شب بخیر -“ اس نے تیزی سے کہا -

مسعود ضدیوں کی طرح ٹانگیں پھیلائے ، سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا دور تک موٹر کی روشنیوں کو دیکھتا رہا -

اگلی بہار کے موسم میں ان کی شادی ہو گئی -

اس بات کو چند مہینے گزر چکے تھے - مسعود کی تعیناتی ایک غیر آباد سی چھاؤنی میں ہو گئی تھی جہاں وہ پتھروں کے بنے ہوئے ایک مکان میں رہتے تھے - سمندر وہاں سے قریب تھا - اور ان کی سب سے بڑی تفریح ساحل سمندر پر جا کر ٹہلنے میں تھی - بظاہر وہ بڑی محبت اور بڑے اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے -

لیکن کبھی کبھی شاموں کو جب انہیں گھر پر رہنا پڑتا تو دل کی بے چینی عود کر آتی اور وہ ایک دوسرے سے الگ ہو کر ، اپنی اپنی جگہ پر ، مختلف طور پر سوچنے لگتے اور وہ بڑا عجیب محسوس کرتے - - - کہ ایسا کیونکر تھا کہ وہ اس طرح سے سوچنے پر مجبور تھے -

ایسی ہی ایک شام کو جب اس کا خاوند سرد آتشدان کے قریب بیٹھا ایک کتاب میں مشغول تھا ، نجی نے اون کے گولے اور ادھ بنا سویٹر آہستہ سے ایک طرف رکھا اور اٹھ کر برآمدے میں

آبیٹھی - شام بڑی شفاف اور خوشگوار تھی اور فضا میں ہرے پتوں کی مہک تھی -

”سمندر پر اس وقت چاند طلوع ہو رہا ہو گا،“ اسنے سوچا، ”اور یہاں برآمدے میں بڑا سکون ہے - سکون؟ اوہ - تم نے اس سامنے والے درخت کو نہیں دیکھا جو کبھی ہرا نہیں ہوتا؟ تو پھر! اور اندر تمہارا خاوند موجود ہے جو تم سے محبت کرتا ہے، لیکن پتا نہیں کیا سوچتا ہے - کیا تم کبھی اس کی سوچ کو جان سکتی ہو؟ باوجود سار باتوں کے کبھی اس کے خوابوں میں شریک ہو سکتی ہو؟ ہم کس میں شریک ہیں؟ محض اپنے آپ میں - اپنے خواب ہم آپ ہی دیکھتے ہیں، اور تنہا ہیں - اور اگر سوچا جائے تو اس دوسرے شخص نے تمہارے اوپر کتنا ظلم کیا ہے - ایک معاہدے کی رو سے تم نے (تم دونوں نے) اپنی خفت مٹانا چاہتی ہے، مگر خفت باقی ہے، اور کنوار پنہ کی سہانی یاد جو اس بری طرح سے کٹھکتی ہے - جیسے دل ٹوٹ جاتا ہے - یادداشت؟ لعنت ہے -“ اس کی سوچ جاری رہی -

”کتنی ہی شامیں ہیں جو زندگی میں ہمیں تنہا اور سوگوار چھوڑ کر گزر جاتی ہیں - زندگی اس قدر غیر حقیقی ہے، اور پھر اس قدر تکلیف دہ طور پر حقیقی بھی - - - کیونکہ ہم پھنس چکے ہیں - محض اگر ہم تلاش کو ترک کر دیں - چھوٹے بڑے سہارے جو ہمارے دل کی شکست ہیں - محض اگر ہم بھول جاتی -

”ہم شاید زیادہ تر عرصہ خوش ہی رہتے ہیں، لیکن ہماری یادداشت ہے جو کچھ بھی جانتے نہیں دیتی - ہم چیزوں کا، باتوں کا فہم بھی رکھتے ہیں مگر شاتی، عمیق امن فہم سے بالاتر ہے - یہ صرف ہمارے پاس ”ہے“ یا ”نہیں ہے“ - ”ہے“ یا ”نہیں ہے“ صرف یہ! ”خاموش رہو اور بھول جاؤ کہ اس میں بھی نجات ہے - (پر کہنے سے کیا ہوتا ہے بھائی، ذرا بھول کے تو دکھائیے)

”کل میں نے اتنا گل مچایا، نوکر پر برسی، اتنے قہقہے لگائے، برج کے کھیل میں اتنا جھگڑا کیا، گھنٹوں باتیں کیں اور بلاوجہ چائے پیتی گئی - کچھ کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا - دوسروں کی تعریف کی، کچھ کو دور سے دیکھ کر پسند کیا اور نزدیک جانے کی حسرت پالتی رہی، کچھ کے سامنے اپنی متعدد خواہشوں کا اظہار کیا - پھر شام کے وقت اکیلی بیٹھی تھی کہ آپ سے آپ سوچ آئی، اس سارے وقت میں جو کچھ میں نے کیا اس کا کیا جواز پیش کر سکتی ہوں؟ نقصان عظیم کا احساس پیدا ہوا جو تھوڑی دیر میں زائل ہو گیا -

”زندگی کی اونچ نیچ، چمک دمک، نیک و بد کو میں نے اٹھلیوں میں سے نکال دیا ہے - جیسے اس ٹنڈ منڈ درخت کی شاخوں میں سے ہوا گزر رہی ہے - میری اٹھلیوں میں سوراخ ہیں - - - ہم بھلا دیے جائیں گے - جیسے وہ سب بھلا دیے گئے جن میں بعض کے پاس ٹوٹے پھوٹے کتبے رہ گئے ہیں - باقی کے پاس یہ بھی نہیں - کیا فرق پڑا؟ کیا فرق پڑتا ہے - صرف اگر میرے

دماغ میں بھی سوراخ ہوتے تو میں یادداشت کو باہر نکال دیتی - چلو نکلو ، باہر جاو - ابھی فوراً - - -

”دنیا میں جو انقلاب آئے ، جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں وہ سب بخیر و عافیت ختم ہوئے - کچھ نوکروں نے اٹھ کر مالکوں پر قبضہ کر لیا ، کچھ مالکوں نے اٹھ کر نوکروں پر قبضہ - - جاری رکھا - تاریخ اس طرح بنتی ہے - انسان اہم نہیں ہیں - واقعات ہیں -

”کیا وہ خوبصورت اور ذہین اور بہادر لوگ نہ تھے ؟ کیا انہوں نے ہماری طرح عظیم منصوبے نہ بنائے تھے ؟ ان میں سے بعض نے بے پناہ دکھ نہ اٹھائے تھے ؟ کیا انہوں نے یہ ساری تیاریاں اس لیے کی تھیں کہ ان ک یاموات کی وجوہات کی فہرست بنا کر تاریخ مرتب کی جائے ؟ کیا فرق پڑتا ہے - موت ابھی تک موجود ہے جو سب سے زیادہ اہم ہے - تاریخ سے بھی زیادہ -

”سامنے والا درخت خاموش کھڑا ہے اور اپنے لکڑہارے کا انتظار کرتا ہے - ہم اپنے لکڑہارے کا بھی انتظار نہیں کرتے ، کیونکہ ہمارے پاس ہماری یادداشت ہے جو ہمیں مصروف رکھتی ہے - جب ہم مریں گے تو شاید بیحد حیران و پریشان ہوں گے -

”رات ، میں نے تیرے وجود کو ، تیرے وجود کے اسرار کو محسوس کیا ہے - جیسے ان سب نے بھی کیا جو یہاں رہے ہوں گے - تیرا کیا خیال ہے کہ میں تجھے یاد رکھوں گی ؟ سراسر غلط - میں تجھے بھول جانے کی ازحد کوشش کروں گی -

”لیکن تو مجھے یاد آتی رہے گی ، اور سب چیزوں کی طرح - یہ تیری اور سب چیزوں کی اکٹھی سازش ہے - کمینی -“

”پہچھے کھڑکی میں اس کے خاوند کا سر نمودار ہوا - ”اندر آ جاؤ نجھی - رات پڑ گئی ہے -“ وہ خاموش بیٹھی رہی -

”تم جو اتنے معتبر بنے بیٹھے ہو ، کیا تم سمجھتے ہو کہ کرنل یا جنرل بن کر مرو گے ؟ ٹھیک ہے - ہو سکتا ہے - لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ بہر حال مرو گے - تو پھر کیا نتیجہ نکلا ؟ کون فائدے میں رہا ، تم یا موت ؟ میدان جنگ میں یا ملٹری ہسپتال میں یا کسی بھی ہسپتال میں ، آخری فیصلے میں گھاٹے میں تم ہی رہو گے میرے عزیز تم ، جس نے زندگی میں اتنی محنت کی اور اس کا پھل پایا - - اس وقت تم بڑی مسخرے لگو گے - تم نے میرے باپ کو مرتے ہوئے دیکھا تھا ؟ اور حسین کو جو کتے کی طرح رو رہا تھا“

”کتنے ہی دکھ ہیں جنہیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اس لیے کہ وہ دوسروں کے ہوتے ہیں - لیکن دوسروں کی زندگیاں ہماری زندگیوں میں شامل ہیں ، ان کے دکھ ہمارے دکھوں میں - نعیم کا کیا بنا ؟ نعیم کا کیا بنا ؟“ اس نے بلند آواز میں دہرایا -

”شاید فسادات میں مارا گیا - کچھ ٹھیک پتا بھی نہیں -“ قریب سے مسعود نے جواب

دیا۔ وہ جانے کب کا آکر اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ نجمی نے اکتاہٹ سے اسے دیکھا۔
 ”تم کیا جاتے ہو۔ تم تو خود مبتلا ہو اور بھگت رہے ہو، اور اس عظیم بھرم کو قائم رکھنے
 میں مصروف ہوں۔ ہم دونوں ایک معاہدے میں شریک ہیں، اور ہمارے مشترکہ دوست ہیں
 جن سے ہم روزانہ اتنی نرمی اتنے اخلاق اتنی مکاری چاہلوسی کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ ہم سب
 ایک بڑے معاہدے میں شریک ہیں۔ ہم کیا جاتے ہیں۔ محض یہ بھرم؟“
 پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ مسعود اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا: ”چلو۔۔۔۔۔“
 ”کہاں؟“

جواب دیے بغیر وہ اسے لیے لیئے جیب کی طرف آیا اور وہ سمندر کی جانب روانہ ہوئے۔
 چاند اوپر آچکا تھا اور ساحل کی ریت پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ فضا میں لہروں کی ہلکی
 ہلکی گرج تھی۔ وہ ریت پر ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا: ”سپین میں میں نے رقص۔۔۔۔۔“
 ”نجمی۔“

وہ چونک پڑی۔

”میری بات سنو۔ اسپین میں میں نے ایک عجیب سا رقص دیکھا تھا۔۔۔۔۔ میرا جی کرتا
 ہے ناچوں۔“
 ”ناچو۔“

اس نے ناچنا شروع کیا۔ یہ واقعی عجیب سا رقص تھا۔ ریت پر اس کا سایہ بڑی تیزی
 اور افراتفری کی حالت میں گھوم پھر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ رک کر اس نے نجمی کا ہاتھ پکڑا۔
 ”تم بھی ناچو۔“

”نہیں مسعود میں۔۔۔۔۔ تم جاتے ہو نہیں ناچ سکتی۔“

اس نے بڑی بدمزگی سے اپنی بیوی کے سراپا پر نظر ڈالی۔ پہلے پہل باپ بننے کی جو عام
 لوگوں کو خوشی ہوتی ہے اس سے قطعی نا آشنا تھا۔ اس نے پھر ناچنا شروع کیا۔
 وہ سہم کر ایک طرف کو ہٹ گئی۔ یہ وحشیوں کا رقص تھا۔ اس میں کو آہنگ، کوئی
 قاعدہ، کوئی نظم، کوئی ضبط نہ تھا۔ بس ٹانگیں، بازو، کولہے، کندھے، سر، سب ایک
 دوسرے سے الگ، نہایت بے قاعدگی اور بے ترتیبی کے ساتھ خوفناک، پاگل کر دینے والی
 حرکات میں چاروں طرف اڑ رہے تھے، گر رہے تھے اور چکر کاٹ رہے تھے۔ یہ بھوتوں کا ناچ
 تھا یا چڑیلوں کا جو میجر مسعود اس وقت بڑے انہماک اور بڑی محنت سے ناچ رہا تھا۔ چند لمحوں
 میں اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چکنے لگے۔ آخر کار وہ تھک کر رک گیا۔
 ”عجیب دیوانگی ہے۔“ نجمی نے آہستہ سے کہا۔

جب اس کا سانس برابر ہوا تو وہ ریت پر لیٹ گیا اور بولا: ”نجمی، میرے پاس آؤ۔ تم

نے دیکھا اس میں کسی سمت کا تعین نہیں ہو پاتا۔ بلکہ سمت کا احساس ہی سرے سے غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں جو بے ساختگی، جو بے راہ روی ہے اس سے بڑا سکون ملتا ہے۔ چلو چلیں۔“

جب وہ خواب گاہ کی بتی گل کر کے ساتھ ساتھ لیٹے تو کھڑکی میں سے چاند کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اور بستر کی چادر بہت سفید دکھائی دے رہی تھی۔ یکساں آواز میں مسعود نے کہنا شروع کیا:

”میں ساہا سال سے اپنی شخصیت کو یکجا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں، کیونکہ میں اپنی ذات میں بٹ چکا ہوں۔ ایک طرف میری خواہشیں ہیں، دوسری طرف میری زندگی ہے، ان کے درمیان۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتیں کیونکہ تم تیسری نسل ہو۔ لیکن تمہارے پرکھوں میں سے کسی نے یہ سب کچھ بھگتا ہو گا۔ یاد رکھو۔“

نجھی نے شاید اس کی بات نہ سنی، اس لیے کہ تبھی وہ بول اٹھی: ”حصول مسرت کی خاطر ہم اتنی خفت اٹھاتے ہیں، پھر خفت مٹانے کی خاطر اتنا دکھ سہتے ہیں، اس کے بعد موت آتی ہے۔ میں تمہارے ساتھ سوؤں گی پر اپنے خواب دیکھوں گی، اس لیے کہ میں بھول نہیں سکتی۔ زندہ رہنے کے لیے اتنی کمینگی پر اترنا پڑتا ہے۔“

”مسعود سو گئے ہو؟ سنو، ایک بات میری سمجھ میں آئی ہے بہر حال۔ روح میں بڑی طاقت ہے۔“ اتنا کہہ کر نجھی نے اس کے کندھے پر سر رکھا اور تھوڑی دیر میں گہری نیند سو گئی۔

مسعود نے بڑے رحم اور محبت سے اسے دیکھا۔ تم بڑے سکون کی نیند سو رہی ہو۔ اس نے سوچا۔ لیکن تم بھی اسی نسل سے تعلق رکھتی ہو۔ اور یہ نسل اپنی ذات میں بٹ چکی ہے۔ تم نے روح میں پناہ ڈھونڈی ہے، مگر میں نے تو بڑے بنیادی انسانی جذبوں سے زندگی کا سبق سیکھا ہے۔ محبت، نفرت، خوف، لالچ۔۔۔۔۔ میں روح میں یقین نہیں رکھتا۔

بڑی دیر تک وہ نجھی کو جگا دینے کے ڈر سے بے حس و حرکت پڑا جاگتا رہا۔ پھر اسے بھی نیند آگئی۔

(۵۰)

”میں نے دل کی بے چینی پر فتح پائی ہے۔ میرے اسرار کو کون جانتا ہے“ غذرا نے سلائیوں پر سے منظر اٹھا کر سوچا اور طمانیت کے گہرے احساس کے ساتھ مسکرائی۔ وہ عمران کے

لیے پل اور بن رہی تھی -

دھوپ لان پر پھیل گئی تھی - سبزے کے کنارے کنارے گلاب کے پھول مرجھاتے جا رہے تھے - چند روز پہلے بجھی کی شادی ہوئی تھی - اور وہ وہاں سے جا چکی تھی - اب فضا میں چیلوں کے بولنے کی آواز تھی - بہار کا موسم بھی ختم ہوا - میرے اسرار کو کون جانتا ہے ، اس نے دوبارہ سوچا -

لیکن یہ سوچ ان محدودے چند خیالات میں سے ایک تھی جو کبھی کبھار آپ سے آپ اس کے دماغ میں آتے چلے جاتے تھے - عموماً وہ سوچ سے گھبراتی تھی کہ یہ اس کے لیے بڑا مشکل کام تھا - ہمیشہ کی طرح اس کا ذہن ایک کاہل آکھاہی کی حالت میں کام کرتا رہتا تھا - لیکن ذہن کی اس چھٹی کے باوجود اس نے جینے کے احساس میں کبھی کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی - وہ سب کچھ جانتی اور محسوس کرتی تھی اور زندہ رہنے کے قدیم عمل کو اس نے مکمل طور پر اپنے آپ میں جذب کر لیا تھا اور اس سے اس کے وجود میں وہ توانائی پیدا ہوئی تھی جس کے سہارے وہ اور دنیا کے کروڑوں چھوٹے چھوٹے انسان روزانہ زندہ رہ رہے تھے - وہ دن رات کے سارے کام بڑے سکون ، بڑی آکھاہی اور نرم روی کے ساتھ کرتی تھی - اس کی زندگی میں شکایتوں اور پچھتاوؤں کا وجود نہ تھا کہ یہ بھی اس کے لیے بڑا مشکل کام تھا -

پرویز گھر کا اکلوتا فرد تھا جو یہ سارا سلسلہ چلا رہا تھا اور بڑی دریا دلی کے ساتھ اپنی ماں اور بہن کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا - وہ بڑی محنت سے کام کرتا اور سرکاری حلقوں میں ایک کامیاب اور دیانت دار افسر خیال کیا جاتا تھا - اس کے علاوہ اس کے فرائض میں روزانہ اپنی ماں اور بہن کے پاس الگ الگ بیٹھ کر ، تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی ، ان کی خیریت دریافت کرنا اور ہر دوسرے تیسرے دن اپنی بیوی کے ساتھ الجھنا اور اسے اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کرنا کہ دونوں دوسری عورتوں کا دنیا میں اور کوئی سہارا نہ تھا اور کہ اب ساری عمر ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا اور ان کا بوجھ اٹھانا ان دونوں میاں بیوی کا اخلاقی فرض ہو چکا تھا ، شامل تھا - اس کی بیوی کا عذرا کی طرف جو پرانا برتری کا رویہ قائم تھا اس میں اب اس کے لیے حقارت بھی شامل ہو چکی تھی ، کہ پہلے ہجرت اور موروثی جائداد کی گم کردگی اور اس کے بعد اس کے خاوند کی گمشدگی اور روشن آفاکی موت سے اس گھر میں اب اس کی حیثیت صفر کے برابر رہ گئی تھی اور زندگی کی کوئی شے اس کے حق میں نہ رہی تھی - عذرا کے لیے پرویز کی بیوی کا یہ رویہ معمول میں شامل ہو چکا تھا اور اس کے پروا کئے بغیر وہ اپنے آپ کو دن بھر کے چھوٹے بڑے کاموں میں مصروف رکھتی تھی - صبح سویرے سارے کمروں کی صفائی اپنی نگرانی میں کرانا اور بجھی کے جانے کے بعد سے باغ کی دیکھ بھال کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا - اس کے بعد وہ لان میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر بڑے انہماک سے عمران کے لیے پل اور یا پرویز کے لیے

موزے بنتی رہتی ، اور کبھی کبھار اپنی بھانجی کے کہنے پر باورچی خانے میں جا کر خانسماں کی مدد کرتی ۔ چند ایک بار ایسا بھی ہوا کہ سرکاری تقریبوں کے موقع پر پرویز اپنی بیوی کی علالت کی وجہ سے ، اور اس کے اجازت دینے پر ، اپنی بہن کو ہمراہ لے گیا اور اس نے بڑی خوش اسلوبی اور وقار کے ساتھ اپنے بھائی کے خاندانی اور سرکاری رتبے کے مطابق اپنے فرض کو انجام دیا ۔ گھر کی مجلسوں میں البتہ اس کی حیثیت کمتر تھی ۔ درجے میں اس کے بعد صرف ملازمین آتے تھے ۔ اس کے باوجود آخری وقت پر کسی نہ کسی طرح تیار ہو کر ہر منظر پر آ جاتی اور اپنی بھانجی سے الگ الگ ، اپنی پرانی گریس کے ساتھ مہمانوں میں گھومتی پھرتی اور ان کی خیریت دریافت کرتی ۔

دن میں کم از کم دو بار وہ اپنی ماں کو دیکھنے کے لیے بھی چلی جاتی جو اب بستر مرگ پر تھی ۔ وہ بڑے سکون اور سبھاؤ کے ساتھ اس سے باتیں کرتی اور اسکی ضروریات کا خیال رکھتی ۔ اسکی موت کا عذرا کو کبھی خیال نہ آیا تھا ۔ جیسے کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی بھی اسے کسی کی موت کا خطرہ لاحق نہ ہوا تھا ۔ مستقبل کے اندیشوں کا اس کی زندگی میں کہیں بھی دخل نہ تھا ۔ وہ وجود کی ایک بڑی حقیقی ، بڑی عام فہم اور بڑی دلکش سطح پر زندہ تھی ۔ اس کی شخصیت یکجا اور پائیدار تھی ۔ اس لحاظ سے وہ اپنی مخصوص معاشرت اور پس منظر کے باوجود دنیا کے ان گنت چھوٹے چھوٹے لوگوں کی ، جیسے کہ اس کے مالی یا میرے یا خانسماں تھے ، نامتدہ تھی ۔ وہ لوگ جو زندگی کے تمام تر عدم تعاون کے باوجود ، کچھ نہ جاتے ہوئے بھی ، دنیا کے عظیم کاروبار کو چلانے کے چکر میں بڑی توانائی کے ساتھ ہم تن مصروف رہتے ہیں ۔

کبھی کبھی نعیم کا خیال آتا تو اس کے دل میں بے اختیار درد پیدا ہوتا ، مگر اور باتوں کی طرح یہ بھی اب معمول بن چکا تھا ۔ اتنا ضرور تھا کہ اسوقت یکے بعد دیگرے چند سوچیں اس کے ذہن میں ابھرتیں اور تھوڑی دیر کے لیے وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیتی ۔ ذہنی عیاشی کے ان موقعوں پر وہ اپنی قدرتی سطح سے کچھ اوپر اٹھ جاتی اور آخر میں ہمیشہ کچھ اس طرح سے سوچتی جیسے آج صبح اس نے سوچا تھا : ”میں نے دل کی بے چینی پر فتح پائی ہے ۔ میرے اسرار کو ۔ ۔ ۔“ اور سر اٹھا کر دیکھا تھا کہ دھوپ لان پر پھیل گئی ہے اور سبزے کے کنارے کنارے اگے ہوئے گلاب کے پودوں پر پھول مرجھاتے جا رہے ہیں کہ یہ بہار کے آخری دن تھے ۔

تقریباً اسی زمانے میں ایک روز علی نے نور دین سے ، جس کے ساتھ اب وہ رہتا تھا ، بانو کا ذکر ان الفاظ میں کیا :

”بانو بڑی اچھی عورت ہے ۔“

”درست ہے ۔ میرا بھی یہی خیال ہے ۔“ نور دین نے کہا ۔

اس پر علی نے ذرا جھجکتے ہوئے ، بانو کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ۔ نور دین پہلے ٹھٹکا ، پھر ہنستے ہوئے بولا : ”اچھا اچھا ، مجھے اس کا خیال بھی نہ تھا ۔“ ۔ ۔ ۔ وہ دیر تک منہ ہی منہ میں ہنستا رہا ۔ پھر تھوڑی دیر کو سنجیدہ ہو کر بولا ؛ لیکن یہ بالکل ٹھیک ہے علی ۔ وہ بڑے کام کی عورت ہے ۔ بڑی محنتی اور دیانت دار ۔ اور پھر عورت کے بغیر مرد کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہوتا ۔“ اس کے بعد پھر وہ ہنستا اور اسے چھیڑتا اور علی مصنوعی خشکی کا اظہار کرتا رہا ، گو دونوں ادھیڑ عمر کے آدمی تھے ۔

چند باتوں کے بعد یہ طے ہوا کہ نور دین اس بارے میں بانو سے دریافت کرے گا ۔ اسی روز کام سے واپس آنے پر نور دین نے کہا : ”چلو ۔“

”کہاں ؟ بات ہوئی ؟“

”ہاں ۔“

سورج غروب ہو رہا تھا جب وہ دونوں منہ ہاتھ دھو دھلا کر بانو کی جھونپڑی میں داخل ہوئے ۔ جھونپڑی کا فرش بڑی صفائی سے لپا ہوا تھا اور سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر احتیاط سے رکھی گئی تھیں ۔ چھت میں سے گھاس پھونس ، جو لٹکتا رہتا تھا ۔ شہتیریوں میں ، جو لکڑی کے ٹیڑھے میڑھے ڈنڈے تھے ، اڑس دیا گیا تھا ۔ بانو نے دھلے ہوئے سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی تھی ۔ آج بڑی دیر تک وہ اپنے ہاتھوں کو ، جو بڑے بڑے اور کھردرے تھے اور کام کرنے کی وجہ سے جگہ جگہ سے تڑنے ہوئے تھے ، رگڑ رگڑ کر دھوتی رہی تھی لیکن ان کی بد رنگی دور نہ کر سکی تھی ۔ چنانچہ اس وقت وہ انہیں اوڑھنی میں چھپائے ہوئے تھی ۔ جب دونوں مرد اندر آئے تو وہ بڑی تمیز سے ان کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی ۔

کافی دیر تک تینوں خاموش بیٹھے رہے ۔ جب کبھی کسی دو کی نظریں اتفاقاً آپس میں ٹکرا جاتیں تو وہ کھیانے سے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتے ۔ تینوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے آپ کو نہایت بدھو خیال کر رہے تھے ۔ کسی کو بھی بات شروع کرنے کا ڈھنگ نہ آتا تھا ، حتیٰ کہ جھونپڑی میں اندھیرا اتر آیا اور بانو چراغ جلانے کے لیے اٹھی ۔

اس وقت اس کے اٹھ کر جانے ، اور کچھ اندھیرے کے بڑھنے کی وجہ سے علی کی ہمت بڑھی اور وہ کھٹکار کر یک دم بول اٹھا :

”میں نے نور سے کہا تھا ۔ اس نے تم سے بات کی ہوگی ۔ ظاہر ہے ۔ میں ۔“ وہ

رکا ، ”تمہیں پیار سے رکھوں گا ۔ میں گھر بنانا چاہتا ہوں ۔ تم بھی تو ۔ ہاں ، تم بھی ۔“ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ۔

وہ زمین پر دیکھتی ہوئی خاموشی سے آکر بیٹھ گئی ۔

”ٹھیک ہے ۔“ علی نے کہا اور خاموش ہو گیا ۔ پھر نور دین نے آہستہ آہستہ بات شروع

کی اور سادہ الفاظ میں اسے بتایا کہ علی محنتی اور دیانت دار آدمی تھا اور کہ مرد کے بغیر عورت کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ۔

”کمال۔۔۔ میرا بچہ؟“ اچانک اس نے سوال کیا۔

”اوہ۔۔۔“ علی جھنجھلیا، ”ابھی تک تم نے اس کا خیال نہیں چھوڑا۔ اتنا عرصہ ہو

کیا۔۔۔“

”مگر وہ ضرور آئے گا۔ وہ۔۔۔“ بانو ایک دم بھڑک اٹھی۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے،“ علی گھبرا کر بولا۔ ”وہ بھی ہمارے ساتھ رہے گا۔ ہم اسے

پالیں گے۔ پہلے پہل تو۔۔۔ تمہیں پتا ہی ہے میں اس کو جانتا بھی نہیں، اور پھر وہ دوسرے

مرد کا۔۔۔“ (بانو نے پھر کر اسے دیکھا) ”مگر ٹھیک ہے۔ رفتہ رفتہ میں اس کے ساتھ گھل

مل جاؤں گا، جیسے ساتھ رہنے سے ہم سب کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ پھر وہ ہمارے گھر کا

آدمی بن جائے گا، جیسے ہمارے اپنے بچے ہوں گے۔ میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کروں گا۔

تم فکر نہ کرو۔ اس کی مدد بھی کروں گا۔ مگر ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“

”کہاں جائیں گے؟“

”ہم کاؤں چلے جائیں گے۔“

اس موقع پر انہیں باتوں میں مشغول پا کر نور دین آہستہ سے کھسک لیا۔ اسے جاتے

ہوئے کسی نے نہ دیکھا۔

”کاؤں کے لوگ سادہ دل اور دیانت دار ہوتے ہیں اور وہ ہماری مدد کریں گے۔ یہ میرے

بھائی نے کہا تھا اور یہ سچ ہے۔ ہم بھی کاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ہم وہاں کھیتی باڑی شروع

کریں گے اور آہستہ آہستہ گھر بھی بنا لیں گے۔ کاؤں میں گھر بنانا مشکل نہیں ہوتا، تم فکر نہ

کرو۔ کھلی جگہ کی آب و ہوا بھی مفید ہوتی ہے۔ میرا بھائی۔۔۔۔۔“ وہ کراہ کر چپ ہو گیا۔

”مجھے اپنے بھائی کے متعلق کچھ بتاؤ۔“

”ابھی وقت نہیں۔ پھر کبھی سہی۔“

دونوں خاموش ہو کر جھونپڑی میں لیمپ کی بتی کی بھڑک کر جلنے کی آواز سنتے رہے۔ ”تیل

ختم ہو رہا ہے۔“ علی نے سوچا۔ دیر تک وہ بتی کے بھڑکنے کا تماشا دیکھتے رہے۔ بھر بانو نے

اٹھ کر تیل ڈالا۔

”تم باتونی تو نہیں ہو؟“ اچانک علی نے پوچھا۔

”میں۔۔۔ بس۔۔۔“ بانو نظریں جھکا کر سادگی سے بولی، ”تم تو جانتے ہی ہو۔“

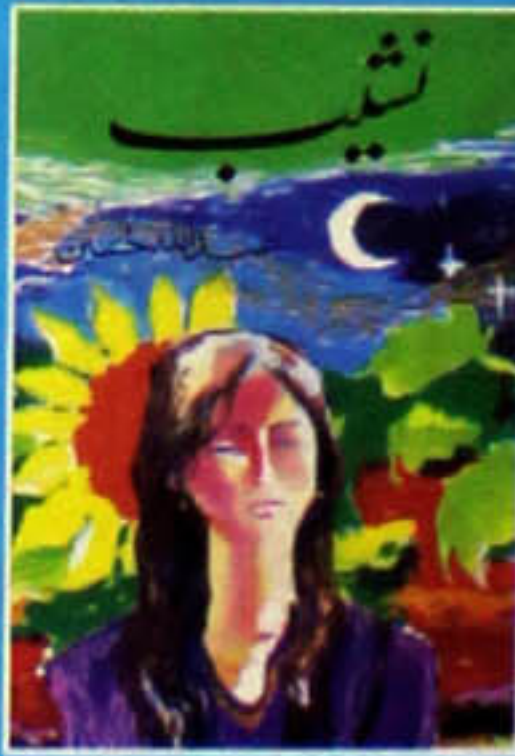
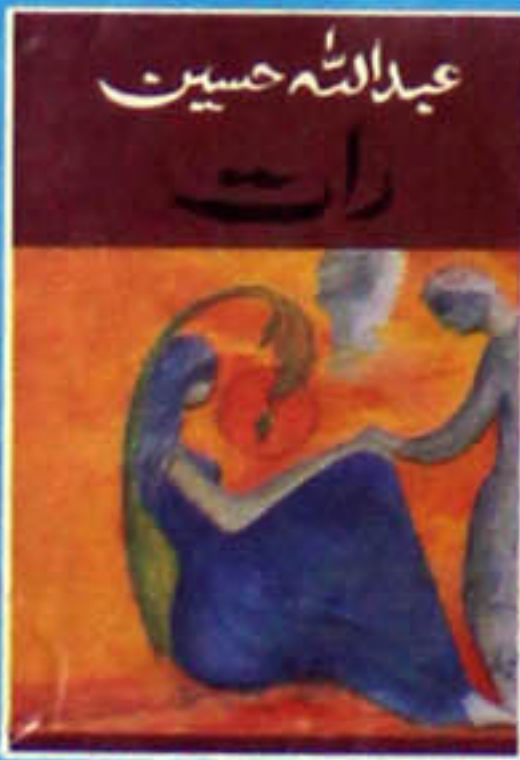
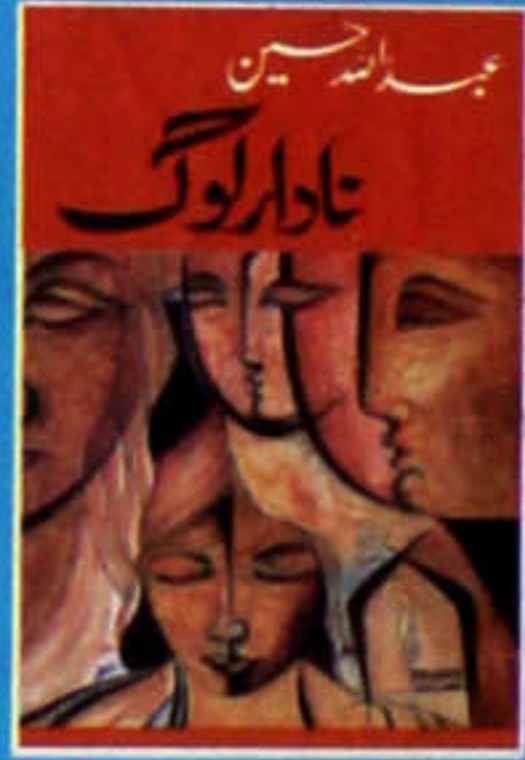
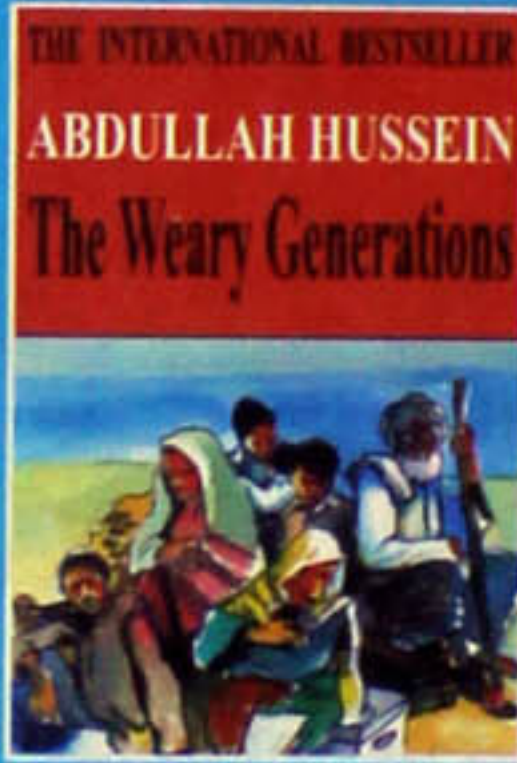
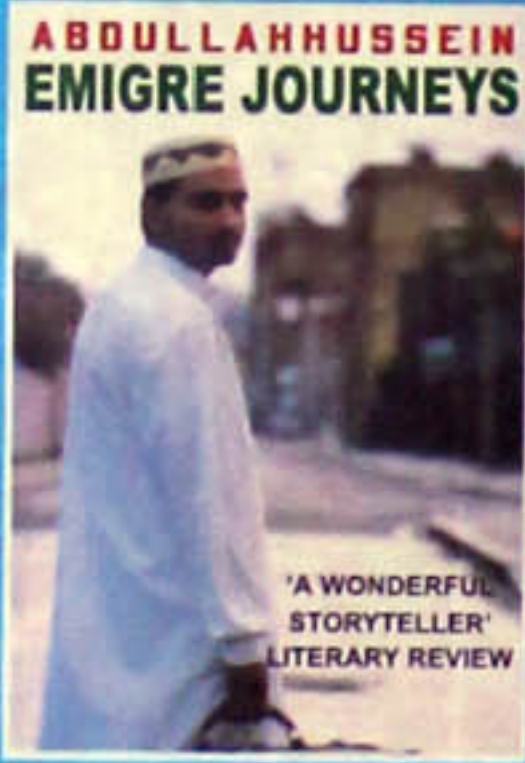
تھوڑی دیر کے بعد چراغ کی بتی پھر بھڑکنے لگی اور ان کی سیاہی مائل، بڑے بڑے،

مختی اور دیانت دار چہرے ایک ساتھ اس کی طرف اٹھ گئے۔ بانو نے اٹھ کر دوبارہ تیل ڈالا اور
دھیے لہجے میں اسے کمال کے بارے میں بتانے لگی۔

داؤد خیل

مئی ۱۹۵۶ء - - - جون ۱۹۶۱ء

عبدالله حسين



Rs. 500.00

www.sang-e-meel.com

ISBN 969-35-0073-3



9 789693 500738